www.paksociety.com

جاسوسی ڈائجسٹ
MEMBER APNS
CPNE

جلد 46 • شمارہ 08 • اگست 2016 • زرِ سالانہ 800 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے •

خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 229 کراچی 74200 • فون: 35895313 (021) فیکس 35802551 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

مدیرِ اعلیٰ

عذرا رسول

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقامِ اشاعت: C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابنِ حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

چینی نکتہ چینی

عزیزانِ من...... السلامُ علیکم!

اگست کا شمارہ یومِ آزادی کی دِلی مبارک باد کے ساتھ پیشِ خدمت ہے۔ کچھ دنوں سے ملک بھر میں بارانِ رحمت برس رہا ہے اور خوب برس رہا ہے۔ سبزے پر بہار آئی ہوئی ہے، پھولوں کے رنگ بکھرے اور نکھرے ہوئے ہیں، شہر، بستیاں اور سڑکیں دھلی دھلی دمک رہی ہیں اسی کے ساتھ چترال اور شمال کے بعض علاقوں میں سیلابی ریلوں نے خوفناک تباہی مچائی ہے۔ مکان ڈھے گئے، لوگ لقمۂ اجل بن گئے، مال و اسباب غضب ناک لہروں کی بھینٹ چڑھ گیا، آسودہ گھروں کے مکین یکایک کھلے آسمان تلے آگئے اور ایسی قدرتی آفات کا پیشگی ادراک کرنے والے ہمارے قومی ادارے حسبِ روایت پھر ناکام رہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے ریڈار ناقص ہیں، دیگر آلات فرسودہ ہیں...... بجا......! اگر کرنے کو کچھ بھی نہیں ہے تو ان اداروں میں زیادہ اور کم تنخواہوں کے ساتھ مراعات لینے والے سرکاری اہلکار کیا کر رہے ہیں۔ انہیں بھی گھر بھیج دیا جائے۔ یہ خرچ بچا کر ان لوگوں کی دادرسی کی جائے جو بے سروسامانی کے عالم میں کھلے آسمان کے نیچے آجاتے ہیں۔ جب کارکردگی دکھانے والے آلاتِ کار اور اسباب مہیا ہو جائیں تو ان سب کو گھروں سے بُلا کر کام سے لگا دیا جائے۔ ایک ادارہ این ڈی ایم اے کے نام سے ہے۔ کبھی کبھی ان کی خبریں آجاتی تھیں۔ کچھ دنوں سے ادھر بھی خاموشی ہے۔ یقیناً وہ کچھ نہ کچھ کر رہے ہوں گے۔ ایسے آڑے وقت میں ان کی طرف سے امدادی کاوشوں کا ذکر ضروری ہے کیونکہ یہ ادارہ قومی آفات سے نمٹنے کے لیے ہی بنایا گیا ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ کراچی کے افسران اس قدرتی امتحان سے محفوظ ہیں۔ ان کی دعائیں بارآور ہو رہی ہیں۔ گہرے اور سیاہ بادل امڈتے ہیں اور بِن برسے ہی شہر کے طول و عرض سے گزر جاتے ہیں۔ کہیں کھل کر برس گئے تو شہر کا جو حال ہوگا، اس کے تصور سے ہی خوف آتا ہے۔ پورے شہر میں کچرے کے ڈھیر، بند نالے، برساتی پانی کی گزرگاہوں پر خودرو گھاس اور جھاڑیوں کے بند نظر آرہے ہیں...... کراچی والے شب و روز بارش کی دعائیں مانگ رہے ہیں لیکن ابھی تک آثار یہی ہیں کہ نکاسیِ آب والوں کی دعائیں قبول ہو رہی ہیں۔ دیکھیں یہ پانسا کب پلٹتا ہے اور شہر کے رہے سہے سبزے پر نکھار آتا ہے۔ اسی کے ساتھ چلتے ہیں اپنی نکھری ہوئی محفل میں جہاں لفظوں کی برکھا سال بھر برستی رہتی ہے۔

کراچی سے ادریس احمد خان کی شمولیت ''جولائی کا جاسوسی حسبِ روایت خوب صورت اور بہترین کہانیوں سے مزین تھا۔ جولائی کا مہینہ ایک طرف خوشیوں بھرا تھا وہیں اپنے ساتھ ایک المناک خبر لے کر آیا۔ مجبور و بے کسوں کے ہر دکھ درد میں کام آنے والے عالمی شہرت یافتہ عبدالستار ایدھی صاحب اس دنیا سے رخصت ہو گئے اور تاریخ میں اپنا نام رقم کر گئے۔ ہر دل نے ان کے دکھ کو محسوس کیا اور ہر آنکھ اشکبار ہوئی۔ انہوں نے رنگ و نسل سے مبرا ہو کر ہر انسان کی انسانیت کے ناتے خدمت کی اور حتی الامکان اس کے درد کا مداوا کیا۔ رہتی دنیا تک ان کا نام قائم و دائم رہے گا۔ اللہ تعالیٰ ان کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے آمین۔ چینی نکتہ چینی میں ڈاکم گور چانی سرِفہرست تھے۔ طاہرہ گلزار نے بھی تبصرہ جامع انداز میں لکھا، بہن طاہرہ گلزار دنیا میں انسان کی زندگی میں الیمے زیادہ ہیں خوشیوں کے لمحے کم ہیں۔ ہر حال میں زندہ دل رہنے والا انسان خوش قسمت ہے۔ کہانیوں میں امجد اقبال کی چہرہ در چہرہ اچھی کہانی تھی جس نے اچھا تاثر دیا۔ افسوس انسان حرص و ہوس میں اندھا بن جاتا ہے۔ دولت کی چمک دمک اس کو خونی رشتوں کا بھی دشمن بنا دیتی ہے۔ جس طرح طاہر سلمان نے کیا کہ خونی رشتوں کو بھی دولت کے لیے پسِ پشت ڈال دیا مگر جس دولت کے نشے میں اتنے قتل کیے، وہ بھی بے وفا نکلی اور آہنی زیور پہننا پڑا۔ یاقوتی فتنہ بھی پُراثر کہانی تھی۔ انٹرویو، معصوم لڑکی بھی اچھے انداز میں لکھی کہانیاں تھیں۔ ہس کے بعد انگارے کا تو جواب نہیں، یہ قسط بھی جاندار رہی اور کہانی پڑھتے ہوئے بوریت کا شائبہ تک محسوس نہ ہوا۔ بہت خوب طاہر جاوید مغل، مبارک باد۔ سارے رنگ ان کی تحریر میں ہوتے ہیں جس کی وجہ سے کسی تشنگی کا مطلق احساس نہیں ہوتا۔ چال پہ چال پڑھنے میں مزہ آیا۔ قاتل کی تلاش میں آخر کار جاسوس نے اپنی عقلمندی اور کوششوں سے قاتل کو تلاش کر لیا۔ آوارہ گرد بھی کامیابی سے اپنا سفر جاری رکھے ہوئے ہے۔ پلان میں ایک شوہر نے اپنی بیوی کو آگ لگا کر قتل کر دیا محض پیسے کے لالچ میں۔ یہ نہیں سوچا کہ قتل کا ثبوت چھپتا نہیں ہے۔ پولیس آفیسر نے لاش دریافت کر لی، مجرم پھنس گیا جو کچھ دیر پہلے تک دولت کو خرچ کرنے کا منظم پلان بنا رہا تھا۔ بلاعنوان بھی اچھی کہانی تھی جس میں ایک پڑوسی نے دوسرے پڑوسی کو قتل کر دیا۔ دولت کے حصول کے لیے نکراتنی چالاکی سے اپنا بیان دینے کے باوجود پکڑا گیا۔ مجرم کتنا چالاک کیوں نہ ہو، اپنی چھوٹی سی غلطی پر بھی پکڑا جاتا ہے جیسا کہ جارج فیئرلی پکڑا گیا۔ میراث بھی خوب صورت تحریر تھی۔ منظر امام اپنی تحریر میں ایک پیغام دے جاتے ہیں۔ مزاح کا رنگ لیے ان کی اچھوتی تحریر کی کیا بات ہے۔ آخری صفحات کی دونوں کہانیوں نے متاثر کیا۔ فتنۂ دلگیر اور قاتل مقتول دونوں عمدہ کہانیاں تھیں۔''

میانوالی سے احسان سحر کا صدمہ ''اچھی باتوں اور خوشبو کا مستقل ٹھکانا نہیں ہوتا، یہ ہر جگہ موجود ہوتی ہیں۔ انہیں ڈھونڈنا مشکل نہیں۔ جاسوسی حسبِ معمول وقت پر ہی مل گیا۔ اچھی چیزوں کا مل جانا بہت بڑی نعمت ہے اور خوش قسمت ہیں وہ جو نعمتوں کی قدر کرنا جانتے ہیں۔ بانہوں میں جاسوسی

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

ہو، دل و دماغ میں مدہوشی نہ ہوا ایسا بھلا کیسے ہوسکتا ہے۔ صنفِ نازک کی معصوم صورت دیکھ کر دل کی پہلے سے عیدی ہوگئی۔ خوشیاں آتی جاتی ہیں ایک مرد
کے چہرے پر خوشی کی پھوار تو دوسرا آگیا زندگی سے ہار۔ زندگی وفا اور بے وفائی کے درمیان جھولتا پنڈولم ہے۔ آگے کی جانب سفر کا آغاز کیا، محفل گلستان،
ہر دل کی جان...... کرتی نہیں پریشان، آبادی آباد نظر آتی ہے۔ ذاکم علی خان آئے اور چھا گئے۔ بعض لوگ قسمت والے ہوتے ہیں جو آتے ہی چھا جاتے
ہیں۔ کاظمی صاحب سے جلنے کی بُو آرہی تھی۔ اللہ اللہ کریں اس عمر میں ہاتھ میں تسبیح لے کر۔ مرحا گل کا طویل تبصرہ متاثر کن رہا۔ قیصر اقبال بھی طویل
عرصے بعد رنگ جمانے میں کامیاب ہوئے خوب، آخر میں طاہرہ آپا نے چار چاند لگا دیے جس طرح بھارتی نگری میں قانون کا راج ہے...... اس طرح
جاسوسی میں بھی جانوں کا راج ہے۔ یقین نہ آئے تو کرلیجیے ثبوت موجود ہے بلکہ ہیں۔ پہلی کہانی اپنے پسندیدہ رائٹر کی پڑھنے کو ملی۔ دولت کی ہوس میں کھیلا
گیا مکروہ کھیل...... جس میں جانیں بھی گئیں اور سکون بھی چلا گیا۔ طاہر سلمان کا لالچی پن ایسے لوگ اپنوں اور معاشرے کے لیے ناسور ہوتے ہیں۔
پرویز جیسا کردار ہی اس ناسور کو ختم کرکے پیار اور امن پھیلا سکتا ہے جہاں قربانی بھی برقرار رہے۔ بہت خوب صورت ناول رہا۔ یاقوتی فتنہ، حاصل اور
لاحاصل جدوجہد کے درمیان اُبھرتا اور ڈوبتا رہا۔ گریشا بھی کام سے گئی...... بچی تو صرف لالچ اور ہاتھ کسی کے کچھ نہ آیا۔ پہلا رنگ قاتل مقتول، مردوں
کے معاشرے میں جب عورت بے بسی کی تصویر بن جائے تو ایسی ہی کہانیاں جنم لیتی ہیں۔ نورین کا دکھ بھرا سفر آخر حرام موت پر تمام ہوا، دکھ جب ساتھ
چلنا اور مسلسل چلنا شروع ہوجاتے ہیں تو مایوسی بھی انسان کی دوست بن جاتی ہے۔ جو انسان کی جان لے کر ہی چھوڑتی ہے۔ دوسرا رنگ بھی کچھ خاص تاثر
قائم نہ رکھ سکا۔ منظر امام ہمیشہ کی طرح سچے اور کھرے لوگوں کو ڈھونڈ کر لاتے ہیں جن کی اینڈ پر کایا پلٹ ہوجاتی ہے اور پڑھنے والوں کو بھی چونکا دیتے
ہیں۔ زندگی میں تکلیفوں اور آزمائشوں کا آنا جانا لگا رہتا ہے۔ اللہ پاک سب کو آزمائشوں میں پورا اترنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔ ہماری دادی جان
کے لیے بھی دعائیں جو عید کے پہلے روز خالقِ حقیقی سے جا ملیں، زندگی رہی تو اگلے ماہ جلوہ بکھیرنے حاضر ہوں گے۔“

ڈسٹرکٹ جیل اٹک سے اسرار ساقی کی اصرار پسندی ”اس مرتبہ عید سے زیادہ جاسوسی ڈائجسٹ عید سے پہلے ملنے پر زیادہ خوشی ہوئی، یقین
مانیں جب ہمیں پتا چلتا ہے کہ ہمارا محبوب رسالہ آگیا ہے تو ہم خوشی سے پھولے نہیں سماتے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس ادارے کو دن دگنی رات چوگنی
ترقی نصیب فرمائے آمین۔ (شکریہ) سب سے پہلے سرورق کو دیکھا، جناب کی مہارت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ اس کے بعد اداریے کو پڑھا۔ اس ملک کے
قانون بنانے والے ہی محفوظ نہیں تو عام آدمی کا کیا حال ہوگا۔ ہمارے ملک میں قانون تو ہے پر قانون پر عمل درآمد نام کی کوئی چیز نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب
پر رحم فرمائے، آمین۔ اس کے بعد اپنی محفل میں آئے تو اپنا خط دیکھ کر نہایت خوشی محسوس ہوئی۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ رسالے کے قیمتی صفحات پر ہم کو جگہ
دی گئی۔ ابتدائی تبصرہ نگاری ذاکم علی خان گورچانی کی تھی۔ تبصرہ مختصر مگر جامع تھا۔ دوسرے نمبر پر نعمان دانش تھے، آپ لوگوں نے کم عمری میں بھی اچھا
تبصرہ کیا، شاباش بھائی آئندہ بھی آتے رہنا۔ اس مرتبہ تو اپنے شاہ صاحب بھی حاضر تھے۔ کمال تبصرہ تھا۔ شاہ جی آپس کی بات ہے یہ شگفتہ کون ہے
(آپ نے پہچانا نہیں؟) آپ کے دم سے ہی محفل میں رنگ ہے۔ ادریس احمد خان، قیصر اقبال، عبدالجبار رومی، معراج محبوب عباسی یہ لوگ اپنی اپنی جگہ
زبردست تبصرے لے کر آئے، ملتان سے میرے بھائی وقار احمد بھی حاضر تھے، جاندار تبصرہ تھا۔ میانوالی سے میرے بھائی سجاد خان بھی تھے، اچھا لکھتے
ہیں مگر کم لکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ سمیت جتنے بھی قیدی ہیں سب کو خیر کی رہائی نصیب فرمائے، آمین۔ مرحا گل صاحبہ نہایت پیارا سا تبصرہ لے کر حاضر
ہوئی تھیں۔ میرے فیورٹ محمد صفدر معاویہ پُراثر تبصرہ کرتے نظر آئے، آپ کے تبصرے دل کو چھو لیتے ہیں۔ اس کے علاوہ چوہدری سرفراز، شفقت محمود،
احسان سحر کے تبصرے شاندار رہے اور اینڈ میں تبصرہ کوئین طاہرہ گلزار صاحبہ اپنے مخصوص انداز میں تشریف لائیں۔ آپ اتنا اچھا اور تفصیلی تبصرہ کیسے لکھ
لیتی ہیں۔ کہانیوں میں انگارے اچھی جا رہی ہے۔ آوارہ گرد اس دفعہ کچھ ٹھنڈی دکھائی دی، اس کے علاوہ کہانیوں میں میراث، فتنۂ دلگیر اور قاتل مقتول
بہت ہی اچھی کہانیاں تھیں۔“ (محفل پر پورا تبصرہ لکھ دیا اور کہانیوں کی باری آئی تو تبصرہ ختم!)

خانیوال سے محمد صفدر معاویہ کی دعا ”جولائی 2016ء کا جاسوسی 2 جولائی کو مسرور بیس کراچی میں ملا۔ خدا کا شکر ہے کہ بادل برس گئے اور
کراچی (کا موسم) ٹھنڈا ہوگیا اس لیے ہم نے اپنی قیمتی عید اہلِ کراچی کے نام کردی اور ادھر ہی منانے کا فیصلہ کیا۔ سرورق کی بہت ہی پیاری دوشیزہ جس
کی آنکھ کے کیا کہنے داد دینی پڑے گی انکل کو، بہت خوب صورت بنایا ہے ماڈل کو ایسے لگ رہا ہے جیسے بہار آئی ہوئی ہو، پر پیچھے دو نمونوں کی وجہ سے بھی
اچھا سجا ہے۔ ساتھ چھوٹی سی عید مبارک، خیر مبارک جی آپ کو بھی۔ آپ کے اداریے تک پہنچے۔ حالات واقعی اس موڑ تک پہنچ گئے جہاں کبھی سوچا بھی نہ
تھا۔ مغرب کی تہذیب نے والدین کی عزت، بھائی سے بھائی بہن کی محبت اور باقی رشتوں کا تقدس چھین لیا، وہیں دولت کے لالچ نے سب کو اندھا کردیا
جس ملک میں قانون کا فیصلہ کرنے والے محفوظ نہ ہوں تو عام آدمی کی کیا اوقات۔ امجد فرید صابری کو اللہ جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے، بہت
عمدہ انسان تھے۔ ساری دنیا میں پاکستان سے امن اور پیار کا درس پہنچایا۔ اپنی محفل میں آئے ذاکم علی خان گورچانی کو پایا۔ تبصرہ مختصر مگر اچھا رہا، مبارک
ہو جی۔ نعمان دانش کی پھرتیاں بھی اچھی لگیں۔ سید شکیل حسین کاظمی کا طنز و مزاح سے بھرپور تبصرہ اچھا لگا۔ ادریس کی تبصرہ نگاری اچھی رہی۔ قیصر بھائی جی
آیاں نوں خوش آمدید ویلکم بیک سرا کھیں تے آپ کی محبت ہے کہ آپ نے محفل میں انٹری دی۔ اب آتے رہیے گا۔ مجھے اب مظہر سلیم، اعجاز راحیل اور
شوکت شہریار کا انتظار ہے۔ انصاری بھائی کا تبصرہ اور معراج محبوب عباسی کا خبرنامہ بھی پسند آیا۔ اسرار بشیر ساقی بہت شکریہ، اللہ پاک آپ تمام لوگوں کو
قید سے رہائی عطا فرمائے۔ سجاد خان سچ کہا، زندگی ہنسی مذاق میں گزرنی چاہیے۔ مرحا گل بہنا آپ بہت عمدہ تبصرے کے ساتھ رونقِ محفل بنیں۔ آپ کے
تبصرے میں کاشف زبیر صاحب کے ذکر پر دل آبدیدہ ہوگیا۔ زخم دوبارہ ہرے ہوگئے۔ ایسے انسان دنیا میں کم ملتے ہیں اور ایسے ہی انسانوں کی وجہ
سے دنیا آباد رہتی ہے۔ باقی دوستوں کے تبصرے بھی اچھے رہے۔ کہانیوں کی شروعات اس دفعہ ایچ اقبال کی چہرہ در چہرہ سے کی۔ کیا تحریر اپنے قلم کی جکڑ
میں لائے ہیں۔ انسان ایسا کہ بلند ہوا تو فرشتوں سے آگے کھڑا نظر آیا گمراہی، لالچ، طمع میں پڑا تو شیطان کو بھی کراس کر گیا جیسا کہ طاہر سلمان نے اپنے

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

سگے بھائی باقر سلمان اور اس کی بیوی کے ساتھ کیا۔ مصنف نے آئینہ دکھا دیا۔ انسانوں کو انسانوں کے روپ میں چھپے بھیڑیوں پرویز اور انسپکٹر سلیم کا کردار بہت عمدہ رہا۔ انگارے پر پہنچے تو انیق پہنچ گیا شاہی کے پاس تو باقی ساری قسط ریان فردوس کی حویلی پہنچے اور فساد میں کھپ گئی، پتا بھی نہ چلا۔ مغل صاحب کمال کے ساتھ کردار ڈھالتے ہیں کہانی میں۔ آوارہ گردی جانب لپکے۔ یہ کیا، یہ تو دشمنوں کو ناکوں چنے چبوا رہا ہے شہزی پھنسا تو برے چکر میں ہے اوپر سے اکیلا، اگر اول خیر اور کبیل دادا ہوتے تو مزہ ہی آجاتا پر اب بھی اس کا خدا مددگار ہے۔ جمال دستی کی یاقوتی فتنہ تیس ملین ڈالر کے ہیروں کی کہانی بہت عمدہ...... نکلے جاکر کہاں سے پسٹل کے کلپ سے۔ سکندر عظیم کی انٹرویو مختصر مگر عمدہ...... کسی کے انٹرویو کو آخری بنانے کے لیے اسے موت کی نیند سلا دیا۔ سیریناراض کے قلم سے معصوم لڑکی آئی۔ جیناواقعی ایک معصوم لڑکی تھی لیکن کہانی شروع میں مظلوم بھی لگی لیکن آخر میں تو ہاتھ کر گئی۔ دو بندے پھڑکا کے جارج کو بھی نہیں چھوڑا۔ عکس فاطمہ چال پہ چال لے کر آئیں۔ بہت عمدہ تحریر، کافی انٹرسٹنگ رہی۔ جیمز فرالے کے ساتھ چور کو پڑ گئے مور اور بعد میں دھوبی کا کتا نہ گھر کا نہ گھاٹ کا والی مثال بالکل فٹ آتی ہے۔ تنویر ریاض کی قاتل کی تلاش بھی بہتر تھی بس پتا نہیں چلتا تھا کہ کب ایک موضوع سے دوسرے موضوع اور ایک سے دوسری جگہ پہنچ گئے ہیں۔ سلیم انور کی پلان اچھی رہی۔ واقعی کبھی کبھی پلان اپنے گلے میں فٹ ہو جاتے ہیں۔ بابر نعیم کے قلم سے بلاعنوان بہت اچھی رہی۔ وہیں پر منظر امام صاحب میراث کی صورت میں بہت اچھی تحریر قلم کی زد میں لائے۔ سلیم فاروقی فتنہ دلگیر کی صورت میں بہت ہی اچھی اور بہترین تحریر لائے۔ فہد نے دولت کے لیے بہت گھٹیا حرکت کی اپنی محبت کو بھینٹ چڑھا دیا۔ لوگ تو محبت کی خاطر جان تک دے دیتے ہیں پر فہد کے پلٹ آنے پر مجھے بہت خوشی ہوئی بابر جس پر گمان ہی نہیں کیا جا سکتا ہے، وہ اس طرح کر سکتا ہے۔ مختار آزاد قاتل مقتول لے کر آئے۔ آج کے معاشرے میں جو کچھ ہو رہا ہے، حقیقت کو عیاں کرتی بہترین تحریر۔ سیٹھ نعمان چائے والا یا عبدالقادر ہی نہیں پتا نہیں اس جیسے کتنے بھیڑیے ہیں جن کی وجہ سے غریب اور کمزور کی بہن بیٹی کی عزت محفوظ نہیں اور نورین عرف نوری جیسے کردار پیدا ہوتے ہیں اللہ ہم کو سب کو اپنے حفظ و امان میں رکھے، آمین۔“

لودھراں سے محمد انعام کا شکوہ ”تین چار ماہ غیر حاضر رہا کسی نے بھی نوٹس نہیں لیا۔ (نہیں، نہیں کئی اخبارات میں تلاش گمشدہ کا اشتہار دیا تھا) نہ ہی کسی نے یاد کیا۔ لوگ مرے ہوئے انسان کو جلد بھول جاتے ہیں لیکن میں تو زندہ ہوں۔ زندہ ہونے کے باوجود جلد بھول گئے چلو خیر۔ اس دفعہ کالج کی چھٹیاں جاسوسی کے ساتھ انجوائے کر رہا ہوں۔ سرورق میں ہیرو گولی کھا کر دوسری گولی سے بچتے ہوئے، حسینہ ٹائپ عورت خیالی پلاؤ پکاتے ہوئے سوچوں میں گم نظر آئی۔ اداریہ پاکستان کے ناقص حالات پر روتا نظر آیا۔ مہنگائی، بدامنی، قتل و غارت وغیرہ روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ اس دفعہ ڈاکم علی سب پر بازی لے گئے۔ صاحب کو تعلیم مکمل کرنے کے بعد جاسوسی کا کچھ خیال آیا۔ نعمان دانش دوستوں کے تبصروں کا جائزہ لے کر ان کو مشورے دیتے نظر آئے۔ شکیل صاحب کو انتیس سال کے ہونے پر مبارک باد پیش کرتے ہوئے یہ نصیحت کرتے ہیں کہ دوستوں کو بھی یاد رکھا کرو۔ معراج محبوب عباسی صحافت میں نئے داخل ہوئے ہو اس لیے ہر چیز کو خبریں بنا کے پیش کر رہے ہو۔ ملتان سے شیخ وقار وضاحتی تبصرہ کرتے ہوئے۔ شفقت محمود یہ آپ کے شہر کے حالات نہیں پورے پاکستان کے حالات ناقص ہیں۔ ساری جگہ یہی حال جا بجا کوڑا کرکٹ کھلے ہوئے گٹر جس کی وجہ سے عید والے دن بچہ گٹر میں گر کر جاں بحق ہو گیا پھر بھی کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔ باقی دوستوں محمد سرفراز، مرحا گل، طاہرہ گلزار کے تبصرے بھی شاندار تھے۔ سب سے پہلے انگارے پڑھی، پڑھ کر مزہ آیا۔ شاہ زیب، ریان فردوس کے پاس تحفہ لے کر قیمت تو نہ وصول کر سکے البتہ ریان کے دشمنوں سے ٹکرا کر ان کے دانت کھٹے کر دیے۔ سجاول اور شاہ زیب نے دونوں کو چھڑوانے کے لیے جو چال چلی ناکام ہو گئی پھر بھی لگتا ہے کہ شاہ زیب ہی اس مسئلے کو حل کرے گا۔ آوارہ گرد تیزی سے جاری ہے۔ حویلی سے نکل کر مصیبت میں پھنستے نظر آ رہے ہیں۔ مہارانی صاحبہ علاج کے طور پر خون استعمال کرنے سے آدم خور بن بیٹھی۔ اگر شہزی نہ آتا تو یہ راز نہ کھلتا نہ جوگی بابا مرتا۔ فتنہ دلگیر دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ سبق آموز بھی تھی۔ فہد نے دولت کے حصول کے لیے اپنی محبت کی پروا تک نہ کی لیکن اس کی بے وفائی نے دولت سے ہی اس کا دل اچاٹ کر دیا۔ بابر اپنے انجام کو پہنچا۔ دل سے توبہ کرنے اور انسانوں کی خدمت سے فہد کو اس کی محبت دولت کے ساتھ ہی مل گئی۔ دوسری کہانی کا ماخذ بنیادی ضروریات اور بے روزگاری سے تنگ آ کر برائی کا راستہ چن لیا لیکن ہوس کے مارے لوگوں کو دوائی کے ذریعے مارتے ہوئے اور ان کی دولت پر ہاتھ صاف کیا۔ لیکن آخر میں شاید سچی محبت مل جانے سے توبہ کر لی تھی۔ کامران کے ساتھ کولڈ ڈرنک کی وجہ سے پکڑی گئی۔ آخر میں شکاری نے خود اپنے آپ کو شکار کر کے ختم کر ڈالا۔ چہرہ در چہرہ میں دولت کے حصول کے لیے اپنے سگے بھائی کو مار ڈالا۔ باقر سلمان اور اس کا ساتھ دینے والے اپنے انجام تک پہنچ گئے۔ چال پہ چال میں دولت ہاتھ آنے کے باوجود ہاتھ سے نکل گئی۔ منیجر کے عہدے کو ٹھکرانا خود پر کلہاڑی کا وار ثابت ہوا۔ باقی چھوٹی کہانیاں کچھ خاص نہ تھیں۔ امید ہے شرفِ قبولیت بخشیں گے تین ماہ پہلے میں نے کچھ لطیفے بھیجے تھے لیکن آپ نے شائع نہیں کیے اس کی وجہ بیان کر سکتے ہیں۔“ (جی...... غیر معیاری)

کورنگی کراچی سے محمد خواجہ کا لمحۂ فکریہ ”جولائی کا شمارہ بروقت موصول ہوا۔ سرورق سادہ لیکن بہت کچھ کہہ رہا ہے۔ ایک شخص گولی کھا کر تکلیف میں اور شاید گولی مارنے والا مسکرا رہا ہے کامیاب نشانہ لگنے پر ایک حیرت زدہ حسینہ۔ مدیرِ اعلیٰ کی چٹپٹی نکتہ چینی موجودہ حالات اور واقعات کی بالکل صحیح عکاسی کی گئی ہے۔ اس وقت عدم برداشت انتہا کو پہنچ چکا ہے۔ شرفا دیواروں کے پیچھے چھپ گئے ہیں اور پھر بھی اپنے کو غیر محفوظ سمجھتے ہیں۔ یہ اسلامی جمہوریہ پاکستان میں اور پاکستان سے باہر مسلمان اپنے اعمال سے اسلام جیسے امن پسند مذہب کی نفی کر رہے ہیں۔ اپنے غصے اور دلی عداوت کی پیاس مسلمانوں کے خون سے بجھا رہے ہیں۔ اسلام دشمن لابی کے مقاصد ہم اپنے ہاتھوں پورے کر رہے ہیں۔ ہمارے ملک کی نسل جس نے آگے اپنے ملک کو چلانا ہے۔ تعلیم و تربیت سے بے بہرہ ہو رہے ہیں۔ درس گاہوں کی دو طرفہ تقسیم، اردو سے دوری اور انگریز محترم اور مقتدر۔ درمیانہ طبقہ نہ اردو میں پورا کامل نہ انگریزی میں۔ آپ کا ادارہ سسپنس، جاسوسی اور سرگزشت وغیرہ سے اردو ادب کی جو خدمت انجام دے رہا ہے، وہ قابلِ تحسین ہے۔ اس وقت

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

ہو، دل و دماغ میں مدہوشی نہ ہو ایسا بھلا کیسے ہو سکتا ہے۔ صنفِ نازک کی معصوم صورت دیکھ کر دل کی پہلے سے عیدی ہو گئی۔ خوشیاں آتی جاتی ہیں ایک مرد کے چہرے پر خوشی کی پھوار تو دوسرا گیا زندگی سے ہار۔ زندگی وفا اور بے وفائی کے درمیان جھولتا پنڈولم ہے۔ آگے کی جانب سفر کا آغاز کیا، محفل گلستان، ہر دل کی جان...... کرتی نہیں پریشان، آبادہی آباد نظر آتی ہے۔ ذاکم علی خان آئے اور چھا گئے۔ بعض لوگ قسمت والے ہوتے ہیں جو آتے ہی چھا جاتے ہیں۔ کاظمی صاحب سے جلنے کی بُو آرہی تھی۔ اللہ اللہ کریں اس عمر میں ہاتھ میں تسبیح لے کر۔ مرحا گل کا طویل تبصرہ متاثر کن رہا۔ قیصر اقبال بھی طویل عرصے بعد رنگ جمانے میں کامیاب ہوئے خوب، آخر میں طاہرہ آپا نے چار چاند لگا دیے جس طرح بھارتی نگری میں قانون کا راج ہے...... اس طرح جاسوسی میں بھی جانوں کا راج ہے۔ یقین نہ آئے تو کر لیجیے ثبوت موجود ہے بلکہ ہیں۔ پہلی کہانی اپنے پسندیدہ رائٹر کی پڑھنے کو ملی۔ دولت کی ہوس میں کھیلا گیا مکروہ کھیل...... جس میں جانیں بھی گئیں اور سکون بھی چلا گیا۔ طاہر سلمان کا لالچی پن ایسے لوگ اپنوں اور معاشرے کے لیے ناسور ہوتے ہیں۔ پرویز جیسا کردار ہی اس ناسور کو ختم کر کے پیار اور امن پھیلا سکتا ہے جہاں قربانی بھی برقرار رہے۔ بہت خوب صورت ناول رہا۔ یاقوتی فتنہ، حاصل اور لاحاصل جدوجہد کے درمیان اُبھرتا اور ڈوبتا رہا۔ گریشا بھی کام سے گئی...... بچی تو صرف لالچ اور ہاتھ کسی کے کچھ نہ آیا۔ پہلا رنگ قاتل مقتول، مردوں کے معاشرے میں جب عورت بے بسی کی تصویر بن جائے تو ایسی ہی کہانیاں جنم لیتی ہیں۔ نورین کا دکھ بھرا سفر آخر حرام موت پر تمام ہوا، دکھ جب ساتھ چلنا اور مسلسل چلنا شروع ہو جاتے ہیں تو مایوسی بھی انسان کی دوست بن جاتی ہے۔ جو انسان کی جان لے کر ہی چھوڑتی ہے۔ دوسرا رنگ بھی کچھ خاص تاثر قائم نہ رکھ سکا۔ منظر امام ہمیشہ کی طرح سچے اور کھرے لوگوں کو ڈھونڈ کر لاتے ہیں جن کی اینڈ پر کایا پلٹ ہو جاتی ہے اور پڑھنے والوں کو بھی چونکا دیتے ہیں۔ زندگی میں تکلیفوں اور آزمائشوں کا آنا جانا لگا رہتا ہے۔ اللہ پاک سب کو آزمائشوں میں پورا اترنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔ ہماری دادی جان کے لیے بھی دعائیں جو عید کے پہلے روز خالقِ حقیقی سے جاملیں، زندگی رہی تو اگلے ماہ جلوہ بکھیر نے حاضر ہوں گے۔"

ڈسٹرکٹ جیل اٹک سے اسرار ساقی کی اصرار پسندی "اس مرتبہ عید سے زیادہ جاسوسی ڈائجسٹ عید سے پہلے ملنے پر زیادہ خوشی ہوئی۔ یقین مانیں جب ہمیں پتا چلتا ہے کہ ہمارا محبوب رسالہ آ گیا ہے تو ہم خوشی سے پھولے نہیں سماتے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس ادارے کو دن دگنی رات چوگنی ترقی نصیب فرمائے آمین۔ (شکریہ) سب سے پہلے سرورق کو دیکھا، جناب کی مہارت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ اس کے بعد اداریے کو پڑھا۔ اس ملک کے قانون بنانے والے ہی محفوظ نہیں تو عام آدمی کا کیا حال ہوگا۔ ہمارے ملک میں قانون تو ہے پر قانون پر عمل درآمد نام کی کوئی چیز نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب پر رحم فرمائے، آمین۔ اس کے بعد اپنی محفل میں آئے تو اپنا خط دیکھ کر نہایت خوشی محسوس ہوئی۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ رسالے کے قیمتی صفحات پر ہم کو جگہ دی گئی۔ ابتدائی تبصرہ نگاری ذاکم علی خان گورچانی کی تھی۔ تبصرہ مختصر مگر جامع تھا۔ دوسرے نمبر پر نعمان دانش تھے، آپ لوگوں نے کم عمری میں بھی اچھا تبصرہ کیا، شاباش بھائی آئندہ بھی آتے رہنا۔ اس مرتبہ تو اپنے شاہ صاحب بھی حاضر تھے۔ کمال تبصرہ تھا۔ شاہ جی آپس کی بات ہے یہ شگفتہ کون ہے (آپ نے پہچانا نہیں؟) آپ کے دم سے ہی محفل میں رنگ ہے۔ ادریس احمد خان، قیصر اقبال، عبدالجبار رومی، معراج محبوب عباسی یہ لوگ اپنی اپنی جگہ زبردست تبصرے لے کر آئے، ملتان سے میرے بھائی وقار احمد بھی حاضر تھے، جاندار تبصرہ تھا۔ میانوالی سے میرے بھائی سجاد خان بھی تھے، اچھا لکھتے ہیں مگر کم لکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ سمیت جتنے بھی قیدی ہیں سب کو خیر کی رہائی نصیب فرمائے، آمین۔ مرحا گل صاحبہ نہایت پیارا سا تبصرہ لے کر حاضر ہوئی تھیں۔ میرے فیورٹ محمد صفدر معاویہ پُراثر تبصرہ کرتے نظر آئے، آپ کے تبصرے دل کو چھو لیتے ہیں۔ اس کے علاوہ چوہدری سرفراز، شفقت محمود، احسان سحر کے تبصرے شاندار رہے اور اینڈ میں تبصرہ کوئین طاہرہ گلزار صاحبہ اپنے مخصوص انداز میں تشریف لائیں۔ آپ اتنا اچھا اور تفصیلی تبصرہ کیسے لکھ لیتی ہیں۔ کہانیوں میں انگارے اچھی جارہی ہے۔ آوارہ گرد اس دفعہ کچھ ٹھنڈی دکھائی دی، اس کے علاوہ کہانیوں میں میراث، فتنہ، دلگیر اور قاتل مقتول بہت ہی اچھی کہانیاں تھیں۔" (محفل پر پورا تبصرہ لکھ دیا اور کہانیوں کی باری آئی تو تبصرہ ختم!)

خانیوال سے محمد صفدر معاویہ کی دعا "جولائی 2016ء کا جاسوسی 2 جولائی کو مسرور بیس کراچی میں ملا۔ خدا کا شکر ہے کہ بادل برس گئے اور کراچی (کا موسم) ٹھنڈا ہو گیا اس لیے ہم نے اپنی قیمتی عید اہلِ کراچی کے نام کر دی اور ادھر ہی منانے کا فیصلہ کیا۔ سرورق کی بہت ہی پیاری دوشیزہ جس کی آنکھ کے کیا کہنے داد دینی پڑے گی انکل کو، بہت خوب صورت بنایا ہے ماڈل کو ایسے لگ رہا ہے جیسے بہار آئی ہوئی ہو، پر پیچھے دو خمونوں کی وجہ سے بھی اچھا سجا ہے۔ ساتھ چھوٹی سی عید مبارک، خیر مبارک جی آپ کو بھی۔ آپ کے اداریے تک پہنچے۔ حالات واقعی اس موڑ تک پہنچ گئے جہاں کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ مغرب کی تہذیب نے والدین کی عزت، بھائی سے بھائی بہن کی محبت اور باقی رشتوں کا تقدس چھین لیا، وہیں دولت کے لالچ نے سب کو اندھا کر دیا جس ملک میں قانون کا فیصلہ کرنے والے محفوظ نہ ہوں تو عام آدمی کی کیا اوقات۔ امجد فرید صابری کو اللہ جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے، بہت عمدہ انسان تھے۔ ساری دنیا میں پاکستان سے امن اور پیار کا درس پہنچایا۔ اپنی محفل میں آئے ذاکم علی خان گورچانی کو پایا۔ تبصرہ مختصر مگر اچھا رہا، مبارک ہو جی۔ نعمان دانش کی پھرتیاں بھی اچھی لگیں۔ سید شکیل حسین کاظمی کا طنز و مزاح سے بھرپور تبصرہ اچھا لگا۔ ادریس کی تبصرہ نگاری اچھی رہی۔ قیصر بھائی جی آیاں نوں خوش آمدید و یلکم بیک سراکھیں تے آپ کی محبت ہے کہ آپ نے محفل میں انٹری دی۔ اب آتے رہیے گا۔ مجھے اب مظہر سلیم، اعجاز راحیل اور شوکت شہر یار کا انتظار ہے۔ انصاری بھائی کا تبصرہ اور معراج محبوب عباسی کا خبرنامہ بھی پسند آیا۔ اسرار بشیر ساقی بہت شکریہ، اللہ پاک آپ تمام لوگوں کو قید سے رہائی عطا فرمائے۔ سجاد خان سچ کہا، زندگی ہنسی مذاق میں گزرنی چاہیے۔ مرحا گل بہنا آپ بہت عمدہ تبصرے کے ساتھ رونقِ محفل بنیں۔ آپ کے تبصرے میں کاشف زبیر صاحب کے ذکر پر دل آبدیدہ ہو گیا۔ زخم دوبارہ ہرے ہو گئے۔ ایسے انسان دنیا میں کم ملتے ہیں اور ایسے ہی انسانوں کی وجہ سے دنیا آباد رہتی ہے۔ باقی دوستوں کے تبصرے بھی اچھے رہے۔ کہانیوں کی شروعات اس دفعہ ایچ اقبال کی چہرہ در چہرہ سے کی۔ کیا تحریر اپنے قلم کی جکڑ میں لائے ہیں۔ انسان ایسا کہ بلند ہوا تو فرشتوں سے آگے کھڑا نظر آیا مگر اہی، لالچ، طمع میں پڑا تو شیطان کو بھی کراس کر گیا جیسا کہ طاہر سلمان نے اپنے

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

www.paksociety.com

سگے بھائی باقر سلمان اور اس کی بیوی کے ساتھ کیا۔ مصنف نے آئینہ دکھا دیا۔ انسانوں کو انسانوں کے روپ میں چھپے بھیڑیوں پرویز اور انسپکٹر سلیم کا کردار بہت عمدہ رہا۔ انگارے پر پہنچے تو انیق پہنچ گیا شاہی کے پاس تو باقی ساری قسط ریان فردوس کی حویلی پہنچنے اور فساد میں کھپ گئی، پتا بھی نہ چلا۔ مغل صاحب کمال کے ساتھ کردار ڈھالتے ہیں کہانی میں۔ آوارہ گرد کی جانب لپکے۔ یہ کیا، یہ تو دشمنوں کو ناکوں چنے چبوا رہا ہے شہزی پھنسا تو برے چکر میں ہے اوپر سے اکیلا، اگر اول خیر اور کپیل دادا ہوتے تو مزہ ہی آجاتا پر اب بھی اس کا خدا مددگار ہے۔ جمال دستی کی یاقوتی فتنہ تیس ملین ڈالر کے ہیروں کی کہانی بہت عمدہ...... نکلے جا کر کہاں سے پسٹل کے کلپ سے۔ سکندر عظیم کی انٹرویو مختصر مگر عمدہ...... کسی کے انٹرویو کو آخری بنانے کے لیے اسے موت کی نیند سلا دیا۔ سیر ینا راض کے قلم سے معصوم لڑکی آئی۔ جینا واقعی ایک معصوم لڑکی تھی لیکن کہانی شروع میں مظلوم بھی لگی لیکن آخر میں تو ہاتھ کر گئی۔ دو بندے پھڑکا کے جارج کو بھی نہیں چھوڑا۔ عکس فاطمہ چال پہ چال لے کر آئیں۔ بہت عمدہ تحریر، کافی انٹرسٹنگ رہی۔ جیمز فرالے کے ساتھ چور کو پڑ گئے مور اور بعد میں دھوبی کا کتا نہ گھر کا نہ گھاٹ کا والی مثال بالکل فٹ آتی ہے۔ تنویر ریاض کی قاتل کی تلاش بھی بہتر تھی بس پتا نہیں چلتا تھا کہ کب ایک موضوع سے دوسرے موضوع اور ایک سے دوسری جگہ پہنچ گئے ہیں۔ سلیم انور کی پلان اچھی رہی۔ واقعی کبھی کبھی پلان اپنے گلے میں فٹ ہو جاتے ہیں۔ بابر نعیم کے قلم سے بلاعنوان بہت اچھی رہی۔ وہیں پر منظر امام صاحب میراث کی صورت میں بہت اچھی تحریر قلم کی زد میں لائے۔ سلیم فاروقی فتنۂ دلگیر کی صورت میں بہت ہی اچھی اور بہترین تحریر لائے۔ فہد نے دولت کے لیے بہت گھٹیا حرکت کی اپنی محبت کو بھینٹ چڑھا دیا۔ لوگ تو محبت کی خاطر جان تک دے دیتے ہیں پر فہد کے پلٹ آنے پر مجھے بہت خوشی ہوئی بابر جس پر گمان ہی نہیں کیا جا سکتا ہے، وہ اس طرح کر سکتا ہے۔ مختار آزاد قاتل مقتول لے کر آئے۔ آج کے معاشرے میں جو کچھ ہو رہا ہے، حقیقت کو عیاں کرتی بہترین تحریر۔ سیٹھ نعمان چائے والا یا عبدالقادر ہی نہیں پتا نہیں اس جیسے کتنے بھیڑیے ہیں جن کی وجہ سے غریب اور کمزور کی بہن بیٹی کی عزت محفوظ نہیں اور نورین عرف نوری جیسے کردار پیدا ہوتے ہیں اللہ ہم کو سب کو اپنے حفظ و امان میں رکھے، آمین۔"

لودھراں سے محمد انعام کا شکوہ "تین چار ماہ غیر حاضر رہا کسی نے بھی نوٹس نہیں لیا۔ (نہیں، نہیں کئی اخبارات میں تلاش گمشدہ کا اشتہار دیا تھا) نہ ہی کسی نے یاد کیا۔ لوگ مرے ہوئے انسان کو جلد بھول جاتے ہیں لیکن میں تو زندہ ہوں۔ زندہ ہونے کے باوجود جلد بھول گئے چلو خیر۔ اس دفعہ کالج کی چھٹیاں جاسوسی کے ساتھ انجوائے کر رہا ہوں۔ سرورق میں ہیرو گولی کھا کر دوسری گولی سے بچتے ہوئے، حسینہ ٹائپ عورت خیالی پلاؤ پکاتے ہوئے سوچوں میں گم نظر آئی۔ اداریہ پاکستان کے ناقص حالات پر روتا نظر آیا۔ مہنگائی، بدامنی، قتل و غارت وغیرہ روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ اس دفعہ ذاکم علی سب پر بازی لے گئے۔ صاحب کو تعلیم مکمل کرنے کے بعد جاسوسی کا کچھ خیال آیا۔ نعمان دانش دوستوں کے تبصروں کا جائزہ لے کر ان کو مشورے دیتے نظر آئے۔ شکیل صاحب کو اتیس سال کے ہونے پر مبارک باد پیش کرتے ہوئے یہ نصیحت کرتے ہیں کہ دوستوں کو بھی یاد رکھا کرو۔ معراج محبوب عباسی صحافت میں نئے داخل ہوئے ہو اس لیے ہر چیز کو خبریں بنا کے پیش کر رہے ہو۔ ملتان سے شیخ وقار وضاحتی تبصرہ کرتے ہوئے۔ شفقت محمود یہ آپ کے شہر کے حالات نہیں پورے پاکستان کے حالات ناقص ہیں۔ ساری جگہ یہی حال جا بجا کوڑا کرکٹ کھلے ہوئے گٹر جس کی وجہ سے عید والے دن بچہ گٹر میں گر کر جاں بحق ہو گیا پھر بھی کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔ باقی دوستوں محمد سرفراز، مرحا گل، طاہرہ گلزار کے تبصرے بھی شاندار تھے۔ سب سے پہلے انگارے پڑھی، پڑھ کر مزہ آیا۔ شاہ زیب، ریان فردوس کے پاس تحفہ لے کر قیمت تو نہ وصول کر سکے البتہ ریان کے دشمنوں سے ٹکرا کر ان کے دانت کھٹے کر دیے۔ سجاول اور شاہ زیب نے دونوں کو چھڑوانے کے لیے جو چال چلی ناکام ہو گئی پھر بھی لگتا ہے کہ شاہ زیب ہی اس مسئلے کو حل کرے گا۔ آوارہ گرد تیزی سے جاری ہے۔ حویلی سے نکل کر مصیبت میں پھنستے نظر آرہے ہیں۔ مہارانی صاحبہ علاج کے طور پر خون استعمال کرنے سے آدم خور بن بیٹھی۔ اگر شہزی نہ آتا تو یہ راز نہ کھلتا نہ جونکی بابا مرتا۔ فتنۂ دلگیر دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ سبق آموز بھی تھی۔ فہد نے دولت کے حصول کے لیے اپنی محبت کی پروا تک نہ کی لیکن اس کی بے وفائی نے دولت سے ہی اس کا دل اچاٹ کر دیا۔ بابر اپنے انجام کو پہنچا۔ دل سے توبہ کرنے اور انسانوں کی خدمت سے فہد کو اس کی محبت دولت کے ساتھ ہی مل گئی۔ دوسری کہانی کا ماخذ بنیادی ضروریات اور بے روزگاری سے تنگ آکر برائی کا راستہ چن لیا لیکن ہوس کے مارے لوگوں کو دوائی کے ذریعے مارتے ہوئے اور ان کی دولت پر ہاتھ صاف کیا۔ لیکن آخر میں شاید سچی محبت مل جانے سے توبہ کر لی تھی۔ کامران کے ساتھ کولڈ ڈرنک کی وجہ سے پکڑی گئی۔ آخر میں شکاری نے خود اپنے آپ کو شکار کر کے ختم کر ڈالا۔ چہرہ در چہرہ میں دولت کے حصول کے لیے اپنے سگے بھائی کو مار ڈالا۔ باقر سلمان اور اس کا ساتھ دینے والے اپنے انجام تک پہنچ گئے۔ چال پہ چال میں دولت ہاتھ آنے کے باوجود ہاتھ سے نکل گئی۔ منیجر کے عہدے کو ٹھکرانا خود پر کلہاڑی کا وار ثابت ہوا۔ باقی چھوٹی کہانیاں کچھ خاص نہ تھیں۔ امید ہے شرفِ قبولیت بخشیں گے تین ماہ پہلے میں نے کچھ لطیفے بھیجے تھے لیکن آپ نے شائع نہیں کیے اس کی وجہ بیان کر سکتے ہیں۔" (جی...... غیر معیاری)

کورنگی کراچی سے محمد خواجہ کا لمحۂ فکریہ "جولائی کا شمارہ بروقت موصول ہوا۔ سرورق سادہ لیکن بہت کچھ کہہ رہا ہے۔ ایک شخص گولی کھا کر تکلیف میں اور شاید گولی مارنے والا مسکرا رہا ہے کامیاب نشانہ لگنے پر ایک حیرت زدہ حسینہ۔ مدیر اعلیٰ کی چھبتی نکتہ چینی موجودہ حالات اور واقعات کی بالکل صحیح عکاسی کی گئی ہے۔ اس وقت عدم برداشت انتہا کو پہنچ چکا ہے۔ شرفا دیواروں کے پیچھے چھپ گئے ہیں اور پھر بھی اپنے کو غیر محفوظ سمجھتے ہیں۔ یہ اسلامی جمہوریہ پاکستان میں اور پاکستان سے باہر مسلمان اپنے اعمال سے اسلام جیسے امن پسند مذہب کی نفی کر رہے ہیں۔ اپنے غصے اور دلی عداوت کی پیاس مسلمانوں کے خون سے بجھا رہے ہیں۔ اسلام دشمن لابی کے مقاصد ہم اپنے ہاتھوں پورے کر رہے ہیں۔ ہمارے ملک کی نسل جس نے آگے اپنے ملک کو چلانا ہے۔ تعلیم و تربیت سے بے بہرہ ہو رہے ہیں۔ درس گاہوں کی دو طرفہ تقسیم، اردو سے دوری اور انگریز محترم اور مقتدر۔ درمیانہ طبقہ نہ اردو میں پورا کامل نہ انگریزی میں۔ آپ کا ادارہ سسپنس، جاسوسی اور سرگزشت وغیرہ سے اردو ادب کی جو خدمت انجام دے رہا ہے، وہ قابلِ تحسین ہے۔ اس وقت

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

www.paksociety.com

جوڈپریشن، ٹینشن اور بے کلی کی زندگی ہے۔ یہ ڈائجسٹ اس کو بہت حد تک کم کر دیتے ہیں، میں خود اب ریٹائرمنٹ کی زندگی گزار رہا ہوں۔ پہلے بے پناہ مصروفیت میں ڈائجسٹ پڑھنے کا وقت ہی نہیں تھا۔ اب فرصت ہے، آپ کے تینوں ڈائجسٹ چاٹ جاتا ہوں۔ یقیناً اس سے بہترین وقت گزرتا ہے۔ عید پر ماں باپ نے اپنے تمام بچوں کو مصنوعی ہتھیار خرید کر دیے۔ سنا تھا کہ پابندی ہے مگر کھلے عام چھرے والی پستول، کلاشنکوف اور جدید ہتھیاروں کی نقل ہر بچے کے ہاتھ میں دیکھی جو ایک دوسرے پر چھروں کی بارش کر رہے تھے، جس کی وجہ سے بہت کوفت اور مالی نقصان بھی ہوا۔ یہ آئندہ کے مجرموں کی ایک نسل دہشت گردی کی تربیت لے رہے ہیں۔ خدارا ان کو روکنے کی کوئی تدبیر کریں اور تعلیمی سرگرمیوں کی طرف ان کا رخ موڑیں۔ دوستوں کی خطوط کی محفل کا بھی اپنا ایک مزہ ہے۔ کھٹی میٹھی باتیں، عمدہ تبصرے اور شکایتیں۔ جیل سے خطوط لکھنے والے دوستوں کی اللہ مشکل آسان کرے اور معافی دے۔ معراج محبوب، مرحا گل، طاہرہ گلزار، ادریس احمد خان کے تبصرے خصوصی طور پر اچھے لگے۔ چہرہ در چہرہ، ایچ اقبال کی اس شمارے کی پہلی ہی کہانی بہت عمدہ اور دلچسپ لگی۔ کہانی طویل اور جدوجہد سے بھرپور تھی۔ اتنی دلچسپ تحریر ہے کہ اس کی طوالت بھی مزے دار لگی۔ دولت کی ہوس، جرائم کی دنیا میں لے جاتی ہے اور صرف بربادی اور موت کا پیغام لے کر آتی ہے۔ یہ کہانی نصیحت آمیز بھی ہے۔ انگارے کی یہ قسط بھی حسبِ معمول بہت دلچسپ رہی۔ طاہر جاوید مغل کے قلم میں بے پناہ طاقت ہے۔ مجرموں، گینگسٹروں، طاقتور درندوں، ظالم زمیندار، رشوت خور اور آدم خور عہدیداروں کا ایک جال جس میں پھنسا ایک عظیم لڑاکا شخص کی جدوجہد۔ ہر قدم پر موت اور خون کے پیاسے افراد سے ٹکراؤ۔ ایک ایسا ہیرو جو سب سے ٹکرانے پر تیار، کہیں وہ 007 کا جاسوس، کہیں پہلوان، کہیں محبوب، قدم قدم سنسنی موڑ نے اس کہانی کو اتنا جاندار بنا دیا ہے اور مصنف کا ایسا عمدہ طرزِ تحریر کے منظر کی تبدیلی کو ایسا اچانک اور چابکدستی سے موڑ دینا، آفرین۔ آوارہ گرد، دوسری قسط وار کہانی۔ یہ بھی ایک پُرعزم اور ہمت والے شخص کے کردار کو زندہ جاوید بنا دیا ہے۔ شہزاد احمد خان، مجرموں سے جرائم پیشہ گینگ ہندوستان کے اور یہودیوں کی مسلم کش تنظیموں سے نبرد آزما دکھائی دیتے ہیں۔ کہیں فولاد کی طرح مضبوط، کہیں دل کے نرم گوشہ کے درد سے آنسو بہانے والا۔ اتنے موڑ، اتنے مظالم اور محرومیوں کے ساتھ پنجہ لڑانا، اس کہانی کو اتنا دلچسپ بناتا ہے کہ پڑھنے والا دنیا سے بے خبر ہو کر پڑھتا ہی جاتا ہے۔ کہیں رکنے کو دل نہیں چاہتا۔ مصنف کو خراجِ تحسین۔ یاقوتی فتنہ اور انٹرویو، یہ دونوں کہانیاں کوئی بہت جاندار نہیں تھیں۔ معصوم لڑکی، چال پہ چال، قاتل کی تلاش، اچھی کہانیاں تھیں۔ نصیحت آمیز، بددیانتی اور اس کے نتائج، مجرموں کی تلاش، ذہانت کی جنگ، یہ سب کچھ ان کہانیوں میں نظر آیا۔ پلان، دولت کی ہوس کی ایک اور کہانی۔ انشورنس کی رقم کے لیے بیوی اور گھر جلا ڈالا۔ ہر طرح سے بے داغ پلان، لیکن قدرت نے سارے پلان پر پانی پھیر دیا۔ ایک موبائل فون جیسی معمولی چیز نے سارا پلان خاک میں ملا دیا۔ ایک چونکا دینے والی کہانی۔ بلا عنوان، ایک پڑوسی کا حسد اور بدنیت رویہ جو ایک بوڑھی عورت کے سرمایۂ حیات کو چرا کر اس کا قتل بھی کر دیتا ہے لیکن ایک ذہین سراغ رساں کی باریک بینی فوراً مجرم کو اس کے بیان کی روشنی میں پکڑ لینا ایک اچھی اور بھنے والی کہانی۔ میراث، منظر امام کی شاہکار داستان، بہت ہی منفرد اور اچھوتا شاہکار۔ عام روش کی کہانیوں سے بالکل ہٹ کر۔ چھوٹی سی کہانی۔ ایک شرارت سوچی سمجھی سازش ایک نفسیاتی شخصیت کے ساتھ لیکن انجام ایسا حیرت انگیز جو اس شرارت سے ایک شخص کا نفسیاتی علاج بن گیا اور زندگی بھر کی کوفت اور نفرت کو محبت میں تبدیل کر دینے والی ایک عجیب داستان۔ فتنہ دلگیر، ایک دلکش کہانی۔ دولت کی ہوس ایک کے بعد ایک مجرم منظرِ عام پر آتا گیا۔ کہانی کے انجام تک بہت سسپنس۔ ایک مجرم سدھر جاتا ہے اور منزل پالیتا ہے۔ ایک ہمدرد بننے والا مجرم نکلتا ہے اور سزا پاتا ہے۔ کہانی کا تسلسل اور تحمیل بہت عمدہ۔ قاتل مقتول، ایک انتہائی مجبور اور بے کس لڑکی کی داستان جس کی ہزار کوششوں سے بھی عزت کی روٹی نہیں مل سکتی۔ ہمارے معاشرے کے درندوں اور مکروہ لوگ جن کو دو ذہین لڑکیوں کی منصوبہ بندی نے معاشرے کی صفائی انتہائی چالاکی سے کی۔ ایک لڑکی کو اس کے لیے اپنی عزت اور عصمت کا جنازہ نکالنا پڑتا ہے۔ اس کو مجرم کے بجائے اعزاز ملنا چاہیے تھا مگر آخر وہ سزا سے بچنے اور بہت سوں کی عزت کا جنازہ نکلنے کے بجائے موت کو گلے لگا لیتی ہے۔ معاشرے کے چہرے پر ایک زبردست طمانچہ، ایک لرزہ دینے والی کہانی۔''

لاہور سے عبدالجبار رومی انصاری کی کتھا نگاری ''خدمتِ خلق کو جس نے شعار بنایا، ہر جا انسانیت کو فیض پہنچایا، بابائے خدمت مولانا عبدالستار ایدھی اپنے مشن کی عظیم شمع جلا کر اس جہاں سے رخصت ہو گئے۔ پورے قومی اعزاز کے ساتھ اور انیس توپوں کی سلامی دے کر ان کا جسدِ خاکی اٹھایا گیا تو اس عظیم شخصیت فخرِ پاکستان کے لیے ہر آنکھ اشکبار تھی جو جاتے جاتے بھی اپنی روشنی دے گیا ہے۔ کوئی اس جیسا عظیم شخص یقیناً نہیں۔ ان کا خلا کبھی پورا نہیں ہو سکتا۔ ٹائٹل میں پھیکی مردانہ مسکراہٹ نے مطلب تو نکال لیا لیکن جب دوشیزہ اپنے آپ پر اتر آئی اور عورت ذات کا اصل روپ سامنے آیا تو مرد نے ہاتھ کھڑے کر دیے کہ بس...... تم جیتیں میں ہارا اب اور نہیں۔ اور بسا اوقات ہوس پرست مرد بھی لڑکیوں کی مجبوری سے فائدہ اٹھا جاتے ہیں اور اگر سامنے سے نوری اور نجمہ جیسی لڑکی سے واسطہ پڑے تو پھر موت سے ہی ہمکنار ہونا پڑے۔ ایک طرف غربت تو دوسری طرف جسم کے بھوکے مردوں سے واسطہ۔ مجبوراً نوری گناہوں کی دلدل میں اُتر گئی اور جب پولیس کے ہتھے چڑھی تو اپنی ہی زندگی کا خاتمہ کر لیا۔ نکتہ چینی اداریہ ملکی حالات پر رواں تھا۔ حالات کچھ ایک جیسے رہتے ہیں تو کوئی ایسا واقعہ ہو جاتا ہے جو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا۔ ذاکم علی گور چانی کا پریم پتر مختصر اور بہت اچھا لگا۔ نعمان دانش بھی اچھی باتوں سے دوسرا نمبر لے گئے۔ سید شکیل حسین کا طاہرہ گلزار کے بارے میں تبصرہ؟ خیر تو ہے نا یہ سب کیا ہے؟ معراج محبوب عباسی کا بلیٹن تو بریکنگ نیوز ہی تھا زبردست۔ مرحا گل کا بھرپور تبصرہ عمدہ رہا۔ احسان سحر بھی لگتا ہے چھٹیوں میں آرام کے متمنی ہیں، چوہدری محمد سرفراز کی حاضری بھی اچھی لگی۔ شفقت محمود کی کھری کھری باتوں نے بھی بہت محظوظ کیا۔ باقی طاہرہ گلزار، اسرار بشیر، ادریس احمد خان اور سجاد خان نے بھی بہت اچھی تبصرہ نگاری کی ہے۔ سجاول کی معیت میں شاہ زیب اور انیق وردل پہنچ کر ایک نئی صورتِ حال سے دوچار ہو گئے ہیں اور وہیں داراب فیملی ممبر شکیل بھی نظر آ گیا ہے۔ ویسے ایک بات ہے شاہ زیب جہاں بھی گیا وہیں اسے داراب فیملی کے تانے بانے مل جاتے ہیں۔ باقی پاراہاؤس کے دشمنوں سے

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

سجاول اور شاہ زیب کی فائٹنگ زبردست رہی۔ آوارہ گردی میں شہزی اور سوشیلا بھی ایک افتاد سے نکل کر دوسری میں پھنس جاتے ہیں اور نکلتے ہیں تو اور بھی سنسنی خیز اور دلچسپ صورتِ حال ہوتی ہے اب گن پوائنٹ پر سوشیلا ہے۔ بدلتے سین کے لیے اگلی قسط کا انتظار ہے، چہرہ در چہرہ بھی عجیب ہی کہانی تھی۔ ایک طرف لالچی اور قاتل سلمان طاہر اور اس کی بیوی تھی اور دوسری طرف شیبا اور اس کے بھائی نے بلیک میلنگ شروع کر رکھی تھی۔ انسپکٹر سلیم اور پرویز کی تفتیش بھی رنگ لائی اور سب مجرم ذہن سلاخوں کے پیچھے پہنچ گئے۔ ثاقب نے روحی کے ساتھ خود کو سنبھال لیا تو پرویز کو شیبا کی صورت ہمسفر مل گیا۔ اف بلاعنوان میں اتنا مشکل نام ڈیکلیو ڈینی ڈیٹن۔ مختصر کہانی اچھی رہی۔ منظر امام کی کوئی بھی کہانی جھنجوڑنے کے لیے کافی ہے جیسے کہ میراث، محبت ایسا دریا ہے کہ بارش روٹھ بھی جائے تو پانی کم نہیں ہوتا۔ اسی محبت نے حکیم صاحب کی بھی آنکھیں کھول دیں اور پھر سکون سے بند بھی ہو گئیں۔ مجرم جتنا بھی شاطر ہو، کہیں نہ کہیں غلطی کر ہی جاتا ہے جیسے نکی کی لاش کے ساتھ سیل فون کی بیپ نے گوڈویل کا سارا پلان چوپٹ کر دیا۔ لیکن ہمت پھر بھی نہیں ہاری۔ اب جیل سے فرار کے لیے پلان...... میں دنیا کو اپنی انگلیوں پر نچاتی ہوں۔ معصوم لڑکی تو بہت زیادہ ہوشیار نکلی۔ مسٹر پرفیکٹ فہد رخصت پر اکیلے نہیں جائیں گے بلکہ نادیہ بھی ان کے ساتھ جائے گی۔ فتنۂ دلگیر میں فہد نے اپنی محنت اور جاں نثاری کی ایک مثال قائم کی تھی۔ سو اسے اس کا ثمر تو ملنا ہی تھا۔ دوسری طرف مکار بابر کو بھی جیل کی ہوا کھانا پڑی اور مجرم کا ٹھکانا بھی یہی ہے۔ سرورق کا پہلا رنگ بھی بہت اچھا رہا۔ مجموعی طور پر کہانی نے مزہ دیا، ویلڈن۔“

کراچی سے رضوان تنولی کریڑوی کی خوش بختی ”عید کی پُرکیف ساعتوں میں ساون رُت کی رس بھری، رنگ بھری رم جھم برستی پھوار نے خوابیدہ یادوں کے دریچے وا کیے تو صفحۂ قرطاس نے سینہ حاضر کیا پھر چاہت کی روشنائی سے قلم کو سخن کی جرأت نصیب ہوئی۔ سرورق کی نصف رخی مطربہ کلی گلاباں کے ادھ کھلے لب، کجراری نین کو حسِ لطیف کے فریفتہ خیالوں نے مستی میں چوما، پشت پہ گولی کا تمغہ سجائے، ڈنو تنگ سے دانت چمکائے سرورق صنف کرخت نے رنگ میں بھنگ ڈالا۔ زیرو بٹا زیرو سخن شناسی کے دعویدار شکیل سلفچی چھوڑ کے طبلہ بجایئے تاک، دنا دھن، تاک...... نرم خو، مُرتیاک بلقیس خان آپ کی خواہش پہ محفل ست رنگ میں حاضر کستوری لگا کے...... تیسرے نمبر پر فائز ہمکتے، پھڑکتے اسلام آبادی کی اناپ شناپ سر پر سے گزر گئی۔ لالا قیصر اقبال حسن اور ناز کی لازم و ملزوم ہم تو سرورق کی حسینہ کے درشن کر کے شفا پاتے ہیں۔ ساحرانہ شخصیت کے پیکر احسان سحر نے فیس بکی سازشیوں پر ہاتھ رکھ کر محفل میں کھلبلی مچا دی ہے۔ مرحا گل کا گل رنگ تبصرہ آنکھوں کو تراوٹ دے گیا۔ ماشاء اللہ ڈے پاجی اتنے گیانی دھیانی ہو گئے کہ سونگھ کر بتا دیتے ہیں تبصرہ میل ہے، بی میل یا ای میل۔ چوہدری محمد سرفراز دبنگ انداز میں چھا گئے کستوری لگا کے۔ طاہرہ گلزار کے تبصرے کی تعریف کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف۔ غلام یاسین نوناری، چوہدری عاصم، عمران جونانی، قاسم رحمان، رانا حبیب الرحمان، یوسف سانول کی کمی محسوس ہوئی۔ نعمان دانش، ادریس احمد خان، عبدالجبار رومی، معراج محبوب عباسی، شیخ وقار، بشیر ساقی، سجاد خان، شفقت محمود عمدہ تبصرہ نگاری کے ساتھ نمایاں رہے۔ انگارے کی خاطر جب جاسوسی سے ٹوٹا بندھن جوڑا تب وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ طاہرہ گلزار کی فرمائش پر مغل اعظم رضوان ٹی (تنولی) کا کردار دے کر انگارے کو میرے لیے یادگار بنا کے سرپرائز دیں گے۔ (جاسوسی، طاہرہ گلزار، مغل اعظم شکریہ)۔ مشفق و مہربان، عاجزی انکساری کے پیکر ہر دلعزیز مصنف ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کے بے مثال قلم کی شاہکار تحریر آوارہ گرد شاندار اٹھان کے ساتھ نکھر کے جوبن پر آ چکی کستوری لگا کے۔ لکھاری وہ جس کے قلم کا جادو قاری کے سر چڑھ کے بولے۔ ابتدائی صفحات پر جادو جگاتی تحریر ایچ اقبال کی چہرہ در چہرہ، انسانی رویوں کی عکاس کہانی۔ کچھ لوگ دولت کے لالچ میں خونی رشتوں کو بھی پامال کر دیتے ہیں جیسے طاہر سلمان اور اس کی بیوی نے کیا جبکہ پرویز جیسے ہمدرد مخلص بھی موجود ایسے لوگوں کے دم سے دنیا قائم ہے کستوری لگا کے...... ان تین تحاریر کے ساتھ جاسوسی اختتام پذیر ہوا...... وقت کی قلت کے باعث میں صرف قسط وار اور ابتدائی تحریر تک محدود ہوں۔ امید ہے مجبوری درگزر کی جائے گی۔“

اسلام آباد سے سید شکیل حسین کاظمی کا عذر ”سرورق اس دفعہ مناسب تھا اس لیے اس پر فی الحال اتنا تبصرہ ہی مناسب ہے۔ چینی نکتہ چینی میں کافی عرصے بعد واپس آنے والے ذاکم علی خان کو خوش آمدید۔ تاریخی حقیقت نگاری لکھنے پر ایڈیٹر کو ڈھیروں داد۔ نعمان دانش صاحب کو نادرا سے ملاقات کا شرف حاصل ہونے پر مبارکباد۔ معراج محبوب عباسی، قیصر اقبال گچھ اور عبدالجبار رومی کے تبصرے بھی انتہائی مناسب تھے۔ شیخ وقار احمد کا تبصرہ کافی جامع تھا جبکہ محمد صفدر معاویہ نے بھی عمدہ تبصرہ نگاری کی۔ مرحا گل کے تبصرے میں ”جی بالکل، بہت محبت ہے“ کے جملے کا سر پیر سمجھ نہیں آیا۔ کھیوڑہ سے شفقت محمود ملکی حالات اور سیاست کا نوحہ پڑھتے دکھائی دیے۔ میں ادارے سے امید کرتا ہوں کہ وہ طاہرہ گلزار آنٹی کے تمام تبصرے اب کتابی شکل میں شائع کروا دیں تو مہربانی ہوگی۔ پندرہ بیس جلدیں بھی بن جائیں گی اور ادب کی خدمت بھی ہو جائے گی۔ شگفتہ کو بھی اس بہانے کوئی نئی مصروفیت مل جائے گی۔ کہانیوں کی بات ویسے کرنی تو نہیں چاہیے مجھے۔ کیونکہ پڑھی ہی صرف تین کہانیاں ہیں۔ دو قسط وار اور ایک ایچ اقبال کی ابتدائی صفحات پر۔ مگر اب جب پڑھ ہی لیں تو تبصرہ کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ ابتدائی صفحات کی کہانی چہرہ در چہرہ ایچ اقبال صاحب کی ایک عمدہ کاوش تھی۔ پرویز کا کردار تھوڑا غیر حقیقی محسوس ہوا مگر ابتدائی تاثر جو اس کا پیدا ہوا تھا، وہ درمیان میں ہی مکمل زائل ہو گیا۔ ایک مثبت اور جاندار کردار۔ انسپکٹر سلیم کا کردار بھی اچھا اور جاندار تھا۔ روحی کو ثاقب کی حقیقت اور پرویز کی قربانی کا علم ہو جاتا تو مزہ دوبالا ہو جاتا۔ باقی روحی کے والدین کا قتل اور اس کی تفتیش نے کافی محظوظ کیا۔ آخر تک تجسس قائم رہا۔ انگارے میں شاہ زیب اور انیق کا ساتھ۔ پھر سجاول جیسے ڈکیت کے ساتھ عزت مآب کے خاندان کا دفاع...... کافی مناسب قسط تھی اور ایکشن سے بھرپور۔ انیق کو ہم تاوان کے زرین گل کا اردو ایڈیشن سمجھنے میں حق بجانب ہیں۔ فلموں اور گانوں کا حوالہ دینا حالات کے مطابق۔ یہ زریں گل کا خاصہ تھا۔ شکیل داراب سے شاہ زیب کا سامنا ہونے کی بھرپور توقع ہے اور اس کا متوقع ردِعمل دیکھنے کی آرزو بھی۔ آوارہ گرد میں بھٹی صاحب نے شاہ زیب کو نئی پریشانی میں ڈال دیا ہے۔ عابدہ کے متعلق جان کر شہزاد کی پریشانی میں یقیناً اضافہ ہوا اور ہو سکتا ہے اس کی کارکردگی میں فرق پڑ جائے۔ شگفتہ کہتی ہے کہ وہ شدت سے شہزاد احمد کے امریکا جانے کی منتظر ہے کہ وہ باسکل ہولارڈ اور لولوش سے دو دو ہاتھ کرے جلد از جلد۔ باقی میرا

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 | PAKSOCIETY

www.paksociety.com

خیال ہے اس ماہ کے لیے اتنا ہی کافی ہے، فرق نہ ہوا تو اگلے ماہ مزید خوراک دی جائے گی۔'' (شکریہ...... مہربانی)

سدھلیانوالی سے علی رحمان کی واپسی ''آج ایک سال کے بعد محفل میں حاضری دے رہا ہوں۔ اس کی وجہ دادا ابو اور کزن کا انتقال تھا۔ امید ہے خوش آمدید کہا جائے گا۔ (یقیناً) جاسوسی کے ساتھ میرا تعلق 4 چار پرانا ہے۔ آج بھی وہی جوش ہے جو چار سال پہلے تھا۔ جولائی 2016ء کا شمارہ 7 کو ملا۔ سرورق نہایت عمدہ اور ذاکر انکل کی محنت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ لڑکی سائڈ پوز سے اپنے چہرے کو نمایاں کر رہی تھی۔ اس کے بعد خطوں کی محفل کی طرف بڑھے تو راجن پور سے ذاکم علی خان کرسی اول ... پر براجمان تھے۔ یہ نہایت اچھا تبصرہ تھا۔ نعمان دانش کی دانش مندانہ باتوں نے کافی متاثر کیا۔ دل کیا خود بابا بن جاؤں ہاہاہا۔ سید شکیل کاظمی آپ کو اپنی سالگرہ مبارک ہو۔ اس کے علاوہ شگفتہ باجی وغیرہ کی باتوں میں نہ آئیں۔ آپ باقاعدگی سے حاضری دیں کیونکہ آپ کا تبصرہ نہایت جاندار ہوتا ہے۔ ادریس احمد خان، میں آپ کی بات سے متفق ہوں کہ حرص و ہوس میں انسان کو رشتے نظر نہیں آتے۔ سجاد احمد خان آپ خط کی کامیاب کوشش کریں ناکام نہیں۔ اللہ آپ کو جلد از جلد رہائی دے۔ مرحا گل آپ کا تبصرہ نہایت جاندار اور دل کو موہ لینے والا تھا۔ پشاور سے طاہرہ گلزار آنٹی نہایت طویل تبصرہ لے کر حاضر تھیں۔ اور بات بات پر ہنس رہی تھیں۔ خیر نہایت ہی اچھا تبصرہ تھا مبارکاں۔ 7 پلیئر باہر تھے گراؤنڈ سے۔ اب آتے ہیں طاہر جاوید مغل کی انگارے کی طرف جو نہایت تیز تھی کہانی کا ٹیمپو نہایت تیز تھا۔ اس کے علاوہ ہماری دل کی دھڑکن بھی۔ یہ قسط مار دھاڑ سے بھرپور تھی۔ انیق کا شاہ زیب کو ملنا بالکل ایسا لگا جیسے تاوان میں زریں گل استاد جہانی کو ملا تھا۔ سجاول وغیرہ کا سفر کرنا اچھا محسوس ہوا جیسے ہم خود سفر کر رہے ہوں۔ وڈے صاحب کی معلومات اور اس کا کردار اچھا لگا۔ جاناں کو دیکھ کر سروج عرف ارجمند بانو کی یاد آگئی۔ کمانڈر خالد شاہ کے قتل ہونے کا افسوس ہوا۔ لیکن اس کے ساتھ سجاول اور شاہی کی لڑائی پسند آئی۔ سجاول کو دیکھ کر شنکر بھارتی کی یاد آگئی۔ سچی بات ہے کہ شنکر شکرا جیسا ولن دوبارہ طاہر انکل پیدا نہیں کر سکے۔ خیر مبارک ہو ایسی خوب صورت قسط لکھنے پر۔ میں نے تاوان پڑھی نہایت جاندار تھی۔ انکل طاہر سے گزارش ہے کہ وہ اس کہانی کو لمبی کریں جیسی تاوان کو کیا تھا۔ اس کے بعد تیز رفتار کہانی آوارہ گرد پڑھی۔ نہایت پُراثر قلم تھا ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کا۔ مہارانی کا کردار خوفناک تھا۔ شکر ہے بچ گئے شہزی لوگ۔ عابدہ کا جیل میں جانا نہایت دکھ والی بات تھی اور کمینے چندر ناتھ اور کوہارا کا حملہ کر کے سوشیلا کو گن پوائنٹ پر لینا دکھ والی بات تھی۔ پہلا سرورق بکواس تو نہیں بس نارمل تھا۔ دوسرا انوری کا کردار نہایت دکھ والا تھا۔ پڑھ کر آنکھیں بھیگ گئیں۔''

کراچی سے محمد اقبال کا شکوہ ''جولائی کا جاسوسی حسب روایت خوب صورت ٹائٹل اور عمدہ کہانیوں سے مزین تھا اور عید سے پہلے ملنے کی خوشی کیا بیان کریں کہ اس کے سہارے عید کی چھٹیاں اچھی گزر گئیں اور ہم ڈائجسٹ کا مطالعہ جلد کرنے کے باعث اس امید پر خط لکھ رہے ہیں کہ وقت پر ادارے کو موصول ہو جائے گا، وقت کی کمی کے باعث خط لکھنے اور پوسٹ کرنے میں دیر ہو جاتی ہے جس کے باعث کبھی بلیک لسٹ میں جگہ ملتی ہے اور کبھی وہاں بھی جگہ بنانے میں کامیاب نہیں ہو پاتے۔ جس طرح پاکستان کی کرکٹ ٹیم اپنی کارکردگی میں تسلسل نہیں رکھتی اسی طرح ہم بھی وقت پر خط ارسال نہیں کر پاتے، لیکن اس کے باوجود محفل کے دوستوں سے شکوہ ہے کہ ہماری طویل غیر حاضری پر ایک، دو دوستوں کے علاوہ کسی نے یاد نہ کیا۔ بہرحال حالات کی ستم ظریفی ہے کہ ہماری طرح دوستوں کے پاس بھی ہمیں یاد کرنے کے لیے دو بول نہیں تھے۔ رسالہ ملنے کی جہاں خوشی انجوائے کی وہیں پاکستان کی بہت نامور اور قابلِ قدر شخصیت عبدالستار ایدھی کی وفات نے ہلا کر رکھ دیا۔ ان کی خدمات کو جتنا بھی سراہا جائے کم ہے، شروع سے لے کر زندگی کے آخری ایام تک ان کی زندگی غریبوں، اور حالات کے ستائے ہوئے انسانوں کے لیے جہدِ مسلسل رہی، اور انہوں نے انسانیت کی خدمت کرتے ہوئے اپنی زندگی گزار دی جبکہ پاکستان کی اعلیٰ قیادت نے ان سے کوئی سبق حاصل نہیں کیا۔ بس ان کے انتقال کے بعد قومی اعزاز کے ساتھ ان کی آخری رسومات ادا کر دی گئیں۔ کسی کو توفیق نہیں ہوئی کہ ان کے مشن کو آگے بڑھانے میں اپنا کردار ادا کرتے ہوئے ان کے ادارے کو مزید سہولیات دینے کا اعلان کرتے، انہیں اراضی دی جاتیں کہ ان کے لواحقین ان اراضی پر مزید سرد خانے بنواتے، اسپتال قائم کرتے یا جو ان کی ضروریات ہوتیں ویسے استعمال کرتے تو زیادہ بہتر ہوتا۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور جنت میں اعلیٰ درجات، ان کے لواحقین کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ ساتھ ہی امجد فرید صابری کے لیے بھی دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے، اور ان کے قاتلوں کو عبرتناک انجام تک پہنچائے جنہوں نے ایک نیک اور بے ضرر انسان کو یوں بے دردی سے مار دیا جو ساری دنیا میں پاکستان کا نام روشن کر رہا تھا۔ اپنی محفل میں پہنچے تو ذاکم گورچانی کو سرفہرست پایا، مبارک ہو جناب کو۔ مرحا گل کا طویل تبصرہ اچھا لگا، قیصر اقبال بھی طویل عرصے بعد نظر آئے، طاہرہ گلزار کا تبصرہ پسند آیا۔ نعمان دانش، سید شکیل حسین کاظمی، ادریس کی کاوشیں بھی اچھی لگیں۔ اس کے علاوہ کہانیوں میں میراث، فتنہ دلگیر اور قاتل مقتول اچھی کہانیاں تھیں۔ اپنی فیورٹ کہانی انگارے کی کیا بات کریں کہ ڈائجسٹ ملنے کے بعد صبر نہیں ہوتا کہ ایک ہی نشست میں سب سے پہلے اسی سے دو، دو ہاتھ کر لیے جائیں۔ کہانی کا ٹیمپو بہت جاندار، شاندار رہا، شاہ زیب اور سجاول کی لڑائی نے بھی خوب رنگ جمایا، شاہ زیب کو سیر اور سوا سیر کا مزہ آگیا لیکن وہ نفسیاتی طور پر سجاول پر حاوی ہو گیا جس کا فائدہ شاہ زیب آگے چل کر بھرپور طریقے سے اٹھائے گا۔ ساتھ ہی انیق کی لمبی غیر حاضری کے بعد شاہ زیب سے اس کا ملنا مزہ دے گیا۔ آئندہ قسط کا انتظار کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد عبدالرب بھٹی صاحب کی آوارہ گرد سے نبرد آزما ہوئے کیونکہ شہزی بھی دیارِ غیر میں اپنے دشمنوں چندر ناتھ اور کوہارا سے بھرپور طریقے سے نبرد آزما ہے اور دشمنوں کے دانت کھٹے کر رہا ہے۔ اس کے بعد ایچ اقبال کی چہرہ در چہرہ سے لطف اندوز ہوئے، عمدہ تحریر تھی۔ منظر امام صاحب کی میراث بہت اچھی تحریر تھی۔ سلیم فاروقی نے فتنہ دلگیر عمدہ انداز میں لکھی۔''

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شاملِ اشاعت نہ ہو سکے۔

کاشف عزیز، کوٹری۔ حرا مختار، لاہور۔ انصار احمد، کراچی۔ عائشہ۔ احیل، حیدرآباد۔ جنید خان، پشاور۔ سائرہ اسماعیل، کراچی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

www.paksociety.com

خطۂ زمین پر پاکستان کا قیام ایک اٹل حقیقت ہے... جسے بعض کینہ پرور دل سے قبول کرنے پر تیار نہیں... پاکستان اور ہمسایہ ملک بھارت کے درمیان آزادی سے اب تک شدید اختلافات رہے ہیں... سیاست... ادب اور فنون... روزمرہ زندگی... غرض کئی محاذوں پر کئی صورتوں میں تعمیر اور تخریب... انسان دوستی اور انسان دشمنی کی یہ چپقلش جاری ہے... ہماری اس کشمکش اور محاذآرائی سے وہی طاقتیں فائدہ اٹھاتی ہیں جو امنِ عالم اور انسانی برادری کی دوستی اور یگانگت کو پسند نہیں کرتیں... ہندوستان اور پاکستان کے درمیان روزِ اول سے کشیدگی اور تناؤ کی کیفیت برقرار ہے... جنگی جنون میں مبتلا بھارت کئی محاذوں پر شکست کھا چکا ہے... اور ہمیں زک پہنچا چکا ہے... افواجِ پاکستان کے جانبازوں کی ان تھک محنت... جرأت... شجاعت پر مربوط کہانی... دشمن کی سرحدوں میں داخل ہونے والے ایک فوجی جوان کی جدوجہد... وہ اپنی پاک سرزمین کو چھونا چاہتا تھا... اسے کسی طور جنگی قیدی بننا منظور نہ تھا...

ہر طرف بارود کی بُو پھیلی ہوئی تھی۔ فضا میں مارٹر گولوں کے دھماکے اور ایل ایم جی کی تڑتڑاہٹ گونج رہی تھی۔ فوجی لحاظ سے یہ بہت اہم پوسٹ تھی اور دشمن نے اپنی پوری ایک ڈویژن فوج وہاں جھونک دی تھی۔ دشمن کے ٹینک اندھیرے میں سیاہ ہاتھیوں کی طرح منڈلا رہے تھے لیکن پیش قدمی نہیں کر پا رہے تھے۔

ان کی راہ میں پاکستانی فوج کی صرف ایک کمپنی مزاحم تھی۔ وہ کمپنی دو حصوں میں بٹی ہوئی تھی۔ اس کے آدھے حصے کی کمان کیپٹن نصراللہ ملک کے ہاتھ میں تھی اور دوسرا دستہ سیکنڈ لیفٹیننٹ عامر کی کمان میں تھا۔

پاکستانی فوج کو اس لحاظ سے برتری حاصل تھی کہ وہ بلندی پر تھے۔ دشمن براہِ راست ان کے نشانے پر تھا اس لیے دشمن کی کوشش تھی کہ کسی بھی طریقے سے اس پوسٹ پر قبضہ کیا جائے تاکہ پھر وہ نہ صرف چھمب جوڑیاں واپس لے لیں بلکہ پاکستان کے کچھ علاقے بھی ہتھیا لیں۔

دشمن کا توپ خانہ ایک لمحے کے لیے بھی خاموش نہیں ہوا تھا۔ ان کے گولے پاکستانی موروچوں سے کچھ فاصلے پر گر رہے تھے۔ ہاں اگر ان

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

کے ٹینک اور توپ خانہ چند فرلانگ مزید آگے آجاتا تو پاکستانی مورچوں کو تباہ کرنے میں انہیں دیر نہ لگتی لیکن کیپٹن نصراللہ ملک نے بھی عہد کرلیا تھا کہ جب تک ...... اس کے جسم میں خون کا ایک قطرہ بھی باقی ہے، وہ دشمن کو یہاں نہیں گھسنے دے گا۔

''سیکنڈ لیفٹیننٹ عامر اور اس کے درمیان وائرلیس پر رابطہ تھا۔ کیپٹن ملک ایک اونچے ٹیلے پر چڑھا آبزرویشن پوسٹ پر بیٹھا تھا۔ وہ وہاں سے کوڈورڈز میں عامر کو ہدایات دے رہا تھا۔ عامر اس کے بتائے ہوئے زاویے پر گولہ باری کرواتا تو میدانِ کارزار دشمن کی اذیت ناک چیخوں سے گونج اٹھتا۔

عامر کی کوشش تھی کہ گولہ بارود کم سے کم استعمال کرے کیونکہ ان کا ایمونیشن بہت تیزی سے ختم ہو رہا تھا اور فوری طور پر رسد ملنے کی امید نہیں تھی۔

دشمن کی اندھا دھند فائرنگ سے کمپنی کے بہت سے جوان جام شہادت نوش کرچکے تھے۔ اس کے باوجود کیپٹن ملک محض اپنے آہنی عزم وارادے سے وہاں جما ہوا تھا۔

اس نے کوڈورڈز میں عامر سے پوچھا۔ ''کیا صورتِ حال ہے؟''

''سر! میرے صرف تین جوان بچے ہیں، باقی شہید ہوچکے ہیں لیکن ہم اب بھی دشمن سے بہتر پوزیشن میں ہیں۔''

''گڈ لیفٹیننٹ!'' اس نے توصیفی انداز میں کہا۔ ''ہمیں صرف دو گھنٹے درکار ہیں، پھر ہماری الفا اور چارلی کمپنیاں یہاں پہنچ جائیں گی۔ اوتلی ٹو اور لیفٹیننٹ۔''

''نو پرابلم سر۔'' عامر نے جواب دیا۔ ''میں دشمن کو اس وقت تک ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھنے دوں گا۔''

دشمن نے راتوں رات بغیر کسی اعلان کے جنگ چھیڑ دی تھی۔ وہ لاہور پر قابض ہونا چاہتا تھا لیکن اس کا یہ خواب بری طرح چکناچور کردیا گیا تھا۔

اچانک ان پر ایک افتاد مزید نازل ہوگئی۔ جب دشمن کی بھاری نفری بھی وہ پوسٹ فتح کرنے میں ناکام رہی تو انہوں نے ائرفورس سے مدد مانگ لی۔

چند منٹ بعد فضا بھارتی فضائیہ کے لڑاکا طیاروں کے شور سے گونج اٹھی۔ اس صورتِ حال سے کیپٹن کے ساتھی فوری طور پر بوکھلا گئے لیکن کیپٹن کا عزم وحوصلہ دیکھ کر وہ بھی اپنی جگہ پر ڈٹ گئے۔

اب وہ دشمن کے بمبار ہوائی جہازوں کی زد میں تھے۔ کیپٹن نے فوری طور پر اپنے ہیڈکوارٹر کو ہوائی حملے کی اطلاع دی اور فضائی مدد طلب کرلی۔ وہ جانتا تھا کہ پاک فضائیہ کے شاہین اس سے زیادہ اہم محاذوں پر مصروف ہوں گے لیکن ایک امید ضرور تھی کہ ممکن ہے فضائیہ کا کوئی ایک شاہین اِدھر آنکلے۔

کیپٹن اور اس کے جوانوں نے چھوٹی مشین گنز سے ان کا نشانہ لینے کی کوشش کی۔

عامر نسبتاً نیچے تھا اس لیے جہاز اس کی رائفل کی رینج سے باہر تھے۔ اس کے باوجود کیپٹن نے دو لڑاکا طیاروں کو نشانہ بناڈالا۔

وہ دشمن کا پورا ایک اسکواڈرن تھا اس لیے محض دو جہازوں کی کمی سے ان کا کیا بگڑ سکتا تھا۔

دشمن کے بمبار طیارے اب ان کے مورچوں پر اندھا دھند بم برسا رہے تھے۔

ایک بم عامر کے بالکل نزدیک پھٹا۔ وہ خود تو اس سے محفوظ رہا لیکن اس کے تینوں جوان بم کی زد میں آگئے۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے حوالدار نور خان اور نائیک اللہ بخش نے جام شہادت نوش کرلیا۔ اس کا تیسرا جوان سپاہی ظفر علی شدید زخمی ہوگیا۔ گرد اور دھوئیں کا بادل چھٹا تو وہ جھپٹ کر ظفر علی کے نزدیک پہنچا جو گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔ عامر کو اس کے زخموں کا اندازہ نہ ہوسکا کہ وہاں اس وقت تاریکی کا راج تھا۔

''تم ٹھیک تو ہو ظفر؟'' عامر نے ہذیانی انداز میں پوچھا اور اپنے پہلو سے بندھی ہوئی پانی کی بوتل نکال کر اسے پانی پلانے کی کوشش کی۔ ظفر نے بمشکل ایک گھونٹ پانی پیا، پھر وہ آہستہ سے بولا۔ ''سر! آپ یہاں سے نکل جائیں۔ میری فکر چھوڑیں۔''

''میں تمہیں اس حالت میں نہیں چھوڑ سکتا ظفر۔'' عامر نے کہا۔

''میں تو اب ...... کہیں ...... بھی ...... جانے ...... کے قابل ...... نہیں ...... ہوں ...... سر۔'' ظفر نے اٹک اٹک کر کہا، پھر زیرِلب کلمہ پڑھا اور اس کی گردن ڈھلک گئی۔

ہمیں ماتھے پر بوسہ دو...... کہ ہم کو جگنوؤں کے تتلیوں کے دیس جانا ہے۔

عامر نے اس کی آنکھیں بند کیں اور دل گرفتہ سا اٹھ کھڑا ہوا۔

اسی وقت اسے مشین گن کی تڑتڑاہٹ بہت نزدیک سے سنائی دی۔ اس نے پھرتی سے ظفر کی مشین گن اٹھائی، اس کے فالتو راؤنڈ نکالے اور جھکتا ہوا اس سمت دوڑا جہاں

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com

www.paksociety.com

کیپٹن ملک کی پوزیشن تھی۔ دشمن کی پیش قدمی فوری طور پر وہیں سے روکی جاسکتی تھی۔ وہ بہت تیزی سے ٹیلے پر چڑھا اور ٹیلے پر پہنچا ہی تھا کہ اسے ایک گرج دار آواز سنائی دی۔

''ہالٹ۔''

عامر وہیں ساکت ہوگیا۔ یہ آواز اس کے لیے جانی پہچانی تھی۔ یہ حوالدار علی بخش کی آواز تھی۔

''فائر مت کرنا علی بخش۔'' عامر نے کہا۔ ''میں......''

''سر! آپ کرالنگ کرتے ہوئے اس طرف آجائیں۔'' علی بخش نے کہا۔ ''یہ جگہ دشمن کے ہوائی حملے سے کچھ محفوظ ہے۔''

عامر زمین پر رینگتا ہوا اس کی آواز کی جانب بڑھا اور پوچھا۔ ''کیپٹن صاحب کہاں ہیں؟''

''کپتان صاحب اب ہم میں نہیں ہیں۔ وہ شہید ہو چکے ہیں۔''

عامر کو دھچکا سا لگا۔ اس نے پوچھا۔ ''اور باقی لوگ؟''

''شہید ہونے میں سب مجھ سے آگے نکل گئے ہیں، میں تو......'' اس کی آواز بھارتی بمبار کی تیز اور ہولناک آواز میں دب گئی۔ پھر وہاں بموں کے کئی دھماکے گونجے۔ جہاز اندھا دھند بمباری کررہے تھے۔

''سر! آپ ٹھیک ہیں؟'' علی بخش کی تشویش ناک آواز سنائی دی۔

''ہاں علی بخش! میں ٹھیک ہوں۔ تمہارے پاس سیون ایم ایم ہے تو دو۔'' عامر نے کہا۔ بمبار طیارہ دوبارہ پلٹ کر آچکا تھا۔

عامر نے رائفل سیدھی کی اور جہاز کا نشانہ لے کر فائر کردیا۔ اس سے چند سیکنڈ پہلے پائلٹ بمباری کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ فوراً ہی وہاں زوردار دھماکا ہوا، عامر دھماکے کی شدت سے اچھل کر پیچھے جا گرا۔ پھر اس نے طیارے کو ڈولتے دیکھا۔ اس میں آگ لگ چکی تھی اور وہ تیزی سے ایک طرف گر رہا تھا۔ بم کے دھماکے سے اردگرد گردوغبار کا ایک طوفان سا آگیا تھا۔

عامر کے اوسان کچھ بحال ہوئے تو اس نے اپنے جسم کا جائزہ لینے کی کوشش کی، دھماکے سے اُڑنے والی گرد اور مٹی کے ٹکڑے اس کے جسم پر لگے تھے۔ آنکھوں میں بھی گرد بھر گئی تھی۔ چند لمحوں تک تو اسے کچھ دکھائی ہی نہ دیا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کی بینائی ختم ہوگئی ہو۔ آنکھوں میں شدید جلن ہورہی تھی اور پانی بہہ رہا تھا۔ اپنی فوجی تربیت کے باعث اس نے آنکھیں ملنے کی کوشش نہیں کی۔ عموماً ایسے موقعوں پر آنکھیں ملنا بھی خطرناک ثابت ہوتا ہے۔ آنکھوں میں اگر کوئی پتھر یا شیشے کا ریزہ پڑ گیا ہو تو ملنے سے آنکھیں بری طرح زخمی ہوجاتی ہیں۔

اس کی آنکھوں سے پانی بہہ رہا تھا۔ وہ تکلیف کی شدت کو برداشت کرتا رہا۔ پانی بہنے کی وجہ سے اس کی آنکھوں کی گرد صاف ہوگئی اور وہ پھر دیکھنے کے قابل ہو گیا۔

عامر ہمت کر کے ایک مرتبہ پھر اوپر چڑھا۔ وہاں اب علی بخش کے بجائے اس کا کٹا پھٹا جسم پڑا تھا۔ اپنے دوسرے ساتھیوں کی طرح وہ بھی شہید ہوچکا تھا۔ اس سے کچھ فاصلے پر کیپٹن ملک کا جسم تھا اور تھوڑے فاصلے پر اس کے دوسرے جوان پڑے ہوئے تھے۔

عامر نے ایک رائفل اٹھائی اور اس کے بہت سے فاضل راؤنڈز اپنے کندھے پر لگے ہوئے بیگ کی سامنے والی جیب میں بھر لیے۔ اس نے وہاں بیٹھ کر چند منٹ تک اپنے ساتھیوں کے لیے دعا کی اور کیپٹن ملک کو دیکھتا رہا۔ زندگی سے بھرپور، صحت مند و توانا کیپٹن ملک، عامر کا آئیڈیل تھا۔

اچانک عامر کو نیچے کی جانب بھاری فوجی بوٹوں کی چاپ سنائی دی۔ جب وہاں سے کوئی مزاحمت نہیں ہوئی تو دشمن کو اندازہ ہوگیا کہ اس چوکی پر اب کوئی زندہ نہیں رہا۔ ایک کمپنی کے ذریعے دشمن کی ایک ڈویژن فوج کو کئی گھنٹے تک روکنا بھی پاکستانی جوانوں کا کارنامہ تھا۔

عامر نے آخری بار اپنے شہید ساتھیوں کو دیکھا اور اپنا پٹھو (پیٹھ پر لادنے والا فوجی بیگ) اٹھا کر وہاں سے روانہ ہوگیا۔ کیپٹن ملک نے کہا تھا کہ ہمیں صرف دو گھنٹے چاہئیں، پھر ہمیں کمک مل جائے گی۔ دو میں سے ڈیڑھ گھنٹا تو گزر چکا تھا۔ ابھی تک کمک کا کوئی نام و نشان نہیں تھا۔ جنگ میں اکثر یوں بھی ہوتا ہے......وقت حالات کا پابند نہیں ہوتا۔

عامر نے دکھے دل کے ساتھ وہ پوسٹ چھوڑی اور اندھیرے میں پیچھے کی طرف روانہ ہوگیا۔ اس کے اردگرد کھیت پھیلے ہوئے تھے جو ٹینکوں اور بمبار طیاروں کی بمباری سے جھلس گئے تھے۔

وہ مشکل سے دس منٹ ہی چلا تھا کہ اوپر ٹیلے سے اسے لوگوں کے زور زور سے بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔ کوئی کرخت لہجے میں بولا۔ ''سب مر گئے ساڈے (سالے)۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

’’ہیاں (یہاں) تو بیس بائیس لاشاں پڑی ہیں، باقی سسرے کدھر گئے؟‘‘ دوسری آواز آئی۔

’’بھاگ گئے ہوں گے کائر (بزدل)۔‘‘ تیسری آواز آئی۔

’’بھاگے ہوں گے تو ابھی زیادہ دور نہیں گئے ہوں گے انہیں دیکھو۔‘‘ کوئی باوقار لہجے میں بولا۔

’’او کے سر۔‘‘ دوسرے آدمی نے جواب دیا۔

گویا انہیں حکم دینے والا کوئی افسر تھا۔

عامر نے اپنی رفتار مزید تیز کردی۔

اب وہ گھنے کھیتوں میں بھاگ رہا تھا۔ اس کے بھاگنے سے کھیتوں میں سرسراہٹ ہو رہی تھی۔ اچانک اسے اپنے پیچھے بھاگتے قدموں کی آوازیں سنائی دیں تو اس نے اپنی رفتار مزید تیز کردی۔

فوراً ہی وہ پورا میدان سرچ لائٹ کی روشنی میں نہا گیا۔ دشمن کی نظر اب اس پر پڑ چکی تھی۔ عامر نے ایک طرف چھلانگ لگائی اور بے تحاشا بھاگنے لگا۔

’’رک جاؤ ورنہ گولی ماردوں گا۔‘‘ کوئی چیخ کے بولا۔

عامر نے اپنی رفتار مزید بڑھادی پھر فائر کا دھماکا ہوا اور عامر کو ایسا لگا جیسے اس کی دائیں ٹانگ میں آگ بھر گئی ہو۔ اس کی ران میں شدید تکلیف تھی۔ گولی اس کی ران میں پیوست ہوگئی تھی۔ اس کے باوجود وہ گرتا پڑتا بھاگتا رہا۔

اچانک فضا کسی بمبار طیارے کی آواز سے گونج اٹھی۔ طیارہ چنگھاڑتا ہوا عامر کے سر کے اوپر سے گزر گیا۔

طیارے پر نظر پڑتے ہی عامر کا دل خوشی سے بلیوں اچھلنے لگا۔ یہ پاک فضائیہ کا طیارہ تھا۔

اسے دیکھ کر دشمنوں میں بھی بھگدڑ مچ گئی۔ طیارے نے لگاتار کئی بم گرادیے۔ خوفناک انسانی چیخیں گونجیں اور گرد وغبار کا ایک طوفان سا چھا گیا۔

کچھ ہی فاصلے پر جا کر طیارہ دوبارہ پلٹا اور اس نے ایک مرتبہ پھر بمباری کی تو مزید انسانی چیخیں ابھریں۔

طیارہ واپس چلا گیا۔ عامر کو یقین تھا کہ اب پاکستان کی فوج دوبارہ اس چوکی پر قبضہ کرنے کی کوشش کرے گی لیکن وہ اپنی فوج کے انتظار میں وہاں رک نہیں سکتا تھا۔ دشمن کا کوئی دستہ اب بھی اس کی تلاش میں ہوسکتا تھا۔ وہ جلد سے جلد اس علاقے سے دور نکل جانا چاہتا تھا۔

وہ گھسٹتا ہوا چلتا رہا۔ اس کے زخم سے خون بہہ رہا تھا جس سے اسے مزید نقاہت محسوس ہو رہی تھی۔ پہلے اس خون کو روکنا ضروری تھا۔ اس نے اپنے بیگ سے خصوصی بینڈیج نکالی، خون روکنے والی دوا نکالی اور زخم پر لگا کر اوپر سے پٹی باندھ لی۔ کچھ دیر بعد اسے احساس ہوا کہ اس کا خون رک چکا ہے۔ اس کی بوتل میں تھوڑا سا پانی تھا۔ اس نے بوتل سے منہ لگایا تو احساس ہوا کہ اس میں صرف ایک گھونٹ ہی پانی ہے۔ پانی پی کر وہ کچھ تازہ دم ہوا اور ایک مرتبہ پھر وہاں سے روانہ ہوگیا۔

چلتے چلتے صبح کے آثار نمودار ہوگئے تھے لیکن عامر کو دور تک اپنی یا دشمن کی فوج کے آثار دکھائی نہیں دیے۔ اس کے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہیں تھا جس سے اسے معلوم ہوتا کہ وہ اس وقت کس حصے میں ہے۔ اس نے تھیلے میں ہاتھ ڈال کر نقشہ نکالنے کی کوشش کی لیکن تھیلے میں نقشہ نہیں تھا۔ اب وہ صرف سورج کی سمت سے اندازہ لگا کر آگے بڑھ رہا تھا۔

عامر نے کئی گھنٹے سے کچھ کھایا نہیں تھا، کمزوری اور نقاہت نے اسے مزید نڈھال کردیا تھا۔

اپنی قوتِ ارادی کے بل پر وہ مزید دو گھنٹے چلتا رہا، چلتا کیا گھسٹتا رہا۔

سورج اب بالکل اس کے سر پر آگیا تھا۔ اب عامر کے لیے چلنا دوبھر ہوگیا۔ وہ تھک کر ایک جگہ بیٹھ گیا۔ اس کے زخم میں اب شدید تکلیف ہو رہی تھی۔

اچانک اس کے کانوں میں ایسی آواز آئی جیسے گائے بیلوں کے گلے میں پڑی ہوئی گھنٹیاں بج رہی ہوں۔ آواز سن کر وہ بوکھلا گیا کہ یہ کون سا علاقہ ہے؟ وہ پاکستان میں ہے یا بھارت میں؟ زیادہ امکان یہ ہی تھا کہ وہ بھارت کے کسی گاؤں میں ہے۔ جہاں ان کی چوکی تھی وہاں سے پاکستانی سرحد خاصی دور تھی۔ وہ لوگ بھارت میں کئی سو کلو میٹر اندر گھس آئے تھے۔ عامر اتنی جلدی پاکستان تو پہنچ نہیں سکتا تھا۔ عامر نے سوچا، اب جو ہوگا، دیکھا جائے گا۔ وہ اٹھا اور گرتا پڑتا اس طرف روانہ ہوگیا جس طرف سے اسے گھنٹیوں کی آواز سنائی دی تھی۔ چند منٹ میں وہ اس پگڈنڈی پر پہنچ گیا۔ وہاں انسانی قدموں، بیل گاڑیوں کے پہیوں اور جانوروں کے کھروں کے نشانات تھے۔ وہ گرتا پڑتا ایک طرف روانہ ہوگیا۔ کچھ فاصلے پر اسے مسجد کے ٹوٹے ہوئے مینار دکھائی دیے۔ گویا بمباری یہاں بھی ہوئی تھی۔

اب اس کا رخ مسجد کی طرف تھا۔ اسے موہوم سی امید تھی کہ وہاں مسجد ہے تو شاید کوئی مسلمان بھی ہو جو اس کی مدد پر آمادہ ہوجائے۔

عامر کے جسم میں اب بالکل سکت نہیں تھی۔ مسجد کا چند

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

فٹ کا فاصلہ اس نے گرتے پڑتے بیس منٹ میں طے کیا اور عین مسجد کے دروازے کے سامنے جا کر گر گیا پھر اس کا ذہن تاریکیوں میں ڈوب گیا۔

☆☆☆

اسے ہوش آیا تو اس کے کانوں میں آواز آئی۔ ''لگتا تو فوجی ہے لیکن یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ اس طرف کیسے آ گیا؟''

''بابا! یہ پاکستانی فوجی ہے۔'' اس کے کانوں سے ایک مترنم آواز ٹکرائی۔ ''دیکھ نہیں رہے اس کے جسم پر خاکی وردی ہے۔ ہماری فوج کی وردی کا رنگ تو ایسا نہیں ہے۔''

''تو ٹھیک کہتی ہے زلیخا۔'' مردانہ آواز آئی۔ ''یہ پاکستانی فوجی ہے لیکن اسے ہوش میں تو آنے دے۔''

عامر نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں۔ سب سے پہلے اس کی نظر نورانی چہرے والے ایک بزرگ پر پڑی۔ ان کے چہرے پر سفید براق شرعی داڑھی تھی۔ سر پر میلی سی پگڑی تھی۔ جسم کا لباس بھی بوسیدہ تھا لیکن آنکھوں میں شفقت تھی۔

عامر نے بہت مشکل سے آواز نکالی۔ ''پ..... پانی......'' پھر اس نے آنکھیں موند لیں۔

''زلیخا بیٹی، اسے پانی پلا۔ میں نماز پڑھانے جا رہا ہوں۔ تو دروازہ اندر سے بند کر لے۔''

''بابا! اب مسجد میں نماز پڑھنے والا ہے ہی کون؟'' عامر کے کانوں میں زلیخا کی مترنم آواز آئی۔

''ابھی دو آدمی تو ہیں جو پانچوں وقت مسجد میں آتے ہیں۔ اللہ کے گھر کو آباد رکھنا چاہیے۔ چاہے دو ہی آدمیوں کی جماعت کیوں نہ ہو۔'' بابا یہ کہہ کر چلے گئے۔

''پانی پی لیں جی۔'' عامر کے کانوں میں پھر اسی کی مترنم آواز آئی جسے بابا زلیخا کہہ کر مخاطب کر رہا تھا۔

عامر نے آنکھیں کھول کر زلیخا کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ وہ اتنی ہی حسین تھی۔ بڑی بڑی ہرنی جیسی آنکھیں، سرخ و سفید رنگت، پُرکشش نقوش اور کالے گھنے سیاہ بال۔ اس کی عمر مشکل سے سولہ برس ہوگی۔

اس کے ہاتھ میں تانبے کا بھدا سا گلاس تھا اور وہ عامر پہ جھکی ہوئی تھی۔ عامر نے پانی پینے کے لیے منہ کھول دیا۔ اس نے عامر کو پانی پلانے کی کوشش کی تو چند قطروں کے علاوہ سارا پانی اس کی ٹھوڑی پر بہہ گیا۔

''ٹھہرو۔'' عامر نے کہا۔ ''مجھے اٹھنے دو۔''

''آپ خود اٹھ سکتے ہو؟'' زلیخا نے پوچھا۔

''کوشش کرتا ہوں۔'' عامر نے کہا اور اٹھنے کی کوشش کی تو اس کے پاؤں پر وزن پڑا۔ اسے اتنی شدید تکلیف ہوئی کہ وہ دوبارہ تکیے پر گر گیا۔ سردی کے باوجود تکلیف کی شدت سے اس کا چہرہ پسینے میں تر ہو گیا۔

''ٹھہریں جی، میں اٹھاتی ہوں، آپ خود تو اٹھ ہی نہیں سکتے ہو۔'' زلیخا نے کہا اور اس کے سر کے پیچھے سے گردن میں ہاتھ ڈال کر اسے اٹھانے کی کوشش کرنے لگی۔ زلیخا کے لباس میں وہی بو بسی ہوئی تھی جو گاؤں کی عورتوں کا خاصہ ہوتی ہے لیکن اس کی سانسوں میں عجیب سی مہک تھی۔ وہ نازک سی لڑکی دراز قد اور وزنی عامر کو اٹھانے میں ہانپ گئی۔ عامر نے بھی اپنے ہاتھوں کی مدد سے اٹھنے کی کوشش کی اور کامیاب رہا۔

زلیخا نے سہارا دے کر اسے پانی پلایا تو وہ اس کے بہت نزدیک تھی۔ اس وقت پانی بھی عامر کو آبِ حیات لگ رہا تھا۔ یوں بھی کچے گھڑے کا پانی اس نے کبھی کبھار اپنے آبائی گاؤں میں پیا تھا۔ پانی پی کر گویا اس میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ زلیخا نے اسے پھر بستر پر لٹا دیا۔

عامر نے اس دفعہ بہ غور زلیخا کا جائزہ لیا۔ اس کے جسم پر بہت معمولی کپڑے کی شلوار قمیص تھی لیکن اس کا جسم گویا سانچے میں ڈھلا ہوا تھا۔

اسے دیکھ کر عامر کو اپنی منگیتر عالیہ یاد آ گئی۔ عالیہ بھی حسین تھی لیکن زلیخا کے مقابلے میں اس کا حسن ماند پڑ جاتا۔ زلیخا کو اگر جدید لباس پہنا دیا جاتا، اس کے بالوں کا اسٹائل جدید ہوتا تو وہ اس سے کہیں زیادہ حسین ہوتی جتنی اس وقت لگ رہی تھی۔

''آپ مجھے اتنے غور سے کیوں دیکھ رہے ہو جی؟'' زلیخا نے کہا۔

''بس، تمہیں دیکھ کر کوئی یاد آ گیا تھا۔'' عامر نے گول مول جواب دیا۔

''کون یاد آ گیا تھا، آپ کی بیوی؟'' زلیخا ہنس کر بولی۔

''بیوی؟'' عامر ہنسا۔ ''میری تو ابھی شادی بھی نہیں ہوئی۔'' پھر وہ چونک کر بولا۔ ''تم یہاں اکیلی رہتی ہو؟''

''اکیلی کہاں جی۔'' زلیخا نے کہا۔ ''میں ہوں، بابا ہے اور بھوری ہے۔''

''بھوری؟'' عامر چونکا۔ ''وہ کہاں ہے، میں نے اسے ابھی تک نہیں دیکھا۔''

''آپ اسے کیسے دیکھو گے؟'' زلیخا نے کہا۔ ''وہ تو

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

گھر کے پچھواڑے میں ہے۔ دس کلو دودھ دیتی ہے۔‘‘
’’اچھا...... بھوری تمہاری بھینس کا نام ہے۔‘‘
عامر ہنسا۔’’ میں سمجھا کہ وہ تمہاری بہن ہے۔‘‘
اس کی بات پر زلیخا بھی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ عامر کو اس کے موتیوں جیسے چمک دار دانت اور رخساروں میں پڑنے والے ڈمپلز نے مسحور کر دیا۔
اسی وقت بابا آ گیا اور بولا۔’’ہاں بیٹا، اب کیا حال ہے؟‘‘ پھر وہ زلیخا سے مخاطب ہوا۔’’تو نے اسے کچھ دودھ وغیرہ پلایا؟‘‘
’’بابا، انہوں نے تو پانی اتنی مشکل سے پیا ہے، ان کے زخم میں بھی بہت تکلیف ہے۔ پاؤں ہلانے میں بھی تکلیف ہو رہی ہے۔‘‘
’’تکلیف ٹھیک ہو جائے گی۔ اللہ بہتر کرے گا تو دودھ گرم کر کے اس میں ہلدی ملا کر لا۔‘‘
’’دودھ میں ہلدی؟‘‘ عامر چونکا۔
’’بہت زبردست نسخہ ہے۔‘‘ بابا نے کہا۔’’میرے پاس بزرگوں کا دیا ہوا ایک سفوف بھی ہے۔ اس سے گہرے سے گہرا زخم بہت جلدی بھر جاتا ہے۔‘‘
’’میرے پیر میں گولی لگی ہے بابا۔‘‘ عامر نے کہا۔
’’پہلے مجھے گولی نکالنا پڑے گی۔‘‘
’’گولی نکالنا پڑے گی۔‘‘ بابا کے لہجے میں تشویش تھی۔’’گاؤں میں تو اس وقت کوئی جراح بھی نہیں ہے۔ دوسرے گاؤں میں ایک جراح ہے لیکن وہ کٹر ہندو ہے۔ وہ فوراً فوجیوں کو اطلاع دے دے گا۔‘‘
’’گولی تو میں خود ہی نکالنے کی کوشش کروں گا۔ آپ ذرا پانی گرم کرا لیں۔‘‘ پھر اس نے اپنے بیگ سے لمبے پھل والا ایک چاقو نکالا اور بولا۔’’اسے بھی ذرا آگ پر دہکا لیں اور مجھے کوئی تہبند وغیرہ دے دیں۔‘‘
اس دوران زلیخا عامر کے لیے دودھ لے آئی۔ عامر کو دودھ پینا اچھا نہیں لگتا تھا لیکن اس وقت تو مجبوری تھی۔ وہ اپنے محسنوں کا دل نہیں توڑنا چاہتا تھا۔
بابا نے اسے آسانی سے اٹھا کر بٹھا دیا۔ عامر ایک ہی سانس میں دودھ کا گلاس چڑھا گیا۔ اسے متلی محسوس ہوئی لیکن اس نے خود پر قابو پا لیا۔
بابا اس کے لیے اپنا دھلا ہوا تہبند اور قمیص لے آیا اور زلیخا سے بولا۔’’تو جا کر پانی کھولا اور اس چاقو کو بھی آگ میں اچھی طرح تپا کر سرخ کر لینا۔‘‘
وہ چھوٹا سا کچا مکان تھا۔ آگے پیچھے دو چھوٹے چھوٹے کمرے تھے اور ایک کوٹھری تھی جس میں غالباً وہ لوگ اناج اور گھر کا دوسرا کاٹھ کباڑ رکھتے ہوں گے۔ مکان کا صحن البتہ خاصا کشادہ تھا۔ اس کے ایک سرے پر باورچی خانہ تھا باورچی خانہ کیا، کھانا بنانے کے لیے کچھ جگہ صاف کر کے ان لوگوں نے کچی مٹی سے چولھے بنا لیے تھے جن میں لکڑی اور اپلے جلتے تھے۔ اس کے سامنے چھوٹا سا ایک تندور تھا۔ صحن کے ایک کونے پر کنواں تھا اور دوسرے کونے پر بیت الخلا تھا۔
بابا نے عامر کو کپڑے بدلنے کو اٹھایا تو زلیخا خود ہی اندر کے کمرے میں چلی گئی۔ عامر نے زخم پر بندھی ہوئی پٹی کھولنے کی کوشش کی تو اسے خاصی تکلیف ہوئی۔ وہ پٹی زخم پر چپک گئی تھی۔
’’ٹھہر جاؤ پتر!‘‘ بابا نے کہا اور ایک پیالے میں گرم پانی لے آیا پھر اندر والے کمرے سے اس نے زلیخا کا ایک صاف ستھرا دوپٹا نکالا اور اسے کئی حصوں میں تقسیم کر دیا۔ اس کے ایک ٹکڑے کی کئی تہیں بنانے کے بعد بابا نے کپڑا پانی کے پیالے میں ڈبو ڈبو کر کئی مرتبہ جمے ہوئے خون پر لگایا تو پٹی آسانی سے الگ ہو گئی۔ عامر کی پینٹ بھی خون کی وجہ سے زخم سے چپکی ہوئی تھی۔
جب بابا نے گرم گرم پانی زخم پر لگایا تو اسے شدید تکلیف ہوئی۔
عامر نے کپڑے بدل کر اپنے زخم کا جائزہ لیا۔ گولی ران کے اوپری حصے میں پیوست تھی۔ شکر ہے اس سے ہڈی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا۔ اب اصل مرحلہ تھا گولی جسم سے نکالنے کا۔ عامر کو اس کا بالکل تجربہ نہیں تھا۔ اس سے قبل کبھی اس کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی تھی۔ البتہ چاند ماری کے دور میں اس کے ایک ساتھی کیڈٹ کو غلطی سے گولی لگ گئی تھی لیکن ڈاکٹروں نے وہ گولی کیسے نکالی تھی، عامر کو اس کا بھی علم نہیں تھا۔
اس نے اکثر جگہ پڑھا تھا اور مختلف فلموں میں دیکھا تھا کہ چاقو یا کسی نوک دار چیز کو تپا کر زخم سے گولی نکالتے ہیں تاکہ چاقو یا چھری میں موجود جراثیم سے سیپٹک نہ ہو جائے۔
بابا نے عامر کو پلنگ کے بجائے نیچے ایک پٹری پر بٹھا دیا۔
اس دوران میں زلیخا کھولتے ہوئے پانی کا ڈونگا لے کر آ گئی۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں عامر کا شکاری چاقو تھا جس کا پھل سرخ ہو رہا تھا۔
عامر نے ہمت کر کے چاقو ہاتھوں میں لیا اور زخم میں

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

گھسا دیا۔ اسے اتنی شدید تکلیف ہوئی کہ اس نے اپنے ہونٹوں کو دانتوں میں دبا لیا تاکہ چیخ نہ نکل جائے۔ اس کے ساتھ ہی جلتے ہوئے گوشت کی بو آئی۔ عامر نے ہمت کر کے چاقو کا پھل مزید اندر ڈالا اور ایک جھٹکے سے گولی کو باہر نکال لیا۔ تکلیف کی شدت سے عامر الٹ کر پیچھے گرا تو کسی کی نرم آغوش نے اسے سمیٹ لیا۔ وہ زلیخا تھی جو اس کے گرنے پر خود بھی چیخ اٹھی تھی۔

عامر چند منٹ یونہی اس کی گود میں سر رکھے گہرے گہرے سانس لیتا رہا۔ اس کے زخم سے خون بہنے لگا تھا لیکن گولی نکل چکی تھی اس لیے وہ مطمئن تھا۔

بابا نے پھر پانی گرم کرایا اور عامر سے پوچھا۔ ''پتر، تیرے بیگ میں ڈیٹول یا کوئی اور ایسی دوا ہے؟''

اس کے بیگ کے چھوٹے فرسٹ ایڈ باکس میں ٹنکچر آیوڈین ..... کی ایک چھوٹی شیشی بھی تھی۔ یہ سامان دورانِ جنگ میں ہر فوجی کے پاس ہوتا ہے تاکہ زخمی ہونے کی صورت میں وہ فوری طور پر خود ہی طبی امداد دے سکے۔

عامر نے زخم کو ٹنکچر ملے پانی سے اچھی طرح دھویا، پھر اس پر پٹی باندھنے لگا تو بابا نے اسے روک دیا اور بولا۔ ''ٹھہر جا پتر، میرے پاس ایک دیسی ٹوٹکا بھی ہے۔ اس سے تیرا زخم بہت جلدی بھر جائے گا۔''

وہ پھر اندر والے کمرے میں گیا اور کچھ دیر کھٹر پٹر کرتا رہا، زلیخا بھی اس کے پیچھے اندر چلی گئی۔ عامر اپنے زخم کا جائزہ لیتا رہا۔ زخم خاصا گہرا تھا۔ اس کی جگہ اگر کوئی دبلا پتلا آدمی ہوتا تو گولی گوشت میں پیوست ہونے کے بجائے ہڈی کو چکنا چور کر دیتی اور وہ زندگی بھر کے لیے ایک ٹانگ سے معذور ہو جاتا، وہ بھی اس صورت میں جب وہ بچ کر یہاں تک پہنچ پاتا۔

عامر قابلِ رشک صحت کا مالک تھا۔ خاص طور پر جاگنگ کرنے اور فٹ بال کھیلنے سے اس کی ٹانگیں بہت مضبوط تھیں۔

بابا کمرے سے باہر نکلا تو اس کے ہاتھ میں ریشمی کپڑے کا بڑا سا ایک ٹکڑا تھا۔

کپڑا دیکھ کر ہی وہ سمجھ گیا کہ بابا اس کی راکھ زخم میں بھر دے گا۔ اس نے اپنے بزرگوں سے اس ٹوٹکے کے بارے میں سنا تھا لیکن کبھی خود نہیں دیکھا تھا۔

بابا نے ایک پلیٹ میں دو تین انگارے نکالے اور کپڑا ان پر رکھ دیا۔ ریشمی کپڑا لمحوں میں بھڑکا اور سلگ کر راکھ میں تبدیل ہو گیا۔ بابا نے انگارے پلیٹ میں سے نکال کر پھینک دیے اور ریشمی کپڑے کی راکھ عامر کے زخم میں بھر دی۔ زخم پر گرم گرم راکھ پڑی تو عامر کا چہرہ تکلیف کی شدت سے سرخ ہو گیا اور ایک مرتبہ پھر پسینے میں ڈوب گیا۔ آہستہ آہستہ اسے سکون آ گیا۔

زلیخا کو اچانک اس نازک صورتِ حال کا احساس ہوا تو وہ کسمسانے لگی۔ عامر کو بھی عجیب لگ رہا تھا۔ وہ اب اٹھ کر بیٹھ سکتا تھا۔ وہ زمین کا سہارا لے کر اٹھ بیٹھا۔

بابا نے کمرے میں جا کر پھر کچھ نکالا۔ وہ کاغذ میں لپٹی ہوئی کوئی چیز تھی۔ اس نے زلیخا سے کہا۔ ''زلیخا! تو دودھ گرم کر کے اس میں یہ پڑیا (سفوف) ملا اور اسے پلا دے۔ رات تک یہ اپنے پیروں پر چلنے لگے گا۔'' پھر وہ چونک کر بولا۔ ''نماز کا وقت ہو گیا ہے، میں مسجد جا رہا ہوں۔''

دودھ کا نام سن کر پھر عامر کو جھرجھری آئی لیکن وہ مجبور تھا۔

چند منٹ بعد زلیخا جست یا تانبے کے بڑے سے گلاس میں دودھ بھر کے لے آئی اور بولی۔ ''لو جی یہ پی لیں۔ میری بھوری کا دودھ تو ویسے بھی زبردست ہوتا ہے، پھر بابا نے اس میں وہ کراماتی دوائی بھی ملوا دی ہے جو وہ کبھی کبھی نکالتا ہے اور اس شیشی کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتا ہے۔ کہتا ہے کہ وہ دوائی اسے کسی بزرگ نے بخشی تھی۔''

عامر کو اس سے کوئی سروکار نہیں تھا کہ دودھ بھوری کا تھا یا کالی کا یا بابا کو وہ سفوف کسی بزرگ نے بخشا تھا یا کسی نوجوان نے۔ اس وقت تو اس کے لیے سب سے بڑا مرحلہ دودھ کا وہ کنگ سائز گلاس پینا تھا۔ بابا جاتے جاتے اسے چارپائی پر لٹا گیا تھا۔ زلیخا نے ایک مرتبہ پر اس کی گردن کو سہارا دے کر اسے اٹھایا اور دودھ کا گلاس اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔

اب وہ اس دودھ کی تاثیر تھی یا زلیخا کی مسحور کن سانسوں کی مہک کہ عامر نے دو تین گھونٹ میں وہ گلاس خالی کر دیا۔

زلیخا اسے سہارا دیے اس کی پشت سے لگی ہوئی تھی۔ اس کے جسم کے گداز سے عامر کے جسم میں سنسنی سی دوڑ رہی تھی۔

وہ اتنی معصوم تھی کہ اسے خود بھی اس صورتِ حال کا احساس نہیں تھا۔ جب عامر نے پورا گلاس خالی کر دیا تو مسکرا کر بولی۔ ''اب دیکھنا جی، آپ رات تک بھلے چنگے ہو جاؤ گے۔'' یہ کہہ کر وہ چارپائی کے سرہانے سے اٹھ کر اس کے

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

نزدیک ہی اس پٹڑی پر بیٹھ گئی جس پر بیٹھ کر عامر نے اپنی ران کا آپریشن کیا تھا۔

''زلیخا! ایک بات بتاؤ۔ اس گاؤں میں کتنے گھر ہیں؟''

زلیخا نے انگلیوں پر حساب لگایا اور بولی۔ ''اس گاؤں میں اکیس گھر ہیں۔ یہاں سے کچھ دور ٹھاکر روپ سنگھ کا گاؤں ہے۔ وہ بہت بڑا جاگیردار ہے۔ اس کے گاؤں میں تین ساڑھے تین سو کے قریب گھر ہوں گے۔''

''ٹھاکر بھی یہیں رہتا ہے؟'' عامر نے پوچھا۔

''نہیں جی، وہ تو دلی میں رہتا ہے۔ سال میں ایک دو مرتبہ ہی یہاں آتا ہے۔ اس کی جاگیر راجستھان میں بھی ہے۔ یہاں جاگیر کا کام اس کے کارندے سنبھالتے ہیں۔''

''اس کا گاؤں یہاں سے کتنی دور ہے؟'' عامر نے پوچھا۔

''اگر سورج نکلنے سے پہلے چلیں تو شام ڈھلے تک اس کے گاؤں پہنچ جاتے ہیں۔'' زلیخا نے کہا۔

''پیدل؟'' عامر نے سوال کیا۔

''پیدل چلنے والا تو دوسرے دن شام کو وہاں پہنچے گا۔ یہاں لوگ گدھا گاڑیوں پر اور گڈوں (بیل گاڑیوں) پر چلتے ہیں۔ روپ سنگھ کے کارندوں کے پاس تو گھوڑے بھی ہیں اور سائیکلیں بھی۔''

''اس کے گاؤں میں مسلمانوں کے کتنے گھر ہیں؟''

''وہاں مسلمانوں کا کوئی گھر نہیں ہے۔ نہ وہاں کوئی مسجد ہے۔''

''اور تمہارے گاؤں میں کتنے مسلمان رہتے ہیں؟'' عامر نے پوچھا۔

''ہمارے گاؤں میں مسلمانوں کے صرف نو گھر تھے۔ جنگ کی وجہ سے پانچ گھروں کے لوگ یہاں سے جا چکے ہیں۔ اب صرف چار گھر ہیں۔ ہم بھی یہاں سے چلے جاتے لیکن ہمارا تو کوئی اور ٹھکانا بھی نہیں ہے۔ ہاں، یہ گاؤں کسی ٹھاکر کی ملکیت نہیں ہے۔ ہر آدمی اپنی اپنی زمین کا خود مالک ہے۔ لوگ کھیتی باڑی کرتے ہیں، جانور پالتے ہیں اور خوش رہتے ہیں۔'' پھر وہ ہنس کر بولی۔ ''ٹھاکر نے ہمارے گاؤں کی زمینیں بھی خریدنے کی کوشش کی تھی لیکن کوئی بیچنے پر تیار نہیں ہوا۔ وہ تو زبردستی بھی خرید لیتا لیکن ہمارے اور اس کے گاؤں کے بیچ جو فاصلہ ہے، سرکار وہاں بہت بڑا مویشی خانہ (فارم ہاؤس) بنانے والی ہے۔ شاید سرکار خود بھی ہماری زمینیں خریدنا چاہتی ہے جب ہی تو ٹھاکر نے زبردستی نہیں کی۔''

''اور اگر حکومت تمہاری زمینیں خریدے گی تو تم لوگ کیا کرو گے؟''

''سرکار ہمیں کسی اور جگہ آباد کرے گی۔ ہمیں زمینیں دے گی۔ میں نے سنا ہے کہ آباد کرنے کے لیے اچھا پیسا بھی دے گی۔''

''فوجی چوکی یہاں سے کتنی دور ہے؟'' عامر اس سے مسلسل سوال کر رہا تھا۔

''یہاں نزدیک کوئی فوجی چوکی نہیں ہے۔'' زلیخا نے جواب دیا۔ ''ہاں، جنگ شروع ہونے کے بعد بہت سی فوجی گاڑیاں یہاں سے گزری تھیں۔''

دودھ سے عامر کی بھوک وقتی طور پر دب گئی تھی۔ اچانک اسے پھر شدید بھوک کا احساس ہوا۔ اسی وقت بابا گھر میں داخل ہوا اور زلیخا سے بولا۔ ''بیٹا مہمان کو کچھ کھانا بھی کھلایا ہے یا اپنی باتوں سے اس کا مغز کھا رہی ہے؟''

''میں کھانا بنانے جا رہی ہوں۔ آلو تو فوراً ہی پک جائیں گے، میں اس وقت تک تندور پر روٹیاں لگا لوں گی۔''

''لے، یہ بھی رکھ لے۔'' بابا نے کاغذ کا ایک تھیلا اس کی طرف بڑھایا۔ ''اس میں چائے کی پتی ہے۔ مہمان چائے تو ضرور پیتا ہوگا۔''

''بابا!'' عامر نے کہا۔ ''یہ آپ نے کیا مہمان مہمان کی رٹ لگا رکھی ہے۔ میرا نام عامر ہے اور میں مہمان نہیں ہوں بلکہ زبردستی آپ کے گلے پڑ گیا ہوں۔''

''ایسا نہیں کہتے عامر پتر۔'' بابا نے کہا۔ ''رب سوہنا جہاں انسان کا رزق اتارتا ہے، اسے وہیں پہنچا دیتا ہے۔ ورنہ میری کیا مجال کہ میں کسی کو چنے کا ایک دانہ بھی کھلا سکوں۔''

☆☆☆

بابا نے بالکل صحیح کہا تھا رات تک عامر کے زخم کی تکلیف بہت کم ہوگئی اور وہ بغیر کسی سہارے کے چلنے لگا۔ بابا نے عامر سے کہا۔ ''صحن میں اب سردی بہت بڑھ گئی ہے۔ تم اندر جا کر سو جاؤ عامر پتر۔''

''بابا! آپ لوگ کہاں سوئیں گے؟'' عامر نے پوچھا۔

''ہمارے لیے وہ دوسرا کمرا ہے نا، ہم دونوں اس کمرے میں سو جائیں گے۔''

اس رات عامر کو ٹھیک سے نیند نہیں آئی۔ کبھی اسے کیپٹن ملک دکھائی دیتا، کبھی اپنا کوئی اور شہید ساتھی۔ پھر

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

اسے عالیہ نظر آئی۔ عالیہ جو اس کی منگیتر تھی اور ان دنوں لاہور کے کسی کالج میں پڑھ رہی تھی۔ شوخی کے بجائے اس کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔ عامر اس سے بات کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور وہ بے اعتنائی سے منہ پھیر کر کھڑی تھی۔

عامر نے اس سے پوچھا۔ ''عالی! مجھ سے ناراض ہو؟''

''تو کیا مجھے خوش ہونا چاہیے؟'' عالیہ نے کہا۔ ''تم اتنے عرصے بعد آئے تو مجھ سے ملے بغیر ڈیوٹی پر چلے گئے۔''

''وہاں جانا تو بہت ضروری تھا۔'' عامر نے کہا۔ ''تم اتنی سی بات پر ناراض ہو۔ تم ایک فوجی کی بیٹی ہو اور ایک فوجی کی بیوی بھی بننے والی ہو۔ بس اب تم نے مجھے بہت ستا لیا۔ اب تو مسکرا دو۔ دیکھو، میں تین تک گنوں گا، اگر تم نہ ہنسیں تو پھر میں ناراض ہو جاؤں گا۔ ارے، گنتی گننے سے پہلے ہی تم مسکرا رہی ہو...... وہ آئی ہنسی...... وہ آئی ہنسی......''

اچانک عالیہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

اسی وقت عامر کی آنکھ کھل گئی۔ اس کے سامنے زلیخا کھڑی تھی اور کھلکھلا کر ہنس رہی تھی۔ ہنسنے سے اس کا سفید چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ گالوں میں ڈمپل پڑ رہے تھے اور موتیوں جیسے دانت جھلملا رہے تھے۔

اسے ہنستے دیکھ کر عامر بھی ہنسنے لگا اور بولا۔ ''کیوں ہنس رہی ہو عا...... زلیخا؟'' وہ عالیہ کہتے کہتے رک گیا۔

''آپ سوتے ہوئے بہت اچھے لگتے ہو جی۔'' وہ سادگی سے بولی۔ ''پھر آپ کیا کہہ رہے تھے...... وہ آئی...... بس مجھے ایک دم ہنسی آ گئی اور آپ کی نیند خراب ہو گئی۔''

''نہیں، میری نیند تو بالکل خراب نہیں ہوئی۔'' عامر نے کہا۔ ''ٹائم کیا ہوا ہے؟ میرا مطلب ہے کہ کیا بجا ہے اس وقت؟''

''گھڑی تو جی میرے پاس نہیں ہے۔ بابا کے پاس بھی نہیں ہے۔ وہ تو سورج کے گھٹتے بڑھتے سائے سے وقت کا اندازہ لگاتا ہے۔''

اچانک عامر کو اپنی گھڑی کا خیال آیا۔ گھڑی اس کے ہاتھ پر نہیں تھی۔

''میں بس اتنا جانتی ہوں کہ سورج سر پر آ گیا ہے۔''

عامر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ''میں اتنی دیر تک سوتا رہا؟''

''بابا نے کہا تھا کہ آپ کو سونے دوں، نہ جانے آپ زخمی حالت میں پیدل کہاں سے چکراتے ہوئے آئے ہو،

تھکن تو ہو گئی ہو گی۔'' پھر وہ چونک کر بولی۔ ''آپ ٹھہرو، میں آپ کے لیے چائے لاتی ہوں۔''

''چائے؟'' عامر چونکا۔ ''تمہیں چائے بنانا آتی ہے؟''

''لو جی، یہ کون سی بڑی بات ہے؟'' زلیخا منہ بنا کر بولی۔ ''بابا نے بتایا تھا کہ پہلے دودھ کو اچھی طرح کھولا لینا، پھر اس میں چائے کی پتی اور چینی ڈال دینا، چائے تیار ہو جائے گی۔ میں ابھی لے کر آتی ہوں۔'' وہ ہرنی کی طرح قلانچیں بھرتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ وہ واپس آئی تو اس نے ایک تھالی میں دو گلاس رکھے ہوئے تھے۔

''اتنی چائے؟'' عامر نے حیرت سے کہا۔

''ان میں سے ایک گلاس میں دودھ ہے۔'' زلیخا نے ہنس کر کہا۔ ''بھوری کا ملائی دار دودھ اور بابا کی خاص الخاص دوائی۔ آپ کو جی پہلے دودھ کا گلاس پینا ہو گا۔ بابا نے کہا تھا کہ آپ کو ابھی ایک اور خوراک کی ضرورت ہے۔''

اس سفوف کے فائدے عامر دیکھ ہی چکا تھا۔ اس وقت بھی اس کے زخم میں تکلیف برائے نام تھی۔ وہ دل پر جبر کر کے دودھ کا گلاس پی گیا۔ اس بار نہ جانے کیوں اسے پہلے جیسا لطف نہیں آیا۔ پہلے اسے زلیخا نے پشت سے سہارا دے کر اپنے ہاتھ سے دودھ پلایا تھا۔ وہ دوا سمجھ کے دودھ کے گلاس کو ایک ہی سانس میں چڑھا گیا۔ پھر زلیخا نے دوسرا گلاس اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ اس میں چائے تھی۔ عامر کو ایک عرصے بعد چائے کی شکل دکھائی دی تھی۔ اس نے بے تابی سے چائے کا گھونٹ بھرا تو اس کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ وہ چائے کم اور شیرہ زیادہ تھی۔ اتنی میٹھی کہ اس کے ہونٹ آپس میں چپکے جا رہے تھے۔

''تمہیں تندوری پراٹھا بنانا آتا ہے؟'' عامر نے پوچھا۔

''لو جی، یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ بابا تو بڑے شوق سے تندوری پراٹھے کھاتا ہے۔ بھوری کے دودھ کا گھی اتنا مزیدار ہوتا ہے کہ آپ بار بار تندوری پراٹھے کی فرمائش کرو گے۔'' زلیخا نے کہا۔

''بار بار کو چھوڑو، مجھے ابھی ایک بار تو کھلا دو، بھوک کے مارے میرا دم نکلا جا رہا ہے۔'' عامر نے اسے وہاں سے ٹالنے کو کہا۔

''ہائے میں مر گئی۔'' زلیخا نے کہا۔ ''آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا جی، میں ابھی تندور گرم کرتی ہوں۔ آپ پہلے منہ ہاتھ دھو لو۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

وہ وہاں سے ہٹی تو عامر نے چائے کچے فرش پر پھینک دی اور گلاس اس تھالی میں رکھ دیا جو زلیخا لے کر آئی تھی۔ اس کے بیگ میں ٹوتھ پیسٹ، برش اور شیو کا سامان بھی موجود تھا۔ اس نے پہلے برش کیا، پھر لوٹے سے منہ دھویا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

☆☆☆

دو دن بعد عامر کا زخم بالکل سوکھ گیا اور زخم پر کھرنڈ آ گیا۔ وہ اپنے لیے مقامی کپڑے لینا چاہتا تھا لیکن اس کے پاس پیسے نہیں تھے۔ اس کے پرس میں پاکستانی کرنسی تھی۔ وہ اس کے لیے نہ صرف کاغذ کے ٹکڑوں کی طرح ناکارہ تھی بلکہ خطرناک بھی تھی۔ کوئی اس کے پاس وہ کرنسی دیکھ لیتا تو اس کی جان کے لالے پڑ جاتے۔

عامر نے اب گھر میں ہی ہلکی پھلکی ایکسرسائز بھی شروع کر دی تھی۔

دو دن مزید گزر گئے۔ اب عامر کو فکر تھی کہ یہاں سے کیسے نکلے اور کس طرف جائے۔ بابا یا زلیخا کو معلوم نہیں تھا کہ سرحد یہاں سے کتنی دور ہے اور اب وہ دشمن کے قبضے میں ہے یا پاکستانی فوج کے قبضے میں۔ عامر کو نقشہ گم ہونے کا شدید افسوس تھا ورنہ وہ نقشے کی مدد سے معلوم کر لیتا کہ اس وقت وہ پاکستانی سرحد سے کتنے فاصلے پر ہے۔ اتنا بہرحال اسے یقین تھا کہ وہ اپنی سرحد سے زیادہ فاصلے پر نہیں ہے۔

بابا اور زلیخا کے علاوہ دو افراد اور بھی تھے جنہیں عامر کی یہاں موجودگی کا علم تھا۔ چاچا خیر دین اور چاچا کرامت۔ ان دونوں کو بھی اس لیے علم تھا کہ بابا کے ساتھ مسجد سے وہ بھی نکلے تھے اور بابا ان دونوں کی مدد سے عامر کو گھر لے کر آیا تھا۔ وہ دونوں بھی پاکستانی فوج کے ہمدرد تھے۔ اس وقت بھارت کے مسلمانوں کی ہمدردیاں عموماً پاکستان کے ساتھ ہوتی تھیں۔ موجودہ نسل تو پاکستان اور پاکستانی فوج سے شدید نفرت کرتی ہے۔ اب یہ ان کا دکھاوا ہے کہ بھارت سرکار ان سے راضی رہے، انہیں محبِ وطن سمجھے یا پھر واقعی وہ پاکستان سے نفرت کرتے ہیں؟ ویسے آج کل وہاں فیشن بھی چل نکلا ہے پاکستان مخالفت کا۔ اس وقت بہرحال وہ پاکستان کے ساتھ تھے۔

☆☆☆

عامر کو وہاں رہتے ہوئے ایک ہفتہ گزر گیا تھا۔ وہ اب ہر طرح سے چاق و چوبند تھا۔ کرامت چاچا اس کے لیے ایک کرتہ پاجامہ اور پمپ شوز لے آئے تھے۔ عامر وہاں سے نکلنے کے منصوبے بنا رہا تھا۔

اس رات بھی وہ اندر کمرے میں سو رہا تھا کہ بمبار طیاروں کی چنگھاڑتی ہوئی آوازوں سے وہ اچھل کر اٹھ بیٹھا۔ پھر اسے دور کہیں ٹینکوں کی گڑگڑاہٹ اور ایل ایم جی کی فائرنگ کی مانوس تڑتڑاہٹ سنائی دی۔ آوازیں بہت دور سے آ رہی تھیں لیکن رات کا سناٹا تھا۔ عامر اس قسم کی آوازوں سے خوب مانوس تھا اس لیے اسے وہ آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

بمبار طیاروں کے گزرتے ہی بابا گھبرایا ہوا اس کے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے پیچھے پیچھے سہمی ہوئی زلیخا بھی تھی۔

بابا نے تشویشناک لہجے میں کہا۔ ”عامر پتر! کیا جنگ ہمارے علاقے میں بھی شروع ہو گئی ہے؟“

”جنگ تو کہیں بھی شروع ہو سکتی ہے بابا۔“ عامر نے جواب دیا۔ ”آپ اتنے پریشان نہ ہوں۔ میرا اندازہ ہے کہ یہاں کوئی ایسی اہم چیز نہیں ہے جس کے لیے جنگ یہاں تک پہنچے، جہاز شاید یہاں سے گزرے ہوں گے۔“

عامر کو اپنا لہجہ خود بھی کھوکھلا لگ رہا تھا۔ اس کے پاس علاقے کا نقشہ نہیں تھا اور کسی دوسرے ذریعے سے اسے اطلاع مل نہیں سکتی تھی۔۔۔۔ صرف زلیخا کا بیان تھا کہ وہاں دور تک بھارتی فوج کی کوئی چوکی نہیں ہے۔ وہ گھر میں رہنے والی گاؤں کی سیدھی سادی لڑکی تھی۔ اسے کیسے معلوم ہو سکتا تھا کہ بھارتی فوج کہاں ہے، سرحد وہاں سے کتنی دور ہے اور نزدیک کوئی اسلحہ ڈپو یا فوجی تنصیب ہے یا نہیں؟

جہاز گزرنے کے بعد اب سناٹا طاری ہو گیا تھا لیکن بہت دور سے ایل ایم جی کی فائرنگ کی موہوم سی آوازیں عامر کو اب بھی سنائی دے رہی تھیں۔

”بابا، پریشان نہ ہوں اور جا کر سو جائیں، اللہ خیر کرے گا۔“

”آپ کی نیند خراب ہو گئی ہے جی۔“ زلیخا نے کہا۔ ”میں آپ کے لیے چائے لاؤں؟“ زلیخا نے گویا اس کے دل کی بات کہہ دی۔ اسے اس وقت خود بھی چائے کی طلب ہو رہی تھی۔ عامر نے زلیخا کو چائے بنانا سکھا دی تھی، اب وہ اتنی بہترین چائے بناتی تھی کہ عامر کو اپنی میس کی چائے یاد آ جاتی تھی۔

اچانک دروازے پر دستک ہوئی تو بابا اور زلیخا کے ساتھ ساتھ عامر بھی اچھل پڑا۔ عامر نے پھرتی سے اپنا ریوالور نکال لیا اور کمرے کے دروازے کی اوٹ میں ہو گیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

''کون ہے؟'' بابا نے تشویش زدہ لہجے میں پوچھا۔
''میں ہوں کرامت۔'' باہر سے کرامت چاچا کی آواز آئی۔
بابا نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا اور بولا۔ ''خیریت تو ہے کرامت، اس وقت کیسے آئے؟''
''بہت بری خبر ہے امام صاحب۔'' کرامت چاچا نے کہا۔ ''پاکستانی فوجیں اس طرف سے پیش قدمی کر رہی ہیں۔ انہیں روکنے کے لیے ہماری فوج یہاں جمع ہو رہی ہے۔ یہ خبر لالہ سکھ دیو کا بیٹا لایا ہے۔ وہ بتا رہا تھا کہ ہمارے فوجی ابھی تھوڑی دیر میں گاؤں والوں سے علاقہ خالی کرنے کو کہیں گے۔''
''علاقہ خالی کرنے کو؟'' بابا نے کھوئے کھوئے سے لہجے میں پوچھا۔ ''لیکن ہم جائیں گے کہاں؟''
''کہیں بھی جائیں۔'' کرامت چاچا نے تلخی سے کہا۔ ''یہاں رہ کر بھی تو مارے ہی جائیں گے، کسی ایک فوج کے ہاتھوں۔''
''فوج گاؤں والوں کو خواہ مخواہ تو نہیں مارتی۔'' بابا نے کہا۔
''توپ کا گولہ یا طیارے سے برسنے والے بم یہ نہیں دیکھتے کہ ان کی زد میں فوجی ہیں یا عام آدمی۔'' کرامت چاچا نے کہا۔ ''میں تمہیں یہ بتانے آیا تھا کہ تم چلنے کی تیاری کرلو۔ روپ نگر والے ابھی سے علاقہ خالی کر رہے ہیں۔ میں اب چلتا ہوں۔ مجھے خود بھی تیاری کرنا ہے۔''
''لیکن تم جاؤ گے کہاں؟'' بابا نے پوچھا۔
''جدھر تقدیر لے جائے۔'' کرامت چاچا نے کہا اور تیز تیز قدموں سے روانہ ہو گئے۔
''چلیں بابا، ہم بھی تیاری کریں۔'' زلیخا نے کہا۔
''بیٹا ہمارے پاس ہے ہی کیا۔ کچھ کپڑے ہیں، وہ ایک گٹھڑی میں باندھ لیں گے۔''
عامر کی حالت عجیب ہو رہی تھی۔ وہ ان سے یہ بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ میرے ساتھ چلیں۔ وہ تو خود اپنی منزل سے نا آشنا تھا۔
ابھی وہ یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ اچانک فوجی ٹرکوں کے انجنوں کے شور سے پورا گاؤں گونج اٹھا۔ پھر میگا فون پر ایک کرخت آواز سنائی دی۔ ''گاؤں کے واسیو! ہمیں اطلاع ملی ہے کہ اس گاؤں میں پاکستانی فوج کے کچھ گھس بیٹھیے موجود ہیں۔ ہم نے روپ نگر سے بھی دو کو پکڑا ہے۔ اگر کسی گھر نے انہیں شرن (پناہ) دے رکھی ہے تو وہ خود ہی انہیں ہمارے حوالے کر دے ورنہ گھر گھر تلاشی ہوگی اور پورے گاؤں والے بے موت مارے جائیں گے۔''
اعلان سن کر بابا بوکھلا گیا۔ اس نے بے بسی سے عامر کی طرف دیکھا۔ عامر نے کہا۔ ''آپ پریشان نہ ہوں بابا! میں ابھی اور اسی وقت نکل جاتا ہوں۔''
''لیکن آپ جاؤ گے کہاں؟'' زلیخا نے کہا۔ ''اب تو یہاں بھی فوجی موجود ہیں۔ گاؤں والے ایک دوسرے کو پہچانتے ہیں۔ آپ کو دیکھ کر کوئی بھی فوجیوں کو خبر کر دے گا کہ کوئی انجان آدمی یہاں موجود ہے۔''
''اس کی تم فکر مت کرو۔'' عامر نے کہا۔ ''میں ایک فوجی ہوں اور ایسے حالات سے نمٹنا جانتا ہوں۔''
''تم ابھی یہیں ٹھہرو پتر۔'' بابا نے کہا۔ ''جب گھر گھر تلاشی شروع ہوگی تو تم پیچھے والے راستے سے نکل جانا۔''
''نہیں بابا، دشمن اس وقت چوکنا ہوگا۔ آپ کو شاید معلوم نہیں کہ تلاشی کا طریقہ کیا ہوتا ہے؟ فوجی پورے علاقے کی ناکا بندی کر دیتے ہیں۔ اس وقت تو یہاں سے نکلنا خود کو موت کے منہ میں دینے کے برابر ہوگا۔''
''ایسا نہ کہیں جی۔'' زلیخا روہانسی آواز میں بولی۔ ''آپ اپنی جان بچاؤ اور ابھی نکل جاؤ۔''
عامر کا بیک پیک (پیٹھ پر لادنے والا بیگ) تیار تھا۔ اس نے وہ اٹھایا، پھر کچھ سوچ کر رکھ دیا اور بولا۔ ''بابا اگر کوئی تھیلا ہے تو مجھے دے دیں۔ فوجی مجھے اس بیگ کی وجہ سے بھی شناخت کرلیں گے۔''
''تھیلا تو نہیں ہے۔'' بابا نے کہا۔ ''بڑی والی بوری ہے۔''
''ہاں، وہ بہترین ہے۔'' عامر نے کہا۔ ''میرا سارا سامان اس میں آجائے گا اور کسی کو شک بھی نہیں ہوگا۔'' عامر نے جلدی جلدی اپنے بیگ کا سامان بوری میں منتقل کیا، پھر بوری کو مضبوط رسی کے ٹکڑے سے باندھ لیا۔
''ابھی سویرا ہونے میں تھوڑی دیر ہے۔'' بابا نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم فجر کے وقت یہاں سے نکل جانا۔ اس وقت تک لوگ اپنا کام کاج شروع کر دیتے ہیں۔ ابھی نکلو گے تو فوجیوں کو شک ہو جائے گا۔''
بابا کی بات درست تھی۔ عامر نے آدھا گھنٹا مزید رکنے کا فیصلہ کرلیا۔
اچانک دروازے پر زوردار دستک ہوئی اور کوئی باہر سے کرخت لہجے میں بولا۔ ''دروازہ کھولو۔''
''کون ہے؟'' بابا نے پوچھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

''ہم فوجی ہیں، تمہارے گھر کی تلاشی لینے آئے ہیں۔''

''یہاں کوئی چھپنے کی جگہ ہے؟'' عامر نے گھبرا کر زلیخا سے پوچھا۔

''ہاں گودام والے کمرے میں اوپر ایک دو چھتی ہے۔ آپ اس میں چلے جاؤ۔ وہاں پرانا سامان اور اناج کی ایک دو بوریاں ہیں۔''

عامر پھرتی سے اناج والے کمرے میں داخل ہوا۔ وہاں واقعی دو چھتی موجود تھی۔ اس نے پہلے اپنا خالی بیگ اوپر پھینکا، پھر سامان والی بوری پھینک کر خود بھی اچھل کر دو چھتی کی دیوار سے لٹک گیا، دوسرے ہی لمحے وہ بھی اوپر اندھیرے میں غائب ہوگیا۔

بابا نے شاید دروازہ کھول دیا تھا۔ صحن سے کرخت آوازیں آرہی تھیں۔

''تو نے اسے کہاں چھپایا ہے بڈھے؟'' ایک درشت آواز عامر کے کانوں سے ٹکرائی۔ اس نے بوری کھولی اور بہت آہستگی سے اپنا پوائنٹ فور ایٹ کا سروس ریوالور نکال لیا۔ اس نے بوری کے ایک کونے میں ہاتھ ڈال کر ریوالور کی فاضل گولیاں نکال کر اپنے کُرتے کی جیب میں بھر لیں۔

''آپ پورے گھر کی تلاشی لے لیں میجر صاحب۔'' بابا نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔ ''اگر کوئی ہو تو اس کے ساتھ بے شک مجھے بھی پکڑ لیں۔''

''اونہہ میجر صاحب۔'' عامر زیرِ لب مسکرایا۔ وہ جانتا تھا کہ اس قسم کے چھوٹے موٹے کام سپاہی، لانس نائیک وغیرہ کرتے ہیں۔ میجر صاحب کا خطاب سن کر اس کے انداز میں مزید رعونت آگئی۔

''تو بتا اوئے۔'' فوجی کرخت لہجے میں کسی سے مخاطب ہوا۔ ''تو نے ہی بتایا تھا نا کہ یہاں کوئی چھپا ہوا ہے؟''

''رگھو داس؟'' بابا نے کسی کو مخاطب کیا۔ ''تم نے بلا سوچے سمجھے مجھ پر اتنا بڑا الزام لگا دیا۔ مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی۔''

''مجھے تو شک گزرا تھا چاچا۔'' رگھو داس کی آواز آئی۔ ''میں نے آپ کے گھر سے کسی مرد کی آواز سنی تھی۔''

''اوئے، تو صرف اس شک پر ہمیں یہاں لے آیا؟ صرف آواز سن کر۔'' پھر چٹاخ کی آواز آئی۔ فوجی نے شاید رگھو داس کو تھپڑ مارا تھا۔ ''چل نکل یہاں سے۔'' اس نے

خوشبو

جہاز میں برابر کی سیٹ پر نہایت خوش جمال اور سبک اندام خاتون براجمان تھیں اور نخوت بھرے انداز میں ایک کتاب پڑھنے میں مصروف تھیں۔ وہ بار بار پہلو بدل کر کوشش کر رہا تھا کہ اسے خاتون سے بات کرنے کا موقع ملے مگر خاتون نے اسے بُری طرح نظرانداز کیا ہوا تھا۔

آخر اس نے ہمت کر کے ہچکچاتے ہوئے، خاتون سے کہا۔ ''معاف کیجیے، آپ نے جو پرفیوم لگایا ہوا ہے، اس کا کیا برانڈ ہے؟''

''کیوں؟'' خاتون نے پھاڑ کھانے والے انداز میں اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

''وہ...... وہ...... دراصل اس کی خوشبو بہت عمدہ ہے۔ یہ میں اپنی بیوی کو تحفے میں دینا چاہتا ہوں!'' وہ ہکلاتے ہوئے بولا۔

''ہرگز یہ غلطی نہ کرنا۔'' خاتون نے خشک لہجے میں اسے تنبیہ کی۔ ''اس نے یہ خوشبو استعمال کی تو اس کا کوئی اوباش ہم سفر اسی بہانے اس سے بے تکلف ہونے کی کوشش کرے گا۔''

مرحا گل، درابن کلاہ سے

شاید رگھو داس کو مخاطب کیا تھا۔

''استاد جی۔'' دوسرے فوجی کی آواز آئی۔ ''یہ چھوری بہت سندر ہے۔ اسے بھی ساتھ لے چلیں؟''

''ہاں اسے تو ساتھ لے ہی چلیں گے۔'' استاد جی نے جواب دیا۔

عامر کا خون کھولنے لگا۔ استاد جی یقیناً نائیک کے عہدے کا شخص تھا۔ فوج میں نائیک کو استاد جی کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔

''مگر ابھی نہیں۔'' استاد جی نے کہا۔ ''ابھی تو میجر ملہوترا صاحب بھی موجود ہے۔ اس نے لڑکی کو دیکھ لیا تو پھر وہ اسے لے جائے گا۔ ایسی بانکی اور سندر ناری تو میں نے پہلی دفعہ دیکھی ہے۔''

''یہ تم لوگ کیسی باتیں کر رہے ہو؟'' بابا نے غصے میں چیخ کر کہا۔ ''یہ بیٹی ہے میری۔''

''اسے سنبھال کر رکھنا بڈھے، ہم کل پھر آئیں گے۔''

''میں اسے اپنے ہاتھوں سے مار دوں گا لیکن اس کی عزت پر آنچ نہیں آنے دوں گا۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

''بکواس بند کر بڈھے۔'' استاد جی نے چیخ کر کہا اور شاید بابا پر کسی چیز سے وار بھی کیا تھا۔

اس کی اذیت ناک کراہ گونجی تھی اور پھر ایسی آواز آئی تھی جیسے کوئی دھم سے زمین پر گرا ہو۔

''بابا!'' زلیخا ہذیانی انداز میں چیخی۔ ''آنکھیں کھولو بابا۔''

''ابھی یہ مرا نہیں ہے۔'' استاد جی نے مکروہ انداز میں کہا۔ ''لیکن آئندہ اس نے بکواس کی تو ہمارے ہاتھوں مر جائے گا۔''

''تم کیا سمجھتے ہو، میں یہاں بیٹھ کر تمہارا انتظار کروں گی۔ تمہیں یہاں میری جگہ میری لاش ملے گی۔ اب دفعہ ہو جاؤ یہاں سے۔''

''یار موہن۔'' استاد جی بولے۔ ''چھوری تو بہت تیکھی ہے۔''

''استاد جی اسے ساتھ ہی لے چلو ورنہ یہ مسلمان چھوریاں اپنی جان دے دیتی ہیں۔''

''کہتا تو تو ٹھیک ہے۔ اسے ابھی لے چلو، ہمیں اس طرف آتے کسی نے دیکھا تو نہیں ہے؟''

''ہم تو گاؤں کے راؤنڈ پر نکلے ہیں۔ کسی کو کیا معلوم کہ اس وقت ہم کہاں ہیں؟''

''استاد جی۔'' موہن نے چٹخارا لے کر کہا۔ ''ابھی بہت وقت ہے۔ ایک گھنٹے سے پہلے تو کوئی ہمیں ڈھونڈے گا بھی نہیں پھر کیا خیال ہے یہیں...... بعد میں تو میجر صاحب، اسے چھوڑے گا نہیں۔''

''میرے نزدیک مت آنا۔'' زلیخا بپھر کر بولی۔ ''چھوڑ مجھے کتے کمینے۔'' وہ بری طرح چیخی۔

عامر کے ذہن میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔ خون اس کی کنپٹیوں پر ٹھوکریں مارنے لگا۔

زلیخا بُری طرح چیخ رہی تھی۔

''اس سندری کا منہ بند کر۔'' استاد جی نے کہا۔ ''ورنہ یہ چیخ چیخ کر پورے گاؤں کو اکٹھا کر لے گی۔''

عامر سے ضبط کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ اس نے ریوالور لوڈ کر کے ہاتھ میں لیا اور نتائج کی پروا کیے بغیر دو چھتی سے نیچے آ گیا۔ وہ دبے پاؤں آگے بڑھا۔ اس نے کھلے ہوئے دروازے کی اوٹ سے دیکھا تو وہاں کا منظر دیکھ کر وہ گویا ہوش و حواس کھو بیٹھا۔ ان لوگوں نے زلیخا کی قمیص پھاڑ کر پھینک دی تھی اور اب وہ اس کے ہاتھ دوپٹے سے باندھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

عامر اچھل کر ایک دم باہر نکل آیا اور چیخ کر بولا۔ ''ہینڈز اپ۔''

وہ دونوں یوں اچھلے جیسے انہوں نے کوئی بھوت دیکھ لیا ہو پھر وہ دونوں اپنی جگہ پر ساکت ہو گئے۔ زلیخا نے جھپٹ کر اپنا دوپٹا جسم پر لپیٹ لیا اور اپنا منہ کھولنے لگی۔

''اپنا منہ دیوار کی طرف کرو۔''

''مگر تو ہے کون؟'' ان میں سے ایک شخص بولا۔ اس کے کندھے پر دو فیتے لگے ہوئے تھے۔ گویا وہی استاد جی تھا۔

''میں نے کہا ہے کہ اپنا منہ دیوار کی طرف کر۔'' عامر دہاڑا۔

''اگر تو پاکستانی فوجی ہے تو یہاں سے بچ کر نکل نہیں سکے گا۔'' استاد جی نے کہا۔

عامر نے بپھر کر اس کے چہرے پر ریوالور کی بھاری نال مار دی۔ ''جو کہہ رہا ہوں، وہ کر۔'' عامر نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''ورنہ اب اس ریوالور سے گولی نکلے گی، سمجھا۔ میں بچوں یا نہ بچوں لیکن تجھ جیسے حرام زادوں کو ضرور ختم کر کے جاؤں گا۔''

عامر کے تیور دیکھ کر دونوں نے جلدی سے اپنے منہ دیوار کی طرف کر لیے۔

زلیخا اس دوران میں اندر والے کمرے میں بھاگ چکی تھی۔

عامر کو بابا کی فکر بھی تھی۔ وہ بے سدھ زمین پر گرا ہوا تھا۔ ان خبیثوں نے شاید اس کے سر پر رائفل کا بٹ مارا تھا۔

عامر نے ریوالور نال کی طرف سے پکڑا اور باری باری دونوں کی کھوپڑیوں پر رسید کر دیا۔ پوائنٹ فور فائیو کے بھاری ریوالور کی ضرب خاصی شدید تھی۔ وہ دونوں کوئی آواز نکالے بغیر زمین پر ڈھیر ہو گئے۔

عامر، بابا کی طرف لپکا۔ اس دوران میں زلیخا بھی دوسرے کپڑے پہن کر وہاں آ چکی تھی۔ بابا کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ لیکن اس کی سانس چل رہی تھی۔

عامر نے بابا کو اٹھا کر چارپائی پر لٹایا۔ اس کے سر پر خاصا گہرا زخم تھا۔ اس نے دو چھتی سے سامان والی بوری اتاری اور اس میں سے ٹنکچر آیوڈین نکال کر بابا کا زخم صاف کیا اور اس کے سر پر پٹی باندھ دی۔

''بابا کو گرم دودھ میں وہی سفوف پلاؤ۔ میرا مطلب ہے کہ بابا کی وہ خصوصی دوائی پلاؤ تم بابا کو سنبھالو۔ میں ذرا اس رگھو کی خبر لے لوں۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

رگھو کو دفع کریں جی۔'' زلیخا نے کہا۔ وہ عامر سے خاصی جھینپی جھینپی اور شرمندہ تھی اور اس سے نظریں نہیں ملا رہی تھی۔

''مجھے بتاؤ رگھو کا گھر کون سا ہے؟'' عامر نے کہا۔

''صرف رگھو جانتا ہے کہ یہ دونوں یہاں آئے تھے۔ میں ان دونوں کو مار کے کھیتوں میں پھینک دوں گا۔ اس کے ساتھ ہی رگھو کی لاش بھی ہوگی ورنہ اب وہ لوگ آئے تو صرف دو آدمی نہیں ہوں گے، پھر وہ تمہیں تو کسی قیمت پر نہیں چھوڑیں گے۔''

عامر نے احتیاط کے طور پر باہر کا جائزہ لیا تو اسے ایک سایہ تیزی سے ایک طرف جاتا دکھائی دیا۔

تمام احتیاط بالائے طاق رکھ کر عامر چیتے کی طرح سے دوڑا اور اس سائے کو دبوچ لیا۔ اس نے خود کو چھڑانے کی کوشش کی لیکن عامر کی گرفت بہت مضبوط تھی۔ اس نے اپنے بائیں ہاتھ کے حلقے میں اس شخص کی گردن دبوچ رکھی تھی۔

''کون ہے تو اور وہاں کیا کر رہا تھا؟'' عامر نے پوچھا۔

''میں رگھو ہوں.... میں صرف اس لیے وہاں رک گیا تھا کہ وہ فوجی بہت دیر تک گھر سے باہر نہیں نکلے تھے۔''

عامر نے اس کی پسلیوں میں ریوالور کی نال چبھوتے ہوئے کہا۔ ''چل میرے ساتھ۔''

''میرا کوئی قصور نہیں ہے جی...... میں تو......''

''آواز بند کر ورنہ یہیں گولی مار دوں گا۔''

وہ سہم کر خاموش ہو گیا۔ عامر اسے لے کر اندر داخل ہوا اور دروازہ بند کر کے زنجیر چڑھا دی۔

بابا اب ہوش میں تھا لیکن کچھ بول نہیں رہا تھا...... بس پھٹی پھٹی نظروں سے عامر اور رگھو کو دیکھ رہا تھا۔

رگھو کی نظر دونوں فوجیوں پر پڑی تو وہ سہم کر بولا۔ ''کیا تم نے انہیں مار دیا؟''

''ہاں، اب تیری باری ہے۔'' عامر نے کہا۔ ''ان دونوں کو تو ہی لایا تھا نا؟''

''یہ لوگ زبردستی مجھے یہاں لے کر آئے تھے۔''

عامر نے اس پر اتنی زور سے اس کے منہ پر تھپڑ مارا کہ وہ لڑکھڑا کر گر گیا۔ ''میں جھوٹ بالکل نہیں سنوں گا۔'' عامر نے درشت لہجے میں کہا۔ ''انہیں یہاں کیوں لایا تھا؟''

''میں نے یہاں سے گزرتے ہوئے آپ کی آواز سنی تھی۔ زلیخا بہت زور زور سے ہنس رہی تھی۔ اس کے ساتھ آپ بھی ہنس رہے تھے۔ میں نے چاچا کو تو مسجد کی طرف جاتے دیکھا تھا۔ مجھے حیرت ہوئی تھی کہ زلیخا کس سے باتیں کر رہی ہے؟''

اچانک وہ فوجی کسمسانے لگے۔ عامر نے رگھو کے سر پر ریوالور کا دستہ مار کے اسے ناک آؤٹ کر دیا۔

پھر اس نے بال پکڑ کر استاد جی کو کھڑا کرنے کی کوشش کی لیکن وہ اٹھنے کے بجائے دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

''کون سی رجمنٹ ہے تمہاری؟'' عامر نے جارحانہ لہجے میں پوچھا۔

استاد جی خاموش رہا تو عامر نے ریوالور کی نال اس کے کھلے ہوئے منہ میں ڈالی اور بولا۔ ''میں نے پوچھا ہے کون سی رجمنٹ ہے تمہاری؟''

اس نے حلق سے کچھ آوازیں نکالیں اور اثبات میں سر ہلایا۔

عامر نے ریوالور اس کے منہ سے نکال لیا۔ پھر اس نے زلیخا سے کہا۔ ''میں ان ناپاک لوگوں پر اپنی ایک گولی ضائع نہیں کروں گا، میرا چاقو تو مجھے دو۔''

زلیخا نے چاقو عامر کو دے دیا۔ اس شکاری چاقو کا لمبا اور تیز دھار پھل دیکھ کر ان دونوں کے چہرے ست گئے۔ انہیں شاید یقین ہو گیا تھا کہ وہ پاکستانی فوجی انہیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔

''ہاں بولو، کون سی رجمنٹ ہے تمہاری؟''

''ایک سو چار جاٹ رجمنٹ۔'' استاد جی نے کہا۔

''تم لوگوں نے یہاں جو چوکی بنائی ہے، اس میں کتنے یونٹس ہیں؟'' عامر نے پوچھا۔

''اس چوکی پر ہمارا صرف ایک یونٹ ہے۔''

''اتنی کم نفری سے تم لوگ جنگ کب لڑتے ہو؟''

''ہمارے کمانڈرز کو شک تھا کہ پاکستان آرمی یہاں بھی ایک محاذ کھول سکتی ہے۔ پاکستان آرمی نے اس طرف بھی ایک محاذ کھول دیا ہے۔ ہم نے اپنے ڈویژن کمانڈر کو انفارم کر دیا ہے۔ ہماری رجمنٹ تو ایڈوانس پارٹی (ہراول دستے) کے طور پر آئی تھی۔ اب دو دن میں یہاں ہمارا ایک ڈو (ڈویژن) پہنچ جائے گا۔''

''اس وقت یہاں تمہارا سی او (کمانڈنگ آفیسر) کون ہے؟'' عامر نے پوچھا۔

''اس ایڈوانس پارٹی کے ساتھ سی او صاحب نہیں آئے ہیں۔'' نائیک نے جواب دیا۔ ''ہاں ہمارے ٹو آئی سی (سیکنڈ اِن کمانڈ) میجر ارون ملہوترا صاحب ہیں۔'' وہ

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

طوطے کی طرح بول رہا تھا۔

عامر نے سنا تھا کہ بھارتی فوجی بزدل ہوتے ہیں لیکن اسے یہ توقع نہیں تھی کہ وہ موت سے اتنے خوف زدہ ہوتے ہیں کہ ریوالور سامنے دیکھ کر سب کچھ اگل دیتے ہیں۔

''ایڈوانس پارٹی کی نفری کتنی ہے؟'' عامر نے پوچھا۔

بھارتی نائیک اس کے جواب میں خاموش رہا۔

''کیا میری بات سمجھ میں نہیں آئی؟'' عامر نے درشت لہجے میں پوچھا۔ ''ایڈوانس پارٹی کی نفری کتنی ہے؟'' اس نے اپنا سوال دہرایا اور چاقو اس کی گردن پر رکھ دیا۔

''مم...... میں حساب لگا رہا ہوں...... ٹھیک طرح سے تو میں بھی نہیں جانتا لیکن...... ابھی ہماری یہاں صرف تین کمپنیاں ہیں۔''

''تم بتاؤ؟'' وہ سپاہی کی طرف مڑا جو منہ پھاڑے عامر اور اپنے استاد جی کی باتیں سن رہا تھا۔

''میں کیا بتاؤں جی۔'' اس نے کہا۔ ''میں تو رنگروٹ ہوں...... ابھی دو مہینے پہلے ہی ٹریننگ ختم کر کے آیا ہوں۔ سب کچھ استاد جی جانتے ہیں۔'' وہ تھوک نگل کر بولا۔

''میجر ملہوترا کا ٹینٹ کس طرف ہے؟'' عامر نے نائیک سے پوچھا۔

''یہاں ہم نے کانٹوں والی ایک باڑ لگائی ہے۔ سامنے کے حصے میں اے کمپنی (الفا) اور سی کمپنی (چارلی) ہے۔ اس کے پیچھے لنگر ہے۔ لنگر کے بعد ہیڈ کوارٹر کمپنی ہے میجر صاحب اسی کمپنی کے پیچھے ایک ٹینٹ میں رہتا ہے۔''

''روپ نگر سے پکڑے ہوئے قیدی کہاں ہیں؟'' عامر نے پوچھا۔

''ہیڈ کوارٹر کے سامنے کوارٹر گارڈ ہے۔ ان دونوں کو وہیں رکھا گیا ہے مگر وہ اپنی بات چیت اور چال ڈھال سے فوجی نہیں لگتے۔''

''تمہارے پاس اسلحہ اور گاڑیاں کتنی ہیں؟'' عامر نے پوچھا۔

''اسلحے کا پتا تو میجر صاحب کو ہوگا۔'' نائیک نے کہا۔

''زلیخا!'' عامر نے اسے مخاطب کیا۔ ''تم اندر جاؤ۔''

زلیخا اٹھ کر اندر چلی گئی۔ اس وقت عامر کے چہرے پر ایسی سفاکیت تھی کہ نائیک گڑگڑانے لگا۔ ''میں نے سب کچھ تو آپ کو سچ سچ بتا دیا ہے۔ اب آپ ہمیں جانے دیں۔''

''تمہیں یہاں سے جانے دوں تا کہ خود بے موت مارا جاؤں اور اس گھر کے لوگ بھی میرے ساتھ ساتھ موت کے منہ میں چلے جائیں۔''

''میں...... آپ کو...... وچن دیتا ہوں کہ...... آپ کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔''

''تم کیا اور تمہارا وچن کیا۔'' عامر نے چاقو کی دھار پر نظریں جما کر کہا۔

''میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں صاحب...... آپ ضرور پاکستانی فوج کے کوئی افسر ہیں۔ میں غریب آدمی ہوں صاحب، مجھے جانے دیں۔''

عامر نے اچانک چاقو پوری قوت سے اس کے سینے میں عین دل کے مقام پر پیوست کر دیا۔ اسے آواز نکالنے کا موقع بھی نہیں ملا۔ عامر نے ایک طرف ہٹ کر اس کے سینے سے چاقو نکالا تو خون کا فوارہ سا اچھل پڑا۔ نائیک نے کٹی ہوئی مرغی کی طرح زمین پر چند لمحے ایڑیاں رگڑیں اور ساکت ہو گیا۔

نائیک کی موت دیکھ کر سپاہی واویلا کرنے لگا۔ ''مجھے مت ماریں صاحب! مجھے تو استاد جی یہاں لائے تھے۔ میں تو بالکل نردوش (بے قصور) ہوں۔''

''تمہارا کام اپنے لوگوں کی حفاظت کرنا ہے یا ان کی عزت لوٹنا؟'' عامر نے درشت لہجے میں کہا۔

''وہ...... بس...... غلطی ہو گئی صاحب...... میں......''

عامر نے اس کے سینے پر بھی خنجر کا بھرپور وار کیا۔ نائیک کی طرح وہ بھی ڈھیر ہو گیا۔

اس وقت تک رگھو داس کو ہوش آ گیا تھا۔ وہ اچانک اٹھ کر دروازے کی طرف بھاگا۔ عامر نے زور سے چاقو پھینک کر اسے نشانہ بنایا۔ خوفناک شکاری چاقو اس کی گردن میں پیوست ہو کر دوسری طرف نکل گیا۔ وہ بھی آواز نکالے بغیر دروازے کے پاس اوندھے منہ گر پڑا۔

''یہ...... یہ...... تم نے کیا کیا......'' بابا نے لرزتی آواز میں پوچھا۔

''یہ بہت ضروری تھا بابا۔'' عامر نے کہا۔

''اب تم تو چلے جاؤ گے، وہ لوگ ہمیں نہیں چھوڑیں گے۔''

''آپ پریشان مت ہوں۔ میں آپ کو مصیبت میں چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا۔'' پھر وہ کچھ سوچ کر بولا۔ ''آپ

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

کے گھر کے پیچھے کوئی مکان نہیں ہے بلکہ کھیت ہیں ناں؟''

''ہاں بیٹا! دور دور تک کھیت ہیں۔''

''میں ان لوگوں کی لاشیں انہی کھیتوں میں ٹھکانے لگاؤں گا۔'' پھر وہ زلیخا سے بولا۔ ''میں لاشیں لے کر جا رہا ہوں تم فوراً یہاں کی صفائی کر دو۔''

اس نے سب سے پہلے نائیک کے ہاتھ سے گھڑی اتاری، اس کی جیب میں ہندوستانی کرنسی بھی تھی۔ عامر نے وہ بھی نکال لی اور بولا۔ ''مجھ سے غلطی ہو گئی۔ ان کی وردیوں کو داغ دار نہیں کرنا چاہیے تھا۔ یہ میرے کام آجاتیں۔'' جو ہوا سو ہوا۔ اس نے آگے بڑھ کر نائیک کی لاش کو کندھے پر اٹھالیا۔

''چلو، میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔'' بابا نے کہا۔ کھیتوں کے بیچ میں جو پگڈنڈیاں ہیں تم کو ان کا پتا نہیں ہے۔''

''آپ چل سکتے ہیں؟'' عامر نے پوچھا۔ ''آپ کو چکر تو نہیں آرہے ہیں۔''

''نہیں اتنا تو میں چل ہی سکتا ہوں۔''

پھر وہ بابا کے ساتھ نائیک کی لاش لے کر نکلا اور اسے دور ایک گہرے گڑھے میں پھینک دیا۔ اس کے بعد اس نے باری باری سپاہی اور رگھو کی لاشیں بھی ٹھکانے لگادیں۔ وہ گڑھا بہت گہرا تھا۔ عامر نے اوپر درختوں کی ٹہنیاں اور پتے بھی ڈال دیے۔

اس دوران میں زلیخا نے مرنے والوں کا خون صاف کر دیا تھا۔ عامر نے سوائے گھڑیوں اور کرنسی کے ان فوجیوں کی جیب سے کوئی چیز نہیں نکالی تھی۔

عامر کے کپڑوں پر بھی خون کے داغ لگ چکے تھے۔ اس کے ہاتھوں اور جسم پر بھی خون لگا ہوا تھا۔ عامر نے خون آلود کپڑے بدلے، پھر کچھ سوچ کر چونک اٹھا اور زلیخا سے بولا۔ ''میری وردی کہاں ہے؟''

''وہ اندر والے کمرے میں کھونٹی پر لٹکادی ہے۔''

''یہ بہت بڑا پاگل پن ہوا تھا، میں نے اپنی وردی یوں چھوڑ دی۔ اگر وہ پورے گھر کی تلاشی لے لیتے تو وردی دیکھ کر انہیں یقین ہو جاتا کہ میں یہاں موجود ہوں۔ وہ تو زلیخا کی وجہ سے آگے نہیں بڑھے۔''

اس کی بات پر زلیخا کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا۔

عامر نے خون آلود کپڑوں اور اپنی وردی کا بنڈل سا بنایا اور اسے آگ لگادی۔

گاؤں میں لوگ اکثر اس قسم کے الاؤ جلاتے رہتے

آج کل تو ہر انسان شوگر کی مرض سے سخت پریشان ہے۔ کیونکہ شوگر انسان کو اندر ہی اندر کھوکھلا اور اعصابی طور پر کمزور کر دیتی ہے۔ ہم نے دیسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں پر ریسرچ کر کے خاص قسم کا ایک ایسا شوگر نجات کورس ایجاد کر لیا ہے جس کے استعمال سے ان شاء اللہ شوگر سے مستقل نجات مل سکتی ہے شفاء منجانب اللہ پر ایمان رکھیں۔ شوگر کے وہ مریض جو آج تک اپنی شوگر سے نجات حاصل نہیں کر سکے وہ ایک بار ہمارا شوگر نجات کورس بھی آزما کر دیکھ لیں۔ آج ہی گھر بیٹھے فون پر اپنی تمام علامات بیان کر کے بذریعہ ڈاک وی پی VP شوگر نجات کورس منگوالیں۔

المُسلم دارالحکمت رجسٹرڈ

ضلع حافظ آباد۔ پاکستان

0300-6526061

0301-6690383

فون اوقات

صبح 10 بجے سے رات 8 بجے تک

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

ہیں لیکن اس الاؤ کے شعلے کچھ زیادہ ہی تھے۔ پھر آہستہ آہستہ شعلے کم ہوتے گئے۔

اسی وقت بابا نے آسمان کو دیکھا اور بولا۔ ''فجر کی نماز کا وقت ہو گیا ہے۔ میں نماز پڑھا کے ابھی آتا ہوں۔'' وہ دروازے کی طرف چند قدم چلا، پھر لڑکھڑا کر گرنے لگا۔

عامر نے لپک کر اسے گرنے سے روکا اور بولا۔ ''بابا، آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ نماز تو کوئی بھی پڑھا دے گا۔''

عامر نے سہارا دے کر اسے پلنگ پر لٹا دیا۔

بابا بڑبڑا رہا تھا۔ ''اتنے برسوں میں یہ پہلا موقع ہے کہ میں نماز نہیں پڑھاؤں گا۔''

''بابا، بیماروں کے لیے تو اللہ تعالیٰ نے بھی رعایت رکھی ہے کہ وہ بیٹھ کر، لیٹ کر یا اشاروں سے نماز ادا کر لیں۔''

اسی وقت کرامت چاچا آ گیا اور بولا۔ ''پیش امام صاحب! کیا آج آنکھ نہیں کھلی، فجر کا وقت نکلا جا رہا ہے۔''

''بابا کی طبیعت بہت خراب ہے چاچا۔'' زلیخا نے کہا۔ ''وہ رات کو کسی چیز سے الجھ کر گر گئے۔ ان کا سر پتھر کی منڈیر سے ٹکرا گیا۔''

''ارے۔'' کرامت چاچا نے کہا۔ ''یہ میرے جانے کے بعد ہوا ہو گا۔ امام صاحب کی مرہم پٹی تو کر دی ہے نا؟''

''جی چاچا۔'' زلیخا نے کہا۔ ''میں نے ان کی مرہم پٹی کر دی ہے اور وہ سو رہے ہیں۔''

''اللہ ان کی تکلیف دور کرے بیٹا۔'' کرامت چاچا یہ کہہ کر وہاں سے چلے گئے۔

دو گھنٹے بعد بابا کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اجنبی اجنبی نظروں سے ادھر اُدھر دیکھتا رہا۔ پھر اس نے اچانک اٹھنے کی کوشش کی تو چکرا کر دوبارہ بستر پر گر گیا۔

''بابا آپ آرام کریں۔'' عامر نے کہا۔

''یہ...... زمین کیوں گھوم رہی ہے، میری چارپائی بھی گھوم رہی ہے...... مجھے یہاں سے نکلنا ہو گا ورنہ وہ درندے پھر آ جائیں گے اور زلیخا......''

''بابا وہ درندے اب یہاں نہیں آ سکتے، وہ مر چکے ہیں۔'' عامر نے کہا۔

''نہیں...... مجھے...... زلیخا کو...... لے کر یہاں سے جانا ہو گا۔''

''کچھ نہیں ہو گا بابا۔'' عامر نے کہا۔ ''میں ایسا کچھ نہیں ہونے دوں گا، اب آپ آرام کریں۔'' پھر وہ زلیخا سے مخاطب ہوا۔ ''بابا کو کچھ کھلا دو۔ انہوں نے رات سے کچھ کھایا بھی تو نہیں ہے بلکہ انہیں چائے پلا دو، میں سر درد کی ایک گولی دے دیتا ہوں۔''

چائے پی کر بابا پھر غنودگی میں چلا گیا۔

اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ عامر نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا اور جھپٹ کر کمرے میں چلا گیا۔

''کون ہے؟'' زلیخا نے پوچھا۔

''بیٹا، میں ہوں رام داس۔''

زلیخا نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ ''آؤ چاچا۔''

''امام صاحب کیسے ہیں اب؟'' اس نے پوچھا۔ ''کرامت بتا رہا تھا کہ وہ گر کے زخمی ہو گئے ہیں؟''

''ان کی حالت ٹھیک نہیں ہے چاچا۔'' زلیخا نے کہا۔ ''وہ سو رہے ہیں۔''

''میں وید کو بلا کر لاتا ہوں۔ وہ کوئی لیپ لگانے کو دے گا تو وہ ٹھیک ہو جائیں گے۔'' یہ کہہ کر رام داس وہاں سے جانے لگا پھر جاتے جاتے بولا۔ ''یہ رگھو پتا نہیں کہاں آوارہ گردی کرتا پھرتا ہے، رات سے گھر بھی نہیں آیا ہے۔'' رام داس یہ کہتا ہوا باہر نکل گیا۔

''رگھو اس کا بیٹا تھا۔'' زلیخا نے عامر کو بتایا۔

دوپہر تک بابا کی حالت مزید بگڑ گئی۔ انہوں نے عامر سے کہا۔ ''عامر پتر، تجھ سے ایک بات کہوں، مانے گا؟''

''آپ حکم کریں بابا۔'' عامر نے کہا۔

''بیٹا...... میری زندگی کا اب کچھ بھروسا نہیں ہے۔ میرے بعد زلیخا...... بالکل اکیلی ہو جائے گی۔ عامر پتر! مجھ سے وعدہ کر کہ تو زلیخا کا خیال رکھے گا۔''

''بابا، میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ اپنے جیتے جی اسے کوئی تکلیف نہیں ہونے دوں گا۔''

''بیٹا، پھر ایک کام کر...... مجھے اپنے منہ سے کہتے ہوئے تو اچھا نہیں لگ رہا ہے لیکن مجبوری ہے...... تو زلیخا سے...... نکاح کر لے......'' یہ کہہ کر بابا بری طرح ہانپنے لگا اور اس کی آنکھوں سے آنسو نکلنے لگے۔

زلیخا تیزی سے اٹھ کر وہاں سے بھاگ گئی۔

''میری زندگی کا تو خود کوئی بھروسا نہیں ہے بابا۔'' عامر نے کہا۔ ''نہ جانے زندہ اس ملک سے نکل بھی سکوں گا یا نہیں۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

''چل چھوڑ۔'' بابا نے گلوگیر لہجے میں کہا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ زلیخا چھوٹے سے اس گاؤں کی جاہل لڑکی ہے...... وہ تیرے قابل کہاں ہے...... بیٹا! جس کا کوئی نہ ہو، اس کا اللہ تو ہوتا ہے نا۔''

اچانک عامر کی نظر دور کھڑی زلیخا پر پڑی۔ اس کے چہرے پر عجیب حزن وملال کی کیفیت تھی اور آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

''بابا...... میں نے انکار تو نہیں کیا ہے۔'' عامر نے کہا۔ ''میں تیار ہوں۔''

مارے خوشی کے بابا بلک بلک کر رونے لگا۔

اسی دن اس نے اپنے دونوں مسلمان دوستوں کو بلا کر اس کا اور زلیخا کا نکاح پڑھایا۔

عامر کے ذہن میں پلان تھا کہ مزید فوج پہنچنے سے پہلے وہ دشمن کی اس ایڈوانس پارٹی کو ختم کر دے گا۔

رات کو وہ یہی سوچتا ہوا اپنے بستر کی طرف بڑھا تو زلیخا وہاں پہلے سے موجود تھی۔ لالٹین کی روشنی میں اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔ اس نے صاف ستھرے کپڑے پہن رکھے تھے۔ اس کے بالوں سے بھینی بھینی مہک اٹھ رہی تھی۔

عامر کو دیکھ کر وہ مزید سرخ ہوگئی۔ اس نے آگے بڑھ کر لالٹین کی لو مدھم کرنے کی کوشش کی لیکن وہ بجھ گئی۔

☆☆☆

رات کے کسی پہر دروازے پر زوردار دستک ہوئی۔ وہ بوکھلا کر اٹھ بیٹھا۔ اس کے ساتھ زلیخا بھی اٹھ گئی۔ ''آپ اُدھر اناج والی کوٹھری میں چلے جاؤ۔ میں دیکھتی ہوں کون ہے؟'' وہ اپنا لباس درست کرتے ہوئے اٹھ گئی۔ دستک ایک مرتبہ پھر ہوئی۔

''کون ہے؟'' زلیخا نے پوچھا۔

''بیٹا، میں ہوں کرامت۔'' باہر سے آواز آئی۔

زلیخا نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ کرامت اندر آگیا اور بولا۔ ''بہت بری خبر ہے۔ مجھے ابھی ابھی رام داس نے بتایا ہے کہ پاکستانی فوج نے اس طرف نیا محاذ کھول دیا ہے۔ وہ آگے بڑھ رہی ہے۔ ہم سب کو فوری طور پر علاقہ خالی کرنا ہے۔ پورے گاؤں کو۔''

پھر وہ چونک کر بولا۔ ''امام صاحب کا کیا حال ہے؟''

''بابا سو رہے ہیں۔ بہت دیر بعد تو انہیں نیند آئی ہے ورنہ وہ مسلسل کراہ رہے تھے۔'' زلیخا نے جواب دیا۔

اچانک کئی فوجی دندناتے ہوئے اندر آگئے۔ ان

شہر میں موسیقی

شہر میں موسیقی کی ایک بہت بڑی محفل کا اہتمام ہو رہا تھا۔ ایک صاحب پروگرام منیجر کے پاس آئے اور پروگرام میں شرکت کی اجازت چاہی۔

منیجر۔ ''آپ گانا گاتے ہیں؟''

وہ صاحب۔ ''نہیں۔''

منیجر ''سارنگی بجاتے ہیں؟''

وہ صاحب۔ ''نہیں۔''

منیجر۔ ''تو پھر طبلہ بجاتے ہوں گے؟''

وہ صاحب۔ ''نہیں۔''

منیجر (جھنجلا کر) ''تو پھر آپ کیا بجائیں گے؟''

وہ صاحب۔ ''تالیاں۔''

فاطمہ شاہین...... اسلام آباد

کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں اور ان پر سنگینیں بھی چڑھی ہوئی تھیں۔

ان میں سے ایک ڈپٹ کر بولا۔ ''کہاں ہے وہ پاکستانی فوجی؟''

''جائے گا کہاں؟'' کرامت چاچا نے کہا۔ ''یہیں ہوگا۔ آج شام ہی تو اس لڑکی کے ساتھ اس کا نکاح ہوا ہے۔''

عامر کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ مخبری کرامت چاچا نے کی تھی۔ شاید بھارتی فوج نے انہیں چند سکے یا چند نوٹ انعام میں بھی دیے ہوں۔

''بابا۔'' زلیخا کی وحشت زدہ آواز آئی۔

''یہ اس کڑی دا پیو اے؟'' (یہ اس لڑکی کا باپ ہے)

''ہاں، یہ گاؤں کی مسجد کا امام بھی ہے۔''

پھر اسی فوجی کی آواز آئی۔ ''اے تو مر گیا اے۔'' (یہ تو مر گیا ہے)

''بابا۔۔!'' زلیخا لرزہ خیز انداز میں چیخی۔ ''مجھے اکیلا چھوڑ کر کہاں چلے گئے بابا؟''

''تو اکیلی کب ہے؟'' کرامت کی آواز آئی۔ ''بتا، تیرا وہ یار کہاں ہے؟'' کرامت نے کہا۔

اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ کوئی آدمی چند ٹکوں کے لیے اتنا بھی گر سکتا ہے۔ وہ تو زلیخا کو بیٹی کہتا تھا۔ اب اس سے

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

اتنے گھٹیا انداز میں بات کر رہا تھا پھر وہ بولا۔ ''وہ کہاں جائے گا یہیں کہیں ہوگا۔''

''وہ فوج کا کوئی آفیسر ہے یا سپاہی؟'' بھارتی فوجی نے پوچھا۔

''جوان آدمی ہے سر بلکہ نوجوان ہے۔'' کرامت نے جواب دیا۔

''میں کیا پوچھ رہا ہوں اور تم کیا جواب دے رہے ہو؟'' فوجی جھنجلا کر بولا۔ ''میں نے یہ پوچھا ہے کہ وہ آدمی کیا پاکستانی فوج کا افسر ہے یا سپاہی؟''

''یہ تو معلوم نہیں جناب۔'' کرامت نے کہا۔

''رام سنگھ۔'' فوجی نے کسی کو مخاطب کیا۔ ''تم اسے اس کمرے میں دیکھو، رنبیر تم اسے اس دوسرے کمرے میں دیکھو، میں اس اناج کی کوٹھڑی میں دیکھتا ہوں۔''

عامر اس وقت دوچھتی میں بیٹھا تھا۔ اس کے اعصاب کشیدہ ہو گئے۔ گویا آزمائش کی گھڑی آن پہنچی تھی۔ اس کا انجام موت بھی ہو سکتا تھا۔ اس نے زیر لب کلمہ پڑھا، بہت آہستگی سے ریوالور کا سیفٹی کیچ ہٹایا اور ہر طرح سے تیار ہو گیا۔

اچانک کمرا روشنی میں نہا گیا۔ آنے والے نے شاید بہت طاقت ور ٹارچ روشن کی تھی۔ روشنی کا دائرہ پورے کمرے میں گردش کر رہا تھا۔ ایک دفعہ تو روشنی دوچھتی تک بھی آئی پھر اس نے کرامت سے کہا۔ ''اس لڑکی کو یہاں بلاؤ۔''

زلیخا فوراً وہاں آ گئی۔

''اس دوچھتی میں کیا ہے؟''

''گھر کا فالتو سامان اور ایک دو اناج کی بوریاں ہیں۔'' زلیخا نے جواب دیا۔

روشنی کا دائرہ پھر دوچھتی پر گردش کرنے لگا۔ اگر عامر کچھ آگے ہوتا تو ضرور اس فوجی کی نظروں میں آ جاتا۔

''دوچھتی کی نچلی دیوار پر ہاتھوں کے نشان ہیں۔ باقی دیوار گرد میں اٹی ہوئی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ سور ما اس بل میں ہے۔'' پھر وہ نرم لہجے میں بولا۔ ''میں تین تک گنوں گا۔ پھر تیری اس نئی نویلی بیوی کو گولی مار دوں گا، ورنہ نیچے آ جا۔''

عامر نے خفیف سا سر آگے بڑھا کر نیچے کا جائزہ لیا۔ وہ کوئی عام فوجی نہیں بلکہ بھارتی فوج کا کوئی گھاگ اور تجربے کار افسر تھا اسی لیے اس نے اتنی باریک بینی سے وہاں کا جائزہ لیا تھا۔

''ایک۔'' اس نے گنتی شروع کر دی۔ ''دو......'' اس نے بلند آواز میں کہا۔

اس سے پہلے کہ وہ تین کہتا، عامر نے دوچھتی سے افسر پر چھلانگ لگا دی۔ وہ اس افتاد کے لیے تیار نہیں تھا۔ عامر کے بھاری بھرکم جسم کے زوردار جھٹکے کے لیے وہ تیار نہیں تھا۔ وہ عامر سمیت زمین پر گر گیا۔ اس کے ہاتھ میں جو ریوالور اور ٹارچ تھی، وہ بھی دور جا گری۔ عامر نے اسے دبوچ لیا اور ریوالور اس کی کن پٹی پر رکھ دیا۔

''زلیخا۔'' عامر نے اسے مخاطب کیا۔ ''اس کا ریوالور اور ٹارچ دونوں چیزیں اٹھا لو۔''

عامر نے گھٹنا افسر کے سر پر مارتے ہوئے کہا۔ ''کھڑا ہو جا اور مجھے پہچان لے، میں پاکستانی فوج کا افسر ہوں، کیا کرے گا معلوم کر کے؟''

''دیکھیں سر۔'' اس نے کہا۔ ''آپ بھی فوجی ہیں اور اچھی طرح جانتے ہیں کہ آپ کا یہاں سے نکلنا مشکل بلکہ بہت مشکل ہے۔''

''جانتا ہوں۔'' عامر نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''لیکن یہ بھی جانتا ہوں کہ میرے ریوالور میں جتنی گولیاں ہیں، وہ تم لوگوں کے لیے کافی ہیں۔ یہ بات تم بھی اچھی طرح جان لو کہ تمہارا ابھی یہاں سے زندہ نکلنا مشکل بلکہ بہت ہی مشکل ہے۔''

''اپنے آدمیوں کو یہاں بلاؤ اور ان سے کہو کہ ہتھیار پھینک دیں۔'' عامر نے اپنے بازو کا شکنجہ اس کی گردن پر سخت کرتے ہوئے کہا۔ ''جلدی کرو ورنہ میں گنتی بھی نہیں گنوں گا۔''

''رام سنگھ، رنبیر۔'' صوبیدار نے بلند آواز میں پکارا۔ ''اِدھر آ جاؤ۔''

وہ دونوں فوراً دوڑتے ہوئے اناج والی اس کوٹھڑی میں آ گئے۔ وہ یہی سمجھے کہ ان کے افسر نے اس پاکستانی فوجی کو پکڑ لیا ہے۔

اندر کا منظر دیکھ کر ان کی آنکھوں میں حیرت سمٹ آئی۔

''اپنے ہتھیار پھینک دو۔'' اس نے انہیں حکم دیا۔

ان دونوں نے فوراً اپنی رائفلیں پھینک دیں۔

''اب دیوار کی طرف گھومو اور اپنے دونوں ہاتھ دیوار سے ٹکا کر کھڑے ہو جاؤ۔'' عامر نے ڈپٹ کر کہا۔

ان دونوں نے فوراً تعمیل کی۔

کرامت اس وقت تک وہیں کھڑا تھا۔ اس نے یہ

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

صورتِ حال دیکھ کر بھاگنے کی کوشش کی۔

''رک جاؤ کرامت۔'' اس نے غرا کر کہا۔ ''ورنہ کھوپڑی تربوز کی طرح کھل جائے گی۔''

وہ یوں اپنی جگہ پر ساکت ہو گیا جیسے چابی کے کھلونے کی چابی ختم ہو گئی ہو۔

''زلیخا۔'' عامر نے اسے مخاطب کیا۔ ''تم ٹارچ زمین پر رکھ دو اور باہر چلی جاؤ۔''

زلیخا کے باہر جانے کے بعد اس نے اس کی تلاشی لی اور اس کی جیبوں سے سب کچھ نکلوا لیا۔ اس کے پاس ایک سروس ریوالور تھا جو اناج کی اس کوٹھڑی میں ایک طرف پڑا تھا۔ پھر اس نے اس افسر سے بھی منہ دیوار کی طرف کرنے کو کہا۔ اس نے بھی عامر کے حکم کی تعمیل کی۔ شاید اسے عامر کی آنکھوں میں اترا ہوا خون نظر آ گیا تھا یا پھر اس کا لہجہ اتنا سفاک تھا۔

اس نے رام سنگھ کی رائفل اٹھائی اور اسے نال کی طرف سے پکڑ کے خاصی قوت سے اس کے سر پر رسید کر دیا۔ رائفل کے بٹ کی آواز کے ساتھ ہی ایسی آواز آئی جیسے سوکھی لکڑی چٹخی ہو۔ گویا اس کی کھوپڑی ٹوٹ چکی تھی۔ دوسرا وار اس نے اسی قوت سے آفیسر کے سر پر کیا۔ اس کے حلق سے اذیت ناک کراہ بلند ہوئی اور وہ بھی دھم سے فرش پر گر پڑا۔

کرامت ابھی تک اسی طرح ساکت کھڑا تھا گویا اس کی ایک آواز سے پتھر ہو گیا ہو۔

عامر نے اس کے بال پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹا تو لرزتا کانپتا وہ اس کے قدموں میں ڈھیر ہو گیا۔

''کھڑا ہو جا ذلیل آدمی، تو تو زلیخا کو اپنی بیٹی کہتا تھا، امام صاحب کا احترام کرتا تھا۔ تو نے ان ہی امام صاحب کی پیٹھ میں چھرا گھونپ دیا۔''

''مجھے معاف کر دو بیٹا، میں......''

اس نے بائیں ہاتھ سے اس کے چہرے پر اتنی زور سے تھپڑ مارا کہ وہ لڑکھڑا کر دیوار سے ٹکرایا۔ پھر زمین پر گر گیا۔ ''کھڑا ہو جا گھٹیا آدمی، دل تو چاہ رہا ہے کہ تجھے یہیں ذبح کر دوں۔''

''مم...... مجھے معاف کر دو بیٹا، میں......''

''مت کہہ مجھے بیٹا۔'' اس نے اسے جھڑک دیا۔ ''بتا تجھے ان لوگوں نے کتنے پیسے دیے تھے؟''

''پپ...... پانچ ہزار۔'' اس نے ہکلاتے ہوئے کہا، پانچ ہزار اس وقت خاصی خطیر رقم ہوتی تھی۔

''تو نے پانچ ہزار میں امام صاحب اور زلیخا کی زندگی کا سودا کر دیا۔ میری تو خیر تیرے نزدیک کوئی حیثیت ہی نہیں تھی۔''

''میں نے بہت مجبور ہو کر یہ قدم اٹھایا ہے بب......''

وہ بیٹا کہتے کہتے رک گیا۔

''تیری کوئی بیٹی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں، میری بھی ایک بیٹی ہے۔'' اس نے کہا۔ ''اسی کی خاطر تو میں نے......''

''بکواس بند کر۔'' اس نے کہا۔ ''میں بھی تجھے پانچ ہزار دیتا ہوں۔ اپنی بیٹی کو میرے حوالے کر دے۔ وہ زلیخا کی طرح خوب صورت تو نہیں ہو گی لیکن جوان تو ہو گی۔''

''عامر۔'' کرامت ایک دم لہجہ بدل کر بولا۔ ''میری بیٹی کے بارے میں اس قسم کی گھٹیا باتیں مت کرو۔ یہ مت بھولو کہ اگر میں امام صاحب کے ساتھ مل کر تمہیں مسجد کے سامنے سے نہ اٹھاتا تو تم وہیں پڑے پڑے مر جاتے۔''

''زندگی اور موت تیرے ہاتھ میں تو ہے نہیں، وہ تو خدا کے ہاتھ میں ہے لیکن اللہ ہی کسی کی جان لینے کے لیے موت کے فرشتے کو بھیجتا ہے جیسے ابھی وقت اس نے مجھے موت کے فرشتے کے روپ میں بھیجا ہے۔''

''مجھے معاف کر دو عامر...... میں''

''وہ پانچ ہزار کہاں ہیں؟''

''تم وہ پانچ ہزار لے لو لیکن مجھے معاف کر دو۔'' اس نے جلدی سے جیب میں ہاتھ ڈال کر پیسے نکالے اور میرے حوالے کر دیے۔

''میرے ہاتھ میں ابھی تک رام سنگھ کی رائفل تھی۔ میں نے دو قدم پیچھے ہٹ کر رائفل کے بٹ سے کرامت کی کنپٹی پر زوردار ضرب لگائی۔ وہ ادھیڑ عمر کا آدمی تھا۔ کنپٹی کی یہ زوردار ضرب تو کوئی جوان اور توانا آدمی بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اوندھے منہ گر گیا۔ میں جانتا تھا کہ اب وہ قیامت ہی کے دن اٹھے گا۔

باہر سے زلیخا کے رونے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اسے اس ہنگامے میں بابا کا خیال ہی نہیں آیا تھا۔ وہ بے چارہ بھی میری وجہ سے جان گنوا بیٹھا تھا۔

وہ فوجی افسر ابھی تک اسی حالت میں کھڑا تھا۔ وہ یہ خون خرابا دیکھ کر سمجھ گیا تھا کہ اب اس کی باری بھی آنے والی ہے۔

''صوبیدار صاحب!'' عامر نے طنزیہ لہجے میں اسے مخاطب کیا۔ ''اپنے کپڑے اتار دیں۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

''کیا...... مم...... کپڑے......''
اس کے حلق سے مبہم الفاظ نکلے۔
''میں نے کہا ہے کہ اپنے کپڑے اتار دیں۔'' اس نے اس بار درشت لہجے میں کہا۔
صوبیدار نے فوراً اپنے کپڑے اتارنا شروع کر دیے۔ چند لمحوں میں صرف کچھے اور بنیان میں ملبوس کھڑا کانپ رہا تھا کیونکہ سردی اس دن بھی شدید تھی۔
عامر نے اس کا سروس ریوالور اٹھالیا اور بولا۔ ''اس وقت یہاں تمہاری فوج کی کتنی نفری ہے؟''
''ایک یونٹ ہے۔'' اس نے جواب دیا۔
''تو آئی سی (سیکنڈ اِن کمانڈ) میجر ملہوترا تو کہہ رہا تھا کہ ایک یونٹ بھی پوری نہیں ہے اس میں بھی ایک کمپنی کم ہے۔''
''میجر ملہوترا!'' وہ حیرت سے بولا۔ ''آپ میجر صاحب کو جانتے ہیں سر؟''
''میری بات کا جواب دو۔'' اس نے درشت لہجے میں کہا۔ ''ایڈوانس پارٹی میں ایک کمپنی کم کیوں ہے اور تمہارا سی او (کمانڈنگ آفیسر) یہاں کیوں نہیں ہے؟''
''آپ کو شاید معلوم نہیں ہے کہ جنگ بندی ہو چکی ہے۔'' افسر نے کہا۔
''جنگ بندی ہوگئی؟'' اس نے حیرت سے کہا۔ اس کے پاس موجودہ حالات جاننے کا کوئی ذریعہ بھی تو نہیں تھا۔ نہ وہاں ریڈیو تھا نہ اخبار آتا تھا۔
''تم لوگ جنگ لڑتے ہی کب ہو، جنگ شروع ہوتے ہی اسے ختم کرنے کا واویلا شروع کر دیتے ہو۔'' اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔
''اس دفعہ تو یہ واویلا آپ لوگوں کی طرف سے شروع ہوا ہے۔'' افسر نے کہا۔
عامر کوشش کر رہا تھا کہ اس کی باتوں پر دھیان نہ دے۔ وہ اس کی وردی پہن چکا تھا۔ وہ تن و توش میں اس سے زیادہ تھا۔ اس لیے اس کی وردی اس کے جسم پر ڈھیلی تھی لیکن لمبائی میں کم تھی کیونکہ وہ اس کی طرح دراز قد نہیں تھا۔ اس کے جوتے البتہ اس کے پیر میں فٹ آگئے۔
عامر نے اچانک رائفل کو ڈنڈے کی طرح گھمایا اور خاصی قوت سے افسر کے سر پر رسید کر دیا۔ وہ بھی کٹے ہوئے درخت کی طرح زمین پر گر پڑا۔ وہ یہ کام پہلے بھی کر سکتا تھا لیکن اس کی وردی کو اس کے خون سے داغ دار نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اب اس گھر میں موت کا سناٹا تھا۔ وہاں بابا سمیت پانچ لاشیں پڑی تھیں۔
زلیخا کی سسکیاں بھی ختم ہوگئی تھیں۔
اس نے زمین پر پڑی ہوئی ٹارچ اٹھائی اور باہر نکل آیا۔
زلیخا اسے دیکھ کر چونک اٹھی پھر ہکلا کر بولی۔ ''کیا...... تم نے......'' وہ جملہ پورا کیے بغیر بلک بلک کر رونے لگی۔
''رو کیوں رہی ہو زلیخا؟'' اس نے ٹارچ کا رخ اپنے چہرے کی طرف کیا۔
''یہ...... یہ آپ ہو جی...... آپ تو...... بالکل فوجی لگ رہے ہو...... ویسے ہی جیسے پہلے دن تھے۔ جب بابا آپ کو لے کر آئے تھے۔''
''اچھا، اب وقت بہت کم ہے۔ جو کچھ لینا ہے لے لو اور چلو یہاں سے ہم اب زیادہ دیر یہاں نہیں رک سکتے۔''
''لیکن بابا!'' زلیخا نے سسک کر کہا۔
''ہم بابا کے لیے...اب کچھ نہیں کر سکتے۔ سوائے ان کی مغفرت کے۔''
زلیخا پھر بلک بلک کر رونے لگی۔ ''میں بابا کو اس حال میں چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔'' وہ بچوں کی طرح مچل کر بولی۔
''دیکھو زلیخا، بابا نے اپنی جان ہم پر قربان کی ہے۔ اگر ہم یہاں رکے تو پکڑے جائیں گے۔ بابا کی روح اس بات پر کتنی بے چین ہوگی، کیا تم چاہتی ہو کہ بابا کی قربانی رائگاں جائے؟''
زلیخا بغیر کچھ کہے اٹھی۔ اندر کمرے میں گئی اور دو تین منٹ بعد کپڑوں کی پوٹلی اور لکڑی کی ایک چھوٹی سی صندوقچی کے ساتھ باہر آگئی۔ سردی سے بچنے کے لیے اس نے ایک موٹا کھیس جسم کے گرد لپیٹ لیا تھا۔
عامر کو اچانک اپنے سامان کا خیال آیا۔ وہ بوری تو ابھی تک دوچھتی ہی میں پڑی تھی۔ وہ ٹارچ لے کر دوبارہ اناج والی کوٹھری میں چلا گیا اور دوچھتی سے اپنی بوری بھی نکال لایا۔ اس نے افسر سمیت ان سب کی جیبوں سے کرنسی نوٹ نکال لیے تھے۔
''ہم یہاں سے جائیں گے کیسے؟'' زلیخا نے پوچھا۔ ''اور کہاں جائیں گے؟''
''باہر فوجی جیپ موجود ہے۔'' اس نے کہا۔ ''رام سنگھ کی جیب سے اس کی چابیاں بھی مل گئی ہیں۔ ہم اس جیپ میں جائیں گے۔ کہاں جائیں گے؟ یہ ابھی تک مجھے

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

خود بھی معلوم نہیں۔''

اس نے زلیخا سے پچھلی نشست پر بیٹھنے کو کہا۔ وہ پرانے زمانے کی ولیز جیپ تھی۔ پسنجر سیٹ پر بیٹھ کر تو وہ بالکل نمایاں ہوجاتی۔ اس کی ہدایت پر پیچھے بھی وہ سیٹ پر نہیں بیٹھی بلکہ اس کے فرش پر گٹھڑی سی بن کر لیٹ گئی۔

اس نے جیپ کا انجن اسٹارٹ کیا اور آگے بڑھا دیا۔

اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب کہاں جائے؟ اچانک اسے خیال آیا کہ فوجی افسر کی جیب میں ایک نقشہ بھی تھا۔ آرمی میں ''میپ ریڈنگ'' (نقشہ پڑھنے) کی تربیت خاص طور پر دی جاتی ہے۔ یہ تربیت افسروں اور جوانوں سب کے لیے لازمی ہوتی ہے۔

اس نے ایک جگہ جیپ روک کر نقشہ جیب میں سے نکالا اور جیپ کی اندرونی لائٹ جلا کر دیکھا۔ جلد ہی اسے اندازہ ہوگیا کہ وہ بھارت کے شہر پٹھان کوٹ سے تقریباً ساٹھ میل کے فاصلے پر ہے۔ اس زمانے میں فاصلہ کلومیٹرز سے نہیں بلکہ میلوں سے ناپا جاتا تھا۔

اسے حیرت ہوئی کہ اس نے تقریباً سو میل کا سفر زخمی ٹانگ کے ساتھ طے کرلیا تھا۔ وہ بھی مخالف سمت میں۔ اگر سمت درست ہوتی وہ بہت پہلے اپنی سرحد تک پہنچ جاتا۔ نقشے کے ذریعے ہی اسے مین روڈ کا علم ہوا۔ دس منٹ سے بھی کم وقت میں اس نے جیپ مین روڈ پر چڑھادی۔

مین روڈ کا سفر خطرناک تھا۔ وہاں جگہ جگہ چیکنگ پوسٹیں ہوتی ہیں پھر پٹھان کوٹ تو بھارتی فضائیہ کا ہوائی اڈا بھی تھا۔ اس لحاظ سے وہاں چیکنگ بھی زیادہ ہوگی مگر وہ مین روڈ پر آہی گیا تھا اس لیے تن بہ تقدیر ہوکر چلتا رہا۔

اچانک پیچھے سے اسے کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس دکھائی دیں۔ گاڑی بہت تیز رفتاری سے آرہی تھی۔ اس کی رفتار دیکھ کر اس کے اعصاب کشیدہ ہوگئے۔ ایسا لگا جیسے وہ گاڑی اس کے تعاقب میں آرہی ہو۔ اس نے اسے راستہ دینے کے لیے جیپ سڑک کے کنارے کی طرف کرلی۔ گاڑی زناٹے سے برابر سے گزر گئی۔ جیپ کے ہیڈ لیمپس کی روشنی میں اسے اس گاڑی کی عقبی سیٹ پر فوج کا کوئی افسر بیٹھا نظر آیا۔

اس نے پہلے اپنی سرحد کی طرف جانے کا ارادہ کیا تھا لیکن اس افسر کی زبانی اسے معلوم ہوا تھا کہ جنگ بندی ہو چکی ہے اس لیے اب مزید فوج یہاں نہیں آئے گی۔

چلتے چلتے اچانک اسے زلیخا کا خیال آگیا۔

''تمھیں سردی تو نہیں لگ رہی ہے؟'' اس نے پوچھا۔ وہ بے چاری جیپ کے ٹھنڈے فرش پر پڑی تھی۔

''نہیں جی۔'' اس نے جواب دیا۔ ''میرے سر کے نیچے کپڑوں کی گٹھڑی ہے اور میں نے آدھا کھیس بچھالیا ہے اور آدھا اوڑھ لیا ہے۔''

اچانک اسے سامنے ایک چیک پوسٹ نظر آئی۔ اس کا بیریئر گرا ہوا تھا۔ اس نے زلیخا سے کہا۔ ''آگے ایک فوجی چوکی ہے۔ تم ذرا سی حرکت بھی مت کرنا۔''

وہ اس دوران میں چیک پوسٹ تک پہنچ گیا تھا۔

چیک پوسٹ کے محافظ بھی بہت رنگ میں تھے۔ انہوں نے سرسری طور پر جیپ کا جائزہ لیا، پھر بیریئر اٹھا دیا۔ اس نے جیپ جھٹکے سے آگے بڑھادی۔

اسے ان فوجیوں کی بے نیازی پر حیرت ہورہی تھی۔ اتنی سرسری چیکنگ تو ہمارے ملک میں قومی رضاکار دستے بھی نہیں کرتے۔ وہ پٹھان کوٹ میں داخل ہوا تو صبح کے آثار پیدا ہوچکے تھے۔ اب وہ اس فوجی جیپ اور وردی سے نجات حاصل کرنا چاہتا تھا۔

اس نے ایک جگہ رک کر ناشتے کے لیے حلوہ پوری لی اور آگے روانہ ہوگیا۔

ایک سنسان مقام پر اس نے جیپ روک کر زلیخا کو اترنے کا اشارہ کیا۔ پھر درختوں کے ایک جھنڈ میں جا کر اس نے وہ فوجی وردی بھی اتار پھینکی۔ اس نے وردی اپنے کُرتے اور تہبند کے اوپر ہی سے چڑھالی تھی۔ وہ جیپ سے اپنے سامان کی بوری بھی نکال لایا تھا۔ اس نے اس سے پمپ شوز نکالے اور وردی دوبارہ بوری میں ٹھونس دی کہ نہ جانے کب پھر اس کی ضرورت پڑ جائے۔ پھر وہ دونوں پیدل ہی ایک طرف چل دیے۔ شہر ابھی تک سورہا تھا۔ صرف دودھ والے، ہاکر اور حلوہ پوری کی دکانوں والے اپنے کام میں مصروف تھے۔

جیپ سے خاصے فاصلے پر آکر اس نے ایک جگہ بیٹھ کر حلوہ پوری نکالی اور دونوں نے خوب ڈٹ کر ناشتا کیا۔ عامر نے تو رات بھی برائے نام کھایا تھا کیونکہ بابا کی طبیعت خراب تھی۔

بابا یاد آیا تو بے اختیار اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے لیکن اس نے انہیں بہت خوب صورتی سے چھپالیا۔

ناشتے کے بعد وہ پھر پیدل روانہ ہوگئے۔ اسے بازار کھلنے کا انتظار تھا۔ وہ وہاں سے ایک سفری بیگ، اپنے اور زلیخا کے لیے کچھ کپڑے لینا چاہتا تھا۔ بھارتی کرنسی کی اس کے پاس کمی نہیں تھی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

اس نے بوری سر پر یوں اٹھا رکھی تھی جیسے دیہاتی اکثر اٹھاتے ہیں۔ زلیخا کا حلیہ تو تھا ہی دیہاتیوں والا۔ اس کی ہدایت پر اس نے اپنا چہرہ کھیس میں چھپا لیا تھا۔ ’اس کی خوب صورتی سے خوف زدہ تھا۔ لوگ خواہ مخواہ اسے گھورتے اور اس سے یہ برداشت نہ ہوتا۔‘

اس نے گھڑی میں وقت دیکھا تو صبح کے نو بج چکے تھے۔ اب شہر میں زندگی کے آثار نظر آرہے تھے۔ دکانیں بھی آہستہ آہستہ کھل رہی تھیں۔ وہیں ایک ہوٹل کے باہر بیٹھ کر اس نے گرما گرم چائے پی تو اس میں خاصی توانائی آگئی۔ اس نے کوشش کی کہ زلیخا بھی چائے پی لے لیکن اس نے انکار کر دیا۔

اچانک اسے سویٹروں اور بیگز کی ایک دکان نظر آگئی۔ اس نے وہاں سے ریگزین کا ایک بڑا سا بیگ دیکھا جو اس کے مطلب کا تھا۔ اس میں نہ صرف اس کی تمام چیزیں سما جاتیں بلکہ اس کے اور زلیخا کے کپڑے بھی آجاتے۔

دکان دار نے اس بیگ کی قیمت پچیس روپے بتائی۔ دیہاتیوں کی طرح وہ اس سے بھاؤ تاؤ کرنے لگا۔ وہ فوراً راضی ہو جاتا تو دکان دار مشکوک ہو جاتا۔ آخر اس نے اٹھارہ روپے میں وہ بیگ خرید لیا اور آگے روانہ ہو گئے۔ اب اسے کسی ایسی دکان کی تلاش تھی جہاں ریڈی میڈ کپڑے مل جاتے۔

اس زمانے میں ریڈی میڈ کپڑے اتنے عام نہیں تھے، نہ ان کی اتنی دکانیں تھیں۔ پھر پٹھان کوٹ جیسے شہر میں تو اِکا دُکا ہی دکانیں ہوں گی۔

آخر بازار میں اسے ریڈی میڈ کپڑوں کی ایک دکان نظر آگئی۔ اس نے زلیخا کو دکان کے باہر ایک محفوظ جگہ بٹھایا اور خود اندر چلا گیا۔

دکان دار ابھی دکان کی صفائی کر کے فارغ ہی ہوا تھا۔

عامر کو دیکھ کر اس نے عجیب سا منہ بنایا۔ گاؤں کے لوگ عموماً بحث مباحثہ زیادہ کرتے ہیں اور خریداری کم کرتے ہیں۔

”کیا چاہیے؟“ دکان دار نے پوچھا۔

”مجھے پتلون قمیص اور جرسی چاہیے۔“ عامر نے کہا۔

”تمہیں پتلون چاہیے؟“ وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔

”مجھے اپنے لیے نہیں چاہیے جی۔ میرا بھائی دلی میں پڑھتا ہے۔ اسے بھیجوں گا۔“ عامر نے جلدی سے کہا۔

”ناپ کیا ہے اس کا؟“ دکان دار نے پوچھا۔

”ناپ تو میرا ہی ہے پورا آتا ہے۔“

”اس کا ناپ لے آتے تو اچھا تھا۔ خیر میں تمہارے ناپ کے کپڑے نکال دیتا ہوں۔ چھوٹے بڑے ہوں تو واپس نہیں کروں گا۔“

”اب اس کا ناپ کہاں سے لاؤں۔“ عامر نے کہا۔

”آپ دے دیں۔“

اس نے عامر کی کمر کا ناپ لیا اور نئی پینٹیں نکال کر اس کے سامنے رکھ دیں۔ وہاں ان دنوں اچھے اور امپورٹڈ کپڑوں کا رواج نہیں تھا۔ وہ عام سے کپڑوں کی پینٹیں تھیں۔ عامر نے وہاں سے دو پینٹیں اور دو شرٹس خریدیں۔ وہاں اسے ایک کوٹ بھی پسند آگیا۔ اس نے وہ بھی لے لیا۔ یہاں بھی اس نے دکان دار سے بھاؤ تاؤ کرنے میں دس منٹ لگائے اور کپڑے خرید لیے۔ کپڑے خرید کر وہ باہر نکلنے لگا تو اسے زلیخا کے کپڑوں کا خیال آیا۔ اس نے اس سے پوچھا۔ ”یہاں زنانہ کپڑوں کی بھی کوئی دکان ہے؟“

”ہاں، یہاں سے سیدھے جاؤ گے تو دس بارہ دکانیں چھوڑ کر تمہیں لیڈیز کے کپڑے بھی مل جائیں گے...... میرا مطلب ہے کہ عورتوں کے کپڑے اور ساڑھیاں وغیرہ۔“

وہ دونوں وہاں سے ٹہلتے ہوئے ایک پارک میں آگئے۔ وہاں ایک الگ تھلگ گوشے میں بیٹھ کر عامر نے بوری کا سامان بیگ میں منتقل کرنا شروع کیا، پھر بوری وہیں ایک طرف پھینک کر وہ ایک مرتبہ پھر کپڑے لے کر درختوں کے ایک جھنڈ میں چلا گیا۔

وہ پینٹ شرٹ اور کوٹ پہن کر باہر نکلا تو زلیخا نے توصیفی نظروں سے اسے دیکھا اور بولی۔ ”آپ تو جی ان کپڑوں میں بہت اچھے لگ رہے ہو۔“

”فکر مت کرو، میں تمہارے لیے بھی ابھی اتنے ہی خوب صورت کپڑے خریدوں گا۔“

وہاں سے وہ زنانہ کپڑوں کی دکان پر گئے اور زلیخا کے لیے ساڑھیاں، پیٹی کوٹ، بلاؤز اور شلوار سوٹ بھی لے لیے۔ وہاں عامر کو اس کے لیے ایک کشمیری شال بھی پسند آگئی۔

ہر طرح سے تیار ہو کر وہ ایک ہوٹل میں پہنچے اور وہاں ایک کمرا بک کرا لیا۔ پھر عامر وہاں پڑ کر ایسا سویا کہ رات ہی کی خبر لایا۔ زلیخا ایک طرف بیٹھی تھی۔ وہ نہ جانے کب اٹھ گئی تھی۔

کھانا انہوں نے کمرے ہی میں کھایا، پھر نہا دھو کر

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

باہر نکل گئے۔ عامر نے اپنے اور زلیخا کے لیے جدید فیشن کے جوتے اور سینڈل بھی خریدے تھے۔ اب عامر پٹھان کوٹ میں رکنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ اسی ادھیڑ بن میں رہتا تھا کہ پاکستان کیسے پہنچے؟ پھر اسے یہ بھی خیال آیا کہ یہاں سے دلی جانے اور وہاں سے پاکستان واپسی کا کوئی بندوبست کرے۔

اس دن وہ اکیلا ہی باہر نکلا تھا۔ اس نے زلیخا کو ہوٹل کے کمرے میں چھوڑ دیا تھا۔ وہ کسی ایسے شخص کی تلاش میں تھا جو انہیں پاکستان پہنچا سکے۔ لیکن اسے کوئی شخص ایسا نظر نہیں آیا جسے وہ اپنے مطلب کے لیے استعمال کر سکے۔ کافی خواری کے بعد اس نے واپس ہوٹل جانے کا ارادہ کرلیا......

مگر اس کا دل اس وقت کافی افسردہ تھا۔

وہ ہوٹل پہنچا تو زلیخا اس کا چہرہ دیکھ کر چونک اٹھی اور بولی۔ ''سب خیر تو ہے جی، آپ اتنے پریشان کیوں ہیں؟''

''بس ایسے ہی حالات نے اچانک ہی دل گرفتہ کر دیا ہے۔'' اس کی آنکھیں نم تھیں۔

زلیخا نے اس کے شانے پر آہستگی سے ہاتھ رکھا اور بولی۔ ''حوصلہ رکھیں جی، آپ کی آنکھوں میں آنسو اچھے نہیں لگتے۔ بہادر لوگ اپنی ہار کو جیت میں بدلنے کے لیے بے چین رہتے ہیں۔''

وہ زلیخا کے منہ سے اس قسم کی باتیں سن کر حیران رہ گیا۔ وہ گاؤں کی اَن پڑھ لڑکی جسے ہیل والی چپل پہن کر ابھی تک چلنا بھی نہیں آیا تھا، وہ اس سے ایسی باتیں کر رہی تھی۔ عامر نے جلدی سے آنسو پونچھ لیے۔

اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ عامر سمجھا کہ روم سروس والا ویٹر ہوگا اور زلیخا نے کچھ منگایا ہوگا۔

اس نے آہستہ سے کہا۔ ''یس، کم اِن۔''

دوسرے ہی لمحے جو شخص اندر داخل ہوا، عامر اسے دیکھ کر جھٹ سے کھڑا ہو گیا۔ اس کے جسم پر معمولی کھدر کا لباس تھا، سر پر کھدر کی ٹوپی تھی اور گلے میں ایک تھیلا لٹکا ہوا تھا۔ ماتھے پر تلک بھی تھا۔

''کون ہو تم؟'' اس نے درشت لہجے میں پوچھا۔

''پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے؟'' آنے والے نے کہا۔

اچانک عامر کو اس کے لب و لہجے سے لگا کہ اس نے اسے شاید پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔ پھر اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا، اور اسے یاد آ گیا کہ وہ سہیل ہے۔ سہیل ملٹری اکیڈمی میں عامر کے ساتھ ہی تھا۔ پھر پاس آؤٹ ہونے کے بعد وہ کھاریاں چلا گیا تھا اور عامر نوشہرہ۔ اب تین برس بعد اس سے ملاقات ہو رہی تھی۔ اس کے چہرے پر اس وقت مونچھیں تھیں، پھر اس کا حلیہ بالکل ہندوؤں والا تھا۔

سہیل کمرے میں داخل ہوا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا پھر اس نے استفسار طلب نظروں سے زلیخا کو دیکھا۔

''یہ تمہاری بھابی ہے زلیخا۔'' عامر نے کہا پھر وہ زلیخا سے مخاطب ہوا۔ ''یہ سہیل ہے، میرا پرانا دوست۔''

''تم یہاں کیا کر رہے ہو؟'' اس نے عامر سے پوچھا۔

''پہلے تم بتاؤ، تم یہاں کیسے؟''

''میں تو اپنی غلطی کی وجہ سے یہاں نکل آیا۔'' سہیل نے کہا۔ میں کھیم کرن سیکٹر میں تھا۔ وہ علاقہ کافی عرصے تک ہمارے کنٹرول میں رہا۔ پھر دشمن نے اپنی کئی ڈویژن فوج کے ساتھ وہاں ہلا بول دیا۔ ہماری بٹالین کو پسپا ہونا پڑا۔ بٹالین کے آدھے سے زیادہ جوان شہید ہو گئے۔ اچانک ان کے بمبار طیاروں نے زبردست بمباری شروع کر دی۔ میں اس وقت ٹریک سوٹ میں تھا اور کپڑے بدلنے جا رہا تھا۔''

''تم مورچے میں بھی ٹریک سوٹ میں تھے؟'' عامر نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

''میں رات میں عموماً ٹریک سوٹ پہن لیتا تھا۔ ہم نے آخری دم تک اس پوسٹ کا دفاع کیا لیکن جب دفاع کرنے والا کوئی باقی نہ بچا تو مجھے بھی پیچھے ہٹنا پڑا۔ پھر میں راستہ بھٹک گیا اور کہیں کا کہیں جا نکلا۔ راستے میں ایک ٹرک ڈرائیور سے لفٹ لی۔ وہ سردار جی تھے۔ میں نے ان سے پنجابی بولی تو وہ خوش ہو گئے اور مجھ سے پوچھا کہ تم کہاں کے رہنے والے ہو۔ میں نے جھٹ امرتسر کا نام لے لیا۔ سردار جی امرت سر کے تھے، سیدھے سادے آدمی تھے۔ وہ میری پنجابی سے ایسے متاثر ہوئے کہ مجھے اپنے ساتھ پٹھان کوٹ لے آئے۔'' سہیل نے کہا۔ ''آج یہاں مجھے تیسرا دن ہے۔ میں دو دن سے یہاں کے ٹرک اڈے پر مزدوری کر رہا ہوں... اور وہیں پڑ کر سو رہتا ہوں۔ کچھ رقم جمع ہو جائے تو یہاں سے نکلنے کی کوشش کروں۔'' پھر اس نے پوچھا۔ ''تم بتاؤ، تم یہاں کیسے اور یہ بھابی؟''

عامر نے مختصر الفاظ میں اسے اپنے بارے میں بتایا اور بولا... ''میں خود بھی یہاں سے نکلنا چاہتا ہوں۔ میرے پاس تھوڑی سی رقم ہے لیکن اس سے کام نہیں چلے گا۔ میں زیادہ دیر پٹھان کوٹ میں رکنا بھی نہیں چاہتا۔ سوچ رہا

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

ہوں کہ دلی یا شاہجہاں پور چلا جاؤں۔ وہاں سے پاکستان جانا آسان ہے۔''

''میں کل کسی وقت آؤں گا۔'' سہیل نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''زیادہ دیر اڈے سے غائب رہا تو ٹرک ڈرائیور میرا کام کسی اور کو دے دیں گے۔ میری دیہاڑی ماری جائے گی۔ یہاں ٹیلی فون ہے۔ مجھے یہاں کا ٹیلی فون نمبر دے دو۔ میں اگر خود نہ آسکا تو... فون کر کے تمہاری خیریت پوچھ لوں گا۔''

''ٹیلی فون نمبر تو تمہیں کاؤنٹر سے مل جائے گا۔ ہاں، ہم یہاں مسٹر اینڈ مسز ارجن پال کے نام سے ٹھہرے ہوئے ہیں۔''

سہیل کے جانے کے بعد عامر کا دکھ کچھ کم ہوگیا۔ اس کی طبیعت کا بوجھل پن دور ہوگیا تھا۔

ان لوگوں نے ابھی رات کا کھانا نہیں کھایا تھا۔ زلیخا نے کہا۔ ''یہاں کا کھانا تو بہت ہی بدمزہ ہوتا ہے۔ کیا ہم باہر سے کوئی چیز یہاں لا کر نہیں کھا سکتے؟''

''کیوں نہیں کھا سکتے؟'' عامر مسکرایا۔ ''بتاؤ کیا کھاؤ گی؟ میں ابھی لے آتا ہوں۔''

''کوئی بھی چٹ پٹی چیز، اگر اچار مل جائے تو اچھا ہے۔ یہاں تو اچار بھی اچھا نہیں ہے۔''

عامر اسی وقت کھڑا ہوگیا۔ ''میں ابھی لے کر آتا ہوں۔ تم دروازہ اندر سے بند کرلو۔''

وہ زینے طے کر کے نیچے اترا۔ ابھی وہ آخری زینے پر تھا کہ اسے کاؤنٹر پر کرخت چہرے والا ایک شخص نظر آیا۔

اس نے کاؤنٹر کلرک سے پوچھا۔ ''اس ہوٹل میں کتنے لوگ ٹھہرے ہوئے ہیں اور کب سے؟ مجھے ان سب کا ریکارڈ چاہیے۔''

''خیریت تو ہے انسپکٹر صاحب؟'' کاؤنٹر کلرک نے پوچھا۔

''ہمارے لیے کب خیریت ہوتی ہے۔ اب سرکار کو یہ تشویش ہے کہ تمام ہوٹلوں کی تلاشی لی جائے اور مشکوک لوگوں سے پوچھ گچھ کی جائے۔ ہمیں اطلاع ملی ہے کہ کچھ پاکستانی فوجیوں نے جان بچانے کے لیے ہمارے ہی ملک کا رخ کرلیا ہے۔''

عامر چند لمحے کو سکتے میں رہ گیا۔ وہ فوری طور پر وہاں سے بھاگ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس طرح تو وہ واضح طور پر وہاں کی خفیہ پولیس کی نظروں میں آجاتا۔

''رجسٹر آپ کے سامنے ہے۔'' کاؤنٹر کلرک نے کہا۔ ''آپ خود دیکھ لیں۔''

''ایسے کتنے لوگ ہیں جو ہوٹل میں اکیلے ٹھہرے ہیں یا وہ لوگ جو کئی ہوں اور ایک ہی کمرے میں ہوں؟''

''ایسے کچھ لوگ ہیں۔'' کلرک نے رجسٹر پر نظریں جما کر کہا۔ ''یہ مسٹر سکسینہ ہیں۔ ان کے ساتھ دو آدمی ہیں۔ یہ دلی سے آئے ہیں۔ یہ مسٹر راکیش ہیں۔'' کاؤنٹر کلرک نے دوسرا نام لیا۔ ''یہ بھی دلی سے آئے ہیں اور سنگل روم میں ہیں لیکن یہ بزنس مین ہیں اور اکثر آتے رہتے ہیں۔ یہ مسٹر اینڈ مسز ارجن پال ہیں۔''

اپنا نام سن کر عامر کے اعصاب کشیدہ ہوگئے۔

''یار، مجھے صرف ان لوگوں کی لسٹ دو جو سنگل روم میں ٹھہرے ہوں یا جنہوں نے ایک یا دو بیڈ ایکسٹرا لیے ہوں صرف جینٹس۔''

ٹھیک ہے سر۔'' کلرک نے کہا۔ ''آپ چائے پئیں۔ میں ایسے لوگوں کی لسٹ تیار کرتا ہوں۔''

انسپکٹر کاؤنٹر سے ہٹ گیا۔

عامر کو اسی وقت قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ اوپر سے کوئی نیچے کی طرف آرہا تھا۔ عامر جلدی سے سیڑھیاں طے کر کے نیچے آیا اور کاؤنٹر کے سامنے سے گزرتا ہوا باہر نکل گیا۔ اس نے اب فوری طور پر یہ ہوٹل چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ اسے خفیہ پولیس کے اس انسپکٹر کے وہاں سے نکلنے کا انتظار تھا۔ اسے اتنا تو اطمینان ہوگیا تھا کہ انسپکٹر ان افراد پر شک نہیں کررہا جو فیملی کے ساتھ تھے لیکن احتیاط کا تقاضا یہی تھا کہ فوری طور پر نہ صرف وہ ہوٹل بلکہ شہر ہی چھوڑ دیا جائے۔

وہ فٹ پاتھ پر ٹہلتا ہوا یونہی وقت گزاری کے لیے آگے بڑھا۔ ایک جگہ اسے ایک بک اسٹال نظر آیا۔ کتابوں اور رسالوں کے علاوہ یہاں اخبارات بھی تھے۔ کچھ لوگ وہاں کھڑے ہو کر اخبارات کی سرخیاں پڑھ رہے تھے۔ ان میں سبھی اخبارات ہندی میں تھے۔ صرف دو تین اخبارات انگریزی کے تھے۔ اس نے ہندوستان ٹائمز کا ایک شمارہ خرید لیا اور آگے بڑھ گیا۔ پھر اسے یاد آیا کہ زلیخا نے اس سے کھانے کی فرمائش کی تھی۔

جلد ہی اسے ایک ریسٹورنٹ نظر آگیا۔ وہاں نہ صرف اندر کی تمام میزیں بھری ہوئی تھیں بلکہ باہر فٹ پاتھ پر بھی لوگ بیٹھے کھا رہے تھے۔ عامر نے وہاں سے چکن کڑاہی، نان اور فش فرائی خریدی اور ویٹر سے پیک کرنے کو کہا۔ وہ کھانے کا سامان اور اخبار لے کر واپسی کے لیے مڑا

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

تو ایک جٹا دھاری سادھو نے اس کا راستہ روک لیا۔ وہ سرخ سرخ آنکھوں سے عامر کو گھور رہا تھا۔

عامر بری طرح بوکھلا گیا۔ وہ سمجھ گیا کہ یہاں کی خفیہ پولیس نے اسے پہچان لیا ہے۔ سادھو کے روپ میں بھی خفیہ پولیس کا کوئی انسپکٹر ہی ہوسکتا تھا۔

''ماس مچھی کھاتا ہے مورکھ۔'' سادھو نے دہاڑ کر کہا۔ ''لا کچھ دان کر......''

اسی وقت ریسٹورنٹ کا ایک ویٹر آ گیا اور بولا۔ ''بابا، تم ادھر بیٹھو۔''

عامر نے جیب سے پچاس پیسے کا سکہ نکالا اور سادھو کی طرف بڑھا دیا۔ سادھو نے اس سے سکہ لیا اور اسے حقارت سے دیکھتا ہوا دوسری طرف بڑھ گیا۔

''مائنڈ مت کیجیے گا صاحب۔'' ویٹر نے کہا۔ ''بابا بہت گیانی ہیں اس لیے مالک بھی انہیں کچھ نہیں کہتا۔''

''کوئی بات نہیں۔'' عامر نے سکون کا طویل سانس لے کر کہا اور وہاں سے روانہ ہوگیا۔

وہ ہوٹل واپس پہنچا تو خفیہ پولیس کا انسپکٹر جا چکا تھا۔ وہ کاؤنٹر پر پہنچا تو کاؤنٹر کلرک نے اسے نمستے کیا۔

''میں کل صبح سویرے چیک آؤٹ کروں گا۔'' عامر نے اس سے کہا۔ ''میرا بل ابھی مجھے بھجوا دیجیے گا۔''

''ابھی آپ ڈنر تو لیں گے نا سر۔'' کاؤنٹر کلرک نے پوچھا۔

''نہیں، میں صرف چائے پیوں گا۔ وہ بل میں ایڈ کر دیجیے گا۔''

''او کے سر۔'' کاؤنٹر کلرک نے کہا۔

زلیخا وہ چٹ پٹا کھانا دیکھ کر خوش ہوگئی۔

کھانا کھاتے ہوئے عامر نے اخبار اٹھا لیا۔ اخبار جنگ کی خبروں سے بھرا ہوا تھا۔ اس میں ان جنگی قیدیوں کی خبر سب سے نمایاں تھی جنہیں مشرقی پاکستان (بنگلہ دیش) سے بھارت منتقل کرنا تھا۔ بھارت سرکار ان کے لیے کیمپ بنانے میں مصروف تھی۔

ادارتی صفحے کے ایک کالم پر ایک تصویر تھی۔ کالم کا عنوان تھا۔ ''ہم نے ہزاروں سال پرانا قرض چکا دیا۔'' اس تصویر میں جنرل نیازی اور جنرل اروڑا کسی کاغذ پر دستخط کر رہے تھے۔ ان کی پشت پر پاکستان اور بھارت کے دوسرے فوجی افسر کھڑے تھے۔

عامر کی آنکھیں اچانک دھندلا گئیں۔ نوالہ اس کے حلق میں گویا اٹک گیا اور وہ یونہی ساکت بیٹھا رہا۔

زلیخا نے کھاتے کھاتے اس کی طرف دیکھا اور تشویش سے بولی۔ ''خیر تو ہے جی...... آپ...... رو رہے ہو؟''

''نہیں تو۔'' عامر نے جلدی سے ہتھیلی کی پشت سے اپنے آنسو پونچھ لیے۔

زلیخا نے اسے پانی کا گلاس دیا اور اخبار اس کے ہاتھ سے لے کر دیکھنے لگی۔ اس کی سمجھ میں صرف اتنا آیا کہ عامر کو یہ تصویر دیکھ کر دکھ پہنچا ہے۔ انگریزی تو وہ پڑھ نہیں سکتی تھی۔

اس نے اخبار لپیٹ کر ایک طرف رکھا اور عامر سے بولی۔ ''جنگ میں تو ایسا ہوتا ہی رہتا ہے۔ آپ نے بھی تو پانچ سال پہلے ان کی فوج کا پلیتھن نکال دیا تھا۔''

اسی وقت دستک دے کر روم سروس کا ویٹر چائے لے کر اندر آ گیا۔ اس نے چائے کے ساتھ عامر کو ہوٹل کا بل بھی دے دیا۔

عامر نے بل ادا کرنے کے بعد کہا۔ ''برتن اب صبح ہی اٹھانا۔ اب ہم لوگ سوئیں گے۔'' ویٹر کے جانے کے بعد عامر نے زلیخا سے کہا۔ ''اب چلنے کی تیاری کرو۔ ہم صبح سویرے یہاں سے نکل جائیں گے۔''

''کیا پاکستان جانے کا بندوبست ہوگیا؟'' زلیخا خوش ہو کر بولی۔

''آہستہ بولو۔'' عامر نے سرد لہجے میں کہا۔ ''وہاں جانے کا بندوست نہیں ہوا ہے۔ ابھی تو ہم دلی جا رہے ہیں۔''

''تیاری کیا کرنا ہے جی؟'' زلیخا نے کہا۔ ''اب آپ کے اور اپنے کپڑے بیگ میں رکھنا ہیں۔ وہ میں صبح چلتے وقت رکھ لوں گی۔ چھوٹا موٹا سامان ابھی رکھ لیتی ہوں۔'' وہ تصویر دیکھ کر عامر کا دل غم سے ابھی تک بوجھل تھا۔ اس سے کھانا بھی نہیں کھایا گیا تھا۔ اس کے جذبات وہی پاکستانی سمجھ سکتا ہے جو اس جنگ کا چشم دید گواہ اور بالخصوص فوجی ہو۔

چائے پی کر عامر نے لائٹ آف کی اور سونے کے لیے لیٹ گیا۔

ابھی انہیں لیٹے ہوئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ کسی نے انتہائی بدتہذیبی سے کمرے کا دروازہ دھڑدھڑایا۔

عامر جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا اور ہاتھ بڑھا کر لائٹ آن کر دی۔ پھر اس نے سنبھل کر جھنجلائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''کون ہے؟''

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

''دروازہ کھولو، پولیس۔'' باہر سے ایک کرخت آواز آئی۔

عامر کا دل بے اختیار زور زور سے دھڑکنے لگا۔ زلیخا بھی اٹھ کر بیٹھ گئی تھی اور وہ سہمی ہوئی نظروں سے کبھی عامر کو اور کبھی اپنے دروازے کو دیکھ رہی تھی۔

اس نے اللہ کا نام لیا اور دروازہ کھول دیا۔

دروازے پر پولیس کا ایک انسپکٹر اور ایک حوالدار کھڑا تھا۔ دونوں ہی چہروں سے خرانٹ لگ رہے تھے۔

عامر نے سنبھل کر کہا۔ ''یس آفیسرز!'' اس کا لہجہ سرد تھا۔ عامر وہاں لوگوں سے کم سے کم بات کرتا تھا اور زیادہ تر انگریزی میں کرتا تھا۔ اسے خدشہ رہتا تھا کہ زبان سے اردو کا کوئی ثقیل لفظ نہ پھسل جائے۔

''ہمیں آپ کے کمرے کی تلاشی لینا ہے۔'' انسپکٹر کا لہجہ کھردرا تھا۔

''ضرور لیکن لیکن......''

''ہمارے پاس سرچ وارنٹ ہے۔'' انسپکٹر نے اسے جملہ پورا نہیں کرنے دیا۔

ان دونوں کے عقب میں ایک اور شخص کھڑا تھا۔ انسپکٹر نے اسے مخاطب کیا۔ ''منیجر صاحب، آپ بھی آئیں۔''

عامر کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ اس کے بیگ میں کچھ ایسی چیزیں تھیں جو اس کی گرفتاری کا سبب بن سکتی تھیں۔ وہ ابھی تک دروازے پر ہی کھڑا تھا۔

''کیا ہوا جی...... کون ہے؟'' اندر سے زلیخا کی آواز آئی۔

انسپکٹر اس کی آواز سن کر چونک اٹھا۔

''ڈونٹ وری کا می۔'' عامر نے زلیخا سے کہا۔ ''یہ آفیسرز ہمارے روم کی تلاشی لینا چاہتے ہیں۔''

''آپ کے ساتھ فیملی ہے؟'' انسپکٹر نے پوچھا۔

''ہاں، میری وائف ہے۔'' عامر نے جواب دیا۔

''منیجر صاحب!'' وہ منیجر کی طرف گھوما۔ ''آپ تو کہہ رہے تھے کہ روم نمبر تین سو دو میں تین لڑکے ہیں؟''

''میں نے شاید روم نمبر دو سو تین کہا تھا۔'' منیجر نے کہا۔

''سوری سر!'' انسپکٹر نے عامر سے کہا۔ ''شما چاہتا ہوں۔''

''پھر بھی سرچ کرلیں۔'' عامر نے کہا۔

''سوری اگین سر!'' انسپکٹر نے کہا۔ ''میں صرف ایک نظر ڈالنا چاہتا ہوں۔''

''پلیز۔'' عامر نے دروازے سے ہٹ کر اسے اندر آنے کا اشارہ کیا۔

وہ شاید یہ تسلی کرنا چاہتا تھا کہ کمرے میں واقعی کوئی عورت موجود ہے یا کوئی عورت کی آواز نکال رہا ہے۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی اس کی نظر زلیخا پر پڑی تو وہ اسے دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ زلیخا کے بالوں کی چند لٹیں چہرے پر بکھری ہوئی تھیں، آنکھوں میں نیند کا خمار تھا۔ وہ فوراً رخ موڑ کر کھڑی ہوگئی۔

وہ اپنی تسلی کر کے ایک مرتبہ پھر معذرت کرنے لگا۔

اس دوران میں حوالدار نے مزید کارکردگی دکھانے کو کمرے کے اٹیچ باتھ روم میں بھی جھانک لیا۔

ان کے جانے کے بعد عامر نے سکون کا طویل سانس لیا۔

زلیخا نے کچھ پوچھنا چاہا لیکن اس نے اشارے سے روک دیا اور بلند آواز میں بولا۔ ''یہ کون سا طریقہ ہے؟ میں ابھی پولیس کمشنر کو ٹیلی فون کرتا ہوں۔''

عامر نے جھٹکے سے دروازہ کھولا تو حوالدار گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا۔ وہ شاید کمرے کے دروازے سے کان لگائے کھڑا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ شرمندہ ہوگیا۔

عامر غصے میں پیر پٹختا ہوا نیچے کاؤنٹر پر پہنچا تو منیجر اور انسپکٹر دونوں اسے دیکھ کر چونک اٹھے۔

''میں ایک کال کرسکتا ہوں؟'' اس نے منیجر سے کہا۔ ''میں ابھی پولیس کمشنر سے بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''سر! میں ایک بار پھر آپ سے سوری کرتا ہوں۔'' انسپکٹر گڑبڑا گیا۔

''بات آپ کی سوری کی نہیں ہے آفیسر۔'' اس نے درشت لہجے میں کہا۔ ''آپ کا یہ حوالدار میرے روم کے دروازے سے کان لگائے کیوں کھڑا تھا؟'' پھر وہ منیجر سے مخاطب ہوا۔ ''اور آپ اپنی میموری کا علاج کرائیں۔ آپ کو دو سو تین اور تین سو دو میں کوئی ڈیفرنس ہی نہیں لگتا؟''

منیجر بھی گھگیانے لگا۔ عامر نے سوچا، اتنی خوراک کافی ہے۔ کہیں الٹی آنتیں گلے ہی نہ پڑ جائیں۔ ان کی خوشامد پر وہ واپس چلا گیا۔

پھر صبح تک نیند نہیں آئی۔

صبح وہ لوگ جانے کو تیار ہوئے تو کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی اور آواز آئی۔ ''روم سروس۔''

عامر نے دروازہ کھول دیا۔ ہوٹل کا ایک ویٹر ناشتے

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

کی ٹرالی لیے کھڑا تھا۔ عامر کے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ بولا۔ ''سر! یہ ناشتا منیجر صاحب نے آپ کے لیے بھجوایا ہے۔''

وہ ناشتا کر کے کمرے سے نکلے تو ویٹر ان کا بیگ اٹھائے ہوئے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ وہ آہستہ سے بولا۔ ''صاحب، اس بیگ میں کیا ہے۔ یہ تو بہت بھاری ہے؟''

اس بیگ میں عامر کا سامان تھا جو واقعی بہت بھاری تھا۔ اس نے ویٹر سے کہا۔ ''اس میں ماربل کا انتہائی قیمتی سامان ہے بے وقوف۔ اسے سنبھال کر اٹھاؤ۔''

وہاں ٹیکسی میں صرف دولت مند لوگ سفر کرتے تھے۔ عام آدمی سائیکل رکشا میں سفر کرتا تھا۔ عامر کو عجیب لگتا تھا کہ ایک آدمی اس کا بوجھ ڈھو رہا ہے۔ ویٹر اس کے لیے ٹیکسی لے آیا تھا۔ عامر نے اس سے اسٹیشن چلنے کو کہا۔

آدھے گھنٹے بعد ایک ٹرین دہلی جانے والی تھی۔ عامر نے بھیڑ بھاڑ سے بچنے کے لیے فرسٹ کلاس کے ٹکٹ خرید لیے۔

''آپ اتنی عیاشی سے پیسے خرچ کر رہے ہیں، اس طرح تو دو چار دن میں پیسے ختم ہو جائیں گے۔'' زلیخا پہلی مرتبہ بیویوں والے انداز میں بولی۔

''اب میں ہاتھ روک کر خرچ کروں گا۔ اب بھی میرے پاس چھ، ساڑھے چھ ہزار تو ہوں گے۔''

دہلی پہنچنے تک انہیں کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ عامر نے بھی اب ہاتھ روک کر خرچ کرنے کا فیصلہ کر لیا اور درمیانے درجے کے ایک ہوٹل میں ٹھہر گیا۔

راستے میں شاید زلیخا کو سردی لگ گئی تھی یا اس نے کوئی اور بد احتیاطی کی تھی۔ دلی پہنچتے پہنچتے اسے بخار آ گیا۔ عامر کے بیگ میں پین کلرز اور بخار وغیرہ کی کچھ گولیاں تھیں۔ اس نے زلیخا کو دو گولیاں کھلائیں اور زبردستی چائے پلائی۔ وہ چائے بھی یوں پیتی تھی جیسے دوا پی رہی ہو۔

رات کا کھانا ان لوگوں نے کمرے ہی میں کھایا۔ اب وہ اپنے بیگ سے وہ تمام چیزیں نکال کر ضائع کر دے گا جن سے اس کے پکڑے جانے کا امکان ہو۔ اس نے جرسی، اونی موزے، گرم بنیانیں اور ٹراوزر سب کچھ بیگ سے نکال لیا۔ ان سب چیزوں پر ایک طرح سے پاکستان آرمی کی چھاپ تھی۔ پھر اس نے فرسٹ ایڈ باکس بھی اپنے بیگ میں الٹ دیا۔ وہ باکس بھی عامر کی شناخت بن سکتا تھا۔

تمام چیزیں اس نے ایک گٹھڑی میں باندھیں اور گٹھڑی لے کر ہوٹل سے باہر نکل آیا۔

وہ ویرانے کی تلاش میں کافی دور تک چلتا رہا پھر اسے ایک جگہ ایک بڑا سا گندہ نالا نظر آیا۔ اس نے گٹھڑی نالے میں پھینک دی۔ اب صرف اس کے پاس ایک شکاری چاقو تھا۔

وہ ہوٹل واپس آیا تو زلیخا کے سر میں شدید درد ہو رہا تھا۔

رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ عامر نے اس سے کہا۔ ''پہلے کچھ کھا لو پھر میں تمہیں دوا دوں گا۔''

اس نے اگل نگل کر دو سلائس کھائے پھر سر درد اور بخار کی گولی کھا کے عامر سے بولی۔ ''اگر کہیں سے گرم گرم دودھ مل جائے تو میری طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔ میرے سر میں جب بھی درد ہوتا تھا میں ایک گلاس گرما گرم دودھ پی لیتی تھی۔ درد چٹکی بجاتے غائب ہو جاتا تھا۔''

عامر نے پٹھان کوٹ سے ایک تھرماس بھی خریدا تھا اس میں دو گلاس دودھ تو آ ہی سکتا تھا۔ وہ تھرماس لے کر کمرے سے باہر نکلا۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ ریلوے اسٹیشن کے باہر دوسری دکانوں کے ساتھ دودھ دہی اور لسی کی ایک دکان تھی۔

دکان پر اس وقت بھی خاصے لوگ موجود تھے۔ کڑھاؤ میں کھولتا ہوا دودھ بڑے بڑے پیالوں میں انڈیل کر گاہکوں کو دیا جا رہا تھا۔ عامر بھی تھرماس لے کر کھڑا ہو گیا۔ اپنی باری پر اس نے دودھ والے کو تھرماس دیتے ہوئے کہا۔ ''اس میں آٹھ آنے کا دودھ ڈال دو، چینی ملا دینا۔''

اس کے بالکل نزدیک ایک میز پر کرخت چہرے والا ایک شخص بیٹھا تھا۔ عامر نے اسے چونکتے دیکھا، پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر عامر کے نزدیک آ گیا اور بولا۔ ''آپ کہاں سے آئے ہیں؟''

اس دوران میں دودھ والا تھرماس میں دودھ ڈال چکا تھا عامر نے اسے پیسے دیتے ہوئے اس شخص کو جواب دیا۔ ''میں الٰہ آباد سے آیا ہوں۔'' اس کے حلیے اور لہجے سے عامر کے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی تھی۔

عامر تھرماس لے کر جانے لگا تو وہ اس کے پیچھے لپکا۔ ''میں آپ کا شبھ نام پوچھ سکتا ہوں؟''

''شبھ'' کا مطلب سمجھے بغیر عامر نے جواب دیا۔ ''ارجن پال۔''

''میں انسپکٹر راٹھور ہوں۔'' اس کے چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ تھی۔ ''الٰہ آباد میں کہاں رہتے ہیں آپ؟'' وہ

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

پھر مسکرایا۔

اس نے تو الہ آباد کا صرف نام ہی سنا تھا۔ وہاں کے بارے میں اور کچھ نہیں جانتا تھا۔ اس نے سنبھل کر کہا۔ ''وھاٹ ڈو یو مین انسپکٹر؟''

''کیا الہ آباد میں ابھی تک آٹھ آنے اور چار آنے چلتے ہیں؟'' اس نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

اچانک عامر کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ بھارت میں کئی سال سے آٹھ آنے اور چار آنے کے بجائے پچاس پیسے، پچیس پیسے وغیرہ رائج تھے۔ اسی طرح وہاں سیر کی جگہ اب کلو اور لیٹر نے لے لی تھی۔

انسپکٹر صاحب!'' وہ زبردستی مسکرایا۔ ''اتنی سی بات پر آپ نے مجھے روک لیا۔ برسوں کی پڑی ہوئی عادت ہے کبھی کبھی زبان پھسل جاتی ہے۔''

انسپکٹر نے اچانک لہجہ بدل کر کہا۔ ''اپنا الہ آباد کا ایڈریس بتاؤ۔''

''میں الہ آباد کے مین بازار کے پیچھے رہتا ہوں۔'' اس نے تکا لگایا۔

''مسٹر ارجن پال!'' انسپکٹر نے کہا۔ ''آپ کو میرے ساتھ پولیس اسٹیشن تک چلنا ہوگا۔'' اس کا لہجہ انتہائی درشت اور سرد تھا۔

''کس جرم میں؟'' اس نے پوچھا۔

''بس تھوڑی سی پوچھ تاچھ کرنی ہے۔'' اس نے کہا۔

وہ دونوں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے کچھ دور نکل آئے تھے۔

وہ پرانی سی ایک ولیز جیپ کے پاس رک گیا اور عامر سے بولا۔ ''پدھاریے مہاراج!''

اس نے سوچا کہ اگر ایک دفعہ میں پولیس کے ہتھے چڑھ گیا تو پھر جیتے جی تو ان کے چنگل سے نکل نہیں سکوں گا۔ وہ اس کے بارے میں معلومات کرتے تو بالآخر یہ معلوم کر لیتے کہ اس کا تعلق پاکستان آرمی سے ہے۔ وہ اسے جنگی قیدی نہیں بناتے بلکہ پاکستان کا جاسوس ثابت کر دیتے، پھر یا تو وہ اسے پھانسی پر لٹکا دیتے یا پھر اس کی زندگی اتنی عذاب ناک بنا دیتے کہ وہ خود مرنے کی تمنا کرتا۔

عامر نے ایسے لوگوں کے بہت واقعات سنے تھے جو صرف اپنے عزیزوں سے ملنے بھارت آئے تھے اور یہاں پاکستانی جاسوس سمجھ کر پکڑ لیے گئے۔ پھر ان کا کوئی سراغ نہیں ملا۔

یہ تمام خیالات لمحوں میں اس کے ذہن میں آئے تھے۔

''سوچ کیا رہے ہو مسٹر ارجن پال؟'' انسپکٹر نے درشت لہجے میں کہا۔ ''گاڑی میں بیٹھو۔''

''میں سوچ رہا ہوں کہ کمشنر پولیس کو کہاں سے ٹیلی فون کروں، کیا آپ مجھے ٹیلی فون کرنے کی اجازت دیں گے؟'' عامر نے پٹھان کوٹ والا نسخہ یہاں بھی آزمانے کی کوشش کی۔

''بالکل اجازت دیں گے، آپ وہاں سے دلّی کے سی ایم یا پردھان منتری کو بھی ٹیلی فون کر سکتے ہیں لیکن آپ کا الہ آباد والا ایڈریس کنفرم ہونے کے بعد۔''

عامر کی بات سے انسپکٹر کے لہجے میں پہلے والا طنطنہ نہیں رہا تھا۔

عامر نے جیپ کی طرف یوں قدم بڑھائے جیسے اس میں بیٹھنے جا رہا ہو لیکن اس نے اچانک گھوم کر تھرماس پوری قوت سے انسپکٹر کے منہ پر مار دیا۔ اس اچانک ضرب سے وہ بوکھلا گیا۔ عامر نے اپنا گھٹنا پوری قوت سے اس کے پیٹ کے نچلے حصے پر رسید کر دیا۔

اس کے حلق سے اذیت ناک کراہ بلند ہوئی اور وہ زمین پر گر پڑا۔

اسی وقت اسے دودھ کی دکان کی طرف سے بھاگتے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ عامر وہاں سے اسٹیشن کی طرف بھاگا۔

کوئی چیخ کر بولا۔ ''کیا ہوا انسپکٹر صاحب؟'' پھر کسی نے عامر پر فائر کیا لیکن شاید اس نے عامر کو محض دھمکانے کے لیے فائر کیا تھا۔

وہ پوری قوت سے بھاگنے لگا۔ اسے اپنے پیچھے بھاگتے قدموں کی آوازیں آرہی تھیں۔ اس کا تعاقب کرنے والے کو یہ برتری حاصل تھی کہ وہ مسلح تھا۔ عامر سے حماقت یہ ہوئی تھی کہ اس نے اپنے سامان میں سے صرف ایک ریوالور بچا کر رکھا تھا، وہ بھی ہوٹل کے کمرے میں تھا۔ اس کے کوٹ کی جیب میں صرف شکاری چاقو تھا۔

وہ بھاگتا ہوا ریلوے اسٹیشن کے نزدیک پہنچ گیا وہاں سے ایک ٹرین ابھی ابھی روانہ ہوئی تھی اور اس کی رفتار قدرے کم تھی۔ وہ جھپٹ کر ٹرین کے پائیدان پر چڑھ گیا اور دروازے کا ڈنڈا پکڑ کر اوپر بوگی میں چلا گیا۔

اس کے پیچھے آنے والے نے بھی اسے ٹرین پر چڑھتا دیکھ لیا تھا۔ وہ چیختا ہوا ٹرین کے پیچھے بھاگا۔ عامر کو پلیٹ فارم کی ناکافی روشنی میں صرف اس کا چہرہ دکھائی دے

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

رہا تھا۔ آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ پھر عامر نے اسے پلٹ کر پلیٹ فارم کی طرف بھاگتے دیکھا۔ وہ یقیناً اسٹیشن ماسٹر کی طرف گیا ہوگا تاکہ ٹرین کو اگلے اسٹیشن پر رکوا سکے۔ عامر کو تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ یہ کون سی ٹرین تھی اور کہاں جا رہی تھی۔

ٹرین اب پوری طرح رفتار پکڑ چکی تھی۔ اس کی تیز رفتاری سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کوئی میل ٹرین ہے۔ وہ جس بوگی میں چڑھا تھا، اس میں زیادہ رش نہیں تھا۔

کھڑکی کے پاس اسے ایک خالی سیٹ نظر آئی تو وہ اسی پر بیٹھ گیا اور اپنی سانس درست کرنے لگا۔ ٹرین کے مسافر ابھی جاگ رہے تھے۔ ان میں سے کچھ مسافروں نے عامر پر ایک نظر ڈالی، پھر ایک دوسرے سے باتوں میں یا کچھ پڑھنے میں مصروف ہو گئے۔

تھوڑی دیر بعد ایک نوجوان وہاں آ گیا اور عامر سے بولا۔ ''سوری سر، یہ سیٹ میری ہے۔''

''نو پرابلم۔'' اس نے ہنس کر کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر پولیس انسپکٹر کے انداز میں بولا۔ ''پدھاریے۔''

''میرا یہ مطلب نہیں تھا سر۔'' وہ کوئی بہت بااخلاق لڑکا تھا۔ ''آپ شاید جلدی میں چڑھ گئے ہیں۔ مجھے اپنی سیٹ کا نمبر بتائیے، میں اسے ڈھونڈ لوں گا۔''

''تھینکس۔'' عامر نے ہنس کر کہا۔ ''میں نے کافی دور سے بھاگ کر ٹرین پکڑی تھی اس لیے دم لینے کو یہاں رک گیا تھا۔ میں اب اپنی سیٹ تلاش کر لوں گا۔'' یہ کہہ کر عامر آگے کی طرف بڑھا پھر رک کر اسی نوجوان سے پوچھا۔ ''اگلا اسٹیشن کتنی دیر میں آئے گا؟''

''وہ تو کم سے کم ایک گھنٹے بعد آئے گا۔'' نوجوان نے جواب دیا۔

وہ آگے بڑھ گیا۔ آج کی طرح اگر اس دور میں بھی موبائل ٹیلی فون ہوتا تو ریلوے پولیس اسے گرفتار کر چکی ہوتی۔

اس کا ارادہ تھا کہ اگلا اسٹیشن آنے سے پہلے ہی زنجیر کھینچے گا اور ٹرین سے اتر کر بھاگ جائے گا۔

اس نے کھڑکی سے باہر جھانکا تو اسے دور سے کسی اسٹیشن کی روشنیاں نظر آئیں۔ نوجوان سے شاید اندازے کی غلطی ہو گئی تھی۔ اگلا اسٹیشن تو آدھے ہی گھنٹے میں آ گیا تھا۔ اس کے اعصاب کشیدہ ہو گئے لیکن اسے حیرت ہوئی کہ ٹرین بغیر رکے دھڑ دھڑاتی ہوئی وہاں سے گزر گئی۔

''یہ کون سا اسٹیشن تھا؟'' اس نے کھڑکی کے ساتھ بیٹھے ہوئے ایک صاحب سے پوچھا۔

''یہ غازی آباد تھا۔'' ان صاحب نے جواب دیا۔ ''راج دھانی یہاں نہیں رکتی۔ یہ کچھ دیر کے لیے ہاپڑ پر رکے گی۔'' پھر وہاں سے امروہہ پر۔''

اس کی باتوں سے عامر کو یہ بھی معلوم ہو گیا کہ وہ ٹرین راج دھانی ایکسپریس ہے اور امروہہ کی طرف جا رہی ہے۔ اب اگر کوئی اس سے پوچھتا تو وہ جواب دے سکتا تھا کہ وہ امروہہ جا رہا ہے۔

گاڑی کی رفتار سست ہونے لگی۔ عامر سمجھ گیا کہ ہاپڑ کا اسٹیشن آ گیا ہے۔ پلیٹ فارم بائیں جانب تھا۔ عامر کا ارادہ تھا کہ بائیں جانب اتر جائے گا۔ وہ بائیں جانب والی کھڑکی کے پاس پہنچ گیا۔

ٹرین آہستہ آہستہ رک گئی۔ عامر نے کھڑکی سے جھانکا تو اس کی پریشانی میں اضافہ ہو گیا۔ اس طرف بھی اسے پولیس والے نظر آئے۔ ادھر سے ایک دو آدمی اترے تھے انہیں پولیس والوں نے گھیر لیا تھا۔

وہ گھبرا کر پلیٹ فارم کی سمت والی کھڑکی کی طرف گیا تو بوکھلا گیا۔ پولیس کے کئی آدمی ٹرین میں سوار ہو رہے تھے اور بہت سے پلیٹ فارم پر کھڑے ہوئے تھے۔ وہ ٹرین سے اترنے والے مسافروں کو روک رہے تھے۔

اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ عامر اس ٹرین میں ہی رہے اور جیسے بھی حالات ہوں، ان کا سامنا کرے۔

ٹرین نے سیٹی بجائی اور ایک دفعہ پھر حرکت میں آ گئی۔ عامر کو یقین تھا کہ پولیس نے اسٹیشن اور اس کے اردگرد کی ناکابندی کر دی ہوگی۔

وہ ٹرین اچھی تھی اور اس کی بوگیوں کے درمیان بھی راستہ تھا۔ دوسری بوگی میں جانے کے لیے نیچے نہیں اترنا پڑتا تھا۔ گویا ایک سرے سے دوسرے سرے تک آنے جانے کی سہولت تھی۔ درمیان میں ٹرین کی ڈائننگ کار تھی۔ اس کے بیرے بھی عامر کو آتے جاتے دکھائی دیے تھے۔

پھر سامنے والی بوگی سے پولیس کے تین آدمی نمودار ہوئے۔ عامر کا دل بے اختیار دھڑکنے لگا۔

اس کے نزدیک ہی دو مسافر شطرنج کی بساط بچھائے بیٹھے تھے۔ عامر کو شطرنج کھیلنا تو آتی تھی لیکن وہ اس میں زیادہ ماہر نہیں تھا۔

دو تین مسافر نزدیک ہی بیٹھے ہوئے ان کے کھیل کو

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

بہت غور سے دیکھ رہے تھے۔

عامر بھی ایک سیٹ پر ٹک گیا اور بہت غور سے شطرنج کی بساط کو دیکھنے لگا۔

''اپنا وزیر بچائیے صاحب۔'' عامر نے بساط پر نظریں جمائے جمائے کہا۔

اسی وقت پولیس والے وہاں پہنچ گئے۔ وہ ایک ایک شخص کی شکل بہت غور سے دیکھ رہے تھے۔ عامر نے سردی سے بچنے کے لیے ایک اونی ٹوپی سر پر چڑھالی تھی جو کانوں تک تھی۔

''آپ خاموشی سے کھیل دیکھیں، بیچ میں دخل مت دیں۔'' شطرنج کے کھلاڑی میں سے وہ شخص ناگواری سے بولا جو دوسرے فریق کا وزیر پیٹنے والا تھا۔

''سوری۔'' عامر نے کہا۔ ''بس اتنی بڑی غلطی دیکھ کر میں چپ نہ رہ سکا۔''

''آپ اتنے ہی ماہر ہیں تو ایک بازی کھیل لیں۔'' اسے ٹوکنے والے کھلاڑی نے اسے دعوت دی۔

''آپ کہاں جارہے ہیں؟'' ایک کرخت آواز گونجی۔ عامر کے چہرے پر پسینا آگیا۔ آخر وہ گھڑی آہی گئی تھی جس سے عامر بچنا چاہ رہا تھا۔ اس نے آہستہ آہستہ گردن گھما کر پولیس والوں کی طرف دیکھا۔ وہ اسی نوجوان سے مخاطب تھے جس کی سیٹ پر عامر بیٹھ گیا تھا۔

''میں امروہہ جاؤں گا۔'' نوجوان نے جواب دیا۔

''چلیے صاحب، پھر ہوجائے ایک بازی۔'' عامر نے اس شخص سے کہا جس نے اسے شطرنج کھیلنے کی آفر کی تھی۔

اس کا فریق شاید بالکل ہی اناڑی تھا۔ اس نے فوراً عامر کے لیے جگہ خالی کردی اور عامر شطرنج کے مہرے لگانے لگا۔

عامر نے پہلی چال چلی تو پولیس والے ان کے نزدیک پہنچ گئے۔ عامر نے کن انکھیوں سے دیکھا، پولیس کا ایک انسپکٹر بہت غور سے شطرنج کی بساط کو گھور رہا تھا۔ عامر بہت انہماک سے دوسری چال چلنے میں مصروف تھا۔

''آپ لوگ کہاں جارہے ہیں؟'' اس نے ان دونوں سے پوچھا۔

''امروہہ۔'' عامر نے جواب دیا۔ اور اپنے فریق سے بولا۔ ''اب میں چال واپس نہیں لینے دوں گا صاحب! اپنا گھوڑا بچائیں۔''

''اوہو۔'' دوسرا آدمی جلدی سے بولا۔ ''میں نے دیکھا نہیں تھا۔'' یہ کہہ کر اس نے اٹھا مہرہ پھر واپس رکھ دیا۔

''آپ نے یہاں کسی مشکوک آدمی کو دیکھا ہے؟'' پولیس انسپکٹر نے پوچھا۔

عامر نہیں جانتا تھا کہ اس کا مخاطب کون ہے؟

''ایک منٹ۔'' اس نے عامر سے کہا۔ ''پھر پولیس انسپکٹر کی طرف متوجہ ہوگیا۔'' بات کیا ہے انسپکٹر صاحب، آپ کو کس کی تلاش ہے؟''

''ایک مشکوک آدمی کی، وہ دلّی سے اسی ٹرین میں چڑھا ہے۔ وہ پاکستانی جاسوس بھی ہوسکتا ہے اور کوئی خطرناک قاتل بھی۔ اس نے دلّی میں ہمارے ایک انسپکٹر کو بہت بری طرح زخمی کردیا تھا۔ چوٹ اتنی زبردست تھی کہ وہ دو گھنٹے میں جان سے گزر گئے۔''

''او، ویری سیڈ۔'' عامر نے کہا۔ ''اس ٹرین میں دلّی سے تو سبھی چڑھے ہیں۔ اس آدمی کا حلیہ بتا سکتے ہیں آپ؟''

''حلیہ!'' انسپکٹر زیرلب بڑبڑایا۔ ''مرنے سے پہلے انسپکٹر راٹھور نے اس کا حلیہ بتایا تھا لیکن وہ پوری طرح حواس میں نہیں تھے۔ وہ لمبا اور صحت مند آدمی ہے اور اس کے بالوں اور داڑھی کا رنگ براؤن ہے۔''

''اس حلیے کے سو آدمی تو آپ کو اسی ٹرین میں مل جائیں گے۔'' عامر نے کہا۔

''حلیہ تو میرا بھی وہی ہے جو آپ بتارہے ہیں۔'' ان صاحب نے جواب دیا جو عامر کے ساتھ شطرنج کھیل رہے تھے۔

پولیس انسپکٹر چند لمحے وہاں کھڑا کچھ سوچتا رہا۔ عامر ایک مرتبہ پھر کھیل میں منہمک ہونے کی اداکاری کرنے لگا۔ پولیس انسپکٹر وہاں سے چلا گیا تو عامر نے سکون کا سانس لیا۔ اب وہ بوگی کے دوسرے لوگوں سے پوچھ گچھ کررہا تھا۔

''انسپکٹر صاحب! ہوسکتا ہے وہ آدمی ہاپڑ پر اتر گیا ہو؟'' عامر کے کانوں میں کسی کی آواز آئی۔ ''گاڑی وہاں بھی تو رکی تھی۔''

''وہاں پولیس کی بھاری نفری موجود تھی۔ وہ وہاں سے اتر کے کہیں فرار نہیں ہوسکتا۔'' انسپکٹر نے کہا۔

''پولیس نے اسے پکڑ لیا ہوگا۔'' عامر کے کانوں میں ایک دوسری آواز آئی۔

عامر سر جھٹک کر پھر کھیل میں مصروف ہوگیا۔ اب کھیل میں اس کا دل نہیں لگ رہا تھا۔ اچانک ٹرین کی رفتار سست ہونے لگی۔ کھیلنے والے صاحب چونک کر بولے۔ ''چلیں اترنے کی تیاری کریں۔ امروہہ آرہا ہے۔'' وہ شطرنج کے مہرے سمیٹنے لگے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

دوسرے لوگ بھی اترنے کی تیاری کرنے لگے۔
''معاف کیجیے گا۔'' عامر نے کہا۔ ''میں آپ کا نام پوچھنا تو بھول ہی گیا۔''
''مجھے آپ کا نام پوچھنا کیا یاد رہا ہے؟'' وہ صاحب مسکرائے۔ ''میرا نام ابرار احمد ہے۔''
''میں نعیم ہوں۔'' عامر نے کہا۔ ''دلّی میں رہتا ہوں اور ایک ضروری کام سے امروہہ جا رہا ہوں۔''
''یہاں آپ کے کوئی عزیز یا رشتے دار ہیں؟'' ابرار نے پوچھا۔
''نہیں صاحب، یہاں تو میں بالکل اجنبی ہوں۔'' عامر نے جواب دیا۔
''تو پھر غریب خانہ حاضر ہے۔ وہاں چلیں، اب تو آپ کی واپسی صبح ہی ہوگی؟'' ابرار نے کہا۔
''آپ کو خوامخواہ زحمت ہوگی۔'' عامر نے کہا۔ ''ایک ہی رات کی بلکہ چند گھنٹوں کی تو بات ہے۔ یہ میں کسی ہوٹل میں گزار لوں گا۔''
''زحمت کیسی؟'' ابرار نے کہا۔ ''غریب خانہ حاضر ہے تو پھر ہوٹل کیوں؟''
ابرار کی بات پر عامر نے گویا ہتھیار ڈال دیے۔ اسے یوں بھی کہیں تو ٹھہرنا ہی تھا۔ پولیس والے تو امروہہ میں بھی اسے تلاش کرتے۔ وہ لوگ سب سے پہلے امروہہ کے ہوٹلوں اور مسافر خانوں کا رخ کرتے۔ ابرار نے اس کی مشکل خود ہی آسان کر دی تھی۔ ٹرین رکی تو ابرار نے ایک بڑا بیگ اور سوٹ کیس اٹھا لیا۔
''ارے، یہ سوٹ کیس مجھے دے دیں۔'' عامر نے کہا اور ضد کر کے ان سے سوٹ کیس لے لیا۔
حسبِ توقع امروہہ کے ریلوے اسٹیشن پر بھی پولیس موجود تھی۔
عامر پولیس والوں کی طرف دیکھے بغیر ابرار سے باتیں کرتا ہوا پلیٹ فارم پر چلنے لگا۔ اگر وہ بالکل خالی ہوتا تو پولیس والوں کی نظروں میں مشکوک ہوتا۔
وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے ریلوے اسٹیشن کے خارجی دروازے تک پہنچ گئے۔
وہاں عامر کے لیے ٹکٹ کلکٹر کی شکل میں ایک اور مشکل موجود تھی۔ عامر اس پر توجہ دیے بغیر تیزی سے باہر نکلا تو پیچھے سے ابرار کی آواز آئی۔ ''نعیم بھائی، اپنا ٹکٹ تو دکھا دیں۔''
''معاف کیجیے گا۔'' عامر نے کہا اور رک کر اپنی جیبوں کی تلاشی لینے لگا۔
اس دوران میں ابرار اپنا ٹکٹ دکھا چکا تھا۔
''کیا ہوا صاحب؟'' ٹکٹ کلکٹر ہنس کر بولا۔
''اصغر صاحب! جانے بھی دیں۔ نعیم میاں نے شاید اپنا ٹکٹ کہیں گرا دیا ہے۔''
''ایسا کرتا ہوں، میں دلّی سے یہاں تک ٹکٹ کے پیسے دے دیتا ہوں۔''
''چھوڑیں صاحب! آپ یہ فضول میں ہرجانہ بھی ہو جائے گا، جائیے۔''
''بہت نوازش۔'' عامر نے کہا اور سوٹ کیس اٹھا کر باہر کی طرف لپکا۔
اسے پناہ میسر آگئی تھی۔۔ اس کی آدھے سے زیادہ پریشانی ختم ہوگئی تھی۔

☆☆☆

زلیخا کے سر میں شدید درد ہو رہا تھا۔ اسے عامر کی طرف سے بھی پریشانی تھی۔ عامر کو گئے ہوئے تین گھنٹے سے زیادہ ہو چکے تھے۔ وہ زلیخا کے لیے دودھ لینے گیا تھا۔ دودھ کی دکان وہاں سے اتنی دور تو نہیں ہوسکتی کہ اسے تین گھنٹے لگ جائیں۔ وہ کمرے کی کھڑکی سے باہر دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن اسے اندھیرے میں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔
اس کے سر کا درد مزید بڑھ گیا تو اس نے سر درد کی ایک اور گولی کھانے کا فیصلہ کیا۔ عامر نے فرسٹ ایڈ کا سارا سامان بیگ میں یونہی الٹ دیا تھا۔ وہ بیگ میں بکھرا ہوا تھا۔ زلیخا سر درد کی گولیوں کو پہچانتی تھی۔ اس نے ایک گولی نکال کر پانی سے نگلی اور دوسری دوائیں اور فرسٹ ایڈ کا سامان کاغذ کی ایک خالی تھیلی میں رکھنے لگی۔ پھر اسے خیال آیا کہ ممکن ہے عامر خدانخواستہ کسی مشکل میں گرفتار ہو اور یہاں سے بھی نکلنے کی بات کرے۔ یہ سوچ کر اس نے کپڑے بدلے اور اپنے اور عامر کے میلے کپڑے تولیے میں لپیٹ کر بیگ میں رکھ دیے۔ اس نے واش روم سے بھی عامر کی شیونگ کٹ، ٹوتھ برش اور پیسٹ اور صابن وغیرہ اٹھا کر کاغذ کی ایک خالی تھیلی میں ڈالا اور اسے بھی بیگ میں ڈال دیا۔
ان سب کاموں میں اسے سر درد کا خیال بھی نہ آیا۔ اسے یہ جان کر خوش گوار حیرت ہوئی کہ اس کے سر کا درد اب ختم ہو چکا تھا۔ وہ پھر عامر کا انتظار کرنے لگی۔ اس نے بقیہ رات بھی آنکھوں میں کاٹ دی لیکن عامر نہ آیا۔ وہ بھلا

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN

www.paksociety.com

آ بھی کیسے سکتا تھا۔

صبح ہوئی تو اس نے روم سروس سے ناشتے کے لیے کہا۔ اس کا دل تو نہیں چاہ رہا تھا لیکن خالی پیٹ اسے مزید پریشانی ہوتی تھی۔

ناشتا کرنے کے بعد اچانک اسے یہ ہولناک خیال آیا کہ عامر خدانخواستہ پکڑا تو نہیں گیا۔ اس تصور ہی سے اس کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ عامر نہ آیا تو میں کہاں جاؤں گی، کیا کروں گی؟'' اس نے ہول کر سوچا۔ ''میں نے تو کبھی اپنے گاؤں سے باہر قدم بھی نہیں نکالا، اب انسانوں کے اس جنگل میں کیسے اپنی حفاظت کروں گی؟ یہ سوچ کر اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ پھر اس نے اپنے آنسو پونچھ لیے۔ وہ بزدل نہیں تھی نہ اتنی نرم و نازک تھی جتنی دیکھنے میں نظر آتی تھی۔ گاؤں میں کسی کی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ میلی آنکھ سے اسے دیکھ سکے۔ شہر میں بھی تو انسان ہی بستے ہیں۔ دو پیروں اور دو ہاتھوں والے۔ ان سے بھلا کیا ڈرنا؟ اس کے باوجود اس کے دل میں ایک خوف سا تھا۔ پھر اسے اچانک دوسرا ہولناک خیال آیا۔ ساری رقم تو عامر کے پاس تھی۔ وہ بغیر پیسوں کے کیسے گزارہ کرے گی، کہاں رہے گی، کیا کھائے گی؟

اس نے اٹھ کر بیگ کھولا اور عامر کے کپڑوں کی جیبیں ٹٹولنے لگی کہ ممکن ہے، اس نے کچھ رقم چھوڑ دی ہو لیکن عامر کی جیبیں بالکل خالی تھیں۔ ایک جیب میں سے چند سکے ضرور نکلے۔

پیسے تلاش کرتے ہوئے اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ بابا نے پیسا پیسا کر کے اس کی شادی کے لیے کچھ پیسے بچائے تھے۔ وہ خود بھی کچھ پیسے بچاتی رہی تھی۔ کئی برس سے یہ سلسلہ چل رہا تھا۔ اسے یاد آ گیا کہ اس کی جمع پونجی ایک دوپٹے میں بندھی رکھی ہے۔ اس نے جلدی جلدی کپڑوں کے نیچے سے اپنا وہ پرانا دوپٹا نکال لیا۔ اس میں بابا کی پس انداز کی ہوئی رقم، ماں کے دو تین زیور اور اس کی اپنی بچائی ہوئی رقم تھی۔ زلیخا نے زیور تو ایک کاغذ میں لپیٹ کر بیگ میں رکھ لیے اور رقم گننے لگی۔ وہ ایک، دو، پانچ اور دس روپے کے نوٹوں کی شکل میں تھی۔

اس نے رقم گنی تو خوش ہو گئی۔ وہ تقریباً بیس ہزار روپے تھے۔ بیس ہزار کی رقم اُس دور میں خاصی خطیر رقم ہوتی تھی۔ اس نے وہ نوٹ بھی سلیقے سے تہ کیے اور انہیں بھی لپیٹ کر اپنے ہینڈ بیگ میں رکھ لیا۔

عامر کا انتظار کرتے کرتے دوپہر کے ساڑھے بارہ

سارجنٹ! کاش تم شادی سے پہلے مجھ سے ملے ہوتے!

بج گئے تو زلیخا مایوس ہو گئی۔ اس کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ عامر پولیس یا فوج کے ہتھے چڑھ گیا ہے۔ یہ خیال ہی ایسا جان لیوا تھا کہ زلیخا پھر رونے لگی۔ روتے روتے اسے ایک اور دل دہلا دینے والا خیال آیا۔ اگر عامر پکڑا گیا ہوگا تو پولیس والے اس سے بھی اگلوا لیں گے کہ وہ دلّی میں کہاں ٹھہرا ہوا ہے پھر وہ کسی سراغ کی تلاش میں یہاں بھی آ جائیں گے۔ پھر عامر کے ساتھ ساتھ میں بھی پکڑی جاؤں گی۔ اس نے سنا تھا کہ پولیس والے عورتوں کے ساتھ انتہائی شرمناک سلوک کرتے ہیں۔ میں اگر پولیس سے محفوظ رہی تو شاید عامر کے لیے کچھ کر سکوں۔

زلیخا کے دل میں ایسا ہول اٹھا کہ اس نے اسی وقت وہ ہوٹل چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے ویٹر کو بلا کر بل منگوایا۔ اور کپڑوں کا بیگ اٹھا کر ہوٹل سے باہر نکل آئی۔ عامر کا بھاری سامان کم ہونے کے بعد وہ بیگ اب اتنا بھاری نہیں رہا تھا۔ زلیخا کا ہینڈ بیگ اب شانے پر لٹک رہا تھا۔

دیکھنے والوں کو زلیخا کے ہاتھ میں لٹکا ہوا بیگ بہت بھاری لگ رہا ہوگا۔ زلیخا جیسی نازک اندام نظر آنے والی دوشیزہ کے لیے وہ بیگ واقعی بھاری تھا لیکن زلیخا گاؤں میں پلی بڑھی تھی۔ گاؤں کی لڑکیاں کچھ زیادہ ہی سخت جان ہوتی ہیں۔

وہ بیگ ہاتھوں میں اٹھائے بے مقصد چلتی رہی۔ اچانک اسے خیال آیا کہ اس شہر میں ایک بہت بڑے

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

بزرگ نظام الدین اولیا کا مزار بھی ہے۔ اس کے گاؤں کے اکثر لوگ مزار پر حاضری دینے آتے تھے۔ وہی لوگ بتاتے تھے کہ مزار پر ہر وقت لنگر تقسیم ہوتا ہے۔ لوگ مہینوں وہاں رہتے ہیں لیکن کوئی اعتراض نہیں کرتا۔ زلیخا نے فوری طور پر وہیں جانے کا فیصلہ کر کے ایک سائیکل رکشا والے کو روک لیا اور اس سے مزار کی طرف چلنے کو کہا۔

''ایک روپیا لوں گا بیگم صاحبہ۔'' رکشے والے نے کہا۔

''بیگم صاحبہ۔'' زلیخا نے دل ہی دل میں سوچا۔ ان قیمتی کپڑوں، جوتوں اور شال کی وجہ سے یہ مجھے بیگم صاحبہ سمجھ رہا ہے؟

''ایک روپیا تو بہت ہے بھائی۔''

''ہم غریبوں کے لیے بہت ہے بیگم صاحبہ! آپ کے لیے تو کچھ بھی نہیں ہے۔'' رکشے والے نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔

''اچھا بھئی چلو، ایک روپیا ہی لے لینا۔'' زلیخا اس لمحے واقعی بیگم صاحبہ بن گئی۔

رکشے والا جھپٹ کر نیچے اترا اور اس نے زلیخا کا بیگ اٹھا کر رکشے میں رکھا پھر اسے بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

زلیخا مزار پر پہنچی تو اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اتنے بہت سے لوگ تو اس نے زندگی میں کبھی نہیں دیکھے تھے۔ اس نے تو کوئی فلم بھی نہیں دیکھی تھی کہ جن لوگوں کو حقیقت میں دیکھنے کا موقع نہیں ملتا، وہ فلموں میں دیکھ لیتے ہیں۔ وہ جھجکتی ہوئی مزار کے وسیع و عریض احاطے میں داخل ہوئی۔ اس وقت وہ احاطہ اسے وسیع و عریض ہی لگ رہا تھا۔

اس سے آگے کچھ خواتین چل رہی تھیں۔ وہ اپنے لباس اور چال ڈھال سے کھاتے پیتے گھرانوں کی لگ رہی تھیں۔ ان سب نے احتراماً اپنے سروں کو دوپٹوں سے ڈھانپ رکھا تھا۔ زلیخا نے تو سر پر پہلے ہی شال لے رکھی تھی۔ ایک جگہ پہنچ کر خواتین نے اپنی چپلیں اتاریں تو زلیخا نے بھی سینڈل اتار کر ہاتھ میں پکڑ لیے۔

مزار کے احاطے میں ہر مذہب اور قوم کے لوگ تھے۔ وہاں مسلمان تو تھے ہی، ہندو بھی تھے، سکھ بھی تھے اور دوسری قومیتوں کے لوگ بھی تھے۔ حد تو یہ ہے کہ اسے وہاں کچھ گورے بھی نظر آئے۔ ان کے گاؤں میں ایک دفعہ غیر ملکی مشنریز کی ایک ٹیم آئی تھی تو بابا نے اسے بتایا تھا کہ یہ لوگ انگریز ہیں اور سات سمندر پار سے آئے ہیں۔

زلیخا نے اِدھر اُدھر دیکھا، پھر جلدی سے اپنے سینڈل بیگ میں رکھ لیے۔ اس نے دوسروں کی طرح اپنے سینڈل دروازے کے پاس بیٹھے آدمی کو نہیں دیے تھے۔

وہیں ایک سایہ دار جگہ پر ایک بوڑھی عورت بیٹھی تھی۔ زلیخا بھی اسی طرف بڑھ گئی اور بوڑھی عورت کے نزدیک جا بیٹھی۔

☆☆☆

اے سی پی وکرم ریلوے اسٹیشن کے اردگرد عامر کا حلیہ بتا کر لوگوں سے پوچھ گچھ کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ حوالدار کاشی رام بھی تھا۔

''کاشی رام!'' وکرم نے کچھ سوچ کر اس سے کہا۔ ''انسپکٹر راٹھور نے اس آدمی کا نام ارجن پال بتایا تھا۔''

''تو نام کون سا اصلی ہوگا صاحب؟'' کاشی رام نے کہا۔

''انسپکٹر راٹھور نے کہا تھا کہ اس کے ہاتھ میں تھرماس تھا۔ اور اس نے دودھ خریدا تھا۔ وہ لمبا چوڑا اور گورا چٹا آدمی تھا، سر کے بال براؤن تھے۔ چہرے پہ گھنی مونچھیں تھیں۔ آؤ پہلے اس دودھ والے سے معلوم کرتے ہیں۔ اسے یاد ہوگا کہ کل کسی گاہک نے اس سے آٹھ آنے کا دودھ خریدا تھا۔''

وہ دونوں دودھ والے کے پاس پہنچے تو وہ حسبِ معمول بڑے بڑے پیالوں میں دودھ انڈیلنے میں مصروف تھا۔ جب وہ ذرا فارغ ہوا تو وکرم نے پوچھا۔ ''مجھے تم سے کچھ پوچھنا ہے۔''

''رش کا ٹیم ہے بابو۔'' دودھ والے نے سرد لہجے میں کہا۔ ''کچھ ٹھہر کے پوچھ لینا۔ ہمارا دودھ بالکل خالص ہوتا ہے۔ یہی پوچھو گے نا کہ ہم اس میں پانی کتنا ملاتے ہیں اور......''

''بک بک نہ کرو۔'' حوالدار نے ڈپٹ کر کہا۔ ''یہ اے سی پی وکرم ہیں، تمیز سے بات کرو۔''

''ا...... سی...... پی...... وک......رم۔'' دودھ والا بوکھلا کر بولا۔ ''پوچھیں سرکار کیا پوچھنا ہے؟''

''کل ایک گاہک نے تھرماس میں تم سے دودھ لیا تھا۔ تمہیں اس کا حلیہ یاد ہے؟''

''یہ تو اسٹیشن ہے مائی باپ۔'' دودھ والا جلدی سے بولا۔ ''یہاں روزانہ بیسیوں آدمی تھرماس میں دودھ لے کر جاتے ہیں...... میں......''

''اس آدمی نے تم سے کہا تھا کہ آٹھ آنے کا دودھ

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

www.paksociety.com

دے دو۔“

”آٹھ آنے۔“ دودھ والا ذہن پر زور ڈال کر بولا۔

”آٹھ آنے...... ہاں، مجھے یاد آ گیا۔ اس نے آٹھ آنے کا دودھ مانگا تھا۔ مجھے حیرت بھی ہوئی تھی وہ جوان آدمی تھا، شکل سے پڑھا لکھا بھی لگ رہا تھا۔ آٹھ آنے اور چار آنے کا دودھ تو اکثر بوڑھے لوگ مانگتے ہیں۔“

”تم بولتے بہت ہو۔“ وکرم نے اسے گھورا۔ ”اس آدمی کا حلیہ یاد ہے تمہیں؟“

”صاحب وہ گورا چٹا، آپ جتنے قد کا آدمی تھا۔ اس نے کوٹ اور پینٹ پہن رکھی تھی۔ اس کے بال اور مونچھیں بھوری تھیں۔ پہلی نظر میں تو میں اسے گورا (غیر ملکی) سمجھا تھا۔“

”اس سے کون سی ٹرین آئی تھی یا جانے والی تھی؟“

”اس سے رش بہت کم تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے صاحب، کوئی ٹرین نہیں آئی تھی۔ ہاں، راج دھانی جانے والی تھی۔“ دودھ والے نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔“ وکرم نے کہا اور حوالدار کاشی رام کے ساتھ باہر نکل آیا پھر وہ پُرخیال انداز میں حوالدار سے بولا۔ ”کاشی رام! وہ آدمی کسی ٹرین سے اترا نہیں تھا، نہ کہیں جانے والا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ یہیں کسی چھوٹے یا بڑے ہوٹل میں ٹھہرا ہوگا۔ تم اسٹیشن کے آزو باز و تمام ہوٹلوں کی لسٹ بتاؤ۔“

”لسٹ تو میں نے پہلے ہی بنالی تھی سر، صرف پانچ ہوٹل ہیں یہاں۔ تین بہت سستے ہیں اور دو اچھے ہیں۔“

”تو چلو، ان اچھے ہوٹلوں سے شروع کرتے ہیں۔“ وکرم نے کہا۔

”اس سے؟“ کاشی رام کراہا۔

”کیوں اس سے کیا ہوٹلوں میں جانا منع ہے؟“ وکرم نے درشت لہجے میں کہا اور آگے بڑھ گیا۔

کاشی رام اس کے پیچھے پیچھے یوں چل رہا تھا جیسے کوئی اسے دھکیل رہا ہو۔ وہ بہت دھیمی آواز میں بڑبڑا بھی رہا تھا۔ ”خود تو کام کرنے کا جنونی ہے، دوسروں کو بھی مشین سمجھتا ہے سالا۔ گھنٹوں سے دھکے کھا رہا ہے، مرے وہ جو کوئی بھی تھا۔ انسپکٹر راٹھور کو مارنے کے بعد کیا یہیں بیٹھا ہوگا؟“

”کیا کہہ رہے ہو کاشی رام؟“ وکرم نے درشت لہجے میں پوچھا۔

”کچھ نہیں سر، میں یہ کہہ رہا ہوں کہ ہوٹل کے رجسٹر میں اس نے نہ جانے کیا نام لکھوایا ہوگا۔“

”وہ نام بدل سکتا ہے، اپنا قد اور حلیہ تو ایک دم نہیں بدل سکتا۔“

اس وقت تک وہ دونوں اسی ہوٹل تک پہنچ گئے تھے جس میں زلیخا اور عامر ٹھہرے ہوئے تھے۔

ہوٹل کا کلرک ارجن پال کا نام سن کر چونک اٹھا اور بولا۔ ”جی اے سی پی صاحب! یہاں اس نام کے ایک صاحب اپنی وائف کے ساتھ ٹھہرے تھے۔“

”وائف کے ساتھ؟“ وکرم چونک اٹھا۔ ”ذرا ان صاحب کا حلیہ بتاؤ۔“

کاؤنٹر کلرک نے بھی وہی حلیہ دہرا دیا جو انسپکٹر راٹھور اور دودھ والا بتا چکے تھے۔

”وہ کس روم میں ہیں؟“ وکرم کا دل خوشی سے بلیوں اچھل رہا تھا۔ وہ ایک مشکوک آدمی اور انسپکٹر راٹھور کے قاتل تک پہنچ گیا تھا۔

”وہ تو سر، اب یہاں سے جا چکے ہیں۔ ارجن پال صاحب تو کل شام چلے گئے تھے۔ ان کی وائف نے آج دوپہر ہوٹل چھوڑا ہے۔“

”شٹ۔“ وکرم کا سارا جوش اور ولولہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ سب انسپکٹر شمشیر اسے بتا چکا تھا کہ میں نے اس آدمی کو اپنی آنکھوں سے راج دھانی ایکسپریس میں چڑھتے دیکھا تھا لیکن وکرم کا خیال تھا کہ سب انسپکٹر شمشیر کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ اگر وہ ٹرین میں چڑھا ہوتا تو ہاپڑ پر پکڑا جاتا یا پھر ٹرین میں پکڑا جاتا۔ ہاپڑ سے ایک پولیس پارٹی ٹرین میں بھی سوار ہوئی تھی۔

”ارجن پال کی وائف کا حلیہ بتاؤ۔“

”سر، وہ بہت سندر تھی، اس کا رنگ سرخ و سفید تھا، اس کے سیاہ کالے بال اتنے لمبے تھے کہ اس کی کمر سے بھی نیچے آتے تھے، بڑی بڑی آنکھیں تھیں اور اس کی چال بہت خوب صورت تھی۔ وہ......“

”بس!“ وکرم نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”مجھے وہ کمرا دکھاؤ جس میں وہ دونوں ٹھہرے تھے۔ اس کمرے کی صفائی جس نے کی تھی، اسے بھی بلوالو۔“

”سر، ابھی تک اس کمرے کی صفائی نہیں ہوئی ہے۔ صفائی کرنے والا راجو بیمار ہے اور چھٹی پر ہے۔“

وکرم کمرے میں پہنچا تو اسے وہاں کوئی ایسی چیز نہیں ملی جس سے کوئی سراغ ملتا۔

”کاشی رام!“ اس نے حوالدار سے کہا۔ ”ذرا بیڈ کے نیچے جھانک کر دیکھ لو۔“

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 | f PAKSOCIETY

www.paksociety.com

بیڈ کے نیچے جھانکنے کے لیے حوالدار کو فرش پر لیٹنا پڑا۔ اسے بیڈ کے نیچے پیچھے کی طرف کوئی کپڑا دکھائی دیا۔ اس نے جیب سے ٹارچ نکال کر اس کی روشنی میں دیکھا۔ وہاں واقعی کوئی کپڑا پڑا تھا۔ وہ کپڑا نکالنے کے لیے اسے بیڈ کے نیچے گھسنا پڑا۔

وہ ایک اونی مفلر تھا۔ شاید عامر کے بیگ سے گر گیا ہو گا۔ مفلر دیکھتے ہی وکرم کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ وہ گہرے سبز رنگ کا مفلر تھا۔ اسے دیکھتے ہی وکرم کو اندازہ ہو گیا کہ یہ کسی پاکستانی فوجی کا ہے۔ پاکستانی فوجیوں کی اونی بنیان، ٹراؤزر وغیرہ اسی رنگ کے ہوتے ہیں۔

''اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کوئی پاکستانی فوجی تھا۔'' وکرم زیرِلب بڑبڑایا۔

☆☆☆

ابرار نے عامر کو مکان کے اوپر والے کمرے میں ٹھہرایا۔ عامر کے لیے وہ گھر بہترین پناہ گاہ تھا، وہ لوگ مسلمان تھے اور بات چیت میں ہندی کے بجائے اردو کے الفاظ استعمال کرتے تھے اس لیے عامر کو یہ خدشہ بھی نہیں تھا کہ اسے زبان کی وجہ سے شناخت کر لیا جائے گا۔ امروہہ میں پڑھے لکھے مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ وہاں ہر گھر میں عام طور پر اردو بولی جاتی تھی۔

ابرار نے اسے صبح سویرے اٹھایا۔ باتھ روم میں اس کے لیے گرم پانی کی بالٹی ایک دھلا دھلایا تولیا موجود تھا۔ غسل سے فارغ ہو کر ابرار کے ساتھ اس نے پُرتکلف ناشتا کیا اور روانگی کو تیار ہو گیا۔ ابرار نے اس سے دلّی کا پتا پوچھا تو اس نے ابرار کو ترول باغ کا ایک فرضی پتا لکھوا دیا کیونکہ اس نے دلّی کے حوالے سے صرف ترول باغ کا نام سنا تھا۔ ابرار نے اس سے وعدہ کیا کہ جب بھی دلّی آنا ہوا، ....آپ سے ملنے ضرور آؤں گا۔

عامر کو افسوس بھی ہو رہا تھا کہ وہ اتنے پُرخلوص انسان کو دھوکا دے رہا ہے لیکن عامر بھی مجبور تھا۔

وہاں سے نکل کر وہ کچھ دور پیدل چلتا رہا پھر ایک باغ میں بیٹھ گیا۔ اس نے باتوں باتوں میں ابرار سے معلوم کر لیا تھا کہ راج دھانی ایکسپریس بارہ بجے جاتی ہے۔ اس حساب سے وہ تین، ساڑھے تین بجے تک دلّی پہنچ جاتا۔ اسے زلیخا کی فکر تھی کہ وہ نہ جانے کیا سوچ رہی ہو گی کتنا گھبرا رہی ہو گی۔ وہ تو زندگی میں پہلی دفعہ اپنے گھر سے نکلی تھی۔

دس بجے وہ اس باغ سے اٹھا اور پیدل ہی اسٹیشن کی طرف چل دیا۔ اسٹیشن وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اسے ٹرین کا ٹکٹ بھی مل گیا اور بیٹھنے کی جگہ بھی مل گئی۔ اس کا اندازہ غلط تھا۔ راج دھانی مشکل سے دو گھنٹے میں امروہہ سے دلّی پہنچ جاتی تھی۔ امروہہ اور اردگرد سے بے شمار لوگ ملازمت کے سلسلے میں صبح دلّی جاتے تھے اور شام کو لوٹ آتے تھے۔

وہ دلی کے اسٹیشن پر اترا تو زلیخا کی طرف سے اس کے دل میں بے نام سا خوف تھا۔ نہ جانے وہ کس حال میں ہو گی اور کتنی پریشان ہو گی۔ کہیں خفیہ پولیس والوں نے پھر اسے پریشان نہ کیا ہو۔

یہی سوچتا ہوا وہ ہوٹل میں داخل ہو گیا۔ کاؤنٹر کلرک اسے دیکھ کر بری طرح چونک اٹھا۔ اس کے چہرے پر تحیّر کے آثار دیکھ کر عامر بھی تشویش میں مبتلا ہو گیا۔

''کیا بات ہے، تم مجھے اتنی حیرت سے کیوں دیکھ رہے ہو؟''

''سر، آپ کی وائف یہاں سے جا چکی ہیں اور آپ بھی خطرے میں ہیں۔ یہاں سے فوراً نکل جائیں۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' عامر الجھ کر بولا۔

''آپ یہاں سے باہر نکلیں، میں ابھی آتا ہوں اور آپ کو سب کچھ بتاتا ہوں، جلدی کریں، ابھی کسی نے آپ کو دیکھا نہیں ہے۔''

عامر الجھ کر رہ گیا لیکن کلرک کی بوکھلاہٹ سے سمجھ گیا کہ معاملہ کچھ گڑبڑ ہے۔ وہ ہوٹل سے باہر نکلا تو چند منٹ بعد کاؤنٹر کلرک بھی باہر نکل آیا اور بولا۔ ''میرے پیچھے پیچھے چلے آئیں۔''

کاؤنٹر کلرک اسے ایک ویران گوشے میں لے گیا اور اس کے باوجود وہ گھبرائے ہوئے انداز میں اردگرد دیکھ رہا تھا۔

''آپ کے جانے کے بعد کل آپ کی وائف بھی یہاں سے چلی گئی تھیں۔ کل رات کو پولیس کا ایک اے سی پی بھی آیا تھا۔ اس نے آپ کے کمرے کی تلاشی بھی لی تھی۔'' کلرک نے اسے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ ''آپ فوراً اس شہر سے نکل جائیں، آپ کی جان خطرے میں ہے۔''

''لیکن تم مجھے یہ سب کیوں بتا رہے ہو؟''

''اس لیے سر کہ میں بھی مسلمان ہوں۔ میری ہمدردیاں پاکستان کے ساتھ ہیں۔''

عامر اس سے بغل گیر ہو گیا اور بولا۔ ''میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔''

''بس آپ یہاں سے نکل جائیں۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

''میری وائف......''

''آپ کی وائف کچھ بتا کر نہیں گئیں کہ وہ کہاں جا رہی ہیں۔'' کاؤنٹر کلرک نے کہا۔

عامر نے اپنی اونی ٹوپی کو اچھی طرح کانوں تک کھینچ لیا اور تیزی سے نکل گیا۔ اب وہ پہلی فرصت میں اپنا حلیہ بدلنا چاہتا تھا۔ اس کے براؤن بال اور مونچھیں اس کی شناخت بن کر رہ گئی تھیں۔ وہ کوٹ پینٹ کے بجائے اب کرتہ پاجامہ پہننا چاہتا تھا۔

اس کے پاس ابھی اچھے خاصے پیسے تھے۔ وہ کپڑے خریدنے کے لیے بازار کی طرف نکل گیا۔

وہ ایک بڑی دکان میں داخل ہو ہی رہا تھا کہ ایک جیپ نے اس کے پیچھے زوردار بریک لگائے۔ وہ اے سی پی وکرم تھا۔ اس نے وہاں سے گزرتے ہوئے عامر کو دیکھ لیا تھا اور اس کی مونچھوں اور قدوقامت کی وجہ سے شبہے میں پڑ گیا تھا۔

عامر دکان میں داخل ہوتے ہوتے رک گیا۔ اس کے نزدیک ہی ایک ٹھیلے والا کھڑا تھا جو امرود بیچ رہا تھا۔

وکرم چیخ کر بولا۔ ''کوئی حرکت مت کرنا۔ اپنے ہاتھ اوپر اٹھا دو۔'' وکرم نے پلک جھپکتے اپنا سروس ریوالور نکال لیا تھا۔ ''اب اسی طرح ہاتھ اٹھائے اٹھائے میری طرف آجاؤ۔'' وکرم چیخ کر بولا۔

وہ بارونق اور بھرا پُرا بازار تھا۔ وہ منظر دیکھ کر وہاں لوگ اکٹھے ہونے لگے۔

''آپ سب لوگ یہاں سے جائیں۔'' وکرم دہاڑا۔

لوگوں کو ہٹانے میں وکرم کا دھیان لمحے بھر کو عامر کی طرف سے ہٹا تھا۔ عامر نے اچانک امرود والے کا آدھا کلو کا باٹ اٹھایا اور وکرم کو دے مارا۔ باٹ وکرم کے سر پر لگا۔ ضرب اتنی شدید تھی کہ وکرم تیورا کر زمین پر گر پڑا۔ عامر ایک جست میں وہاں پہنچا اور اس کا سروس ریوالور اٹھا لیا۔ پھر اس نے لوگوں کو منتشر کرنے کے لیے دو ہوائی فائر کیے...... لوگ ایک دوسرے پر گرتے پڑتے وہاں سے بھاگے۔ عامر بھی بھاگتا ہوا وہاں سے نکل گیا۔

وہ باہر نکلا تو ایک شخص اپنی گاڑی پارک کرنے کے لیے جگہ تلاش کر رہا تھا۔ عامر نے جھپٹ کر گاڑی کا دروازہ کھولا اور اس میں بیٹھ کر درشت لہجے میں بولا۔ ''گاڑی نکالو یہاں سے، جلدی کرو۔'' اس کے لہجے میں وحشت تھی۔

گاڑی والا بوکھلا گیا اور اس نے گاڑی وہاں سے نکال لی۔ وہ مین روڈ پر پہنچا تو عامر ڈپٹ کر بولا۔ ''سیدھے چلتے رہو۔''

''آ...... آپ جائیں گے کہاں؟''

''خاموشی سے گاڑی چلاؤ۔'' عامر غرایا۔

ایک ویران سڑک پر پہنچ کر عامر نے گاڑی رکوائی اور گاڑی والے سے کہا۔ ''اب تم اتر جاؤ۔''

''مم...... میں...... اور...... یہ گاڑی......''

''اترو۔'' عامر دہاڑ کر بولا۔ ''میرے پاس وقت بالکل نہیں ہے۔''

وہ گھبرا کر فوراً ہی گاڑی سے اتر گیا۔

عامر نے اسٹیئرنگ سیٹ سنبھالی اور گاڑی گولی کی طرح وہاں سے روانہ ہوگئی۔ وہ فوری طور پر اس گاڑی میں فرار تو ہوگیا تھا لیکن یہ گاڑی بھی اس کے لیے خطرہ تھی۔ گاڑی کے مالک نے وہاں سے اترتے ہی پولیس اسٹیشن کا رخ کیا ہوگا اور پولیس اس گاڑی کی تلاش میں نکل پڑے گی۔

درختوں کا جھنڈ دیکھ کر اس نے گاڑی سڑک سے اتار کر وہاں روک دی۔ اسے گاڑی کی عقبی سیٹ پر ایک چھوٹا سا بریف کیس نظر آیا۔ اس نے بریف کیس اٹھا کر دیکھا۔ وہ لاک نہیں تھا۔ اس میں کاغذات کے ساتھ کرنسی نوٹ بھی تھے۔ عامر کے اندازے کے مطابق وہ پانچ ہزار روپے ہوں گے۔ اس کے علاوہ گاڑی میں کوئی کام کی چیز نہیں تھی۔ اس نے کرنسی نوٹ جیب میں رکھے اور واپسی کے لیے مڑا۔

وہ مین روڈ پر پہنچا تو اسے پولیس کی ایک جیپ تیز رفتاری سے اسی سمت جاتی دکھائی دی جس طرف اس نے گاڑی چھوڑی تھی۔ وہ پھر درختوں کے جھنڈ میں چلا گیا اور پیدل ہی چلتا رہا۔ کافی دیر چلنے کے بعد وہ پھر مین روڈ پر آیا۔ وہاں خاصی رونق تھی۔ وہاں سائیکل رکشا اور تانگے والے کھڑے تھے۔ نزدیک ہی شاید بس کا کوئی اڈا تھا۔ ایک تانگے والا آواز لگا رہا تھا۔ ''نظام بستی...... نظام بستی۔''

عامر کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ اگر وہ نظام بستی پہنچ کر نظام الدینؒ کے مزار پر چلا جاتا تو وہاں پولیس سے محفوظ رہ سکتا تھا۔ وہ تانگے میں بیٹھ گیا۔ تانگے والا اس کے باوجود کھڑا نظام بستی کی آواز لگاتا رہا۔ عامر سمجھ گیا کہ وہ فی سواری کے حساب سے پیسے لے گا۔ تھوڑی دیر میں ایک بس سے اتر کر کچھ لوگ مزید وہاں آگئے اور تانگے کی آوازیں سن کر اس میں سوار ہوگئے۔ وہ لوگ اپنے لباس اور چہروں سے

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

مسلمان لگ رہے تھے۔
ان میں سے ایک صاحب بولے۔ ”صاحب بہت دلیر آدمی ہے۔ وہ جو جنگ کے زمانے میں بھارت کی راج دھانی میں گھس گیا۔“
ان کی باتیں سن کر عامر کے کان کھڑے ہوگئے۔
”ہاں، یار مسلمان تو ہوتے ہی جی دار ہیں۔“ دوسرا آدمی بولا۔ ”اب تک وہ پولیس کے دو بہترین انسپکٹروں کو مار چکا ہے اور پولیس کے ہاتھ نہیں آیا۔“
”دو انسپکٹر؟“ عامر نے سوچا۔ ”تو کیا وہ انسپکٹر بھی مر گیا ہے جسے میں نے آدھا کلو کا باٹ پھینک کر زخمی کیا تھا؟“
”پولیس کتوں کی طرح اس کی بو سونگھتی پھر رہی ہے۔ اللہ اسے محفوظ رکھے۔“ ایک بزرگ نے کہا۔
عامر کا دل بھر آیا۔ یہاں کے مسلمان آج بھی پاکستان اور پاکستانیوں سے محبت کرتے ہیں (اب صورتِ حال اس کے بالکل برعکس ہے)
نظام بستی پہنچ کر عامر کو عجیب سکون کا احساس ہوا۔ مزار کے باہر پورا ایک بازار موجود تھا۔ ان میں زیادہ دکانیں پھول والوں کی، نان بائیوں کی اور مزار پر چڑھانے کے لیے چادریں بیچنے والوں کی تھیں۔ ان سے آگے روزمرہ کے استعمال کی چیزوں کی دکانیں اور کریانہ اسٹور تھے۔ وہیں عامر کو ایک باربر شاپ نظر آئی۔ حجام اس وقت فارغ بیٹھا تھا۔ عامر نے وہاں بیٹھ کر اپنے خوب صورت بال بالکل چھوٹے کرالیے اور مونچھوں پر بھی مشین پھروادی۔ نائی نے شیو بنانے کو کہا لیکن عامر نے انکار کردیا اور بولا ”اتنے بڑے بزرگ کے دربار میں جارہا ہوں وہاں داڑھی منڈا کر جاؤں؟“
”بالکل نہیں۔“ نائی نے عقیدت بھرے لہجے میں کہا۔
”ایک دکان پر شالیں اور کھیس وغیرہ بک رہے تھے۔ عامر نے وہاں سے ایک بڑا سا کھیس خرید لیا۔ سردی کی وجہ سے بہت سے لوگ کھیس لپیٹے ہوئے تھے۔ عامر نے بھی اپنے جسم کے گرد کھیس لپیٹ لیا اور مزار کی طرف روانہ ہو گیا۔ بال اور مونچھیں کٹنے سے اس کے حلیے میں اچھی خاصی تبدیلی آگئی تھی۔ وہ جوتے اتار کر مزار کے احاطے میں داخل ہوگیا۔

☆☆☆

”تم کون ہو بیٹی اور کہاں سے آئی ہو؟“ بوڑھی عورت نے زلیخا سے پوچھا۔ وہ دو دن سے ان ہی بڑی بی کے ساتھ تھی اور ان سے خاصی مانوس ہوگئی تھی۔
”میرا اس دنیا میں کوئی نہیں، کوئی ٹھکانا بھی نہیں ہے۔“ زلیخا بری طرح رونے لگی۔
”تمہارا شوہر کیا......“
”نہیں میرے شوہر زندہ ہیں لیکن نہ جانے کہاں چلے گئے ہیں۔“
”میں مراد آباد میں رہتی ہوں۔ میرا ایک بیٹا تھا وہ بھی اب نہیں رہا۔ تم میرے ساتھ چلو، کب تک یہاں پڑی رہوگی؟“
بڑی بی کے اصرار پر زلیخا ان کے ساتھ جانے کو روانہ ہوگئی۔ اس وقت اسے زور سے ابکائی آئی اور وہ ایک طرف دوڑی۔ زلیخا واپس آئی تو بڑی بی مسکرا کر بولیں۔
”ماشاء اللہ تم تو ماں بننے والی ہو۔ اللہ مبارک کرے۔ حضرت صاحب سے اپنے لیے اور اپنے ہونے والے بچے کے لیے دعا مانگو اور ان سے رخصت لے کر میرے ساتھ چلو۔“
زلیخا بڑی بی کے ساتھ مزار کے احاطے سے باہر نکل رہی تھی کہ عامر اندر داخل ہورہا تھا۔ زلیخا نے شال سر اور چہرے پر لپیٹ رکھی تھی، عامر نے بھی کھیس کا بُکل مار رکھا تھا اس لیے دونوں ایک دوسرے کو دیکھے بغیر وہاں سے گزر گئے۔

☆☆☆

عامر تین مہینے تک اس مزار کے احاطے میں رہا۔ اس کی شیو بڑھ کر اب داڑھی کی شکل اختیار کرچکی تھی۔ اس نے مزار کے باہر ایک درزی سے اپنے لیے کُرتے پاجامے لیے تھے کہ وہاں ریڈی میڈ کپڑے نہیں ملتے تھے، کم سے کم کُرتے اور پاجامے تو بالکل نہیں ملتے تھے۔
ایک دن عامر نے شیشے میں اپنی شکل دیکھی تو خود کو پہچان نہ سکا۔ گھنی خوب صورت داڑھی اور مونچھوں نے اس کا حلیہ ہی بدل دیا تھا۔ اس نے وہاں سے نکلنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس نے اپنے سامان کی گٹھڑی سمیٹی اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔
لاری اڈے سے اسے امرتسر کی بس مل گئی۔ وہ امرتسر سے بارڈر کراس کرنا چاہتا تھا۔ بس میں زیادہ تعداد سکھ مسافروں کی تھی۔ ان کی داڑھیاں اور پگڑیاں دیکھ کر عامر کو اچانک خیال آیا کہ مجھے بھی سکھ کا روپ دھار لینا چاہیے۔ سکھ عموماً پنجابی بولتے ہیں اور عامر کی تو مادری زبان ہی پنجابی تھی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

امرتسر میں ایک دکان سے اس نے اپنے لیے پگڑی خریدی، پگڑی باندھنے میں اسے کچھ دشواری ہوئی لیکن اب وہ حلیے سے بالکل سکھ نظر آتا تھا۔

اس نے امرتسر کے ایک نچلے درجے کے ہوٹل میں قیام کیا۔ اسے اندازہ تھا کہ کہاں سے بارڈر کراس کرنا ہے۔ یوں تو کئی سردار جی بھی بارڈر کراس کرانے کا کام کرتے تھے لیکن وہ کوئی رسک نہیں لینا چاہتا تھا۔ وہ دو دن تک اس علاقے کا جائزہ لیتا رہا، پھر تیسرے دن اس نے ایک جگہ سے بارڈر کراس کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

انسپکٹر وکرم کا ریوالور اور شکاری چاقو اس کے پاس تھا۔ بارڈر کے کنارے خاردار تاروں کی باڑھ لگی ہوئی تھی۔ باڑ عبور کرنا عامر کے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھا لیکن باڑ میں جگہ جگہ ٹین کے چھوٹے چھوٹے گول ڈبے لگے ہوئے تھے۔ خاردار تار کہیں سے بھی ہلتا تھا تو اس میں لگے ہوئے ڈبے دور تک کھڑکتے تھے۔ اس دور میں یہی طریقہ تھا۔ اب تو ٹیکنالوجی بہت آگے نکل گئی ہے۔

عامر اپنے ساتھ تار کاٹنے کے لیے کٹر بھی لایا تھا لیکن پھر اس نے تار کاٹنے کا ارادہ ملتوی کردیا۔ کٹا ہوا تار دیکھ کر سنتری کو فوراً معلوم ہوجاتا کہ کسی نے اس جگہ سے خاردار تار عبور کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس نے تار ہٹا کر باڑ عبور کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ ڈبے کھڑکتے تو سنتری چوکنا ہوکر ادھر اُدھر دوڑتے، اس وقت تک عامر درختوں کے جھنڈ میں روپوش ہوجاتا۔

بارڈر کی طرف جانے والے راستے پر بھی بی ایس ایف کی چوکی تھی۔ عامر اندھیرے میں اس چوکی سے کافی فاصلے پر چلا گیا۔ باڑ کے باہر بھی بی ایس ایف کے جوان گشت پر تھے۔

عامر درختوں کے ایک جھنڈ میں بیٹھا، ان کی نقل و حرکت نوٹ کرتا رہا۔ اس طرف دو جوان تھے اور وہ دونوں گشت کرتے ہوئے ایک دوسرے کے نزدیک آتے پھر آگے نکل جاتے۔ وہ دونوں پانچ منٹ بعد پھر واپس آتے تھے۔ انہیں وہاں سے دور جانے میں بھی دو منٹ لگتے تھے۔ گویا عامر کے پاس صرف تین منٹ تھے۔

آدھے گھنٹے تک ان کا مشاہدہ کرنے کے بعد عامر باڑ کی طرف جانے کو تیار ہوگیا۔ وہ دونوں ذہنی آپس میں مل کر پلٹے، عامر کانٹوں اور خراشوں کی پروا کیے بغیر تیزی سے محتاط انداز میں آگے بڑھتا رہا۔ اس کے ایک ہاتھ میں ریوالور تھا اور جیب میں چاقو تھا۔ اس نے ایک مرحلہ سر کرلیا تھا۔ اس میں وہ پسینے پسینے ہوگیا تھا۔

اپریل شروع ہو چکا تھا اس لیے اب وہاں خاصی گرمی تھی۔ وہ خودرو جھاڑیوں کے ایک جھنڈ میں دبکا ہوا اپنا سانس درست کرتا رہا۔ پھر وہ بہت محتاط انداز میں خاردار تار کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ سنتری کہاں ہے؟

جلد ہی اسے سنتری نظر آگیا۔ وہ ایک فولڈنگ کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوگا کہ کوئی خاردار تاروں کی بیرونی چوکی پار کرنے کی جرأت بھی کرسکتا ہے۔ عامر مزید آگے بڑھا۔ دوسرا سنتری اس سے تقریباً آدھا کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔

اس آدھے کلومیٹر کے درمیان اسے باڑ عبور کرنا تھی اور سنتریوں سے بچنا تھا۔ یہ مرحلہ خاصا کٹھن تھا لیکن اب عامر پیچھے نہیں ہٹ سکتا تھا۔ باڑ اور زمین کے درمیان تقریباً دس بارہ انچ کا فاصلہ تھا۔

ایک مناسب جگہ دیکھ کر عامر نے اپنا چاقو نکالا اور بہت احتیاط سے زمین کھودنے لگا۔ وہ اتنا راستہ بنانا چاہتا تھا کہ اس کے نیچے سے گزر سکے۔

تھوڑی دیر میں وہ پسینے پسینے ہوگیا۔ چاقو سے تو یہ کام صبح تک نہیں ہوسکتا تھا۔ اس نے اردگرد دیکھ کر ایک جھاڑی کی مضبوط لکڑی کاٹ لی اور اسے بہت احتیاط سے جیک کی طرح باڑ اور زمین کے درمیان لگا دیا۔

تار ہلنے سے ڈبے کھڑکے تو عامر جھپٹ کر پیچھے کی طرف خودرو گھنی جھاڑیوں میں گر گیا۔

فوراً ہی اسے بھاگتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ پھر اسے وہاں سنتری دکھائی دیے۔ انہیں بھی کھدی ہوئی زمین اور اس کے نیچے لگی ہوئی لکڑی دکھائی دے گئی۔

”یار رنبیر لگتا ہے اس طرف سے کوئی اندر گیا ہے۔“

”ہوسکتا ہے ابھی اندر نہ گیا ہو۔“ رنبیر بولا۔

”آ کر اس طرف دیکھ پہلے۔“ سنتری نے کہا۔ ”میں اندر کی طرف دیکھتا ہوں۔“

رنبیر اسی جگہ سے رینگ کر باڑ کے باہر آگیا۔ عامر کا اندازہ درست تھا۔ وہاں اتنی گنجائش پیدا ہوچکی تھی کہ ایک آدمی پیٹ کے بل رینگ کر وہاں سے گزر سکتا تھا۔ رنبیر اسے اردگرد تلاش کرتا رہا پھر اس نے طاقتور ٹارچ روشن کرلی اور دور دور تک دیکھتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔

وہ عامر کے قریب پہنچ کر پلٹا تو عامر نے چیتے کی طرح اس پر جست لگائی اور ایک ہی وار میں اس کی گردن

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

توڑ دی۔ اسے آواز نکالنے تک کا موقع نہیں ملا۔ عامر نے ٹارچ آف کی اور رنبیر کو کھینچ کر جھاڑیوں میں لے آیا۔ اچانک اس کے ذہن میں ایک نیا آئیڈیا آ گیا۔ اس نے بہت تیزی سے رنبیر کی رائفل اٹھائی اور اسی جگہ سے خاردار تار عبور کرلیے۔

اس وقت تک دوسرا سنتری بھی واپس آچکا تھا۔ اس نے پوچھا رنبیر کچھ نظر آیا؟''

''ہوں......نہیں......'' عامر نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

لوٹنے والا اس کے بالکل نزدیک آ گیا تو عامر جھپٹ کر مڑا اور اس کی گردن دبوچ لی پھر اس کی ٹھوڑی پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا۔ چٹاخ کی آواز آئی اور سنتری اس کے ہاتھوں میں جھول گیا۔ عامر نے اس کی بھی گردن توڑ دی تھی۔ اسے جھاڑیوں میں ڈال کر وہ تیزی سے آگے بڑھا۔ اسے ان دشوار گزار راستوں پر ابھی بہت دیر تک چلنا تھا۔ پاکستان سرحد وہاں سے کئی میل کے فاصلے پر تھی۔

عامر بہت تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ ان لوگوں کو جلد ہی معلوم ہو جائے گا کہ کسی نے باڑ عبور کی ہے اور دو سنتریوں کو ہلاک کیا ہے تو وہ اس کا پیچھا کرتے۔ کسی بھی موقع پر اسے بھارتی یا پاکستانی رینجرز میں سے کوئی بھی نشانہ بنا سکتا تھا۔

افق پر صبح کاذب کے آثار نمودار ہوئے تو اسے دور پاکستانی سرحد نظر آئی۔ اس کے گرد بھی خاردار باڑ لگی تھی۔ درختوں کے ایک جھنڈ میں عامر نے کپڑے بدلے اور تیزی سے اپنی سرحد کی طرف بڑھا۔

ایک گھنٹے بعد اسے پاکستانی رینجرز نے گرفتار کر لیا اور مزید پوچھ گچھ کے لیے اپنے ہیڈ کوارٹر لے گئے۔

☆☆☆

''امی، میں نے پاسپورٹ بنوا لیے ہیں۔'' اسد نے کہا۔ ''اب میں ویزے کے لیے اپلائی کردوں گا۔''

''پھر ہم پاکستان چلیں گے۔'' زلیخا نے خلاؤں میں تکتے ہوئے کہا۔

''لیکن امی آپ کے پاس ابو کا ایڈریس تو ہے ہی نہیں۔ ہم انہیں ڈھونڈیں گے کیسے؟''

''میرے پاس ان کا پتا ہے بیٹا! بچہ بچہ جانتا ہوگا۔ جی ایچ کیو راولپنڈی۔'' زلیخا مسکرائی۔ ''اس وقت وہ لیفٹیننٹ تھے۔ اب اللہ نے انہیں اور ترقی دی ہوگی۔''

زلیخا بیس سال سے بڑی بی کے ساتھ مراد آباد میں رہ رہی تھی۔ تین سال پہلے بڑی بی کا بھی انتقال ہو چکا تھا۔ ان کے آگے پیچھے کوئی نہیں تھا۔ صرف ایک بھائی تھے جو پاکستان میں رہتے تھے۔ وہ ایک دفعہ بڑی بی سے ملنے بھی آئے تھے تو زلیخا سے بھی ملاقات ہوئی تھی۔ وہ کراچی میں رہتے تھے۔

یہیں زلیخا نے عامر کے بیٹے کو جنم دیا تھا۔ اسد ہو بہو عامر کی تصویر تھا۔ وہی سرخ و سفید رنگت، وہی دراز قد اور مضبوط ہاتھ پاؤں، وہی براؤن بال اور براؤن آنکھیں اور عامر کی طرح گھنی مونچھیں۔ زلیخا اکثر اسے ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہتی تھی۔ اسے ایسا لگتا تھا جیسے اس کے سامنے عامر چل پھر رہا ہوں۔ اس کا بات کرنے کا انداز بھی وہی تھا۔ وہ بی ایس سی کر چکا تھا اور ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب کر رہا تھا کہ زلیخا کو پاکستان جانے کی دھن سوار ہوئی۔ اسد نے اسے بہت سمجھایا کہ ابو کا ایڈریس نہیں ملے گا لیکن زلیخا بضد رہی۔

بڑی بی کے بھائی مظفر ابھی حیات تھے لیکن بہت بیمار تھے۔ زلیخا نے ویزے میں ان ہی کا حوالہ دیا تھا۔ اس نے مظفر صاحب کو بھی خط کے ذریعے اپنی آمد کی اطلاع دے دی تھی۔ وہ انہیں مظفر ماموں کہتی تھی۔

آخر ان دونوں کو پاکستان کا ویزا مل گیا۔ اسد نے اپنے آفس سے چھٹی لے لی تھی۔

تیسرے دن روانگی تھی۔ زلیخا بہت خوش تھی۔ اس کے حسن میں کوئی کمی نہیں آئی تھی بلکہ وہ اب باوقار بھی ہو گئی تھی۔

وہ کراچی پہنچے تو مظفر ماموں بہت بیمار تھے۔ اس نے جیسے تیسے دو دن کراچی میں گزارے، پھر اس نے اسد کے ساتھ راولپنڈی کا رخ کیا۔ مظفر ماموں کے ایک خالہ زاد اکبر راولپنڈی میں رہتے تھے۔ اکبر ماموں وہاں بزنس کرتے تھے۔

راولپنڈی پہنچتے ہی زلیخا اسد کے پیچھے پڑ گئی کہ جی ایچ کیو چلو۔

''امی، ایسے ہر کوئی منہ اٹھا کر جی ایچ کیو نہیں جا سکتا۔''

''کیوں نہیں جا سکتا، مجھے لے کے چلو۔'' زلیخا نے کہا۔

''اچھا پہلے میں معلوم کر کے آتا ہوں، پھر آپ کو بھی لے جاؤں گا۔'' اسد نے کہا اور وہ جی ایچ کیو کے لیے روانہ ہو گیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

''تم یقیناً یہ جاننا چاہ رہے ہو گے کہ ریس میں حصہ لینے والے باقی گھوڑے کس طرف گئے......وہ اس طرف گئے ہیں......''

جب شام تک اسد گھر نہ لوٹا تو زلیخا کو شدید پریشانی ہوئی۔ اس نے اکبر ماموں کو بتایا کہ اسد جی ایچ کیو کی طرف گیا تھا۔ اپنے کسی دوست سے ملنے۔ وہ ابھی تک واپس نہیں آیا۔

''جی ایچ کیو گیا تھا؟'' اکبر ماموں نے حیرت سے کہا۔ ''وہاں اس کا کون دوست پیدا ہو گیا؟ میں جا کر معلوم کرتا ہوں۔''

ایک گھنٹے بعد اکبر ماموں یہ روح فرسا خبر لائے کہ اسد کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ وہ کہاں ہے؟ اس کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں ہے۔

زلیخا سکتے میں رہ گئی۔ اسے امید نہیں تھی کہ پاکستان میں اس کے ساتھ یہ سلوک ہو گا۔ وہ تو بڑے ارمانوں سے پاکستان آئی تھی۔ اپنے شوہر، اپنے محبوب سے ملنے۔

دوسرے دن وہ جی ایچ کیو پہنچ گئی۔ گیٹ پر اسے سنتری نے روک لیا۔ وہ اس کی خوب صورت اور باوقار شخصیت سے متاثر ہو گیا تھا۔ ''جی میڈم!'' اس نے بہت ادب سے پوچھا۔ ''کس سے ملنا ہے آپ کو؟''

''کل میرا بیٹا یہاں آیا تھا اور آپ لوگوں نے اسے گرفتار کر لیا، کس جرم میں؟''

''میڈم! اس کے بارے میں میجر ناصر آپ کو بتا سکتے ہیں۔ آپ اُن سے مل لیں۔'' اس نے میجر ناصر کے نام کی سلپ بنا کر زلیخا کو دے دی۔

زلیخا دندناتی ہوئی میجر ناصر کے کمرے میں گھس گئی۔ وہ اس وقت ٹیلی فون پر کسی سے بات کر رہا تھا۔ اس نے ریسیور کریڈل پر رکھ کر زلیخا سے پوچھا۔ ''جی فرمایئے؟''

''کل میرا بیٹا یہاں کسی کی تلاش میں آیا تھا۔ آپ نے اسے گرفتار کر لیا، کیوں؟''

''کیا نام ہے آپ کے بیٹے کا؟ آپ تشریف تو رکھیں۔'' میجر ناصر بھی اس کی باوقار شخصیت سے متاثر ہو گیا تھا۔

''میرے بیٹے کا نام اسد علی ہے۔'' زلیخا نے کہا۔

''وہ......''

''وہ انڈیا کا شہری ہے۔ جی ایچ کیو میں اس کا کیا کام؟''

''وہ ایک صاحب کی تلاش میں یہاں آیا تھا۔'' زلیخا نے کہا۔ ''1971ء میں وہ لیفٹیننٹ تھے، لیفٹیننٹ عامر

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

علی۔‘‘

’’لیفٹیننٹ عامر علی؟‘‘ میجر نے پُرخیال انداز میں کہا۔’’وہ کس رجمنٹ میں تھے؟‘‘

’’یہ میں نہیں جانتی۔‘‘ زلیخا نے کہا۔’’بس اتنا جانتی ہوں کہ وہ 71ء میں انڈیا میں پھنس گئے تھے۔‘‘

’’آئی ڈونٹ نو۔‘‘ میجر ناصر نے کہا۔’’آپ کس لیفٹیننٹ عامر کے بارے میں پوچھ رہی ہیں۔ میں ابھی معلوم کر کے آپ کو بتاتا ہوں۔‘‘ پھر وہ انکساری سے بولا۔ ’’آپ تشریف رکھیں۔ میں چائے بھجواتا ہوں اور ابھی حاضر ہوتا ہوں۔‘‘

زلیخا چائے کے لیے اسے منع ہی کرتی رہ گئی۔ وہ چائے نہیں پیتی تھی۔ عامر سے بچھڑنے کے بعد تو اس نے چائے کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔

اردلی تھوڑی دیر میں چائے لے آیا۔ زلیخا نے چائے کا گھونٹ لیا تو اس کے کانوں میں عامر کی آواز آئی۔

’’اے، اسے دوا سمجھ کر پی لو۔‘‘

وہ اسے اٹک اٹک کر پینے لگی۔

تھوڑی دیر میں میجر واپس آگیا اور بولا۔’’میڈم! عامر سر کے بارے میں معلوم ہو گیا ہے۔ وہ ریٹائر ہو چکے ہیں اور آج کل اسلام آباد میں رہتے ہیں۔‘‘ اس نے ایک کاغذ زلیخا کی طرف بڑھایا۔’’یہ ان کا ایڈریس ہے۔‘‘

’’اور میرا بیٹا؟‘‘ زلیخا نے پوچھا۔

’’اس کے لیے آپ کو بریگیڈیئر آفتاب سے ملنا ہو گا۔ یہ کیس وہی ڈیل کر رہے ہیں۔ آئیے، میں آپ کو بریگیڈیئر صاحب سے ملوا دوں۔‘‘

وہ زلیخا کو لے کر ایک لمبے کوریڈور میں داخل ہوا۔ اس دروازے کے آگے ایک اسکینر لگا تھا اور گارڈ بیٹھا ہوا تھا۔ اسکینر سے گزرنے کے بعد زلیخا بریگیڈیئر صاحب کے کمرے تک پہنچی۔ میجر ناصر نے بریگیڈیئر کو مختصراً اسد اور زلیخا کے بارے میں بتایا اور واپس چلا گیا۔

’’تشریف رکھیں۔‘‘ بریگیڈیئر آفتاب نے کہا اور غور سے زلیخا کو دیکھنے لگا۔ پھر آہستہ سے بولا۔’’آپ کا نام زلیخا ہے؟‘‘

زلیخا اچھل پڑی اور حیرت سے بولی۔’’آپ میرا نام کیسے جانتے ہیں؟‘‘

’’آپ پریشان نہ ہوں۔‘‘ آفتاب مسکرایا۔’’عامر میرا بہت اچھا دوست ہے۔ ہم دونوں اکیڈمی میں بھی ساتھ تھے اور جنگ پر بھی ساتھ ہی گئے تھے۔ انڈیا سے واپسی پر عامر نے مجھے سب کچھ بتا دیا تھا۔‘‘

’’سر، وہ میرا بیٹا؟‘‘

’’آپ کا بیٹا بالکل خیریت سے ہے۔ آپ بروقت آگئیں ورنہ آج ہم اسے پولیس کے حوالے کرنے والے تھے۔‘‘ پھر اس نے انٹرکام اٹھا کر کسی سے کہا۔’’میجر عرفان! کل آپ نے جس لڑکے کو اریسٹ کیا تھا اسے میرے آفس میں لے آئیں، تمام کاغذات سمیت۔‘‘ پھر وہ زلیخا سے بولا۔’’مجھے عامر نے بتایا تھا کہ آپ دونوں کی شادی کن حالات میں ہوئی تھی۔ سوری، میں تو بھول ہی گیا۔ چائے تو آپ پیتی نہیں ہیں۔ میں آپ کے لیے کوک منگواتا ہوں۔‘‘

تھوڑی دیر بعد اسد کمرے میں داخل ہوا۔ اس کا چہرہ ستا ہوا تھا اور وہ کچھ گھبرایا ہوا سا تھا۔ زلیخا کو دیکھتے ہی وہ چونک اٹھا اور بولا۔’’امی، آپ کو یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ یہ لوگ آپ کو بھی گرفتار کر لیں گے۔ آپ بھی تو انڈین شہری ہیں۔‘‘

’’ایسا کچھ نہیں ہوگا بیٹا۔‘‘ آفتاب صاحب نے کہا۔ ’’بیٹھ جاؤ۔‘‘ پھر وہ اس کے ساتھ آنے والے میجر عرفان سے مخاطب ہوئے۔’’میں اس لڑکے کو ریلیز کر رہا ہوں۔‘‘ انہوں نے میجر عرفان سے ایک فائل لے کر اس پر دستخط کیے اور بولے۔’’اس پر اسٹیمپ لگا لیجیے گا۔‘‘

’’یس سر۔‘‘ میجر عرفان نے کہا اور اسے سیلیوٹ کر کے کمرے سے باہر نکل گیا۔

’’آفتاب بھائی! اب مجھے اجازت دیں۔‘‘

’’ضرور!‘‘ آفتاب مسکرایا۔’’لیکن عامر کے ساتھ میرے گھر آئیے گا ضرور، اس سے کہیے گا، کل میں ڈنر پر اس کا انتظار کروں گا۔‘‘ زلیخا اور اسد اٹھے اور آفتاب نے کہا۔ ’’میں ڈرائیور سے کہہ دیتا ہوں۔ وہ آپ لوگوں کو عامر کے بنگلے پر چھوڑ دے گا۔‘‘

بریگیڈیئر آفتاب کے ڈرائیور نے ان دونوں کو عامر کے بنگلے کے گیٹ پر اتارا اور واپس چلا گیا۔

اسد نے اطلاعی گھنٹی بجائی تو گارڈ نے دروازہ کھولا اور بولا۔’’جی میڈم!‘‘

’’مجھے عامر صاحب سے ملنا ہے۔‘‘ زلیخا نے کہا۔

گارڈ نے اسے راستہ دے دیا اور انہیں ایک اور گارڈ کے حوالے کر دیا۔ وہ زلیخا اور اسد کو لے کر اندر کی طرف بڑھا اور انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھا کر بولا۔’’میں صاحب کو اطلاع کرتا ہوں۔‘‘

زلیخا نے کمرے کا جائزہ لیا۔ ایک طرف عامر کی

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

جوانی کی تصویر تھی۔ وہ اس وقت میجر تھا۔ وہی خوب صورت براؤن بال اور آنکھیں، وہی گھنی مونچھیں اور مسکراتا ہوا چہرہ۔

اسد اٹھ کر تصویر کے پاس چلا گیا اور بولا۔ ''امی، یہ تو میری تصویر ہے۔''

''نہیں بیٹا! یہ تمہارے ابو ہیں۔'' زلیخا مسکرائی اور اپنی آنکھوں میں آئے ہوئے آنسو صاف کرنے لگی۔

اسی وقت اندر سے قدموں کی آہٹ سنائی دی اور پندرہ سولہ سال کی خوب صورت سی ایک لڑکی ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔

وہ زلیخا کو دیکھ کر چونکی اور بولی۔ ''جی آنٹی! آپ......''

''مجھے عامر صاحب سے ملنا ہے۔''

''پاپا واش روم میں ہیں۔'' لڑکی نے جواب دیا۔ ''آپ جب تک مجھ سے ملیں۔ میں شائستہ ہوں اور......''

''پاپا!'' زلیخا نے ڈوبتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''تم عامر کی بیٹی ہو؟''

''آپ اتنی حیران کیوں ہیں آنٹی؟''

زلیخا کو ایسا لگا جیسے کوئی اس کا دل مٹھی میں لے کر مسل رہا ہو۔ بائیس طویل ماہ و سال کے جان لیوا انتظار کے بعد اس نے عامر کو پایا تھا بلکہ پایا کہاں تھا، ایک مرتبہ پھر کھو دیا تھا۔ ہمیشہ کے لیے۔ اس سے اپنے قدموں پر کھڑے رہنا محال ہو رہا تھا۔ ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ اچانک اس کے لیے سب کچھ بے معنی ہو گیا تھا۔

اس نے چیخ کر اسد سے کہا۔ ''اسد! واپس چلو۔''

''امی، آپ......''

''واپس چلو، اسد۔'' زلیخا اتنی زور سے چیخی کہ اس کی آواز پھٹ گئی اور وہ اسد کی طرف دیکھے بغیر تیزی سے باہر کی طرف لپکی۔

شائستہ حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اسد کو ماں کے دکھ کا اندازہ تھا۔ وہ زلیخا کے پیچھے لپکا اور بولا۔ ''امی، میری بات تو سنیں، آپ ایک مرتبہ......''

زلیخا نے گھوم کر اس کے چہرے پر زناٹے دار تھپڑ رسید کر دیا۔ ''چلو یہاں سے، میرا دم گھٹ رہا ہے۔''

اس وقت ایک بنگلے کے سامنے ٹیکسی سواریوں کو اتار کے واپس جا رہی تھی۔ زلیخا نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکا اور اسد کی طرف دیکھے بغیر ٹیکسی میں بیٹھ گئی۔ اسد بھی جلدی سے ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔

اکبر صاحب کے گھر آ کر زلیخا یوں بلک بلک کر روئی جیسے اسے ابھی ابھی عامر کی موت کی اطلاع ملی ہو۔ اسد نے اسے رونے دیا۔ دل کی بھڑاس نکالنے کے بعد زلیخا کچھ سوچ کر خاموش ہو گئی اور اس نے اپنے آنسو پونچھے لیکن وہ گم صم سی ہو گئی تھی۔ اس کی حالت صحرا میں بھٹکنے والے اس پیاسے جاں بہ لب مسافر کی سی تھی جو نخلستان پہنچ کر بھی پیاسا ہی رہا۔

زلیخا ساری رات جاگتی رہی اور نہ جانے کیا سوچتی رہی۔

وہ علی الصباح اٹھی، اس نے منہ دھویا اور ناشتا کیے بغیر اپنا ہینڈ بیگ اٹھا کر گھر سے باہر نکل گئی۔

عین اسی وقت اسد کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے زلیخا کو باہر جاتے دیکھا تھا۔ وہ ٹراؤزر اور ٹی شرٹ میں تھا۔ اسی حالت میں باہر کی طرف دوڑا۔

زلیخا اس وقت تک ٹیکسی میں بیٹھ چکی تھی۔ جب تک اسد وہاں تک پہنچتا، ٹیکسی روانہ ہو چکی تھی۔

اکبر صاحب کے پاس بائیک تھی۔ وہ صبح دیر سے اٹھنے کے عادی تھے۔

اسد نے ان کی بائیک نکالی اور برق رفتاری سے اس طرف روانہ ہو گیا جس طرف زلیخا کی ٹیکسی گئی تھی۔ سڑک پر ابھی اتنا ٹریفک نہیں تھا۔ اسد کو جلد ہی ٹیکسی نظر آ گئی لیکن وہ خاصے فاصلے پر تھی۔ اس کا رخ اسلام آباد کی طرف تھا۔ اسلام آباد کی ہموار سڑک پر ٹیکسی ڈرائیور نے رفتار بڑھا دی۔ اسد کی پرانی موٹر سائیکل اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ لیکن اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ زلیخا، عامر کے بنگلے کی طرف جا رہی ہے۔

زلیخا ٹیکسی سے اتری اور بنگلے میں داخل ہو گئی۔ گارڈ اسے ایک دن پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ اس لیے اسے روکنے کی جرأت نہ کر سکا۔

کوریڈور میں زلیخا کو ایک ملازم نظر آیا۔ اس نے ملازم سے عامر کے بیڈ روم کے بارے میں معلوم کیا اور دندناتی ہوئی عامر کے بیڈ روم میں داخل ہو گئی۔

عامر شاید اسی وقت سو کر اٹھا تھا اور بیڈ ٹی پی رہا تھا۔

اسے دیکھ کر زلیخا کا دل بے اختیار دھڑکنے لگا۔ وہ ان بائیس برس میں کچھ اور وجیہ اور باوقار ہو گیا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ عامر کے سینے سے لگ جائے لیکن اس کی جنونی محبت پر فوراً ہی شدید نفرت کے جذبات غالب آ گئے۔

''زلیخا...... تم......'' عامر نے خوشی سے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''تم کل اچانک ہی یہاں سے چلی گئیں، کیوں؟''

''میں بائیس سال تک جدائی کی آگ میں جلتی رہی ہوں، تمہاری تلاش میں پل پل روتی رہی ہوں اور تم...... تم یہاں آ کر سب کچھ بھول گئے۔ میرے بابا کی قربانی بھی یاد

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

نہ آئی تمہیں...... تم نے یہاں آ کر شادی رچالی اور میں تمہاری امانت، تمہارے بیٹے کو سینے سے لگائے تم سے..... ملنے کی آرزو میں جیتی رہی۔ تم نے تو ایک لمحے میں مجھے میری ہی نظر میں گرا دیا۔ اب میں مزید جینا نہیں چاہتی۔'' زلیخا نے ہذیانی انداز میں اپنی بات مکمل کی۔

زلیخا نے ہینڈ بیگ سے اچانک عامر کا وہی سروس ریوالور نکال لیا جو وہ دلی میں ہوٹل کے کمرے میں چھوڑ کر آیا تھا۔

''میں نے تو تمہارے اس ہتھیار کو تمہاری نشانی سمجھ کر اپنے پاس رکھا تھا تم میری فطرت سے واقف نہ ہو سکے۔ میں اپنی توہین تو کسی بھی قیمت پر برداشت نہیں کر سکتی ہوں۔''

''زلیخا...... میری بات تو سنو۔'' عامر نے بوکھلا کر کہا اور اس کی طرف بڑھنا چاہا۔

''ایک قدم بھی آگے مت بڑھانا عامر!'' زلیخا نے کہا۔ ''تم میرے خوابوں کے قاتل ہو۔ تم کیا سمجھتے ہو میں تمہیں رنگ رلیاں منانے دوں گی...... نہیں عامر نہیں......''

اس نے اچانک عامر پر فائر کر دیا۔ گولی عامر کے بازو میں لگی، اس نے دوسرا فائر کیا۔ وہ گولی عامر کے سینے میں پیوست ہو گئی۔

اسد تقریباً بھاگتا ہوا بنگلے میں داخل ہوا تھا۔ وہ کوریڈور میں تھا کہ اس نے یکے بعد دیگرے دو فائر کی آوازیں سنیں۔ وہ جھپٹ کر اندر داخل ہو گیا۔

عامر اکھڑے اکھڑے سانس لے رہا تھا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے زلیخا کو دیکھ رہا تھا۔

''تم کیا سمجھتے ہو، میں اپنے سہاگ کو خود اجاڑنے کے بعد زندہ رہوں گی۔'' زلیخا نے ہیجان زدہ لہجے میں کہا۔ ''نہیں، اب میری زندگی کا سفر بھی ختم ہوا۔'' اس نے ریوالور اپنی کنپٹی پر رکھ لیا اور فائر کرنے ہی والی تھی کہ اسد نے جھپٹ کر اس کے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جا گرا۔ اسد چیخ کر بولا۔ ''امی، یہ کیا کیا آپ نے؟ آپ نے اس شخص کی جان لے لی جس کے لیے آپ نے اپنی جوانی لٹا دی...... آپ نے تو مجھے بھی یتیم کر دیا امی۔'' اسد بلک بلک کر رونے لگا۔

اسی وقت شائستہ بھی کمرے میں داخل ہوئی اور عامر کو دیکھ کر فلک شگاف چیخ ماری اور نڈھال ہو کر فرش پر گر گئی۔

دو تین ملازم اور گارڈ بھی فائرنگ کی آواز سن کر اندر آ گئے تھے۔

''ڈاکٹر کو ٹیلی فون کرو۔'' اسد نے روتے ہوئے کہا۔ ''یا ایمبولینس بلاؤ، جلدی کرو۔''

''اب سب کچھ بیکار ہے بیٹا۔'' عامر نے کہا۔ ''اور اکھڑے اکھڑے سانس لینے لگا۔ ''تیری...... ماں نے تو میری بات سنی ہی نہیں۔ تو تو سن سکتا ہے...... میرے...... پاس...... اب زیادہ وقت نہیں ہے...... آ...... ایک دفعہ میرے سینے سے تو لگ جا۔''

اسد سسکتا ہوا اس کے سینے سے لگ گیا۔ زلیخا پتھر کی بت بنی کھڑی تھی۔

عامر نے زلیخا سے کہا۔ ''زلیخا...... تم نے یہ...... کیسے سمجھ لیا...... کہ...... میں...... تمہاری...... جگہ...... کسی اور...... کو دے سکتا ہوں...... اس کا سانس اکھڑ گیا۔ اور وہ سانس لینے کی کوشش کرنے لگا۔ شائستہ نے جلدی سے پانی کا گلاس اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔

اس نے کچھ پانی پیا، کچھ اس کے ہونٹوں سے نکل گیا...... وہ سنبھالا لے کر بولا۔ ''یہ...... شائستہ...... میرے بڑے بھائی...... ناصر کی...... بیٹی ہے...... وہ...... وہ......''
عامر کا سانس پھر اکھڑ گیا۔

''عامر...... یہ...... یہ...... تم کیا کہہ رہے ہو؟'' زلیخا نے وحشت زدہ لہجے میں کہا۔ ''یہ...... شائستہ......''

''جی ہاں آنٹی! میرے ڈیڈی اور مما کا اس وقت انتقال ہوا تھا جب میں صرف ایک سال کی تھی۔ میں نے اپنے ڈیڈی کو تو دیکھا نہیں تھا اس لیے انکل ہی کو پاپا کہنے لگی۔''

''تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا عامر! میں نے...... ان ہی ہاتھوں سے تمہاری جان لینے کی کوشش کی جو تمہارے لیے دعائیں کرتے تھے...... میں قاتل ہوں...... میں اپنے پیار کی قاتل ہوں...... میں نے ان دو بچوں کو یتیم کر دیا۔'' اس کے لہجے سے پاگل پن جھلک رہا تھا۔

اسی وقت کمرے میں ڈاکٹر داخل ہوا۔ اس کے پیچھے پولیس کے دو افسر بھی تھے۔

''آپ نے فضول زحمت کی ڈاکٹر صاحب...... ! اب...... تو...... بس روانگی ہے...... اب...... تو......'' عامر کا سانس بری طرح اکھڑا اور اس کی گردن ڈھلک گئی۔

زلیخا دھاڑیں مار کے رونے لگی پھر اچانک اس کے وحشیانہ قہقہے گھر میں گونجنے لگے۔ اسد بھی بری طرح سسک رہا تھا۔

پولیس انسپکٹر نے آگے بڑھ کر زلیخا کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دیں۔ زلیخا کے آتشِ جنون نے اس کو جلا کر خاکستر کر دیا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

ٹیڑھی انگلی

مختار آزاد

سیدھی انگلی سے گھی نہ نکلے تو انگلی ٹیڑھی کرنا پڑتی ہے۔ یہ محاورہ چاہے کتنا ہی پرانا ہو جائے اپنی افادیت رکھتا ہے۔ چور چوری سے جائے مگر ہیرا پھیری اس کی گھٹی میں پڑی ہوتی ہے۔ ایسے ہی چوروں کی دلچسپ و بھرپور کہانی... روز بروز ان کی محنت و تگ و دو کی اُجرت کم ہو رہی تھی۔ وہ اپنے معاوضے میں اضافے کے متمنی تھے۔ مگر ساہوکار اپنی کنجوسی اور بخیل طبیعت سے مجبور تھا۔

چوروں کی یونین سازی کرنے والے چوروں کا مفاہمانہ معاہدہ

DOWNLOADED FROM
PAKSOCIETY.COM

گزشتہ پندرہ برس سے بیومنٹ اور یارنیل اکٹھے کام کررہے تھے۔ دونوں کی ففٹی ففٹی کی پارٹنرشپ تھی۔ اُن کے مزاج میں اتنی ہم آہنگی تھی کہ اب وہ ایک دوسرے سے الگ ہوکر کام کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ دونوں لڑکپن کے ساتھی تھے اور اب ادھیڑ عمری میں بھی ان کی دوستی پہلے روز کی طرح توانا اور مضبوط تھی۔

جب سے بیومنٹ کی فرسٹ کزن این نے مارٹی سے شادی کی تھی، تب سے وہ دونوں اُسی کے لیے کام کرنے

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

لگے تھے۔ مارٹی شہر کے تجارتی حصے کے نواح میں ایک دکان چلاتا تھا، دکان سے کچھ فاصلے پر ہی اس کا گھر تھا۔ دریا کنارے واقع الیگزینڈر سٹی پوری ریاست کا سب سے بدنام شہر تھا۔ اس کی وجہ یہاں کا وہ چور بازار تھا جہاں بظاہر تمام کاروبار قانونی تھے لیکن سب ہی جانتے تھے کہ مرینا مارکیٹ پوری ریاست کے چوروں کا تجارتی مرکز تھی۔ مارٹی بھی چور بازار کے نیک نام دُکان داروں میں سے ایک تھا۔ اس نے مارکیٹ کے نواحی علاقے میں واقع اپنی دکان کے عقب میں ایک گودام بھی بنا رکھا تھا، جہاں وہ چوری کا خریدا گیا قیمتی مال رکھتا تھا۔ وہ قیمتی چیزیں گروی رکھ کر ضرورت مندوں کو غیر قانونی طور پر سود پر پیسے بھی دیتا تھا۔ گروی رکھی گئی چیزیں بھی وہ گودام میں جمع کرتا تھا، جس کی حفاظت کے لیے اپنی دانست میں وہ خاصا مضبوط سیکیورٹی سسٹم نصب کروا چکا تھا۔

مارٹی بہت کنجوس شخص تھا۔ یارنیل اور بیومنٹ کو وہ چوری کے سامان کی کل مالیت کا صرف تین فیصد دیا کرتا تھا۔ کئی برس تک تو معاملات خوش اسلوبی سے چلتے رہے لیکن گزشتہ چند ماہ سے یارنیل اور بیومنٹ کے مارٹی سے تجارتی تعلقات کشیدہ ہونے لگے تھے۔ بیومنٹ کا اصرار تھا کہ انہیں تین کے بجائے دس فیصد ملنا چاہیے جبکہ مارٹی کا کہنا تھا کہ دھندے میں مندی ہے اور وہ ایسا نہیں کر سکے گا۔ مندی کے نام پر وہ کئی مہینوں سے اس معاملے کو لٹکا تا رہا تھا لیکن اب بات کافی آگے بڑھ گئی تھی۔ اسی معاملے کو طے کرنے کے لیے مارٹی نے اُن دونوں کو یوکرائن بار میں بلایا تھا۔

یارنیل اور بیومنٹ بار کے ایک کیبن بیٹھے ووڈ کا سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ یارنیل تو قریب میں ہی رہتا تھا لیکن بیومنٹ کا فلیٹ دریا کے پار پُرسکون رہائشی علاقے میں تھا۔ ویسے بھی یارنیل کو ہلا گلا جبکہ بیومنٹ تنہائی پسند تھا۔ بیومنٹ کو ہمیشہ کسی اچھی جگہ بیٹھ کر پینے میں لطف آتا تھا۔ وہ یہاں اپنی مرضی سے کبھی نہیں آیا، مجبوری سے بیٹھا ہوا تھا۔ مارٹی کو ہمیشہ ایسی جگہ پسند آتی تھی جو سستی ہو اور یوکرائن جیسا گھٹیا بار تو کسی طور بھی مہنگا نہیں کہلایا جا سکتا تھا۔

یہ بار قصبے کے مرکزی اسکوائر پر واقع تھا جہاں سے شہر کے ہر حصے کے لیے سڑک نکل رہی تھی۔ وہ بار بھی تجارتی حصے میں کام کرنے والے مزدوروں کی بڑی تعداد کو دیکھتے ہوئے ہی کھولا گیا تھا۔ بار کے اندر ایک طرف انگریزی حرف ایل کی شکل میں پیازی رنگ کے شیشے سے بنے چند چھوٹے کیبن بنائے گئے تھے جہاں پوری بوتل خرید کر بیٹھنے والے تنہائی پسند اپنا غم غلط کرتے تھے۔ کیبن کے شیشوں کی دیوار کے پار سے باہر کا منظر صاف دکھائی دیتا تھا۔ وہ دونوں بھی ایک کیبن میں گلاس تھامے بیٹھے تھے۔ باہر لکڑی کے پالش شدہ فرش والے بار کے اندر دو چار ہی لوگ موجود تھے۔

بیومنٹ نے شیشے کے پار نظر ڈالی۔ کاؤنٹر پر نہایت دلکش جسم کی مالک سنہری بالوں والی بارٹینڈر خالی گلاسوں میں مارٹینی اور ووڈ کا بھرے جا رہی تھی۔ یارنیل کا خیال تھا کہ اگر وہ ماڈلنگ کرتی تو امریکا میں صفِ اول یہ ہوتی۔ جس تن دہی سے وہ گلاس بھر کر ترتیب سے رکھ رہی تھی، اس سے صاف نظر آ رہا تھا کہ جلد ہی تشنہ لبوں کی لائن لگنے والی ہے۔ ویسے وہ بارٹینڈر کے ساتھ ساتھ ویٹرس بھی تھی، یارنیل اپنا آرڈر اسے ہی دینا پسند کرتا تھا۔ بیومنٹ نے وقت گزاری کے لیے آنکھوں ہی آنکھوں میں گلاسوں کی گنتی شروع کر دی۔ ایک، دو تین، چار...... وہ چالیس گلاس بھر چکی تھی۔ ”لگتا ہے دھندا اچھا چلتا ہے۔“ بیومنٹ نے زیرِ لب کہا اور مسکرا دیا۔

بار حالتِ غنودگی میں تھا لیکن کچھ دیر بعد لوگوں کا آنا جانا شروع ہو گیا۔ مشرقی یورپ کے لب و لہجے والی حسین بارٹینڈر مارگریٹا کے ہاتھوں میں پھرتی اور چہرے پر مسکراہٹ بڑھتی چلی گئی۔ ایک کے بعد ایک...... تشنہ لب دروازہ کھولتے، لکڑی کے چمکدار فرش پر ٹھک ٹھک کرتے کاؤنٹر کی طرف بڑھتے۔ ایک ڈالر کا نوٹ بارٹینڈر کی طرف بڑھاتے، خالص مارٹینی کا گلاس اٹھاتے، لوہے کے اسٹول پر ٹکتے، چسکیاں بھرتے، اور پھر...... خالی گلاس کاؤنٹر پر رکھ کر یہ جا وہ جا۔ بیومنٹ نے اندازہ لگایا کہ ایک گاہک کو اندر پہنچ کر بڑا سا بھرا گلاس خالی کرنے تک، اوسطاً تین منٹ لگ رہے تھے۔ وہ سب مزدور پیشہ تھے اور جس تیزی سے گلاس بھگتا کر واپس جا رہے تھے، اسے دیکھ کر لگتا تھا کہ ان سب کو کہیں پہنچنے کی جلدی تھی۔

کچھ دیر تک گلاس کو بے مقصد دیکھنے کے بعد بیومنٹ نے باہر نظر ڈالی۔ سامنے سڑک پر لوگ اِدھر سے اُدھر آ جا رہے تھے۔ دریا کے دوسری طرف کا یہ علاقہ تجارتی اور صنعتی تھا۔ اسی لیے سڑک پر مزدور اور خریدار، دونوں ہی کی بڑی تعداد موجود تھی۔ اچانک اس کی نظر سڑک پار واقع سٹی ہال پر پڑی۔ عمارت پر سرخ رنگ کا بڑا سا بینر لگا تھا۔ اس پر سفید رنگ سے لکھا تھا: عالمی یوم مزدور۔

بیومنٹ نے دیکھا کہ لوگ ایک ایک کر کے عمارت

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

کے اندر جا رہے تھے لیکن کافی دیر تک اس نے ایسا کوئی شخص نہیں دیکھا جو اندر سے باہر آیا ہو۔ تھوڑی دیر بعد بار بھی لوگوں سے تقریباً خالی ہو چکا تھا البتہ باہر سڑک پر لوگوں کی تعداد بڑھتی رہی تھی۔ سٹی ہال سے بھی لوگ گروہ در گروہ کی صورت نکلتے جا رہے تھے۔ وہ پوری قوت سے نعرے لگا رہے تھے۔ کسی غیر متوقع صورتِ حال سے بچنے کے لیے بار کا دروازہ اندر سے لاک کر دیا گیا تھا۔ موٹے شیشے کی دیوار کے باوجود نعروں کی آوازیں دونوں کے کانوں تک صاف پہنچ رہی تھیں۔ ہجوم اب بار کے داخلی دروازے کے سامنے پہنچ چکا تھا۔ دونوں کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔

بیومنٹ نے یارنیل کی طرف دیکھا۔ وہ بھی آدھا خالی گلاس تھامے باہر ہی دیکھ رہا تھا۔ ''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' اس نے سوالیہ لہجے میں کہا۔

یارنیل نے گھونٹ بھرا اور کچھ دیر سوچنے کے بعد کہنے لگا۔ ''سوچو...... یہ کیا ہو رہا ہے۔'' سوال کا جواب بھی سوال میں تھا۔

بیومنٹ نے اُسے گھور کر دیکھا۔

''میرا خیال ہے کہ یہ ویسا ہی کچھ معاملہ ہے جس پر کچھ ہی دیر میں ہم مارٹی سے بات کرنے والے ہیں۔'' یارنیل نے بے یقینی سے کہا۔

''لیکن یہ ہے کس بارے میں، کس کے خلاف۔'' بیومنٹ کے لہجے سے تجسس عیاں تھا۔

''تمہارا کیا خیال ہے؟''

''میں سمجھ رہا ہوں کہ یہ سب کچھ ہمارے دوست مارٹی اور اس کے ساتھی دُکان داروں کا ہی کیا دھرا ہے۔ ضرور انہوں نے اپنے ہاں کام کرنے والوں کے معاوضے مزید کم کر دیے ہوں گے، تبھی تو یہ چلا رہے ہیں۔'' بیومنٹ نے انگلی سے ہجوم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ ''یاد ہے مارٹی کچھ دن پہلے ہی کہہ رہا تھا کہ دھندے میں بہت مندی ہے اور سارے دُکان دار اس صورتِ حال سے سخت پریشان ہیں، ایسے میں وہ کُل قیمت کا تین فیصد بھی بہت زیادہ دنوں تک نہیں دے پائے گا۔''

''کیا......'' یہ سن کر یارنیل کو حیرت کا جھٹکا لگا۔ ''مجھے یاد نہیں پڑتا لیکن اگر تم کہہ رہے ہو تو ٹھیک ہی ہوگا مگر یہ تو بہت بڑی زیادتی ہوگی ہمارے ساتھ۔''

بیومنٹ نے اس کی طرف دیکھا۔ ''وہ تو یہ بھی کہہ رہا تھا کہ حالات اتنے خراب ہیں کہ شاید اسے کچھ عرصے کے لیے دھندا ہی بند کرنا پڑے۔''

احمق

لڑکا: ''شراب پینے کے بعد تم غیر معمولی طور پر حسین اور دلکش اور دلربا نظر آنے لگتی ہو!''

لڑکی: ''احمقانہ بات مت کرو، میں نے آج تک کبھی شراب نہیں پی۔''

لڑکا: ''مگر میں تو پیتا ہوں۔''

بڑا جیب کترا

ایک شخص لوگوں کی جیب کاٹتا ہے، بٹوے اڑا لیتا ہے۔ یہ جیب کترا کہلاتا ہے۔ لوگ اس سے ڈرتے ہیں اور اپنی جیبیں اور بٹوے اس سے بچا بچا کر رکھتے ہیں۔ اگر کبھی پولیس کے ہتھے چڑھ جائے تو جیل خانے میں لے جا کر بند کر دیا جاتا ہے۔ مگر ایک دوسرا شخص اپنا بینک بیلنس بڑھانے کے لیے اشیائے ضرورت مہنگی کر کے لوگوں کی جیبوں سے سب کچھ نکلوا لیتا ہے لیکن وہ لوگوں کی نگاہوں میں باعزت ''سیٹھ'' یا ''ساہوکار'' ہے۔

تحریر: محترمہ ام کلثوم، لاہور

''لیکن وہ تو پہلے ہی ہمیں بہت کم دے رہا ہے۔'' یارنیل نے احتجاجی لہجے میں کہا۔ ''پوری مارکیٹ میں دس فیصد تو بھی دے رہے ہیں، ہمیں تو کئی سالوں سے صرف تین فیصد ہی مل رہا ہے۔''

اسی دوران مارٹی کیبن میں داخل ہوا۔ ''کیا چل رہا ہے دوستو؟'' اس نے کرسی گھسیٹی۔

''تمہارے بارے میں ہی بات ہو رہی ہے۔'' یارنیل نے بھنّا کر کہا۔ ''اب اور کتنی اجرت کم کرو گے۔'' اس کا لہجہ طنزیہ تھا۔

''لیکن تم کیسے آئے، دروازہ تو اندر سے بند ہے۔'' بیومنٹ نے حیرانی سے پوچھا۔

''برابر کے کیبن میں بیٹھا تھا۔''

''اوہ اکیلے ہی اکیلے......ہمیں یہاں انتظار کرنے کے لیے بیٹھا رہنے کو کہہ دیا۔'' یارنیل نے جل بھن کر کہا۔ وہ اس کی چالاکی پر کڑھ رہا تھا کہ اُن کے ڈرنکس کے پیسے بچانے کے لیے مکار نے کیا چال چلی تھی۔

''تو تم ہماری اجرت اور بھی کم کرنا چاہتے ہو؟'' یارنیل کا لہجہ سوالیہ تھا۔

''سب دھندے پر منحصر ہے۔'' مارٹی نے سکون سے

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

جواب دیا۔

''خود منافع کمارہے ہو ہم سے اور کیا دے رہے ہو......'' بیومنٹ نے طعنہ دیا۔

''ہاں کماتا ہوں۔'' مارٹی نے اعتراف کیا ''لیکن دماغ بھی استعمال کرتا ہوں ورنہ دھندے کی جو حالت ہے، ایسے میں مجھے سڑک پر آنے میں دیر نہیں لگتی، دوسروں کی طرح۔''

''تو پھر ہماری اُجرت میں کٹوتی کیوں......'' یارنیل کے دماغ کی سوئی اب تک اجرت پر ہی ٹکی تھی۔

''ٹھیک ہے۔'' بیومنٹ نے مداخلت کی۔ ''دھندا مندا سہی لیکن یاد رکھنا کہ ہم رشتے دار ہیں۔ تمہاری بیوی میری فرسٹ کزن ہے اور اس طرح ہم قریبی رشتے دار ہیں۔''

''لیکن بات یہ ہے......'' مارٹی نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔

''کوئی بھی بات ہو۔'' بیومنٹ نے قطع کلامی کی۔ ''یہ ٹھیک ہے کہ تم چمڑی جانے دو گے پر دمڑی نہیں مگر مت بھولنا، چاہے دھندا ہو یا کچھ اور، دکھ درد میں فیملی والوں کا خیال رکھنا چاہیے اور ہم تو پھر بھی قریب کے رشتے دار ہیں۔'' بیومنٹ اسے جذباتی طور پر گھیرے جارہا تھا۔

''فیملی......'' مارٹی نے طنز بھرے انداز میں کہا۔ ''تمہارے منہ سے یہ لفظ سن کر تو مجھے شرم آنے لگی ہے۔'' اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر چہرہ چھپاتے ہوئے کہا۔ ''سوری دوستو...... میں اب تمہاری کوئی مدد نہیں کرسکتا۔ پہلے ہی تم پر بہت کچھ لٹا چکا، اب مزید خرچ کرنے کی ہمت نہیں ہے مجھ میں۔'' اس کا لہجہ دوٹوک تھا۔

''لٹایا نہیں...... بہت کچھ کما لیا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے بیومنٹ نے چہرہ دوسری طرف موڑ لیا۔ اس کی نگاہیں سامنے سڑک پارٹی ہال پر لگے بڑے سے بینر پر ٹکی تھیں۔ اس کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ جیسے وہ کچھ سوچ رہا ہو۔ کچھ دیر بعد اچانک اس نے جھٹکے سے گردن موڑی اور اپنے پارٹنر یارنیل کی طرف دیکھا۔ اُس کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ جیسے اس مصیبت سے نکلنے کا کوئی حل اسے سوجھ گیا ہو۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو مارٹی۔'' بیومنٹ نے اس کی طرف نظر ڈالی اور پھر یارنیل کو دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ''ہم پہلے اس کے لیے دھندا کررہے تھے لیکن اب اپنے لیے کیوں نہ کریں۔''

اس کے لہجے سے اٹھتی بغاوت کی مہک مارٹی کے نتھنوں تک بھی پہنچ گئی تھی۔ وہ یہ سن کر چونکا ضرور لیکن بولا کچھ نہیں۔

''ٹھیک کہہ رہے ہو، کم از کم کچھ تو ہاتھ لگے گا، کب تک ٹکے ٹکے کی محتاجی اٹھائیں۔'' یارنیل نے فوراً اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا ''مگر کرنا کیا ہوگا؟''

''جب مارٹی نے ہی اپنا عہد توڑ دیا تو پھر ہمیں بھی اپنا خرچہ پانی پورا کرنے کے لیے کچھ تو کرنا ہوگا۔''

''لیکن کرو گے کیا......'' مارٹی نے مداخلت کی۔ وہ ان کی بات سن کر پریشان ہورہا تھا۔ دونوں ہی اس کے کماؤ پوت تھے۔

''بات یہ ہے یارنیل......'' بیومنٹ نے بتانا شروع کیا۔ ''ہم دونوں چوروں کی ایک یونین بناتے ہیں جیسے مزدور اپنی یونین بناتے ہیں۔''

''ایک منٹ......'' ان دونوں کی طرف سے نظرانداز کیے جانے اور علیحدہ دھندے کی بات سن کر مارٹی اندر سے بھڑک چکا تھا۔ ''اور بیومنٹ......'' اس نے خشمگیں نگاہوں سے اسے گھورا ''ابھی ابھی تم نے معاہدہ توڑنے کی بات کی ہے۔''

بیومنٹ نے اقرار میں سر ہلایا۔

''کون سا معاہدہ کیا تھا تم سے میں نے، کون سی دستاویزات لکھ کر تمہیں دی تھیں۔'' مارٹی آگ بگولا ہورہا تھا۔

یارنیل منہ کھولے چوروں کی یونین بنانے پر غور کررہا تھا۔ مارٹی کی بات پر اس کے خیالوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ یہ معاہدہ اور اس کی خلاف ورزی کہاں سے آگئی۔ اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کیا کہے۔ وہ بیومنٹ کی طرف دیکھے جارہا تھا۔

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد آخر بیومنٹ نے لب کشائی کی۔ ''یہ ایک غیر تحریری اور غیر رسمی معاہدہ ہے جس پر چور اور چور بازار کے دُکان دار، دونوں برسوں سے عمل کرتے چلے آرہے ہیں۔''

''تو پھر جاؤ......'' مارٹی نے بری طرح بھڑک کر کہا۔ ''وکیل کرو اور مجھ پر مقدمہ کردو۔ پھر جو عدالت فیصلہ کرے۔''

''ہمیں وکیل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔'' بیومنٹ نے بڑے سکون سے ٹھہرے لہجے میں جواب دیا۔ ''ہم چور بازار میں مال لانے والے تمام چوروں کو اکٹھا کریں گے اور پھر کوئی چور تمہارے پاس سامان نہیں لائے گا۔'' یہ کہہ کر اس نے یارنیل کی طرف دیکھا۔ ''ٹھیک ہے نا۔''

''میں چور نہیں، دُکان دار ہوں۔'' مارٹی غرایا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

''کوئی بات نہیں......'' بیومنٹ بدستور پُرسکون تھا۔ ''ویسے بھی تمہیں تو چور بازاری کے دھندے میں کچھ بچ ہی نہیں رہا، بڑھاؤ اپنی دکان اور کچھ اور کرو۔'' یہ کہہ کر وہ رکا اور کچھ توقف کے بعد بولا۔ ''سوری مارٹی......''

اس نے چونک کر سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

''میں دکان بند کرنے کی بات غلط کہہ گیا تھا۔''

مارٹی کے ہونٹوں پر فخریہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''جب ہم سب چور ایکا کرلیں گے تو تمہاری دکان پر مال کہاں سے آئے گا۔ دکان تو ویسے ہی بند ہوجائے گی۔ تمہیں کچھ نہیں کرنا پڑے گا۔'' یہ کہہ کر اس نے قہقہہ لگایا۔

یارنیل بھی منہ کھول کر ہنس پڑا۔

غصے کے مارے مارٹی اُبل رہا تھا۔ اس کا چہرہ سرخ پڑ گیا تھا۔ اس نے غصے سے دانت پیسے۔

''چلو یارنیل......'' بیومنٹ اپنی جگہ سے اٹھا اور گھڑی پر نظر ڈالی۔ ''وقت کم ہے، ابھی ہمیں دوسرے ساتھیوں سے بھی بات کرنی ہے۔''

''اوکے......'' وہ کھڑا ہوا۔ اس نے میز کی طرف دیکھا۔ اس کا گلاس ابھی خالی نہیں ہوا تھا۔ اس نے گلاس اٹھایا اور غٹاغٹ پی گیا۔ ''چلو چلتے ہیں۔'' وہ دروازے کی طرف بڑھا۔

اس کے پیچھے پیچھے بیومنٹ نے بھی جانے کے لیے قدم بڑھائے۔

مارٹی غصے سے پیچ و تاب کھاتا ہوا انہیں باہر جاتے دیکھتا رہا۔ وہ دونوں اس کے لیے کمائی کا بڑا ذریعہ تھے۔ اس سے پہلے انہوں نے کبھی اس طرح کے لب ولہجے میں باتیں نہیں کی تھیں لیکن نہ جانے کیوں آج وہ باغی نظر آرہے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ مارکیٹ میں مندی ضرور ہے لیکن اتنی بھی نہیں۔ مندی کے باوجود دھندا بہت بہتر حالت میں تھا۔ سچی بات یہ تھی کہ اسے دونوں کو چوری کے مال کا تین فیصد دینا بھی اب کھلنے لگا تھا۔ وہ بلا کا کنجوس تھا۔ چاہتا تھا کہ مندی کو بہانہ بنا کر انہیں اتنا ڈرائے دھمکائے کہ وہ اونے پونے بھاؤ پر ہی تیار ہوجایا کریں مگر اب اسے اپنی چال الٹی اپنے ہی گلے پڑتی محسوس ہورہی تھی۔

فٹ پاتھ پر بیومنٹ کے برابر چلتے ہوئے یارنیل نے اپنے کوٹ کے اندر ہاتھ ڈالا اور ایک بوتل نکالی۔

بیومنٹ نے سوالیہ نگاہوں سے بوتل اور اسے دیکھا۔

''نکلتے ہوئے بار سے اڑالی تھی، اب موج کروں گا......'' یارنیل نے فخریہ نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے اپنا کارنامہ سنایا۔

بیومنٹ نے زوردار قہقہہ لگایا۔ یارنیل کی ہنسی نے بھی اس کے قہقہے کا بھرپور ساتھ دیا۔ وہ دونوں چور بازار کے بیچ سے گزر رہے تھے۔

''ہم تو چور ہیں لیکن مارٹی ہم سے بھی بڑا چور ہے۔'' بیومنٹ اب تک اسی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

''ہم چور تو وہ چوروں کا باپ......'' یارنیل ہنسا۔

''باپ نہیں ڈاکو......'' یہ کہہ کر بیومنٹ نے منہ بنایا۔ ''تمہیں وہ پچھلے ہفتے کا واقعہ یاد ہے نا۔''

''کون سا......''

''وہی جو ہم نے قیمتی موتیوں والا ہار چوری کیا تھا۔''

یارنیل نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''میرا خیال ہے کہ وہ کم از کم بھی دس ہزار ڈالر کا تو ہوگا لیکن ہمیں کیا ملا۔'' بیومنٹ نے دانت کچکچائے۔ ''پہلے تو مارٹی نے اس کا کوڑیوں کا مول لگایا اور دیا کیا، تین سو ڈالر......''

یارنیل نے افسوس سے سر ہلایا۔

''ہم تو چور ہیں لیکن وہ بھتا خور ہے، تاوان وصول کرتا ہے۔'' بیومنٹ کو مارٹی پر شدید غصہ تھا۔ ''نہ اس نے پستول نکالا، نہ گولی چلائی اور مال بھی لوٹ لیا۔'' یہ کہہ کر اپنے پارٹنر کی طرف دیکھا۔ ''اب بتاؤ اسے کیا کہیں گے؟''

''سفید پوش ڈاکو......''

بیومنٹ ہنس پڑا۔

''یہ تو بتاؤ ہم کہاں جارہے ہیں۔ وہ لوگ کہاں ملیں گے۔'' یارنیل نے سوالیہ لہجے میں کہا۔

''چلتے رہو......''

''لیکن پھر بھی......'' یارنیل نے اصرار کیا۔ ''ہم جن چوروں کو اپنی چور یونین میں شامل کرنے جارہے ہیں، وہ کہاں پر ملیں گے، کیا وہ ہمارے ساتھ کام کرنے اور یونین چلانے کے لیے چندہ دینے پر تیار ہوجائیں گے۔'' یہ کہہ کر لمحہ بھر توقف کیا اور پھر بولا۔ ''مجھے تو یہ سب مشکل لگتا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ ہم دونوں پارٹنر ہیں اور اکیلے کام کرتے ہیں، وہ بھی مارٹی کے لیے۔ اتنی آسانی سے لوگ ماننے والے نہیں۔''

بیومنٹ مسکرایا۔ ''یہ اعصاب کی جنگ ہے۔'' اس نے کہنا شروع کیا۔ ''میں نے چال چلی ہے اور مارٹی ہماری چال میں پھنس چکا۔'' یہ کہہ کر رکا اور یارنیل کی طرف دیکھا۔ ''تم نے دیکھا نہیں، جب میں نے یونین کی بات کی

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

اور مارٹی کے ساتھ دھندا نہ کرنے کا کہا تو اس کے چہرے کا رنگ کیسا فق ہوگیا تھا۔"

یارنیل نے اثبات میں سر ہلایا۔ "تو کیا ہم دھندا مارٹی کے ساتھ ہی کریں گے۔"

"فی الحال تو اسے پریشان ہونے دو۔ میں بہت کچھ سوچ رہا ہوں۔" یہ کہہ کر اس کی طرف دیکھا۔ "بس! سیدھے چلتے رہو اور مجھے سوچنے دو کہ اب آگے کیا اور کیسے کرنا ہوگا۔"

یارنیل سوچ میں پڑ گیا۔ کوٹ کی جیب میں تقریباً بھری ہوئی بوتل تھی اور اس کا پارٹنر سوچ و بچار کی بات کر رہا تھا۔ اس نے بیومنٹ سے دور ہو کر اپنی بوتل کے ساتھ وقت بتانے کا فیصلہ کیا۔ "میرا خیال ہے کہ اس وقت تمہیں تنہائی کی ضرورت ہوگی۔"

بیومنٹ نے اسے گھورا۔

"میرا مطلب یہ تھا کہ......" یارنیل اس کے گھورنے سے گھبرا گیا تھا۔ "میں بہت تھک گیا ہوں۔ کچھ دیر تنہائی میں بیٹھنا چاہتا ہوں۔"

اس وقت تک دونوں چوراہے تک پہنچ چکے تھے۔

"تو ٹھیک ہے، فی الحال تم اپنے راستے پر اور میں اپنے۔" یہ کہتے ہوئے بیومنٹ رکا اور چوراہے کے دونوں جانب دیکھنے لگا۔

"یہ ہوئی نا بات......" یارنیل خوشی سے اُچھل پڑا۔

سڑک پر ٹریفک بہت کم اور زیبرا کراسنگ عبور کرنے کا نشان روشن تھا۔

بیومنٹ نے سڑک عبور کی اور شمال میں بنے وسیع و عریض سٹی پارک کی طرف بڑھ گیا۔ وہ اکثر و بیشتر وہاں جاتا تھا۔ پارک میں کھیلتے بچے اسے اچھے لگتے تھے۔ اسے پارک کے سبزہ زار کے بیچوں بیچ واک کے لیے بنی پختہ راہداریوں پر گھومنے پھرنے میں بہت مزہ آتا تھا۔

یارنیل اسے شمال کی سمت جاتا دیکھ کر ہی سمجھ گیا تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہوگا۔ مارٹی کے ساتھ بات بگڑنے کے بعد اسے یقین تھا کہ بیومنٹ چوری کا مال خریدنے والے کسی دوسرے 'بزنس مین' کی تلاش میں ہی وہاں گیا ہوگا۔ ایک چور کی حیثیت سے وہ جانتا تھا کہ سٹی پارک جیسا عوامی مقام چوروں اور ان سے مال کے خریداروں کا پسندیدہ مقام تھا۔ ویسے بھی وہ عالمی یوم مزدور پر چھٹی کا دن تھا۔ یارنیل دعا کر رہا تھا کہ بیومنٹ کو مارٹی کا نعم البدل مل جائے۔

بیومنٹ کے جانے کے بعد وہ کچھ دیر تک چوراہے پر رکا اِدھر اُدھر دیکھتا رہا اور پھر سب وے کی طرف بڑھ گیا۔ راستے سے برگر لیا اور اسٹیشن کے سامنے سے گزرتا ہوا، دریا کنارے بنے اپنے چھوٹے سے لیکن صاف ستھرے فلیٹ میں پہنچ گیا۔

اگلے چند روز تک بیومنٹ نے یارنیل سے کوئی رابطہ نہیں کیا۔ اس کا موبائل فون بھی بند جا رہا تھا۔ اس نے وائس میل باکس پر کئی پیغام چھوڑے لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ ان دونوں کے درمیان آخری رابطے کو بھی ایک ہفتہ گزر چکا تھا۔

اُس دن صبح کے چھ بج رہے تھے۔ وہ دو دن سے اس صبح کا منتظر تھا۔ یارنیل نے سفید ایپرن پہنا اور سر پر پیپر ہیٹ اوڑھ کر برابر کی مارکیٹ کے پارکنگ ایریا میں کھڑے گوشت کی ڈلیوری دینے والے ٹرک کے پیچھے پہنچ گیا۔ اس وقت گوشت ڈلیور کرنے والے مزدور سامنے کے ریستوران میں مال پہنچانے کے لیے اندر جا چکے تھے۔ اس نے چند قدم آگے بڑھائے اور ریستوران کے داخلی دروازے سے اندر کی طرف جھانکا۔ سامنے کچن تھا۔ ڈلیوری بوائز وہیں تھے۔ وہ تیزی سے پلٹا اور ٹرک کے عقب میں پہنچ کر دروازہ کھولا۔ ابھی وہ گوشت سے بھرا باکس لے کر اترنے ہی والا تھا کہ ٹرک چل پڑا۔ وہ وہیں جم کر بیٹھ گیا۔ کچھ آگے جا کر سگنل پر ٹرک رکا تو اس نے نہایت آہستہ سے دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ اردگرد کوئی نہ تھا۔ وہ جھٹکے سے اترا اور گوشت کا باکس لے کے فٹ پاتھ پر اتنے سکون سے آگے بڑھنے لگا جیسے وہ چوری کر کے نہیں آ رہا بلکہ کہیں ڈلیوری دینے جا رہا ہو۔ صبح کے اس وقت سڑک پر اِکا دُکا لوگ ہی آ جا رہے تھے۔ کسی کی توجہ اس پر نہ تھی۔ اچانک کسی نے پیچھے سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اس کا دل دھک کر کے رہ گیا۔ لمحہ بھر میں وہ خود کو دوڑنے کے لیے ذہنی طور پر تیار کر چکا تھا۔ اس نے تیزی سے پلٹ کر دیکھا۔ اگلے ہی لمحے دوڑنے کا ارادہ دم توڑ چکا تھا۔

"لاؤ یہ باکس مجھے دے دو۔" سامنے بیومنٹ کھڑا تھا۔ "یہ ایپرن اور ہیٹ اتار کر پھینکو، کام ہو چکا۔"

یارنیل مسکرایا۔

"بڑا بھاری ہے۔" بیومنٹ نے باکس تھامتے ہوئے کہا۔ "اتنا زیادہ گوشت کھانا تمہارے ہاضمے کے لیے ٹھیک نہیں ہوگا۔"

"کہاں غائب تھے ہفتہ بھر۔" یارنیل نے فٹ پاتھ کے ساتھ رکھے ڈسٹ بن میں ایپرن اور ہیٹ پھینکتے

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

ہوئے پوچھا۔ ”نہ کوئی فون، نہ ای میل، میرے وائس میل تک کا جواب نہیں دیا۔“ اس نے شکایتی لہجے میں بات مکمل کرکے اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

”کچھ سوچنا تھا، کچھ دیکھنا تھا۔“ بیومنٹ نے مختصر جواب دیا۔

”دیکھ لیا اور سوچ لیا۔“ یارنیل نے پھر سوال کر دیا۔

”ہاں......“ بیومنٹ نے اس کی طرف دیکھا۔ ”اچھی طرح چھان پھٹک کرلی، ایک دکان بھی دیکھ لی، اس میں تمہیں بھی دلچسپی ہوگی۔“

”سب طے کرلیا۔“

”بالکل......“ بیومنٹ مسکرایا۔ ”منصوبہ تیار ہے۔“

”کیا منصوبہ ہے۔“ یارنیل کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

”پہلے تو یہ اپنا مال سنبھالو۔“ بیومنٹ نے باکس اس کی طرف بڑھایا۔ ”تمہارے گھر چلتے ہیں، وہیں بیٹھ کر تفصیل سے بتاتا ہوں۔“

”لاؤ......“ یارنیل نے باکس تھام لیا۔

”کافی وزنی ہے بھئی۔“ بیومنٹ نے اپنے دونوں بازو جھٹکتے ہوئے کہا۔ ”کتنے مل جائیں گے اس سے۔“

”دو کوڑی بھی نہیں۔“ یارنیل نے جھلائے لہجے میں جواب دیا۔ ”بیوی کچھ کرتی نہیں، اوپر سے اپنے بھتیجے کو گھر لاکر رکھ لیا ہے۔ ایک تو اسے کوئی نوکری نہیں مل رہی، اوپر سے گھوڑے کی طرح کھاتا ہے۔ میرا تو دیوالیا نکلنے والا ہے۔“ وہ اپنے گھر کے حالات سے کافی جلا بھنا لگ رہا تھا۔

”لگتا ہے اب ان دونوں کا پیٹ بھرنے کے لیے اسی طرح گوشت چرانا پڑے گا۔ یہ دونوں کمبخت گوشت خور نہ ہوتے تو اس باکس کے چار پانچ سو ڈالر آسانی سے مل جاتے۔“

”لگتا ہے سخت کڑکی ہے ان دنوں۔“ بیومنٹ مسکرایا۔

”بس تمہارا منصوبہ کامیاب ہوجائے۔“ یہ کہتے ہوئے یارنیل نے اس کی طرف دیکھا۔ ”دس پندرہ دن ہونے کو آئے، کہیں سے ایک ڈالر کا منہ دیکھنا بھی نصیب نہ ہوا۔“

”بہت جلد ڈالر ہی ڈالر ہوں گے۔“ بیومنٹ نے ذومعنی انداز میں کہا۔

ڈالر ملنے کا سن کر یارنیل کی باچھیں کھل گئیں۔ اس دوران وہ گھر کے سامنے پہنچ چکے تھے۔

اس ملاقات کے دو دن بعد، رات کی تاریکی میں

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

اور مارٹی کے ساتھ دھندا نہ کرنے کا کہا تو اس کے چہرے کا رنگ کیسا فق ہو گیا تھا۔''

یارنیل نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''تو کیا ہم دھندا مارٹی کے ساتھ ہی کریں گے۔''

''فی الحال تو اسے پریشان ہونے دو۔ میں بہت کچھ سوچ رہا ہوں۔'' یہ کہہ کر اس کی طرف دیکھا۔ ''بس! سیدھے چلتے رہو اور مجھے سوچنے دو کہ اب آگے کیا اور کیسے کرنا ہوگا۔''

یارنیل سوچ میں پڑ گیا۔ کوٹ کی جیب میں تقریباً بھری ہوئی بوتل تھی اور اس کا پارٹنر سوچ و بچار کی بات کر رہا تھا۔ اس نے بیومنٹ سے دور ہو کر اپنی بوتل کے ساتھ وقت بتانے کا فیصلہ کیا۔ ''میرا خیال ہے کہ اس وقت تمہیں تنہائی کی ضرورت ہوگی۔''

بیومنٹ نے اسے گھورا۔

''میرا مطلب یہ تھا کہ......'' یارنیل اس کے گھورنے سے گھبرایا گیا تھا۔ ''میں بہت تھک گیا ہوں۔ کچھ دیر تنہائی میں بیٹھنا چاہتا ہوں۔''

اس وقت تک دونوں چوراہے تک پہنچ چکے تھے۔

''تو ٹھیک ہے، فی الحال تم اپنے راستے پر اور میں اپنے۔'' یہ کہتے ہوئے بیومنٹ رکا اور چوراہے کے دونوں جانب دیکھنے لگا۔

''یہ ہوئی نا بات......'' یارنیل خوشی سے اچھل پڑا۔

سڑک پر ٹریفک بہت کم اور زیبرا کراسنگ عبور کرنے کا نشان روشن تھا۔

بیومنٹ نے سڑک عبور کی اور شمال میں بنے وسیع و عریض سٹی پارک کی طرف بڑھ گیا۔ وہ اکثر و بیشتر وہاں جاتا تھا۔ پارک میں کھیلتے بچے اسے اچھے لگتے تھے۔ اسے پارک کے سبزہ زار کے بیچوں بیچ واک کے لیے بنی پختہ راہداریوں پر گھومنے پھرنے میں بہت مزہ آتا تھا۔

یارنیل اسے شمال کی سمت جاتا دیکھ کر ہی سمجھ گیا تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہوگا۔ مارٹی کے ساتھ بات بگڑنے کے بعد اسے یقین تھا کہ بیومنٹ چوری کا مال خریدنے والے کسی دوسرے 'بزنس مین' کی تلاش میں ہی وہاں گیا ہوگا۔ ایک چور کی حیثیت سے وہ جانتا تھا کہ سٹی پارک جیسا عوامی مقام چوروں اور ان سے مال کے خریداروں کا پسندیدہ مقام تھا۔ ویسے بھی وہ عالمی یوم مزدور پر چھٹی کا دن تھا۔ یارنیل دعا کر رہا تھا کہ بیومنٹ کو مارٹی کا نعم البدل مل جائے۔

بیومنٹ کے جانے کے بعد وہ کچھ دیر تک چوراہے پر رکا اِدھر اُدھر دیکھتا رہا اور پھر سب وے کی طرف بڑھ گیا۔ راستے سے برگر لیا اور اسٹیشن کے سامنے سے گزرتا ہوا، دریا کنارے بنے اپنے چھوٹے سے لیکن صاف ستھرے فلیٹ میں پہنچ گیا۔

اگلے چند روز تک بیومنٹ نے یارنیل سے کوئی رابطہ نہیں کیا۔ اس کا موبائل فون بھی بند جا رہا تھا۔ اس نے وائس میل باکس پر کئی پیغام چھوڑے لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ ان دونوں کے درمیان آخری رابطے کو بھی ایک ہفتہ گزر چکا تھا۔

اس دن صبح کے چھ بج رہے تھے۔ وہ دو دن سے اس صبح کا منتظر تھا۔ یارنیل نے سفید ایپرن پہنا اور سر پر پیپر ہیٹ اوڑھ کر برابر کی مارکیٹ کے پارکنگ ایریا میں کھڑے گوشت کی ڈلیوری دینے والے ٹرک کے پیچھے پہنچ گیا۔ اس وقت گوشت ڈلیور کرنے والے مزدور سامنے کے ریستوران میں مال پہنچانے کے لیے اندر جا چکے تھے۔ اس نے چند قدم آگے بڑھائے اور ریستوران کے داخلی دروازے سے اندر کی طرف جھانکا۔ سامنے کچن تھا۔ ڈلیوری بوائز وہیں تھے۔ وہ تیزی سے پلٹا اور ٹرک کے عقب میں پہنچ کر دروازہ کھولا۔ ابھی وہ گوشت سے بھرا باکس لے کر اترنے ہی والا تھا کہ ٹرک چل پڑا۔ وہ وہیں جم کر بیٹھ گیا۔ کچھ آگے جا کر سگنل پر ٹرک رکا تو اس نے نہایت آہستہ سے دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ اردگرد کوئی نہ تھا۔ وہ جھٹکے سے اترا اور گوشت کا باکس لے کے فٹ پاتھ پر اتنے سکون سے آگے بڑھنے لگا جیسے وہ چوری کر کے نہیں آ رہا بلکہ کہیں ڈلیوری دینے جا رہا ہو۔ صبح کے اس وقت سڑک پر اِکا دُکا لوگ ہی آ جا رہے تھے۔ کسی کی توجہ اس پر نہ تھی۔ اچانک کسی نے پیچھے سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اس کا دل دھک کر کے رہ گیا۔ لمحہ بھر میں وہ خود کو دوڑنے کے لیے ذہنی طور پر تیار کر چکا تھا۔ اس نے تیزی سے پلٹ کر دیکھا۔ اگلے ہی لمحے دوڑنے کا ارادہ دم توڑ چکا تھا۔

''لاؤ یہ باکس مجھے دے دو۔'' سامنے بیومنٹ کھڑا تھا۔ ''یہ ایپرن اور ہیٹ اتار کر پھینکو، کام ہو چکا۔''

یارنیل مسکرایا۔

''بڑا بھاری ہے۔'' بیومنٹ نے باکس تھامتے ہوئے کہا۔ ''اتنا زیادہ گوشت کھانا تمہارے ہاضمے کے لیے ٹھیک نہیں ہوگا۔''

''کہاں غائب تھے ہفتہ بھر۔'' یارنیل نے فٹ پاتھ کے ساتھ رکھے ڈسٹ بن میں ایپرن اور ہیٹ پھینکتے

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

ہوئے پوچھا۔ ”نہ کوئی فون، نہ ای میل، میرے وائس میل تک کا جواب نہیں دیا۔“ اس نے شکایتی لہجے میں بات مکمل کر کے اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

”کچھ سوچنا تھا، کچھ دیکھنا تھا۔“ بیومنٹ نے مختصر جواب دیا۔

”دیکھ لیا اور سوچ لیا۔“ یارنیل نے پھر سوال کر دیا۔

”ہاں......“ بیومنٹ نے اس کی طرف دیکھا۔ ”اچھی طرح چھان پھٹک کر لی، ایک دکان بھی دیکھ لی، اس میں تمہیں بھی دلچسپی ہوگی۔“

”سب طے کر لیا۔“

”بالکل......“ بیومنٹ مسکرایا۔ ”منصوبہ تیار ہے۔“

”کیا منصوبہ ہے۔“ یارنیل کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

”پہلے تو یہ اپنا مال سنبھالو۔“ بیومنٹ نے باکس اس کی طرف بڑھایا۔ ”تمہارے گھر چلتے ہیں، وہیں بیٹھ کر تفصیل سے بتاتا ہوں۔“

”لاؤ......“ یارنیل نے باکس تھام لیا۔

”کافی وزنی ہے بھئی۔“ بیومنٹ نے اپنے دونوں بازو جھٹکتے ہوئے کہا۔ ”کتنے مل جائیں گے اس سے۔“

”دو کوڑی بھی نہیں۔“ یارنیل نے جھلائے لہجے میں جواب دیا۔ ”بیوی کچھ کرتی نہیں، اوپر سے اپنے بھتیجے کو گھر لا کر رکھ لیا ہے۔ ایک تو اسے کوئی نوکری نہیں مل رہی، اوپر سے گھوڑے کی طرح کھاتا ہے۔ میرا تو دیوالیا نکلنے والا ہے۔“ وہ اپنے گھر کے حالات سے کافی جلا بھنا لگ رہا تھا۔

”لگتا ہے اب ان دونوں کا پیٹ بھرنے کے لیے اسی طرح گوشت چرانا پڑے گا۔ یہ دونوں کمبخت گوشت خور نہ ہوتے تو اس باکس کے چار پانچ سو ڈالر آسانی سے مل جاتے۔“

”لگتا ہے سخت کڑکی ہے ان دنوں۔“ بیومنٹ مسکرایا۔

”بس تمہارا منصوبہ کامیاب ہو جائے۔“ یہ کہتے ہوئے یارنیل نے اس کی طرف دیکھا۔ ”دس پندرہ دن ہونے کو آئے، کہیں سے ایک ڈالر کا منہ دیکھنا بھی نصیب نہ ہوا۔“

”بہت جلد ڈالر ہی ڈالر ہوں گے۔“ بیومنٹ نے ذو معنی انداز میں کہا۔

ڈالر ملنے کا سن کر یارنیل کی باچھیں کھل گئیں۔ اس دوران وہ گھر کے سامنے پہنچ چکے تھے۔

اس ملاقات کے دو دن بعد، رات کی تاریکی میں

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

یارنیل تنگ ڈھلوانی راستے پر آگے بڑھ رہا تھا۔ چاروں طرف سناٹے کا راج تھا لیکن پھر بھی وہ بڑی احتیاط سے قدم اٹھا رہا تھا۔ اس کے ایک کندھے سے بڑا سا پیراشوٹ بیگ لٹک رہا تھا۔ دوسرے پر اس نے بڑی سی المونیم کی سیڑھی فولڈ کر کے لٹکائی ہوئی تھی۔ اس کی پوری کوشش تھی کہ کوئی آواز نہ ہو مگر سیڑھی پرانی تھی۔ ہر قدم پر اس سے کھڑکھڑانے کی آواز نکل رہی تھی۔ اس سے وہ خاصا پریشان تھا۔ ''اگلی بار نئی سیڑھی خریدنا پڑے گی۔'' وہ بڑبڑایا۔

بیومنٹ سیڑھی کے شور کو دبانے کے لیے اونچی آواز میں گاتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ یارنیل کو یقین تھا کہ اس کے گانے اور چلانے سے ذمّے دار شہری ضروری خبردار ہو جائیں گے اور ان میں سے کچھ فرض شناس ضرور پولیس کو فون بھی کر دیں گے۔ ویسے اسے شہریوں سے اتنی زیادہ ذمّے داری کی امید نہ تھی۔ وہ اگر خود ان کی جگہ ہوتا تو سرد رات میں گرم بستر سے نکل کر باہر جھانکنے کے بجائے کروٹ بدل کر لحاف دبوچ کر، دوبارہ سونے کی کوشش کرتا۔

اسی دوران کسی عمارت کے مکین نے ذمّے داری کا ثبوت دینے کے بجائے غصے کا اظہار اپنی بندوق سے کیا۔ یارنیل اگر تجربہ کار چور نہ ہوتا اور ایسے حالات سے نمٹنے کے گر نہ جانتا ہوتا تو شاید گولی کا نشانہ بن جاتا۔ اس علاقے کے مکینوں کی اکثریت کے پاس کسی نہ کسی قسم کا اسلحہ ضرور تھا۔

اس راستے پر کچھ آگے بڑھنے کے بعد بیومنٹ رکا اور پیچھے آتے ہوئے یارنیل کو ایک سنگل اسٹوری بلڈنگ کی عقبی دیوار کے ساتھ سیڑھی لگانے کا اشارہ دیا۔ اس نے کندھے سے لٹکتی سیڑھی اتار کر دیوار سے لگائی اور تھیلا کھول کر رسی کا بڑا سا گچھا نکالا۔ اوپر پہنچ کر اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ حالات سازگار تھے۔ اس نے رسی کھولی اور اس سے منسلک ہک کو دیوار میں پھنسا کر رسی کو جھٹکے دیے۔ مطمئن ہو کر اس نے گچھا نیچے پھینک دیا۔ اب دیوار سے نیچے زمین تک رسی لٹک رہی تھی۔ یارنیل ہمیشہ حفاظتی نقطۂ نظر سے فرار کا متبادل انتظام ضرور تیار رکھتا تھا۔

اس کے پیچھے پیچھے بیومنٹ نے سیڑھی کے راستے اوپر چڑھنا شروع کیا۔ ''مضبوطی سے پکڑے رکھنا۔'' وہ آدھے راستے میں تھا کہ سیڑھی زور سے ہلی لیکن اس نے توازن بگڑنے نہ دیا۔ اس کے کندھے سے بھی نقب زنی کے ضروری سامان والا سیاہ پیراشوٹ کا تھیلا لٹک رہا تھا۔

چند لمحوں بعد وہ دونوں بلڈنگ کی چھت پر تھے۔

''سیڑھی اوپر کھینچ لو، کسی کو شک نہیں ہونا چاہیے۔'' بیومنٹ نے یارنیل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''آرام سے کھینچنا، شور نہ ہونے پائے۔'' دبی دبی آواز میں تاکید کر کے وہ آگے بڑھا۔

یارنیل نے بڑی احتیاط سے سیڑھی کھینچ کر چھت پر ڈال دی اور یہ دیکھنے کے لیے کہ بیومنٹ کیا کر رہا ہے، جھکتا ہوا آگے بڑھا۔

''میں نے یہ جگہ منتخب کی ہے۔'' بیومنٹ نے انگلی کے اشارے سے چھت کے ایک حصے کی طرف اشارہ کیا۔

یارنیل نے تائید میں سر ہلایا۔

اس دوران بیومنٹ نے اپنے تھیلے سے اسپرے اور پینٹ کا ڈبا نکالا اور چھت پر ایک دائرہ بنایا۔ ''تم مجھ پر پیراشوٹ ٹینٹ اور ایک دو کمبل اوپر سے ڈال دو تاکہ چھت کاٹنے کی آواز اور ٹارچ کی روشنی باہر نہ نکلے۔ یہ کہہ کر اس نے بیگ میں ہاتھ ڈالا اور کنکریٹ کی چھت کاٹنے والا آرا نکالا۔ وہ بیٹری اور بجلی، دونوں سے چلتا تھا۔

بیومنٹ نے چھت کاٹنا شروع کی۔ آرے سے آواز ہو رہی تھی لیکن کمبلوں کی وجہ سے وہ خاصی دب گئی تھی۔ یارنیل کنکریٹ کے ٹکڑوں کو ایک طرف کیے جا رہا تھا۔ ڈھیر آہستہ آہستہ بڑا ہوتا گیا، آخر کار چھت میں اتنا بڑا سوراخ ہو گیا تھا جس سے ایک آدمی بہ آسانی اندر اتر سکتا تھا۔

''سیڑھی لا کر نیچے لٹکاؤ۔'' بیومنٹ نے دبی آواز میں یارنیل کو ہدایت کی اور خود ٹارچ بند کر کے اپنے اوپر سے کمبل ہٹائے اور سارا سامان واپس تھیلے میں رکھنا شروع کر دیا۔

یارنیل اپنی جگہ اکڑوں بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا۔ ''جاؤ، انتظار کس بات کا ہے۔'' بیومنٹ نے زچ ہو کر کہا۔ ''اب تک تو سیڑھی لگ جانی چاہیے تھی۔''

''تمہیں پکا یقین ہے کہ نیچے اترو گے تو الارم نہیں بجے گا۔'' یارنیل ہمیشہ تصویر کا دوسرا رخ دیکھنے کا عادی تھا۔

''بالکل......'' بیومنٹ نے اطمینان سے جواب دیا۔

''میرا دوست ہے نا دکان دار، وہیں سے یہ الارم خریدا گیا تھا۔ خود اس نے بتایا تھا کہ وہ بہت گھٹیا معیار کا ہے۔ اس سے خوف کھانے کی ضرورت نہیں۔''

یارنیل نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

''تمام دروازوں اور کھڑکیوں پر الارم نصب ہیں لیکن عام طور پر اندر آنے اور باہر جانے والے دروازوں پر خاص توجہ دی گئی ہے تاکہ چوروں کو داخل ہونے یا

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

دروازہ توڑنے سے روکا جا سکے۔'' بیومنٹ نے اپنے پارٹنر کے خدشات دور کرنے کے لیے یقین دلانے کی کوشش کی۔ وہ جانتا تھا کہ یارنیل اچھی طرح مطمئن ہوئے بغیر ایک قدم بھی نہیں اٹھائے گا۔

''لیکن تجوری والے عقبی کمرے سے متعلق تمہارا کیا خیال ہے۔'' یارنیل سیڑھی لٹکانے کے بجائے سوال پہ سوال کیے جا رہا تھا۔

''تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔'' بیومنٹ نے تسلی دی۔ ''میں نے تجوری والے کمرے کے الارم کا کوڈ حاصل کر لیا ہے۔''

یارنیل نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

''روایتی طور پر الارم پیڈ دروازے کے ساتھ داہنی طرف ہوتا ہے۔'' اس احمق نے تجوری والے کمرے کا الارم پیڈ دیوار پر کھلا ہی رہنے دیا ہے۔ شاید وہ سمجھتا ہوگا کہ اس کی غلطی نقصان دہ نہیں۔'' بیومنٹ نے مسکرا کر اسے مطمئن کرنے کی بھرپور کوشش کی۔

''تمہیں الارم کوڈ کیسے ملا؟'' یارنیل نے ایک اور سوال داغ دیا۔

''بہت آسانی سے......'' بیومنٹ نے جواب دیا۔ ''تم نے دیکھا نہیں کہ ہمارا دوست چکنائی میں لتھڑے سینڈوچز کھاتے ہوئے اکثر الارم بٹن دبا کر کوڈ آن آف کرتا رہتا ہے۔ سیدھی سی بات ہے چار ہندسوں پر مشتمل کوڈ والے بٹن پر لگی چکنائی سے صاف پتا چلتا ہے کہ کون سے بٹن دبائے جاتے ہوں گے۔ ذرا سا الٹ پلٹ کر دیکھو، کام بن جائے گا۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنے پارٹنر کی طرف دیکھا۔ ''میں نے بھی ایسا ہی کیا۔ کوڈ ہاتھ میں...... ذہانت کی بات ہے ساری۔'' وہ اسے دیکھ کر مسکرایا۔

یارنیل نے اطمینان سے گردن ہلائی اور جھکا جھکا آگے بڑھا۔ چند لمحوں بعد وہ چھت میں بنائے گئے سوراخ سے سیڑھی نیچے لٹکا رہا تھا۔

''اپنا تھیلا اٹھا کر نیچے اترو۔'' بیومنٹ نے اسے حکم دیا۔

یارنیل نے تھیلا اٹھایا لیکن سیڑھی پر قدم رکھتے رکھتے رک گیا۔ ''اگر نیچے کتے ہوئے تو......''

''نہیں ہیں......'' بیومنٹ نے جھلاتے ہوئے کہا۔ ''وہ اتنا کنجوس ہے کہ چوکیداری کے لیے رکھے گئے کتوں کی خوراک کو فضول خرچی شمار کرتا ہوگا۔ اس لیے یقین ہے نیچے کتے نہیں ہوں گے۔'' اس نے یقین دلانے کی کوشش کی۔ ''اگر پھر بھی تمہیں کوئی خوف ہے تو کوئی بات نہیں......'' یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا تھیلا تھاما۔ ''تم ہٹو، پہلے میں نیچے جاتا ہوں۔''

آخر کار بیومنٹ کے پیچھے پیچھے یارنیل بھی نیچے اتر آیا۔ اس نے لاسٹک سے سر پر بندھی ریڈنگ لائٹ روشن کی۔ سامنے سامان سے بھرے شیشے کے کئی شیلف ترتیب سے رکھے تھے۔

''یہاں......'' بیومنٹ نے سرگوشی کی۔ ''تھوڑا پیچھے کی طرف آؤ۔''

وہ کمرا کسی کباڑی کی دکان جیسا منظر پیش کر رہا تھا۔ یارنیل سر سے بندھی لائٹ کی روشنی میں احتیاط سے اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا عقبی کمرے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ہر قدم پر وہ کسی نہ کسی شے سے ٹکرا جاتا تھا۔ اس کا دماغ اب بھی کتوں میں الجھا ہوا تھا۔ وہ بہت احتیاط برتنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسی دوران اس کے دماغ میں ایک اور خیال آیا۔ اس نے سوچا کہ دکان کا مالک بہت کنجوس ہے تو کہیں اس نے کتوں کے بجائے سانپ نہ پال رکھے ہوں جو رات بھر فرش پر اِدھر سے اُدھر رینگتے پھرتے ہوں۔ یہ سوچتے ہی اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ دوڑنے لگی۔ ''اب تو بہت زیادہ احتیاط کرنا پڑے گی۔'' اس نے زیرِلب کہا۔

''اُدھر...... ہمیں اُدھر جانا ہے۔'' بیومنٹ نے سرگوشی کرتے ہوئے انگلی سے اشارہ کیا۔ اگلے ہی لمحے وہ ٹارچ کی روشنی میں الارم پیڈ کو دیکھ رہا تھا۔

''یہی ہے وہ۔'' یارنیل نے سرگوشی کی۔

وہ اثبات میں سر ہلا کر الارم کا کوڈ بٹن دبانے لگا۔

''اگر تم نے غلط بٹن دبا دیے تو کیا ہوگا۔'' یارنیل نے سوال کیا۔ اس کے لہجے سے تشویش عیاں تھی۔

''الارم سے بپ سنائی دے گی۔'' بیومنٹ نے الارم پیڈ سے نظریں ہٹائے بغیر کہنا شروع کیا۔ ''اس کے بعد ہمارے پاس درست کوڈ داخل کرنے کے لیے صرف ساٹھ سیکنڈ ہوں گے۔''

بیومنٹ نے جیسے ہی چوتھا بٹن دبایا، ایک بپ سنائی دی اور اس کے ساتھ ہی الارم پر سرخ رنگ کا لیبل روشن ہو گیا...... 'خبردار'۔

''جلدی کرو......'' یارنیل بپ سنتے ہی بدحواس ہو گیا۔ ''دوبارہ کوشش کرو۔'' اس نے سرگوشی میں کہا لیکن پھر بھی اس کی آواز کافی اونچی تھی۔

''کر تو رہا ہوں۔'' بیومنٹ نے جھلا کر کہا۔ ''سمجھا تھا کہ پہلی کوشش میں ہی کام بن جائے گا مگر......'' اس نے

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

بات ادھوری چھوڑ دی۔ وہ کسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

''اس سے پہلے کہ وقت گزر جائے، جلدی کرلو۔''

یارنیل الارم بجنے کے بعد کی ممکنہ صورتِ حال کے بارے میں سوچ سوچ کر پریشان ہو رہا تھا۔

بیومنٹ بڑے غور سے الارم پیڈ کو دیکھ رہا تھا۔ الارم کے ساتھ نصب وارننگ اسٹاپ واچ پر سیکنڈوں کی شکل میں بدلتے ہندسے ایک منٹ کا وقت تیزی سے ختم ہونے کی اطلاع دے رہے تھے۔ کچھ سوچ کر اس نے ہاتھ بڑھایا۔ اس کی شہادت کی انگلی بٹن دبانے جا رہی تھی۔ ''اب کام بن جائے گا۔'' اس کے لہجے سے امید جھلک رہی تھی۔

''اگر اس بار بھی یہ کام نہ کرے تو میرے پیچھے دوڑ لگا دینا۔'' یارنیل نے مشورہ دیا۔ وہ سیڑھی کی طرف بھاگنے کو تیار کھڑا تھا۔

''آرام سے......'' بیومنٹ نے آخری بٹن دبایا۔

یارنیل کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ وہ دوڑنے کو تیار تھا۔ اسے خدشہ تھا کہ بس کسی بھی لمحے الارم بجنے لگے گا مگر ایسا نہ ہوا۔ الارم کا سرخ لیبل غائب ہوا اور سبز لائٹ روشن ہوگئی۔ کوڈ ورڈ درست تھا۔ لاک کھل گیا۔

ہلکی سی کلک کے ساتھ ہی دروازے کا لاک ہٹا تو بیومنٹ کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ یارنیل نے اطمینان بھرا گہرا سانس لیا۔ وہ مڑ کر دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''تم دروازے کو پکڑے رکھو۔'' بیومنٹ اس سے مخاطب تھا۔ ''کہیں بند نہ ہو جائے۔'' یہ کہہ کر وہ اپنے تھیلے سے کچھ اوزار نکالنے لگا۔

یارنیل دروازہ تھامے کھڑا تھا اور بیومنٹ اس کے لاک کو ناکارہ بنا رہا تھا تاکہ وہ اگر اندر جائیں اور غلطی سے دروازہ بند ہوگیا تو کہیں وہ ہی اندر بند نہ ہو جائیں۔

''اندر چلو......'' بیومنٹ نے اوزار واپس بیگ میں ڈالے۔ ''الیکٹرانک لاک اور الارم لگا کر اس نے یہ سمجھ لیا تھا کہ سب کچھ محفوظ ہے۔'' وہ طنزیہ ہنسی ہنسا۔ ''بے وقوف کہیں کا......''

یہ سن کر یارنیل نے بھی قہقہہ لگا دیا۔ ''واقعی اس کے بارے میں تو یہی لقب فٹ بیٹھتا ہے۔''

یارنیل اس کے پیچھے پیچھے کمرے میں داخل ہوا۔ ہر طرف بڑی بڑی الماریوں میں قیمتی سامان بھرا تھا۔ یہ یا تو چوری کا خریدا مال تھا یا پھر لوگوں کا رہن رکھا سامان۔

''کیا کچھ جمع کر رکھا ہے اس کنجوس نے......'' بیومنٹ نے ایک الماری کا لاک توڑتے ہوئے کہا۔ ''جلدی جلدی قیمتی سامان تھیلوں میں بھرنا شروع کر دو۔''

تقریباً پندرہ منٹ کے اندر سارا قیمتی اور ہاتھوں ہاتھ چور بازار میں بکنے والا سامان ان دونوں کے بڑے بڑے تھیلوں میں منتقل ہو چکا تھا۔ کام مکمل کر کے دونوں کمرے کے وسط میں کھڑے ہوئے اور ٹارچ کی روشنی میں کمرے کا جائزہ لینے لگے۔ وہاں جو کچھ تھا، سب تھیلوں میں پہنچ چکا تھا۔ اب کمرے میں صرف خالی الماریاں تھیں اور ایک پرانے دور کی تجوری۔

''اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟'' یارنیل نے ٹارچ کی روشنی تجوری پر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

بیومنٹ کچھ دیر کھڑا خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ ''اگر اس کا لاک توڑنے کی کوشش کی تو کافی شور ہوگا۔'' کچھ توقف کے بعد اس نے کہنا شروع کیا۔ ''بہت پرانی لگتی ہے، اس کا لاک بھی کافی مضبوط ہوگا۔'' اس نے تجوری کا ہینڈل پکڑ کر اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔

''تم ٹھیک کہتے ہو۔'' یارنیل نے اپنے پارٹنر کی تائید کی۔ ''چھینی اور ہتھوڑے سے ہی کام بن سکتا ہے۔ یہ دونوں بھی ہیں مگر......'' اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''مگر شور......'' بیومنٹ نے تصدیق چاہی۔

''وہ تو ہوگا ہی۔'' یارنیل نے سر ہلایا اور پھر ایک دم اسے خیال آیا۔ ''میرے پاس اس طرح کی تجوری کاٹنے کے لیے ایک آری ہے۔''

''واقعی......'' بیومنٹ نے حیرانی سے کہا۔

یارنیل جھکا اور تھیلے سے فولاد کاٹنے والی آری نکالی۔

''اس سے ہم تہ در تہ فولاد کی سطح کاٹ کر تجوری کے اندر رکھے مال تک پہنچ سکتے ہیں۔ پرانے زمانے سے ہی تجوریاں کاٹنے کا یہ طریقہ نہایت کارگر ہے۔''

''آگے بڑھو......'' بیومنٹ نے تیزی سے کہا۔ ''ہمیں یہ کام جتنی جلد ہو سکے، نمٹا دینا چاہیے۔''

تھوڑی دیر بعد تجوری کٹ رہی تھی۔ اچھی بات یہ تھی کہ اس سے اتنی زیادہ آواز پیدا نہیں ہو رہی تھی کہ باہر تک جا سکے۔ ایک گھنٹے کے اندر تجوری کٹ چکی تھی۔ اندر قیمتی چیزیں اور دستاویزات رکھی تھیں۔

دونوں کے بیگ تقریباً بھر چکے تھے لیکن یارنیل نے تجوری میں رکھا سارا سامان ٹھونس ٹھانس کر کسی نہ کسی طرح اپنے تھیلے کا منہ بند کر لیا تھا۔ کام مکمل کر کے اس نے ایک بار پھر ٹارچ کی روشنی تجوری کے اندر ڈالی۔ وہاں دو گفٹ باکس

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

تھے۔ اس نے دونوں اٹھا لیے۔

"یہ کیا ہے؟" بیومنٹ نے نظر دوڑائی۔ باکس پر ٹیگ لگے ہوئے تھے، جن پر مخفف الفاظ میں لکھا تھا: "ایس او بی"۔

"ان کا کیا کرنا ہے؟" گفٹ باکس میں اس کی دلچسپی دیکھ کر یارنیل نے پوچھا۔ دونوں باکس خالی تھے۔

یارنیل اسے حیرانی سے دیکھے جا رہا تھا۔

"انہیں بھی رکھ لو۔" بیومنٹ نے سر جھٹک کر کہا۔ "میرے فلیٹ پر پہنچ کر دیکھیں گے کہ یہ کیا ہے۔"

کام مکمل ہو چکا تھا۔ اب واپسی کی تیاری تھی۔

کچھ دیر بعد وہ اسی راستے سے واپس جا رہے تھے، جہاں سے آئے تھے۔ آسمان ابر آلود اور سڑکوں پر سناٹا تھا۔ وہ گھروں کی قطار کے عقب سے چھپتے چھپاتے آگے بڑھ رہے تھے۔ ان کے پاس کافی وزن تھا اس لیے چلنے کی رفتار بھی بہت دھیمی تھی۔

"ہم نے تو اپنے پیچھے چوہوں کے لیے بھی کچھ نہیں چھوڑا۔" کامیاب چوری کے بعد یارنیل کا دل خوشی کے مارے اچھل رہا تھا۔ "خاصا مال ہاتھ لگا ہے۔" اس نے سرگوشی میں بات مکمل کی۔

"میرا خیال ہے کہ اتنا مال ملنے کے بعد کچھ عرصے تک تمہیں اپنے کھاؤ اور بے روزگار بھتیجے کا بوجھ زیادہ محسوس نہیں ہوگا۔" بیومنٹ نے پیار بھرے لہجے میں طنز کیا تو وہ مسکرا دیا۔

....

"اسے چھوڑ بھی تو نہیں سکتا، میری جان ہے۔" یارنیل نے جواب دیا۔ "اب پیار کی خاطر اس کے نکمے بھتیجے کو بھی برداشت تو کرنا ہی پڑے گا۔"

کچھ دیر بعد دونوں ویرانے میں کھڑی اسٹیشن ویگن میں سارا سامان لاد کر واپس جا رہے تھے۔

چوری کو ایک ہفتہ گزر چکا تھا۔

ایک روز بیومنٹ نے مارٹی کو فون کر کے یوکرین بار کے کیبن میں ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ اس نے مارٹی کو بتایا کہ وہ اپنا کمیشن تین سے دس فیصد تک لانے کے لیے ایک ایسا حل پیش کرنا چاہتے ہیں جو تینوں کے لیے قابل قبول ہوگا۔ یہ سن کر مارٹی نے بہت پس و پیش کی، مارکیٹ کی مندی کا رونا رویا لیکن وہ بھی اپنی بات پر اڑا رہا۔ آخر مارٹی اس شرط پر مان گیا کہ اس ملاقات میں چوروں کی یونین سازی کے حوالے سے کوئی تذکرہ نہیں ہوگا۔ بیومنٹ نے اس کی شرط مان لی۔

مکینک

ایک سردار نے روڈ پر کھڑی کار کے نیچے کتے کو لیٹا ہوا دیکھا تو کتے کو دم سے پکڑ کر کھینچا اور بولا۔ "باہر نکل، بڑا آیا مکینک کا بچہ۔"

معصومیت

دولہا، دلہن سے۔ "تمہارا شادی سے پہلے کوئی بوائے فرینڈ تھا؟"

دولہن خاموش۔

دولہا چلا کے بولا۔ "میں اس خاموشی کو کیا سمجھوں؟"

دلہن۔ "توبہ ہے، گن تو رہی ہوں۔"

حل

دو لڑکیاں بس میں ایک سیٹ کے لیے لڑ رہی تھیں کہ وہ پہلے آئی ہے۔ ایک لڑکا کافی دیر سے یہ تماشا دیکھ رہا تھا، وہ بولا۔

"کیوں لڑ رہی ہو۔ اس کا حل میں تم کو بتاتا ہوں۔ تم میں سے جو عمر میں بڑی ہے، وہ بیٹھ جائے۔"

دونوں لڑکیاں پورے رستے کھڑی رہیں۔

ملاقات کے لیے طے شدہ دن پر بیومنٹ اور یارنیل وقت سے پہلے بار میں پہنچ گئے تھے۔ دراصل وہ دونوں اسی کیبن میں بیٹھنا چاہتے تھے، جہاں دس پندرہ دن پہلے مارٹی کے ساتھ اُن کی آخری ملاقات ہوئی تھی۔ خوش قسمتی سے وہ انہیں خالی مل گیا۔ دونوں موٹے پیازی شیشے کی دیوار کے ساتھ اس زاویے سے بیٹھے تھے کہ بار کے اندر آنے والا کوئی شخص ان کی نگاہوں سے بچ نہیں سکتا تھا۔

بیٹھتے ہی یارنیل نے ویٹرس کو بلایا۔ مشرقی یورپ کی اس حسین ویٹرس مارگریٹا کا سلواکیہ لہجہ اسے بہت دلکش لگتا تھا۔ خاص طور پر یارنیل اس وقت جھوم اٹھتا تھا جب وہ بڑے چاؤ سے کمر لچکا کر، چہرہ اس کی طرف جھکا کر کہتی تھی۔

"ماٹو...... بتاؤ کیا چاہیے۔"

یارنیل ووڈ کا نمبر تھری کی ایک بوتل آرڈر کر چکا تھا۔

پندرہ منٹ بعد مارٹی اندر داخل ہوا۔ وہ تیزی سے چلتا ہوا کیبن کی طرف آ رہا تھا۔ اس کی سانس پھول رہی تھی۔ وہ پندرہ منٹ لیٹ تھا اور یقیناً وقت پر پہنچنے کے لیے وہ تیز تیز چلتا ہوا پہنچا تھا۔ اس کے لیے یہی بڑی بات تھی کہ وہ دونوں ایک بار پھر اس کے ساتھ دھندے پر آمادہ ہو رہے تھے ورنہ وہ یونین کی بات سن کر دہل گیا تھا۔ ویسے

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

بھی حالات پلٹا کھا چکے تھے۔ پچھلے ہفتہ بھر سے وہ ان دونوں کی کمی شدت سے محسوس کر رہا تھا۔ ایک بار پھر پاؤں جمانے کے لیے اسے ان دونوں کی سخت ضرورت تھی۔ اگر دو چار روز اور بیومنٹ فون نہ کرتا تو وہ خود اسے فون کرنے والا تھا۔ بظاہر وہ اپنا ہاتھ اوپر رکھنا چاہتا تھا لیکن اندر سے ڈرا ہوا تھا۔ اسی لیے لگ بھگ دوڑتا ہوا پہنچا کہ کہیں وقت پر نہ پہنچا تو وہ پھر بدک نہ جائیں۔ وہ کیبن میں داخل ہوا تو دونوں کو دیکھ کر اس کی جان میں جان آئی۔

بنا ایک لفظ کہے مارٹی نے آنکھوں ہی آنکھوں میں پہلے اُن دونوں کو غور سے دیکھا اور پھر کیبن کا اچھی طرح جائزہ لیا۔ وہ کسی ان دیکھے خطرے سے بھی خوفزدہ تھا۔

''آؤ......'' بیومنٹ نے خالی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ کرسی کی پشت دروازے کے رخ پر تھی۔

''سوری......'' مارٹی آگے بڑھا اور کھڑکی کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھا۔ ''میں دروازہ اپنی نگاہوں کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔'' اس نے بات بنانے کی کوشش کی لیکن لہجے سے صاف عیاں تھا کہ فی الحال اسے ان دونوں پر اعتماد بالکل بھی نہ تھا۔ اسے ڈر تھا کہ یہ ملاقات اسے پھنسانے کے لیے ان دونوں کی کوئی چال نہ ہو۔

وہ دونوں بھی اُس کے خدشات بھانپ گئے تھے۔

''اطمینان رکھو......'' بیومنٹ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''میں دُکان دار ہوں، دروازہ نگاہوں کے سامنے رکھتا ہوں۔'' اس نے اپنے اندر کے شکوک چھپاتے ہوئے جواب دیا۔

''ہم دونوں یہاں تمہاری مدد کو آئے ہیں، تاکہ مسئلہ حل ہو سکے۔'' بیومنٹ نے اطمینان دلانے کے لیے کہا۔

مارٹی چونکا۔ ''مجھے کیا مسئلہ درپیش ہے، مجھے تو کوئی پریشانی نہیں۔'' وہ کسی طور یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ ان کے سامنے کمزور پڑ رہا ہے۔

بیومنٹ نے سنی ان سنی کر دی۔ ''ہم تمہاری پیاری محبت بھری زندگی سے بات شروع کرتے ہیں۔''

''معاف کیجیے......'' مارٹی نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔

بیومنٹ نے قطع کلامی نظر انداز کرتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔ ''میں اور یارنیل نے جب یونین بنانے کے لیے دوسرے لوگوں سے بات کرنے سے متعلق سوچا تو مارٹی یہ تم ہی تھے کہ......''

''میرے خیال میں ہم یہ پہلے ہی طے کر چکے تھے کہ چوروں کی یونین سازی کے حوالے سے کوئی بات نہیں ہوگی۔'' مارٹی نے اکھڑے لہجے میں کہا۔

''بالکل ٹھیک کہا تم نے......'' بیومنٹ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔ ''مگر بات یہ ہے کہ جب ہم دونوں نے یونین بنانے کے لیے دوسرے چوروں کے ساتھ رابطے شروع کیے، تب پتا چلا کہ چند رات پہلے تمہاری دُکان اور گودام کو نقب لگا کر لوٹا جا چکا ہے۔''

یہ سنتے ہی مارٹی تیزی سے اٹھا اور بیومنٹ کے پاس رک کر جھکا۔ ''تم کچھ جانتے ہو، یہ کس نے کیا۔'' وہ اُس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔

''یہ تمہیں نہیں بتا سکتا۔'' بیومنٹ نے چہرہ دوسری طرف کرتے ہوئے بے رخی سے جواب دیا۔ ''ویسے اگر تم سکون سے بیٹھو اور مہذب لوگوں کی طرح برتاؤ کرو تو شاید آگے چل کر میں یہ بھی تمہیں بتا دوں۔'' یہ کہہ کر اس نے گہری سانس لی اور مارٹی کی طرف دیکھا۔ ''تم مانو یا نہ مانو، آخر کو ہم ایک فیملی سے ہی ہیں۔''

یہ سن کر مارٹی پلٹا اور مرے مرے قدموں سے چلتا ہوا اپنی کرسی پر جا کر بیٹھ گیا۔ ''ویسے تم میری کیا مدد کر سکتے ہو؟'' اس بار اُس کا لہجہ مفاہمانہ تھا۔

''ہم تمہارا چوری شدہ سارا مال نہایت رعایتی داموں پر تمہیں واپس دلوا سکتے ہیں۔'' بیومنٹ نے اس کی طرف جھکتے ہوئے رازدارانہ لہجے میں کہا۔

''کس قیمت پر......'' مارٹی نے بھویں چڑھاتے پوچھا۔

''وہی......'' یہ کہہ کر بیومنٹ نے لمحہ بھر توقف کیا۔ ''پرانے دام یعنی کل مالیت کا دس فیصد۔''

''دس فیصد......'' مارٹی نے چہک کر کہا۔

''سوچ سمجھ کر بات کرو۔'' بیومنٹ نے ناگواری سے کہا۔ ''وہ اتنا مال اڑا چکے ہیں کہ دس فیصد کی کوئی اوقات ہی نہیں۔ وہ اس مال کو بیچ کر تمہاری جیسی شاندار زندگی بسر کر سکتے ہیں لیکن یہ تو میں اور یارنیل ہیں جن کی وجہ سے وہ دس فیصد پر آ چکے......''

''وہ بھی بڑی مشکل سے۔'' یارنیل نے اس کی بات کاٹتے ہوئے جملہ مکمل کر دیا۔ ''لیکن تم ہو کہ......'' یہ کہہ کر اس نے مایوسی سے گردن ہلائی۔

''بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے یہ۔'' بیومنٹ نے مارٹی کی طرف دیکھا۔ ''ہمارا اس سے کچھ لینا دینا نہیں، ہم تو یہ سچے دل سے صرف اس لیے کر رہے ہیں کہ آخر ایک فیملی ہیں ورنہ تو......''

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

''ورنہ کیا......'' مارٹی چونکا۔
''ہمیں تم سے یا تمہارے مال سے کیا لینا دینا ہے، صرف فیملی کے لیے یہ کام کرنے جا رہے ہیں۔'' بیومنٹ کا لہجہ افسردہ تھا۔
مارٹی خاموش تھا۔ اس کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ وہ کسی اُدھیڑ بن میں ہے۔ وہ چوری شدہ مال کی واپسی کے لیے دس فیصد کی رقم دینے کے لیے بیومنٹ کی تجویز سے متفق نظر نہیں آ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے منہ کھولا اور بے یقین نگاہوں سے ان دونوں کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا تم دونوں سارا مال واپس لے آؤ گے...... سب کچھ؟''
بیومنٹ نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''یقیناً......''
کیبن میں ایک بار پھر طویل خاموشی چھا گئی۔ کافی دیر بعد مارٹی نے لب کھولے اور بیومنٹ کو غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''او کے......'' یہ کہتے ہوئے اس نے بیومنٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ''ڈیل پکی......''
''لیکن ایک بات اور ہے......''
مارٹی یہ سن کر چونکا۔ ''وہ کیا......؟''
''آج کے بعد میں اور یارنیل جو سامان تمہارے پاس لائیں گے، تم کُل قیمت کا پندرہ فیصد ہمیں دو گے۔'' بیومنٹ نے ٹھہرے لہجے میں بتایا۔
''کیا تم پاگل ہو گئے ہو۔'' مارٹی کرسی پر تن کر بیٹھ گیا۔ وہ غصے میں نظر آ رہا تھا۔ ''کیا سمجھ رکھا ہے تم نے، کیا سوچ کر یہ بات کی۔'' یہ کہہ کر کرسی کی پشت سے سر ٹکایا اور منہ بنا کر بڑبڑایا۔ ''لو...... اب پندرہ فیصد دیا کروں۔''
بیومنٹ نے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک کارڈ نکالا۔ یہ گفٹ باکس پر لگایا جانے والا نیم کارڈ تھا۔ اس پر لکھا تھا 'او ایس بی'۔ اس نے نہایت احتیاط سے کارڈ مارٹی کی نگاہوں کے سامنے لہرایا۔ اس کی گرفت سخت تھی تاکہ مارٹی جھپٹا مار کر چھین نہ سکے۔ ''اسے پہچان سکتے ہو۔''
مارٹی آگے کی طرف جھکا اور کارڈ پر نظر ڈالی۔ اس کے چہرے کا رنگ بدلتا جا رہا تھا۔
بیومنٹ نے ہاتھ پیچھے کیا اور ٹھہرے لہجے میں کہنے لگا۔ ''مجھے یہ تمہاری تحریر لگتی ہے۔''
مارٹی نے کوئی جواب نہ دیا۔
''یہ اُس بڑے سے ہیرے کے نیکلس والے باکس پر تھا، جسے تم نے میری پیاری کزن اور اپنی بیوی کو تحفے میں دیا تھا۔''
مارٹی نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''کبھی کبھار ہر شوہر اپنی بیوی کو کوئی نہ کوئی تحفہ دیا ہی کرتا ہے۔''
''بالکل ٹھیک کہا تم نے۔'' بیومنٹ نے بات شروع کی۔ ''لیکن بیوی کے ساتھ ساتھ تم نے بالکل ویسا ہی دوسرا نیکلس اپنی اُس کے لیے بھی خریدا اور تحفے میں دیا۔'' بیومنٹ کے لہجے سے طنز صاف ظاہر تھا۔
''یہ کیا بکواس کر رہے ہو تم؟'' مارٹی نے طیش میں آ کر کہا۔ اس کی آواز خاصی اونچی تھی۔
یہ سنتے ہی اس بار یارنیل نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور دوسرا نیم ٹیگ والا کارڈ نکال کر اس کی نگاہوں کے سامنے لہرایا۔ ''اب میں اسے پڑھ کر بھی سناتا ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے کارڈ اپنی نگاہوں کے سامنے کیا اور کچھ توقف کے بعد بولا۔ ''میری پیاری......''
مارٹی تیزی سے اٹھا اور اس کے ہاتھ سے کارڈ چھیننے کی کوشش کی مگر بیومنٹ بھانپ چکا تھا۔ اس نے یہ کوشش ناکام بنا دی۔
مارٹی واپس اپنی کرسی پر بیٹھ چکا تھا۔ اس نے یارنیل کی طرف دیکھا۔ ''تمہیں اتنی اونچی آواز میں کارڈ نہیں پڑھنا چاہیے تھا۔'' یہ کہہ کر اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ''کوئی سن لیتا تو پھر۔ ویسے بھی یہ کسی کا نجی معاملہ ہے۔ تم دونوں کا اس سے کچھ لینا دینا نہیں۔'' اس کا انداز مصالحانہ تھا۔
''میں سوچ رہا ہوں کہ یہ کارڈ جب میری پیاری کزن اور تمہاری بیوی دیکھے گی تو اس کے دل پر کیا گزرے گی۔'' اتنا کہہ کر بیومنٹ نے کچھ توقف کیا اور پھر گمبھیر لہجے میں بولا۔ ''وہ تو ایک لمحے میں ہی تمہارے ہاتھ کی لکھی تحریر پہچان لے گی۔ برسوں کا ساتھ ہے تم دونوں کا۔ تمہارے ہاتھ کی تحریر تو وہ ضرور پہچان سکتی ہوگی۔''
''ٹھیک ہے۔'' مارٹی نے ان دونوں کی طرف بے بسی سے دیکھا۔ ''تم دونوں مجھ سے کیا چاہتے ہو؟''
''میں چاہتا ہوں کہ میرے اور میرے پارٹنر کے لیے......'' یہ کہتے ہوئے اس نے یارنیل پر نظر ڈالی۔ ''دونوں کا حصہ پندرہ، پندرہ فیصد ہوگا آج اور ابھی سے۔'' بیومنٹ نے دونوں کارڈ کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھتے ہوئے دوٹوک لہجے میں کہا۔
''تم مجھے مارنا چاہتے ہو؟'' مارٹی نے روہانسے لہجے میں کہا۔ ''میں تو سمجھا کہ تم یہ سب کچھ فیملی کے لیے کر رہے تھے مگر......'' اس نے نفرت سے منہ دوسری طرف پھیرتے ہوئے بات ادھوری چھوڑ دی۔
''ہم ایک فیملی ہیں اسی لیے صرف پندرہ فیصد۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

بیومنٹ نے روکھے لہجے میں کہنا شروع کیا۔ ''ورنہ تو ان حالات میں بات کہیں سے کہیں اور پہنچتی۔'' یہ کہہ کر اس نے مارٹی کی طرف دیکھا۔ ''لیکن فیملی کا بھی تو کچھ خیال کرنا ہے، اسی لیے صرف پندرہ فیصد۔'' یہ کہہ کر کچھ توقف کیا اور پھر مارٹی کی طرف جھکا۔ ''اب تم بتاؤ، کیا کہتے ہو؟''

مارٹی نے کھا جانے والی نگاہوں سے ان دونوں کو گھورا۔ ''ٹھیک ہے لیکن ایک بات اور......''

''بولو......'' دونوں نے بیک زبان کہا۔

''بیومنٹ تم......'' مارٹی نے انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''کبھی بھی اس کارڈ کے حوالے سے میری بیوی کو کچھ نہیں بتاؤ گے اور نہ ہم اس بارے میں کبھی کوئی خود بات کریں گے نہ ہی کسی اور سے۔''

دونوں نے اثبات میں سر ہلایا۔

''ایک اور بات......'' مارٹی نے انگلی سے دونوں کی طرف اشارہ کیا۔ آئندہ تم دونوں کبھی بھی چوروں کی یونین بنانے کی بات بھی زبان پر نہیں لاؤ گے۔''

''ہمیں منظور ہے۔'' یارنیل اور بیومنٹ دونوں یک زبان بول اٹھے۔

''میں پہلے ہی بہت مشکل میں ہوں، اب کوئی اور پریشانی مول نہیں لینا چاہتا۔'' یہ کہتا ہوا وہ کرسی سے اٹھا۔

''ٹھیک ہے۔'' دونوں نے اٹھ کر مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھائے مگر وہ انہیں نظر انداز کرتا ہوا کیبن سے نکل گیا۔

''اٹھو......'' بیومنٹ اپنی جگہ سے کھڑا ہوا۔ دونوں مسکرا رہے تھے۔

باہر نکلے تو بار کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ یارنیل لمحہ بھر کے لیے رکا اور مسکرا کر اپنی پسندیدہ ویٹرس کی طرف دیکھا اور ہاتھ ہلاتا ہوا آگے بڑھا۔ وہ اپنا کوٹ درست کرتے ہوئے باہر نکل رہا تھا۔

''ہاتھ دکھا آئے۔'' بیومنٹ اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

''اب رات کو بھی تو پیاس بجھانے کے لیے کچھ چاہیے، ڈالر تو ہنوز دور ہیں۔''

دونوں خوش خوش مارکیٹ روڈ سے گزرتے ہوئے سب وے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ''ایک بات سمجھ نہیں آئی۔'' یارنیل نے اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ ''کیا تم مارٹی کی دکان میں نقب زنی سے پہلے ہی یہ بات جانتے تھے کہ اُس نے دو مختلف عورتوں کے لیے نیکلس خریدے تھے؟''

''بالکل بھی نہیں۔'' بیومنٹ نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''یہ تو اتفاق تھا، جس سے ہم نے اپنا کام بنالیا۔''

''تم اُس عورت کو جانتے ہو؟''

''جب تک اُس خالی گفٹ پر غور نہیں کیا تھا، تب تک اُس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔'' بیومنٹ نے معنی خیز انداز میں کہنا شروع کیا۔ ''تمہیں یاد ہے، تجوری میں کچھ دستاویزات بھی تھیں۔''

''جنہیں تم بغور دیکھ رہے تھے۔'' یارنیل نے پوچھا۔

''وہی......'' بیومنٹ نے تائید کی۔ ''ان میں سے ایک فائل تھی، جس کے اوپر لکھا تھا 'ایس او بی' اور اندر اُن چیکس کی کاپیاں تھیں جو مختلف اوقات میں ایک ہی خاتون کے نام پر کاٹے گئے تھے۔ اسی سے پتا چلا کہ مارٹی کی وہ ڈارلنگ مس شیلا او نیل بٹلر تھی یعنی ایس او بی۔''

''عجیب بات ہے، کہاں ہم سے کمانے والا ہمیں ہی دس فیصد دینے سے انکاری تھا اور کہاں بیوی کے ہوتے ہوئے دوسری عورت پر لاکھوں اڑا رہا ہے۔'' یارنیل نے کہا۔ ''ٹھیک ہی روتا ہے وہ کہ خرچے بڑے ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ مسکرایا۔ ''واقعی مارٹی کے تو بڑے ہی خرچے ہیں۔''

''اب تو ہم بھی دل کھول کر خرچ کرنے کے قابل ہونے جا رہے ہیں۔'' بیومنٹ ہنسا۔

''اب یونین بنانے کا کیا کریں۔'' یارنیل نے پوچھا۔

''جب یونین بنائے بغیر ہی مندی کے دنوں میں آمدنی کئی سو گنا بڑھ چکی تو پھر یونین سازی میں کیوں سر کھپائیں۔'' بیومنٹ نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''فی الحال لاکھوں کی آمدنی ہونے جا رہی ہے۔ کہیں اچھی جگہ چھٹیاں گزارنے کی سوچو۔''

''واقعی...... یہ اچھا آئیڈیا ہے۔'' یارنیل نے مسرت بھرے لہجے میں جواب دیا۔

''تو سوچو......'' بس آچکی تھی۔ ''میں گھر جا رہا ہوں، پروگرام بنالو تو بتا دینا۔ کل چوری کا مال لوٹانے کے بعد تو پیسے اور فرصت، دونوں ہی وافر تعداد میں ہوں گے۔''

یارنیل نے زوردار قہقہہ لگایا۔ ''اکٹھے چلیں گے چھٹیوں پر۔''

بس چل پڑی تھی۔ بیومنٹ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے ہاتھ ہلایا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

DOWNLOADED FROM
PAKSOCIETY.COM

خونی اتفاق

سیریناراض

اچھے پڑوسی کا ساتھ کسی نعمت سے کم نہیں... خوشی غمی اور دکھ سکھ کے موسم میں آپ کے ہمراہ ہوں تو پھر کسی تیسرے کی ضرورت نہیں رہتی... ایسی ہی دو پڑوسنوں کا احوال... ایک پڑوسن کو زندگی میں صفائی... ترتیب اور قرینے کا سلیقہ عزیز تھا... جبکہ دوسری پھوہڑ تھی... اس کی ذات اور گھر میں بے ترتیبی کا راج تھا... مگر ایک واقعے نے دو متضاد ہستیوں کو یکجا کردیا...

چونکا دینے والے انجام سے مزین خونی اتفاقات کا ملاپ

وہ پیر کا دن تھا اور صبح کے ساڑھے دس بج چکے تھے مگر میرا کام اب تک ختم نہیں ہوا تھا۔ کچن کا فرش دھو رہی تھی۔ ایسی بات نہیں کہ اسے کافی عرصے سے نہیں دھویا گیا تھا، گزشتہ روز ہی اسے صاف کیا تھا لیکن یہ ایسی جگہ ہے... جو زیادہ جلد گندی ہو جاتی ہے اور مجھے گندگی اور بے ترتیبی بالکل بھی پسند نہیں۔ ویسے بھی میرے شوہر کی موجودگی میں کچن کا فرش صاف رہنا انہونی ہوتی۔ فرش سے فارغ ہو کر سنک میں رکھے ناشتے کے جھوٹے برتن دھونے تھے، پھر سودا سلف کی خریداری کے لیے ٹاؤن مارکیٹ بھی جانا تھا۔

گھر کافی بڑا ہو، صفائی ستھرائی میں مدد کرنے والا کوئی نہ ہو اور شوہر کو بھی بے ترتیبی سے رتی بھر پریشانی نہ ہوتی ہو تو پھر مجھ جیسی بیوی کی ذمے داریاں بڑھ ہی جاتی ہیں۔ کئی مہینے پہلے گھریلو کام کاج کے لیے ایک بوڑھی عورت کو ملازم رکھا تھا لیکن اس نے وہ رنگ دکھائے کہ بس توبہ ہی بھلی۔ پورے قصبے میں میرے گھر کی باتیں عام تھیں۔ ہر زبان پر آرویل کی بے ترتیبی کے قصے تھے۔ تنگ آ کر اس سے جان

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

چھڑانا پڑی، نتیجہ یہ نکلا کہ آرویل نے سب کچھ میرے کندھوں پر ڈال دیا۔

اب اتنا بڑا گھر ہے کہ آدھا دن تو صفائی ستھرائی میں لگ جاتا ہے۔ میں نے اس کا یہ حل نکالا کہ رات سونے سے پہلے برتن دھو لیتی ہوں اور کپڑے بھی۔ صبح اٹھ کر ویکیوم کلینر سے صفائی کی اور جلدی جلدی کام نمٹا ڈالے لیکن کچن کا فرش...... یہ تو اتنی جلدی گندا ہوتا ہے کہ روزانہ دھلائی نہ کروں تو یہاں کھڑا ہونے کو بھی دل نہ کرے، کم از کم میرا یہی خیال ہے۔ ویسے بھی مجھے کچن میں ذرا سی بھی گندگی یا بے ترتیبی پسند نہیں لیکن آرویل...... اسے تو جیسے پھیلاوے سے کوئی تکلیف ہی نہیں ہوتی۔

میں گھر کو ڈھنگ سے رکھنا چاہتی ہوں لیکن یہ بھی یقین ہے کہ آرویل کی موجودگی میں ایسا نہیں ہو سکتا۔ نئی ملازمہ ہیلن جلد آنے والی ہے لیکن وہ بھی آخر کیا کرے گی جب میں ہی پوری توجہ کے بعد ایسا کرنے میں اب تک کامیاب نہیں ہو سکی۔ ہیلن کو اگلے مہینے کی پہلی سے کام پر آنا ہے لیکن وہ یہ دیکھنے کے لیے کہ مجھے کس طرح کام کرنا پسند ہے، کئی بار گھر آ چکی ہے۔ اتفاق ہے کہ آج نہیں آئی ورنہ تو اس نے روز کا آنا جانا معمول بنا لیا ہے حالانکہ اگلا مہینہ شروع ہونے میں کافی دن باقی تھے۔

میں آرویل کو کئی بار سمجھا چکی ہوں کہ جس کا گھر بے ترتیب ہو، اس کا دماغ منتشر رہتا ہے لیکن وہ سائنسی بنیادوں پر دلیل کے بنا یہ ماننے کو تیار ہی نہیں۔ اس میں جمالیاتی حس ضرور ہے لیکن وہ میری نظر سے نہیں دیکھتا۔ اس بات پر ہم دونوں میں ہمیشہ سے ہی اختلاف رہا ہے۔ وہ بے پروا ہے۔ جہاں جی چاہا میلے کپڑے، موزے اور جوتے پھینک دیے مگر مجھے ایسا ہرگز پسند نہیں۔ شاید میری اسی عادت کے پیش نظر پچھلی ملازمہ نے قصبے میں نہ جانے کیسی کیسی باتیں پھیلا دی تھیں کہ لوگ مجھے پیٹھ پیچھے سنکی عورت کہنے لگے مگر مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

ویسے آرویل مجھ سے بہت پیار کرتا ہے۔ اکثر میرے سلیقے کی تعریف کرتا ہے۔ یہ مجھے اچھا لگتا ہے لیکن زیادہ اچھا تب لگتا جب وہ گھر کے کام کاج میں بھی میرا ہاتھ بٹاتا لیکن یہ کیسے ممکن تھا۔ وہ ٹھہرا ابلا کاست۔ دفتر سے واپسی پر تو جیسے اُس کا جوڑ جوڑ دکھ رہا ہوتا ہو۔ مجال ہے جو پانی بھی اٹھ کر پی لے۔ البتہ جہاں اسے کوئی کام پڑتا، ڈھیروں تعریفیں شروع کر دیتا۔ اب اسے کون سمجھائے کہ عورتیں تعریفوں سے خوش تو ضرور ہوتی ہیں لیکن خالی خولی زبانی جمع خرچ سے نہیں خوش کیا جا سکتا ہے اور صرف خوش ہو جانے سے کام نہیں چلتا۔ ہاتھ پاؤں بھی ہلیں، تب بات بنتی ہے۔ ویسے بھی پندرہ سال اس کے ساتھ گزارنے کے بعد اب مجھے احساس ہونے لگا تھا کہ اگر وہ خود کو تبدیل نہیں کرتا تو پھر اُس کے ساتھ مزید گزارا کرنا مشکل ہو جائے گا۔

فرش اور برتن دھونے کے بعد صفائی کرنے جا رہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ جب آپ کام میں الجھے ہوں اور سب کچھ ادھورا ہو تو ایسے میں دستک سن کر صرف زحمت ہوتی ہے۔ میں نے دن بھر کا شیڈول بنا رکھا تھا۔ ایسے میں کسی کے آنے کا مطلب تھا کہ آپ کا پورا شیڈول غارت ہو گیا۔

''یہ کون آ گیا بے وقت کا مہمان۔'' میں بڑبڑاتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھی۔ میرے ہاتھ میں ڈسٹر تھا۔ دروازہ کھولا تو سامنے میری برنسن کھڑی تھی۔

''ہائے......'' کمر کے پیچھے ڈسٹر چھپاتے ہوئے میں مسکرائی۔ ''سب خیریت تو ہے۔'' میں نے رسماً پوچھا۔ وہ ہماری پڑوسن تھی۔ ہم دونوں کے گھروں کے درمیان کوئی دیوار نہ تھی، بس ایک لکڑی کی نیچی سی باڑ نے دو گھروں کو علیحدہ کر رکھا تھا۔ ویسے وہ چہرے سے کافی پریشان نظر آ رہی تھی۔

''ہیلن گھر پر ہے؟'' میری نے ہچکچاتے ہوئے ملازمہ کا پوچھا۔

''نہیں...... آج تو وہ اب تک نہیں پہنچی، ہو گی کہیں اور ورنہ چکر ضرور لگاتی۔'' میں نے جواب دیا۔ ''تمہیں اس سے کیا کام پڑ گیا؟''

''وہ بات یہ ہے کہ......'' کچھ کہتے کہتے وہ رک گئی اور موضوع بدل دیا۔ ''کیا میں تم سے دو منٹ بیٹھ کر بات کر سکتی ہوں۔'' صاف لگ رہا تھا کہ وہ کچھ کہنا چاہ رہی تھی مگر ہمت نہیں پا رہی تھی۔

''وہ تو ٹھیک ہے مگر......''

''مگر......'' وہ زیرِ لب بڑبڑائی اور چونک کر سوالیہ نگاہوں سے مجھے دیکھا۔

''پلیز...... کچھ غلط مطلب نہ نکالنا۔'' میں مسکرائی اور قدرے نرم تاثر چہرے پر سجا کر اس کی طرف غور سے دیکھا۔ ''اس وقت پورا گھر پھیلا ہوا ہے اور میں صفائی میں مصروف تھی۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے کمر کے پیچھے رکھا ہاتھ سامنے کر کے ڈسٹر لہرایا۔

''میرے آنے سے زحمت تو نہیں ہوئی۔'' وہ ڈسٹر دیکھ

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

رہی تھی۔

''شاید نہیں......'' میں نے مسکراتے ہوئے جھوٹ بولا۔ ''اندر آجاؤ۔'' یہ کہتے ہوئے میں ایک طرف ہٹ گئی۔

میری برنسن ڈگمگاتے قدموں سے سیڑھیاں چڑھ کر ہال تک پہنچی۔ اس کی یہ کیفیت دیکھ کر لمحہ بھر کو میں بھی پریشان ہوگئی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ بہت کمزور ہوگئی ہے۔ اس کے ہاتھ بھی ہلکے ہلکے کپکپا رہے تھے۔ سٹنگ روم میں پہنچ کر وہ آرام کرسی پر نیم دراز ہوگئی۔ میں اس کے سامنے صوفے پر بیٹھ گئی۔

''اچھی سجاوٹ کی ہے تم نے مسز آرویل۔'' اس نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے رسمی لہجے میں کہا۔ اس کا لہجہ لفظوں کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔

''بہت بہت شکریہ۔'' میں مسکرائی۔ اگر کوئی میرے گھر کی تعریف کرے تو مجھے بہت... اچھا لگتا ہے۔

''تمہارے گھر میں تو بہت ساری کتابیں ہیں، میرے گھر میں تو شاید ہی کوئی ایک آدھ کتاب ہو۔'' وہ چاروں طرف بے مقصد نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ ''جارج کو تو کتابوں سے کوئی شغف ہی نہ تھا۔''

میں رسمی طور پر مسکرائی۔ محسوس کر رہی تھی کہ وہ جو کچھ کہنا چاہتی ہے، شاید اس کی تمہید باندھ رہی ہو۔

''ہیلن نے بھی بتایا تھا کہ تمہارے گھر میں بہت ساری کتابیں ہیں۔''

''دراصل ہم دونوں کو ہی مطالعے کا بہت شوق ہے۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ دن کے گیارہ بجنے والے تھے۔ مجھے اپنے سارے باقی کام یاد آگئے۔ سوچ رہی تھی کہ دن گزرتا جا رہا ہے۔ آخر میری وہ سب کچھ صاف صاف کہہ کیوں نہیں دیتی جس کے لیے یہاں تک آئی ہے۔

''اگر تم برا نہ مناؤ تو کیا پوچھ سکتی ہوں کہ مسئلہ کیا ہے؟'' آخر میں نے ہی ابتدا کردی۔

یہ سن کر اس نے بے بس نگاہوں سے مجھے دیکھا اور کچھ دیر کے لیے گم صم ہوگئی۔

مجھے لگا کہ کوئی ایسی بات ضرور ہے جو وہ بتانا بھی چاہتی ہے اور کہنے سے ہچکچا بھی رہی ہے۔ ''دیکھو......'' میں نے دوستانہ لہجے میں کہا۔ ''تم مجھ پر بھروسا کرسکتی ہو۔ جو کہنا چاہتی ہو، کھل کر کہو۔''

''میں سخت مشکل میں ہوں......'' اس نے لرزتی آواز میں بات شروع کی۔ ''سمجھ نہیں آتا کہ کیسے بیان کروں۔'' اس کا لہجہ بھرا رہا تھا۔

میں اور پریشان ہوگئی۔ ''سب خیریت تو ہے، گھر میں کوئی پریشانی......؟'' میں نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

یہ سنتے ہی اس نے دونوں ہتھیلیوں میں منہ چھپالیا۔ اس کی سسکیاں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ ''پریشان مت ہو۔'' میں اٹھ کر اس کے قریب آگئی اور شانے پر ہاتھ رکھ کر ہمدردانہ لہجے میں کہا۔ ''جو بھی بات ہے، کھل کر کہو۔ یہی میرا مشورہ ہے۔''

میری نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ اس کی پلکیں تر تھیں۔ یہ دیکھ کر میری پریشانی اور بڑھ گئی۔ ہمارا کچھ خاص تعلق تو نہ تھا البتہ میں نے ہمیشہ اسے ہنستے مسکراتے ہی دیکھا تھا۔ ''کیا ہوا، بتاؤ تو سہی۔''

''جارج......'' یہ کہہ کر وہ پھر سسکیاں بھرنے لگیں۔

''اوہ...... ایک بار پھر......'' میری کا اپنے شوہر سے اکثر جھگڑا ہوتا رہتا تھا۔ ہمارے گھر تک اس کے جھگڑنے کی آوازیں آیا کرتی تھیں۔ ''اب کیا ہوا ہے، میرا مطلب سب ٹھیک تو ہے نا؟'' وہ پکا شرابی اور لڑاکو انسان تھا۔ اسی لیے ہم اس فیملی سے تھوڑا کھنچے کھنچے ہی رہتے تھے۔

''رات ہم دونوں میں سخت جھگڑا ہوا تھا۔''

''خیر یہ کوئی نئی بات نہیں۔'' میں بڑبڑائی مگر اس نے سن لیا۔

''صرف جھگڑا ہی نہیں ہوا، بات ہاتھا پائی تک پہنچ گئی۔'' اس نے جلدی سے کہا۔

''اب جارج سے تو یہی توقع رکھی جاسکتی ہے۔'' میں نے منہ بنا کر کہا۔

''میں سچ کہہ رہی ہوں، اس میں قصور میرا نہیں تھا، وہ جارج ہی......'' یہ کہتے ہوئے اس کی آواز بھرا گئی۔ اس نے منہ ہاتھوں میں چھپالیا۔

''وہ تو پورے قصبے کو ہی پتا ہے کہ تم دونوں کے بیچ کیا کچھ چلتا رہتا ہے۔ ہوسکتا ہے اس بار بات کچھ زیادہ بڑھ گئی ہو۔'' میرے لہجے سے اندر کی ناگواری صاف جھلک رہی تھی۔ اس کا یہاں ہونا، میرے نزدیک وقت کا زیاں تھا اور وہ بھی صرف میرے وقت کا۔

اس نے روتے روتے سر اٹھایا۔ ''بات بہت سنگین ہوچکی ہے۔''

میں اب تک یہ نہیں سمجھ سکی تھی کہ اس جھگڑے میں سنگینی کیا ہے۔ یہ تو ان کا تقریباً روز کا ہی معمول تھا۔ ''رومت میری......'' میں نے اسے تسلی دی۔ ''اب اس میں ایسا نیا کیا ہے جو اب تک رو رہی ہو۔ چھوڑو بھی، رات گئی بات گئی۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

''نہیں...... ایسا نہیں ہے۔'' اس نے جلدی سے میری طرف دیکھا۔ لڑائی جھگڑے تک بات رہتی تو اتنا برا نہ ہوتا۔''

''تو ایسا کیا ہوگیا۔'' میں نے تجسس بھرے لہجے میں پوچھا۔

''تم سمجھ نہیں پا رہی ہو۔''

''تو پھر کھل کر کہونا۔'' میں نے زچ ہو کر کہا۔

''معمولی سی بات سے جھگڑا شروع ہوا اور پھر بڑھتا ہی چلا گیا۔'' اس نے خود پر قابو پا کر کہنا شروع کیا۔ ''ہم دونوں ہی ایک دوسرے پر چلا رہے تھے۔ وہ بھی غصے میں تھا۔ مجھے بھی شدید طیش آ رہا تھا۔'' یہ کہتے ہوئے اس کی آواز بھرا گئی۔ اس نے سائڈ ٹیبل پر رکھے باکس سے ٹشو پیپر نکالا اور نم پلکیں پونچھنے لگی۔

''یہ اب ایسی بھی بات نہیں کہ تم یہاں تک آ گئیں۔'' میں نے ناگوار لہجے میں کہا۔ مجھے اس کی باتیں اپنے وقت کا زیاں لگ رہی تھیں۔ میرا دھیان اب بھی دن بھر کے شیڈول کے گرد ہی بھٹک رہا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ زیادہ دیر تک بیٹھی رہتی تو جو کچھ میں نے سوچا تھا، وہ سب کچھ طے شدہ وقت پر مکمل کرنا ممکن نہ رہتا۔ اسے دیکھ کر نہیں لگتا تھا کہ وہ جلدی جان چھوڑنے کے موڈ میں ہے۔

''میں جانتی ہوں کہ جارج ذرا مشکل آدمی ہے۔ میرا تو مشورہ ہے گھر جا کر اسے اچھی سی کافی بنا کر دو اور سوری کہہ دو۔ کم از کم اگلے جھگڑے تک تو صلح ہو جائے گی۔'' میں نے جان چھڑانے کے لیے اپنے تئیں کوشش کی۔

اس نے تاسف بھری نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ ''اب دیر ہو چکی ہے، واقعی بہت دیر ہو چکی۔''

''اگر وہ بہت زیادہ ناراض ہے تو ایسا کرو کہ اُسے اس کی پسند کی کوئی چیز تحفے میں دے دو، وہ مان جائے گا۔''

میری نے کوئی جواب نہیں دیا۔

اس کی خاموشی مجھے بُری لگی۔ میں اس سے جلد از جلد جان چھڑانے کے موڈ میں تھی۔ میرے ذہن میں ایک اور تجویز آئی۔ ''دیکھو میری...... ایک دفعہ آرویل اور میرے بیچ بھی جھگڑا ہوا تھا۔'' میں... اسے اپنے مشورے پر مکمل کے لیے قائل کرنا چاہتی تھی۔ ''وہ مجھ سے سخت ناراض تھا۔ میں بازار گئی اور اس کے لیے بیچ کس باکس کا ایک سیٹ لے کر آئی اور عمدہ گفٹ پیپر میں پیک کر کے، سوری کا کارڈ لگا کر اسے دیا۔ وہ فوراً سب کچھ بھول گیا۔ آزمایا ہوا نسخہ ہے، تم بھی ایسا ہی کرو۔'' اپنی بات مکمل کر کے میں نے ستائشی نظروں سے اُس کی طرف دیکھا۔

میری کا چہرہ سپاٹ تھا۔ اس کی پلکیں بدستور نم تھیں۔ اچانک وہ غیر متوقع طور پر زور سے ٹھٹھا مار کر ہنسی۔

یہ دیکھ کر میں ڈر گئی۔

''اب معاملہ تحفے تحائف سے آگے نکل گیا ہے مسز آرویل۔'' اس نے بڑے عجیب سے لہجے میں جواب دیا۔

یہ سن کر میں سوچ میں پڑ گئی کہ شاید اب وہ روز روز کی جھک جھک سے تنگ آ کر طلاق لینے کا فیصلہ کر چکی ہے۔ اگر یہ بات تھی تو اسے کسی وکیل کے پاس جانا چاہیے تھا، میرا سر کھپانے کیوں آ گئی۔ ایک بار پھر میرا دماغ کچن کی صفائی میں اُلجھنے لگا تھا۔

وہ ایک بار پھر خاموش ہو چکی تھی۔

''سنو......'' میں نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد اسے ذرا سخت لہجے میں مخاطب کیا۔ ''مجھے کچھ ضروری کام نمٹانے ہیں، دیر ہو رہی ہے...... پلیز صاف صاف بتاؤ آخر معاملہ کیا ہے؟''

''جارج چلا گیا......''

''جارج چلا گیا......'' میں نے اس کا جملہ زیرِ لب دہرایا۔ آخر وہ کہاں جا سکتا ہے۔ میں سوچ رہی تھی۔

''وہ ہمیں چھوڑ کر چلا گیا ہے......''

''ہمیں......'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''تمہارے کہنے کا مطلب ہے کہ وہ تمہیں چھوڑ کر چلا گیا ہے۔''

''نہیں......'' میری نے روتے ہوئے کہا۔ ''وہ ہم سب کو چھوڑ کر چلا گیا ہے۔''

''کیا مطلب......'' میں اب بھی کچھ سمجھ نہیں پائی تھی کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔

''وہ مر گیا ہے۔''

یہ سنتے ہی ایک لمحے کے لیے میرا دماغ سُن ہو کر رہ گیا۔ نئے ہفتے کے آغاز پر، مصروف دن کے گیارہ بجے مجھے اس طرح کی اطلاع ملنے کی کوئی توقع نہ تھی۔ ''تمہارا مطلب ہے کہ وہ......'' میں نے ہچکچاتے ہوئے کہنا شروع کیا لیکن ایک انجانے خوف سے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''ہاں میرا مطلب وہی ہے، جارج مر گیا۔'' یہ کہہ کر وہ ایک بار پھر ہذیانی کیفیت میں زور سے ہنسی۔ ''جارج مر گیا...... وہ بے جان، ٹھنڈا، کسی بھوت کی طرح پڑا ہے۔''

میری کی اس کیفیت نے مجھے اور پریشان کر دیا۔ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ مجھے فکر کے ساتھ ساتھ اب اس سے خوف بھی محسوس ہو رہا تھا۔ ''تم ٹھیک کہہ رہی ہو؟''

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

کہیں سننے میں کوئی مغالطہ نہ ہوا ہو، یہ سوچ کر میں نے تصدیق طلب لہجے میں پوچھا۔

''سو فیصد ٹھیک کہہ رہی ہوں مسز آرویل...... وہ اب ہم میں نہیں رہا۔''

''لیکن یہ سب ہوا کیسے؟'' اندر کے خوف کے باعث میری بھی آواز کپکپا رہی تھی۔

''بتایا تو ہے نا کہ کل رات ہمارے درمیان جھگڑا ہوا تھا۔'' ایک بار پھر وہ اُداس اور سنجیدہ نظر آنے لگی۔

''نہیں...... میرا مطلب ہے کہ یہ سب کس طرح رونما ہوا؟'' میں نے اپنے خوف پر قابو پاتے ہوئے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ میں اپنی کمزور کیفیت اس پر آشکار نہیں کرنا چاہتی تھی۔

''جھگڑے کی وجہ غیر معمولی تھی۔ اس کا کسی اور عورت سے چکر چل رہا تھا۔''

''کیا......'' میں نے چونک کر پوچھا۔ ''یہ چکر کب سے چل رہا تھا اور تمہیں کیسے پتا چلا؟'' کہانی کا یہ موڑ اتنا دلچسپ تھا کہ میں یہ بھول ہی بیٹھی کہ برابر کے گھر میں ایک لاش پڑی ہے۔

''چھوٹے موٹے جھگڑے تو میں نظرانداز کرتی چلی آرہی تھی لیکن اب بات کافی آگے نکل گئی تھی۔''

''لیکن تمہیں یہ کب پتا چلا۔'' میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

''پتا تو کافی دنوں پہلے ہی چل چکا تھا۔ اس پر ہم دونوں کے درمیان کئی بار تُوتُو میں میں بھی ہو چکی تھی لیکن کل شام......''

''تو کل شام کیا ہوا تھا؟'' میں نے بے تابی سے اس کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔ ویسے تو جارج بے تحاشا شراب پینے کا عادی تھا۔ اس میں اور بھی کئی برائیاں تھیں لیکن یہ اندازہ نہ تھا کہ وہ شادی شدہ ہونے کے باوجود اِدھر اُدھر منہ مارتا پھرتا ہے۔

''وہ کل شام ہی سے خوب بن ٹھن کر بیٹھا تھا۔'' میری نے کہنا شروع کیا۔ ''اب اس کی پلکیں خشک تھیں۔'' اس نے نہایت عمدہ چرمی جیکٹ خریدی تھی۔ نئی جینز اور شرٹ پہن رکھی تھی۔ جوتے بھی خوب چمکائے تھے۔ اس کے جسم سے خوشبو کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔ لگتا تھا کہ پرفیوم کی پوری بوتل اپنے اوپر اُنڈیل چکا ہے۔ مجھے اس کی یہ تیاریاں دیکھ کر شک تھا کہ وہ کچھ خاص کرنے جا رہا ہے لیکن اس انتظار میں چپ بیٹھی رہی تھی کہ وہ خود بتائے لیکن وہ تو مجھ سے بات کرنا درکنار، میری طرف دیکھ بھی نہیں رہا تھا۔''

''پھر جھگڑا کیسے شروع ہوا؟''

''میں ڈنر تیار کر رہی تھی۔'' اس نے ایک بار پھر پلکیں پونچھیں۔ ''کچن سے نکلی تو وہ لاؤنج میں کھڑا فون پر باتیں کر رہا تھا۔ پشت میری طرف تھی۔ اچانک مجھے کھانسی آئی تو اس نے پلٹ کر دیکھا۔'' یہ کہہ کر اس نے گہری سانس لی اور کچھ توقف کے بعد کہنے لگی۔ ''شاید اسے شک ہو گیا تھا کہ میں پیچھے کھڑی اس کی باتیں سن رہی ہوں۔ بس! پھر کیا تھا، وہ غصے میں آگیا۔''

میں خاموش بیٹھی اس کی طرف پوری توجہ سے دیکھے اور سنے جا رہی تھی۔

''اس نے جھٹ سے فون زمین پر پٹخا اور میری طرف لپکا۔ تم میری جاسوسی کرتی ہو۔ یہ سن کر مجھے طیش آگیا۔ میں نے پوچھا کہ تم کدھر جا رہے ہو، کس کے ساتھ جا رہے ہو۔ یہ سن کر وہ میرے قریب آیا اور دونوں ہاتھوں سے میرا منہ پکڑ کر بھینچ دیا۔ اس کی گرفت اتنی سخت تھی کہ جبڑا دکھنے لگا۔ میں نے پوری قوت لگا کر خود کو اس کی گرفت سے آزاد کرایا اور اسے پیچھے دھکیلا۔ وہ پھر میری طرف لپکا۔ خود کو اس کی مار سے بچانے کے لیے میں نے اسے دھکا دے دیا۔'' یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئی۔

اس کی باتوں میں، میں یہ بالکل ہی بھول چکی تھی کہ ابھی کیا کیا کام کرنا باقی ہیں۔ میں اٹھ کر کچن میں گئی اور اس کے لیے پانی لے کر آئی۔

''شکریہ......'' اس نے خالی گلاس سائڈ ٹیبل پر رکھا۔

''تو وہ مرا کیسے......'' میں نے اپنی نشست پر بیٹھتے ہوئے دوبارہ بات شروع کی۔ ''وہ خود مرا، کوئی حادثہ تھا یا پھر تم نے......'' میرے دماغ میں متعدد سوالات کلبلا رہے تھے۔

''میں ایسا نہیں کرنا چاہتی تھی، میں تو صرف خود کو اس کی مار سے بچانے کی کوشش کر رہی تھی۔'' میری نے بھرائی آواز میں کہا۔

''تو پھر کیا ہوا؟''

''میں نے دھکا، شاید بہت زور سے دھکا دے دیا تھا یا پھر وہ زیادہ پی چکا تھا کہ ایک دم توازن کھو بیٹھا اور دھڑام سے فرش پر گرا۔ گرتے ہوئے اس کے سر کا پچھلا حصہ ڈائننگ ٹیبل سے ٹکرایا تھا۔''

''واقعی......'' مجھے اس طرح جارج کے دنیا سے چلے جانے پر حیرت ضرور تھی لیکن یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ مر چکا

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

ہے۔

''وہ کل دوپہر سو کر اٹھا تھا اور پھر اس کے بعد سے نان اسٹاپ پیے جارہا تھا۔'' میری نے وضاحت کی۔ ایک بار پھر وہ نارمل محسوس ہونے لگی تھی۔

میرے لیے یہ حیران کن بات نہ تھی۔ جو جارج کو جانتے تھے، وہ واقف تھے کہ بنا پیے، دو منٹ بھی رہنا اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ میں نے کبھی اسے نارمل لوگوں کی طرح زمین پر قدم جما کر ٹھیک طریقے سے چلتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ ہمیشہ لڑکھڑاتا، گرتا پڑتا چلتا تھا۔

''تو تم یہ کہہ رہی ہو کہ وہ نشے میں تھا اور تم نے پوری قوت سے دھکا دیا تو......'' یہ کہہ کر لمحہ بھر توقف کیا۔ ''میرا خیال ہے کہ ابھی تم یہی کہہ رہی تھیں۔'' سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔''

ہم دونوں خاموش تھے۔

میں سوچ رہی تھی کہ کیا وہ سچ بول رہی ہے۔ واقعی ایسا ہوا ہوگا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس نے یہ سب کچھ جان بوجھ کر کیا اور اب میرے اور آرویل کے لیے ایک کہانی گھڑ کر سنا رہی ہو تاکہ کسی طرح وہ قتل کو حادثے کا رنگ دے کر سزا سے بچ سکے اور رات بھر پولیس کو اطلاع نہ کرنے کا جواز اپنے خوف اور معصومیت کو قرار دے سکے۔ شاید وہ سوچ رہی ہو کہ اس کی کہانی سن کر ہم پولیس سے اسے بچانے کے لیے لاش ٹھکانے لگانے پر مدد کو تیار ہو جائیں۔ میرے دماغ میں طرح طرح کے سوال آندھی اور طوفان کی طرح اِدھر سے اُدھر سنسناتے ہوئے پھر رہے تھے۔

''دیکھو میری......'' کچھ دیر بعد میں نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ ایسے بیٹھی تھی جیسے کسی بڑے صدمے سے دوچار ہو اور وہ اس جھٹکے سے نکل نہ پا رہی ہو۔ ''لفظ مُردہ ایک بڑا لفظ ہے اور کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ مر چکا۔'' میں نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں...... مجھے یقین ہے کہ وہ مر چکا ہے۔'' میری نے مجھے یقین دلانے کی پوری کوشش کرتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ ''اس کا جسم ٹھنڈا پڑ چکا ہے۔ وہ جہاں گرا تھا، وہاں پر پچھلی رات سے بنا کسی حرکت کے پڑا ہوا ہے۔''

''بالکل اُسی پوزیشن میں......''

میری نے اثبات میں سر ہلایا۔

''تو تم نے اُسے ویسے ہی چھوڑ دیا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں......'' میری نے کہنا شروع کیا۔ ''اس صورتِ حال سے میرے اوسان خطا ہو گئے تھے۔ میں اوپر کمرے میں جا کر بستر میں دُبک گئی۔ میں سوچ رہی تھی کہ وہ گرا ہے، بے ہوش ہوا ہوگا۔ ہوش آئے گا تو خود ہی لڑکھڑاتا ہوا سیڑھیاں چڑھ کر بیڈروم میں آجائے گا۔'' یہ کہہ کر وہ رکی اور کچھ توقف کے بعد بولی۔ ''لیکن وہ نہیں آیا۔ مجھے بھی اُس وقت اس کی کوئی خاص فکر نہ تھی۔ میں نے نیند کی گولی لی اور سو گئی۔ صبح اٹھی تو وہ بستر پر نہیں تھا۔ نیچے لاؤنج میں گئی تو وہ کل رات والی پوزیشن میں فرش پر پڑا تھا۔ میں نے قریب جا کر اس کا ہاتھ پکڑ کر دیکھا تو وہ بے جان اور نہایت ٹھنڈا ہو رہا تھا۔''

''اوہ میرے خدا......'' میں نے یہ سن کر سر تھام لیا۔

جارج اور ہمارے تعلقات کبھی بھی اچھے ہمسائیوں جیسے نہیں رہے تھے۔ اگر کبھی میری کسی ضرورت کے تحت ہمارے گھر آئی تو میں اسے دروازے سے ہی ٹرخا دیا کرتی تھی۔ جارج تو ایسا آدمی تھا ہی نہیں کہ جس سے مل کر خوشی ہوتی۔ نہ ہم نے اور نہ ہی اس جوڑے نے کبھی ایک دوسرے کو اپنے گھر مدعو کیا تھا۔ پچھلے پندرہ سال سے ہم پڑوسی تھے لیکن یاد نہیں کہ کبھی جارج یا میری سے بات دعا سلام سے آگے بڑھی ہو۔ میں تو ان کے ساتھ بیٹھ کر ایک کپ چائے پینے تک کی روادار نہ تھی۔ میں بدمزاج نہیں ہوں اور نہ ہی آدم بیزار لیکن اس طرح کے لوگوں سے دور رہنے میں ہی عافیت محسوس کرتی ہوں۔

موجودہ صورتِ حال میں میرا دماغ کام نہیں کر رہا تھا کہ کیا کیا جائے۔ اس نے جو کچھ بیان کیا، اس کے مطابق جارج کی موت صرف ایک حادثہ تھی، ہوسکتا ہے کہ ایسا نہ ہو۔ میری نے جان بوجھ کر اسے قتل کیا ہوا۔ ویسے بھی وہ جارج کے کسی دوسری عورت کے ساتھ معاشقے کے بارے میں بھی کہہ چکی ہے۔ جارج جیسے شخص کو برسوں سے برداشت کرنے والی میری جیسی عورت کے لیے ناممکن ہو کہ تمام تر زیادتیوں کے باوجود شوہر کا معاشقہ ناقابلِ برداشت ہو۔ اب وہ خود قتل کر کے قانون سے بچنے کی کوشش کر رہی ہو۔ حقیقت چاہے جو بھی ہو، پولیس تفتیش سے پہلے کوئی بات حتمی نہیں کہی جاسکتی تھی۔ میں نے پولیس کو اطلاع دینے کے بارے میں سوچا۔

''تو اب کیا، کیا جائے۔'' میں نے کمرے میں چھائی خاموشی توڑتے ہوئے پوچھا۔ ''پولیس کو فون کیا جائے؟'' سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

اس نے میری بات سن کر نظریں چرائیں۔ میں اس کے چہرے پر پولیس کا نام سن کر خوف کی لہراتی پر چھائیاں دیکھ چکی تھی۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا اور بے مقصد نگاہوں سے چھت کی طرف دیکھنے لگی۔

''کچھ تو بتاؤ...... کیا کرنا چاہتی ہو؟'' میری بات سننے کے باوجود وہ متوجہ نہ ہوئی۔

سچ کہوں تو میں اس کی کہانی سن کر ذرا بھی متاثر نہیں ہوئی تھی۔ میں آسانی سے متاثر ہونے والوں میں سے نہیں۔ آرویل نے تو کبھی میری اس خداداد صلاحیت کی تعریف نہیں کی لیکن دوست احباب اکثر کہتے تھے کہ مجھ میں چیزوں اور انسانوں کو پرکھنے کی صلاحیت بہت زیادہ ہے۔ میں بہت کچھ سوچ رہی تھی۔ اس وقت میرا ذہن کئی باتوں کو سلجھانے کی کامیاب کوششوں میں مصروف تھا۔ میری نے میرے ذہن میں ہلچل مچادی تھی۔

کئی منٹ گزر چکے تھے۔ وہ خاموشی سے خلاؤں میں گھور رہی تھی۔ لگتا تھا کہ کوئی فیصلہ کرنے کی ادھیڑ بن میں مشغول ہے۔

''کیا جارج کے خاندان والے، دوست احباب ہیں۔ کچھ پتا ہے تمہیں اس بارے میں ہے۔'' میں نے پوچھا۔

یہ سن کر اس نے میری طرف دیکھا اور نفی میں سر ہلا دیا۔ ''سابقہ بیوی سے اُس کا ایک بچہ ہے، وہ بھی سان فرانسسکو کے ایک مرکز میں۔ وہ ذہنی معذور ہے۔ اس کے ماں باپ کا آٹھ سال پہلے کار ایکسیڈنٹ میں انتقال ہوگیا تھا۔ اس کے سوا مجھے نہیں پتا کہ اس کے خاندان کا کوئی فرد اور بھی ہے یا نہیں۔'' میری نے دھیمے لہجے میں بتایا۔

''کوئی دوست...... ؟'' میں نے پوچھا۔

''میرا خیال ہے کہ کوئی نہیں۔'' اس نے کچھ دیر تک سوچنے کے بعد کہا۔ اس کی پلکیں بدستور نم تھیں۔ ''ویسے تو وہ ہلا گلا پسند کرتا تھا، اس کے ساتھ پینے اور ہنگامہ کرنے والے بہت سے لوگ ہیں لیکن سب اس کی طرح بے پروا، شرابی......'' وہ بات ادھوری چھوڑ کر نم پلکیں خشک کرنے لگی تھی۔ ''مجھے نہیں لگتا کہ ان لوگوں میں کوئی بھی اس کی پروا کرنے والا ہو سکتا ہے۔ تم تو جانتی ہی ہو کہ وہ کیسا شخص تھا۔ ایسے لوگوں کے دوست کیسے ہوتے ہیں، اس کا تمہیں بھی اچھی طرح اندازہ ہوگا۔''

میں نے سر ہلایا۔

جارج جیسے شرابی اور بے پروا لوگوں کے دوستوں کے بارے میں تو ہر وہ شخص جان سکتا ہے جسے خدا نے تھوڑا بھی دماغ دیا ہو۔ جہاں تک میں جارج کو جانتی ہوں، وہ اکثر اپنے دوستوں کے ساتھ گھر پر پارٹی کیا کرتا تھا۔ رات دیر گئے اس کے گھر سے شور شرابے کی آوازیں آتی رہتی تھیں۔ کئی بار اس کی ان حرکتوں سے تنگ آکر پولیس کو فون کرنا چاہا لیکن آرویل ہمیشہ مجھے روک دیتا تھا۔ آرویل بھی موج مستی کا دلدادہ تھا لیکن میرے مزاج کے سبب کم از کم وہ گھر پر اس طرح کی پارٹیاں کرنے سے گریز ہی کرتا تھا۔ مجھے ہنگامے اور لوگوں میں گھرا رہنا سخت ناپسند تھا۔

کمرے میں ایک بار پھر خاموشی کا راج تھا۔ ''اس کے بزنس کا کوئی ساتھی میرا مطلب ہے پارٹنر وغیرہ۔''

''کوئی نہیں۔'' میری کا سر نفی میں ہلا۔ ''وہ اکیلا ہی سارا کام سنبھالتا تھا۔''

شہر میں تین اسٹیٹ ایجنسیاں تھیں جن میں سے ایک جارج کی ملکیت اور باقی دوسری دو، امریکا میں رئیل اسٹیٹ بزنس سے منسلک دو بڑی کمپنیوں کی فرنچائز تھیں۔ میں نے سنا تھا کہ جب سے وہ دونوں ایجنسیاں قائم ہوئی تھیں، جارج کو کاروبار میں سخت مقابلے کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ وہ لاابالی مزاج کا حامل شخص تھا، اسی سبب وہ بزنس بھی منظم انداز میں کرنے سے قاصر رہا تھا۔ جس کی وجہ سے نئی کمپنیوں کے آنے کے بعد اس کا بزنس روز بروز زوال پذیر ہوتا گیا تھا۔ یہی سوچ کر میں نے پوچھا۔ ''ویسے اس کا بزنس تو ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا؟''

''میرے خیال میں تو اتنا بُرا نہ تھا۔''

''ہو سکتا ہے جس عورت کو تم اس کی محبوبہ سمجھ رہی ہو، وہ اس کی کوئی کلائنٹ ہو اور تم غلط فہمی......''

''بالکل بھی نہیں۔'' میری نے تیزی سے بات کاٹی۔ ''کلائنٹ اور محبوبہ سے گفتگو کا انداز اور الفاظ، دونوں بالکل مختلف ہوتے ہیں۔'' اس کے لہجے سے تلخی صاف جھلک رہی تھی۔ ''ویسے بھی اسے کاروبار سے زیادہ دلچسپی بوتل میں تھی۔ بوتل کے پیسے نکلتے تو دفتر کو تالا۔''

''او کے......'' میں نے دونوں ہاتھ اٹھا کر معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ ''تم نے سوچا کہ اب کیا ہوگا، وہ تو مر گیا لیکن آگے کیا کرنا ہے۔ اس بارے میں تمہارے دماغ میں کچھ ہے؟'' میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

وہ کچھ دیر خاموش رہی اور مدد طلب کرنے والی نگاہوں سے میری طرف دیکھتی رہی۔ ''تمہارے دماغ میں کچھ سوجھ رہا ہے؟'' اس نے امید بھرے لہجے میں پوچھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

''نہیں......'' میرے دماغ میں تو اس وقت کچھ خاص نہیں لیکن وہ نصف ایکڑ زمین......'' میں اتنی دیر میں واضح طور پر ایک منصوبہ بنا چکی تھی۔

''نصف ایکڑ زمین۔'' اس نے میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی اُچک لی اور سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

یہ نصف ایکڑ زمین میرے گھر کے عقب میں واقع تھی۔ کئی سال پہلے بہت سستے داموں پر یہ سوچ کر خرید لیا تھا کہ کبھی اسے ڈیولپ کروں گی۔ آرویل بھی اس فیصلے سے بہت خوش تھا۔ یہ ایک پلاٹ نہیں بلکہ جنگل کی زمین تھی۔ جھاڑیاں، خودرو پودے...... کبھی وقت ہی نہ ملا کہ اسے ڈیولپ کرا کر کچھ تعمیر کرسکوں یا شاید اتنے پیسے ہی جمع نہ ہوسکے کہ یہ کام کرسکتی۔

برسوں سے وہ جنگل نما نصف ایکڑ زمین کا ٹکڑا اُسی طرح بے آباد تھا۔ وہاں نہ کوئی آتا اور نہ جاتا تھا۔ ویسے بھی ہم دونوں کے گھروں کے پیچھے صرف ویرانہ تھا۔ یہ دونوں گھر قصبے کے اختتام پر تھے۔ میرے گھر کے عقب اور اُس نصف ایکڑ زمین کے سامنے سے ایک پہاڑی پگڈنڈی گزرتی ہوئی نیچے چرچ تک جاتی تھی لیکن جب سے سڑک بنی تھی، اس پر بھی شاید ہی کسی نے قدم رکھا ہو۔ سڑک عین چرچ کے سامنے سے گزرتی تھی۔ لوگ اپنی گاڑیوں میں بیٹھ کر وہاں پہنچ جاتے تھے۔ اس لیے ہم دونوں کے گھر کا عقبی حصہ مدتوں سے کسی ویرانے کا منظر پیش کررہا تھا۔

''میں کچھ سمجھ نہیں سکی کہ اس زمین کا جارج والے معاملے سے کیا تعلق بنتا ہے؟'' کافی دیر سوچنے کے بعد اس نے سوالیہ لہجے میں پوچھا۔

''تمہیں جارج کا قصہ نمٹانا ہے نا؟''

میری نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''لیکن وہ نصف ایکڑ......''

''تو پھر ذہن پر زیادہ بوجھ مت ڈالو'' اس کی بات کاٹ کر جلدی سے کہا۔ اندازہ کرلیا تھا کہ وہ بہت کچھ جاننے کے لیے مری جارہی ہے لیکن میں سسپنس برقرار رکھنا چاہ رہی تھی۔ اب مجھے بھی اس معاملے میں لطف آرہا تھا۔ معاملہ میری تک محدود نہ تھا۔ بات اس سے آگے نکلنے والی تھی۔

''اٹھو......'' کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد میں نے میری کا ہاتھ پکڑ کر اٹھتے ہوئے کہا۔

گھر کے عقبی دروازے سے نکل کر اُس کے گارڈن میں پہنچی۔ عقبی حصے میں بنے گارڈن میں پہلی بار آئی تھی۔

پندرہ سالوں میں پہلی بار میری اور جارج کے گھر میں قدم رکھ رہی تھی۔ گارڈن میں رک کر چاروں طرف نظر ڈالی۔ ہر طرف ویرانی اور سناٹے کا راج تھا۔ میں اس زاویے سے پہلی بار اپنے گھر کا عقبی حصہ دیکھ رہی تھی۔ گزشتہ ہفتے ہی گھر کے اس حصے پر پینٹ کیا تھا۔ کافی شاندار لگ رہا تھا۔ یہاں سے ہم دونوں کے قریب ترین گھر بھی سو گز فاصلے پر چڑھائی اترتے ہوئے تھا۔ وہ گھر مسز کریسنٹ کا تھا۔

میری کے گھر کا کچن عقبی حصے میں واقع تھا۔ مجھے اُس کے گھر کا یہ حصہ کچھ خاص نہ لگا۔ وہ نام کا ہی گارڈن تھا ورنہ جھاڑ جھنکاڑ کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ ان کے مزاج کا اندازہ گارڈن کی حالت دیکھ کر ہی لگایا جاسکتا تھا۔ میرا گارڈن ایسا نہ تھا۔ اسے میں نے بڑی اچھی طرح رکھا ہوا تھا۔

میری کے پیچھے پیچھے عقبی دروازے سے کچن میں داخل ہوکر لاؤنج میں پہنچی۔ قدم جہاں تھے، وہیں تھم گئے۔ سامنے جارج اوندھے منہ فرش پر پڑا تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا۔

''یہ رات سے ہی اسی پوزیشن میں ہے۔'' میری نے جلدی سے کہا۔

میں سمجھ چکی تھی کہ وہ واقعی مرچکا ہے ورنہ کوئی بے ہوش شخص کبھی اتنے لمبے عرصے تک ایک ہی پوزیشن میں پڑا نہیں رہ سکتا۔

میں نے لاؤنج پر نظر دوڑائی۔ ہر چیز بے ترتیب تھی۔ وہ گھر نہیں کباڑی کی دکان لگ رہا تھا۔ میں نے ناک سکیڑی اور اس کی طرف دیکھا۔ ''تم میں ذرا سا بھی قرینہ نہیں ہے۔''

''سب چھوڑو، یہ بعد میں بھی ہوسکتا ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے لاش کی طرف انگلی سے اشارہ کیا۔ ''سب سے پہلے اسے ٹھکانے لگانے کا سوچو۔''

''اس کا ہی سوچ رہی ہوں۔'' میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''اگر تمہیں یہ پسند نہیں تو میں جاؤں؟''

''نہیں نہیں...... جیسا کہو ویسا ہی کروں گی۔'' وہ حسبِ توقع گھبرا کر جلدی سے بولی۔

''تو ٹھیک ہے، جیسا میں کہتی ہوں، ویسا کرو۔''

اس نے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

''غور سے سنو۔'' میں نے ہدایت دینا شروع کی۔ ''سب سے پہلے کچن صاف کرو۔ اس کے بعد لاؤنج اور پھر پورے گھر کو قرینے سے سنوارو۔ صفائی کرو۔ ہر چیز ترتیب سے نظر آنی چاہیے۔ پورا گھر صاف ستھرا ہو۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

''اوکے......'' اس نے تابعداری سے سر ہلایا۔

''پھر جارج کا سوٹ کیس پیک کرو۔''

''سوٹ کیس......'' اس نے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ ''مگر وہ کیوں؟''

''سوال نہ کرو، جیسا کہتی ہوں کرتی جاؤ۔'' میں نے ایسے لہجے میں حکم دیا جیسے ملازمہ کو کہہ رہی ہوں۔

''لیکن پھر بھی......''

''تاکہ پولیس کی نوبت آجائے تو تم بچ سکو۔''

''وہ کیسے......''

میں زچ ہوگئی۔ ''لگتا ہے تم پوری بات سنے بنا چین سے نہیں بیٹھوگی۔''

اس نے پھر سر ہلا دیا۔

''دیکھو کرنا یہ ہے۔'' میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہنا شروع کیا۔ ''تم مشہور کردوگی کہ وہ کچھ دنوں کے لیے نیویارک گیا ہے۔ جب وہ کافی عرصہ پلٹ کر نہیں آئے گا تو تم پولیس کو اطلاع کروگی۔ پولیس گمشدہ جارج کو کچھ مہینے تلاش کرے گی۔ آخر تھک ہار کر کیس داخلِ دفتر ہوگا اور پھر سال بھر میں سب بھول بھال جائیں گے۔''

''یہ تو کمال کا منصوبہ ہے۔'' اس کے چہرے پر پہلی بار خوشی دیکھی تھی۔

''دیکھو...... جارج کے سوٹ کیس میں شیونگ کٹ کریم، ٹوتھ پیسٹ اور اس کا جو کچھ ضروری سامان ہے، وہ یاد سے رکھ دینا۔''

''اور کچھ......'' میری نے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

''نہیں...... فی الحال یہ کرو۔''

تقریباً ایک گھنٹے کے اندر اندر سارا کام نمٹ چکا تھا۔ یہ اتنی جلدی نہیں ہوتا لیکن میں نے میری کا ہاتھ بٹایا۔ ''اب تم چائے بناؤ۔ تازہ دم ہوکر اسے ٹھکانے لگانے کا باقی کام کرتے ہیں۔'' میں نے انگلی سے لاش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمائش کی۔ لاش کو ہم پہلے ہی پلٹ کر، ہاتھ پاؤں سیدھے کر کے ایک چادر سے ڈھانپ چکے تھے۔

میری نے مسکرا کر دیکھا۔ ''ابھی لاتی ہوں۔'' وہ بے دام غلام نظر آرہی تھی۔

کچھ دیر بعد ہم دونوں اطمینان سے صوفے پر بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ فارغ ہوکر باہر نکلے۔ ایک ٹرالی میں کدال، پھاوڑا اور بیلچہ رکھا تھا۔ میری کو ساتھ لے کر اپنی زمین کی طرف جارہی تھی۔ اگرچہ اس کے گرد چار دیواری اور بڑا سا لوہے کا پھاٹک تھا جس پر زنگ خوردہ بھاری تالا پڑا تھا۔ البتہ کھولنے کا تکلف نہ تھا۔ گیٹ کے برابر کی دیوار کا ایک بڑا حصہ کافی عرصہ پہلے گر چکا تھا۔ ہم وہیں سے اندر داخل ہوئے اور اطراف کا جائزہ لیتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ میں درختوں کے جھنڈ میں ایسی جگہ ڈھونڈ رہی تھی کہ جہاں گڑھا کھودتے ہوئے ہم کسی کی نظروں میں نہ آسکیں۔

ویسے تو وہاں کسی کے آنے جانے کی کوئی امید نہ تھی لیکن میں بہت محتاط تھی۔ ذرا سی بھی غلطی نہیں کرنا چاہتی تھی۔

کچھ دیر بعد میری پوری قوت کے ساتھ زمین پر پھاوڑا چلا رہی تھی۔ میں قریب میں گرے ایک درخت کے سوکھے تنے پر بیٹھی تھی۔ ہفتہ بھر پہلے لگاتار چوبیس گھنٹے تک بارش پڑی تھی۔ زمین نرم تھی۔ دو گھنٹوں کے دوران ہم قبر نما گہرا گڑھا کھود چکے تھے۔

''اب ٹھیک ہے؟'' میری نے مجھے پکارا۔

چند لمحوں تک میں کنارے پر کھڑی دیکھتی رہی۔ وہ چھ فٹ لمبا، تین فٹ چوڑا اور تقریباً ڈھائی فٹ گہرا گڑھا تھا۔

''تم باہر آؤ......'' میں نے سہارے کے لیے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

''وہ باہر نکلی تو میں گڑھے کے اندر کودی۔ آدھا گھنٹے بعد میں اسے مزید ایک فٹ گہرا کر چکی تھی۔ کچھ دیر تک میں کھرپی کی مدد سے کھرچ کھرچ کر مٹی ہٹا کر قبر کو اندر سے ہموار کرتی رہی پھر کھڑے ہوکر گہری نگاہوں سے اندر کا

ٹیلی فون

ایک ننھی لڑکی نے پہلی مرتبہ ٹیلی فون میں اپنے باپ کی آواز سنی اور پھوٹ کر رونے لگی۔

''کیا ہوا بچی؟'' اس کی ماں نے پوچھا۔

''امی'' وہ بچی بولی۔ ''اب ہم اتنے تنگ سوراخ سے ابا جان کو کیسے نکالیں گے؟''

☆☆☆

ایک شخص تمام دن اپنی بکری کو تلاش کرتا رہا مگر بکری نہ ملی۔ رات کو تھک ہار کر گھر لوٹا تو دیکھا بکری گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ایک کونے میں کھڑی تھی۔

اس شخص کو بہت غصہ آیا اور چھری اٹھا کر بکری کو ذبح کر ڈالا۔ گوشت خود بھی کھایا اور محلے داروں کو بھی کھلایا۔

جب صبح اٹھ کر دیکھا تو بکری تو ایک کونے میں کھڑی تھی مگر کتا غائب تھا۔

ملک نذر حسین عاصم، مردان

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

جائزہ لیا۔ سب کچھ میرے منصوبے کے مطابق بہترین انداز میں مکمل ہو چکا تھا۔ ''ہاتھ دو......'' باہر نکلنے کے لیے میری کو پکارا۔

کچھ دیر بعد ہم دونوں واپس گھر پلٹے۔ منہ ہاتھ دھو کر کچھ آرام کیا۔ ہاتھ پاؤں درد کر رہے تھے، میری کافی بنانے چلی گئی تھی۔

''اب کیا کرنا ہے؟'' کچھ دیر بعد سامنے بیٹھی میری نے خالی کپ میز پر رکھتے ہوئے میری طرف دیکھا۔

''لاش اور سوٹ کیس، دونوں کو دفن کرنا ہے۔''

''او کے......'' اس نے تابعداری سے کہا۔

پہلی بار میں نے میری کے ساتھ اتنا وقت گزارا تھا۔ اس کا یہ انداز مجھے بہت پسند آیا۔ وہ کوئی چوں و چرا کیے بغیر میرا ہر حکم مان رہی تھی۔ ''اب تم ایسا کرو کہ سوٹ کیس لے کر جاؤ۔ اسے گڑھے میں ڈال دو اور ٹرالی لے آؤ۔''

پوری بات سنے بغیر وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اگلے دس منٹ میں ہم جارج کی لاش اٹھا کر گارڈن ٹرالی میں لادنے کی کوشش کر رہے تھے۔

''کافی بھاری تھا بھئی یہ تو۔'' میں نے کمر سیدھی کرنے کی کوشش کی۔

میری کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ ''سوری جارج...... میں یہ سب کچھ نہیں کرنا چاہتی تھی۔'' وہ ٹرالی کے قریب کھڑے ہو کر کہہ رہی تھی۔ جارج کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ اس کے ہاتھ اور پاؤں ٹرالی سے باہر لٹک رہے تھے۔ میری زیرلب کچھ دعائیہ کلمات ادا کر رہی تھی۔

''چلو......'' میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ یہ سب کچھ کرتے ہوئے پہلی بار میں خوفزدہ ہو رہی تھی۔

کچھ دیر بعد ہم دونوں ٹرالی کو دھکیلتے ہوئے کچن کے راستے عقبی گارڈن میں نکل رہے تھے۔ میں نے باہر نکل کر دیکھا۔ دور دور تک کسی کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ میں واپس ٹرالی کی طرف پلٹی۔ میری اسے ہتھے کی طرف سے پکڑ کر آگے دھکیل رہی تھی اور میں دوسری طرف سے اسے آگے کی جانب کھینچ رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ہم جارج کو گڑھے میں دھکیل چکے تھے۔ میری اندر اتری۔ اس کے ہاتھ پاؤں پکڑ کر سیدھے کیے۔ سوٹ کیس لاش کے برابر رکھا اور میرا ہاتھ پکڑ کر باہر نکل آئی۔ وہ بہت سہمی ہوئی تھی۔ آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

باہر آ کر اس نے بیلچہ اٹھایا اور مٹی پھینکنے ہی والی تھی کہ میں نے جلدی سے اس کا ہاتھ روک دیا۔ ''سب کچھ ایسے ہی رہنے دو۔''

اس نے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ ''مگر لاش تو......''

''تم ٹرالی لے کر چلو اور اسے لاؤنج کے کونے میں کھڑی کر دو۔'' یہ کہہ کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ ''پھاوڑا، بیلچہ، کدال اور کھرپی یہیں رہنے دو۔ ان چیزوں کی بعد میں ضرورت پڑے گی۔''

''لیکن اب کیا کرنا باقی رہ گیا؟''

''کچھ اور کرنا باقی ہے ابھی۔'' میں نے اس کی طرف دیکھے بنا زیرلب جواب دیا۔ اس وقت میرا دماغ کسی اور سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

''او کے۔'' یہ کہہ کر وہ ٹرالی لے کر گھر کی طرف بڑھی۔ مجھے اس کے چہرے پر تعجب کے آثار نظر آ رہے تھے۔

مجھے پتا تھا کہ وہ کیا سوچ رہی ہوگی۔ یہ میں جانتی تھی لیکن وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ میں کیا سوچ رہی ہوں اور کیا کرنا باقی رہ گیا ہے۔

جب اس کام سے فارغ ہوئے تو سہ پہر کے تین بج رہے تھے۔ ہم دونوں اس مشقت سے بری طرح تھک چکے تھے۔ میری نے چائے بنائی۔ ساتھ چاکلیٹ بسکٹ تھے۔

''اب قبر پر مٹی ڈالنا باقی ہے، وہ کب کریں گے؟'' چائے ختم کر کے اس نے پوچھا۔

''اچھے وقت پر سوال کیا ہے تم نے۔'' یہ کہہ کر میں نے تعریفی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ ''اب بتاتی ہوں کہ تمہیں آگے کیا کرنا ہوگا۔''

اس نے سوالیہ نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ ''تو بات یہ ہے کہ......'' میں نے اسے ہدایت دینی شروع کی۔

وہ میری بات خاموشی سے سن رہی تھی لیکن جیسے جیسے میں آگے کا بتاتی جا رہی تھی، اس کے چہرے کے تاثرات بدلتے جا رہے تھے۔ ''تو سمجھ گئیں کہ اب کیا کرنا باقی ہے۔'' اپنی بات مکمل کر کے میں نے اس کی طرف تصدیق طلب نگاہوں سے دیکھا۔

اس نے کچھ کہنے کے بجائے میری طرف حیرت سے دیکھا اور اثبات میں سر ہلانے پر ہی اکتفا کیا۔

میں نے لاؤنج پر نظر ڈالی۔ ایک کونے میں پیتل کا ایک چھوٹا سا گلدان رکھا تھا۔ ''یہ ٹھیک رہے گا۔'' میں نے اس جانب انگلی سے اشارہ کیا۔

''میرا خیال ہے تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔'' اس نے بھی گلدان کی طرف دیکھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

''اب تم نہادھو کر آرام کرلو۔ جیسے ہی میرا میسج ملے تم تیار ہوجانا۔ ہر کام منصوبے کے مطابق ہونا چاہیے ورنہ تم پھنس بھی سکتی ہو۔'' میں نے اسے ڈرانے کی کوشش کی تاکہ وہ اپنا کام ٹھیک ٹھیک کرسکے ورنہ ذرا سی غلطی بنا بنایا کام بگاڑ سکتی تھی۔

''جیسا کہا ہے، سب اسی طرح ہوگا۔'' میری نے پُراعتماد لہجے میں مجھے یقین دلانے کی کوشش کی۔

جب میں اس کے گھر سے نکلی تو پونے پانچ بج چکے تھے۔ مجھے افسوس تھا کہ پورے دن کا شیڈول غارت ہوگیا۔ گھر کا کچھ کام بھی باقی تھا۔ اس کے بعد ڈنر بھی تیار کرنا تھا۔ ایک خوشی تھی کہ آئندہ گھر اتنا نہیں پھیلے گا کہ صاف کرتے کرتے پورا دن ہی غارت ہوجائے۔

میں نے باقی کے ادھورے کام نمٹائے، البتہ مارکیٹ جانے کا وقت نہیں تھا۔ ڈنر تیار کیا اور دروازے سے لگ کر آرویل کے آنے کا انتظار کرنے لگی۔ وہ ساڑھے چھ بجے تک گھر پہنچ جاتا تھا لیکن خلاف توقع اسے تاخیر ہورہی تھی۔ میں بےچینی سے اس کے آنے کا انتظار کررہی تھی۔

آخر تھک ہار کر لاؤنج میں کرسی پر بیٹھ گئی۔ نظریں دروازے پر ہی تھیں۔

سات بجے کے قریب آرویل گھر میں داخل ہوا۔ ''گڈ ایوننگ......''

''تم کچھ غلط بول رہے ہو۔'' میں نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ ''گڈ نائٹ۔''

''اوہ میرے خدا...... تم تو ہر بات میں غلطی نکالنے کی ماہر ہو۔'' اس نے صوفے پر بیٹھ کر جوتے اتارتے ہوئے کہا۔

میں خاموشی سے اُسے دیکھ رہی تھی۔ کچھ دیر میں سلیقے سے سنورا لاؤنج بےترتیبی کا نمونہ بن چکا تھا۔ ایک طرف جوتے الٹے پڑے تھے۔ صوفے کے ہتھے سے موزے لٹک رہے تھے۔ بک شیلف پر ٹائی لٹک رہی تھی۔ فرش پر ہینڈ بیگ پڑا تھا۔ یہ سب کچھ دیکھ کر میرے پاس اپنا جی جلانے کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہ تھا۔

آرویل باتھ روم سے نکلا تو ٹی شرٹ اور جینز میں تھا۔ ''کافی نہیں بنائی......''

اس نے ٹیبل کی طرف دیکھا۔ میں صوفے پر موبائل تھامے بیٹھی تھی۔ ''میری نے فون کیا ہے، کوئی ایمرجنسی ہے۔''

''کیا ہوا......؟'' آرویل نے پوچھا۔

''ابھی ابھی میری کا فون آیا تھا۔ وہ ہمیں بلا رہی ہے۔ کہہ رہی تھی کہ ہم دونوں فوراً پہنچیں کوئی ایمرجنسی ہوگئی ہے۔''

''اوہ......'' اس نے میز پر سے موبائل فون اٹھاتے ہوئے کہا۔

میں جارہی ہوں، تم بھی ساتھ چلو۔ واپس آکر کافی بناتی ہوں۔'' یہ کہہ کر میں اس کے آنے کا انتظار کیے بنا دروازے کی طرف بڑھی۔

''میں بھی آرہا ہوں۔'' اسی دوران مجھے فون کی گھنٹی سنائی دی۔ میں نے موبائل فون دیکھا۔ شاید آرویل کا فون تھا۔

میں جارج کے گھر کی طرف بڑھ رہی تھی کہ پیچھے سے آرویل بھی دوڑتا ہوا آگیا۔ داخلی دروازہ کھلا ہوا تھا۔

''میری، میری...... جارج...... کہاں ہو تم۔'' میں انہیں پکارتی ہوئی اندر داخل ہوئی لیکن وہاں حسبِ توقع کوئی نہ تھا۔

میرے پیچھے پیچھے آرویل اندر داخل ہوا۔ ''کوئی نہیں ہے کیا۔''

اس سے پہلے کہ میں جواب دیتی۔ عقب سے میری نے اس کے سر پر پیتل کے گلدان سے وار کیا۔

ایک ہی وار کارگر ثابت ہوا۔ اگلے ہی لمحے آرویل سر پکڑے ہوئے فرش پر گر رہا تھا۔

''ویل ڈن میری......'' میں نے اس کی طرف تعریفی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ دروازے کی اوٹ سے نکل کر سامنے آگئی تھی۔ میں اسے کانپتے ہوئے دیکھ سکتی تھی۔ گلدان اب تک اس کے ہاتھ میں تھا۔

آرویل اوندھے منہ فرش پر بےحس و حرکت پڑا تھا۔ اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ سب کچھ منصوبے کے مطابق ہورہا تھا۔ البتہ میری بدستور نروس نظر آرہی تھی لیکن مجھے اب کوئی فکر نہیں تھی۔ جارج کی کھلی قبر کو آرویل کا انتظار تھا۔ کچھ دیر کے بعد دونوں کا ہمیشہ ہمیشہ کا ساتھ ہوجانا تھا۔

''چلو...... اب ٹرالی نکالو۔'' میں نے آگے بڑھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''اسے دیکھ لو، شاید زندہ ہو۔'' میری نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔

''اس کی کوئی ضرورت نہیں۔'' میں سفاکی سے مسکرائی۔ ''اگر زندہ بھی ہے تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ منوں مٹی کے نیچے سانس بہت دیر تک نہیں چلتی۔ ہمیں اب کون سی دیر کرنی ہے۔ تم جلدی سے ٹرالی لاؤ۔''

مجھے آرویل کی دس لاکھ ڈالر کی لائف انشورنس پالیسی بھی صاف نظر آرہی تھی۔ میں لالچی نہیں ہوں لیکن آرویل

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

کے بعد مجھے پیسے کی تو ضرورت ہوگی۔ یہ پالیسی میری باقی کی زندگی کے لیے کافی ہوگی۔ ویسے آرویل اچھا آدمی تھا لیکن ایک برائی تھی اس میں۔ وہ گھر کی صفائی ستھرائی کی بالکل بھی پروا نہیں کرتا تھا۔ میں اس سے بہت پیار کرتی تھی لیکن اس عادت پر گزشتہ پندرہ سالوں میں کوئی سمجھوتا نہیں کر پائی تھی۔ اگر وہ خود میں تھوڑی سی تبدیلی لے آتا تو شاید یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔ اس کے ساتھ رہنا روز بروز مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ ''اچھا ہے، جان چھوٹی۔ اب گھر میں کم کام کرنا پڑے گا اوپر سے انشورنس......

میں نے نم پلکوں سے آرویل کی طرف دیکھا۔ پندرہ سال کا ساتھ چھوٹنے پر دکھ ہونا فطری تھا۔ مجھے رونا آرہا تھا لیکن میری کی وجہ سے خود پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ پہلے ہی نروس تھی۔ مجھے روتا دیکھ کر وہ ہاتھ پاؤں چھوڑ سکتی تھی۔ وہ جس پوزیشن میں گرا تھا، ویسے ہی پڑا ہوا تھا۔ اس کے سر سے خون تیزی سے بہہ رہا تھا۔

''تم ٹرالی لاؤ......'' میں نے برابر کھڑی میری سے سخت لہجے میں کہا تو وہ اپنی جگہ سے ہلی۔

ہم دونوں نے بڑی مشکل سے آرویل کو اٹھا کر ٹرالی پر لادا۔ سر سے بہنے والے خون سے فرش گندا ہو گیا تھا۔ میرے ہاتھ بھی خون میں لت پت ہو رہے تھے۔ میں نے آرویل کے سر کے گرد بڑا سا تولیا لپیٹ دیا۔

ابھی ہم ٹرالی گھسیٹنے ہی والے تھے کہ اچانک شیرف رابرٹ اندر داخل ہوا۔ ''جارج...... آرویل۔'' جیسے ہی اس کی نظر ہم پر پڑی، وہ جہاں تھا، وہیں تھم گیا۔ ''کیا ہوا......'' اس سے پہلے ہم دونوں کچھ سمجھ پاتے، وہ پستول نکال چکا تھا۔ ''اپنے ہاتھ اوپر اٹھاؤ۔''

ہم دونوں سخت خوفزدہ ہو چکے تھے۔ جھٹ سے ہاتھ اوپر اٹھا دیے۔

''آگے بڑھو اور دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑی ہو جاؤ۔'' شیرف نے سخت گیر لہجے میں حکم دیا۔

''بازی پلٹ چکی۔'' میں نے زیر لب میری سے کہا۔

ہم دونوں آہستہ سے پلٹے اور لرزتے قدموں سے دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو گئے۔ میں نے کن انکھیوں سے میری کی طرف دیکھا۔ وہ پتے کی طرح لرز رہی تھی۔

شیرف وائرلیس پر پولیس اور ایمبولینس بھیجنے کی ہدایت کر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد پولیس ہم دونوں کو گرفتار کر چکی تھی۔ ہماری نشاندہی پر جارج کی لاش کو گڑھے سے نکال کر مردہ خانے منتقل کر دیا گیا تھا۔

خوش قسمتی سے آرویل صرف بے ہوش ہوا تھا۔ اسے اسپتال منتقل کیا جا چکا تھا۔ پولیس ہم دونوں کے ہاتھ پشت پر کر کے ہتھکڑی لگا چکی تھی۔ ایک آفیسر آگے بڑھا اور ہمیں پولیس کار کی طرف دھکیلا۔

''تم کیسے پہنچے؟'' میں شیرف کے قریب رکی اور سپاٹ لہجے میں پوچھا۔ کیونکہ میں حیرت زدہ تھی کہ وہ اچانک وہاں کیسے آگیا۔

''آرویل کی گاڑی راستے میں خراب ہو گئی تھی، وہ اسے وہیں چھوڑ کر آگیا تھا۔'' شیرف نے کہنا شروع کیا۔ ''میں نے سیونتھ ایونیو، اسٹریٹ اینڈ پر جب اس کی کار دیکھی تو اسے فون کیا۔ اس پر آرویل نے بتایا کہ وہ جارج کے گھر جا رہا ہے۔ کچھ ایمرجنسی ہے۔ یہی سن کر میں پہنچا تھا ورنہ تم نے تو اپنا کام دکھا دیا تھا۔'' یہ کہہ کر اس نے مجھ پر ایک گہری نظر ڈالی۔ ''یہ تو اتفاق کی بات ہے کہ میں سیونتھ ایونیو سے گزرا ورنہ تو گھر جانے کے لیے ہمیشہ دوسرے راستے سے گزرتا ہوں۔ شاید قدرت کو اس اتفاق کے ذریعے آرویل کی جان بچانا مقصود تھا ورنہ تو......'' اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

مجھے یاد آیا کہ آرویل دیر سے گھر پہنچا تھا اور اس کے آنے پر گاڑی کی آواز بھی نہیں سنائی دی تھی۔ میں نے اسے اتنا وقت ہی نہیں دیا تھا کہ وہ اس بارے میں کچھ بتا سکتا۔ ویسے بھی شیرف اور آرویل کبھی کلاس فیلو تھے اور وہ دوستی اب تک قائم تھی۔

''چلو......'' پولیس افسر نے مجھے کار کی طرف دھکیلا۔

میں مسکرائی۔ کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی لیکن یہ دیکھنا بھول گئی کہ میرے پیچھے آنے والا آرویل گھر سے نکلتے ہوئے کس سے بات کر رہا تھا۔ یک دم مجھے موبائل فون سے شدید نفرت محسوس ہونے لگی۔ اس موبائل نے میری جیتی بازی کو ہار میں بدل دیا تھا۔

میری نے گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے گردن گھما کر میری طرف دیکھا۔ وہ زارو قطار روئے جا رہی تھی۔ اچانک مجھے سکون محسوس ہوا۔ کم از کم جیل میں کوئی تو ایسا ہوگا، جس پر میں اپنا حکم چلا سکوں گی۔ مجھے یقین تھا کہ گھر کی نسبت کم از کم جیل میں اتنا پھیلاوا نہیں ہوگا کہ سمیٹتے سمیٹتے پورا دن گزر جائے۔ یہ سوچ کر کچھ اطمینان ہوا۔ یک دم پچھلے پندرہ سالوں کی تھکن غالب آنے لگی۔ میں نے گہری سانس بھری اور آنکھیں بند کر لیں۔

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

نروان

منظر امام

ایک راست گو انسان شیطان کو شدید اذیت پہنچا سکتا ہے... تھوڑا سا علم جس کے ساتھ عمل بھی ہو... اس علم سے کہیں برتر ہے جو بے مصرف ہو... ایک دانا شخص کی حکمت... اس کا علم بشری کمزوریوں اور مصیبتوں سے بے نیازی کا سبق دیتا تھا... اس کا کہنا تھا کہ جو اپنے ساتھیوں کو صحیح راستے پر چلانا نہیں سکھاتا وہ کم مایہ انسان ہے... علم و دانائی کو سمجھو اور اپنی زندگی میں برتو... اصل نروان کی تلاش میں سرگرداں ایک خطاکار کی جدوجہد...

دل کی گہرائیوں سے پڑھی جانے والی ایک روح پرور کہانی....

میں نے الاؤ جلا لیا تھا۔ سوکھی لکڑیاں اِدھر اُدھر سے مل گئی تھیں۔ اس جنگل میں ایسی لکڑیوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک عرصے سے بارش نہیں ہوئی تھی اسی لیے سارے درخت سوکھے ہوئے تھے۔

پتا نہیں کیا ہو گیا ہے۔

قدیم زمانے کے کسی کردار کی طرح۔ جو شہر چھوڑ کر جنگل کی راہ لیتا ہے اور نروان تلاش کرنے میں مگن ہو جاتا ہے۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN

وہ جنگل میں رہائش اختیار کر لیتا ہے۔ کیونکہ اسے سکون کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ اپنے اندر ڈوب کر اپنے خدا اور اپنی روح کو تلاش کرنا چاہتا ہے اور ان کی رہنمائی میں زندگی گزارنا چاہتا ہے۔

میرے پاس تو سب کچھ تھا۔

بہت اچھی نوکری تھی میری۔ کمپنی نے گاڑی دے رکھی تھی۔ ایک شاندار فلیٹ تھا جس کا کرایہ بھی کمپنی ادا کرتی۔ میں اس فلیٹ میں اکیلا رہتا تھا۔

مزاج ہی ایسا تھا۔ حالانکہ اسی شہر میں دو بھائی اور ایک بہن بھی تھے لیکن میں نے الگ تھلگ کی زندگی پسند کی تھی۔ اپنی مرضی کی زندگی۔

میرا نام فہیم ہے۔ مجھ سے چھوٹا ندیم، پھر شمیم، ندیم تو کسی حد تک مالی لحاظ سے ٹھیک ہے لیکن شمیم کے مالی حالات بہت خراب رہتے ہیں۔

دونوں بھائی شادی شدہ ہیں سوائے میرے۔ میں نے پابندی قبول نہیں کی، آوارہ ہی رہا۔ آزاد اور بے فکر۔

تو میں یہ بتا رہا تھا کہ زندگی بالکل اسی طرح چل رہی تھی جس طرح ہوا کرتی ہے۔ ایک نارمل انسان کی نارمل زندگی۔ صبح دفتر جانا۔ دوستوں کے ساتھ وقت گزارنا۔ دوست لڑکیوں کے ساتھ تھوڑی تفریح۔ اس کے علاوہ ایک نارمل انسان کی زندگی میں کیا ہوتا ہے۔

لیکن ایک دن اچانک بکھرے الجھے بالوں اور وحشت ناک آنکھوں والا ایک شخص مل گیا۔

وہ مجھے پارک میں ملا تھا۔ یہ پارک میرے فلیٹ کی بلڈنگ سے قریب تھا۔ بے اعتدالی کی زندگی گزارنے کے باوجود کچھ عادتیں مجھ میں مثبت بھی تھیں۔

جیسے صبح اٹھنا، پارک میں جا کر واک کرنا اور کتابیں پڑھنا۔ میرے فلیٹ میں کتابوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ کہتے ہیں نا کہ کتابیں انسان کی بہت اچھی دوست ہوتی ہیں۔

تو میں نے صرف کتابوں سے ہی دوستی نہیں کی تھی بلکہ زندہ چلتے پھرتے انسان بھی میرے دوست تھے۔ خاص طور پر لڑکیاں۔ جن کے ساتھ وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوتا تھا۔

تو اس دن وہ الجھے بالوں والا شخص پارک میں مجھے مل گیا تھا۔

میں واک کر کے کچھ دیر ستانے کے لیے ایک بینچ پر آکر بیٹھا تھا کہ وہ بھی نہ جانے کس طرف سے نمودار ہو کر میرے ساتھ آکر بیٹھ گیا۔ اسے دیکھ کر تھوڑی سی وحشت ہوئی تھی لیکن میں اپنی جگہ بیٹھا رہا۔

''کیا تم یہاں روزانہ سیر کرنے آتے ہو؟'' اس نے اچانک سوال کیا۔

''جی ہاں، روزانہ آتا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

''اس سے کیا فائدہ ہوتا ہے؟'' اس نے دوسرا سوال کیا۔

''جناب! میں آپ کو کیا بتاؤں کہ اس سے کیا فائدہ ہوتا ہے۔ پوری دنیا جانتی ہے کہ واک کرنا صحت کے لیے بہت ضروری ہے۔''

''لیکن تم تو اچھے خاصے بیمار ہو۔'' اس نے ایک عجیب بات کہہ دی۔

اس کی بات سن کر میں طیش میں آ گیا۔ ''غلط فہمی ہے تمہاری۔ میں بالکل تندرست ہوں۔ نہ تو مجھے کولیسٹرول ہے، نہ ہی شوگر ہے اور نہ ہی دل کا کوئی عارضہ لاحق ہے۔ پھر یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ میں بیمار ہوں؟''

''اس لیے کہ تمہاری روح بیمار ہے۔'' اس نے کہا۔ ''اس پر دھبے پڑے ہوئے ہیں۔ زخم ہی زخم ہیں۔ ان کا علاج بہت ضروری ہے۔''

''واہ! تم نے میری روح تک کو دیکھ لیا؟'' میں نے اس کا مذاق اڑایا۔

''ہاں، کیونکہ میرے خدا نے مجھے یہ صلاحیت دی ہے۔ تم تو صرف اپنے ظاہری جسم کو دیکھ کر دعویٰ کر رہے ہو کہ تم بیمار نہیں ہو جبکہ میں تمہاری روح کو دیکھ رہا ہوں۔ علاج کر لو ورنہ یہ زخم ناسور بن جائیں گے۔''

اتنا کہہ کر وہ اٹھ کر چلا گیا۔

اس دفعہ میں اس سے کچھ کہہ نہیں سکا۔ اس کی طرف دیکھتا اور سوچتا رہ گیا۔

اس کی باتوں نے مجھے کچھ پریشان کر دیا تھا۔ کیسا آدمی تھا۔ وہ مجھے کچھ اشارے دے گیا تھا۔ کیا وہ کوئی خاص آدمی تھا یا یونہی کسی کو مرعوب کرنے والا ہنر مند۔

لیکن شاید وہ ایسا نہیں تھا۔

اس نے جو کہا تھا، وہ کسی حد تک مجھے سوچنے پر مجبور کر رہا تھا۔ ہو سکتا ہے میری روح واقعی بیمار ہو۔ گھر آکر میں نے اپنا تجزیہ شروع کر دیا۔

اس کی بات دل کو لگ گئی تھی۔

میں نے بڑی لاابالی اور کسی حد تک گناہوں والی زندگی گزاری تھی۔ میرے پاس پیسے بھی تھے۔ فلیٹ بھی تھا۔ گاڑی بھی تھی اور لڑکیوں سے دوستی بھی رہی تھی۔ ایسی

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

صورت میں اپنا دامن صاف رکھنا ذرا مشکل ہو جاتا ہے اور میرا دامن صاف نہیں تھا۔

اس کے علاوہ یہ بھی تھا کہ میں نے نماز، روزے وغیرہ کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔ بس دل میں آتا تو نماز پڑھ لیتا تھا ورنہ نہیں۔

یہ تو خیر ظاہری بے پروائیاں اور کوتاہیاں تھیں جو دکھائی دیتی ہیں۔

دکھائی نہ دینے والی بھی کئی اخلاقی کمزوریاں موجود تھیں۔

جیسے باس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے تھوڑی خوشامد اور جھوٹ وغیرہ۔ یہ بھی تو اخلاقی برائیاں تھیں۔ شاید ان سب نے مل کر میری روح کو داغ دار کر دیا ہو۔

ہاں، اس کے علاوہ یہ بھی تھا کہ میں اپنے بھائیوں اور بہنوں کی طرف ذرا کم ہی جایا کرتا۔ کبھی چلے گئے تو چلے گئے ورنہ گول کر گئے۔

شاید اس الجھے ہوئے بالوں والے شخص نے ان ہی باتوں کی طرف توجہ دلانے کی کوشش کی تھی۔

وہ رات تو اسی سوچ بچار میں گزری لیکن صبح ہوتے ہوتے میں سب بھول چکا تھا۔ ایسے لوگ تو زندگی میں ملتے ہی رہتے ہیں۔ اب آدمی اگر سب پر دھیان دیتا رہے تو پھر وہ کسی کام کا نہ رہے۔

پھر سب کچھ پہلے کی طرح ہو گیا۔ وہی شب و روز، وہی مستیاں جو میری زندگی کا حصہ بن چکی تھیں۔

ایک شام میں ذرا دیر سے گھر لوٹا تو اپنے بھائی شمیم کو سیڑھیوں پر کھڑا ہوا دیکھا۔ کچھ عجیب سا لگا تھا۔ کیونکہ آدھ گھنٹے بعد کسی کو میرے پاس آنا تھا۔ میرے دفتر کے کچھ افسران تھے۔

انہیں میرے ہی فلیٹ میں ایک ضروری میٹنگ کرنی تھی۔

''اوہ شمیم۔'' میں بظاہر خوش دلی سے بولا۔ ''تم کب آئے؟''

''بہت دیر ہو گئی بھائی۔'' اس نے کہا۔ ''آج شاید آپ کو واپسی میں دیر ہو گئی۔ ورنہ آپ تو عام طور پر جلدی آجاتے ہیں۔''

''ہاں ایک میٹنگ میں پھنس گیا تھا۔'' میں نے بتایا۔ ''آؤ، اندر آؤ۔''

شمیم میرے ساتھ اندر آ گیا۔ وہ کچھ الجھا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کسی خاص مقصد سے اس طرح میرے پاس آیا ہو گا۔

میں نے اس کے لیے اور اپنے لیے جوس بنایا۔

''کیسے ہیں بھائی؟'' اس نے گلاس اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

''یار، یہ مت پوچھو۔'' میں نے اپنے لہجے میں پریشانیاں سمیٹ لیں۔ ''بہت بری طرح پھنسا ہوا ہوں۔''

''وہ کیوں؟''

''ارے بھائی، کیا بتاؤں۔ ابھی گاڑی خریدی ہے۔ اس کی پے منٹ کرنی ہے۔ اس کے علاوہ میں نے ایک فلیٹ بک کرا لیا ہے۔ اس کی قسطیں دینی ہیں۔ تم تو جانتے ہو کہ ملازمت پیشہ لوگوں کی حالت کیا ہوتی ہے۔ بس کسی طرح سفید پوشی کا بھرم قائم رکھتے ہیں۔ خیر، میری چھوڑو۔ عالیہ کیسی ہے؟'' (عالیہ، شمیم کی بیوی کا نام تھا)

''عالیہ ٹھیک ہی ہے بھائی۔''

''اور تینوں بچے؟''

''وہ بھی ٹھیک ہیں۔'' وہ دھیرے سے بولا۔ ''دو مہینوں سے ان کی فیس نہیں دے سکا ہوں تو اسکول میں ان کے ساتھ پرابلم ہو گئی ہے۔''

''یہ تو ہے۔ یہ اسکول والے کسی کی مجبوریاں کہاں سمجھتے ہیں۔ ویسے برا مت ماننا۔ تم کو بھی بچوں کو مہنگے اسکولوں میں پڑھانے کا شوق ہے۔''

''شوق نہیں مجبوری ہے بھائی۔ سرکاری اسکولوں کی حالت تو آپ جانتے ہیں۔'' شمیم نے کہا۔

''ہاں، جانتا ہوں۔ خیر کوئی بات ہو تو مجھے بتاؤ۔''

''اب آپ کو کیا بتاؤں۔ آپ تو خود اپنی الجھنوں میں ہیں۔'' وہ دھیرے سے بولا۔ ''اچھا میں چلتا ہوں۔ پھر آؤں گا۔''

''ایک منٹ ٹھہرو۔'' میں نے کہا۔

میں اپنے کمرے سے ایک ہزار لے کر اس کے پاس آ گیا۔ ''لو، یہ رکھ لو۔'' میں نے کہا۔

''وہ کیوں بھائی؟''

''رکھ لو، شاید تمہارے کام آ جائیں۔''

''رہنے دیں بھائی۔ میں یہ ایک ہزار لے کر آپ کے مسائل میں اضافہ نہیں کرنا چاہتا۔'' وہ یہ کہہ کر چلا گیا۔

کچھ دیر کے لیے مجھے دکھ بھی ہوا۔ پھر دفتر کے آفیسرز آ گئے۔ ہنسی مذاق اور میٹنگ کے دوران شمیم کی یاد ہوا کے ایک جھونکے کی طرح گزر گئی۔

کئی دنوں کے بعد پارک میں واک کے دوران میں

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

پھر وہی شخص مل گیا۔ وہی اُلجھے ہوئے بالوں والا۔ مجھے دیکھ کر وہ تیزی سے میرے پاس آگیا۔ اس وقت اس کے ہونٹوں پر بڑی حقارت آمیز مسکراہٹ تھی۔ ''مبارک ہو۔'' اس نے کہا۔ ''تم نے اپنی روح کے زخموں میں ایک اور بہت بڑے زخم کا اضافہ کرلیا ہے۔''

''اے بھائی، تم یہ بتاؤ تم اپنا یہ ناٹک صرف میرے ساتھ کرتے ہو یا دوسروں کی روحوں میں بھی جھانکتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''میں ہر ایک کی روح میں جھانکتا ہوں لیکن کسی کے لیے بولنے کا اختیار اس وقت ملتا ہے جب خدا کی طرف سے اسے توفیق ملنے کا اشارہ دیا گیا ہو۔ میں تو ایک ڈاکیا ہوں بھائی۔ میرا کام صرف پیغام پہنچانا ہے اور وہ پیغام یہ ہے کہ تمہیں توفیق ملنے والی ہے۔ بشرطیکہ تم نے محنت کی۔ ایسے نصیب بھی کم ہی لوگوں کے ہوتے ہیں۔''

اس بار تو اس نے میرے وجود میں آگ لگادی تھی۔

توفیق۔ کیا واقعی مجھے توفیق ملنے والی تھی۔ مجھ جیسے گنہگار کو بھی ایسی سعادت حاصل ہوسکتی ہے؟ مجھے ایک ایسی بے چینی سی ہوگئی جس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ بہت کچھ یاد آنے لگا تھا۔ ایسے بزرگوں کے قصے، جو مجھ سے بھی زیادہ گنہگار اور خطاکار تھے۔ پھر انہیں توفیق مل گئی تھی۔ اس کے بعد ان کے مرتبے اتنے بلند ہوگئے تھے کہ آج بھی لوگ ان کے نام احترام سے لیتے اور انہیں یاد کرتے ہیں۔

لیکن میں نے تو زندگی میں کبھی ایسی بات بھی نہیں سوچی تھی پھر میرے ساتھ ایسی مہربانی کیوں؟

میں سوچتا اور اپنے اندر کی آگ میں جھلستا چلا گیا۔

اچانک ہی میرا دل اپنی دنیا اور یہاں کے مسئلوں سے اُکتا گیا تھا۔

کیا رکھا تھا۔ کچھ بھی تو نہیں۔ سوائے انتشار کے، افراتفری کے، ڈپریشن کے۔ اس اُلجھے ہوئے بالوں والے انسان نے میری سوچ کی راہیں بدل دی تھیں۔

مجھے اپنے آپ کو تلاش کرنا تھا۔ اپنی روح کو تلاش کرنا تھا اور اپنے خدا کو تلاش کرنا تھا۔ اس شخص نے اسی طرف تو اشارہ کیا تھا۔

اور یہ سب کچھ اس اُلجھی ہوئی زندگی اور مصنوعی ماحول میں تو نہیں مل سکتا تھا۔ مجھے کہیں اور جانا تھا۔ کسی اور طرف۔

نہ جانے مجھے کیا ہوا تھا۔ میں اپنا دھیان ہٹانے کی کوشش بھی کرتا تو بھی اس شخص کا چہرہ سامنے آجاتا۔ اس کی باتیں ذہن میں گونجنے لگتیں۔ اس کے ساتھ مجھے اپنے وجود میں زخم دکھائی دینے لگتے اور ایک رات اسی وحشت کے عالم میں، میں نے ایک فیصلہ کرلیا اور دوسری صبح اس فیصلے پر عمل بھی کر بیٹھا۔

☆☆☆

سخت سردی تھی۔

لیکن الاؤ کی آنچ اور اپنے وجود کی آنچ نے سردی کے اس احساس کو بہت حد تک کم کردیا تھا۔ مجھے اب ایسی چیزوں کی طرف دھیان دینے کی فرصت ہی کہاں تھی۔ میں تو اپنی روح، اپنے آپ اور اپنے خدا کو تلاش کرتا پھر رہا تھا۔

میں تین مہینوں سے اسی جنگل میں بھٹک رہا تھا۔

پتا نہیں کیا ہوا تھا۔ جس رات میں نے یہ فیصلہ کیا، اس کے دوسرے دن میں نے دفتر پہنچ کر طویل چھٹی کی درخواست دے دی۔ باس نے مجھے اپنے کمرے میں بلاکر دریافت کیا۔ ''خیریت تو ہے خورشید صاحب! چھٹی کی ضرورت کیوں پیش آگئی؟''

''سر! میں کیا بتاؤں، بس یہ سمجھ لیں اپنے خدا کی تلاش میں جارہا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''خدا کی تلاش میں؟'' باس نے حیران ہوکر میری طرف دیکھا۔ ''میں آپ کی بات نہیں سمجھا۔''

''سر! انسان کا اپنے مرکز کی طرف لوٹنا بہت ضروری ہے۔'' میں نے کہا۔ ''دنیا بھر میں اِدھر اُدھر بھٹکنے کے بعد بھی واپسی اسی کی طرف ہوتی ہے تو میں اس کی طرف واپس ہونے کے لیے جارہا ہوں۔''

باس نے ہمدردانہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ ''میرا خیال ہے کہ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''

''میں بالکل ٹھیک ہوں سر۔'' میں مسکرادیا۔ ''آپ یہ نہ سمجھیں کہ میں پاگل ہوگیا ہوں یا ذہنی مریض ہوں۔ صرف اتنا ہوا ہے کہ مجھے اپنے آپ کو اپنی روح کو اور اپنے خدا کو تلاش کرنا ہے۔''

''تو کیا یہ سب کچھ آپ کو یہاں نہیں مل سکتا؟''

''نو سر، میں کوشش کرکے دیکھ چکا ہوں۔'' میں نے بتایا۔ ''یہاں کی زندگی میں یکسوئی بہت مشکل ہے۔ جس کی طرف دھیان دینا ہو اس کی طرف دھیان نہیں دے سکتا اور جتنی فالتو چیزیں ہیں، وہ سب دھیان میں چلی آتی ہیں۔''

''چلیں، جو آپ کی مرضی۔'' باس نے کہا۔ ''اس دفتر میں ہمیشہ آپ کی جگہ رہے گی۔ آپ جب چاہیں واپس آسکتے ہیں۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

''بہت شکریہ سر! ایک بات اور۔ میں کمپنی کی گاڑی بھی واپس کر رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''ارے وہ کیوں؟''

''جب تک میں چھٹی پر ہوں۔ تب تک اس گاڑی پر میرا کوئی حق نہیں ہے۔ میں اسے استعمال نہیں کرسکتا اور آپ نے جو اپارٹمنٹ دلایا ہے، وہ بھی واپس لے لیں۔ میں خالی ہاتھ جانا چاہتا ہوں۔''

''خورشید صاحب! اس میں تو آپ کا سامان بھی ہو گا۔ اس کا کیا ہوگا؟''

''میں اپنے دوست کا ایڈریس لکھوا رہا ہوں۔ میرا سارا سامان اس کے یہاں بھجوا دیجیے گا۔''

پورے دفتر میں یہ بات پھیل گئی کہ میں نروان حاصل کرنے کے لیے جنگل کی طرف جا رہا ہوں۔ خدا کو تلاش کرنا ہے۔ بہت سے لوگ طنزیہ انداز میں مبارک باد دینے آئے۔ ''ارے بھائی مبارک ہو۔ سنا ہے گوتم بدھ کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کر رہے ہو۔''

دوسرے نے کہا۔ ''یار، جب تمہیں جنگل میں خدا مل جائے تو ہم غریبوں کی سفارش بھی کر دینا۔''

اپنے آپ پر جبر ضروری تھا۔ ایسی تلخ باتیں سنی تھیں اور برداشت کرنی تھیں۔ یہی شاید اپنی تلاش کا پہلا زینہ تھا۔

اگر کوئی اور موقع ہوتا تو شاید سب سے میرا جھگڑا ہو چکا ہوتا لیکن نہیں۔ ضبطِ نفس ہی اصل کام ہوتا ہے۔ اب تو ایسی باتیں خود بخود ذہن میں آنے لگی تھیں۔

جیسے کسی نے اگر اپنے نفس پر قابو پا لیا تو اس نے دنیا پر قابو پا لیا۔ غصہ انسان کی آزمائش ہے۔ جو اس موقع پر صبر سے کام لے کر مسکرا دیتا ہے۔ وہ اس آزمائش میں پورا اتر جاتا ہے۔

میں نے تو ابھی ابتدا کی تھی۔ ابھی اور نہ جانے کتنی باتیں برداشت کرنی تھیں۔ کتنی تلخیاں گوارا کرنی تھیں۔

بہر حال میں نے سفر اختیار کر لیا۔

مجھے نہیں معلوم تھا کہ میری منزل کیا ہے۔ مجھے کہاں جانا ہے۔ کیا کرنا ہے۔ بس چل پڑا۔ خدا جانے لوگ اس جنون کو کیا نام دیں گے۔

لیکن میں نے دیکھا اور سنا ہے کہ جب کسی پر کوئی دھن سوار ہو جائے تو پھر کسی کی پروا نہیں کرتا۔ اس کو اپنی منزل کو پانا ہے اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔

میں نے اپنے ساتھ بہت مختصر سا سامان لیا تھا۔ بس

کنوارا خاندان

لارڈ خاندان کے معزز فرد کو اپنی خاندانی روایات پر بڑا ناز تھا۔ وہ ان کے متعلق ایک دوست سے بات چیت کر رہے تھے اور انہیں بتا رہے تھے کہ ہمارے خاندان میں سیاسی، ثقافتی اور دیگر روایات کیا کیا ہیں۔ ان صاحب کی عمر کوئی چالیس سال تھی مگر وہ اب تک کنوارے تھے۔ دوست نے دریافت کیا۔ ''اور کیا اس عمر تک شادی نہ کرنا بھی آپ کی خاندانی روایات میں شامل ہے؟''

لارڈ نے نہایت فخر سے برجستہ جواب دیا۔ ''آپ نے خوب سمجھا، میرا باپ بھی کنوارا تھا۔ اور دادا و پردادا تک کنوارے ہی مر گئے۔''

صالح حیات، حیدر آباد

ضرورت کی چیزیں تاکہ جہاں میں رہوں وہاں یہ کام آئیں۔

ویسے تو میں نے کراچی سے لاہور تک کا ریل کا ٹکٹ لیا تھا۔ لیکن راستے میں ایک جنگل نظر آیا اور میں اس سے آگے کے اسٹیشن پر اتر پڑا۔

بغیر یہ سوچے ہوئے کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ کہاں رہنا ہے اور کس طرح رہنا ہے۔

اسٹیشن سے کئی میل کا سفر واپس طے کر کے میں اس جنگل میں پہنچ گیا۔ خدا جانے اس جنگل کو کیا کہتے ہوں گے۔ لیکن بہت بے ضرر قسم کا جنگل تھا۔

یہاں کوئی خوف نہیں تھا۔ بے پناہ سکون تھا۔ چاروں طرف ایسی خاموشی جیسی قبرستان میں ہوتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے جانور تو تھے لیکن وہ بھی کوئی نقصان پہنچانے والے نہیں تھے۔ وہ اپنے درمیان ایک زندہ انسان کو دیکھ کر خود ہی بھاگ لیتے تھے۔

سردی شروع ہو چکی تھی۔ میں نے اپنے ساتھ ایک کمبل کے سوا کچھ نہیں رکھا تھا۔ البتہ کچھ پیسے ضرور رکھ لیے تھے کہ کھانے پینے کی چیزوں کی ضرورت ہو تو کسی قریبی بستی سے خرید کر لے آؤں۔

میں نے اپنے سامان میں جا نماز اور تسبیح وغیرہ رکھ لی تھی۔

جنگل کی خاموشی میں عبادت کا لطف ہی کچھ اور تھا۔ ہر طرف گہری خاموشی کے درمیان جب میں جا نماز پر بیٹھ کر اپنے خدا سے اپنا دھیان لگا لیتا تو اب تک جو زندگی

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

گزاری تھی۔ وہ بے سود معلوم ہونے لگتی۔ شاید اصل زندگی یہی تھی جو...... اب مجھے مل رہی تھی۔

خاموشی۔ سکون۔ کوئی دکھ نہیں۔ کوئی جھنجٹ نہیں۔ کوئی ڈپریشن نہیں۔ کوئی ٹینشن نہیں۔ کوئی دفتری یا کاروباری اُلجھن نہیں۔

اس کے باوجود شاید کچھ بھی نہیں تھا۔ میری تلاش شاید ناکام ہوتی جارہی تھی۔ میں اپنی روح اور اپنے خدا کی تلاش میں آیا تھا لیکن ایسا اشارہ، کوئی ایسی طمانیت حاصل نہیں ہورہی تھی۔

اب باہر کی دنیا کی بے کلی تو نہیں تھی لیکن اندر کی دنیا میں ایک ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ شاید میں نے جنگل میں آکر حماقت کی تھی۔

اس دور میں ایسا کہاں ہوتا ہے کہ بن باس لے لیا جائے۔ دنیا اور اس کے معاملات کو اس طرح ترک کر دیا جائے۔ شاید میں یہاں اپنا وقت برباد کررہا ہوں۔

شاید مجھے اپنے آپ، اپنی روح اور اپنے خدا کو کہیں اور تلاش کرنا تھا۔ میں رہبانیت کی راہ اختیار کر گیا تھا جو اسلام میں سخت منع ہے۔

مجھے بزرگوں کی باتیں یاد آرہی تھیں۔ انہوں نے کہا اور لکھا تھا کہ کمال یہ ہے کہ دنیا میں رہ کر حقیقت کو تلاش کیا جائے اس طرح جنگل میں بیٹھ جانا مناسب نہیں ہے۔

میں نے سوچا تھا کہ میں یہاں سے نکل لوں۔ واپس چلا جاؤں اسی وقت ایک ایسی بات ہوئی جس نے مجھے وہیں رہنے پر مجبور کردیا۔

وہ کچھ لوگ تھے۔ جن کو میں نہیں جانتا تھا۔ اجنبی چہروں والے لوگ جو اچانک کہیں سے نمودار ہو کر میرے سامنے آکر بڑی عقیدت سے بیٹھ گئے تھے۔

”بابا، کون ہو تم لوگ؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”بابا ہم آس پاس کے گاؤں کے لوگ ہیں۔“ ان میں سے ایک نے بتایا۔ ”ہم آپ کے دیدار کے لیے آئے ہیں۔“

”میرا دیدار؟“ میں اور بھی حیران ہو رہا تھا۔ ”میرا دیدار کس لیے؟“

”بابا، آپ بہت بڑے آدمی ہیں۔ آپ اللہ کے خاص بندے ہیں۔ ہم نے آپ کو چھپ چھپ کر دیکھا ہے۔ آپ یہاں دنیا کو چھوڑ کر عبادت کے لیے آئے ہیں۔ آپ کا دیدار ہمارے لیے بہت مبارک ہے بابا۔“

”بابا!“ میں نے لاشعوری طور پر اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ میری داڑھی بڑھ آئی تھی۔ ہوسکتا ہے اس لیے میں بابا ہو گیا ہوں اور یہ سیدھے سادے لوگ مجھے نہ جانے کیا سمجھ کر میرے پاس آگئے تھے۔

”ارے بھائی میں ایک گنہگار انسان ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”میں تو یہاں اپنے آپ کو تلاش کرنے کے لیے آیا ہوں۔ میرے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔“

”نہیں بابا، آپ کے پاس بہت کچھ ہے۔“ دوسرا بولا۔ ”آپ کی دعائیں ہمارے کام آئیں گی۔ آپ اس جنگل میں ہمارے مہمان ہیں۔ ہم سب نے مل کر یہ فیصلہ کیا ہے کہ آپ کے لیے روزانہ ہر گھر سے کھانا اور پانی آیا کرے گا۔ آس پاس ملا کر پانچ سو چالیس گھر ہیں۔ آپ اس طرح پانچ سو چالیس دنوں تک باری باری سب کے مہمان رہیں گے۔“

”ارے بھائی، ان سب کی کیا ضرورت ہے؟“ میں نے کہا۔ ”میں اپنی خواہشوں کو مارنے کی کوشش کررہا ہوں۔ یہاں خدا کے اس جنگل میں کھانے کے لیے بہت کچھ ہے۔ بہت سے پھل ہیں۔ انہیں کھا لیتا ہوں۔ پینے کے لیے صاف پانی کی نہر ہے۔ اب اور کیا چاہیے، تم لوگ زحمت نہ کرو۔“

”نہیں سرکار، یہ کیسے ہوسکتا ہے۔“ ان میں سے جو کچھ پڑھا لکھا معلوم ہوتا تھا۔ وہ آگے بڑھ کر بولا۔ ”آپ ہم غریبوں کو اپنی خدمت سے محروم نہ کریں۔“

میرے خدا، یہ سب کیا ہو رہا تھا میرے ساتھ۔ میں تو ابھی تک راستے میں ہی بھٹک رہا تھا۔ پھر ان لوگوں کے دلوں میں میرے لیے ایسا احترام، ایسا خلوص کہاں سے آگیا تھا۔

”ٹھیک ہے، جو تمہاری مرضی۔“ میں نے اس مرحلے پر اُن کا دل توڑنا مناسب نہیں سمجھا۔ ”لیکن ایک وعدہ کرو کہ تم لوگ میرے لیے کوئی اہتمام نہیں کرو گے۔ کوئی خاص چیز میرے لیے نہیں آئے گی جو کچھ تم کھاتے ہو، وہی میرے لیے بھیجا کرو گے۔ اگر میں نے محسوس کیا کہ میرے لیے کچھ خاص آیا ہے تو میں اسے واپس کردوں گا۔“

”آپ واقعی بڑے آدمی ہیں سرکار۔“ ان لوگوں نے کہا اور جس احترام سے آئے تھے اسی طرح واپس چلے گئے۔

یہ سب کچھ ہوا تھا۔ لیکن کیا واقعی یہ کوئی کامیابی تھی۔ یہ تو ایک عام سی بات تھی۔ کوئی بھی شخص جنگل میں جا کر اللہ اللہ کرنے لگے تو لوگ اسے اللہ کا دوست سمجھ کر اس کے آگے

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

پیچھے ہونے لگتے ہیں۔ جیسے میرے آگے پیچھے ہورہے تھے اور سچائی یہ ہے کہ میں کچھ بھی نہیں تھا۔ کم از کم اب تک وہ کچھ بھی نہیں ملا تھا نہ کوئی روشنی، نہ اطمینانِ قلب اور نہ ہی نروان۔

بس ایک بیگار تھا جو برداشت کیے جارہا تھا۔ تجزیہ کرنے بیٹھا تو احساس ہوا کہ اتنے دن بلاوجہ گزار دیے۔

اور دوسرے ہی دن میں نے اپنا مختصر سا سامان اٹھایا اور واپسی کی راہ اختیار کرلی۔

شہر واپس آکر نئے سرے سے سارا سیٹ اپ کرنا پڑا تھا۔ خیریت یہ رہی کہ سب کچھ موجود تھا۔ یعنی میرا خوب صورت اپارٹمنٹ، میری نوکری، میری کار۔ سب کچھ اپنی جگہ تھا۔ باس کا خیال تھا کہ کچھ دنوں کا بھوت ہے اتر جائے گا پھر واپس آجاؤں گا۔

یہی ہوا اور میں واپس آگیا۔

اور یہ بھی بہتر ہوا کہ میرا زیادہ مذاق نہیں اُڑایا گیا۔ کسی نے دو چار باتیں کیں، اس کے بعد سب کچھ نارمل ہو گیا۔

رات کو بستر پر لیٹ کر میں یہی سوچا کرتا کہ میں نے ایسی حماقت کیوں کی تھی۔ خوامخواہ اس اُلجھے ہوئے بالوں والے شخص کی باتوں میں آکر اپنا وقت ضائع کرتا پھرا۔

ایک شام دل میں نہ جانے کیا آئی کہ میں اپنے بھائی شمیم کی خیریت معلوم کرنے اس کے گھر کی طرف چلا گیا۔ بہت عرصے کے بعد اس کے گھر آیا تھا۔

وہ مجھے دیکھ کر حیران ہی رہ گیا۔ ”بھائی، آج کیسے ہم غریبوں کی طرف آنکلے؟“

”بس دل چاہا تو چلا آیا۔“ میں نے کہا۔ ”تم سناؤ، تمہارے بچوں کا کیا ہوا؟“

”ہونا کیا ہے بھائی، ان کو اسکولوں سے ہٹا لیا ہے۔ وہ فی الحال گھر پر ہی پڑھ رہے ہیں۔“

”نہیں، تم ایسا نہیں کرو گے۔ بچے کل سے اسکول جائیں گے۔“ میں نے ایک چیک اس کی طرف بڑھا دیا۔ ”یہ لو، پچاس ہزار ہیں۔ ان سے دوبارہ ایڈمیشن کراؤ۔ ان کے یونیفارم اور کتابیں وغیرہ خریدو۔ اس کے بعد بھی اگر ضرورت ہو تو مجھے بے جھجک فون کردینا۔“

”بھائی، آخر آپ یہ سب کیوں کررہے ہیں؟“ شمیم حیران ہوا جارہا تھا۔

”میں کچھ نہیں کہہ سکتا، کیوں کررہا ہوں۔ دوسری بات یہ ہے کہ تم میرے چھوٹے بھائی ہو۔ میرا خون ہو۔ تم اگر پرابلم میں ہو تو مجھے کیسے چین مل سکتا ہے؟“

شمیم کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میں نے اس کو گلے سے لگا لیا۔

اور اس رات مجھے برسوں کے بعد گہری اور پُرسکون نیند آئی تھی۔ میں ایک جذب کی کیفیت میں تھا۔ ایسی بے پناہ طمانیت کا احساس ہورہا تھا کہ جس کا اظہار نہیں کرسکتا۔ کوئی مہربان آواز ساری رات مجھے تسلیاں دیتی رہی۔ کوئی مہربان روشنی میرے چاروں طرف منڈلاتی رہی۔

دوسری صبح پارک میں وہی شخص مل گیا۔ وہی اُلجھے ہوئے بالوں والا۔ وہ میرے پاس آکر بولا۔ ”مبارک ہو تمہیں۔ تم نے شاید اپنی منزل حاصل کرلی ہے۔“

”ارے نہیں۔ کچھ بھی تو نہیں ملا ہے۔“

”مل چکا ہے۔ میں تمہارے چہرے پر جس قسم کا سکون اور جس قسم کا نروان دیکھ رہا ہوں۔ ایسا صرف ان ہی کے چہروں پر ہوتا ہے جنہیں منزل مل چکی ہو۔“

”لیکن مجھے تو کچھ نہیں ملا۔ میں نے تین مہینے جنگل میں گزار دیے۔ پوری دنیا سے کٹ کر۔ اپنے آپ کو تلاش کرتا رہا تھا پھر مایوس اور بددل ہوکر شہر واپس آگیا۔“

”اور شہر آکر کیا کرتے رہے؟“

”کوئی خاص نہیں۔ بس ایک بار اپنے ایک بھائی کے پاس چلا گیا تھا۔ جنگل جانے سے پہلے وہ ایک بار میرے پاس آیا تھا۔ مدد کے لیے۔ میں نے اس کی اس وقت مدد نہیں کی تھی۔ واپس آکر اس کے گھر پہنچ کر اس کی مدد کی۔ بس اتنی سی بات ہوئی تھی۔“

”یہ اتنی سی بات نہیں ہے بے وقوف۔“ اس نے کہا۔ ”یہی تو نروان ہے۔ اگر تم اپنے بھائی کو پالیتے ہو تو اپنے آپ کو، اپنی روح کو اور اپنے خدا کو پالیتے ہو۔ اسی ایک نکتے میں سب کچھ چھپا ہوا ہے۔ یہ چیزیں تمہیں کہیں جنگل میں جاکر نہیں ملتیں۔ یہ سب تمہارے اردگرد ہوتی ہیں اور تم ان سے آنکھیں بند رکھتے ہو۔ اب تم نے آنکھیں کھول لی ہیں تو انہیں کھلا رکھنا۔ ورنہ تمہارے چہرے کی یہ کیفیت غائب ہوجائے گی۔ خدا حافظ۔“

وہ چلا گیا...... اور میں سوچتا ہی رہ گیا۔

اس وقت ایک جرمن شاعر کی ایک نظم یاد آرہی تھی کہ جس نے اپنے بھائی کو پالیا، اس نے خدا کو پالیا اور جس نے خدا کو پالیا۔ اس نے اپنی روح تلاش کرلی اور جس نے اپنی تلاش کرلی اسے اپنا آپ مل گیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

چودھویں قسط

انگارے

طاہر جاوید مغل

نیکی کر دریا میں ڈال... بات محاورے کی حد تک ٹھیک ہو سکتی ہے لیکن خودغرضی اور سفاکی کے اس دور میں نیکی کرنے والے کو ہی کمر میں پتھر باندھ کر دریا میں ڈال دیا جاتا ہے۔ انسان بے لوث ہو اور سینے میں دردمند دل رکھتا ہو تو اس کے لیے قدم قدم پر ہولناک آسیب منہ پھاڑے انتظار کر رہے ہوتے ہیں۔ بستیوں کے سرخیل اور جاگیرداری کے بے رحم سرغنہ لہو کے پیاسے ہو جاتے ہیں... اپنوں کی نگاہوں سے نفرت کے انگارے برسنے لگتے ہیں... امتحان در امتحان کے ایسے کڑے مراحل پیش آتے ہیں کہ عزم کمزور ہو تو مقابلہ کرنے والا خود ہی اندر سے ریزہ ریزہ ہو کر بکھرتا چلا جاتا ہے لیکن حوصلہ جوان ہو تو پھر ہر سازش کی کوکھ سے دلیری اور ذہانت کی نئی کہانی ابھرتی ہے۔ وطن کی مٹی سے پیار کرنے والے ایک بے خوف نوجوان کی داستان جسے ہر طرف سے وحشت و بربریت کے خون آشام سایوں نے گھیر لیا تھا مگر وہ ان پیاسی دلدلوں میں رکے بغیر دوڑتا ہی چلا گیا... اثر و رسوخ اور درندگی کی زنجیریں بھی اس کے بڑھتے ہوئے قدم نہیں روک سکیں۔ وقت کی میزان کو اس کے خونخوار حریفوں نے اپنے قدموں میں جھکا لیا تھا مگر وہ ہار مان کر پسپا ہونے والوں میں سے نہیں تھا...

سطر سطر رنگ بدلتی... ایک لہو رنگ اور دل گداز داستان...

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

www.paksociety.com

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

میں ڈنمارک سے اپنے پیارے وطن پاکستان لوٹا تھا۔ مجھے کسی کی تلاش تھی۔ یہ تلاش شروع ہونے سے پہلے ہی میرے ساتھ ایک ایسا واقعہ ہو گیا جس نے میری زندگی کو تہ و بالا کر دیا۔ میں نے سرِراہ ایک زخمی کو اٹھا کر اسپتال پہنچایا جسے کوئی گاڑی ٹکر مار کر گزر گئی تھی۔ مقامی پولیس نے مجھے مددگار کے بجائے مجرم ٹھہرایا اور یہیں سے جبر و ناانصافی کا ایسا سلسلہ شروع ہوا جس نے مجھے شکیل داراب اور لالہ نظام جیسے خطرناک لوگوں کے سامنے کھڑا کر دیا۔ یہ لوگ ایک قبضہ گروپ کے سرخیل تھے جو رہائشی کالونیاں بنانے کے لیے چھوٹے زمینداروں اور کاشت کاروں کو ان کی زمینوں سے محروم کر رہا تھا۔ میرے چچا حفیظ سے بھی زبردستی ان کی آبائی زمین ہتھیانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ چچا کا بیٹا ولید اس جبر کو برداشت نہ کر سکا اور شکیل داراب کے دستِ راست انسپکٹر قیصر چودھری کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہو گیا۔ اس جرأت کی سزا اسے یہ ملی کہ ان کی حویلی کو اس کی ماں اور بہن فائزہ سمیت جلا کر راکھ کر دیا گیا اور وہ خود دہشت گرد قرار پا کر جیل پہنچ گیا۔ انسپکٹر قیصر اور لالہ نظام جیسے سفاک لوگ میرے تعاقب میں تھے، وہ میرے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ میں MMA کا یورپی چیمپئن تھا، وسطی یورپ کے کئی بڑے بڑے گینگسٹر میرے ہاتھوں ذلت اٹھا چکے تھے۔ میں اپنی پچھلی زندگی سے بھاگ آیا تھا لیکن وطن پہنچتے ہی یہ زندگی پھر مجھے آواز دینے لگی تھی۔ میں نے اپنی چچی اور چچازاد بہن فائزہ کے قاتل لالہ نظام کو بیدردی سے قتل کر دیا۔ انسپکٹر قیصر شدید زخمی ہو کر اسپتال نشیں ہوا۔ شکیل داراب ایک شریف النفس زمیندار کی بیٹی عاشرہ کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑا ہوا تھا۔ وہ اسی عارف نامی نوجوان سے محبت کرتی تھی جسے میں نے زخمی حالت میں اسپتال پہنچانے کی "غلطی" کی تھی۔ میں نے شکیل داراب کی ایک نہایت اہم کمزوری کا سراغ لگایا اور یوں اس پر دباؤ ڈال کر عاشرہ کی جان اس سے چھڑا دی۔ میں یہاں بیزار ہو چکا تھا اور واپس ڈنمارک لوٹ جانے کا تہیہ کر چکا تھا مگر پھر ایک انہونی ہوئی۔ وہ جادوئی حسن رکھنے والی لڑکی مجھے نظر آ گئی جس کی تلاش میں، میں یہاں پہنچا تھا۔ اس کا نام تاجور تھا اور وہ اپنے گاؤں چاند گڑھی میں نہایت پریشان کن حالات کا شکار تھی۔ میں تاجور کے ساتھ گاؤں پہنچا اور ایک ٹریکٹر ڈرائیور کی حیثیت سے اس کے والد کے پاس ملازم ہو گیا۔ انیق بطور مددگار میرے ساتھ تھا۔ مجھے پتا چلا کہ تاجور کا غنڈا صفت منگیتر اسحاق اپنے ہمنواؤں زمیندار عالمگیر اور پیر ولایت کے ساتھ مل کر تاجور اور اس کے والد دین محمد کے گرد گھیرا تنگ کر رہا تھا۔ پیر ولایت نے گاؤں والوں کو باور کرا رکھا تھا کہ اگر تاجور کی شادی اسحاق سے نہ ہوئی تو چاند گڑھی پر آفت آ جائے گی۔ ان لوگوں نے چاند گڑھی کے راست گو امام مسجد مولوی فدا کو بھی اپنے ساتھ ملا رکھا تھا۔ تاجور کے گھر میں آئی مہمان نمبر دارنی کو کسی نے زخمی کر دیا تھا۔ اس کا الزام بھی تاجور کو دیا جا رہا تھا۔ ایک رات میں نے چہرے پر ڈھاٹا باندھ کر مولوی فدا کا تعاقب کیا۔ وہ ایک ہندو میاں بیوی رام پیاری اور وکرم کے گھر میں داخل ہوئے۔ پہلے تو مجھے یہی غلط فہمی ہوئی کہ شاید مولوی فدا یہاں کسی غلط نیت سے آئے ہیں لیکن پھر حقیقت سامنے آ گئی۔ مولوی فدا ایک خدا ترس بندے کی حیثیت سے یہاں وکرم اور رام پیاری کی مدد کے لیے آئے تھے۔ تاہم اسی دوران میں وکرم اور رام پیاری کے کچھ مخالفین نے ان کے گھر پر ہلا بول دیا۔ ان کا خیال تھا کہ ٹی بی کا شکار وکرم ان کے بچے کی موت کا باعث بنا ہے۔ اس موقع پر مولوی فدا نے دلیری سے وکرم اور رام پیاری کا دفاع کیا۔ لیکن جب حالات زیادہ بگڑے تو میں نے ہڈیوں کے ڈھانچے وکرم کو کندھے پر لادا اور رام پیاری کو لے کر وہاں سے بھاگ نکلا۔ میں نمبر دارنی کو زخمی کرنے والے کا کھوج لگانا چاہتا تھا۔ یہ کام مولوی صاحب کے شاگرد طارق نے کیا تھا۔ وہ تاجور کی جان لینا چاہتا تھا کیونکہ اس کی وجہ سے مولوی صاحب کسی بلیک میلنگ کا شکار ہو رہے تھے۔ طارق سے معلوم ہوا کہ مولوی جی کی بیٹی زینب ایک عجیب بیماری کا شکار ہے۔ وہ زمیندار عالمگیر کے گھر میں ٹھیک رہتی ہے لیکن جب اسے وہاں سے لایا جائے تو اس کی حالت غیر ہونے لگتی ہے۔ اسی دوران میں ایک خطرناک ڈاکو سجاول نے گاؤں پر حملہ کیا۔ حملے میں عالمگیر کا چھوٹا بھائی مارا گیا۔ میں تاجور کو حملہ آوروں سے بچا کر ایک محفوظ جگہ لے گیا۔ ہم دونوں نے کچھ اچھا وقت گزارا۔ واپس آنے کے بعد میں نے بھیس بدل کر مولوی فدا سے ملاقات کی اور اس نتیجے پر پہنچا کہ عالمگیر وغیرہ نے زینب کو جان بوجھ کر بیمار کر رکھا ہے اور یوں مولوی صاحب کو مجبور کیا جا رہا ہے کہ وہ اپنی بچی کی جان بچانے کے لیے اسحاق کی حمایت کریں۔ میں نے مولوی صاحب کو اس "بلیک میلنگ" سے نکالنے کا عہد کیا مگر اگلی رات مولوی صاحب کو قتل کر دیا گیا۔ میرا شک عالمگیر اور اسحاق وغیرہ پر تھا۔ رات کی تاریکی میں، میں نے عالمگیر اور اسحاق کو کسی خاص مشن پر جاتے دیکھا۔ وہ ایک ویرانے میں پہنچے۔ میں نے ان کا تعاقب کیا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ عالمگیر، سجاول کے کندھے سے کندھا ملائے بیٹھا تھا۔ میں نے چھپ کر ان کی تصاویر کھینچ لیں۔ پھر میں اقبال کا تعاقب کرتا ہوا ایک سرنگ جا پہنچا اور چھپ کر ان کی باتیں سنیں۔ وہ بے بس و مظلوم شخص تھا اور چھپ کر ایک قبرستان میں اپنے دن گزار رہا تھا۔ ایک دن میں اور انیق پیر ولایت کے والد پیر سائیں جی کے اس ڈیرے پر جا پہنچے جو کسی زمانے میں جل کر خاکستر ہو چکا تھا اور اس سے متعلق متعدد کہانیاں منسوب تھیں۔ اس ڈیرے پر لوگ دم درود وغیرہ کرانے آتے تھے۔ تاجور کی قریبی دوست ریشمی شادی کے بعد دوسرے گاؤں چلی گئی تھی۔ اس کا شوہر شکی مزاج اور تشدد پسند شخص تھا۔ اس نے ریشمی کی زندگی عذاب بنا رکھی تھی۔ ایک دن وہ ایسی غائب ہوئی کہ اس کا شوہر ڈھونڈتا رہ گیا۔ میں تاجور کی خاطر ریشمی کا کھوج لگانے کا بیڑا اٹھا بیٹھا اور ایک الگ ہی دنیا میں جا پہنچا۔ ریشمی ایک ملنگ کا روپ دھار چکی تھی اور آستانے پر اپنی دلکش و سریلی آواز کے باعث پاک بی بی کا درجہ حاصل کر چکی تھی۔ درگاہ پر ہم سب قید تھے لیکن قسمت نے ساتھ دیا اور حالات نے اس تیزی سے کروٹ لی کہ درگاہ کا سب نظام درہم برہم ہو گیا۔ میرے ہاتھوں پردے والی سرکار کا خون ہو گیا۔ آگ و خون کا دریا عبور کر کے ہم بالآخر پہاڑوں کے درمیان تک جا پہنچے۔ یہاں بھی ملنگی محافظوں سے ہمارا مقابلہ ہوا۔ اس دوران انیق وغیرہ ہم سے بچھڑ گئے۔ میں اور تاجور بھاگتے ہوئے ایک جنگل میں پہنچے۔ لیکن ہماری جان ابھی چھوٹی نہیں تھی۔ آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا کے مصداق ہم سیالکوٹی سجاول ڈکیت کے ڈیرے پر جا پہنچے تھے۔ یہاں سجاول کی ماں (ماؤ جی) مجھے اپنا ہونے والا جوائی سمجھی۔ جس کی پوتی مہناز عرف مانی سے میری بات طے تھی۔ یوں سجاول سے ہماری جان بچ گئی۔ یہاں سجاول نے میرا مقابلہ باقرے سے کرا دیا۔ سخت مقابلے کے بعد میں نے باقرے کو چت کر دیا تو میں نے سجاول کو مقابلے کا چیلنج کر دیا۔ میرے چیلنج نے سجاول سمیت سب کو پریشان کر دیا تھا۔ اس دوران ایک خط میرے ہاتھ آ گیا جسے پڑھ کر چاند گڑھی کے عالمگیر کا مکروہ چہرہ سامنے آ گیا۔ اس خط کے ذریعے میں سجاول اور عالمگیر میں دراڑ ڈالنے میں کامیاب ہو گیا۔ متوقع مقابلے کے بارے میں سوچتے سوچتے میرا ذہن ایک بار پھر ماضی کے اوراق پلٹنے لگا۔ جب میں ڈنمارک میں تھا اور ایک کمزور پاکستانی کو گورے اور انڈین غنڈوں سے بچاتے ہوئے خود ایک طوفان کی لپیٹ میں آ گیا۔ وہ غنڈے ٹیکساری

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

گینگ کے لوگ تھے جس کا سرغنہ جان ڈیرک تھا۔ مجھ سے بدلہ لینے کے لیے انہوں نے میری یونیورسٹی دوست ڈیزی کے ساتھ اجتماعی کھیل کھیلا، پھر ڈیزی غائب ہوگئی۔ اس واقعہ کے بعد میری زندگی میں ایک انقلاب آ گیا۔ مجھے چھ ماہ جیل ہوئی۔ پھر میرا رجحان مکس مارشل آرٹ کی طرف ہوگیا اور ایسٹرن کنگ کی حیثیت سے MMA کی فائٹس میں جھلکا مچاتا رہا اور دوسری طرف سکائی ماسک کی اوٹ میں ٹیکساری گینگ کے غنڈوں سے برسرِ پیکار رہا۔ اسی مارشل آرٹ کی بدولت میں نے سجاول سے مقابلہ کیا اور سخت مقابلے کے بعد برابری کی بنیاد پر میں نے ہار مان لی لیکن سجاول کا دل جیت لیا۔ سجاول سے کہہ کر میں نے انیق کو بلوا لیا۔ سجاول ایک حسین دوشیزہ سنبل کو تو یا بیاہتا دلہن کی طرح سجا سنوار کر ریان فردوس (وڈے صاحب) کی خدمت میں تحفے کے طور پر پیش کرنا چاہتا تھا۔ میں انیق اور جاناں ساتھ تھے۔ ہم وڈے صاحب کے محل نما بنگلے پارا ہاؤس پہنچے۔ وڈا صاحب اپنے دو بیٹوں کے ہمراہ برونائی سے پاکستان شفٹ ہوا تھا۔ برونائی میں اس کی خاندانی دشمنی تھی۔ سب ٹھیک تھا کہ اچانک چند نقاب پوشوں نے پارا ہاؤس پر حملہ کر دیا جن کا سرغنہ ثاقب تھا۔ سخت مقابلہ ہوا۔ سجاول نے جان جوکھوں میں ڈال کر بڑی بیگم صاحب کی جان بچائی لیکن سرغنہ ثاقب نے اس کے بیٹے ابراہیم اور ایک مہمان کو یرغمال بنا لیا۔ مہمان کا نام سن کر میں چونک گیا یعنی شکیل داراب!

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

میں نے انگلی ٹریگر پر رکھی اور اس کھڑکی کی طرف دیکھنے لگا جس کے عقب میں کسی کی موجودگی کا شبہ تھا۔ میری حسیات پوری طرح بیدار تھیں اور میں خطرے کی تصدیق ہوتے ہی فائر کر سکتا تھا۔ اچانک کھڑکی کے ساتھ والا دروازہ کھلا اور سجاول نظر آیا۔

''یہ میں ہوں...... کہیں گولی نہ چلا دینا۔'' وہ بولا۔

میں طویل سانس لے کر رہ گیا۔ ''تم کیوں آگئے؟'' میں نے دھیمی آواز میں پوچھا۔

''مجھے لگا کہ مجھے آجانا چاہیے۔ یہاں سب ٹھیک تو ہے نا؟''

''ابھی تک تو ٹھیک ہے۔''

''اس کی بیوی کہاں ہے؟''

''میں نے بند کردی ہے ساتھ والے کمرے میں۔''

''کوئی اور تو نہیں ہے گھر میں۔ میرا مطلب ہے ثاقب کے ساتھی کے علاوہ؟''

''نہیں، بس وہی ہے۔ پچھلے صحن میں کہیں ہے۔ اس کے پاس سیون ایم ایم رائفل ہے اور مجھے لگتا ہے کہ وہ خبیث پوری طرح چوکس بھی ہے۔''

''اگر تم کہو تو میں اسے دیکھتا ہوں۔'' سردار سجاول بولا۔

''تم نے میرے دل کی بات کہی ہے۔''

''ٹھیک ہے تم اس کمینے کو نشانے پر رکھو۔'' سجاول نے کہا۔ اس کا اشارہ ٹوٹے بازو والے اصغیر کی طرف ہی تھا۔

سجاول نے اپنا پستول دوبارہ کمر میں اُڑس لیا اور اپنی قمیص کے نیچے سے لمبے پھل والا چھرا برآمد کر لیا۔ یہ چھرا ایک طرح سے اس ڈکیت گینگ کا ٹریڈ مارک تھا۔ سجاول بڑی احتیاط سے اس گھر کے پچھلے صحن کی طرف بڑھا۔

میں خود بھی یہی چاہتا تھا کہ سجاول اس کارروائی میں فعال نظر آئے۔ بڑے صاحب اور حلمی وغیرہ کی نظر میں اس کی کافی عزت بن گئی تھی۔ اس عزت کو برقرار رہنا چاہیے تھا بلکہ اس میں اضافہ ہونا چاہیے تھا۔ سجاول پر ان لوگوں کا یہ اعتماد آگے چل کر ہم سب کے لیے فائدہ مند ثابت ہوسکتا تھا۔

درحقیقت وہ لمحے بڑے نازک تھے جب حملہ آوروں نے پارا ہاؤس کی بالائی منزل پر جناب عزت مآب بڑے صاحب کی بیگم کو یرغمال بنانے کی کوشش کی تھی۔ سجاول اس کوشش کے سامنے دیوار بن گیا تھا...... اور اسے فوری طور پر پارا ہاؤس والوں کی نگاہ میں ایک اہم مقام مل گیا تھا۔ اب اس مقام کا برقرار رہنا بہت ضروری تھا۔

میری رائفل بدستور گرم چادر کے نیچے تھی اور اس کا رخ صغیر کی طرف تھا۔ میں صغیر کو لے کر ایک برآمدے میں آ گیا اور ایک دیوار کی اوٹ میں کھڑا ہو کر پچھلے صحن کا منظر دیکھنے لگا۔ یہ کافی کشادہ جگہ تھی۔ ایک طرف ٹین کی چھت کا بڑا سا سائبان بنا ہوا تھا۔ اس کے نیچے ایک جیپ کھڑی تھی۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ یہ پولیس جیپ تھی۔ اس کی چھت پر ایمرجنسی لائٹ بھی نظر آ رہی تھی۔ جیپ میں پولیس والوں کی تین چار وردیاں ہینگروں سے جھول رہی تھیں۔ بلب کی زرد روشنی میں دکھائی دیا کہ جیپ کی پچھلی نمبر پلیٹ اتری ہوئی تھی۔ پاس ہی ایک اور نمبر پلیٹ دکھائی دے رہی تھی اور اس کے نٹ بولٹ پڑے تھے۔ بالکل یہی لگا کہ چند سیکنڈ پہلے یہاں کوئی شخص موجود تھا اور نمبر پلیٹ تبدیل کر رہا تھا۔ سجاول کی آمد کو محسوس کر کے وہ فوراً کہیں دائیں بائیں ہوگیا تھا۔ یہ پُرخطر صورتِ حال تھی۔

سجاول نے بھی اس خطرے کو محسوس کر لیا۔ اس نے لمبے پھل والا چھرا اس کے چرمی غلاف میں واپس رکھا اور پستول کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس سارے عمل کے دوران میں چند ساعتیں ایسی تھیں جب سجاول نے اپنا ہاتھ چھرے

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

www.paksociety.com

کے دستے سے ہٹالیا تھا اور پستول کا دستہ ابھی اس کے ہاتھ میں نہیں آیا تھا۔ یہی وقت تھا جب ایک پرچھائیں سی بلندی سے سجاول پر جھپٹی۔ اس اچانک اور شدید حملے کے باعث سجاول اوندھے منہ اینٹوں کے فرش پر گرا۔ میری آنکھوں کے سامنے بجلی کا کوندا ہوا۔ کسی تیز دھار آلے سے سجاول پر وار کیا گیا تھا۔ سجاول نے یہ وار اپنے داہنے ہاتھ سے روکا اور حملہ آور کو اپنی پشت سے ہٹانے کی کوشش کرنے لگا۔ یقیناً یہ وہی شخص تھا جس کے لیے ہم عقبی صحن میں آئے تھے اور جو کچھ دیر پہلے پولیس جیپ کی نیم پلیٹ تبدیل کررہا تھا۔ اس نے بے حد ہوشیاری سے کام لیا تھا۔ ہماری آمد سے پہلے ہی برآمدے کے شیڈ پر چلا گیا تھا اور اب وہاں سے اس نے سجاول پر چھلانگ لگائی تھی۔

میں نے غور سے دیکھا، اس کے ہاتھ میں ایک چمکیلا پیچ کس تھا۔ اس پیچ کس کو اس نے سجاول کی پسلیوں میں گھونپنے کی کوشش کی تھی۔ اب اس کا یہ ہاتھ سجاول کی مضبوط گرفت میں آچکا تھا مگر "پیچ کس" ہنوز اس شخص کی گرفت میں تھا۔ اس نے اپنے دوسرے بازو سے سجاول کی گردن جکڑ رکھی تھی اور کسی کیکڑے کی طرح اس کی پشت سے چپک کر رہ گیا تھا۔

یکایک سجاول نے پینترا بدلا۔ حملہ آور کو اپنی پشت سے اتارنے کی کوشش ترک کرکے وہ برق رفتاری سے الٹے قدموں پیچھے ہٹا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ حملہ آور کا تصادم پختہ دیوار سے ہوا۔ یہ بڑا زوردار تصادم تھا اور بالکل اچانک ہوا تھا۔ میں نے پیچ کس حملہ آور کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گرتے دیکھا۔ سجاول نے بلاتامل دوسری مرتبہ اس شخص کو دیوار سے ٹکرایا۔ وہ شخص خوش قسمت ہوتا تو اس دوسری ٹکر سے پہلے ہی سجاول کی گردن چھوڑ دیتا...... لیکن ایسا نہیں ہوا۔ یہ ٹکر پہلی سے بھی زیادہ مؤثر ثابت ہوئی۔ مضروب کے ہونٹوں سے بے ساختہ بلند کراہ نکلی اور وہ اینٹوں کے فرش پر گرا۔ اس کے ناک منہ سے خون جاری ہوگیا تھا۔ لگتا تھا کہ اس کے اندرونی اعضا کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا ہے۔ چند سیکنڈ بعد ایک دم اس کے منہ سے خون کا فوارہ چھوٹا اور وہ دو بار اینٹھ کر ساکت ہوگیا۔ اس کی آنکھوں پر ایک نگاہ ڈال کر ہی پتا چل جاتا تھا کہ وہ آناً فاناً دنیا کے بکھیڑوں سے آزاد ہو چکا ہے۔

بلب کی روشنی میں اب اس کا حلیہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ وہ یقیناً برونائی کا ہی باشندہ تھا۔ آنکھوں کے پپوٹے بھاری تھے، ناک تھوڑی پست اور رخسار ابھرے ہوئے تھے۔ بہرحال اس کا لباس مقامی تھا۔ اس نے پینٹ اور سویٹر پہن رکھا تھا۔ اس کی سیون ایم ایم رائفل کافی فاصلے پر برآمدے کی دیوار سے ٹنگی ہوئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ رائفل استعمال نہیں کرسکتا تھا اور اس نے فوری طور پر پیچ کس کو ہتھیار بنانے کی کوشش کی تھی۔

"کیا یہ مرگیا؟" صغیر نے لرزاں آواز میں پوچھا۔

"مرگیا ہے اور اسی طرح تم بھی مرو گے۔ اگر کوئی ہیرا پھیری کرو گے اور سوالوں کے ٹھیک جواب نہیں دو گے تو کل کا سورج تمہارے لیے نہیں ہوگا۔"

وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔

"کیا نام ہے اس کا؟" سجاول نے پوچھا۔

"باقر......"

"یہ کیا کررہا تھا یہاں...... اور یہ پولیس کی گاڑی...... اس کے ساتھ کیا ڈراما ہورہا ہے یہاں؟"

"یہ...... یہ پولیس کی گاڑی نہیں ہے۔ اسے ان...... لوگوں نے پولیس کی گاڑی جیسا بنایا ہے۔" صغیر نے اٹک اٹک کر کہا۔

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ روشنی تھوڑی تھی پھر بھی مجھے پتا چل رہا تھا کہ گاڑی کو حال ہی میں پمپ اسپرے کے ذریعے پینٹ کیا گیا ہے اور اس میں دیگر ضروری تبدیلیاں کی گئی ہیں۔ اس پر آزاد کشمیر پولیس کی نمبر پلیٹ بھی لگائی جارہی تھی۔

میں نے صغیر سے پوچھا۔ "یہ جو وردیاں اندر لٹک رہی ہیں، یہ بھی جعلی ہیں؟"

"جج...... جی ہاں۔ ان لوگوں کا پروگرام یہ تھا کہ پولیس کے بھیس میں یہاں سے نکل جائیں۔ میرا مطلب ہے، چھوٹے صاحب کو لے کر......"

چھوٹے صاحب سے اس کی مراد عزت مآب کا فرزند ارجمند تھا۔ لگتا تھا کہ ان لوگوں نے لمبی چوڑی پلاننگ کررکھی تھی۔

"یہاں سے ان لوگوں کا پروگرام کہاں جانے کا تھا؟" میں نے اسے گدی سے دبوچ کر دریافت کیا۔

"مجھے اس بارے میں نہیں معلوم جی......"

"تمہیں معلوم ہے...... اور تم بتاؤ گے بھی۔" میں نے اس کی گردن کو جھنجوڑا۔

جھنجوڑنے سے اس کا ٹوٹا ہوا بازو ہل گیا اور وہ بری طرح کراہنے لگا۔ اندازہ ہورہا تھا کہ پارا ہاؤس میں میرے مروڑنے سے اس کی کہنی چکنا چور ہوچکی ہے۔ پتا

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

www.paksociety.com

نہیں وہ کیسے درد کو برداشت کیے ہوئے تھا۔

معاً ایک بار پھر اس کے سیل فون کا میوزک بج اٹھا۔ میں نے رائفل کی نال اس کے سر سے لگاتے ہوئے کہا۔ ''کوئی چالاکی دکھائی تو اس مشٹنڈے باقر کے ساتھ ہی فرش پر لمبے لیٹے نظر آؤ گے۔''

''نن...... نہیں جی۔''

''اگر فون پارا ہاؤس سے ہے تو خود کو بالکل نارمل ظاہر کرو...... اور یہاں او کے کی رپورٹ دو۔ اگر وہ لوگ باقر کا پوچھیں تو بتاؤ کہ وہ واش روم میں ہے۔''

صغیر نے تھوک نگل کر اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے اسے اشارہ کیا کہ وہ کال ریسیو کرے۔ اسپیکر آن کرنے کا حکم بھی میں نے اسے اشارتاً ہی دے دیا تھا۔ چند سیکنڈ کے بعد فون کے اسپیکر پر وہی آواز ابھری جو ہم نے کچھ دیر پہلے راستے میں بھی سنی تھی۔ یہ صغیر کا ساتھی بشیرا تھا اور پارا ہاؤس سے ہی بول رہا تھا۔ اس مرتبہ اس کی آواز میں اعتماد اور جوش تھا۔ بولا۔ ''ہاں، صغیر بھائی! گھر پہنچ گئے ہو؟''

''ہاں، پہنچ گیا۔'' صغیر نے اپنی آواز کو حتی الامکان نارمل رکھتے ہوئے کہا۔

''یہ باقر کہاں مر گیا ہے۔ ناقب صاحب اس سے بات کرنا چاہ رہے تھے۔ اس کا فون ہی نہیں مل رہا۔''

''شاید اس کا پیٹ خراب ہے۔ واش روم میں ہے۔''

''چلو ٹھیک ہے...... اِدھر ایک خوش خبری ہے۔ وڈے صاحب کی گردن میں جو سریا تھا، وہ ٹوٹ گیا ہے۔ اس نے ہمیں جانے کے لیے رستہ دے دیا ہے۔ ہم اب بڑے صاحب کے لڑکے کے ساتھ گاڑیوں میں بیٹھ رہے ہیں، بلکہ سمجھو کہ نکل رہے ہیں۔ چالیس پینتالیس منٹ میں ہم وہاں ہوں گے۔''

میں ساری گفتگو غور سے سن رہا تھا۔ صغیر کا یہ بشیرا نامی ساتھی صرف بڑے صاحب کے لڑکے کی بات کر رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ انہوں نے وی آئی پی مہمان شکیل داراب کو وعدے کے مطابق پارا ہاؤس کے پورچ میں پہنچ کر آزاد کر دیا ہے۔

بشیرا اب صغیر سے اس کے بھائی کی موت پر افسوس کا اظہار کر رہا تھا۔ ''حوصلہ رکھ صغیر! ناقب صاحب کو بھی تیرے بھائی کی موت کا دکھ ہوا ہے۔ ناقب صاحب اس کے گھر والوں کی مدد کریں گے۔ بے شک وہ ہمارے ساتھ نہیں تھا لیکن تمہارا بھائی تو تھا۔ اس کی جان تو واپس نہیں آسکتی مگر باقی وہ کسی طرح کی کسر نہیں چھوڑیں گے۔ تو بس اپنے ہوش حواس کو کنٹرول میں رکھ۔''

''کوشش تو کر رہا ہوں۔'' صغیر نے مری مری آواز میں کہا۔

بشیرے کی آواز آئی۔ ''جس کمرے میں لڑکے کو رکھنا ہے اس کی ایک بار پھر چنگی طرح تلاشی لے لے۔ اس میں کوئی ایسی شے نہیں ہونی چاہیے جو منڈے کے کام آسکے۔ تالے وغیرہ بھی چیک کر لے۔''

''میں نے سب دیکھ لیا ہے۔'' صغیر نے اپنی کراہ دباتے ہوئے کہا۔

گاڑیاں اسٹارٹ ہونے کی آوازیں آرہی تھیں۔ دروازے بند ہو رہے تھے۔ پارا ہاؤس میں رکھوالی کے کتے بے پناہ شور مچا رہے تھے۔ مگر اب یہ شور اور دیگر سارے حفاظتی انتظامات بیکار تھے۔ سرغنہ ناقب دیگر حملہ آوروں کے ساتھ پارا ہاؤس والوں کو زیر کرنے میں کامیاب رہا تھا اور اب بڑے صاحب کے چھوٹے بیٹے ابراہیم کو گن پوائنٹ پر رکھ کر پارا ہاؤس سے نکل رہا تھا۔ وہ خود کو کامیاب سمجھ رہا تھا لیکن اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ کامیاب و کامران ہو کر جہاں پہنچ رہا ہے، وہاں پہلے ہی اس کے لیے گھات لگائی جا چکی ہے اور یہ گھات اس وجہ سے لگی ہے کہ اس کا ایک کارندہ ہمارے ہاتھ لگ کر اور ساؤنڈ پروف کمرے میں زبردست مار کھا کر سب کچھ اگل چکا ہے۔

یہ بڑے سنسنی خیز لمحات تھے۔ ہمارے پاس وقت بہت کم تھا۔ وہ لوگ پارا ہاؤس سے روانہ ہو چکے تھے اور یہاں تک کا فاصلہ پینتالیس پچاس منٹ سے زیادہ کا نہیں تھا۔ ہم نے باقر کی لاش کو گھسیٹ کر پچھلے صحن کے گیٹ سے باہر نکالا اور کچھ فاصلے پر جھاڑیوں میں چھپا کر اس پر ایک ترپال ڈال دی۔ خون کے نشانات بھی اچھی طرح صاف کر دیے۔

صغیر کی حالت بری تھی۔ وہ مزاحمت کے قابل تو نہیں تھا، پھر بھی احتیاط ضروری تھی۔ میں نے ایک کپڑے سے اس کے ہاتھ پشت پر باندھے اور اسے اینٹوں کے فرش پر دیوار کے ساتھ بٹھا دیا۔ جب میں ہاتھ پشت پر باندھ رہا تھا وہ کربناک انداز میں چلّانے لگا۔ اس کی تکلیف کی وجہ اس کا چکنا چور بازو ہی تھا۔

میں نے جیپ کی نمبر پلیٹ لگائی۔ ظاہر ہے کہ جیپ کی طرح یہ پلیٹ بھی جعلی ہی تھی۔ ہم نے گاڑی کو اندر سے دیکھا۔ گاڑی کی چابی ہمیں متوفی باقر کی جامہ تلاشی کے

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

دوران میں ٹل گئی تھی۔ میں نے گاڑی کو اسٹارٹ کر کے دیکھا۔ وہ فوراً اسٹارٹ ہو گئی۔ فیول کی ٹینکی تقریباً بھری ہوئی تھی۔ میں نے اگنیشن کے نیچے ہاتھ ڈال کر بیٹری کے چند تار کھینچ دیے۔ اب یہ فوری طور پر اسٹارٹ نہیں ہو سکتی تھی۔

اسی دوران میں اندرونی کمرے سے صغیر کی بیوی کی آہ و بکا سنائی دینے لگی۔ وہ دُہائی دے رہی تھی۔ ''مجھے نکالو......خدا کے لیے نکالو......میں نے کچھ نہیں کیا۔''

آواز خاصی مدھم تھی۔ ہمیں اس کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔

سجاول نے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ پہلے وہ کمرا دیکھ لیں جہاں منڈے کو رکھا جانا ہے۔''

جیپ کی طرف سے مطمئن ہو کر ہم نے صغیر کو ساتھ لیا اور اس کی نشاندہی پر اس کمرے میں پہنچے جہاں شاید چند گھنٹوں یا ایک دو دن کے لیے اغوا شدہ ابراہیم کو رکھا جانا تھا۔ یہ عام سائز کا کمرا تھا۔ اس کے دو دروازے تھے۔ ایک کھڑکی تھی جس میں موٹی گرل اور جالی لگی ہوئی تھی۔ کمرے میں ایک چٹائی بچھی ہوئی تھی۔ ایک جستی پیٹی پڑی تھی اور ایک الماری رکھی تھی۔ چٹائی پر ایک کونے میں ایک فرشی بستر بچھا تھا۔ بستر سے تھوڑے فاصلے پر ہی اٹیچ باتھ روم کا دروازہ تھا۔ میں نے باتھ روم کا دروازہ کھول کر دیکھا۔ اندر ضرورت کا سامان، بالٹی، ڈونگا، صابن تولیا، شیمپو وغیرہ موجود تھا۔

انتظامات دیکھ کر سجاول نے اپنی تیکھی مونچھوں کو انگلی سے سہلایا اور بولا۔ ''لگتا ہے کہ منڈے کو یہاں کچھ دن رکھنے کا پروگرام ہے۔''

''ہاں، ہو سکتا ہے کہ پہلے اسے یہاں رکھا جائے۔ جب اس کو ڈھونڈنے کا کام ذرا سست پڑ جائے تو پھر آگے لے جایا جائے۔''

''مگر جیپ کی تیاری شیاری دیکھ کر تو یہ بھی لگتا ہے کہ فوراً یہاں سے روانگی کا پلان ہے۔'' سجاول نے کہا۔

''کیا پتا انہوں نے دونوں طرح کی تیاری کی ہو۔ فوراً نکل بھی سکتے ہوں اور رک بھی سکتے ہوں۔''

کمرے کے پچھلے دروازے کو باہر سے تالا لگایا گیا تھا مگر اگلا دروازہ کھلا تھا۔ میں نے صغیر کے کندھے کو رائفل کی نال سے ٹہوکا دیتے ہوئے کہا۔ ''اس تالے کی چابی کدھر ہے؟''

''مم......میری گھر والی کے پاس۔''

سجاول نے آگے بڑھ کر اس کمرے کا دروازہ کھولا جہاں صغیر کی بیوی (جو کسی ہندی فلم کی ہیروئن بنی ہوئی تھی) موجود تھی اور گاہے بگاہے واویلا کرنے لگتی تھی۔ جونہی دروازہ کھلا وہ کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح آئی اور سجاول کی بغل سے نکل کر بھاگنے کی کوشش کی۔ سجاول اسے کہاں جانے دیتا۔ اس نے اس کے لہراتے بال پکڑے۔ وہ اپنی ہی جھونک میں ڈگمگائی اور گھوم کر ایک بستر پر جا گری۔ سجاول کی لہولہو آنکھیں دیکھ کر اس کا پتّا پانی ہو گیا۔ وہ ہاتھ جوڑنے لگی۔ ''رب کا واسطہ مجھے کچھ نہ کہنا۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔ جو کچھ کیا ہے اس نے کیا ہے۔ بب......بس یہ ان لوگوں کے دھوکے میں آ گیا......'' اس کا اشارہ اپنے شوہر نامدار صغیر کی طرف تھا۔

صغیر کڑوا گھونٹ بھر کر رہ گیا۔ دلچسپ صورتِ حال تھی۔ شوہر اپنی بیوی پر لالچی ہونے کا الزام لگا رہا تھا۔ بیوی اپنے شوہر کو نادان قرار دے رہی تھی۔ شاید دونوں ہی قصوروار تھے۔

بے شک وہ دونوں جھلاہٹ میں ایک دوسرے پر الزام لگا رہے تھے مگر ان کے تاثرات اور ان کی نگاہوں کے انداز سے پتا چلتا تھا کہ وہ ایک دوسرے کی خیریت کے بارے میں بہت فکرمند بھی ہیں۔ ان کا ابھی کوئی بچہ نہیں تھا اور اکثر بے اولاد جوڑوں کی طرح شاید ابھی وہ دونوں ہی ایک دوسرے کی توجہ کا محور تھے۔

صغیر نے اپنے فرض سے غداری کی تھی۔ وہ پارا ہاؤس کا محافظ تھا۔ اس کے جسم پر محافظ کی وردی تھی۔ اس کا اسلحہ پارا ہاؤس کی حفاظت کے لیے تھا مگر اس نے پارا ہاؤس کے غیر ملکی دشمنوں کا ساتھ دیا تھا۔ اس نے اپنی برادری کے مزید گارڈز کو ساتھ ملایا اور ناقب کا دستِ راست بن گیا۔ اب وہ مشکل میں تھا اور ساتھ ہی اس کی گھر والی بھی۔

صغیر کی گھر والی کا نام نادیہ معلوم ہوا تھا۔ سجاول نے نادیہ کو قہرناک لہجے میں مخاطب کیا۔ ''چابی کہاں ہے اس تالے کی؟''

''جی......وہ تو......'' وہ ہکلائی اور سوالیہ نظروں سے صغیر کی طرف دیکھا۔

''چابی دے دو۔'' صغیر نے مری مری آواز میں کہا۔

وہ چند لمحے ہچکچائی پھر اس نے اپنی مختصر تنگ چولی میں ہاتھ ڈالا اور چابی نکال کر سجاول کے حوالے کر دی۔ اس کے ہاتھ لرز رہے تھے۔

''اس چھمک چھلو کا کیا کرنا ہے؟'' سجاول نے نادیہ

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

کی طرف اشارہ کر کے مجھ سے سوال کیا۔
''تمہارا کیا خیال ہے؟'' میں نے اس سے پوچھا۔
وہ بستر پر آڑی ترچھی پڑی تھی۔ گلابی ساڑی کا طویل پلو فرش پر بکھرا ہوا تھا۔ کمر کا زیادہ تر حصہ لباس سے عاری تھا۔ بال بکھرے ہوئے اور گہنے وغیرہ وہ اتار چکی تھی۔ اکثر مردوں کو اپنی بیویوں کی حد سے بڑھی ہوئی ضروریات یا ان کا لالچ ہی پھنساتا ہے۔ یہاں بھی کچھ ایسا ہی معاملہ دکھائی دیتا تھا۔ سجاول نے خشک لہجے میں کہا۔
''میرا خیال تو اس الو کی پٹھی کے بارے میں بڑا خطرناک بھی ہوسکتا ہے۔ لیکن جو تم کہو گے وہی کریں گے۔''
میں نے کہا۔ ''اس صغیر کو لگام ڈالے رکھنے کے لیے اس کی اس معشوق زوجہ کو اپنے قبضے میں رکھنا پڑے گا۔''
صغیر اور نادیہ دونوں کا رنگ زرد ہو گیا۔ صغیر بولا۔
''آ...... آپ بے فکر رہو جی۔ یہ کچھ نہیں کرے گی۔ اس کو بس اسی کمرے میں بند کر دو۔ آواز تک نہیں نکالے گی۔''
میں نے جواب دیا۔ ''آوازیں تو یہ ابھی تھوڑی دیر پہلے بھی نکال رہی تھی۔ جب تمہارے وہ والد صاحبان اپنے ہتھیاروں سمیت یہاں تشریف لے آئیں گے تو پھر یہ کیوں رولا نہ ڈالے گی؟''
سجاول نے نادیہ کو بازو سے پکڑ کر اٹھایا اور پستول کی نال سے ٹہوکا دے کر عقبی صحن کی طرف چلنے کے لیے کہا۔
وہ ہاتھ پاؤں جوڑنے لگی۔ سجاول کی لال انگارا آنکھوں کا نظارہ اسے سخت خوف زدہ کر رہا تھا۔ وہ پکاری۔
''میں نے کوئی قصور نہیں کیا۔ جو تم کہو گے میں وہی کروں گی لیکن میں یہاں سے نہیں جاؤں گی۔''
وہ دوبارہ بستر پر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھوں پر لگا ہوا کاجل اس کے رخساروں تک آ رہا تھا۔ یقیناً وہ کمرے میں بند ہونے کے بعد آنسو ہی بہاتی رہی تھی۔ اس نے اپنے ماتھے کی بندیا بھی مٹانے کی کوشش کی تھی۔ وہ مکمل طور پر مٹ نہیں سکی تھی اور یوں ماتھے پر رنگ پھیل کر رہ گیا تھا۔
سجاول نے اس بار اس کے پہلو میں لات رسید کی۔
وہ اُڑتی ہوئی سی برآمدے کے وسط میں جا گری۔ سجاول نے دھمکانے کے لیے پستول اس کی طرف سیدھا کیا اور پھنکارا۔ ''چلتی ہو یا اسی جگہ کھوپڑی میں موری بنا دوں۔''
وہ تڑپ کر اٹھ کھڑی ہوئی اور چپ چاپ سجاول کے آگے آگے چل پڑی۔ اس کا چہرہ بالکل فق تھا۔ صغیر کو میں نے گن پوائنٹ پر رکھا ہوا تھا۔ چادر کی بکل کے نیچے اس کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ درد کی شدت سے وہ بار بار کراہ اٹھتا تھا۔
عقبی صحن میں پہنچ کر میں نے انچارج گارڈ قادر خان کو فون کیا۔ وہ تھوڑے ہی فاصلے پر اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ جیپ میں موجود تھا۔ ''ہیلو کون؟'' قادر خان کی بھاری آواز ابھری۔
''میں شاہ زیب بول رہا ہوں۔ سجاول صاحب کہتے ہیں کہ تم جیپ لے کر فوراً گھر کی پچھلی جانب آ جاؤ۔''
''کوئی ڈر خطرے والی سچویشن تو نہیں؟''
''نہیں، سب او کے ہے۔'' میں نے کہا۔
صرف پانچ منٹ بعد قادر خان کی جیپ گھر کے عقبی صحن کے گیٹ کے باہر کھڑی تھی۔ احتیاط کے طور پر قادر خان نے ہیڈ لائٹس بجھا رکھی تھیں۔ ہم نادیہ اور صغیر کو لے کر باہر آ گئے۔ سجاول کے اشارے پر قادر خان نے جیپ کا عقبی دروازہ کھولا۔ سجاول نے نادیہ کو گھسیٹ کر دروازے کے پاس کیا اور پھر دھکا دے کر جیپ میں پھینک دیا۔ وہ گھٹی گھٹی آواز میں چلانے لگی۔ صغیر بھی بیوی پر ٹوٹنے والی آفت کے حوالے سے سخت پریشان نظر آتا تھا لیکن کر کچھ نہیں سکتا تھا۔
سجاول نے کرخت لہجے میں قادر خان سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''اس حرام زادی کے کھوپڑے سے رائفل لگا کر رکھنا اگر اس کا خصم ٹھیک ٹھیک چلتا رہا تو کچھ نہیں کہنا لیکن اگر یہ کوئی گڑبڑ کرے تو پھر بے دریغ کھوپڑی اُڑا دینا اس ناگن کی۔''
''جیسے آپ کا حکم ہو جی۔'' قادر خان نے فرمانبرداری کا مظاہرہ کیا۔
''میں کچھ نہیں کروں گا، جیسے آپ لوگ کہو گے وہی ہو گا۔ پر اس کو کچھ نہیں ہونا چاہیے۔'' صغیر نے کہا۔ اس کا اشارہ اپنی جواں سال بیوی کی طرف ہی تھا۔
''کچھ نہیں ہوگا۔'' سجاول بولا۔ ''بال بھی ڈنگا نہیں کریں گے اس کا۔ پر اگر تم نے اپنے ساتھیوں کو دیکھ کر کوئی چالاکی دکھائی تو پھر......'' سجاول نے معنی خیز انداز میں فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔
صغیر نے ایک بار پھر یقین دلایا کہ وہ ہمارے ہر حکم پر عمل کرے گا۔ اس نے اپنی روتی بلکتی بیوی کو بھی تسلی دی اور ہمارے ساتھ واپس گھر میں آ گیا۔ واپس آنے سے پہلے ہم نے قادر خان کو ضروری ہدایات دے دی تھیں۔ ان ہدایات کے مطابق قادر خان کو جیپ لے کر تقریباً 50 میٹر دور انہی جھاڑیوں کے عقب میں کھڑے رہنا تھا جہاں ہم

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

نے تھوڑی دیر پہلے باقر کی لاش چھپائی تھی۔ جونہی ہم ابراہیم کو لے کر جھاڑیوں تک پہنچتے قادر خان کو ہیڈ لائٹس آن کیے بغیر جیپ اسٹارٹ کرنا تھی اور ہمیں لے کر وہاں سے نکل جانا تھا۔ (قادر خان کا خیال تھا کہ پارا ہاؤس میں فون کر کے وہاں سے مزید نفری منگوانے کی کوشش کی جائے لیکن میں نے اور سجاول نے اسے سختی سے منع کر دیا۔ پارا ہاؤس میں بہت کنفیوژن تھی کچھ پتا نہیں تھا کہ محافظوں میں سے کون وفادار ہے اور کون غدار۔ اپنی موجودہ لوکیشن کو ہم جتنا راز میں رکھتے اتنا ہی بہتر تھا)

ہم ایک بار پھر اس کمرے تک پہنچ گئے جہاں صغیر کے بقول اغوا شدہ ابراہیم کو رکھا جانا تھا۔ سجاول نے چابی گھما کر عقبی دروازے کا تالا کھولا اور دوبارہ سے بند کیا۔ ہمیں تسلی ہو گئی کہ بوقتِ ضرورت ہم یہ تالا کھول سکتے ہیں۔ اب ہمیں اس کمرے کی عقبی جانب ایک ایسی جگہ کی تلاش تھی جہاں سجاول آنے والوں کی نگاہوں سے محفوظ رہ سکے اور اردگرد کڑی نظر بھی رکھ سکے۔ جلد ہی ہمیں یہ جگہ نظر آ گئی۔ یہ اندرونی برآمدے کے اوپر ایک پختہ پڑچھتی تھی جس کے اوپر گتے کے کچھ بڑے کارٹن رکھے تھے۔ یہ خالی کارٹن تھے۔ سجاول ان کے پیچھے بہ آسانی چھپ سکتا تھا۔ جگہ کے حوالے سے مطمئن ہونے کے بعد سجاول اس کمرے میں پہنچا جہاں کچھ دیر پہلے ہم نے نادیہ کو بند کیا تھا۔ میں تاڑ گیا تھا کہ وہ وہاں کیا کرنے گیا ہے۔ اسے پتا چل گیا تھا کہ نادیہ نے وہاں اپنے بیش قیمت گہنے اتارے ہیں۔ یہ گہنے ان اشیا میں سے تھے جو غداری کے صلے میں صغیر کو عنایت کی گئی تھیں۔ سجاول ان پر ہاتھ صاف کرنا چاہتا تھا اور اس نے ایسا ہی کیا۔ دو تین منٹ بعد جب وہ باہر نکلا تو وہ جڑاؤ زیورات... ایک چھوٹی پوٹلی کی صورت میں سجاول کے لباس کے نیچے پہنچ چکا تھا۔ وہ شاید ایک پیدائشی ڈکیت تھا اور پرائی چیز پر قبضہ جمانا اس کی فطرت کا حصہ تھا۔

اب ہمارے پاس وقت بہت کم تھا۔ سجاول کو پڑچھتی کے اوپر گتے کے خالی ڈبوں کے عقب میں چھپنا تھا۔ وہ قد آور ہونے کے باوجود پھرتیلا اور چست تھا۔ وہ پڑچھتی پر چڑھا اور ڈبوں کی اوٹ لے کر بیٹھ گیا۔ میں نے اپنی والی رائفل اسے دے دی تھی اور اس کا پستول خود لے لیا تھا۔

پروگرام کے مطابق مجھے اسی کمرے کے اندر رہنا تھا جہاں ابراہیم کو لا کر رکھا جانا تھا۔ کمرے میں چھپنے کی بہترین جگہ وہی جستی پیٹی تھی۔ یہ کمرے کے ایک گوشے میں رکھی تھی۔ اس پر دو صندوق بھی پڑے تھے۔ یہ پیٹی لحاف وغیرہ رکھنے کے لیے استعمال ہوتی ہو گی مگر جب ڈھکنا کھول کر دیکھا تو چند گدیلے اور کھیس وغیرہ ہی رکھے تھے۔ لحاف نکال کر استعمال کیے جا رہے ہوں گے۔ یقیناً کوئی اس سے بہتر جگہ میسر آ ہی نہیں سکتی تھی۔ صندوق وزنی نہیں تھے۔ بوقتِ ضرورت میں بہ آسانی پیٹی کا ڈھکن اٹھا کر باہر نکل سکتا تھا۔

سجاول نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''شاہی! ایسی پیٹیوں میں بند ہونے میں ایک بڑا خطرہ ہوتا ہے جس کا پتا شاید تم کو نہیں......''

''کیسا خطرہ؟''

''یہ دیکھو، اس پیٹی کے دونوں طرف یہ کنڈیاں ہیں۔ پیٹی کا ڈھکن نیچے آئے تو یہ خود بخود بند ہو جاتی ہیں۔ پھر تم اندر جتنا مرضی ناچتے رہو یہ ڈھکن کھلے گا نہیں۔''

وہ درست کہہ رہا تھا۔ پیٹی کے کھٹکے خود بخود نیچے گر کر مجھے اندر ہی بند کر سکتے تھے۔ اس کا حل ہم نے یہ نکالا کہ دونوں کھٹکوں کو تھوڑا تھوڑا ٹیڑھا کر دیا۔ یوں وہ پوری طرح بند نہیں ہوئے۔ اب ڈھکن اندر سے بھی کھولا جا سکتا تھا۔

میں نے ایک بار پھر صغیر کی گدی اپنے ہاتھ میں دبوچی اور صاف کھرے لہجے میں کہا۔ ''صغیر بیٹا! اگر تم نے کوئی بھی حماقت فرمائی تو تمہاری چھمک چھلو پر قیامت ٹوٹ پڑے گی...... اور اس قیامت سے پہلے شاید تمہارا بھی بولو رام ہو جائے۔ سجاول اوپر پڑچھتی پر موجود رہے گا۔ وہ کسی بھی وقت تمہیں نشانہ بنا سکتا ہے۔''

''ایسا کچھ نہیں ہوگا جی۔'' صغیر بولا۔

اب وہ پوری طرح ہمارے ٹرانس میں آ چکا تھا۔ اس کی چھٹی حس نے شاید گواہی دے دی تھی کہ یہاں بہت کچھ الٹ پلٹ ہونے والا ہے۔ اس نے ہمیں یقین دہانی کرائی کہ اپنی اور بیوی کی جان بچانے کے لیے وہ ہمارے ساتھ پورا تعاون کرے گا۔

یکایک اس کے سیل فون کا میوزک پھر بج اٹھا۔ میں نے اسکرین دیکھی۔ حسبِ توقع دوسری طرف اس کا دوست بشیرا ہی تھا۔ میں نے آنکھیں نکال کر صغیر کی طرف دیکھا اور خاموشی کی زبان میں سمجھایا کہ اسے سابقہ ہدایات پر عمل کرنا ہے۔

صغیر نے اپنے سلامت بازو کو حرکت دے کر کال ریسیو کی۔ بشیرے کی آواز آئی۔ ساتھ میں چلتی گاڑی کا شور بھی تھا۔ بشیرے نے کہا۔ ''صغیر! ہم دس منٹ میں پہنچ رہے ہیں۔ تم ریڈی رہو۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

"میں...... بالکل ریڈی ہوں۔"

"سامنے والا گیٹ کھول دو۔ ہم لڑکے والی گاڑی سیدھی اندر ہی لائیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔"

"باقر کو بلاؤ۔ ناقب صاحب بات کریں گے۔"

"بب...... باقر...... وہ پھر باتھ روم میں ہے۔ اس کا موبائل باہر ہی پڑا ہے۔"

"شاباش، اچھے موقع پر باتھ روم لگے ہیں اُسے...... چلو وہ نکلے تو اسے کہو کہ ناقب صاحب سے بات کرے۔"

"ٹھیک ہے۔"

سلسلہ منقطع ہو گیا۔ بشیرے کو معلوم نہیں تھا کہ جس سے وہ بات کرنا چاہ رہا ہے وہ تھوڑی دور جھاڑیوں میں ابدی خاموشی اوڑھ کر لیٹا ہوا ہے۔ اب حشر سے پہلے اس میں بیداری کے آثار نمودار نہیں ہوں گے۔

ہم نے صغیر کو سب کچھ سمجھا دیا۔ میں جستی پیٹی میں چلا گیا اور سجاول نے باہر کی نگرانی شروع کر دی۔

جستی پیٹی کے اندر تاریکی تھی اور خوشگوار حرارت کا احساس تھا۔ فینائل کی گولیوں کی بہت ہلکی سی بو بھی محسوس ہو رہی تھی۔ میں روئی کے گدیلوں پر نیم دراز ہو گیا۔ پستول کو اپنے ہاتھ میں بالکل تیار کر لیا اور کان باہر سے ابھرنے والی آوازوں پر لگا دیے۔ دھڑکن جیسے کنپٹیوں میں گونج رہی تھی اور تناؤ بڑھتا جا رہا تھا۔

بمشکل سات آٹھ منٹ گزرے ہوں گے کہ گاڑیوں کا مدھم شور سنائی دیا۔ یہ کم از کم دو گاڑیاں تھیں جو تیزی سے اس مکان کی طرف آ رہی تھیں۔ پھر وہ سامنے والے گیٹ سے اندر داخل ہوئیں۔ پورے گھر میں بھاری قدموں کی آوازیں گونجیں۔ کسی نے مالے زبان میں گرج کر کچھ کہا۔ دروازے کھلے اور بند ہوئے۔ چند سیکنڈ مزید گزرے پھر کمرے کا دروازہ پُرشور آواز میں کھلا اور کسی کو دھکا دے کر کمرے کے اندر پھینک دیا گیا۔ یقیناً وہ نوجوان ابراہیم ہی تھا۔ وہ جستی پیٹی کے بالکل پاس چٹائی پر گرا تھا۔ میں نے سرغنہ ناقب کی آواز سنی۔ اس نے بڑے کرخت لہجے میں ابراہیم سے کچھ کہا۔

جواب میں ابراہیم کی گھٹی گھٹی آواز سنائی دی۔ وہ بھی مالے میں ہی بولا تھا۔ اس کے لہجے سے اس کی شدید جسمانی تکلیف کا بھی اظہار ہوتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اس کے بازو پر کافی بڑا زخم ہے (پارا ہاؤس میں اس زخم کو ہمارے سامنے ہی ٹانکے لگائے گئے تھے)

لکڑی کا مضبوط دروازہ دھماکے سے بند ہو گیا اور اسے باہر سے بولٹ کر دیا گیا۔ میں نے انجنوں کی آواز سے اندازہ لگایا کہ گاڑیاں واپس جا رہی ہیں۔ بات سمجھ میں آ رہی تھی۔ یہ پارا ہاؤس کی گاڑیاں تھیں۔ ان گاڑیوں کو یہ لوگ یہاں روکتے تو اپنے لیے خطرہ پیدا کرتے۔ اب ان کو کہیں اور چھوڑ کر آنا تھا.... ممکن تھا کہ کہیں جھاڑیوں یا سرکنڈوں وغیرہ میں چھپا دیا جاتا۔

میں جستی پیٹی میں تھا۔ باہر کی دنیا سے میرا رابطہ بس آوازوں کی شکل میں ہی تھا۔ یہ مختلف آوازیں تھیں۔ ہتھیاروں کی کھڑکھڑاہٹ، بھاری قدموں کی چاپیں، مالے زبان کی گفتگو۔ ایک دو بار ناقب کی آواز بھی واضح سنائی دی۔ اس آواز میں جوش اور فتح کا تاثر تھا۔ تب ایک بار پھر کمرے کا دروازہ کھلا۔ مجھے محسوس ہوا کہ دو افراد اندر آئے ہیں۔ ان میں سے ایک بشیرا تھا جس کی آواز ہم سیل فون پر سنتے رہے تھے۔ پھر صغیر کی آواز بھی سنائی دی جو شاید کمرے کے دروازے پر موجود تھا۔

بشیرے نے اپنے ساتھی سے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ بس تھوڑی سی روئی رکھ کر ٹیپ لگا دیں۔"

"لیکن پہلے خون تو بند ہونا چاہیے۔" دوسرے شخص نے کہا۔

"خون بند ہی ہے۔ بس گاڑی میں لگنے والے دھکوں کی وجہ سے ایک دو ٹانکے ٹوٹے ہیں۔" یہ آواز دروازے پر کھڑے صغیر کی تھی۔ یہ گفتگو یقیناً ابراہیم کے زخم کے بارے میں ہو رہی تھی۔

صغیر اور بشیرا ایک ساتھ اس کمرے میں موجود تھے۔ صغیر کا بازو ٹوٹا ہوا تھا۔ پتا نہیں کہ اس نے بشیرے کو اور دیگر ساتھیوں کو اس حوالے سے کس طرح مطمئن کیا تھا۔ چار پانچ منٹ بعد بشیرا اس کا ساتھی اور صغیر وغیرہ واپس چلے گئے۔ لکڑی کا دروازہ پھر باہر سے بولٹ ہو گیا۔

مجھے پتا تھا کہ کمرے کے عقبی دروازے کے قریب سجاول بالکل چوکس ہے۔ عقبی دروازے کی چابی بھی اس کے پاس موجود تھی۔ آوازوں اور آہٹوں سے پتا چلتا تھا کہ زیادہ تر پہرے داری سامنے کی طرف ہی ہے۔ عقبی جانب شاید دو تین بندے ہی تھے۔

اب میرے حرکت میں آنے کا وقت تھا۔ میں نے بہت آہستہ سے ڈھکن کو اوپر اٹھانا شروع کیا۔ کمرے میں نیم تاریکی تھی۔ میں نے درز سے آنکھیں لگا کر دیکھا۔ ابراہیم دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا اور پیٹی کی طرف ہی

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر مجھے خوف آمیز حیرت نظر آئی۔

میں نے کمرے کا جائزہ لیا۔ کوئی اور موجود نہیں تھا۔ اب دن کا اجالا پھیل چکا تھا۔ کمرے کی گرل دار کھڑکی سے سامنے والے برآمدے کا منظر دکھائی دے رہا تھا۔ ایک گارڈ ستون سے ٹیک لگائے کھڑا تھا اور اپنے سیل فون سے چھیڑ چھاڑ کر رہا تھا۔ میں نے ڈھکن پورا اوپر اٹھایا اور ابراہیم کی طرف دیکھا۔ حیرت سے اس کا منہ وا تھا۔ میں نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ جیسے ٹھٹک کر رہ گیا۔

پھر اس نے بڑی تیزی سے صورتِ حال کو سمجھا۔ وہ آگے آیا اور اس نے ڈھکن اٹھا کر پیٹی میں سے نکلنے میں میری مدد کی۔ کمرے میں نیم تاریکی تھی اس لیے باہر سے اندر کا منظر فوری طور پر دیکھا نہیں جا سکتا تھا۔ میں نے اس کے دبلے پتلے کندھے پر ہاتھ رکھا، پھر اپنے سینے پر ہاتھ رکھا اور اشاروں کی زبان میں اسے سمجھایا کہ میں دشمن نہیں دوست ہوں۔

وہ خشک لبوں پر زبان پھیر رہا تھا۔ کبھی گرل دار کھڑکی کی طرف دیکھتا تھا، کبھی میری طرف۔ اس کی تشویش بجا تھی۔ کھڑکی کے عین سامنے جو گارڈ ستون سے ٹیک لگائے کھڑا تھا، وہ کسی بھی وقت آگے بڑھ کر کھڑکی میں سے جھانک سکتا تھا۔ میں نے اشاروں میں ابراہیم سے کہا کہ وہ دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ جائے۔

اس نے میری ہدایت پر عمل کیا۔ میں الماری کی اوٹ میں ہو گیا۔ پستول میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے پروگرام کے مطابق عقبی دروازے کی طرف قدم بڑھائے اور دروازے کو ہولے سے حرکت دی۔ یہ سجاول کے لیے اشارہ تھا۔

اس اشارے کے چند سیکنڈ بعد سجاول نے بھی جواب دیا۔ اس نے بھی دروازے کو ہولے سے حرکت دی۔ وہ دروازے کی دوسری جانب موجود تھا اور تالے میں چابی لگانے کو تیار تھا۔ یہی وقت تھا جب میری نگاہ دروازے کے درمیانی حصے کی طرف گئی۔ رگوں میں خون سنسنا کر رہ گیا۔ اب دروازے پر اندر کی طرف بھی تالا نظر آرہا تھا۔ یقینی بات تھی کہ یہ تالا ابھی پانچ دس منٹ قبل ہی لگایا گیا ہے۔ جب ابراہیم کو کمرے میں لایا گیا تو اس وقت کسی ملازم نے مزید احتیاط کے طور پر دروازے کو اندر سے بھی لاک کر ڈالا تھا۔

اس کا مطلب تھا کہ اب سجاول باہر سے دروازہ کھول بھی دیتا تو ہم آسانی سے باہر نہیں نکل سکتے تھے۔ چند لمحے کے لیے میں ٹپٹایا۔ باہر سے کھٹ پٹ کی بہت مدھم آواز آئی۔ سجاول نے اپنی جانب سے کام کر دیا تھا۔ یعنی تالا کھول کر بولٹ ہٹا دیا تھا۔

میں نے اشارے سے ابراہیم کو پاس بلایا...... اور اشارے سے ہی بتایا کہ وہ باہر نکلنے کے لیے تیار ہو جائے۔

وہ شکستہ انگلش میں بولا۔ ”تم کیا کرنا چاہتے ہو؟“

مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ میں اس سے بات کر سکتا ہوں۔ میں نے اسی کے انداز میں مدھم سرگوشی کی۔ ”باہر ہمارے آدمی موجود ہیں۔ اس دروازے سے نکلتے ہی ہم محفوظ ہو جائیں گے۔ تمہیں بس تھوڑی سی ہمت کرنا ہوگی۔“

”لیکن...... آپ کون ہو؟“

”کہا ہے ناں دوست ہوں۔“ میں نے بھی انگلش میں جواب دیا۔ ”جس بندے نے تمہاری ماما کو پارا ہاؤس میں بدمعاشوں سے بچایا ہے وہ اس دروازے کی دوسری طرف کھڑا ہے۔“

ابراہیم کی آنکھوں میں امید کی کرن نمودار ہوئی۔ سجاول کے ذکر نے جیسے اس کے اندر نئی توانائی بھر دی تھی۔

یہی وقت تھا جب میں نے دیکھا کہ سامنے والی کھڑکی سے باہر کھڑا مسلح گارڈ کمرے میں جھانکنے کے لیے کھڑکی کی طرف بڑھ رہا ہے۔ میں نے فوراً ابراہیم کے کندھے پر دباؤ ڈالا اور اسے نیچے بٹھا دیا۔ خود میں تیزی سے اس الماری کی اوٹ میں چلا گیا۔ گارڈ نے اندر جھانکا اور پھر اپنی رانیں کھجاتا ہوا واپس ستون کی طرف چلا گیا۔

میں نے اشارے سے ابراہیم کو دروازے کے پاس بلایا۔ اسے پستول دکھاتے ہوئے سرگوشی میں کہا۔ ”میں فائر کر کے یہ تالا توڑنے لگا ہوں۔ اس کے بعد ہم باہر نکلیں گے اور ایک راہداری میں دوڑتے ہوئے پچھلے صحن کی طرف جائیں گے۔“

اس نے ڈرے ڈرے انداز میں اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے کہا۔ ”کہیں رکنا نہیں۔ مڑ کر دیکھنا نہیں۔ بس سیدھے بھاگتے جانا ہے۔“

وہ انگلش اچھی طرح سمجھ رہا تھا اور تھوڑی سی دشواری کے ساتھ بول بھی لیتا تھا۔ وہ برونائی اسٹائل کے لباس میں ہی تھا لیکن اب ٹوپی اس کے سر پر دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ لبادہ بھی ایک طرف سے پھٹا ہوا تھا اور فرش پر گھسٹ رہا تھا۔ بھاگتے ہوئے یہ کپڑا اس کی ٹانگوں سے الجھ سکتا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

میں نے اس پھٹے ہوئے کپڑے کو گرہ دے کر باندھ دیا۔

نائن ایم ایم کے پستول کو تالے پر رکھ کر میں نے دو فائر کیے۔ تالا ٹوٹ گیا اور اس کے ساتھ ہی اردگرد کی خاموشی بھی ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہوگئی۔ پہرے داروں کی بلند آوازیں سنائی دیں۔ پھر دوڑتے قدموں کی بازگشت ابھری۔ یقیناً وہ لوگ سامنے کی طرف سے کمرے کی جانب لپک رہے تھے۔

ہم پچھلا دروازہ کھول کر باہر نکل آئے۔ سجاول کے ہاتھ میں گن تھی اور آنکھوں کی سرخی جیسے شعلوں میں بدل چکی تھی۔ ہم نے ابراہیم کو اپنے درمیان رکھا اور عقبی صحن کی طرف بھاگے۔ سب سے پہلے پچھلے برآمدے میں مزاحمت ہوئی۔ ایک دراز قد پہرے دار رائفل تان کر سامنے آیا لیکن اس سے پہلے کہ وہ صورتِ حال کو پوری طرح سمجھتا، سجاول نے بے دریغ اسے نشانہ بنایا۔ گولی اس کے چہرے پر لگی اور وہ رائفل سمیت الٹ گیا۔ اس کے جسم کو پھاندتے ہوئے ہم صحن میں آئے۔ جعلی پولیس جیپ کے پاس ہی ایک مسلح گارڈ موجود تھا۔ اس نے گولی چلائی جو خطا گئی۔ اسے دوسری گولی چلانے کا موقع ہم نے نہیں دیا۔ میرا سیدھا فائر اس کی پیشانی پر لگا۔ وہ جیپ کی باڈی سے ٹکرایا اور زمین بوس ہو گیا۔

ہم اندھا دھند بھاگتے ہوئے عقبی گیٹ سے نکلے اور ان جھاڑیوں کی طرف لپکے جن کے پیچھے قادر خان موجود تھا۔ اپنے زخم کی وجہ سے ابراہیم کو بھاگنے میں تکلیف ہو رہی تھی مگر موت کے خوف نے اس تکلیف کو پس منظر میں دھکیل دیا تھا اور وہ پوری کوشش کر کے ٹانگوں کو حرکت دے رہا تھا۔ میں نے کندھے کے پاس سے اس کا بازو تھام رکھا تھا۔

قادر خان نے بھی ہمیں آتے دیکھ لیا تھا۔ وہ جیپ کو ریورس بھگاتا ہوا ہماری طرف لایا۔ دوسری طرف مکان کے اندر تہلکہ مچ گیا تھا۔ بھاگو پکڑو کی صدائیں سنائی دے رہی تھیں۔ عقب سے ہم پر چند فائر بھی کیے گئے مگر خوش قسمتی سے کسی گولی نے ہمیں نقصان نہیں پہنچایا۔ جیپ کا عقبی دروازہ کھول دیا گیا تھا۔ ہم پھرتی سے جیپ میں چلے گئے اور وہ ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔ مجھے گھر کے عقبی گیٹ سے باہر مسلح افراد نظر آئے۔

''سر نیچے کرو۔'' میں نے چلّا کر کہا اور اس کے ساتھ ہی ابراہیم کو گدی سے پکڑ کر نیچے جھکا دیا۔

گولیوں کی ایک باڑ آئی اور جیپ کی دائیں جانب والی دونوں کھڑکیاں چکنا چور ہوگئیں۔ ہم بروقت نیچے جھک گئے تھے اس لیے محفوظ رہے۔

قادر خان خود ڈرائیو کر رہا تھا۔ اس نے پکار کر پوچھا کہ کس طرف جانا ہے؟

میں نے کہا۔ ''تمہیں زیادہ پتا ہوگا۔ جس طرف رستہ ملے نکل چلو۔''

قادر خان نے اسٹیئرنگ موڑا اور بائیس ہارس پاور کی فور وہیل جیپ کچے راستے پر اچھلتی کودتی تیزی سے آگے بڑھی۔ بے ہودہ ساڑی والی نادیہ بھی سکڑی سمٹی، جیپ کے ایک کونے میں پڑی تھی۔ میں نے اسے اشارہ کیا کہ وہ بھی بیٹھنے کے بجائے لیٹ جائے۔

''کوئی پیچھے تو نہیں آرہا؟'' قادر خان نے پوچھا۔

''ابھی تو نہیں......''

ابھی میرا فقرہ مکمل بھی نہیں ہوا تھا کہ ایک نیلی گاڑی کی جھلک دکھائی دی...... وہ لوگ آرہے تھے...... اور یہ صرف ایک گاڑی نہیں تھی۔ چند سیکنڈ بعد ایک دوسری گاڑی بھی دکھائی دی۔ یہ وہی کرولا تھی جو ہم نے یہاں اپنی آمد کے وقت صغیر کے گھر سے باہر کھڑی دیکھی تھی۔

پولیس جیپ کے تار کھینچ کر ہم یہ سمجھے تھے کہ شاید تعاقب نہ ہو سکے، مگر یہ خیال غلط ثابت ہوا تھا۔ اب دو گاڑیاں برق رفتاری سے پیچھے آرہی تھیں۔

''حرام زادے...... کتے کے تخم۔'' سردار سجاول نے دانت پیس کر کہا اور یکے بعد دیگرے کئی فائر ان گاڑیوں کی طرف کیے۔

جواب میں بھی فوراً فائر آئے۔ دو تین گولیاں جیپ کی باڈی میں لگیں اور پوری جیپ تھرا اٹھی۔ صغیر کی بیوی خوف زدہ ہو کر چلائی۔ ''ہائے میں مرگئی۔''

اب قادر خان نے بھی عقب نما آئینے میں گاڑیوں کو دیکھ لیا تھا۔ اس نے رفتار حتی الامکان تیز کر دی۔ جیپ بری طرح ڈگمگانے لگی۔ دفعتاً مجھ پر ایک مایوس کن انکشاف ہوا۔ یہ صرف ناہموار راستے کے ہچکولے نہیں تھے۔

میں نے سجاول سے کہا۔ ''مجھے لگ رہا ہے کہ ہماری گاڑی کا اگلا دایاں ٹائر بے کار ہوگیا ہے۔''

سجاول نے چند لمحے غور کیا اور بولا۔ ''شاید...... ایسا ہی ہے۔''

ایک گولی سنسناتی ہوئی آئی اور سیدھی قادر خان کے ساتھی کے بازو میں لگی۔ وہ بازو پکڑ کر دوہرا ہوگیا۔ رائفل اس کے ہاتھ سے نکل گئی تھی۔

سجاول نے بھنّا کر جوابی فائرنگ کی۔ اس نے دو

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

چھوٹے برسٹ چلائے۔ ہم نتیجے کے بارے میں تو نہیں جان سکے، لیکن اتنا ضرور ہوا کہ متعاقب گاڑیوں سے ہمارا فاصلہ کچھ بڑھ گیا۔ سورج ابھی طلوع نہیں ہوا تھا۔ مگر اجالا پھیل چکا تھا۔ ہمارے چاروں طرف ٹیلے تھے اور جھاڑیاں تھیں۔ ہماری جیپ کی اُڑائی ہوئی گرد میں پیچھے دیکھنا دشوار ہو رہا تھا۔

یکایک قادر خان کو زور سے بریک لگانا پڑے۔ آگے راستہ مسدود تھا۔ ایک برساتی نالا ہمیں ''فل اسٹاپ'' لگا رہا تھا۔

قادر خان نے چند سیکنڈ تذبذب میں رہنے کے بعد گاڑی کو بائیں جانب موڑا اور نالے کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنے لگا۔ برسٹ ٹائر کی وجہ سے جیپ کی رفتار تیز نہیں ہو سکتی تھی۔ پیچھے آنے والے بتدریج قریب آ رہے تھے۔ ان میں ایک تو وہی کرولا تھی جو ہم نے صغیر کے گھر سے باہر دیکھی تھی۔ دوسری ایک شہ زور گاڑی تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ اس میں درجن کے لگ بھگ مسلح افراد موجود ہیں۔ یہ نازک صورتِ حال ہو گئی تھی۔ میں نے قادر خان سے کہا۔ ''فون پر ساتھیوں سے رابطہ کرو۔''

''کوئی فائدہ نہیں۔'' وہ پکارا۔ ''میں انہیں اپنی لوکیشن کے بارے میں نہیں بتا سکتا۔ ویسے بھی انہیں یہاں آتے آدھ گھنٹا لگ جاتا ہے۔''

عقب سے مسلسل فائر آ رہے تھے۔ یہ آٹومیٹک اور سیمی آٹومیٹک اسلحے کی فائرنگ تھی۔ گاہے بگاہے ایل ایم جی بھی استعمال ہو رہی تھی۔ سجاول اور قادر خان کا ساتھی بھرپور جواب دے رہے تھے۔ بہرحال ہم جانتے تھے کہ ہماری فائرنگ پاور کم ہے۔ ہمارا ایمونیشن زیادہ دیر ہمارا ساتھ نہیں دے سکتا تھا۔ ہم رک رک کر گولی چلا رہے تھے یکایک ایک برسٹ آیا جس نے جیپ کی عقبی اسکرین توڑ دی اور مجھے اپنے پاؤں پر کسی گرم سیال کے گرنے کا احساس ہوا۔

میں نے دیکھا قادر خان کا دوسرا ساتھی اوندھے منہ میرے پاؤں پر پڑا تھا۔ اس کی گردن سے خون تیزی سے بہہ رہا تھا۔ کھوپڑی کا ایک حصہ بھی ٹوٹ چکا تھا اور مغز نشست پر بکھرا ہوا تھا۔ ابراہیم سکتہ زدہ نگاہوں سے یہ دلدوز منظر دیکھتا جا رہا تھا۔ ایک اور برسٹ آ کر ابراہیم کی اپنی کھوپڑی بھی چکنا چور کر سکتا تھا۔ میں نے ایک بار پھر ابراہیم کی دبلی گردن کو عقب سے پکڑا اور اسے آگے کی طرف جھکایا۔ ''نیچے لیٹ جاؤ۔'' میں نے چلا کر کہا۔

وہ پہلے گھٹنوں اور ہاتھوں کے بل ہو گیا پھر دو نشستوں کے درمیانی خلا میں پہلو کے بل لیٹ گیا۔ جہاں وہ لیٹا تھا وہاں خون تھا۔ شیشے کی بے شمار کرچیاں تھیں۔ اور گولیوں کے گرم خول تھے مگر زندگی بچانے کی فطری خواہش کے تحت اس نے کسی چیز کی پروا نہیں کی۔ گارڈ کی لاش کا منظر صغیر کی بیوی کو دکھائی نہیں دیا تھا۔ وہ اسی طرح گٹھڑی بنی ایک نشست پر پڑی تھی۔

عقبی گاڑیاں اب تیزی سے قریب آ رہی تھیں۔ کسی بھی وقت ہماری گاڑی کا کوئی اور ٹائر برسٹ ہو سکتا تھا۔ ہم نالے کے ساتھ ساتھ جا رہے تھے۔ دائیں طرف ایک خستہ حال پل نظر آ رہا تھا۔ یہ نالے پر ہی بنا ہوا تھا۔ قادر خان نے جیپ پل پر چڑھا دی۔ ہم نے پل تو بخیریت پار کر لیا مگر جب دوسری طرف اترے تو جیپ کا اگلا پہیا کیچڑ میں دھنس گیا۔ بے شک یہ فور وہیل ڈرائیو تھی مگر پہیا تو پہلے ہی برسٹ ہو چکا تھا۔ گاڑی زور لگا رہی تھی مگر نکل نہیں پا رہی تھی۔ انجن دہاڑ رہا تھا۔ پہیے گھوم رہے تھے مگر جتنا گھوم رہے تھے گاڑی اتنا ہی بائیں طرف جھکتی چلی جا رہی تھی۔ عقبی گاڑیوں کو خود سے دور رکھنے کے لیے ہم نے بھرپور فائرنگ شروع کر دی۔ دھماکوں سے قرب و جوار لرزنے لگے۔ اب صورتِ حال یہ تھی کہ پل کے ایک سرے پر ہم تھے اور دوسرے پر تعاقب کرنے والوں نے مورچا جما لیا تھا۔ وہ کسی بھی وقت پل پار کر کے ہم پر آ سکتے تھے۔

میں نے کہا۔ ''سجاول لگتا نہیں کہ گاڑی نکل سکے گی۔ تم اور قادر، ابراہیم کو لے کر نکل جاؤ۔ ہم دونوں ان لوگوں کا راستہ روک سکتے ہیں۔ موقع دیکھ کر ہم بھی پیچھے آ جائیں گے۔''

''تم زیادہ قربان علی خان مت بنو۔'' سجاول نے کہا۔ ''تم اور قادر نکلو۔ میں ان لوگوں کو روک لوں گا۔''

''نہیں سجاول، قربانی شربانی کی بات نہیں ہے۔ یہ ابراہیم مجھ سے زیادہ تم پر بھروسا کر رہا ہے۔ تم ساتھ ہو گے تو اسے حوصلہ رہے گا۔''

تھوڑی دیر اس معاملے پر بات ہوئی پھر میں نے سجاول کو قائل کر لیا، وہ بولا۔ ''لیکن قادر کو لے جانا ٹھیک نہیں۔ یہاں اس کی زیادہ ضرورت ہو گی۔ میں اسے ساتھ لے جاتا ہوں۔''

سجاول کا اشارہ قادر کے اس ساتھی کی طرف تھا جس کے بازو پر گولی لگی تھی۔

قادر خان سے بات کی تو وہ میرے ساتھ رکنے کو تیار ہو گیا۔ وقت بہت کم تھا۔ زخمی گارڈ نے اپنی رائفل میرے

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

حوالے کردی اور میں نے اپنا پستول اسے دے دیا۔ رائفل کے ساتھ ساٹھ کے قریب اضافی راؤنڈ بھی تھے۔ زبردست فائرنگ کے دوران میں ہی ابراہیم اور سجاول گاڑی کے اگلے دروازے سے باہر نکلے۔ زخمی گارڈ یعقوب بھی ان کے ساتھ تھا۔ وہ گاڑی کی آڑ لیتے اور جھک کر دوڑتے ہوئے جھاڑیوں میں اوجھل ہو گئے۔ اسی دوران میں قادر نے اور میں نے مسلسل فائرنگ کی اور پیچھے آنے والوں کو سر اٹھانے نہیں دیا۔ ہم چاہتے تو صغیر کی بیوی کو ڈھال کے طور پر استعمال کرنے کی کوشش کرسکتے تھے لیکن مجھے یہ گوارا نہیں ہوا۔ وہ مسلسل توبہ تلا کر رہی تھی اور رو رہی تھی۔ میں نے بائیں طرف والا دروازہ کھول کر اسے دھکا دیا اور کہا کہ وہ بھاگ جائے۔ وہ بھاگ کر درختوں میں روپوش ہو گئی۔

قادر خان انچارج گارڈ تھا اور یقیناً وہ اس عہدے کا حق دار بھی تھا۔ وہ بڑی دلیری سے میرا ساتھ دینے لگا۔ ہم اب پھنسی ہوئی گاڑی میں سے نکل آئے تھے اور اس کی اوٹ میں پناہ لے لی تھی۔ مرنے والے گارڈ کی لاش بدستور گاڑی کے اندر ہی تھی۔ گاہے بگاہے اسے کوئی فائر لگتا تھا اور وہ اچھل کر رہ جاتی تھی۔ اب قریباً نو بج چکے تھے۔ ہر طرف سنہری دھوپ پھیل گئی تھی۔ ٹیلوں پر چھایا ہوا سرد کہرا اب چھٹنا شروع ہو گیا تھا۔ یہ بالکل بے آباد جگہ تھی۔ پھر بھی مسلسل فائرنگ کے سبب اِکا دُکا لوگ متوجہ ہو چکے تھے۔ دور ایک ٹیلے پر تین چار افراد کھڑے یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ اس کے علاوہ قریباً نصف فرلانگ کے فاصلے پر ایک بیل گاڑی بھی اپنے راستے پر چلتے چلتے رک گئی تھی۔ اس پر موجود افراد اب بیل گاڑی کی اوٹ میں کھڑے پل کی طرف نگاہیں جمائے ہوئے تھے۔

میں نے اور قادر نے اگلے کم و بیش آدھ گھنٹے تک بڑی کامیابی سے تعاقب کرنے والوں کو روکے رکھا۔ اس دوران میں ہماری گاڑی کی باڈی چھلنی بن گئی اور تین ٹائر فلیٹ ہو گئے۔ تعاقب کرنے والوں میں سے بھی دو تین افراد کے زخمی ہونے کی نشاندہی ہوئی۔ ان کی کرولا گاڑی آگے تھی اور اس کا ایک ٹائر بھی زبردست دھماکے سے پھٹ چکا تھا۔

قادر خان نے میرے پہلو میں پوزیشن لے رکھی تھی۔ عام پٹھانوں کی طرح اس کا نشانہ بہت اچھا تھا اور کرولا گاڑی کا ٹائر اسی نے برسٹ کیا تھا وہ تیز سرگوشی میں بولا۔ ''شاہ زیب، مجھے لگ رہا ہے کہ کرولا آگے آرہی ہے۔''

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ وہ لوگ اب کرولا کو دھکیلتے ہوئے اور اس کی آڑ لیتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔

''کتنے راؤنڈ ہیں تمہارے پاس؟'' میں نے پوچھا۔

''راؤنڈ تو پچاس کے قریب ہیں مگر اللہ نے چاہا تو اگلے پندرہ بیس منٹ اور ہم ان کو روکے رکھیں گے...... اور تمہارے پاس کتنے ہیں؟''

میں نے اپنی بیلٹ والے راؤنڈ گننے کے بعد اسے بتایا کہ چالیس کے قریب میرے پاس ہیں۔

کرولا اب پل کے اوپر چڑھ آئی تھی۔ اسی دوران میں کرولا کے پیچھے شہ زور گاڑی کے پاس کچھ دھول نظر آئی۔ یہ ایک اور مہران گاڑی تھی۔ قادر بولا۔ ''لو جی، ان کے اور مددگار بھی آگئے۔''

''چار پانچ بندے تو اس میں بھی ہیں۔'' میں نے آنکھیں سکیڑ کر دیکھتے ہوئے کہا۔ جواب میں قادر خان نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن اس سے پہلے ہی ایک تبدیلی نظر آئی۔ مہران کار اب ریورس ہو رہی تھی۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے وہ برساتی نالے کے ساتھ ساتھ چلتی اور دھول اُڑاتی ہوئی مغرب کی جانب نکل گئی۔

فائرنگ میں کچھ دیر کے لیے وقفہ آگیا تھا۔ قادر خان نے کہا۔ ''یہ مہران کس طرف گئی ہے؟''

''شاید یہ لوگ آگے کسی پل کی تلاش میں نکلے ہیں۔''

''یہ تو پھر خطرناک ہوگا۔''

''مگر لگتا نہیں کہ پل کہیں آس پاس ہوگا۔ اگر ایسا ہوتا تو یہ لوگ ایک گھنٹے سے یہاں سر نہ مار رہے ہوتے۔''

اسی دوران میں ایک بار پھر تابڑ توڑ فائرنگ شروع ہو گئی۔ اس مرتبہ فائرنگ کی شدت نمایاں طور پر زیادہ تھی۔ یہ لوگ اب ایک اسنیپر گن بھی استعمال کر رہے تھے۔ ممکن تھا کہ یہ لونگ رینج کی رائفل ان کے لیے اسی مہران کار میں آئی ہو جو اب دھول اڑاتی مغرب کی طرف اوجھل ہو چکی تھی۔

گولیاں اب خطرناک زاویوں سے ہم تک پہنچ رہی تھیں۔ کسی بھی وقت پگھلا ہوا سیسا ہم دونوں میں سے کسی کا مزاج پوچھ سکتا تھا۔ کرولا کار رینگتی ہوئی مسلسل آگے بڑھ رہی تھی۔ اس کے عقب میں شوٹرز نے آڑ لے رکھی تھی۔ گاڑیوں کے پیچھے آڑ لینے والے لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ ان کے پاؤں اور پنڈلیوں کے نچلے حصے اکثر غیر محفوظ رہتے ہیں۔ دو سال پہلے لندن میں ٹیکساری گینگ کے تین بدمعاشوں کے ساتھ میرا زبردست شوٹ آؤٹ ہوا تھا اور یہ تجربہ مجھے اسی لڑائی میں حاصل ہوا تھا۔ میں رتیلی زمین پر

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

اوندھا لیٹ گیا۔ میری نگاہ اپنی تباہ حال جیپ کے نیچے سے گزر کر کرولا کے نیچے گئی۔ کرولا کے عقب میں مجھے چھ ٹانگیں نظر آئیں۔ پاؤں اور پنڈلیاں میرے نشان پر تھے۔

اب تک میں نے بہت کم برسٹ چلائے تھے لیکن اب یہ برسٹ چلانے کا موقع تھا۔ میں نے ایک بار پھر اپنی سیون ایم ایم رائفل کو برسٹ پر سیٹ کیا...... نشانہ لیا...... اور ٹریگر دبایا۔ تڑتڑاہٹ کی لرزہ خیز آواز سے آٹھ گولیوں کا ایک برسٹ فائر ہوا۔ میں نے کرولا کی آڑ لینے والوں کو زخمی ہو کر گرتے دیکھا۔ یہ ایک کامیاب حملہ تھا، مگر اس حملے کا جو دوسرا نتیجہ نکلا وہ میرے گمان میں نہیں تھا۔ بالکل غیر متوقع طور پر ایک زوردار دھماکا ہوا اور میں نے کرولا کار کو ہوا میں اچھلتے اور آگ کی لپیٹ میں آتے دیکھا۔

جیسا کہ بعد میں پتا چلا۔ میرے چلائے ہوئے برسٹ کی کوئی گولی فیول ٹینک یا فیول لائن میں لگی تھی اور اس نے کرولا کو اڑا دیا تھا۔ کرولا قریباً دو فٹ اچھلنے کے بعد اپنے پہلو کے بل گری۔ ہم نے ایک شخص کو شعلوں کی لپیٹ میں دیکھا۔ وہ کربناک آواز میں چلاتا ہوا بھاگا اور اس نے ایک دم نالے کے پانی میں چھلانگ لگا دی۔ کار پوری طرح آگ کی لپیٹ میں تھی۔ یوں لگتا تھا کہ کسی نے آگ کا گولا یہاں پر رکھ دیا ہے۔ گاڑھا سیاہ دھواں تیزی سے پھیل رہا تھا۔

یہاں سے نکلنے کے لیے یہ موقع بہترین تھا۔ ''آجاؤ قادر۔'' میں نے کہا۔

ہم دونوں جھک کر بھاگے اور جھاڑیوں کی طرف لپکتے چلے گئے۔ ہم پر کوئی فائر نہیں ہوا۔ جھاڑیوں اور درختوں کا یہ سلسلہ دور تک پھیلا ہوا تھا۔ ہمیں معلوم تھا کہ ہم جتنی جلدی دور نکل جائیں گے اتنا ہی ہمارے حق میں بہتر ہوگا۔ جلدی ہی ہمیں اندازہ ہوگیا کہ ابھی مصیبت پوری طرح ٹلی نہیں ہے۔ ہوا کے دوش پر تیر کر آنے والی چند آوازوں سے پتا چلا کہ وہ لوگ پیچھے آرہے ہیں۔

''کچھ اندازہ ہے کہ ہم کس طرف جارہے ہیں؟'' میں نے بھاگتے بھاگتے قادر خان سے پوچھا۔

''پاراہاؤس کو جانے والی پکی سڑک اسی طرف ہے، پر ٹھیک سے پتا نہیں کہ کتنی دور ہے۔''

ہمارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ بھاگتے رہیں...... اور سانس درست کرنے کے لیے کسی وقت چلنا شروع کردیں۔ تھوڑی دیر بعد مجھے کافی فاصلے سے موٹر سائیکل کی آواز سنائی دی۔ پھر پتا چلا کہ یہ ایک نہیں زیادہ موٹر سائیکلز ہیں۔ شاید چار پانچ۔ اس جھاڑیوں اور جھاڑ جھنکاڑ والی جگہ پر ہمیں تلاش کرنے کے لیے وہ موٹر سائیکلیں بھی لے آئے تھے۔ موٹر سائیکلوں کی آواز بتدریج قریب آرہی تھی۔ قادر خان پہلی بار کچھ گھبرایا ہوا نظر آیا۔ ہانپی آواز میں بولا۔ ''اب تو بچنا مشکل ہے۔ ہتھیار پھینکنے ہوں گے...... یا پھر لڑنا ہوگا۔''

اچانک مجھے خشک جھاڑ جھنکاڑ کے اندر ایک سیاہ سوراخ سا نظر آیا۔ یہ سوراخ بمشکل تین فٹ افقی رخ پر اور دو فٹ عمودی رخ پر تھا۔ خودرو خشک پودوں نے اسے ڈھانپ رکھا تھا۔ یہ دراصل ایک چھوٹا سا نیم ریتیلا ٹیلا تھا جس کے دامن میں یہ ایک خلا سا تھا۔ ہم اس میں چھپنے کی کامیاب کوشش کرسکتے تھے۔ اگر تعاقب کرنے والوں کی نگاہوں سے بچنے میں کامیاب نہ ہوتے تو پھر ہم اس جگہ کو ایک محفوظ مورچے کی شکل بھی دے سکتے تھے۔

سوچنے سمجھنے کا وقت بالکل نہیں تھا۔ موٹر سائیکلز کی آواز اب بالکل نزدیک پہنچ چکی تھی۔ سواروں کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ ہم گھٹنوں تک اونچی جنگلی گھاس کے اندر چلتے تاریک سوراخ تک پہنچے۔ پہلے میں اوندھا لیٹ کر اس سوراخ میں گھسا، پھر قادر خان بھی داخل ہوگیا۔ کانٹوں نے ہمارے جسم چھیل دیے تھے۔ اس خلا کے اندر کیا تھا؟ اس حوالے سے بھی شکوک تھے۔ یہ جگہ کسی خارپشت، نیولے یا جنگلی بلّے وغیرہ کا مسکن ہوسکتی تھی۔ اس کے علاوہ پتا چلا تھا کہ سؤر، سیاہ گوش اور مشک بلاؤ وغیرہ سے بھی ان علاقوں میں ملاقات ہوسکتی ہے۔

عام حالات میں شاید ہم اس خلا میں گھسنے سے پہلے کئی بار سوچتے، لیکن اس وقت چونکہ ''موت'' پیچھے تھی اس لیے خلا کے حوالے سے کوئی اندیشہ بھی سنگین محسوس نہیں ہورہا تھا۔ خلا اندر سے قدرے چوڑا تھا اور کچھ کشادہ بھی محسوس ہوتا تھا مگر گہری تاریکی میں کچھ بھی دکھائی نہیں دیا۔ صرف دہانے کے پاس ہی مدھم سی روشنی تھی۔

ہم اوندھے منہ لیٹنے کے بجائے اٹھ کر بیٹھ گئے اور باہر سے آنے والی آوازوں پر غور کرنے لگے۔ وہ لوگ یہاں چاروں طرف پھیل گئے تھے اور بھاگ دوڑ کررہے تھے۔ موٹر سائیکلز کی آوازیں بھی چاروں طرف چکرا رہی تھیں پھر ایک آواز سن کر ہم اچھل پڑے۔ یہ آواز دہانے کے بالکل پاس سے آئی تھی اور یہ اجنبی نہیں تھی۔ یہ صغیر کے ساتھی بشیرے کی آواز تھی۔ اس نے اپنے کسی ساتھی سے

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

کہا۔ ''وہ آگے نہیں جاسکتے۔ آگے ملٹری ایریا ہے۔ وہ یہیں کہیں چھپے ہوں گے...... یا پھر کھبے پاسے (بائیں طرف) نکلے ہوں گے۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے ہمیں ایک موٹی سی غائبانہ گالی دی۔

قادر خان پیچ وتاب کھا کر رہ گیا۔ یہاں اس بشیرے کے علاوہ کم وبیش دس افراد اور موجود تھے۔ سب کے سب مسلح اور بپھرے ہوئے۔ یقیناً کرولا کو آگ لگنے کے بعد ان کا پارا مزید چڑھ چکا تھا۔ ہم فون پر پارا ہاؤس سے رابطہ کرنے کی کوشش کر سکتے تھے لیکن دونوں کے فون اس نازک موقع پر ساتھ چھوڑ چکے تھے۔ قادر خان کا فون، پل پر ہونے والی لڑائی کے دوران میں اس کی جیب سے گر گیا تھا جبکہ میرے والے کی چارجنگ بالکل ختم ہو چکی تھی۔

وہ ہر جگہ ہمیں تلاش کرنے لگے اور ساتھ ساتھ للکارے بھی مارنے لگے۔ عین ممکن تھا کہ سرغنہ ثاقب بھی ان میں موجود ہو مگر اس کی آواز ہمیں سنائی نہیں دی۔ چاروں طرف چاپوں کی آواز تھی اور ہم دم سادھے بیٹھے تھے۔ بشیرا اور اس کا کوئی ساتھی قدم قدم آگے بڑھتے اس خلا کے بالکل نزدیک چلے آئے۔

''کوئی اِدھر ہی نہ گھس گیا ہو؟'' بشیرے نے کہا۔

''جان بچانے کے لیے تو وہ کہیں بھی گھس جائیں گے۔'' ساتھی نے بازاری لب ولہجے میں کہا۔

ہم تیار ہو گئے...... اور انگلیاں ٹریگرز پر رکھ لیں۔ پھر وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ کوئی شخص اوندھا لیٹ کر سوراخ میں گھسا، تاہم اس سے بھی پہلے اس کی رائفل اندر گھسی اور ساتھ میں ٹارچ بھی۔ دفعتاً اندر گھسنے والے کو پتا نہیں کیا ہوا وہ تڑپ کر پیچھے ہٹ گیا۔ ''کیا ہوا؟'' بشیرے کی گھبرائی آواز ابھری۔

''یہاں تو سانپ ہیں۔'' وہ شخص بولا۔

اب ہمارے ڈرنے کی باری تھی لیکن جہاں بیٹھے تھے وہاں سے ہل نہیں سکتے تھے۔ ہمیں تاریکی کی وجہ سے کچھ نظر نہیں آیا تھا لیکن بشیرے کے ساتھی نے ٹارچ کی روشنی میں کچھ نہ کچھ ضرور دیکھا تھا۔ بشیرے کے کہنے پر وہ شخص دوبارہ آگے بڑھا لیکن اس مرتبہ اس نے سوراخ میں سر گھسانے کی کوشش نہیں کی، بلکہ باہر سے ٹارچ کا روشن دائرہ خلا میں اِدھر اُدھر گھمایا، ہم اس پھیکی ہوئی سی روشنی سے کافی دور تھے اس لیے محفوظ رہے۔ تاہم فرش پر پڑنے والی روشنی میں مجھے کوئی سانپ یا سانپ جیسی چیز ضرور دکھائی دی۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی سانپ نے کسی شاخ کے گرد بل کھا رکھا ہے۔ شاخ اور سانپ دونوں زمین پر ہی پڑے تھے۔

روشنی اوجھل ہو گئی اور اس کے ساتھ ہی قدموں کی چاپیں بھی دور چلی گئیں۔ وہ لوگ کسی اور طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ ایک موٹر سائیکل سوار سوراخ کے بالکل سامنے سے دوڑتی اور دھواں چھوڑتی ہوئی نکل گئی۔ پھر دو تین فائر سنائی دیے۔ شاید درختوں اور جھاڑیوں کے کسی مشکوک جھنڈ میں اندھی فائرنگ کی گئی تھی۔ درختوں سے پرندے پھڑپھڑا کر اُڑ گئے اور ایک گونج سی دور تک گئی۔

موٹر سائیکلوں کا شور اور دیگر آوازیں ہم سے دور ہونے لگیں۔ یہ کسی حد تک اطمینان کا پہلو تھا لیکن اگر ہم یہ سمجھتے تھے کہ یہ جنگل مکمل طور پر کلیئر ہو جائے گا تو ایسا نہیں ہوا۔ کچھ لوگ بدستور آس پاس کے درختوں میں موجود تھے۔ ان کی باتوں کی آوازیں ہم تک صاف پہنچ رہی تھیں۔ اب ہماری آنکھیں آہستہ آہستہ اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہو گئی تھیں۔ میں نے دھیان سے دیکھا تو دہانے کے بالکل پاس موجود سانپ نظر آنے لگا۔ یقیناً وہ درمیانے سائز کا ایک کنگ کوبرا تھا۔ وہ جس شاخ سے لپٹا نظر آرہا تھا، وہ دراصل اس کی مادہ تھی۔ وہ دونوں ملاپ کی حالت میں تھے۔ یعنی وہی ازلی کھیل جو ہر ذی نفس کی افزائشِ نسل کا باعث بنتا ہے۔ یہ ایک مدھر ملن کی سی کیفیت تھی۔ وہ دونوں ان حالات وواقعات اور خطرات سے قطعی بے خبر تھے جو ان کے بالکل قریب موجود تھے۔ آتشیں ہتھیاروں میں پگھلا ہوا سیسہ بے قرار تھا اور عقابی نگاہیں اپنے ہدف کو ڈھونڈ رہی تھیں۔

یکایک میرے گھٹنے پر سرسراہٹ سی ہوئی۔ جیسے کوئی نرم جسم والا جانور مجھے چھو کر گزر گیا ہو۔ اسی دوران میں قادر خان کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی واقعہ ہوا۔ وہ ڈری ڈری آواز میں بولا۔ ''میرے پاس پنسل ٹارچ ہے، جلا کر دیکھوں؟''

میں نے کہا۔ ''لاؤ، مجھے دو۔''

اس نے پتلی سی ٹارچ میرے ہاتھ میں تھما دی۔ ہم کھوہ کی گہرائی میں تھے۔ کھوہ سے باہر دن کی تیز روشنی تھی۔ اگر ٹارچ احتیاط سے جلائی جاتی تو اسے باہر سے دیکھا نہیں جاسکتا تھا۔ میں نے ٹارچ کو اپنے اٹھے ہوئے گھٹنے کی بالکل اوٹ میں رکھ کر اس کا چھوٹا سا روشن دائرہ کھوہ کی گہرائی میں پھینکا، لفظی نہیں حقیقی معنوں میں میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ یقیناً یہی حال قادر خان کا بھی ہوا ہوگا۔ یہاں کم وبیش ڈیڑھ درجن چھوٹے بڑے سانپ موجود تھے۔ یا یوں کہا جائے کہ ڈیڑھ درجن ہمیں نظر آرہے تھے۔ جو مزید کونے

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

کھدروں یا چھوٹے سوراخوں میں ہوں گے، وہ ہمیں دکھائی نہیں دیتے تھے۔

پہلے شاید وہ ہم سے دور تھے لیکن اب ہمارے جسموں کی اجنبی حرارت محسوس کر کے ہمارے قریب پہنچ چکے تھے۔ ان میں سے ایک باقاعدہ میرے گھٹنے پر چڑھ آیا تھا اور دوسرا قادر کے پاؤں کے پاس رینگ رہا تھا۔ قادر بے تابی سے کونے میں سمٹا۔ میں نے تیز سرگوشی کی۔ ''قادر، حرکت نہ کرو۔ خطرہ بہت زیادہ ہو جائے گا۔''

وہ ایک دلیر شخص تھا لیکن اس قدرتی آفت نے اسے حواس باختہ کر دیا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا۔ ورنہ شاید وہ اندھا دھند فائر کرنے لگتا یا پھر اٹھ کر باہر بھاگ جاتا۔ آگے کنواں پیچھے کھائی والا محاورہ ہم پر بالکل صادق آرہا تھا۔ سانپ اجتماعی طور پر ہماری طرف بڑھ رہے تھے۔ میں بائیں جانب بیٹھا تھا اس لیے ان کا پہلا ہدف میں ہی تھا۔ میں جانتا تھا کہ اگر اس موذی جاندار کے سامنے بے حرکت رہا جائے اور خود کو بالکل پُرسکون رکھا جائے تو وہ نقصان پہنچانے سے باز رہتا ہے لیکن ایسی صورتِ حال میں پُرسکون رہنا کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔ اگلے دو تین منٹ بے حد اذیت ناک تھے۔ کئی سانپ رینگتے ہوئے میرے جسم پر آگئے تھے۔ میں ان کے رینگتے ہوئے گرم لمس کو محسوس کر رہا تھا۔ ان کی پھنکاریں میرے کانوں میں گونج رہی تھیں مگر میں پتھر کے بت کی طرح ساکت تھا۔ یہاں تک کہ سانس بھی اتنی آہستگی سے لے رہا تھا کہ سینے کا زیروبم واضح نہ ہو۔

ایک ''سنپولیا'' میری جیکٹ کی آستین میں گھس چکا تھا۔ ایک بڑا کوبرا میرے کندھے کے اوپر سے سرسراتا ہوا گزر رہا تھا۔ ایک گردن کو چھوتا ہوا نیچے جا رہا تھا، اس کا رخ قادر خان کی جانب تھا۔ باہر بشیرا اور اس کا کوئی ساتھی گفتگو کر رہے تھے، ان کی یہ گفتگو کسی دور افتادہ آواز کی طرح میری سماعت تک پہنچ رہی تھی۔ کوبرے کے جان لیوا زہر سے کون واقف نہیں اور میں جانتا تھا کہ کسی بھی وقت دو نکیلے دانتوں سے نکلنے والا زہرناک مواد میرے جسم میں سرایت کر سکتا ہے۔

جیسے کوئی بھولی کہانی یاد آتی ہے...... جیسے تاریک بادلوں میں بجلی کوندتی ہے...... تاجور کی من موہنی صورت میری آنکھوں کے سامنے چمک کر اوجھل ہوگئی۔

شاید ٹھیک ہی کہا جاتا ہے جو لوگ رگِ جاں میں بستے ہیں وہ بدترین اور بہترین موقعوں پر ضرور یاد آتے ہیں۔

اور پھر یہ جان لیوا...... بدترین موقع گزر گیا۔ میرے جسم پر سے سانپوں کی مکروہ سرسراہٹ معدوم ہوگئی۔ اب قادر خان کا امتحان تھا۔ وہ اس کی طرف بڑھ رہے تھے۔

میں نے سرگوشی کی۔ ''قادر خان، ڈرنا نہیں، یہ کچھ نہیں کہیں گے۔''

قادر خان مجسمے کی طرح ساکت بیٹھا رہا۔ سانپ اور سنپولیے اس پر رینگتے رہے۔ اس کے جسم کے نشیب و فراز کا جائزہ لیتے رہے...... پھر وہ آگے بڑھنے لگے۔ وہ اسے چھوڑ کر مخالف سمت میں جا رہے تھے۔ لیکن بالکل آخری مرحلے میں قادر خان نے دل چھوڑ دیا۔ جب ایک سانپ اس کی شلوار کے پائنچے میں داخل ہو کر ذرا اوپر کی طرف گیا۔ اس نے سانپ کا سر دبوچ لیا۔ سانپ نے وہی کیا جو اس کی جبلّت کا خاصہ تھا۔ اس نے پلک جھپکتے میں اپنے نکیلے دانت قادر خان کی پنڈلی میں گاڑھ کر زہر اس کے جسم میں انجیکٹ کر دیا۔ قادر خان کے ہونٹوں سے بے ساختہ دردناک کراہ نکلی۔ مجھے کوبرا کے جسم کا پچھلا حصہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے جسم پر چھوٹے چھوٹے گول نشان تھے، اس کی دم کا ارتعاش لرزہ خیز آواز پیدا کر رہا تھا۔ میں نے اسے کھینچ کر قادر خان کے جسم سے جدا کیا اور دور تاریکی میں پھینک دیا۔

قادر خان نے گھٹنے کے پاس سے اپنی پنڈلی کو تھام رکھا تھا اور بری طرح اینٹھ رہا تھا۔ اسے ایک جسیم سانپ نے کاٹا تھا اور یقیناً زہر کی ایک بڑی مقدار اس کے جسم میں داخل ہو چکی تھی۔ اس نے اپنے ہونٹ مضبوطی سے بھینچ لیے تھے۔ اور پوری کوشش کر رہا تھا کہ کراہ کی آواز بلند نہ ہونے پائے۔ قادر کی قمیص کے نیچے شکاری چاقو موجود تھا۔ میں نے چاقو نکال کر اس کی شلوار کا پائنچہ اوپر تک کاٹ دیا۔ اسی کپڑے کی ایک لمبی پٹی علیحدہ کر کے میں نے زخم پر اوپر کی طرف کس کے باندھ دی۔ زخم کے اردگرد کی جگہ حیرت انگیز تیزی سے سوجتی چلی جا رہی تھی۔ قادر خان کو فوری طبی امداد کی ضرورت تھی۔ اور میرا اندازہ تھا کہ پارا ہاؤس کے نجی اسپتال میں سانپ کے کاٹے کے انجکشن وغیرہ موجود ہوں گے لیکن یہ سب تو تب سوچا جا سکتا تھا جب ہم اس خلا سے نکل سکتے۔ ہم سے صرف آٹھ دس میٹر کی دوری پر قاتل دشمن موجود تھا۔ وہ مسلح تھا اور بے حد مشتعل بھی میں پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔

میں نے رائفل کا سیفٹی کیچ ہٹایا اور سرگوشی میں قادر سے کہا۔ ''میں باہر جا کر دیکھتا ہوں۔''

سخت تکلیف میں ہونے کے باوجود قادر نے مجھے

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

کہا۔ ''وہ آگے نہیں جاسکتے۔ آگے ملٹری ایریا ہے۔ وہ یہیں کہیں چھپے ہوں گے...... یا پھر کھبے پاسے (بائیں طرف) نکلے ہوں گے۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے ہمیں ایک موٹی سی غائبانہ گالی دی۔

قادر خان پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ یہاں اس بشیرے کے علاوہ کم و بیش دس افراد اور موجود تھے۔ سب کے سب مسلح اور بپھرے ہوئے۔ یقیناً کرولا کو آگ لگنے کے بعد ان کا پارا مزید چڑھ چکا تھا۔ ہم فون پر پارا ہاؤس سے رابطہ کرنے کی کوشش کر سکتے تھے لیکن دونوں کے فون اس نازک موقع پر ساتھ چھوڑ چکے تھے۔ قادر خان کا فون، پل پر ہونے والی لڑائی کے دوران میں اس کی جیب سے گر گیا تھا جبکہ میرے والے کی چارجنگ بالکل ختم ہو چکی تھی۔

وہ ہر جگہ ہمیں تلاش کرنے لگے اور ساتھ ساتھ للکارے بھی مارنے لگے۔ عین ممکن تھا کہ سرغنہ ثاقب بھی ان میں موجود ہو مگر اس کی آواز ہمیں سنائی نہیں دی۔ چاروں طرف چاپوں کی آواز تھی اور ہم دم سادھے بیٹھے تھے۔ بشیرا اور اس کا کوئی ساتھی قدم قدم آگے بڑھتے اس خلا کے بالکل نزدیک چلے آئے۔

''کوئی ادھر ہی نہ گھس گیا ہو؟'' بشیرے نے کہا۔

''جان بچانے کے لیے تو وہ کہیں بھی گھس جائیں گے۔'' ساتھی نے بازاری لب و لہجے میں کہا۔

ہم تیار ہو گئے...... اور انگلیاں ٹریگرز پر رکھ لیں۔ پھر وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ کوئی شخص اوندھا لیٹ کر سوراخ میں گھسا، تاہم اس سے بھی پہلے اس کی رائفل اندر گھسی اور ساتھ میں ٹارچ بھی۔ دفعتاً اندر گھسنے والے کو پتا نہیں کیا ہوا وہ تڑپ کر پیچھے ہٹ گیا۔ ''کیا ہوا؟'' بشیرے کی گھبرائی آواز ابھری۔

''یہاں تو سانپ ہیں۔'' وہ شخص بولا۔

اب ہمارے ڈرنے کی باری تھی لیکن جہاں بیٹھے تھے وہاں سے ہل نہیں سکتے تھے۔ ہمیں تاریکی کی وجہ سے کچھ نظر نہیں آیا تھا لیکن بشیرے کے ساتھی نے ٹارچ کی روشنی میں کچھ نہ کچھ ضرور دیکھا تھا۔ بشیرے کے کہنے پر وہ شخص دوبارہ آگے بڑھا لیکن اس مرتبہ اس نے سوراخ میں سر گھسانے کی کوشش نہیں کی، بلکہ باہر سے ٹارچ کا روشن دائرہ خلا میں اِدھر اُدھر گھمایا، ہم اس بھٹکتی ہوئی سی روشنی سے کافی دور تھے اس لیے محفوظ رہے۔ تاہم فرش پر پڑنے والی روشنی میں مجھے کوئی سانپ یا سانپ جیسی چیز ضرور دکھائی دی۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی سانپ نے کسی شاخ کے گرد بل کھا رکھا ہے۔ شاخ اور سانپ دونوں زمین پر ہی پڑے تھے۔

روشنی اوجھل ہو گئی اور اس کے ساتھ ہی قدموں کی چاپیں بھی دور چلی گئیں۔ وہ لوگ کسی اور طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ ایک موٹر سائیکل سوار سوراخ کے بالکل سامنے سے دوڑتی اور دھواں چھوڑتی ہوئی نکل گئی۔ پھر دو تین فائر سنائی دیے۔ شاید درختوں اور جھاڑیوں کے کسی مشکوک جھنڈ میں اندھی فائرنگ کی گئی تھی۔ درختوں سے پرندے پھڑپھڑا کر اُڑ گئے اور ایک گونج سی دور تک گئی۔

موٹر سائیکلوں کا شور اور دیگر آوازیں ہم سے دور ہونے لگیں۔ یہ کسی حد تک اطمینان کا پہلو تھا لیکن اگر ہم یہ سمجھتے تھے کہ یہ جنگل مکمل طور پر کلیئر ہو جائے گا تو ایسا نہیں ہوا۔ کچھ لوگ بدستور آس پاس کے درختوں میں موجود تھے۔ ان کی باتوں کی آوازیں ہم تک صاف پہنچ رہی تھیں۔ اب ہماری آنکھیں آہستہ آہستہ اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہو گئی تھیں۔ میں نے دھیان سے دیکھا تو دہانے کے بالکل پاس موجود سانپ نظر آنے لگا۔ یقیناً وہ درمیانے سائز کا ایک کنگ کوبرا تھا۔ وہ جس شاخ سے لپٹا نظر آ رہا تھا، وہ دراصل اس کی مادہ تھی۔ وہ دونوں ملاپ کی حالت میں تھے۔ یعنی وہی ازلی کھیل جو ہر ذی نفس کی افزائشِ نسل کا باعث بنتا ہے۔ یہ ایک مدھر ملن کی سی کیفیت تھی۔ وہ دونوں ان حالات و واقعات اور خطرات سے قطعی بے خبر تھے جو اُن کے بالکل قریب موجود تھے۔ آتشیں ہتھیاروں میں پگھلا ہوا سیسہ بے قرار تھا اور عقابی نگاہیں اپنے ہدف کو ڈھونڈ رہی تھیں۔

یکایک میرے گھٹنے پر سرسراہٹ سی ہوئی۔ جیسے کوئی نرم جسم والا جانور مجھے چھو کر گزر گیا ہو۔ اسی دوران میں قادر خان کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی واقعہ ہوا۔ وہ ڈری ڈری آواز میں بولا۔ ''میرے پاس پنسل ٹارچ ہے، جلا کر دیکھوں؟''

میں نے کہا۔ ''لاؤ، مجھے دو۔''

اس نے پتلی سی ٹارچ میرے ہاتھ میں تھما دی۔ ہم کھوہ کی گہرائی میں تھے۔ کھوہ سے باہر دن کی تیز روشنی تھی۔ اگر ٹارچ احتیاط سے جلائی جاتی تو اسے باہر سے دیکھا نہیں جا سکتا تھا۔ میں نے ٹارچ کو اپنے اٹھے ہوئے گھٹنے کی بالکل اوٹ میں رکھ کر اس کا چھوٹا سا روشن دائرہ کھوہ کی گہرائی میں پھینکا، لفظی نہیں حقیقی معنوں میں میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ یقیناً یہی حال قادر خان کا بھی ہوا ہوگا۔ یہاں کم و بیش ڈیڑھ درجن چھوٹے بڑے سانپ موجود تھے۔ یا یوں کہا جائے کہ ڈیڑھ درجن ہمیں نظر آ رہے تھے۔ جو مزید کونے

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

کھدروں یا چھوٹے سوراخوں میں ہوں گے، وہ ہمیں دکھائی نہیں دیتے تھے۔

پہلے شاید وہ ہم سے دور تھے لیکن اب ہمارے جسموں کی اجنبی حرارت محسوس کر کے ہمارے قریب پہنچ چکے تھے۔ ان میں سے ایک باقاعدہ میرے گھٹنے پر چڑھ آیا تھا اور دوسرا قادر کے پاؤں کے پاس رینگ رہا تھا۔ قادر بے تابی سے کونے میں سمٹا۔ میں نے تیز سرگوشی کی۔ ''قادر، حرکت نہ کرو۔ خطرہ بہت زیادہ ہو جائے گا۔''

وہ ایک دلیر شخص تھا لیکن اس قدرتی آفت نے اسے حواس باختہ کر دیا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا۔ ورنہ شاید وہ اندھا دھند فائر کرنے لگتا یا پھر اٹھ کر باہر بھاگ جاتا۔ آگے کنواں پیچھے کھائی والا محاورہ ہم پر بالکل صادق آرہا تھا۔ سانپ اجتماعی طور پر ہماری طرف بڑھ رہے تھے۔ میں بائیں جانب بیٹھا تھا اس لیے ان کا پہلا ہدف میں ہی تھا۔ میں جانتا تھا کہ اگر اس موذی جاندار کے سامنے بے حرکت رہا جائے اور خود کو بالکل پُرسکون رکھا جائے تو وہ نقصان پہنچانے سے باز رہتا ہے لیکن ایسی صورتِ حال میں پُرسکون رہنا کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔ اگلے دو تین منٹ بے حد اذیت ناک تھے۔ کئی سانپ رینگتے ہوئے میرے جسم پر آگئے تھے۔ میں ان کے رینگتے ہوئے گرم لمس کو محسوس کر رہا تھا۔ ان کی پھنکاریں میرے کانوں میں گونج رہی تھیں مگر میں پتھر کے بت کی طرح ساکت تھا۔ یہاں تک کہ سانس بھی اتنی آہستگی سے لے رہا تھا کہ سینے کا زیروبم واضح نہ ہو۔

ایک ''سنپولیا'' میری جیکٹ کی آستین میں گھس چکا تھا۔ ایک بڑا کوبرا میرے کندھے کے اوپر سے سرسراتا ہوا گزر رہا تھا۔ ایک گردن کو چھوتا ہوا نیچے جا رہا تھا، اس کا رخ قادر خان کی جانب تھا۔ باہر بشیرا اور اس کا کوئی ساتھی گفتگو کر رہے تھے، ان کی یہ گفتگو کسی دور افتادہ آواز کی طرح میری سماعت تک پہنچ رہی تھی۔ کوبرے کے جان لیوا زہر سے کون واقف نہیں اور میں جانتا تھا کہ کسی بھی وقت دو نکیلے دانتوں سے نکلنے والا زہرناک مواد میرے جسم میں سرائیت کر سکتا ہے۔

جیسے کوئی بھولی کہانی یاد آتی ہے...... جیسے تاریک بادلوں میں بجلی کوندتی ہے...... تاجور کی من موہنی صورت میری آنکھوں کے سامنے چمک کر اوجھل ہو گئی۔

شاید ٹھیک ہی کہا جاتا ہے جو لوگ رگِ جاں میں بستے ہیں وہ بدترین اور بہترین موقعوں پر ضرور یاد آتے ہیں۔

اور پھر یہ جان لیوا...... بدترین موقع گزر گیا۔ میرے جسم پر سے سانپوں کی مکروہ سرسراہٹ معدوم ہو گئی۔ اب قادر خان کا امتحان تھا۔ وہ اس کی طرف بڑھ رہے تھے۔

میں نے سرگوشی کی۔ ''قادر خان، ڈرنا نہیں، یہ کچھ نہیں کہیں گے۔''

قادر خان مجسمے کی طرح ساکت بیٹھا رہا۔ سانپ اور سنپولیے اس پر رینگتے رہے۔ اس کے جسم کے نشیب و فراز کا جائزہ لیتے رہے...... پھر وہ آگے بڑھنے لگے۔ وہ اسے چھوڑ کر مخالف سمت میں جا رہے تھے۔ لیکن بالکل آخری مرحلے میں قادر خان نے دل چھوڑ دیا۔ جب ایک سانپ اس کی شلوار کے پائنچے میں داخل ہو کر ذرا اوپر کی طرف گیا۔ اس نے سانپ کا سر دبوچ لیا۔ سانپ نے وہی کیا جو اس کی جبلّت کا خاصہ تھا۔ اس نے پلک جھپکتے میں اپنے نکیلے دانت قادر خان کی پنڈلی میں گاڑھ کر زہر اس کے جسم میں انجیکٹ کر دیا۔ قادر خان کے ہونٹوں سے بے ساختہ دردناک کراہ نکلی۔ مجھے کوبرا کے جسم کا پچھلا حصہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے جسم پر چھوٹے چھوٹے گول نشان تھے، اس کی دم کا ارتعاش لرزہ خیز آواز پیدا کر رہا تھا۔ میں نے اسے کھینچ کر قادر خان کے جسم سے جدا کیا اور دور تاریکی میں پھینک دیا۔

قادر خان نے گھٹنے کے پاس سے اپنی پنڈلی کو تھام رکھا تھا اور بری طرح اینٹھ رہا تھا۔ اسے ایک جسیم سانپ نے کاٹا تھا اور یقیناً زہر کی ایک بڑی مقدار اس کے جسم میں داخل ہو چکی تھی۔ اس نے اپنے ہونٹ مضبوطی سے بھینچ لیے تھے۔ اور پوری کوشش کر رہا تھا کہ کراہ کی آواز بلند نہ ہونے پائے۔ قادر کی قمیص کے نیچے شکاری چاقو موجود تھا۔ میں نے چاقو نکال کر اس کی شلوار کا پائنچہ اوپر تک کاٹ دیا۔ اسی کپڑے کی ایک لمبی پٹی علیحدہ کر کے میں نے زخم پر اوپر کی طرف کس کے باندھ دی۔ زخم کے اردگرد کی جگہ حیرت انگیز تیزی سے سوجتی چلی جا رہی تھی۔ قادر خان کو فوری طبی امداد کی ضرورت تھی۔ اور میرا اندازہ تھا کہ پارا ہاؤس کے نجی اسپتال میں سانپ کے کاٹے کے انجکشن وغیرہ موجود ہوں گے لیکن یہ سب تو تب سوچا جا سکتا تھا جب ہم اس خلا سے نکل سکتے۔ ہم سے صرف آٹھ دس میٹر کی دوری پر قاتل دشمن موجود تھا۔ وہ مسلح تھا اور بے حد مشتعل بھی۔ میں پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔

میں نے رائفل کا سیفٹی کیچ ہٹایا اور سرگوشی میں قادر سے کہا۔ ''میں باہر جا کر دیکھتا ہوں۔''

سخت تکلیف میں ہونے کے باوجود قادر نے مجھے

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

ہاتھ سے روک لیا۔ ''نہیں شاہ زیب۔ ذرا انتظار کرلو۔''

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ فی الحال ہمارا انتظار کرنا ہی بنتا تھا۔ کم ازکم اس وقت تک جب تک دہانے کے قریب موجود افراد یہاں سے ٹل نہ جاتے مگر اب انتظار کرنا مشکل تھا۔ قادر خان کو تیزی سے زہر چڑھ رہا تھا۔ اگر اس کی جان بچانا تھی تو پھر نکلنا ضروری تھا۔ ویسے بھی سانپوں سے بھری ہوئی اس کھوہ میں زیادہ دیر ٹھہرنا بدترین مصیبت کو دعوت دینا تھا۔

میں نے اندازہ لگایا کہ قادر خان کا گلا بالکل خشک ہوگیا ہے۔ اسے پانی کی شدید ضرورت تھی مگر پانی یہاں کہیں نہیں تھا۔ پتا نہیں کیوں مجھے بشیرے اور اس کے ساتھی پر شدید طیش آنے لگا جو دہانے سے ہٹنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ میں نے اپنے طور پر فیصلہ کیا اور قادر خان کے منع کرنے کے باوجود دہانے کی طرف رینگ گیا۔ ناگ ناگن بدستور ایک دوسرے سے لپٹے اپنے حال میں مست تھے۔ لگتا تھا کہ کوئی ان کے اوپر پاؤں رکھ کر بھی گزر جائے تو وہ شاید اسے اپنی مستی بھری مصروفیت کے سبب معاف کردیں گے۔ میں ان کے پاس سے پیٹ کے بل رینگتا ہوا سوراخ تک پہنچ گیا۔ میں نے باہر جھانکا تو مجھے ایک ہیولا نظر آیا اور کھنکھارنے کی آواز سنائی دی۔ یقیناً یہ بشیرا ہی تھا۔ اس کے چہرے کا صرف ایک رخ دکھائی دے رہا تھا۔ بھاری سیاہ مونچھیں اور ٹھوڑی پر کسی پرانے زخم کا گہرا نشان تھا۔ وہ آٹھ ایم ایم کی رائفل سونتے کھڑا تھا۔ اس کا رخ دوسری طرف تھا۔ اس کا کوئی ساتھی دکھائی تو نہیں دیا لیکن یقینی بات تھی کہ وہ یہاں اکیلا نہیں ہے۔

میں زیادہ سوچ بچار کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ جو ہوگا، دیکھا جائے گا کے مصداق میں نے باہر کی طرف کرالنگ کی جس وقت میں سوراخ میں سے گزر رہا تھا، شکاری چاقو میرے دانتوں میں دبا ہوا تھا۔ یہ بڑے نازک لمحے تھے۔ اگر آہٹ پیدا ہوتی اور بشیرا میری طرف مڑ کر دیکھ لیتا تو میرے پاس فائر کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ فائر کی آواز اس پورے گینگ کو اس ٹیلے کی طرف متوجہ کرسکتی تھی۔

میں فائر کرنا نہیں چاہتا تھا اور میری یہ مراد پوری ہوئی۔ میں رینگ کر سوراخ میں سے نکل آیا۔ یہی وقت تھا جب بشیرے کو خطرے کا احساس ہوا لیکن تب تک بہت دیر ہوچکی تھی۔ میں رائفل نیچے رکھ چکا تھا اور چاقو دانتوں سے نکال کر ہاتھ میں لے چکا تھا۔ میں بلندی پر تھا۔ بشیرا نیچے کھڑا تھا۔ میں نے اس پر پوری جست لگائی۔ میرے ہاتھ میں پکڑا ہوا دندانے دار چاقو دستے تک اس کے سینے میں گھس گیا۔ وہ اور میں اوپر نیچے گرے۔ میرے ہاتھ کی پشت پر گرم لہو کی پچکاری چلی۔ یہ بشیرے کا ہی خون تھا۔

بشیرے کی رائفل بھی اس کے ساتھ ہی ڈھلوان پر لڑھکی۔ میں نے اس کے سینے پر گھٹنا رکھ کر دھنسا ہوا چاقو باہر کھینچا۔ دس پندرہ فٹ کے فاصلے پر بشیرے کا وہی ساتھی موجود تھا جس سے اس کی گفتگو چل رہی تھی۔ وہ چند سیکنڈ کے لیے سکتہ زدہ رہ گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا اور کوئی پکار بلند کرتا، میں نے دوسری بار جست لگائی اور اس پر جا پڑا۔ یہ ایک بیس بائیس سالہ نوجوان تھا۔ اس کی بدقسمتی یہ تھی کہ جب میں نے اس پر چھلانگ لگائی وہ ڈھلوان پر کھڑا شلوار کا ازار بند باندھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کچھ نہیں تھا۔ آٹھ ایم ایم رائفل زمین پر پڑی تھی۔ میں نے سب سے پہلے اس کا منہ ہی ڈھانپا۔ وہ ایک پلٹی کھا کر اوندھے منہ میرے نیچے گرا۔ میں نے پشت کی جانب سے اس کے دل کو نشانہ بنانے کے لیے اپنا چاقو والا ہاتھ اوپر اٹھایا، بھرپور وار کرنے کے لیے چاقو کے دستے پر میری گرفت مضبوط تھی۔ انگوٹھا دستے کے آخری سرے پر تھا۔ یہاں پر بالکل وہی سین ہوا جو کبھی کبھی کرکٹ کے کھیل میں نظر آتا ہے۔ بالر گیند پھینکنے کے لیے اپنا ہاتھ اوپر اٹھاتا ہے لیکن عین موقع پر گیند کا رخ یا اس کی لمبائی تبدیل کردیتا ہے۔ بالکل آخری لمحات میں مجھے اپنے حریف کی صورت اور کم عمری پر ترس آیا۔ میں نے اس کے دل کے بجائے نیچے والی پسلیوں کو نشانہ بنایا۔ اس کی شدید مزاحمت یک لخت دم توڑ گئی۔ میں نے اسی کی رائفل کے دستے سے اس کے سر کے عقبی حصے پر فیصلہ کن ضرب لگائی۔ وہ ہوش و حواس سے بیگانہ ہوگیا۔

یہ ساری کارروائی بمشکل دس بارہ سیکنڈ میں مکمل ہوگئی تھی۔ بشیرے کا جسم دو تین بار اینٹھ کر ساکت ہوچکا تھا۔ اس کے سینے سے ابلنے والا خون ڈھلوان پر رینگ رہا تھا۔ آنکھیں ساکت تھیں۔ اس کی آنکھوں میں وہی سرخ ڈورے تھے جو انسان کی عیش پرستی اور بوالہوسی کو ظاہر کرتے ہیں۔ اب وہ اپنی تمام آسودہ و ناآسودہ خواہشات سمیت عدم آباد کے سفر پر روانہ ہوچکا تھا۔

میں نے قرب و جوار میں نگاہ دوڑائی۔ ارد گرد کوئی دکھائی نہیں دیا۔ ہاں کچھ فاصلے سے موٹر سائیکل کی پھڑ پھڑاہٹ ضرور سنائی دے رہی تھی۔

''قادر خان آجاؤ۔'' میں نے آواز دی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

وہ سوراخ میں سے رینگ کر باہر نکل آیا۔ اس کا چہرہ پسینے میں نہایا ہوا تھا اور جلد کی رنگت گہری ہوتی جارہی تھی۔ وہ شدید کرب میں تھا۔ ''پانی ملے گا؟'' اس نے بمشکل کہا اور ڈھلوان پر لیٹ گیا۔

میں نے دوبارہ اردگرد نگاہ دوڑائی۔ واپس قادر خان کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھیں بند ہو چکی تھیں۔ وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ میں نے اسے کندھے پر اٹھایا اور جھاڑیوں کی آڑ لیتا ہوا ڈھلوان سے اترنے لگا۔ قادر کی رائفل میں نے اپنے کندھے پر لٹکالی تھی۔

موٹر سائیکلز کی دور افتادہ آواز بتا رہی تھی کہ وہ لوگ کافی فاصلے پر دائیں طرف ہیں۔ میں نے بایاں رخ اختیار کیا۔ کیونکہ سیدھا جاتا تو آگے ملٹری ایریا تھا۔ چوڑے چکلے قادر خان کو کندھے پر اٹھا کر چلنا آسان نہیں تھا مگر میں جیسے تیسے حتی الامکان رفتار کے ساتھ آگے بڑھتا رہا۔ سردی کے باوجود جسم پسینے سے شرابور تھا۔ میرے اردگرد جھاڑیوں اور ٹیلوں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ اب دن کے گیارہ بج چکے تھے۔ کہر ختم ہو چکا تھا اور دھوپ میں چمک تھی۔ میں نے ایک جھنڈ میں رک کر ذرا دم لیا۔ قادر خان کو پشت کے بل ریتیلی زمین پر لٹا دیا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور رنگ سیاہی مائل ہونا شروع ہو گیا تھا۔ پنڈلی کا رنگ تو تقریباً سیاہ ہو چکا تھا۔ اس کی زندگی خطرے میں تھی۔

قریب ہی ایک چھوٹے سے شفاف گڑھے میں کسی پرانی بارش کا تھوڑا سا پانی موجود تھا۔ میں نے اپنے ہونٹ تر کیے اور کچھ پانی قادر کے بند ہونٹوں پر بھی ٹپکایا۔ تقریباً دس منٹ بعد میں نے ایک بار پھر اسے کندھے پر لادا اور آگے بڑھنا شروع کر دیا۔ اپنے اندازے کے مطابق میرا رخ پختہ سڑک کی طرف ہی تھا۔ (بعدازاں پتا چلا کہ یہ اندازہ غلط تھا) اردگرد سے کوئی مخدوش آواز بلند نہیں ہو رہی تھی۔ پھر بھی میں جانتا تھا کہ میں خطرے سے باہر نہیں ہوں۔

میں نے بائیں ہاتھ سے قادر خان کے بے ہوش جسم کو کندھے پر سہارا دے رکھا تھا اور دائیں ہاتھ میں رائفل اس طرح تھام رکھی تھی کہ وقت پڑنے پر اسے فوراً استعمال کر سکوں...... اور پھر تھوڑی ہی دیر بعد مجھ پر انکشاف ہوا کہ ''وقت پڑ گیا ہے'' مجھے انجن کی مدھم آواز سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی کسی شخص کی صدا ہوا کے دوش پر تیر کر کانوں سے ٹکرائی۔ بڑی کرخت اور مشتعل آواز تھی۔ میں چند خاردار جھاڑیوں کے عقب میں رک گیا اور پھر ایک گھٹنا ٹیک کر بیٹھ گیا۔ تاہم میں نے قادر خان کو کندھے سے اتارا نہیں تھا۔

اس کی سانسوں کی نہایت بوجھل آواز میرے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ اس کا سانس اب اکھڑنا شروع ہو گیا تھا۔

یکایک مجھے عقب سے بھی کسی موٹر بائیک کا مدھم شور سنائی دیا۔ سامنے والی گاڑی اب بالکل نزدیک آ گئی تھی۔ وہ جس طرح سیدھی میری طرف بڑھ رہی تھی۔ مجھے شک ہوا کہ انہوں نے میری جھلک دیکھ لی ہے۔ ایک بلند آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ ''وہ دیکھو...... ان جھاڑیوں کے پیچھے کوئی ہے۔''

اب صورت حال واضح ہو گئی تھی۔ میرے سینے میں انگارے سے دہکنے لگے۔ یہ وہی انگارے تھے جو ڈنمارک میں ''ٹیکساری گینگ'' سے مڈبھیڑ کے موقع پر میرے سینے میں دہکا کرتے تھے۔ میں زندگی موت سے بے نیاز ہو جاتا تھا اور جان ہتھیلی پر رکھ کر ان لوگوں سے ٹکرا جاتا تھا جنہوں نے مجھے ''ہمیشہ خون اگلنے والے'' زخم لگائے تھے۔

آج پھر... ویسی ہی کیفیت مجھ پر طاری ہوئی۔ میں نے ہچکیاں لیتے ہوئے قادر خان کو بہ آہستگی زمین پر لٹا دیا اور رائفل سے نیا میگزین اٹیچ کر کے بالکل تیار ہو گیا۔ یہ ایک چھوٹی جیپ تھی۔ اس کھلی جیپ میں کم وبیش پانچ افراد سوار تھے۔ ان کے ہاتھوں میں آتشیں اسلحہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔

اچانک رائفل کے دستے پر میری گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور میں ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔ میں پہچان گیا، یہ دشمن نہیں، دوست تھے۔ یہ پاراہاؤس کے لوگ تھے۔ میں نے گنجے آغا جان کو صاف دیکھ لیا۔ اس کے پیچھے انیق بھی کھڑا نظر آ رہا تھا۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اب جیپ والوں نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا۔ آغا جان کے چہرے پر دبا دبا جوش نظر آیا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے ساتھیوں کو رائفلیں نیچی کرنے کا حکم دیا۔ پھر وہ لوگ چھلانگیں لگا کر نیچے اترے۔ موٹر سائیکل بھی ایک چکر کاٹ کر جیپ کے نزدیک پہنچ گئی تھی۔ موٹر سائیکل سوار کا تعلق بھی پاراہاؤس ہی سے تھا۔

انیق دوڑتا ہوا میرے پاس پہنچا۔ ''آپ ٹھیک تو ہیں شاہ زیب بھائی؟'' اس نے جیسے سرتاپا مجھے نگاہوں سے ٹٹولا۔

''ہاں، میں ٹھیک ہوں لیکن قادر خان ٹھیک نہیں۔''

آغا جان اور انیق وغیرہ قادر خان پر جھک گئے۔ اس کی پنڈلی سے مسلسل گاڑھا سیاہی مائل خون رس رہا تھا۔

''اسے کوبرا نے کاٹا ہے۔ اسے فوراً اسپتال پہنچانا ہوگا۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

میں تے اطلاع دی۔

ان لوگوں نے پلک جھپکتے میں قادر خان کو اٹھا کر کھلی چھت والی جیپ میں ڈالا۔ میں بھی سوار ہو گیا۔ ایک جیپ سوار موٹر سائیکل والے کے پیچھے بیٹھ گیا۔ ہم تیزی سے پختہ سڑک کی طرف روانہ ہوئے۔ میں نے آقا جان سے پوچھا۔ ''سجاول اور ابراہیم پہنچ گئے؟''

''ہاں، ان سے ہی ہمیں پتا چلا کہ تم اور قادر پیچھے رہ گئے ہو۔ ہم جیپ لے کر نکل کھڑے ہوئے۔'' آقا جان نے کہا۔

''سجاول اب کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ بھی تمہیں ڈھونڈنے کے لیے نکلا ہوا ہے۔ وہ چار افراد دوسری گاڑی پر ہیں۔ ان کے ساتھ بھی ایک موٹر سائیکل ہے۔''

اسی دوران میں دوسری موٹر سائیکل کی آواز بھی آنے لگی۔ یہ آواز دائیں جانب قریباً ایک ڈیڑھ فرلانگ کی دوری سے آرہی تھی۔ آقا جان نے فوراً سیل فون پر رابطہ کیا۔ کچھ ہی دیر بعد ہم اس دوسری جیپ کے پاس پہنچ گئے جس پر سجاول وغیرہ موجود تھے۔

سجاول مجھے دیکھ کر گاڑی سے اتر آیا اور گلے لگا لیا۔ بے ہوش قادر خان کو دیکھ کر اسے بھی سخت تشویش ہوئی۔ میں نے مختصر لفظوں میں سجاول کو بتایا کہ قادر خان کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ ہم مزید وقت ضائع کیے بغیر فوراً آگے روانہ ہو گئے۔ پختہ سڑک پر پہنچنے تک ہمیں 'ناقب اینڈ کمپنی' سے مڈبھیڑ کا خدشہ رہا لیکن سڑک پر پہنچنے کے بعد یہ خدشہ نہ ہونے کے برابر رہ گیا۔ ہم تیزی سے پارا ہاؤس کی طرف بڑھنے لگے۔

☆☆☆

قادر خان کو تو اسپتال میں داخل ہونا ہی تھا، پارا ہاؤس کے ڈاکٹروں نے مجھے بھی وہیں پر روک لیا۔ میرے جسم پر کندھے اور پیٹ کے بالائی حصے پر شدید جلن ہو رہی تھی۔ جب میرے کپڑے اتروا کر دیکھا گیا تو وہاں گہرے سرخ نشان دکھائی دیے جو نمایاں طور پر ابھرے ہوئے تھے۔ درحقیقت کھوہ کی تاریکی میں میرے جسم پر آزادانہ سانپ رینگتے رہے تھے اور یہ بھی ممکن تھا کہ ان میں کچھ اور حشرات الارض بھی ہوں۔ بہرحال جسم پر نشان ڈاکٹروں کے لیے تشویش کا باعث تھے۔ وہ دیکھنا چاہ رہے تھے کہ ان نشانات کے اثرات زیادہ گہرے تو نہیں ہو رہے۔ مجھے انجکشن لگایا گیا اور سرخ نشانات کو کسی مرہم کے ساتھ ٹریٹ بھی کیا گیا۔ ہلکا سا ٹمپریچر بھی محسوس ہو رہا تھا۔

میں سارا دن اسپتال میں رہا۔ رات آٹھ بجے کے لگ بھگ ڈاکٹروں کی تسلی ہوئی اور انہوں نے میری جان چھوڑی۔ انیق بدستور میرے آس پاس ہی رہا۔ میں نے اس سے قادر خان کی طبیعت کے بارے میں پوچھا۔ اس نے کہا۔ ''قادر خان کی حالت ٹھیک نہیں۔ وہ مسلسل بے ہوش ہے۔ کبھی کبھی اس کے دل کی دھڑکن بھی خراب ہو جاتی ہے۔''

میں قادر خان کو دیکھنا چاہتا تھا مگر انیق نے بتایا کہ وہ انتہائی نگہداشت میں ہے اور ڈاکٹر کسی کو اس سے ملنے نہیں دے رہے۔

''پارا ہاؤس کے رہائشی حصے میں کیا پوزیشن ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''رات کو یہاں سے نکلتے وقت حملہ آوروں نے شکیل داراب کو تو رہا کر دیا تھا۔ اس رہائی کے فوراً بعد اس نے پولیس بلا لی تھی۔ پولیس بھی رات کو اپنے طور پر کارروائی کرتی رہی ہے۔ پولیس افسروں کا خیال تھا کہ ابراہیم کو اغوا کے بعد شاید سرحدی علاقے کی طرف لے جایا گیا ہو گا۔ یہ کسی کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ پارا ہاؤس سے بہت زیادہ دور نہیں گیا۔ جب سجاول اسے واپس لے کر پہنچا تو اصل صورتِ حال کا پتا چلا۔''

''لاشوں وغیرہ کا کیا ہوا؟''

''وہ سب پولیس نے اپنی تحویل میں لے لیں۔ انہیں پوسٹ مارٹم کے لیے شہر بھیج دیا گیا ہے۔ شکیل داراب ابھی تک یہاں پر ہی ہے اور آج دوپہر تک قانونی کارروائی مکمل کرانے میں مصروف تھا۔ اس کی موجودگی میں پولیس کی زبردست دوڑیں لگی رہی ہیں......''

میں اور انیق اسپتال سے باہر نکلنے کے لیے راہداری میں آ گئے تھے، جب اسپتال کے عملے میں کھلبلی سی نظر آئی۔ انیق نے ایک بندے سے پوچھا تو پتا چلا کہ شکیل داراب میری خبر گیری کے لیے آ رہا ہے۔ چند ہی سیکنڈ بعد وہ دکھائی دے گیا۔ اس کے ساتھ چار پانچ دیگر افراد بھی تھے۔ گارڈز کا ایک دستہ بھی عقب میں آ رہا تھا۔

وہ مجھے دیکھ کر حیران ہوا۔ حیرانی اس بات کی تھی کہ میں اب بستر کے بجائے اپنے قدموں پر تھا۔ شکیل داراب نے مجھ سے مصافحہ کیا اور بولا۔ ''تمہیں اپنے پاؤں پر دیکھ کر خوشی ہوئی۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

''مجھے بھی آپ کو صحیح سلامت پا کر خوشی ہوئی۔''

''سی سی ٹی وی پر ہم نے وہ سارے منظر دیکھے ہیں جن میں تم نے ڈٹ کر تعاقب اور اس کے ساتھیوں کا مقابلہ کیا۔ میں نے تمہیں اسکرین پر دیکھ کر پہچان تو لیا تھا لیکن یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ تم ہی ہو۔''

''یقین کیوں نہیں آرہا تھا؟'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تمہاری اور میری اکلوتی ملاقات اسٹیشن ویگن میں ہوئی تھی اور اس ملاقات میں ہمارے درمیان کچھ باتیں طے ہوئی تھیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ تم پاکستان سے چلے جاؤ گے۔''

''ہر کام میں قدرت نے کوئی بہتری چھپا رکھی ہوتی ہے۔ اگر میں چلا گیا ہوتا تو شاید آج یہاں کی صورتِ حال بھی ویسی نہ ہوتی جیسی اب نظر آرہی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ آپ نے میرے ساتھ ساتھ سردار سجاول کو بھی پہچان لیا ہو گا؟''

''نہیں، میں نے بس سجاول کا نام سنا ہوا تھا۔ کبھی اس سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ یہ تو آج ہی پتا چلا ہے کہ یہ وہی سجاول ہے جس کا نام چاند گڑھی وغیرہ میں لیا جاتا ہے۔''

شکیل داراب کا رویّہ دوستانہ نظر آرہا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ یہ شخص ان مفاد پرست سیاست دانوں میں سے ہے جو اپنے مطلب کے بغیر کسی کے سلام کا جواب دینا بھی پسند نہیں کرتے۔ میں اور انیق، شکیل داراب کے ساتھ پارا ہاؤس کے رہائشی حصے میں پہنچے۔ کل رات ہلاک ہوجانے والے افراد کا دکھ تو پارا ہاؤس کی فضا میں محسوس کیا جاسکتا تھا لیکن اس کے ساتھ ابراہیم کی بحفاظت بازیابی کی خوشی بھی دکھائی دے رہی تھی۔

پارا ہاؤس کی وسیع و عریض نشست گاہ میں کافی لوگ موجود تھے۔ ان میں بڑے صاحب کے علاوہ آقا جان، ابراہیم اور ابراہیم کا بڑا بھائی کمال احمد بھی تھا۔ کمال احمد، ابراہیم کی نسبت قدرے صحت مند تھا۔ شکل سے وہ بھی شریف النفس اور کسی حد تک دین دار نظر آتا تھا۔ یعنی دونوں بیٹے اپنے باپ ''بڑے صاحب'' کا الٹ دکھائی دیتے تھے۔ میں نے بڑے صاحب کو ادب سے سلام کیا۔ بڑے صاحب نے مالے زبان میں کچھ کہا جس کا ترجمہ کرتے ہوئے مترجم نے بتایا۔ ''عزت مآب کا کہنا ہے کہ تم نے چھوٹے صاحب کو حملہ آوروں کے چنگل سے نکالنے کے لیے جس طرح سجاول صاحب کی مدد کی، وہ تمہارے بہت شکر گزار ہیں اور تمہاری اس خدمت کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔''

میں نے پھر بڑی عاجزی سے شکریہ ادا کیا۔ بڑے صاحب نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے ایک نشست پر بیٹھنے کی ہدایت کی۔ میں عقبی نشست پر بیٹھ گیا۔ سجاول کو یہاں بڑی اہم جگہ ملی ہوئی تھی۔ وہ ابراہیم کے بالکل ساتھ ایک شاندار کرسی پر براجمان تھا۔ مجھے سجاول کے ہاتھ میں نیلم کے پتھر والی ایک انگوٹھی نظر آئی۔ نیلم اتنا شاندار تھا کہ دور ہی سے چمکارے مار رہا تھا۔ میں نے انیق کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ انگوٹھی پہلے تو سجاول کی انگلی میں نہیں تھی؟''

''یہ اب اس کی انگلی میں تشریف لائی ہے۔ پارا ہاؤس کی بڑی بیگم نے خوش ہو کر اسے انعام میں دی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ انگوٹھی دیتے ہوئے بڑی بیگم نے کوئی اور بات بھی کہی ہوگی۔''

''کیسی بات؟''

''ویسی ہی جیسی کہانیوں میں ہوتی ہے یا پھر گل بکاؤلی یا ہزار داستان جیسی فلموں میں۔ بادشاہ یا ملکہ کسی وفادار کی خدمت سے سرشار ہو کر اسے انگوٹھی دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ زندگی میں جب کبھی بھی ضرورت پڑے، یہ انگوٹھی دکھا کر کچھ بھی مانگ لینا۔ مغل اعظم میں بھی تو پرتھوی راج نے مدھوبالا کی ماں کو ایسی ہی انگوٹھی دی تھی۔''

''یہ سردار سجاول تم سے بہت تپا ہوا رہتا ہے۔ کہیں یہ نہ ہو کہ وہ یہ انگوٹھی بڑی بیگم کو دکھا کر تمہیں ہی ان سے مانگ لے۔''

''میرا اچار ڈالے گا؟''

''اچار کا تو پتا نہیں لیکن اپنے ڈیڑھ فٹ کے چھرے سے تمہارا کوئی اہم عضو ضرور کاٹ ڈالے گا اور ہوسکتا ہے کہ یہ عضو تمہاری زبان ہی ہو۔ تم اسے بہت زیادہ چلاتے ہو۔''

''شاہ زیب بھائی، زبان تو اللہ نے دی ہی چلانے کے لیے ہے، آپ کی اس بات پر مجھے پہلوان جناب حشمت راہی کا ایک شعر یاد آگیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں۔ سیانے کہتے ہیں کتنی وڈی ہے اللہ کی یہ شان دیکھو، مرد مرے تو اس کی نبض دیکھو، عورت مرے تو زبان دیکھو۔''

شاید انیق اپنی زبان کو مزید حرکت دیتا چلا جاتا لیکن اسی دوران میں دو لڑکیاں چست لباس پہنے نمودار ہوئیں۔ ان کے ریشمی لبادوں کے گریبان تا حدِ نگاہ پھیلے ہوئے

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

تھے۔ سروں پر پھولوں کی آرائش تھی۔ یہاں بیشتر اشیا میں پھولوں خاص طور سے سرخ گلابوں کی آرائش نظر آتی تھی۔ ہمیں معلوم ہوا تھا کہ گلاب بڑے صاحب کی بہت بڑی کمزوری ہے۔

لڑکیوں کے ہاتھوں میں کپڑے تھے...... اور ایک ڈبا سا کپڑوں کے اوپر رکھا تھا۔ آقا جان نے ڈبا کھولا اور ایک نہایت قیمتی کولٹ پستول جس کی قیمت میرے اندازے کے مطابق پانچ لاکھ پاکستانی روپے سے کم نہیں تھی، نکال کر بڑے صاحب کو پیش کیا...... سردار سجاول اپنی جگہ سے کھڑا ہو چکا تھا۔ بڑا صاحب بھی کھڑا ہوا اور اس نے یہ بیش قیمت ہتھیار سجاول کو بطور انعام پیش کیا۔ سردار سجاول نے جھک کر اس نوازش کا شکریہ ادا کیا۔

تب ایک کامدار جوڑا سجاول کو دیا گیا۔ یہ ایک طرح کی خلعت تھی جس سے سجاول کو سرفراز کیا گیا تھا۔ ہم دور ہی سے دیکھ سکتے تھے اس سرخ خلعت پر سونے کے تاروں کا کام کیا گیا تھا۔ مجھے اور انیق کو بھی ایک ایک خلعت دی گئی لیکن یہ کم تر درجے کی تھی۔ ایسی ہی خلعتیں تین چار اور افراد کو بھی دی گئیں۔

اپنی پُرشکوہ نشست پر بیٹھے بیٹھے بڑے صاحب ریان فردوس نے مالے میں ایک چھوٹی سی تقریر کی۔ اس کا ترجمہ کچھ یوں تھا۔

''کل رات...... نو بجے کے بعد جو خونی ڈراما پارا ہاؤس میں شروع ہوا تھا، وہ اب اختتام پذیر ہو چکا ہے۔ اس خطرناک صورتِ حال سے ہمیں جہاں کچھ سبق بھی حاصل ہوئے ہیں وہاں بہت سے نمک حلالوں اور نمک حراموں کی پہچان بھی ہوئی ہے۔ پارا ہاؤس کے تمام سیکیورٹی گارڈز کی چھان بین کی جا رہی ہے اور اب صرف ان لوگوں کی ملازمت ہی بحال ہوگی جن کی طرف سے ہر طرح کا اطمینان ہو جائے گا۔ اس نہایت مشکل وقت میں جن لوگوں نے میری فیملی کے لیے اپنی جان ہتھیلی پر رکھی ان میں نمایاں ترین نام مسٹر سجاول کا ہے۔ سجاول نے نہ صرف یہ کہ پارا ہاؤس کے اندر حملے کی شروعات میں بے مثال دلیری کا مظاہرہ کیا بلکہ اس کے بعد جب ہمارے بیٹے ابراہیم کو حملہ آوروں نے یرغمال بنایا اور اپنے ساتھ لے جانے میں کامیاب ہو گئے تو بھی اس نے ہمت نہیں ہاری۔ وہ اپنے ساتھی شاہ زیب کے ساتھ اس مقام تک جا پہنچا جہاں ابراہیم کو آگے لے جانے سے پہلے رکھا جانا تھا۔ ابراہیم کی رہائی کے وقت بھی زبردست معرکہ ہوا جس میں سجاول کے علاوہ اس کے ساتھی شاہ زیب نے بھی بھرپور کردار ادا کیا۔ بدبخت ناقب کی اندھادھند یلغار اور گولیوں کی بوچھاڑ میں سجاول، چھوٹے صاحب ابراہیم کو بحفاظت نکالنے اور پارا ہاؤس پہنچانے میں کامیاب رہا۔ اس جان لیوا کارروائی کے دوران میں انچارج گارڈ قادر خان بھی ایک حادثے کے سبب شدید زخمی ہوا ہے اور اس وقت موت وحیات کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ ہم اس کی زندگی کے لیے دعاگو ہیں۔

''بدبخت ناقب اور اس کا ساتھ دینے والے دیگر غداروں کے گرد گھیرا تنگ کیا جا رہا ہے۔ مقامی پولیس بھی اس سلسلے میں زبردست تعاون کر رہی ہے۔ امید ہے کہ یہ لوگ جلد سلاخوں کے پیچھے ہوں گے......''

تقریر ختم ہوئی تو انیق نے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ ''اس کہانی میں تو آپ کا یہ امریش پوری سجاول ہی سجاول چھایا ہوا ہے۔ آپ کا ذکر تو بس مہمان داری کے طور پر ہی ہوا ہے۔''

''چلو ہوا تو ہے۔''

''لیکن یہ تو سراسر ناانصافی ہے۔ صغیر کا بازو توڑ کر اس کے ٹھکانے کا کھوج آپ نے لگایا۔ وہاں ہونے والی لڑائی میں آپ نے اپنی جان خطرے میں ڈالی اور پل پر حملہ آوروں کو روکا تاکہ یہ امریش پوری (سجاول) ابراہیم کو حفاظت سے لے کر نکل سکے لیکن اس بات کا کہیں ذکر ہی نہیں۔''

''اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ ویسے بھی ایک چھوٹی سی تقریر میں یہ ساری باتیں تو نہیں کہی جا سکتی تھیں ناں۔''

''یہ بات نہیں۔ مجھے تو لگتا ہے سجاول نے یہ بات ویسے ہی گول کر دی ہے تاکہ اس کی مارکیٹ ویلیو میں فرق نہ آئے۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ یہ پارا ہاؤس والوں کی نگاہ میں اپنی اہمیت بڑھا رہا ہے۔''

''اس میں کیا شک ہو سکتا ہے۔ اصل کام آپ نے دکھایا ہے اور خیر سے بڑے صاحب کے پہلو میں یہ بیٹھا ہوا ہے۔ انگوٹھیاں اس کو پہنائی جا رہی ہیں۔''

''تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے نکو شہزادے۔'' میں نے اسے اسی نام سے پکارا جس سے سجاول پکارتا تھا۔

''فرق پڑتا ہے...... ایک تو میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ آپ جان بوجھ کر پیچھے کیوں رہتے ہیں۔ چاند گڑھی میں آپ نے وہاں کے لوگوں اور تاجور وغیرہ کے

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

لیے کافی کچھ کیا لیکن اس کا کریڈٹ اپنے بجائے کسی نشئی یاسر بھائی کو دے دیا۔ وہ یاسر بھائی کسی قبرستان میں چرس کا سوٹا لگا کر پڑا ہوگا اور لوگ اس کی ہمت اور خدا ترسی کے گن گاتے پھرتے ہیں۔ اب یہاں آپ اپنی ساری محنت اس موٹی ناک والے سجاول کے کھاتے میں ڈال رہے ہیں۔''

''اس کا بھی تو اپنا ایک مزہ ہوتا ہے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''بس آپ مزے لیتے رہیں اور یہ سجاول کوئی ''عظیم الشان'' کام دکھا کر رفوچکر ہو جائے گا اور ہوسکتا ہے کہ جاتے جاتے ہمارے لیے عدم آباد کا ٹکٹ کاٹ جائے۔''

''ایسا کچھ نہیں ہوگا یار! اگر سجاول کی ویلیو یہاں بڑھ رہی ہے تو یہ ہم سب کے کام ہی آئے گی۔''

''مجھے تو یہ وہی راج کپور کی پرانی فلم برسات والا سین لگ رہا ہے، جس میں......''

میں نے اس کی بات کاٹی۔ ''آج مجھے ایک بات بتاؤ، ابھی تمہارے دودھ کے دانت گرے بھی زیادہ دیر نہیں ہوئی اور تم باتیں کرتے ہو چندر گپت موریہ کے دور کی۔ یہ پرانی فلمیں، پرانے گانے اور ڈرامے...... یہ سب کیا ڈراما ہے؟''

''سچی بات بتاؤں؟''

''بتا ہی دو ورنہ آج میں سجاول کو بتا دوں گا کہ تم نے اسے موٹی ناک والا کہا ہے اور اس کے بارے میں کچھ اور گھٹیا باتیں بھی کی ہیں۔''

انیق نے ڈرنے کی اداکاری کی...... اور خوف زدہ نظروں سے سجاول کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''یہ غضب نہ کیجیے گا شاہ زیب بھائی۔ میری بیوی شادی سے پہلے ہی بیوہ ہو جائے گی اور میرے بچے پیدا ہونے سے پہلے ہی مر جائیں گے۔ یہ بڑا ظالم شخص ہے۔ میں نے اسے بہت چنگی طرح دیکھ لیا ہے۔ میں آپ کو اصل بات بتا دیتا ہوں۔ دراصل میں دیکھنے میں چھوٹا نظر آتا ہوں لیکن میری عمر 65 سے اوپر ہے۔ ہماری فیملی میں یہ خاص بات ہے کہ ہم بوڑھے ہونے کے باوجود جوان ہی نظر آتے ہیں۔ یہ جو آپ جاوید شیخ، شان اور معمر رانا وغیرہ کو دیکھ رہے ہیں یہ ہماری ہی لڑی سے ہیں۔''

''یعنی تم درحقیقت بوڑھے ہو؟''

''بالکل۔''

میں نے اس کی نچلی پسلیوں میں کہنی کی خاص چوٹ لگائی وہ تکلیف سے دہرا ہو گیا اور اس کے منہ سے بے ساختہ ''اوہ شٹ'' نکل گیا۔

میں نے کہا۔ ''اب یہ اپنا ''اوہ شٹ'' ہی دیکھ لو۔ یہ کوئی بوڑھا شخص نہیں بول سکتا۔ یہ نئی نسل کا لفظ ہے۔''

''اس چھوٹی سے غلطی کا مطلب یہ نہیں کہ آپ مجھ سے میری بزرگی چھین لیں۔'' وہ کراہتے ہوئے بولا۔

اسی دوران میں شکیل داراب کو فون موصول ہوا۔ اس نے کال ریسیو کی۔ اس کے سرخ وسپید چہرے پر دبا دبا جوش دکھائی دیا۔ پھر اس نے جھک کر حلمی کے کان میں کچھ کہا۔ حلمی نے بڑے صاحب کے کان میں سرگوشی کی۔ یہی وقت تھا جب تین پولیس موبائلز بڑی تیزی سے پارا ہاؤس کے پورچ میں داخل ہوئیں۔ میں نے دور ہی سے دیکھ لیا۔ ایک گاڑی کی نیلی باڈی میں گولیوں کے کئی سوراخ نظر آرہے تھے۔

حلمی نے کھڑے ہو کر اعلانیہ انداز میں حاضرین سے کہا۔ ''آپ لوگوں کے لیے ایک اچھی خبر ہے۔ جناب شکیل صاحب کی ذاتی توجہ اور کوشش سے ہمیں کامیابی ملی ہے۔ پارا ہاؤس پر حملہ آور ہونے والوں کا سرغنہ اور اس کے دو ساتھی گرفتار ہوئے ہیں۔''

اس خوش کن اطلاع کے فوراً بعد شکیل داراب لمبے لمبے ڈگ بھرتا پولیس کی گاڑیوں کی طرف چلا گیا۔ حلمی...... اور چند دیگر افراد بھی اس کے ساتھ تھے۔ شکیل اس صوبے کا ایک نہایت طاقتور سیاست داں تھا۔ اس کی ذاتی توجہ کیوں رنگ نہ لاتی اور اغوا کے مجرم کیوں گرفتار نہ ہوتے؟ یہ کسی غریب کا بچہ تو نہیں تھا کہ کئی دن تک جس کی ایف آئی آر ہی درج نہ ہوتی۔

ناقب اور اس کے ساتھیوں کو پولیس موبائل سے اتار کر ایک قریبی کمرے میں لے جایا گیا۔ میں بس ناقب کی ایک جھلک ہی دیکھ سکا۔ صاف پتا چلتا تھا کہ پولیس نے اسے کافی بھاگ دوڑ اور مارا ماری کے بعد گرفتار کیا ہے۔ اس کے کپڑوں پر لہو کے داغ دور ہی سے دکھائی دے رہے تھے۔

سجاول اپنی نشست سے اٹھ کر میری طرف آیا، اس کی تیکھی مونچھوں کے نیچے ایک مطمئن مسکراہٹ تھی۔

''اب کیا ارادے ہیں؟'' میں نے سجاول سے پوچھا۔

''ارادے کیا ہیں، فی الوقت تو ہم پارا ہاؤس کے ہی مہمان ہیں۔''

انیق بولا۔ ''ہم تو شاید مہمان ہیں لیکن آپ تو یقینا

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

مہمانِ خصوصی ہیں۔‘‘
انیق کے لہجے میں چھپے ہوئے طنز کو محسوس کر کے سجاول کے تیور بگڑنے لگے لیکن میں نے فوراً بات بدل دی۔ ’’اب کہاں جانا ہے ہمیں...... کچھ بھوک بھی لگ رہی ہے۔‘‘
’’آؤ میرے ساتھ۔‘‘ سجاول نے بھاری آواز میں کہا۔
ہم اس کے ساتھ چل دیے۔ تین چار خادم بڑے مؤدب انداز میں ہمارے ساتھ تھے۔ دو گارڈز بھی عقب میں آرہے تھے۔ ہم ایک بار پھر اسی مہمان خانے میں آگئے جہاں ہم کل کا ہنگامہ شروع ہونے سے پہلے تھے۔ تب ہم کھانے کا انتظار کر رہے تھے مگر کھانے کی جگہ حملہ آوروں نے ہمیں گولیاں کھلانے کی کوشش کی تھی۔ اب واقعی بے طرح بھوک لگی ہوئی تھی۔
ہم سیدھا مہمان خانے کے ڈائننگ ہال میں گئے۔ گارڈز ہمارے پاس ہی موجود تھے۔ اس لیے کوئی اہم بات نہیں کی جاسکتی تھی۔ چند منٹ کے اندر ایک نہایت پُرتکلف کھانا ہمارے سامنے چن دیا گیا۔ اہم ترین ڈش شکار کیے ہوئے تکور کا سالن تھا۔ ہاں یہی پرندہ تھا جس کو شکار کرنے کی چاہ میں شکیل دارا ب کل خود شکار ہوتے ہوتے بچا تھا۔ وہ سارے مناظر نگاہوں کے سامنے گھوم گئے۔ حملہ آوروں نے ابراہیم کے ساتھ ساتھ شکیل کو بھی مرغی کی طرح باندھ کر فرش پر ڈالا ہوا تھا اور خوفناک نتائج کی دھمکیاں دے رہے تھے۔ ہم نے یہ سب کچھ سی سی ٹی وی پر دیکھا تھا۔ اب شکیل دارا ب آزاد ہو گیا تھا اور اپنے اثر و رسوخ سے علاقے کی ساری انتظامی مشینری کو حرکت میں لے آیا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا تھا کہ 24 گھنٹے پورے ہونے سے پہلے پہلے مجرم دھر لیے گئے تھے۔
کھانا ختم ہوا ہی تھا کہ زخمی قادر خان کا اسسٹنٹ رفاقت اندر آیا اور اس نے سجاول کے قریب جھک کر اس کے کان میں کچھ کہا۔
سجاول اٹھ کر اس کے ساتھ چل دیا مگر دروازے پر پہنچ کر رک گیا اور اس نے مجھے بھی ساتھ آنے کو کہا۔
ہم چند راہداریوں سے گزرے۔ کل والے خونی ہنگامے کے بعد پورے پارا ہاؤس میں ریڈ الرٹ کی سی کیفیت تھی۔ بیشتر دروازے مقفل تھے، صرف ضروری راستے کھلے رہنے دیے گئے تھے۔ گارڈز پوری طرح چوکس تھے اور نگرانی والے کیمرے اپنا کام کر رہے تھے۔ ہم پارا ہاؤس کے رہائشی حصے میں داخل ہوئے۔ ایک کمرے میں سنبل ہماری منتظر تھی۔ وہ کل شام سج سنور کر اس عالیشان محل میں پہنچی تھی۔ بڑے صاحب نے اسے منظورِ نظر کی حیثیت دی تھی اور اسے اپنی ’’خدمت‘‘ کے لیے منتخب کیا تھا۔ لیکن یہ ’’خدمت‘‘ اور خدمت گزاری کے سارے پروگرام کل رات گولیوں کی بوچھاڑوں اور خون کی پچکاریوں میں غارت ہو گئے تھے۔
پتا چلا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے سجاول نے خود سنبل سے ملنے اور اس کی خیر خیریت دریافت کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ بڑے صاحب نے اس کی درخواست مانتے ہوئے اسے یہاں سنبل کے پاس بھیج دیا تھا۔
سنبل اب کل والے زرق برق لباس کے بجائے ذرا دھیمے رنگوں والے کپڑوں میں نظر آرہی تھی۔ وہ یہاں ہونے والے خون خرابے سے بہت ڈری سہمی ہوئی تھی۔ سجاول نے اسے تسلی تشفی دی اور سمجھایا کہ کل رات والا واقعہ محض ایک اتفاق تھا۔ یہاں اس چار دیواری میں اسے کسی طرح کا کوئی خطرہ لاحق نہیں۔
وہ منمنا کر بولی۔ ’’مجھے یہاں بہت ڈر لگ رہا ہے۔ آپ لوگ مجھے چھوڑ کر نہ جائیں۔‘‘
’’تم بے فکر رہو۔‘‘ سجاول نے کہا۔ ’’بڑے صاحب بہت چنگے بندے ہیں۔ تمہیں بڑے آرام سے رکھیں گے۔ ویسے ہم بھی ابھی اِدھر ہی ہیں۔ تمہارے آس پاس ہی موجود رہیں گے۔‘‘
وہ اپنی حنائی انگلیاں مروڑ کر رہ گئی۔ اپنی کم عمری کی وجہ سے وہ کافی معصوم نظر آتی تھی۔ تاہم مرد و زن کے تعلق...... اور ان کے باہمی شوق اور اشتیاق کے ساری رمزوں سے وہ آگاہ تھی۔ اگر نہ ہوتی تو اس طرح خوشی خوشی یہاں بکنے کے لیے اور خود کو پیش کرنے کے لیے کیوں آجاتی۔ اب یہ اور بات تھی کہ اس کے ساتھ وہی محاورے والی بات ہوئی تھی کہ سر منڈواتے ہی اولے پڑ گئے۔
سجاول سے بات کرتے کرتے وہ کسی وقت متوحش نگاہوں سے در و دیوار کو دیکھنے لگتی تھی۔ اس نے بتایا کہ کل شام کے بعد جب ہنگامہ شروع ہوا تھا تو بڑے صاحب نے اپنی ایک اور خواص کے ساتھ اسے بالائی منزل پر بھجوا دیا اور چار زنانہ پہرے داران کی حفاظت پر لگا دیں۔ اب تک وہ بالائی منزل پر ہی ٹھہری ہوئی تھی۔
اس نے کہا۔ ’’جب اوپر والی منزل پر بھی گولیاں چلنے لگیں اور رونا پیٹنا مچ گیا تو میں تھوڑی دیر کے لیے بے

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

ہوش ہوگئی تھی۔ بڑے صاحب کی خواص نے میرے منہ پر چھینٹے دے دے کر مجھے ہوش دلایا۔ بعد میں اس نے بتایا کہ حملہ کرنے والوں نے بڑے صاحب کے چھوٹے بیٹے کو زخمی کر کے پکڑ لیا ہے۔ اس کے بعد پہرے دارنیاں ہمیں اس کمرے سے نکال کر اندر کی طرف ایک دوسرے کمرے میں لے گئیں۔ یہ بڑا شاندار اور سجا سجایا کمرا ہے اور یہاں کھڑکیوں پر لوہے کی گریلیں لگی ہوئی ہیں......"

سجاول اور سنبل بہت دھیمے لہجے میں بات کر رہے تھے۔ اندیشہ تھا کہ اس کمرے میں بھی کوئی ڈکٹا فون قسم کی شے موجود نہ ہو۔ بظاہر تو اس طرح کی کوئی شے دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ سجاول نے سنبل سے پوچھا۔ "اور کوئی خاص بات نوٹ کی تم نے؟"

اس نے تھوک نگل کر اثبات میں سر ہلایا۔ "مجھے تو یہاں بہت کچھ عجیب لگ رہا ہے۔ بڑے صاحب کے چھوٹے بیٹے ابراہیم کی طرح بڑا بیٹا کمال بھی نمازی اور پرہیزگار ہے۔ سنا ہے کہ ایک دن چھوڑ کر ایک دن روزہ بھی رکھتا ہے لیکن حرکتیں اس کی بھی کچھ اور طرح کی ہیں۔ ابھی کوئی دو ڈھائی گھنٹے پہلے میں نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے دیکھا تو باہر دھواں سا اٹھ رہا تھا۔ پھر زور زور سے بولنے کی آوازیں آئیں۔ ایسے لگا کہ آگ لگ گئی ہے۔ میں نے اور خواص نے آگے جا کر دیکھا تو ہم دونوں حیران رہ گئے۔ ایک دروازے سے باہر بڑے قیمتی کپڑوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ یہ سارے زنانہ کپڑے تھے۔ کئی ایک پر تو موتی اور سونے کے تار بھی لگے ہوئے تھے۔ ان میں زیور اور زنانہ جوتیاں بھی تھیں اور چادریں وغیرہ بھی۔ کمال نے ان پر پیٹرول چھڑک کر آگ لگا دی تھی۔ ملازم اور گارڈ بھاگے ہوئے آئے۔ کچھ خواصیں (بیگمات) بھی پہنچ گئیں۔ انہوں نے پھیلنے سے پہلے ہی آگ کو بجھا دیا۔ بڑی بیگم "کمال" کو سمجھا بجھا کر اندر لے گئیں۔

"کیا چکر تھا یہ؟" سجاول نے پوچھا۔

"بڑی بیگم اور کمال وغیرہ دوسری زبان میں بات کر رہے تھے۔ کچھ بھی سمجھ میں نہیں آیا۔ پر اتنا پتا چل رہا تھا کہ کمال زاروقطار رو رہا ہے اور ان چیزوں کی بات ہی کر رہا ہے جو اس نے جلانے کی کوشش کی تھی۔"

"تم نے اپنے ساتھ والی خواص سے کچھ پوچھا؟" میں نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے سنبل سے دریافت کیا۔

وہ انگلیاں مروڑتے ہوئے بولی۔ "ہاں...... پوچھا تو سہی، مگر اس نے بس گول مول بات کی۔ بس اتنا بتایا کہ

فیصلے پر نظر ثانی

لڑکی نے پوچھا۔ "مجھ سے شادی کر کے تم سگریٹ نوشی ترک کر دو گے؟"

لڑکے نے یقین دلایا۔ "کر دوں گا۔"

لڑکی نے پوچھا۔ "اور آوارہ گردی سے بھی باز آ جاؤ گے؟"

"ہاں! اس سے بھی باز آ جاؤں گا۔"

"فلم بینی بھی چھوڑ دو گے؟"

لڑکے نے آہ بھری۔ "ہاں، فلم دیکھنا بھی چھوڑ دوں گا۔"

"تم کتنے اچھے ہو۔" لڑکی نے خوش ہو کر کہا۔ "میری خاطر تم اور کون کون سی چیزیں ترک کر دو گے؟"

لڑکے نے پیشانی پر آیا ہوا پسینہ خشک کیا اور آہستہ سے جواب دیا۔ "تم سے شادی کرنے کا ارادہ!"

بنگرام سے کاشف عبید کا فیصلہ

چھوٹے صاحب کمال کچھ پریشان رہتے ہیں۔ ان کی شادی ہوئی لیکن بیوی تھوڑے دنوں بعد ہی مر گئی تھی۔"

"ہوسکتا ہے کہ جو کپڑے وغیرہ جلانے کی کوشش کمال نے کی وہ اس مرنے والی کے ہوں۔" سجاول نے کہا۔

"میں نے بھی خواص سے یہ پوچھا تھا پر وہ بات کو گھما کر اور طرف لے گئی۔"

دروازے سے باہر کھڑے پہرے دار گاہے بگاہے کن انکھیوں سے ہماری طرف دیکھ لیتے تھے۔ یہ نئے پہرے دار غیر معمولی طور پر چوکس اور ہوشیار باش نظر آتے تھے۔ ان کی وردیاں بالکل سیاہ تھیں۔ سجاول نے دھیمے لہجے میں سنبل سے کہا۔ "تم ذرا ہوشیار بن کر رہو۔ اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھو۔ میری بات سمجھ رہی ہو نا؟"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خوب صورت آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ ذرا توقف کر کے بولی...... "ہم کب تک یہاں سے جائیں گے؟"

"بے وقوف مت بنو۔" سجاول دانت پیس کر بولا۔ "تمہیں کہا ہے ناں یہاں کچھ نہیں ہوگا تمہیں، اب آئی ہو تو حوصلے سے رہنا پڑے گا۔"

سجاول کی لال آنکھیں دیکھ کر اس نے ہونٹوں کو مضبوطی سے بھینچا اور سر جھکا لیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

دراصل وہ تو یہ سمجھ کر یہاں آئی تھی کہ چند ہفتے یہاں رہے گی۔ محل کے عیش و آرام دیکھے گی۔ کھائے پیے گی۔ اپنے جسم کی ٹھیک ٹھاک قیمت تحائف کی شکل میں وصول کرے گی اور خراماں خراماں اس بڈھے سے چھٹکارا حاصل کر کے نکل جائے گی۔ لیکن یہاں تو آتے ساتھ ہی اس نے پانی پت کی لڑائی دیکھ لی تھی اور اسے جان کے لالے پڑ گئے تھے۔

سنبل سے مل کر ہم واپس مہمان خانے میں آ گئے۔ واپس آتے ہوئے سجاول نے ایک بار پھر سنبل کو تاکید کی تھی کہ وہ اپنی ساتھی بیگم سے کمال کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ سجاول درحقیقت سنبل کو یہاں لایا ہی اس غرض سے تھا کہ اس کے ذریعے اندر خانے کی معلومات حاصل ہو سکیں۔ سجاول کے اس کام سے مجھے ٹیکساری گینگ یاد آ گیا۔ ان لوگوں کا طریقہ کار بھی یہی تھا۔ وہ خوب صورت عورتوں کی مدد سے اپنے مقاصد حاصل کرتے تھے۔ جان ڈیرک اور اس کے انڈین پارٹنر راہول کی منحوس شکلیں میرے ذہن میں گھومنے لگیں۔ میں ان لوگوں کو زندگی کی آخری سانس تک معاف نہیں کر سکتا تھا۔ لڑائی میں یہ جو وقفہ تھا، عارضی تھا۔ اس عارضی وقفے میں بھی جان ڈیرک کا تصور اکثر میرے دماغ کو کچوکے لگاتا رہتا تھا۔ انہوں نے میرے جان سے پیارے دوست مامون اور اس کی محبوبہ انیتا کو اس وقت گولیوں سے چھلنی کیا تھا جب وہ بڑے ارمانوں سے اپنے جمنازیم کا افتتاح کرنے والے تھے۔ اس روز مارشل آرٹ ہار گیا تھا اور بدمعاشی جیت گئی تھی اور اب ڈیرک کا مقابلہ بھی کسی مارشل آرٹسٹ سے نہیں تھا۔

رات کو ہمارا قیام بڑا ٹھاٹ باٹ والا تھا۔ ہمیں تین بہترین کمرے دیے گئے تھے۔ سجاول کے لیے علیحدہ کمرا تھا، تاہم ہمارا کمرا بھی بالکل ساتھ ہی تھا۔ سجاول کے ساتھ ایک غیر معمولی برتاؤ کیا گیا تھا اور وہ یہ کہ اسے بڑے صاحب ریان فردوس کا ڈائریکٹ نمبر بھی دیا گیا تھا۔ وہ بوقتِ ضرورت بڑے صاحب سے براہِ راست رابطہ بھی کر سکتا تھا۔ حلمی کا ڈائریکٹ نمبر بھی سجاول کے پاس موجود تھا۔ سجاول نے حلمی کے ذریعے یہ بات بڑے صاحب تک پہنچائی تھی کہ پاراہاؤس میں ہونے والے ہنگامے کی وجہ سے اس کی منظورِ نظر سنبل ذرا ٹینشن میں ہے اس لیے وہ چاہتا ہے کہ ایک دو بار اس سے مل کر اس کو نارمل کرے۔

اگلے روز سجاول کو ایک بار پھر دس پندرہ منٹ کے لیے سنبل سے ملنے کا موقع مل گیا۔ واپس آ کر سجاول کافی دیر سوچ میں گم رہا، مجھے لگا کہ شاید وہ مجھ سے کھل کر بات کرنا نہیں چاہتا لیکن پھر وہ بتانے کی طرف آ گیا۔ وہ انیق سے چڑ کھاتا تھا۔ اس نے انیق کو خاموش کرا دیا اور بولا۔ ”سنبل کی باتوں سے پتا چلتا ہے کہ برونائی میں کہیں کمال کی شادی ہوئی تھی۔ لڑکی بھی برونائی ہی کی تھی مگر وہ شادی کے صرف چار دن بعد بیمار ہوئی اور تین دن بستر پر رہ کر ختم ہو گئی۔ کمال نے اس واقعے کا بے حد صدمہ لیا۔ کئی ماہ تک وہ دیوانہ سا پھرتا رہا۔ آہستہ آہستہ ٹھیک تو ہو گیا مگر اپنی دلہن کا غم اب تک اس کے دل میں ہے۔“

”غم دل میں ہے تو پھر اس کے کپڑے وغیرہ کیوں جلا رہا ہے؟“

”اس کی بھی وجہ ہے۔ اب اس کی دوسری شادی ہو رہی ہے۔ شاید چند دنوں کے اندر ہی......“

”کس سے؟“

”یہ تو پتا نہیں۔ لیکن ہو ضرور رہی ہے بلکہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دونوں بھائیوں کی اکٹھی شادی کا پروگرام ہو۔“

میرے ذہن میں بجلی کا کوندا سا ہوا۔ میں نے کہا۔ ”تم نے بتایا ہے کہ کمال کی پہلی بیوی شادی کے چار پانچ دن بعد ہی بیمار ہو گئی تھی۔ اس کی بیماری کا کچھ پتا چلا؟“

”تفصیل تو سنبل نہیں بتا سکی۔ وہ اتنی سمجھ بوجھ والی نہیں ہے۔ اس نے جو کچھ بتا دیا ہے وہی بڑی بات ہے۔“

انیق کی زبان میں کھجلی ہو رہی تھی۔ اس کی حسِ ظرافت نے زور مارا اور وہ خود کو بولنے سے باز نہیں رکھ سکا۔ ”دراصل جی سنبل کو زبان کا مسئلہ ہے نا اگر اس کی جگہ میں ہوتا تو اب تک بڑے صاحب کی تین چار پشتوں کی ہسٹری مجھے معلوم ہو گئی ہوتی۔“

سجاول نے کہا۔ ”اگر تو سنبل کی جگہ ہوتا تو تیرے ساتھ اور بھی بہت کچھ ہونا تھا، جو شاید تجھ سے برداشت نہ ہوتا۔ تجھے پتا ہی ہے نا کہ یہ کڑی یہاں کس لیے آئی ہے......؟“

”سوری، آپ تو برا مان گئے ہیں سجاول صاحب۔“

”شکر کرو برا ہی مان رہا ہوں۔ برا کر نہیں رہا ہوں۔ ایک دو چنگے کام بھی ہوئے ہیں تجھ سے جس کی وجہ سے تجھے برداشت کر رہے ہیں۔ جب تمہیں لگے کہ عزت راس نہیں آ رہی ہے تو اِدھر اُدھر ہو جایا کرو اور بہتر یہ ہے کہ اب اِدھر اُدھر ہی ہو جاؤ۔“

سجاول کے تمتمائے چہرے کو دیکھ کر انیق نے پانی

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

پینے کے بہانے اٹھ جانا ہی مناسب سمجھا۔

سجاول دھیمی آواز میں بولا۔ ''شاید کوئی زنانہ قسم کی بیماری ہو لڑکی کو...... یا پھر پہلے سے کوئی تکلیف ہو گی جو لڑکی والوں نے چھپائی ہوگی......''

''نہیں سجاول، میرا ذہن کسی اور طرف جا رہا ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ یہاں پارا ہاؤس میں لانے کے لیے کچھ لڑکیوں کو تیار کیا جا رہا ہے، شاید دو یا تین لڑکیوں کو...... اور ان میں سے ایک وہ بھی ہے جس کا نام زینب ہے اور جو یہاں سے بہت فاصلے پر اپنے گاؤں چاند گڑھی میں ہنسی خوشی رہ رہی تھی۔ ان لڑکیوں کو کسی طرح کا زہر دے دے کر کسی خاص مقصد سے تیار کیا گیا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ مقصد یہی ہو۔''

''کون سا؟''

''کمال اور ابراہیم کی شادی والا۔ ان لڑکیوں کی شادیاں ان دونوں بھائیوں سے کی جانی ہوں۔''

''لیکن کیوں؟ ایسی لڑکیاں جن کو زہر دے دے کر زہریلا کیا ہوا ہے، ان کو بیاہ کر لانے سے ان لڑکوں کو اور وڈے صاحب کو کیا ملے گا؟''

''ان کو یہ ملے گا کہ ان کو جیتی جاگتی بیویاں مل جائیں گی...... اور وہ زندہ بھی رہیں گی۔''

''زندہ بھی رہیں گی؟ تمہاری بات ابھی تک میرے پلے نہیں پڑ رہی۔'' سجاول اپنی تمام تر دانش مندی کے باوجود ابھی تہ تک نہیں پہنچ رہا تھا۔

مجھے سگریٹ کی طلب محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ ''کمال کی پہلی بیوی اپنی شادی کے صرف چار دن بعد بستر سے جا لگی اور مر گئی لیکن اب یہ ہونے والی بیوی شاید بچ جائے...... اور اس لیے بچ جائے کہ یہ IMMUNE ہے اس کے اندر بھی زہر موجود ہوگا۔''

سجاول کی آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئیں۔ چہرے کا رنگ بدل گیا۔ وہ سرسراتی آواز میں بولا۔ ''تم کیا کہنا چاہتے ہو شاہی...... تمہارا مطلب ہے کہ...... یہ دونوں لڑکے بھی...... زہریلے ہیں......؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور سگریٹ کا کش لے کر دھواں کھڑکی کی جانب چھوڑا۔ کھڑکی سے باہر رات اپنے لبے پر پارا ہاؤس کے در و دیوار پر پھیلا چکی تھی۔ روشنیاں در و دیوار کو اجاگر کر رہی تھیں۔ بلند باؤنڈری وال پر سرچ لائٹس چکراتی تھیں اور پھولوں سے گھری ہوئی روشوں پر گارڈن لیمپس دودھیا اجالا بکھیر رہے تھے۔

سجاول نے اٹھ کر کمرے کے اندر ہی چند قدم چہل قدمی کی اور دوبارہ میرے سامنے بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''تمہارا مطلب ہے کہ یہ دونوں لڑکے عام نہیں ہیں۔ ان کے خون میں زہر ہے اور اس زہر کی وجہ سے ہی کمال کی بیوی مری تھی۔''

''لگ تو یہی رہا ہے۔ شادی کے بعد میاں بیوی ایک دوسرے کے بالکل قریب آجاتے ہیں۔ پہلے سے ایک دوسرے کو نہ بھی جانتے ہوں تو بھی چند دنوں میں برسوں کا فاصلہ طے ہو جاتا ہے۔ شادی کے چند دن بعد ہی کمال کو اپنی دلہن کی جدائی سہنا پڑی۔ وہ ابھی تک اسے پوری طرح بھول نہیں پایا۔ اس نے اب تک اس کے ذاتی استعمال کی چیزیں سنبھال کر رکھی ہوئی تھیں۔''

''اور اب انہیں جلانے کی کوشش کر رہا ہے۔'' سجاول نے کہا۔

''ظاہر ہے جو کچھ سنبل بتا رہی ہے۔ اس سے تو یہی پتا چلتا ہے کہ کمال اور ابراہیم دونوں کی شادی ہو رہی ہے۔ اپنی دوسری شادی سے پہلے کمال ڈپریشن میں ہے...... اور پہلی بیوی کی یادوں سے پیچھا چھڑانا چاہتا ہے۔''

کمرے میں گمبھیر خاموشی طاری ہو گئی۔ ہم دونوں ہی اپنی اپنی جگہ سوچ رہے تھے اور سوچنے کے لیے سب سے اہم بات یہ تھی کہ اگر دونوں بھائیوں کے جسموں کے اندر واقعی کوئی خطرناک زہر موجود ہے تو کیوں ہے؟ کیا وہ پیدائشی طور پر ایسے ہیں یا ان کے ساتھ بعد میں کوئی مسئلہ ہوا ہے۔ یا پھر یہ اسی دشمنی کا نتیجہ ہے جس کا ذکر بار بار سننے میں آ رہا ہے۔ مجھے زینب کے بارے میں بھی پریشانی لاحق ہو رہی تھی۔ اپنے والد مولوی فدا کی موت کے بعد وہ لاوارثوں کی طرح ہو گئی تھی۔ اس کی سوتیلی ماں اس کا بہت خیال رکھ رہی تھی لیکن عالمگیر اور پیر ولایت جیسے فتنہ سازوں سے ٹکر لینا اس کے بس میں کہاں تھا؟ انیق نے مجھے بتایا تھا کہ وہ اسلام آباد کے اسپتال میں ابھی تک زیر علاج ہے اور وہاں اس کی حفاظت کے لیے پولیس کا گارڈ بھی موجود ہے مگر میں تازہ ترین صورت حال جاننا چاہتا تھا۔ ہماری نئی معلومات کے مطابق چار پانچ دن تک پارا ہاؤس میں دو تین لڑکیاں پہنچنے والی تھیں اور ان میں سے ہی دو لڑکیوں کو بڑے صاحب کے دونوں بیٹوں کی دلہنیں بننا تھا۔ سوال یہ تھا کہ کہیں زینب بھی تو ان میں شامل نہیں؟

اس سلسلے میں تازہ ترین صورتِ حال مجھے پہلوان حشمت سے معلوم ہو سکتی تھی۔ وقتِ رخصت تاجور کی طرح

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

میں نے پہلوان حشمت کو بھی اپنا سیل نمبر دیا تھا۔ جواباً تاجور نے تو مجھے اپنا نمبر نہیں دیا تھا مگر پہلوان حشمت نے ضرور دیا تھا۔ پہلوان کو چاند گڑھی واپس پہنچے اب دو ہفتے ہو چکے تھے۔ اس دوران میں دو تین بار اس کی کال آئی تھی۔ ایک بار میں نے کال ریسیو بھی کی تھی اور پہلوان سے تھوڑی سی بات بھی ہوئی تھی۔

میں نے وہیں کمرے میں سجاول کے پاس بیٹھے بیٹھے پہلوان حشمت سے رابطہ کرنے کی کوشش کی۔ تیسری چوتھی کوشش میں کامیابی ہوگئی۔ پہلوان کی بھاری بھرکم آواز فون کے اسپیکر پر ابھری۔ ”ہیلو شاہ زیب، تمہارا کیا حال ہے؟ تمہاری آواز سن کر دل باغ باغ ہو گیا ہے۔ تم سے جب بھی بات ہووت ہے بالکل ایسا لگت ہے کہ کوئی گمشدہ چیز مل گئی ہو۔“

”پہلوان جی، مجھے بھی بالکل یہی لگتا ہے۔ ویسے کیا حال ہے آپ کا؟ آپ کی آواز کچھ بدلی بدلی سی ہے۔“

”بس کوئی نہ کوئی مصیبت مجھ پر پڑ ہی جاوت ہے۔ کل کرموں اور سونگی کے بکروں میں لڑائی ہوگئی۔ کرموں کے بکرے کا سینگ ٹوٹ گیا۔ میں اس کا سینگ جوڑنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس نے میرے منہ پر ٹکر مار دی۔ سارا چباڑا (جبڑا) ہل گیا ہے۔“

”آپ انسانوں کا علاج کرتے ہیں۔ انسانوں کی ہڈیاں ہی جوڑا کریں تو زیادہ اچھا ہے۔“

”تم نے میرے وہ شعر پہلے بھی سنے ہوں گے۔

ہم لوگوں کے کام آتے ہیں اور پھنستے ہیں
ہماری اس حالت پر لوگ بہت ہنستے ہیں
خلقِ خدا کے کام آنا ہی تو راہ ہے نیکی کی
ورنہ تو بہت سارے پنگے ہیں بہت رستے ہیں

اب یہ بکرا بھی تو ایک انسان کا ہی تھا۔ انسان کی خدمت کو بکرے کی خدمت سے جدا تو نہیں کیا جاسکت ہے نا۔ ویسے بڑے ٹھیک ہی کہوت ہیں جو کام بھی ہووت ہے اس میں قدرت کی طرف سے کوئی بہتری ہی ہووت ہے۔ بڑے دنوں سے میرا حلوہ کھانے کو جی چاہ رہا تھا۔ بیوی کے بہت ترلے کرتا تو ایک دفعہ پکا دیتی۔ اب بغیر ترلوں کے ہی روز حلوہ مل رہا ہے۔“ اس کے بعد پہلوان نے غالباً ہنسنے کی کوشش کی تھی جس کی وجہ سے اسے بلند آواز میں کراہنا پڑ گیا۔

میں نے کہا۔ ”پہلوان جی، باتیں تو کئی پوچھنی ہیں مگر فی الوقت اللہ بخشے مولوی فدا کی بیٹی زینب کی خیر خیریت کے بارے میں بتا دیں۔“

”یہ تو اچھا پوچھا تم نے۔ میں کل ہی امام مسجد سے ساری بات پوچھ کر آیا ہوں۔ امام صاحب دو اور بندوں کے ساتھ کسی کام سے اسلام آباد گئے تھے۔ زینب کو بھی دیکھ کر آئے ہیں۔ اس کا بڑا اچھا علاج ہو رہا ہے۔ پہلے سے صحت مند بھی ہوگئی ہے۔ اس کی ماں سوتیلی ہے لیکن پھر بھی دن رات اس کی دیکھ بھال کر رہی ہے۔ دو سپاہی بھی اس کی حفاظت کے لیے وارڈ میں موجود رہت ہیں۔“

”چلو میری تسلی ہوگئی۔ مجھے اس کی طرف سے بڑی فکر رہتی ہے۔ یہ عالمگیر اور پیر ولایت کی نیت اس بچی کے بارے میں ٹھیک نہیں ہے۔“

”ہاں اس بات کا پتا تو پورے گاؤں کو چل چکا ہے۔ لوگ جانت ہیں کہ اگر انہوں نے مولوی جی کی بچی کی طرف سے توجہ ہٹائی تو اس کے ساتھ کچھ نہ کچھ برا ہو جاوے گا۔ اللہ کا شکر ہے کہ تاجور تو اس گندے پھندے سے بچ کر نکل گئی ہے۔ وہ جہاں رہے سکھی رہے۔ میں تو اس کے لیے یہی کہوں گا...... جان بچی تو دودھوں نہائے...... اور ہاں مجھے ایک اور بات یاد آئی۔ عالمگیر کے منشی افضل کے گم ہونے کا گاؤں میں بڑا چرچا ہے۔ اسے زور شور سے ڈھونڈا جا رہا ہے لیکن لوگوں کو پتا ناہیں کہ اب وہ ڈھونڈنے سے ناہیں ملے گا۔ اس کے بارے میں رنگ برنگی کہانیاں بنائی جا رہی ہیں......“

”چلیں ٹھیک ہے۔ میں پھر کال کروں گا اور تفصیل سے بات کریں گے۔“

”تم سے ملنے کو بہت دل چاہت ہے۔ میں تو سمجھت ہوں کہ تم میں پہلوانی کا بہت سا ہنر چھپا ہوا ہے۔ وہاں سجاول کے ڈیرے پر تم نے جس طرح سجاول سے ہتھ جوڑی کی، وہ کوئی بھولنے والی بات ناہیں ہے۔ ابھی تو مجھے زیادہ وقت ناہیں ملا۔ بس دو چار داؤ ہی میں تمہیں بتا سکا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر دو چار ہفتے ہمیں اکٹھے مل جائیں تو تم اچھے اچھوں کو لمبا لٹا سکت ہو۔“

پہلوان سے بات ختم کرنے کے بعد میں پھر سوچ میں ڈوب گیا۔ ابھی میری تسلی نہیں ہوئی تھی۔ میں زینب کے حوالے سے مزید جاننا چاہتا تھا۔ اس سلسلے میں داؤد بھاؤ سے زیادہ کون میری مدد کر سکتا تھا۔ میں نے داؤد بھاؤ سے فون ملانے کا سوچا اس سے پہلے دو تین مرتبہ میں اس سوچ کو عملی جامہ پہناتے پہناتے رہ گیا تھا۔ ایک بار کال کی تھی تو

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

پتا چلا تھا کہ آج کل وہ زیرِ زمین ہے۔ میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے داؤد بھاؤ کا نمبر ملایا۔ اتفاق تھا کہ پہلی ہی بیل پر داؤد بھاؤ کی بارعب آواز کانوں سے ٹکرائی۔ ”ہالو، کون بول رہا ہے؟“

”آپ کا خادم، شاہ زیب عرض کر رہا ہوں۔“

داؤد بھاؤ کی خوشی دیدنی تھی لیکن میں چونکہ اسے دیکھ نہیں سکتا تھا اس لیے اس خوشی کو شنیدنی کہنا چاہیے۔ اس نے میرا حال احوال پوچھا اور ایک ساتھ کئی سوال جڑ دیے۔ میں کہاں ہوں...... سردار سجاول نام کا جو بندہ میرے پیش پڑا ہوا ہے وہ کس باغ کی مولی ہے اور یہ مولی کتنی کڑوی یا میٹھی ہے۔ چاند گڑھی کی لڑکیوں والے معاملے کا کیا ہوا...... اور ان کو زہر دیے جانے کا کیا قصہ ہے وغیرہ وغیرہ......؟

میں نے کہا۔ ”داؤد بھاؤ، اتنے سوالوں کے جواب دوں گا تو میرا بیلنس ختم ہو جائے گا اور آپ کا دماغ بھی پلپلا ہونا شروع ہو جائے گا۔ یہ ساری باتیں میں آپ کو بعد میں بتاؤں گا اور پوری تفصیل سے بتاؤں گا۔ یہ تو آپ کو انیق سے پتا چل ہی گیا ہوگا کہ ہم اس وقت لیہ کے قریب ایک خاص جگہ پر موجود ہیں۔ میں کچھ باتیں جاننا چاہ رہا ہوں جو یہاں رہ کر نہیں جان سکتا۔ ان میں سے ایک بات اس لڑکی زینب کے حوالے سے ہے جس کا ذکر انیق نے بھی آپ سے کیا تھا۔ وہ اسلام آباد کے جس اسپتال میں ہے، اس کا بھی آپ کو پتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ اپنے کسی خاص بندے کو جو اسلام آباد میں ہی رہتا ہو، اسپتال میں بھیجیں اور زینب کی خیر خیریت کا پتا کریں۔“

وہ بولا۔ ”میں پتا بھی کراتا ہوں اور اگر سیکیورٹی کا پرابلم ہے تو اپنے دو چار بندے بھی لگا دیتا ہوں۔“

میں نے کہا۔ ”اتنا تو پتا چلا ہے کہ دو پولیس والے وہاں ڈیوٹی دے رہے ہیں۔“

اس نے پولیس والوں کے بارے میں نازیبا الفاظ استعمال کیے اور بولا۔ ”یہ ڈیوٹی وغیرہ کہاں دیتے ہیں۔ یہ تو اپنی والدہ کی برات پر تشریف لاتے ہیں اور کھا پی کر آرام کرتے ہیں۔ کوئی حملہ وغیرہ ہو جائے تو ان کی رائفلیں جام ہو جاتی ہیں۔“

”لیکن سب تو ایسے نہیں ہوتے۔ کچھ اپنی روزی حلال بھی تو کرتے ہیں۔“

”پاکستان آتے ساتھ ہی تم نے ان لوگوں کو بھگتا تھا، پھر بھی ان کے وکیل بن رہے ہو۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو۔ میں ابھی اسلام آباد میں اپنے بندے کو کال کرتا ہوں۔“

”بہت شکریہ، میں دوبارہ فون کروں گا۔“

لیکن میرے دوبارہ فون کرنے کی نوبت نہیں آئی۔ ابھی دس منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ میرے سیل فون کا میوزک بج اٹھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ کال داؤد بھاؤ کی طرف سے ہی ہے۔ داؤد بھاؤ کی نوخیز محبوبہ روبی کی شیریں آواز میرے کانوں میں پڑی۔ ”ہیلو، بھاؤ آپ سے بات کرنا چاہیں گے۔“

”ہاں، کراؤ بات۔“ میں نے کہا۔

روبی نے میری آواز نہیں پہچانی تھی ورنہ کئی سوالات کرتی۔ وہ یقیناً داؤد بھاؤ کے اسی لاہور والے...... زیرِ زمین ٹھکانے سے بول رہی تھی جس کے اوپر ایک بہت بڑا اسنوکر کلب تھا۔ اسنوکر کلب کے نیچے باکسنگ اور مارشل آرٹ کے خونی مقابلے ہوتے تھے۔ ایسے ہی ایک مقابلے میں، میں نے بھاؤ کے اہم باکسر لودھی کو ناکوں چنے چبوائے تھے۔ بھاؤ نے لائن پر آنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی، وہ بولا تو اس کے لہجے میں گہری تشویش جھلک دکھاتی تھی۔ کہنے لگا۔ ”شاہ زیب! تم نے لڑکی کی خیر خیریت کب دریافت کی تھی؟“

”ابھی کوئی آدھ گھنٹا پہلے میرا چاند گڑھی میں ایک بندے سے رابطہ ہوا ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ پرسوں کچھ لوگ اسپتال گئے تھے اور وہ زینب کو دیکھ کر آئے ہیں۔“

داؤد بھاؤ نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ”شاہ زیب! یہ خبر اب پرانی ہو گئی ہے، تمہیں اطلاع دینے والے بندے کو شاید پتا نہیں کہ ابھی کوئی چار گھنٹے پہلے وہاں اسلام آباد کے اسپتال میں ایک ناخوشگوار واقعہ پیش آ گیا ہے۔“

”زینب تو خیریت سے ہے؟“ میں نے چونک کر پوچھا۔

”مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ وہ خیریت سے نہیں ہے۔ وہ کڈنیپ ہو چکی ہے۔ یہ واقعہ آج شام پانچ اور ساڑھے پانچ بجے کے درمیان پیش آیا ہے۔ ہڑتال کی وجہ سے اسپتال میں سیکیورٹی کی حالت پتلی تھی۔ دو گاڑیوں پر آٹھ دس بندے آئے۔ ان میں سے چار اسپتال کے اندر گئے اور زینب کو اٹھا کر لے گئے۔ اس کی سوتیلی والدہ کافی زخمی ہوئی ہے۔ اسٹاف کے دو بندے بھی زخمی ہیں لیکن پولیس والے زخمی نہیں ہوئے۔ تمہیں کہا تھا ناں یہ لوگ اکثر موقع پر موجود نہیں پائے جاتے۔“

میرے جسم کا سارا خون میرے دماغ کو چڑھنے لگا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

آخر وہی ہوا تھا جس کا اندیشہ کئی گھنٹوں سے میرے سر میں پرُخطر دھماکے کر رہا تھا۔ میرے سامنے بیٹھا سجاول میرے چہرے سے بھانپ گیا کہ کوئی بری خبر ہے۔

''کیا ہوا شاہی؟'' اس نے پوچھا۔

میں نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''زینب کو اسپتال سے اٹھا کر لے گئے وہ لوگ۔'' اس کے بعد میں نے پھر داؤد بھاؤ سے بات جاری رکھی۔

داؤد بھاؤ نے مجھے اس واقعے کی تفصیل بتائی اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ وہ اپنے سب سے خاص بندے جھارے کو فوراً اسلام آباد بھیج رہا ہے۔ وہ مقامی پولیس کے ایک دو افسروں سے گہرے لنک رکھتا ہے۔ لڑکی کی بازیابی کے سلسلے میں وہ پولیس کے ساتھ مل کر...... اور انفرادی طور پر بھی اپنا کردار ادا کر سکتا ہے (جھارا وہی دبلا پتلا شخص تھا جسے ازراہِ تفنن اس خطاب سے نوازا گیا تھا لیکن اپنی صلاحیتوں کے اعتبار سے یہ شخص واقعی کسی جھارے یا بھولو سے کم نہیں تھا)۔

سجاول نے ذرا ستائشی نظروں سے میری طرف دیکھا اور بولا۔ ''تمہارے دماغ نے ٹھیک کام کیا ہے۔ تمہیں جو ڈر تھا، وہ سچ نکلا ہے۔''

''ہاں، یہ لوگ شاید زینب کو بھی یہاں لا رہے ہیں۔''

''حالانکہ تم کہہ رہے تھے کہ وہ ابھی تک پوری طرح اس کام کے لیے تیار نہیں ہوئی جو یہ لوگ اس سے لینا چاہتے ہیں۔''

''بالکل ایسا ہی ہے۔ عالمگیر اور پیر ولایت چاند گڑھی میں ابھی زینب پر ''کام'' کر رہے تھے کہ میں نے ان کا بھانڈا پھوڑ دیا۔ اسے کھانے میں ملا کر جو کشتہ وغیرہ دیا جا رہا تھا، وہ بھی لیبارٹری میں ٹیسٹ ہو گیا اور وہ علاج کے لیے اسپتال پہنچ گئی۔''

میری آنکھوں کے سامنے اس خفیہ خط کے مندرجات گھومنے لگے جو چاند گڑھی سے منشی افضل نے الٹے حرفوں میں لکھا تھا۔ اس خط میں زینب کا ذکر تھا اور خط کی شروعات کچھ اس طرح سے تھی۔ رٹسام بحاص پاحبِ ٹیل وہ۔

حرفوں کو سیدھا کر کے پڑھا جاتا تو مطلب تھا۔ ''ماسٹر صاحب آپ بہت لیٹ ہو۔'' آگے لکھا تھا۔ ''مجبور ہو کر خط لکھنا پڑا۔ آپ کو پتا ہی ہے میری طرف حالات زیادہ ٹھیک نہیں۔ مولوی کی بیٹی زینب اسلام آباد کے اسپتال میں ہے۔ اسے وہاں سے نکالنا آسان نہیں۔ وہ تو جب چاند گڑھی آئے تو کچھ ہو سکتا ہے۔''

کچھ مزید آگے جا کر الٹے حرفوں میں ہی لکھا تھا۔

''پرسوں بھی وردل سے فون آیا ہے۔ بڑے صاحب اب زیادہ انتظار نہیں کر سکتے۔ کم از کم ایک لڑکی تو ہمیں فوراً بھیجنی پڑے گی (تا کہ تسلی ہو) باقیوں کے لیے ٹائم مل سکتا ہے۔ تم اپنے والی لڑکی کی خوراک تھوڑی سی بڑھا دو۔ میرا خیال ہے کہ اب وہ دو تین ہفتے میں تیار ہو سکتی ہے۔''

یہ خط عالمگیر نے منشی افضل سے لکھوا کر اپنے کسی ساتھی ''ماسٹر صاحب'' کو روانہ کیا تھا۔ اس خط کے مندرجات سے فوراً پتا چل جاتا تھا کہ ان لوگوں کو بہت جلدی ہے۔ چونکہ انہوں نے موٹی رقم پکڑی ہوئی ہے اس لیے وہ وعدے کے مطابق جلد از جلد مطلوبہ لڑکیاں یہاں اس علاقے میں پارا ہاؤس تک پہنچانا چاہتے ہیں۔ لڑکیوں کی تعداد تین کے قریب معلوم ہوتی تھی۔ شاید احتیاط کے طور پر ایک لڑکی اضافی منگوائی جا رہی تھی۔ یہ لڑکیاں بہت زیادہ خوب صورت تو نہیں تھیں مگر عام شکل و صورت کی بھی نہیں تھیں۔ ان کا تعلق دینی گھرانوں سے تھا۔ یہ دینی گھرانوں والی بات اب تھوڑی بہت میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ یہاں پارا ہاؤس میں پہنچ کر ہمیں صاف پتا چلا تھا کہ اپنے رنگین مزاج باپ ''بڑے صاحب'' کے برعکس اس کے دونوں بیٹے مذہبی رجحان رکھتے ہیں اور نماز، روزے کے پابند ہیں۔ ان کی والدہ بڑی بیگم کا مزاج بھی ایسا ہی تھا اور وہ اسلامی شعائر کی پابند نظر آتی تھیں۔

''کس سوچ میں کھو گئے ہو؟'' سجاول کی آواز نے مجھے خیالوں سے چونکایا۔

''یہی کہ اگر سب کچھ ویسا ہی ہے جیسا ہم سوچ رہے ہیں تو پھر جلد ہی ہم زینب کو یہاں پارا ہاؤس میں دیکھ سکتے ہیں اور شاید......''

''کیا شاید؟''

''شاید یہ صورتِ حال اس بے چاری کے لیے بہت خطرناک ثابت ہو۔ وہ ان حالات کے لیے تیار ہی نہیں ہے جو اسے یہاں پیش آ سکتے ہیں۔ اسے وہ لوگ جلد بازی میں یہاں پہنچا رہے ہیں۔ غالباً ان دو لڑکیوں میں سے بھی صرف ایک ہی تیار ہو سکی ہے جس کو تیار کرنے کی ذمّے داری کسی ''ماسٹر صاحب'' کے پاس تھی یا تو وہ پوری طرح IMMUNE نہیں ہو سکی ہو گی یا پھر زہریلی ڈوز دینے کے دوران میں اس کے ساتھ کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی ہو گی۔ یہ لوگ بڑا خطرناک کھیل کھیل رہے ہیں۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

''میرا دماغ تو وہیں اٹکا ہوا ہے۔'' سجاول نے کہا۔
''اگر تمہارے کہنے کے مطابق وڈے صاحب کے دونوں منڈے واقعی زہریلے ہیں تو کیوں ہیں؟ یہ کوئی پیدائشی مسئلہ ہے یا انہیں بعد میں کوئی بیماری لگی ہے......''
''جہاں اتنا کچھ پتا چل گیا ہے، یہ بھی چل جائے گا۔ ایک بات تو بالکل صاف نظر آرہی ہے۔ یہ دونوں لڑکے بھلے مانس اور نیک ہیں۔ یقیناً وہ کسی عورت سے ناجائز تعلق قائم کرنے کو بھی برا سمجھتے ہوں گے۔ وہ شادی کرنا چاہتے ہیں اور یہ کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں مگر اس کے لیے جو طریقہ اختیار کیا جارہا ہے، وہ بالکل غلط اور غیر قانونی ہے۔''
''ہوسکتا ہے کہ ان لڑکوں کو بھی پتا نہ ہو کہ ان کے لیے دلہنیں کس طرح ڈھونڈی جارہی ہیں یا پھر انہیں جھوٹ سچ ملا کر بتایا گیا ہو۔''
اسی دوران میں میرے سیل فون پر پھر کال آگئی۔ یہ پہلوان حشمت ہی تھا۔ میں نے ذرا تذبذب میں رہنے کے بعد کال ریسیو کی۔ پہلوان کا سانس پھولا ہوا تھا۔ وہ بولا۔ ''شاہ زیب! غضب ہوگیا۔ مولوی جی کی بیٹی کو اسلام آباد کے اسپتال سے اغوا کرلیا گیا ہے۔ یہ خبر ابھی ابھی یہاں گاؤں میں پہنچی ہے۔ لوگ بہت پریشان ہیں۔ زینب کی دادی کو بار بار غش آرہا ہے۔ پولیس کچھ بھی نا ہیں کررہی۔ عالمگیر گاؤں سے غائب ہے۔ زیادہ تر لوگ یہی کہوت ہیں کہ اس ظلم کے پیچھے بھی عالمگیر کا ہاتھ ہے۔''
''ہاں مجھے بھی ابھی ابھی اطلاع ملی ہے۔'' میں نے کہا۔
''تم کو کوئی شک تھا؟ ابھی تھوڑی دیر پہلے تم نے اس کی خیر خیریت پوچھی اور اب یہ خبر آگئی؟''
''بس شک ہی سمجھ لو۔''
''یہ تو بہت برا ہوا ہے۔ گاؤں میں پہلے ہی دو دھڑے بنے ہوئے ہیں۔ اگر یہ ثابت ہوگیا کہ مولوی جی کی بیٹی کے اغوا میں عالمگیر اور پیر ولایت وغیرہ کا ہاتھ ہے تو ہو سکتا ہے کہ فساد ہوجاوے۔''
''چلو، آپ ہمیں چاند گڑھی کی خبر دیتے رہنا۔ ہم بھی زینب کے سلسلے میں کوشش کررہے ہیں۔'' میں نے کہا۔
''لیکن تم......''
میں نے لائن کاٹ دی۔ مجھے پتا تھا کہ پہلوان اب پوچھے گا کہ میں اور انیق وغیرہ کہاں ہیں اور زینب کے لیے کس طرح کی کوشش کا ارادہ رکھتے ہیں۔
میرا دماغ گھن چکر بنا ہوا تھا۔ صاف پتا چلتا تھا کہ آنے والے دو تین روز میں یہاں اہم واقعات ہونے والے ہیں۔ کچھ اور نہ بھی ہوتا لیکن یہ تو یقینی تھا کہ وہ لڑکیاں یہاں پہنچ جائیں گی جن کے لیے پارا ہاؤس والوں نے عالمگیر وغیرہ کو فی لڑکی ایک کروڑ سے زائد کی رقم دینا تھی۔ ان لڑکیوں کو یہاں اس لیے لایا جارہا تھا کہ بڑے صاحب کے دونوں بیٹوں کو رشتۂ ازدواج میں منسلک کیا جاسکے۔ اپنے بیٹوں کے لیے من پسند دلہنیں لانے کے لیے بڑے صاحب ریان فردوس جیسا بندہ ایک کروڑ تو کیا کئی کروڑ خرچ کرسکتا تھا۔ پتا نہیں کیوں میرا دھیان تاجور کی طرف چلا گیا۔ وہ بے چاری بھی تو اس چکر میں پھنسنے والی تھی۔ وہ پُراسرار خط جو موذن عبدالرحیم کے ذریعے میرے ہاتھ لگا تھا اس میں تاجور کا ذکرِ خیر بھی تو موجود تھا۔ منحوس خط کا چوتھا پانچواں فقرہ تاجور کے حوالے سے ہی تھا۔ مجھے وہ الفاظ اب تک یاد تھے۔ بار وجات اک بھ چھک انرک وہ اگ...... یعنی ''اب تاجور کا بھی کچھ کرنا ہوگا......''
یہ تو تاجور کی خوش قسمتی تھی کہ وہ بروقت ساقے کے چنگل سے نکل گئی اور پھر چاند گڑھی سے ہی اپنے گھرانے سمیت اوجھل ہوگئی۔ ورنہ یہ ممکن تھا کہ اب تک پیر ولایت اور عالمگیر کے تعاون سے اسحاق اسے اپنی بیوی بنا چکا ہوتا اور وہ بیوی بننے کے باوجود کنواری رہتی اور اسے زہری ڈوز دینے کا بے ہودہ اور خطرناک کام شروع ہوچکا ہوتا یا پھر ساقے نے ہی اسے پامال کردیا ہوتا۔
جب سے میں تاجور کو اس کے والدین کے پاس چھوڑ کر آیا تھا، کئی مرتبہ اس کی سوچوں نے میرے دل و دماغ پر حملہ کیا تھا۔ میں نے سیکڑوں ہی بار اپنے سیل فون کی اسکرین پر اس امید سے نگاہ ڈالی تھی کہ شاید تاجور نے میرے لیے کوئی پیغام بھیجا ہو۔ مجھے کال کیا ہو لیکن اسکرین کی طرف اٹھنے کے بعد میری نگاہ کو ہمیشہ مایوسی ہی ملی تھی۔ میرے پاس تاجور کا نمبر نہیں تھا۔ اگر ہوتا بھی تو شاید میں خود کبھی اسے کال نہ کرتا۔ میں نے تو خود راستہ بدلا تھا۔ خود اسے اپنی دسترس سے نکالا تھا اور اسے والدین کے حوالے کرکے آیا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ میں کبھی کبھی خود کو ملامت بھی کرتا تھا کہ میری نگاہ کیوں بے ساختہ فون کی اسکرین کی طرف اٹھتی ہے؟ کیوں دل کی اتھاہ گہرائی میں کوئی انتظار سا چھپا ہوا ہے؟
کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب کسی کی یاد آتی ہے تو پھر آتی چلی جاتی ہے۔ شاید وہ رات بھی ایسی ہی تھی۔ دو دن تک جو شدید ہنگامہ جاری رہا، وہ اب ختم ہو چکا تھا۔ پارا

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

ہاؤس کی بلند و بالا دیواروں کے اندر قدرے سکون محسوس ہوتا تھا۔ پتا نہیں کیوں میرا دل چاہ رہا تھا کہ اپنے کمرے میں چلا جاؤں اور چپ چاپ لیٹ جاؤں۔ کمرے میں مجھے کافی سکون ملتا تھا۔ وہاں پرائیویسی تھی۔ میں نے اچھی طرح دیکھ لیا تھا وہاں کوئی کیمرا یا مائیکروفون وغیرہ نصب نہیں تھا۔ مہمان خانے میں صرف کامن استعمال کے کمروں میں یہ چیزیں موجود تھیں۔ میں سجاول کو وہیں بیٹھا چھوڑ کر اپنے کمرے میں آگیا۔ اب رات کے نو بج چکے تھے۔ راستے میں مجھے حلمی ملا۔ ہنگامے میں وہ خود بھی زخمی ہوا تھا اور اس کا ایک بازو گلے میں جھول رہا تھا۔ میں نے اس سے قادر خان کا احوال پوچھا۔ حلمی نے بتایا کہ اس کی حالت ابھی پوری طرح خطرے سے باہر نہیں۔ سانپ کے زہر نے اس کا خون اس قدر گاڑھا کر دیا ہے کہ دھڑکن اور سانس کی آمدورفت پر بہت بوجھ پڑ گیا ہے۔

میں نے حلمی سے گرفتار شدہ ناقب اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں پوچھا۔ حلمی سے معلوم ہوا کہ اب ان لوگوں کو تھانے بھیج دیا گیا ہے اور صبح قانون کے مطابق انہیں عدالت میں پیش کیا جائے گا۔

میں کمرے میں داخل ہوا تو انیق پہلے سے آکر ڈبل بیڈ پر لیٹ چکا تھا.... میں سمجھا کہ سجاول سے جھاڑ کھانے کے بعد وہ ذرا بدمزہ ہوا ہے۔ میں نے کمبل کے اوپر سے ہی اس کے کولہوں پر چپت لگائی۔ ایک دم مجھے لگا کہ یہ چپت کسی مرد کو نہیں عورت کو لگی ہے۔ ساتھ ہی مجھے نسوانی کراہ سنائی دی۔ کمبل ہٹا اور جاناں اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کے بال کھلے تھے اور وہ سلیپنگ گاؤن میں تھی۔ میں ششدر رہ گیا۔

''تم یہاں؟''

''اتنے حیران کیوں ہو رہے ہو۔ پارا ہاؤس والوں کو تو یہی پتا ہے کہ میں آپ کی بیوی ہوں۔''

''تم یہاں پہنچیں کیسے؟''

''یہ لوگ بہت مہمان نواز ہیں...... اور سمجھدار بھی۔ وہ جانتے ہیں کہ اگر تمہیں یہاں پارا ہاؤس میں مہمان رکھیں گے تو مجھے بھی تمہارے ساتھ رہنا ہوگا۔'' وہ آنکھیں مٹکا کر بولی۔

''اور وہ جو بنگلے میں تمہاری ڈیوٹی لگی ہوئی تھی آقا جان کی بیگم کو انگلش ناول سنانے کی اور ٹانگیں دبانے کی؟''

وہ ادا سے بولی۔ ''مجھے یاد تو نہیں لیکن میں نے زندگی میں کوئی نہ کوئی نیکی ایسی ضرور کی ہوگی جو میرے کام آگئی ہے اور مجھے اس ہوتنی کی ٹانگیں...... دن رات دبانے کی سزا سے چھٹکارا مل گیا ہے۔''

وہ میرے دونوں ہاتھ پکڑ کر بیٹھ گئی اور کندھے سے کندھا ملا دیا۔ یہاں آنے کے بعد وہ بنگلے میں ایک رات میرے ساتھ رہی تھی۔ اس رات کے بعد سے وہ کچھ زیادہ ہی بے تکلف ہو چکی تھی اور وقت بے وقت بھرپور دخل اندازی کر رہی تھی۔ لیکن اس وقت میرا موڈ بھی بہت ابتر تھا۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ زینب کے اغوا کی خبر ملی تھی اور اس خبر کے ساتھ ساتھ تاجور کی یاد بھی بھڑا مار کر ذہن کے نہاں خانوں میں چکرانے لگی تھی۔

وہ میرے کندھے سے سر ٹکاتے ہوئے بولی۔ ''پتا نہیں کہ آپ یقین کریں گے یا نہیں، پچھلے دو روز میں آپ کے لیے بے حد پریشان رہی ہوں۔ یہاں ہونے والی فائرنگ کی آوازیں بنگلے تک صاف پہنچ رہی تھیں۔ اتنی زیادہ فائرنگ تھی کہ لگتا تھا کہیں دو فوجوں میں لڑائی چھڑ گئی ہے۔ اگر آپ کو کچھ ہو جاتا تو پتا نہیں میرا کیا بنتا۔''

اس نے اپنی سانسوں سے میری گردن کو گدگدانا چاہا لیکن میرے سینے میں تو دھواں سا بھرا ہوا تھا۔ میں نے اسے دھکیل کر پیچھے ہٹا دیا۔ ''میں سونا چاہتا ہوں۔'' میں نے بیزاری سے کہا۔

وہ شکوہ کناں نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ بے بی پنک کلر کے سلکی گاؤن میں سے اس کا جسم پھوٹا پڑ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد مسکرا کر بولی۔ ''آپ سونا چاہتے ہیں...... اور سونا چاندی دونوں آپ کے پاس ہیں۔'' انداز معنی خیز تھا۔

میں نے کہا۔ ''جاناں، بہتر ہے کہ تم دوسرے کمرے میں جا کر سو جاؤ اور اگر اِدھر ہی سونا ہے تو خاموشی سے پڑی رہو۔''

وہ بدستور شوخ اور رومانی موڈ میں رہی۔ ''دیکھ لیں آپ زیادتی کر رہے ہیں۔ حالانکہ آپ جانتے ہیں کہ میں آپ کے ایک اہم راز کی امین ہوں۔ اگر زبان کھول دی تو آپ کو مصیبت پڑ جائے گی۔''

''کس راز کی بات کر رہی ہو؟''

وہ نشیلی نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی، پھر زیرِلب مسکرا کر بولی۔ ''ناراض نہ ہو جانا لیکن یہ بات تو آپ بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ پچھلے کچھ عرصے میں چاند گڑھی میں ''یاسر بھائی'' نے جو کارروائیاں کیں وہ دراصل آپ نے ہی کی تھیں۔ ان میں ایک کارروائی وہ بھی تھی جس میں آپ نے میری جان بچائی، اور ایک کارروائی وہ بھی تھی جس میں آپ نے اصلی یاسر کی بہن کو بچاتے ہوئے سردار

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

سجاول کے پانچ چھ آدمیوں کو......'' اس نے معنی خیز انداز میں بات ادھوری چھوڑ دی۔

وہ اس واقعے کی طرف اشارہ کر رہی تھی جب باغ پور گاؤں میں سجاول کے لوگوں نے یاسر بھائی کی بہن کو اغوا کرنے کی کوشش کی تھی اور ایک زوردار جھڑپ میں، میں نے اس کے پانچ بندوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ ایک بعد میں مر گیا تھا۔ اس جھڑپ کے وقت بھی میں نے اپنا چہرہ مخصوص ڈھاٹے میں چھپا رکھا تھا۔

ایک دم میرا دماغ جیسے تڑخ گیا۔ جاناں ڈھکے چھپے الفاظ میں مجھے بلیک میل کر رہی تھی۔ اس کی بات کا مطلب یہی تھا کہ وہ سجاول کو یہ بتا سکتی ہے کہ باغ پور میں اس کے بندوں کو ہلاک کرنے والا میں ہی تھا۔ بے شک جاناں نے یہ بات پوری سنجیدگی سے نہیں کہی تھی مگر اس وقت میرا موڈ کچھ ایسا ہو رہا تھا کہ مجھے طیش آ گیا۔ مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ یہ کیسے ہو گیا۔ میرا ایک زوردار تھپڑ جاناں کے گال پر پڑا اور وہ بستر سے گرتے گرتے بچی۔

میں نے اسے کندھے کے پاس سے، بازو سے پکڑا اور دروازے کی طرف کھینچا۔ ''جاؤ......تم ابھی جاؤ...... ابھی جا کر سجاول کو بتاؤ یہ سب کچھ اور اس کے علاوہ بھی جو تمہارا دل چاہتا ہے، بک دو۔''

وہ بھونچکی رہ گئی تھی۔ اس نے دروازے کی چوکھٹ پکڑ لی تا کہ میں اسے کمرے سے باہر نہ نکال سکوں۔ میں نے اس کے ہاتھ چوکھٹ سے چھڑائے تو اس نے دوسری جانب کی چوکھٹ تھام لی۔ میں نے اسے ایک دھکا دے کر پیچھے ہٹا دیا۔ وہ کمرے کے اندر ہی صوفے پر جا گری۔ میں نے کرخت لہجے میں کہا۔ ''میں اسی لائق ہوں کہ تم مجھے بلیک میل کرو۔ شاید وہ وقت تم بھول گئی ہو جب سجاول کے ڈشکرے تمہیں اور پہلوان کو پکڑ کر ڈیرے پر لے آئے تھے۔ وہ شرابی اعظم اور اس کا ساتھی نوچ کر کھا جانا چاہتے تھے تمہیں۔ یہ مجھے پتا ہے کہ میں نے کتنے حیلوں سے تمہاری جان چھڑائی۔ اور اب تم مجھے بلیک میل کرو گی۔ تو ٹھیک ہے کرو۔ کرا دو میری جنگ سجاول وغیرہ کے ساتھ۔'' میں نے زور سے دروازہ بند کر دیا۔ وہ کمرے کے اندر صوفے پر گٹھڑی سی بن کر بیٹھ گئی۔ اپنا سر اپنے اوپر اٹھے ہوئے گھٹنوں پر رکھ دیا اور رونے لگی۔ میں بستر پر آ کر لیٹ گیا۔ دماغ میں سنسناہٹ تھی۔ وال کلاک کی ٹک ٹک جیسے دماغ پر ہتھوڑے برسا رہی تھی...... نائٹ بلب کی مدھم روشنی بھی زہر لگ رہی تھی۔ میں نے بلب بھی آف کر دیا اور کمبل اوڑھ کر لیٹ گیا۔

قریباً آدھ گھنٹے بعد مجھے اپنے بالکل پاس سے جاناں کی ہلکی سی آواز آئی۔ ''مجھے معاف کر دیں شاہ زیب۔ میرا مطلب یہ نہیں تھا...... میں نے تو یونہی ایک بات کہہ دی تھی۔ مجھے پتا نہیں تھا آپ کو ایسے غصہ آ جائے گا۔''

میں اسی طرح لیٹا رہا۔ اس نے ہولے سے میرا کندھا ہلایا...... میں نے کمبل چہرے سے ہٹا کر ٹیبل لیمپ روشن کیا۔ اس کے بال منتشر تھے۔ چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔ اس نے ملتجی لہجے میں ایک بار پھر سوری کہا۔ اس نے انگلیاں میرے کندھے میں گاڑ رکھی تھیں جیسے اس کندھے کو ہی اپنا واحد سہارا سمجھ رہی ہو۔

''چلو ٹھیک ہے۔'' میں نے بھاری آواز میں کہا۔ ''آئندہ مذاق میں بھی اس طرح کی بات نہیں کہنا، خاص طور سے یہاں پارا ہاؤس میں۔ تم جانتی ہی ہو۔ یہاں دیواروں کے بھی کان ہیں۔''

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور تکیہ کمبل وغیرہ پکڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ قالین پر سونا چاہ رہی تھی۔ میں نے کہا۔ ''نہیں، ادھر ہی سو جاؤ۔''

چند لمحے ہچکچانے کے بعد اس نے تکیہ دوبارہ اس کی جگہ پر رکھ دیا۔ پتا نہیں رات کا کون سا پہر تھا۔ غنودگی میں جسم سے جسم ٹکرایا۔ میں نے اپنے ہاتھوں پر اس کے ہاتھوں کا لمس محسوس کیا۔ سانس سے سانس الجھی اور میرے اندر پھیلا ہوا بیکراں صحرا پانی کا طلب گار رہا۔ پتا نہیں وہ پانی تھا یا سراب۔ حقیقت تھی یا دھوکا۔ لیکن جو کچھ بھی تھا عارضی طور پر مجھے اپنے بے پناہ درد سے بہت دور لے گیا۔

......صبح ایک بار پھر مجھ پر وہی ندامت طاری تھی جس کا تجربہ مجھے چند بار پہلے بھی ہو چکا تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ کوئی میرا راستہ روکے کھڑا ہے۔ مجھ سے پوچھ رہا ہے، تمہارا یہ چلن کیوں ہے؟ تمہارے یہ اطوار کس لیے ہیں؟ اور وہ جو میرا راستہ روکے کھڑا تھا میں اس کے سامنے خود کو جواب دہ سمجھتا تھا۔ میرا دل کہتا تھا کہ اس کا حق ہے، مجھ سے یہ سب پوچھے۔ میں کیوں الکحل سے دل بہلاتا ہوں، میں کیوں زلفوں کی چھاؤں ڈھونڈتا ہوں؟ اور یہ کون تھا؟ یا یہ کون تھی؟ یہ وہی تھی جو ہمیشہ سے میرے دل میں موجود تھی۔ میں جب یورپ کی بے پناہ روشنیوں میں رہتا تھا، اس وقت بھی پنجاب کے کسی کھیت کی شبیہ میرے ذہن میں ابھرتی تھی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

سرسوں کے زرد پھولوں میں کھڑی وہ مجھے دیکھتی تھی، مسکراتی تھی۔ مجھ سے خاموشی کی زبان میں پوچھتی تھی تم کب آؤ گے؟ کب مجھ سے بات کرو گے؟ لیکن جب میں آیا تھا۔ میں اس سے ملا تھا۔ میں نے اس سے بات کی تھی تو وہ چپ ہوگئی تھی۔ اس نے منہ پھیر لیا تھا۔ کیا یہ صرف اس کی کوئی ادا تھی یا پھر میں ہی غلط تھا۔ مجھے ہی دھوکا ہوا تھا کہ وہ سنہری دھوپ میں، سرسوں کے زرد پھولوں میں کھڑی مجھے بلاتی ہے...... شاید مجھے ہی دھوکا ہوا تھا۔

سینے میں دھواں سا پھیلنے لگا۔ آنکھوں کے کنارے جلنے لگے۔ میں نے الماری سے بیئر نکالی اور اس کے دو گلاس خالی کر دیے۔ یوں لگا جیسے دماغ میں دہکتے ہوئے انگارے کچھ ماند پڑ رہے ہیں۔ میں نے کمرے کی کھڑکی کھولی۔ سورج کافی اوپر آ گیا تھا۔ دس بج رہے تھے۔ پارا ہاؤس کی بلند باؤنڈری سے آگے نئی تعمیر ہونے والی عمارت کی چھت کے کنگرے دکھائی دے رہے تھے۔ اس نئے عالیشان محل کی تعمیر آخری مراحل میں تھی۔ جہاں بڑے صاحب کے دونوں بیٹوں کے لیے علیحدہ علیحدہ پورشن بنائے جا رہے تھے۔ درجنوں مزدور چھت پر کام کرتے دکھائی دیتے تھے۔ کنکریٹ مکس کرنے والی مشینوں کی مدھم گڑگڑاہٹ پارا ہاؤس کے اندر تک پہنچتی تھی۔ ابھی اس بلڈنگ کی تزئین و آرائش مکمل ہونے میں شاید تین چار ماہ مزید لگنے تھے مگر دونوں بھائیوں کی شادی ابھی ہو رہی تھی۔ غالباً دو تین ہفتے کے اندر ہی۔ پتا نہیں ایسی کیا جلدی پڑ گئی تھی۔ یہ دو تین ہفتوں کی تاخیر بھی شاید اس لیے کی جا رہی تھی کہ تین دن پہلے پارا ہاؤس میں ایک خونی ہنگامہ در و دیوار کو لرزا چکا تھا۔ نئی بلڈنگ میں تو کام ہو ہی رہا تھا، پارا ہاؤس میں بھی کاریگر لگے ہوئے تھے۔ شدید ہنگامے میں دیواروں پر گولیوں کے بے شمار نشان آئے تھے انہیں ختم کیا جا رہا تھا۔ ٹوٹے ہوئے شیشوں کی جگہ نئے شیشے لگ رہے تھے۔ اسی دوران میں ایک پورشے گاڑی ڈرائیو وے سے گزری۔ عقبی نشست پر پارا ہاؤس کا کرتا دھرتا ''بڑا صاحب'' بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے کے سرخ داغ نمایاں نظر آتے تھے اور ہونٹوں میں سگار دبا ہوا تھا۔ وہ عام طور پر بالکل ساکت و جامد بیٹھتا تھا، جیسے بہت سکون کی حالت میں ہو۔ اس کے اس طرح بیٹھنے سے مجھے اپنا، سانپوں والی کھوہ میں بیٹھنا یاد آ گیا...... وہ جاگتی آنکھوں کا خواب لگتا تھا۔ کوئی نصف درجن سانپ میرے جسم پر چڑھائی کر چکے تھے۔ میں ساکت جامد اور پُرسکون نہ رہتا تو شاید اب تک قبر میں اتر چکا ہوتا۔ وہ نہ بھولنے والی گھڑیاں تھیں۔

اچانک میں ٹھٹک گیا۔ مجھے سجاول کے ساتھ بڑے صاحب کا دست راست حلمی نظر آیا۔ دونوں گفتگو کرتے ہوئے پھولوں کی ایک وسیع و عریض کیاری کے ساتھ ساتھ چلتے جا رہے تھے۔ گلاب کے پھولوں کی ایسی بے شمار کیاریاں اور تختے پارا ہاؤس میں موجود تھے اور ان سے بڑے صاحب کے ذوق اور خوشبو پسندی کا پتا چلتا تھا۔ سجاول اور حلمی کے درمیان پتا نہیں کیا راز و نیاز ہو رہا تھا۔

انیق، سجاول کی طرف سے مطمئن نہیں تھا۔ وہ اکثر یہ بات کہتا تھا کہ یہ چونا لگانے والا بندہ ہے۔ ہوسکتا ہے کہ پورا پورا انڈین ولن امریش پوری بن جائے۔ ہم یہاں لٹکے رہ جائیں اور یہ بڑے صاحب کو کوئی بہت بڑا ٹیکا لگا کر چمپت ہو جائے۔ میں، انیق کو ایسی باتوں پر جھاڑ دیتا تھا لیکن اندر سے مجھے بھی معلوم تھا کہ سجاول سے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔

کچھ دیر بعد وہ کمرے میں واپس آیا تو مجھے بیدار دیکھ کر چونکا۔ ''ہاں بھئی شاہی...... تمہارا وہ تکو شہزادہ آج دوسرے کمرے میں سو رہا تھا۔ کیا جھگڑا ہو گیا؟''

میں نے کہا۔ ''اتنے بھولے مت بنو، تم سب جانتے ہو۔ یہ بلا تم نے ہی میرے پیچھے لگائی ہے۔''

''شاید تم جاناں کی بات کر رہے ہو لیکن وہ تو بنگلے میں آقا جان کی زنانی کی مٹھی چاپی کر رہی تھی اور اس کو کتابیں پڑھ کر سنا رہی تھی؟''

''لیکن اب وہ یہاں پارا ہاؤس میں ہے۔ یہ بڑا صاحب ہمارا پورا پورا میزبان بنا ہوا ہے۔''

''چلو تمہاری راتیں چنگی گزر جائیں گی۔'' وہ آنکھ دبا کر بولا۔ ''اور وہ جو تمہارے پیٹ میں عشق کے مروڑ اٹھتے تھے وہ بھی ذرا کم ہو جائیں گے...... بلکہ کم ہونا شروع ہو گئے ہوں گے۔ میں نے تمہیں بتایا تھا ناں کہ یہ زنانیاں تو بس وقت گزاری کے لیے ہونی چاہئیں...... وہ کیا کہتے ہیں...... تو نہیں ہور سہی...... ہور نہیں ہور سہی۔''

میرے سینے میں شعلے بھڑک گئے۔ یہ دوسری، تیسری بار تھی کہ سجاول نے ایسی بات کہی تھی۔ جو بھی تھا، میں تاجور کے خلاف کچھ سن نہیں سکتا تھا۔ میں نے سجاول کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''سجاول...... یہ کیا بات کہہ رہے ہو تم؟''

میں نے بالکل عام سے الفاظ کہے تھے لیکن ان عام الفاظ اور عام لب و لہجے کے پیچھے جو آگ تھی، اس کو سجاول نے فوراً محسوس کر لیا۔ وہ جو کچھ بھی تھا بلا کا معاملہ فہم اور رمز شناس تھا۔ اس نے ایک دم دفاعی لہجہ اختیار کیا اور بولا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

"اچھا، چلو بھول ہوگئی۔ اب یہ بات نہیں کروں گا لیکن تم بھی کبھی کسی سے یہ بات نہ کرنا..... کبھی بھی..... میرا مطلب ہے کہ تاجور کی بات......"

"کیا کہنا چاہتے ہو؟" میں نے گمبھیر آواز میں پوچھا۔

"تاجور کو تم خود اس کی مرضی کی جگہ پر چھوڑ کر آئے ہو لیکن اس کے منگیتر ساقے اور عالمگیر وغیرہ کو ہم نے یہی بتایا ہے کہ وہ ڈیرے سے خود ہی کہیں بھاگ گئی تھی۔ تمہاری خاطر اتنا بڑا جھوٹ بولنا پڑا مجھے۔ اب اگر کبھی یہ راز فاش ہوا تو عالمگیر مجھے قتل کر دے گا یا میں اُسے......"

"میں اس کی بات کیوں کروں گا؟ مجھے اس کی زندگی چاہیے...... اس کی عزت چاہیے۔ ہاں...... کبھی تم بھی اپنے دماغ میں کوئی فتور نہ لانا...... ورنہ بہت کچھ ختم ہو جائے گا۔"

میرا لہجہ ایک بار پھر آتش بار ہو گیا تھا۔

وہ دوستانہ انداز میں بولا۔ "وہ سوہنی زنانی ہے۔ یہ ساقا اور عالمگیر اتنی جلدی اس کا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔ جگہ جگہ اس کو ڈھونڈیں گے۔ میں تو کہتا ہوں کہ اگر تمہارے بس میں ہے تو جلدی اس کی شادی کرا دو...... ایک دو بچے پیدا کر لے گی تو معاملہ ٹھنڈا ہو جائے گا۔"

سجاول کی گفتگو کا انداز مجھے چبھتا دیتا تھا۔ میں نے کہا۔ "تمہیں ایسی فکروں میں دبلے ہونے کی ضرورت نہیں اور اس موضوع پر ہم بات نہ ہی کیا کریں تو ٹھیک ہے۔"

اس نے ایک دم موضوع بدلا۔ سگریٹ سلگا کر بولا۔ "ابھی تھوڑی دیر پہلے حلمی صاحب سے میری بات چیت ہوئی ہے، ایک نئی گل کا پتا چلا ہے۔"

میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ساتھ ساتھ میں اپنا ٹیش دبا رہا تھا۔ سجاول نے کہا۔ "یہ بڑا صاحب چاہتا تھا کہ پہلے یہ دوسری بلڈنگ مکمل ہو جائے...... بالکل ریڈی ہو جائے اس کے بعد دونوں بیٹوں کی شادیاں کر کے ان کو علیحدہ علیحدہ حصے میں بھیج دیا جائے۔ پر اس کام میں کم از کم چھ سات مہینے اور لگنے تھے اور ہو سکتا ہے کہ زیادہ لگ جاتے۔ لڑکوں کی ماں چاہتی ہے کہ یہ شادیاں جلد ہوں، خود لڑکوں کا خیال بھی یہی ہے۔ بڑا لڑکا تو آج سے تین سال پہلے ہی لٹھ لے کر باپ کے پیچھے تھا کہ میری شادی کرو۔ شادی ہوئی اور بیوی بھی مر گئی۔ اب اس کے سر پر پھر سہرا باندھا جا رہا ہے۔"

"بات کچھ کچھ میری سمجھ میں آ رہی ہے۔ یہ دونوں لڑکے مذہبی ذہن کے ہیں اور ماں بھی ایسی ہی ہے بلکہ لڑکوں سے بھی بڑھ کر ہے۔ وہ اپنے بچوں کو باپ کے اثر اور آس پاس کی بے شمار برائیوں سے بچانا چاہتی ہے۔ اس کی خواہش ہے کہ اسلامی تعلیم کے مطابق جلد از جلد بچوں کے نکاح ہوں۔"

"مگر وہ یہ نہیں جانتی کہ دونوں کے نکاح کے لیے کیا کچھ ہو رہا ہے؟"

"ہاں، یہ تو ہے۔ جن لوگوں کے ذمے یہ کام لگایا گیا ہے کہ وہ ان لڑکوں کے لیے دلہنیں ڈھونڈیں، وہ یہ کام اپنے طور طریقے سے کر رہے ہیں۔"

"بات پھر وہیں پر آ جاتی ہے۔" سجاول نے کہا۔ "یہ لڑکے ایسے کیوں ہیں کہ ان کے لیے ایسی خاص دلہنیں ڈھونڈنی پڑ رہی ہیں۔ اگر واقعی کوئی ایسی بات ہے کہ یہ...... زہریلے ہیں تو پھر کیوں؟ اور کیسے؟"

کچھ دیر خاموش رہ کر وہ بولا۔ "یہ آقا جان اور حلمی وغیرہ اس فیملی کے خاص الخاص نوکروں میں سے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اس بارے میں کچھ جانتے ہوں۔"

"پتا نہیں کیوں، مجھے ایسا نہیں لگتا۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ اس فیملی کا بالکل اندرونی معاملہ ہے اور اسے ان لوگوں نے بس اور بس اپنے تک ہی رکھا ہوا ہے۔"

"آزمانے میں کیا حرج ہے؟" سجاول نے مونچھوں کو ہلکا سا بل دے کر کہا۔ (وہ آقا جان یا حلمی پر ہاتھ ڈالنے کی بات کر رہا تھا)

"حرج تو ہے۔ ہمارا سارا کھیل خراب ہو سکتا ہے۔ ہاں ایک بات ذہن میں آتی ہے۔ یہ جو لوگ برونائی سے بڑے صاحب کے پیچھے آئے ہیں، یہ ضرور اصل کہانی جانتے ہوں گے۔ میرا مطلب ہے، ناقب اور اس کے ساتھی۔"

"مگر وہ تو اب پولیس کے حوالے ہیں۔"

"مجھے نہیں لگتا۔" میں نے کہا۔

سجاول نے میری آنکھوں میں دیکھا اور اس کی چوڑی پیشانی پر سوچ کی لکیریں نمودار ہوئیں۔ وہ بولا۔ "تمہاری یہ بات میرے دماغ میں بھی آتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ناقب وغیرہ کو پولیس کے حوالے نہ کیا گیا ہو اور یہیں کہیں پارا ہاؤس میں بند رکھا گیا ہو یا پھر ویسے ہی کہیں مار کر گاڑ دیا گیا ہو۔"

"کسی طرح ناقب وغیرہ کی ٹوہ لگائی جانی چاہیے۔" میں نے کہا۔

"اپنے نکو شہزادے سے کہو۔ ٹھیک ٹھاک مسخرہ ہے۔ لوگوں میں بہت جلد گھل مل جاتا ہے۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

''ہاں اسے بھی کہا جا سکتا ہے...... اور...... وہ جو تمہاری سوہنی کڑی ہے۔ وہ کوئی کام نہیں دے رہی؟'' میرا اشارہ سنبل کی طرف تھا (وہ بڑے صاحب کی منظورِ نظر بنی تھی اور بڑی چاہت سے یہاں لائی گئی تھی)

سجاول بولا۔ ''وہ اتنی جوگی نہیں ہے۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ اپنے اردگرد نظر رکھے لیکن کوئی بہت زیادہ کام کی بات ابھی تک وہ نہیں بتا سکی۔ حالانکہ وہ اس رہائشی حصے کے اندر ہے جہاں یہ ٹبر (خاندان) رہتا ہے۔ سب کچھ اس کھوتی کے سامنے ہے۔ آج کل بڑے صاحب کے ساتھ سو رہی ہے۔ کافی وقت گزار رہی ہے اس بڈھے گکڑ کے ساتھ۔''

''کافی مال پانی بھی بنا رہی ہوگی؟'' میں نے ٹوہ لینے کے لیے سجاول سے پوچھا۔

''ہاں وڈے صاحب نے ایک ہار دیا تھا اُسے ''منہ دکھائی'' کے طور پر۔ اور کچھ دوسری چیزیں بھی۔'' سجاول نے گول مول بات کی۔

''اگر وہ اتنا مہربان ہے تو پھر سنبل کو کوشش کرنی چاہیے کہ اسے ٹٹولے۔''

''کہا ہے نا کھوتے کی بچی ہے...... اور وہ بڈھا گکڑ ہے ایک نمبر کا کھوچل۔ ایسے لوگ حسن کے لشکارے سے اندھے تو ضرور ہو جاتے ہیں، پر اپنے مطلب کی چیزیں انہیں نظر آتی رہتی ہیں۔''

وہ ہار جس کا ذکر ابھی سجاول نے کیا تھا، میں نے پرسوں نوخیز سنبل کے گلے میں دیکھا تھا۔ وہ دو ملازماؤں کے ساتھ باغیچے میں اٹکھیلیاں کر رہی تھی۔ وہ سفید مینا بھی اس کے لیے پارا ہاؤس میں پہنچا دیا گیا تھا جو وہ بنگلے میں لیے پھرتی تھی۔ میں نے اس کے گلے کا ہار ذرا فاصلے سے دیکھا تھا۔ اس پر گہرے سبز زمرد جڑے ہوئے تھے۔ ایک موٹے سے اندازے کے مطابق وہ ہار پندرہ بیس لاکھ کا تو ہوگا۔ سجاول یہ بات بھی غلط کہہ رہا تھا کہ سنبل اندر خانے کی باتیں نہیں بتا رہی۔ وہ تو اسے لایا ہی جاسوسی کے لیے تھا۔ وہ اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق سجاول کا کام کر رہی تھی۔

''وہ دیکھو تمہارا انکو کیا کر رہا ہے۔'' سجاول نے برآمدے سے آگے گراسی لان کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ انیق ایک سنگی بینچ پر بیٹھا تھا اور ایک چھوٹے سے صاف ستھرے بندر کو اپنے ہاتھ سے مکئی کے بھٹے کھلا رہا تھا۔ بندر کبھی چھلانگ لگا کر اس کے کندھے پر چڑھ جاتا تھا، کبھی اس کے گھٹنے پر بیٹھ کر بھٹے کھانے لگتا تھا۔

سجاول نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''لگتا ہے کہ تمہارے انکو کو اپنی بچھڑی ہوئی ہمشیرہ مل گئی ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے یہ بندریا ہے؟''

''ہاں، اور میرا خیال ہے کہ یہاں پارا ہاؤس کے کسی ملازم نے ہی پالی ہوئی ہے۔ شاید ہیڈ خانساماں نے۔''

بندریا اب باقاعدہ انیق کی گود میں بیٹھ گئی تھی اور اس کی ٹھوڑی پر ہاتھ چلا رہی تھی۔ جیسے وہ حجام ہو اور اس کی شیو کرنا چاہ رہی ہو۔ انیق نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ پھر پینٹ کی پچھلی جیب سے کنگھی نکالی اور بڑی ملائمت سے بندریا کے بالوں میں پھیرنے لگا۔ غالباً اس نے دو چار جوئیں بھی نکالیں اور انہیں دونوں انگوٹھوں کے ناخنوں سے مسلا۔

سجاول نے کہا۔ ''یار! یہ تمہارا انکو ویسے ہی جھلا ہے یا جان بوجھ کر جھلا بنتا ہے۔''

''اس کا پتا تو مجھے بھی آج تک نہیں چلا...... مگر اس کے اکثر کاموں میں کوئی نہ کوئی حکمت بھی ہوتی ہے۔''

''کبھی کبھی تو بڑا تاؤ آتا ہے اس پر۔ تمہارا خیال آ جاتا ہے ورنہ ایسا جھانپڑ ماروں اس کو کہ گردن کڑک ہو جائے۔''

''ایسی غلطی نہ کرنا۔ یہ بڑے کام کا لڑکا ہے۔ تم نے ہنگامے والی رات کو دیکھ ہی لیا تھا۔ اس نے کتنی بے جگری سے ہمارا ساتھ دیا۔ دیکھنے میں عام سا لگتا ہے مگر عام ہے نہیں۔ موم نظر آتا ہے مگر وقت پڑنے پر پتھر اور فولاد کی طرح سخت بھی ہے۔''

''پتا نہیں اس کی صورت دیکھ کر کیوں مجھے تاؤ آتا ہے۔''

''اس کی صورت میں ہی تو کمال ہے، بڑی جلدی لوگوں میں گھل مل جاتا ہے۔ دوسرے بھی اس سے کوئی خطرہ محسوس نہیں کرتے۔''

گراسی لان میں بندریا اطمینان سے کنگھی کرا رہی تھی اور بھٹے کھا رہی تھی۔ اسی دوران میں ایک موٹا تازہ شخص جھومتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ ''یہی بڑا خانساماں ہے یہاں کا۔'' سجاول نے بتایا۔

وہ یقیناً برونائی ہی کا باشندہ تھا لیکن رنگ قدرے سرخ و سپید تھا۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ اور پپوٹے سوجے سوجے تھے۔ اس نے ایک نفیس گاؤن پہن رکھا تھا اور ہاتھوں پر سفید دستانے تھے جو کہنیوں تک پہنچتے تھے۔

اسے دیکھ کر انیق بڑے تپاک سے کھڑا ہو گیا۔ پھر دونوں پتھریلے بینچ پر ہی بیٹھ گئے۔ وہ اشاروں کنائیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ انیق حالانکہ مالے زبان جانتا تھا

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

لیکن وہ خانساماں پر اپنی صلاحیت ظاہر نہیں کر رہا تھا۔ اتنے میں خانساماں کے سیل فون پر کال آگئی۔ وہ کال ریسیو کرتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ بندریا جس نے فراک بھی پہن رکھا تھا جست لگ کر خانساماں کے کندھے پر چلی گئی۔ خانساماں نے انیق کو مسکرا کر دیکھا اور غالباً خدا حافظ کہتا ہوا کمروں کی طرف چلا گیا۔

کچھ دیر بعد انیق بھی ہمارے پاس پہنچ گیا۔ سجاول کو دیکھ کر اس نے نہایت برا سامنہ بنایا لیکن یہ احتیاط رکھی کہ سجاول اس برے سے منہ کو دیکھ نہ سکے۔

''ہاں، اس باندری سے کیا رشتے داری گانٹھ رہے تھے؟'' سجاول نے پوچھا۔

''آپ سے مذاق کی بات کروں گا تو آپ ناراض ہو جائیں گے۔''

''چلو نہیں ہوتا، تم بکو۔''

انیق ''بکو'' کے لفظ کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ ''یہ بے چاری اکیلی ہے۔ باپ فوت ہو چکا ہے۔ ماں ایک لنگور کے ساتھ بھاگ گئی تھی مطلب اس کی اپنی عمر شادی کی ہے۔ مجھ سے یہی کہہ رہی تھی کہ جواں باندری ہوں۔ اپنے منہ سے کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔ میرے ویاہ کی عمر نکلی جا رہی ہے۔ تم میرے لیے کوئی بر ڈھونڈنے کی کوشش کرو۔''

سجاول نے تیز تیکھے لہجے میں کہا۔ ''میلوں ٹھیلوں میں اکثر لوگ وچھڑ جاتے ہیں۔ مجھے تو لگتا ہے کہ یہ بھی تمہاری کوئی وچھڑی ہوئی ہمشیرہ ہے۔ بڑا بھائی سمجھ کر تم سے مدد مانگ رہی ہے۔''

انیق نے جواباً کوئی کراری سی بات کرنے کے لیے منہ کھولا لیکن میں نے آنکھ کے اشارے سے منع کر دیا۔ میں جانتا تھا کہ انیق کی بات پر سجاول کسی بھی وقت جتھے سے اکھڑ سکتا ہے۔

میری ہدایت پر انیق چپ رہا۔ سجاول دھیمی مگر غصیلی آواز میں بولا۔ ''یار! یہاں ہم باندروں کی جوئیں نکالنے کے لیے نہیں آئے۔ کچھ کرنا ہے ہمیں، وقت گزر جائے گا تو پھر ہاتھ لگا کر روتے رہو گے۔ نہ آگے کے رہو گے نہ پیچھے کے۔''

انیق سر کھجا کر رہ گیا۔

سجاول کا موڈ آف ہو رہا تھا۔ وہ اٹھ کر لمبے ڈگ بھرتا ہوا اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ برآمدے میں کھڑے نیلی وردی والے مسلح گارڈ نے اسے باقاعدہ سیلوٹ کیا۔ میں اور انیق مدھم آواز میں باتیں کرنے لگے۔

میں نے اس سے پوچھا۔ ''یہ کیا چکر چلاتے پھر رہے ہو؟''

''بیکار کا چکر نہیں ہے۔ خانساماں ازمیر طیب سے دوستی گانٹھی ہے میں نے۔ ایک دو بڑے کام کی باتیں معلوم ہوئی ہیں۔''

''مثلاً کیا؟''

''کل ازمیر مجھے اپنا رہائشی کوارٹر دکھانے کے لیے لے گیا۔ کہنے کو تو کوارٹر تھا لیکن دیکھنے میں چھوٹا سا ولا نظر آتا تھا۔ بعد میں ہم چھت پر چلے گئے اور کافی دیر باتیں کرتے رہے۔''

''باتیں کس طرح؟ تم تو اس سے اشاروں میں گفتگو فرما رہے تھے؟''

''تو اشاروں میں گفتگو ہوتی ہے ناجی۔ آپ نے انڈین فلم کوشش دیکھی تھی؟ سنجیو کمار اور جیا بہادری والی۔ دونوں گونگے تھے۔ ویسے اس لڑکی نے پتا نہیں کیا بہادری دکھائی ہوئی ہے کہ ہر کوئی اسے ''بہادری'' کہتا ہے۔ ٹھیک ہے ایک بہت لمبے بندے سے شادی کرنا بھی بہادری ہے لیکن......''

''تم بکواس چھوڑ کر کام کی بات کرو تو اچھا ہے۔''

اس نے اپنے سر پر ہلکا سا مکا رسید کیا۔ جیسے خود کو بکواس کرنے سے روک رہا ہو پھر مسکرا کر بولا۔ ''سوری...... میرا مطلب ہے کہ اشاروں میں بھی بندہ بہت سی باتیں کر سکتا ہے اور مجھ پر تو اشاروں اشاروں میں باقاعدہ انکشاف ہوا ہے...... اور انکشاف یہ ہے کہ کچن میں بڑے صاحب کے دونوں بیٹوں کے لیے عموماً کھانا پکتا ہے...... دراصل یہ دونوں بیٹے شراب کباب وغیرہ سے بہت دور ہیں اور بالکل سادہ کھانا کھاتے ہیں۔ دال چاول، سبزی، دلیہ وغیرہ۔''

''تو اس میں ایسا کون سا ''وکی لیکس'' والا انکشاف ہے؟''

''آپ پوری بات تو سنیں، مجھے پتا چلا ہے کہ دونوں بھائیوں کے لیے جو کھانا پکتا ہے، وہ کھانے کے وقت سے کوئی ایک گھنٹا پہلے ہی بڑی بیگم کے پاس پہنچا دیا جاتا ہے۔ بعد میں وہ کھانا دستر خوان تک پہنچتا ہے۔''

''بھئی، یہ بھی کوئی ایسی انوکھی بات نہیں ہے۔ اکثر بڑے گھرانے جن کی عداوتیں وغیرہ چل رہی ہوتی ہیں کھانے پینے میں بہت زیادہ احتیاط کرتے ہیں۔ کھانے کو پہلے چیک کیا جاتا ہے۔''

''لیکن یہاں ایک پوائنٹ اور ہے ناجی، پورے گھرانے کا کھانا چیک نہیں ہوتا۔ صرف دونوں لڑکوں، کمال احمد اور ابراہیم کا کھانا چیک ہوتا ہے اور مجھے تو ایک اور شک

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

www.paksociety.com

ہو رہا ہے شاہ زیب بھائی۔''

''کیا؟''

وہ کچھ دیر سنسنی خیز انداز میں میری طرف دیکھتا رہا پھر بولا۔ ''مجھے لگتا ہے جی کہ یہ کھانا اس لیے کچن سے نہیں نکالا جاتا کہ اسے چیک کیا جائے۔''

''تو پھر؟''

''یہ اس لیے نکالا جاتا ہے، تاکہ اس میں کچھ ملایا جائے۔''

میں حیرت سے اس کا منہ دیکھنے لگا۔ ''تمہارا مطلب ہے کہ لڑکوں کی ماں یا پھر ماں اور باپ لڑکوں کی خوراک میں کچھ ملاتے ہیں؟''

''فی الحال تو یہ ایک مفروضہ ہی ہے..... لیکن مجھے لگتا ہے کہ ایک آدھ دن تک میں کسی نتیجے پر پہنچ جاؤں گا۔''

''لیکن کرو گے کیا؟''

وہ مسکرایا۔ ''یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔''

''مگر کہیں گردن نہ پھنسا بیٹھنا۔ تم دیکھ ہی رہے ہو یہاں سیکیورٹی کتنی سخت ہے۔''

''سیکیورٹی سخت ہے تو آپ کا یہ خادم بھی نرم نہیں ہے۔ مجھ پر بھروسا رکھیں جو کروں گا احتیاط سے کروں گا۔ میری وجہ سے آپ کا کھیل بگڑے گا نہیں۔''

اسی دوران میں میرے سیل فون پر لاہور سے پھر داؤد بھاؤ کی کال آگئی۔ داؤد بھاؤ کے پاس کئی خاص نمبر تھے جو کسی بھی طرح ٹریس نہیں ہو سکتے تھے۔ داؤد بھاؤ نے بتایا کہ اس کا دستِ راست جھارا اسلام آباد میں ہے، اور لڑکی کا کھوج لگانے کی بھرپور کوشش کر رہا ہے۔ داؤد بھاؤ نے بتایا کہ انیق کی طرح وہ بھی ایک کائیاں بندہ ہے اور ہر کام کے لیے راستے نکالنا جانتا ہے۔

میں نے کہا۔ ''داؤد بھاؤ، آپ نے جو ٹینشن لی ہے اس کے لیے آپ کا بہت شکریہ..... مگر مجھے لگتا ہے کہ میں لڑکی تک پہنچنے والا ہوں۔''

''کس طرح؟''

''شاید، میں غلط کہہ گیا۔ آپ یوں کہہ لیں کہ لڑکی مجھ تک پہنچنے والی ہے۔''

''تمہاری بات سمجھ میں نہیں آرہی۔''

''آپ یوں سمجھ لیں کہ لڑکی نے اغوا ہونے کے بعد جس جگہ پہنچنا ہے، وہاں میں اور انیق پہلے سے ہی موجود ہیں۔ مجھے پچانوے فیصد امید ہے کہ زینب کو یہیں پارا ہاؤس میں لایا جائے گا۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

"یہ تو زبردست بات ہے لیکن اگر یہ اندازہ غلط ثابت ہوا تو؟"

"پھر میں دوبارہ آپ سے مدد کی درخواست کروں گا۔"

"میں ہر وقت تیار ہوں۔ کوئی جھجک محسوس نہیں کرنا۔ کہیں مارا ماری کرنی ہو تو بھی ہر طرح کی نفری موجود ہے۔" وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔

میں نے ایک بار پھر داؤد بھاؤ کا شکریہ ادا کیا۔

☆☆☆

انیق نے کہا تھا کہ ایک آدھ دن تک وہ کوئی اہم سراغ لگائے گا مگر پورے دو دن گزر گئے۔ وہ کوئی اہم بات نہیں بتا سکا۔ ہاں وہ ایک دو بار خانساماں ازمیر طیب کے ساتھ ضرور نظر آیا۔ میرے جسم پر کسی زہریلے کیڑے کے رینگنے سے جو سرخ نشان نمودار ہوئے تھے وہ اب کافی حد تک معدوم ہو گئے تھے اور میں اس حوالے سے سکون میں تھا۔ دوپہر کو میں نے دیکھا کہ انیق ازمیر کی لاڈلی بندریا کے ساتھ لان میں فٹ بال کھیل رہا ہے۔ بندریا نے باقاعدہ سویٹر اور گرم پاجامہ پہنا ہوا تھا۔ پارا ہاؤس کی اندرونی بالکونی میں چند لڑکیاں کھڑی دلچسپی سے یہ تماشا دیکھ رہی تھیں۔ ان میں زرق برق لباس والی سنبل بھی تھی جو آج کل یہاں "خاتونِ اول" بنی ہوئی تھی۔ لڑکیوں کی چہکاریں مہمان خانے تک پہنچ رہی تھیں۔

سہ پہر کو میں نے انیق سے کہا کہ وہ بندر کا تماشا ہی دکھاتا رہے گا کہ کوئی رپورٹ بھی دے گا۔

وہ بولا۔ "ابھی تک تو رپورٹ کوئی نہیں۔ دراصل میں چاہ رہا تھا کہ کسی طرح پارا ہاؤس کے کچن تک پہنچ سکوں لیکن کچھ دوسری جگہوں کی طرح کچن کی سیکیورٹی بھی بڑی سخت ہے۔ چڑیا بھی پر نہیں مار سکتی۔"

"اگر کچن تک تمہاری رسائی ہو جاتی تو پھر کیا کرتے؟"

"مجھے پتا ہے کہ آپ کے پاس ایک زبردست پن ہول کیمرا موجود ہے۔ دال کے دانے جتنا...... اسے کہیں رکھنے کی کوشش کی جا سکتی تھی۔"

"چلو، اب یہ تو نہیں ہوا۔ اب کیا کرو گے؟"

"میں اب ازمیر کو ٹٹولنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ وہ تھوڑی بہت انگریزی بول لیتا ہے۔ میں بھی ٹوٹے پھوٹے انگلش لفظ بولتا ہوں، ایک دوسرے کی بات سمجھ میں آجاتی ہے۔"

انیق کہہ تو رہا تھا لیکن اس کے لہجے سے اشارہ ملتا تھا کہ خانساماں کے ذریعے کچھ معلوم ہونے کی امید کم ہی ہے۔

میں نے انیق سے کہا۔ "تم کھل کر بتاؤ کہ چاہتے کیا ہو؟"

"بس یہی جاننا چاہ رہا ہوں کہ کسی طرح پتا چلے کہ دونوں بھائیوں کے کھانے کو علیحدہ سے کیوں لے جایا جاتا ہے اور اس کے ساتھ کیا ہوتا ہے؟"

میں نے سگریٹ سلگا کر کہا۔ "ان دو ڈھائی دنوں میں، میں نے بھی تھوڑی سی سوچ بچار کی ہے اور کچھ ہوم ورک بھی کیا ہے۔ میں تمہیں اس کا طریقہ بتاتا ہوں۔"

وہ ہمہ تن متوجہ ہو گیا۔ میں نے کہا۔ "آج کسی طرح معلوم کرو کہ رات کے کھانے میں دونوں بھائیوں کے لیے کیا پکا ہوگا۔"

"یہ تو مجھے معلوم ہے۔ یہ لوگ زیادہ چاول ہی کھاتے ہیں، آج بھی دونوں بھائیوں کے لیے سبزیوں والے چاول ہیں اسے یہ لوگ سبزی پلاؤ کہتے ہیں۔"

"کنفرم؟"

"آج کے دن کے لیے تو کنفرم ہے۔"

"چلو، یہ تو ہو گیا۔ اب شام کا انتظار فرماؤ۔"

"شام کو کیا ہوگا؟"

"شام کو سجاول کو سنبل سے ملنا ہے۔ ہم سنبل سے تھوڑا سا کام لیں گے۔"

"کس طرح؟"

"تم پہیلیاں بجھوا سکتے ہو تو اب مجھے بھی موقع دو۔"

وہ چپ ہو گیا اور سوچنے لگا۔

میں نے سنبل کی آمد سے پہلے ہی سجاول سے تفصیلی بات کر لی تھی۔ وہ شام سے کچھ دیر پہلے آگئی۔ پارا ہاؤس میں چونکہ آناً فاناً سجاول کو زبردست اہمیت حاصل ہو گئی تھی اس لیے جب وہ سرپرست کی حیثیت سے سنبل سے ملنے کی بات کرتا تھا تو یہ بات مانی جاتی تھی۔ اس نے بڑے صاحب کو بھی یہ باور کرا دیا تھا کہ سنبل کو رام رکھنے کے لیے کبھی کبھی اس کا سنبل سے ملنا بہتر ہے۔

سنبل کے ساتھ دو اسپیشل گارڈز تھے۔ وہ باہر ہی کھڑے رہے۔ سنبل اپنے زرق برق لباس کو جھلاتی ہوئی سجاول کے آرام وہ کمرے میں آگئی۔ میں بھی اس وقت وہیں موجود تھا۔ سنبل گلاب کے عطر میں بسی ہوئی تھی۔ شاید وہ رات بھر بڑے صاحب کی "رنگین مزاجی" کا ساتھ دیتی رہی تھی، کچھ مضمحل سی دکھائی دیتی تھی مگر اس کی آنکھوں سے جھلکنے والی الہڑ شوخی اب بھی لشکارا مارتی تھی۔

"کیسی گزر رہی ہے؟" سجاول نے بے باکی کے ساتھ اس سے پوچھا۔

"ٹھیک ہوں۔" وہ زیرِ لب مسکرائی۔ "مگر اس

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN

www.paksociety.com

دوسری کو بڑی آگ لگی ہوئی ہے۔''
''کون دوسری؟''
''وہی سفید پتلون اور لال جرسی والی، کیا نام ہے... پرکٹی کبوتری کا...... روحی۔''
سنبل اسی لڑکی کی بات کر رہی تھی جسے آقا جان کا آشیرباد حاصل تھی اور اس آشیرباد کے سہارے وہ چاند کی چودھویں رات کو پارا ہاؤس کے لیے منتخب ہوئی تھی۔ شاید اب وہ سنبل سے رقیبانہ جلن محسوس کر رہی تھی۔
سنبل نے بتایا کہ وہ کس طرح آتے جاتے اسے گھورتی ہے اور دوسری خواصوں کے ساتھ چہ میگوئیاں کرتی ہے۔ خواصیں وہی عورتیں تھیں جنہیں پارا ہاؤس کی مستقل رہائش نصیب ہوگئی تھی۔ وہ بڑے ٹھاٹ کے ساتھ پارا ہاؤس کے ایک علیٰحدہ پورشن میں رہتی تھیں۔ انہیں کبھی کبھار بڑے صاحب کی قربت کا موقع بھی ملتا تھا۔
سجاول نے سنبل کو سرتا پا کڑی نظروں سے گھورا۔ ''کوئی کام کی بات بھی معلوم کی ہے تونے، یا بس اس کڑی سے گھوریوں کا مقابلہ ہی کر رہی ہو؟''
''بہت سخت لوگ ہیں یہ۔ زنانہ پہرے داریاں بھی ہیں۔ سب خواصوں کو اپنی نظر میں رکھتی ہیں۔ کل ایک خواص ایک گارڈ سے باتیں کر رہی تھی۔ اس گارڈ کو پہرے داریوں نے پکڑ کر بری طرح مارا اور پھر تہ خانے کی طرف لے گئیں۔''
اس طرح کی دو چار مزید باتیں بھی سنبل نے اپنے مخصوص لب و لہجے میں بتائیں۔ باتیں کرتے ہوئے اس کے یاقوتی ہونٹوں کے اندر دانت کلیوں کی طرح چمکتے تھے اور بات سننے والا بس انہیں دیکھتا رہ جاتا تھا۔ پروگرام کے مطابق سجاول کے پاس ایک چھوٹا سا پلاس موجود تھا۔ سنبل کے گلے میں زمرد کے قیمتی پتھروں والا وہی بیش قیمت ہار نظر آ رہا تھا جو بقول سجاول اسے بڑے صاحب نے ''منہ دکھائی'' کے طور پر دیا تھا۔ سجاول نے ہار کا بغور جائزہ لیا اور پھر چھوٹے سے پلاس کی مدد سے ہار کی ایک لڑی ہار سے علیٰحدہ کرلی۔ اس کی لمبائی بمشکل تین انچ ہوگی۔ اس میں چھوٹے سائز کے بیچ یمنی موتی جڑے ہوئے تھے۔ بے شک یہ چھوٹی سی لڑی تھی مگر اس سے ہار کی موزونیت اور خوب صورتی ماند پڑ گئی۔
''یہ کیا ہے؟'' سنبل نے حیرت سے پوچھا۔
''تمہارے ہار کی یہ لڑی کہیں گر گئی ہے اور تم اسے ڈھونڈتی پھر رہی ہو۔'' سجاول نے کہا۔

''م...... میں کچھ سمجھی نہیں۔''
''میں تمہیں سمجھاتا ہوں۔'' میں نے مداخلت کی پھر آسان لفظوں میں تفصیل کے ساتھ اسے آگاہ کیا کہ اسے کیا کرنا ہے...... اور کب کرنا ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ فی الحال وہ کسی کو لڑی گم ہونے کے بارے میں نہیں بتائے گی اور اپنا دوپٹا اس طرح رکھے گی کہ کسی کی نظر ہار پر نہ پڑ سکے۔ ہم اس لڑی کو ڈھونڈنے کے بہانے ایک خاص جگہ پر جانا چاہتے ہیں۔''
''کہاں؟'' اس نے دیدے پٹپٹا کر پوچھا۔
''اس جگہ جہاں پارا ہاؤس کا کچرا پھینکا جاتا ہے۔''
''لیکن کیوں؟''
''اس کا جواب بعد میں دیں گے۔'' سجاول نے کہا۔
''فی الحال تم یہ ذہن میں رکھو کہ اگر لڑی گم ہونے کا پتا چل جائے تو تم نے بڑے صاحب سے یہی کہنا ہے کہ تم ڈر گئی تھیں، تم نے صرف مجھے بتایا تھا کہ ہار سے لڑی گم ہوگئی ہے اور میں نے تم سے کہا تھا کہ میں اسے ڈھونڈنے کی کوشش کرتا ہوں۔'' سنبل کو پوری بات سمجھا کر ہم نے واپس بھیج دیا۔ اسی دوران میں سجاول کو ''بڑے صاحب'' کا بلاوا آگیا اور وہ اس سے ملنے کے لیے چلا گیا۔ بڑا صاحب اور بڑی بیگم اسے یہاں مہمانِ خصوصی کا درجہ دے رہے تھے۔
سجاول کے جانے کے بعد انیق نے مجھ پر سوالوں کی بوچھاڑ شروع کردی۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ میرا پروگرام کیا ہے اور میں نے پچھلے دو تین دن میں کیا ہوم ورک کیا ہے؟
میں نے کہا۔ ''شہزادے! میرا ہوم ورک کچرے کے سلسلے میں ہے۔''
''ہائیں، کیا آپ کچرے کو ری سائیکل کر کے کوئی پاور پلانٹ بنانا چاہتے ہیں۔ حال ہی میں ایک انگلش فلم آئی ہے۔ اس میں......''
''ایک بے وقوف لڑکا قتل ہوگیا تھا...... اور وہ خوامخواہ بکواس کرنے کی وجہ سے قتل ہوا تھا۔'' میں نے اس کی بات کاٹ کر اس کی گردن دبوچی اور جھنجوڑ دی۔
اس نے آنکھیں الٹ دیں اور غش کھانے کی اداکاری کرنے لگا۔ ''اگر مسخری کرو گے تو میں تمہارے اور سجاول کے درمیان سے ہٹ جاؤں گا، بلکہ ابھی ہٹ رہا ہوں۔''
میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے فوراً ہاتھ پاؤں جوڑ کر مجھے بٹھایا اور سنجیدگی سے ہمہ تن متوجہ ہوگیا۔ میں نے اسے اپنے ہوم ورک کے حوالے سے بتاتے ہوئے کہا۔ ''پارا ہاؤس کے اندرونی رہائشی حصے کا کچرا نیلے رنگ کے دو یا تین بڑے

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

شاپرز میں ہوتا ہے۔ باقی کچرے کے لیے ہلکے شاپرز استعمال ہوتے ہیں۔ ان کا رنگ پیلا ہوتا ہے۔ ہر روز صبح نو بجے کے لگ بھگ یہ کچرا ایک چھوٹے لوڈر پر بار کر کے پاراہاؤس سے باہر لے جایا جاتا ہے اور کوئی دو فرلانگ دور جھاڑیوں کے ایک جھنڈ میں رکھ دیا جاتا ہے۔ بعد میں بارہ بجے کے لگ بھگ کارپوریشن کی گاڑی آتی ہے۔ وہ زیرِ تعمیر بلڈنگ کا کچرا بھی لیتی ہے، پاراہاؤس اور بنگلے کا کچرا بھی لیتی ہے اور چلی جاتی ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ پاراہاؤس کے رہائشی حصے کا کچرا جو نیلے رنگ کے دو یا تین بڑے شاپرز میں ہوتا ہے، صبح نو بجے سے بارہ بجے تک ان جھاڑیوں میں پڑا رہتا ہے۔''

''تو اس سے ہمیں کیا فائدہ ہوگا؟'' انیق نے پوچھا۔

''ہمیں یہ فائدہ ہوگا کہ ہم اس کچرے میں سے سنتبل کے ہار کا یہ گمشدہ ٹکڑا ڈھونڈ سکیں گے۔''

پہلے تو انیق کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ پھر اس نے اپنے دیدے تیزی سے دائیں بائیں گھمائے اور اس کے چہرے پر دبا دبا جوش نظر آنے لگا۔ ''آپ کا مطلب ہے کہ ہم یہ لڑی ڈھونڈنے کے بہانے اس کچرے تک جائیں گے اور وہاں پر کسی نیلے شاپر میں بچا کھچا سبزی پلاؤ ڈھونڈیں گے؟''

''شاباش...... اسی طرح دماغ استعمال کرتے رہو گے تو ایک دن ضرور تمہارا اپنا ذاتی ٹھیلا ہوگا۔ پانچ چھ ہزار کی سبزی میں سے ہزار روپیا منافع تو ضرور نکال لیا کرو گے۔''

''پلان تو آپ کا ٹھیک ہے لیکن کیا ہم مطلوبہ چاولوں تک پہنچ پائیں گے...... اور اگر پہنچ بھی گئے تو کیا اس وقت دو چار گارڈز ہمارے آس پاس نہیں ہوں گے۔ ان کی موجودگی میں ہم ''سیمپل'' کیسے اٹھا سکیں گے؟''

''ساری منفی باتیں ابھی سوچنی ہیں...... تو پھر یہ بھی سوچ لو کہ ہم آج رات سے پہلے پہلے ہی وفات پا جائیں گے اور ہمارا یہ کھوجی پلان دھرے کا دھرا رہ جائے گا۔ بھلے مانس، پازیٹو سوچا کرو۔ ابھی تمہاری شادی نہیں ہوئی، پریشان ہونے کے لیے تو ساری عمر پڑی ہے۔''

''آج بڑی فارم میں نظر آ رہے ہیں آپ...... لگتا ہے کچھ نہ کچھ مل جائے گا ہمیں۔ اگر واقعی مل گیا اور کسی طرح ہم نے ''اس چیز'' کو لاہور وغیرہ بھیج کر اس کا کیمیکل ایگزام...کرا لیا تو اہم ثبوت مل سکتا ہے۔''

سب کچھ پلان کے مطابق چل رہا تھا۔ سجاول نے رات ہی کو ہمیں ''بڑی بیگم'' سے اجازت لے دی تھی کہ ہم کل صبح پاراہاؤس سے باہر تھوڑی سی چہل قدمی کر لیں اور زیرِ تعمیر عالیشان عمارت کو نزدیک سے دیکھ لیں۔ میں اور انیق ساڑھے نو بجے کے لگ بھگ پیدل ہی نکلے۔ سردیوں کی ٹھٹھری ہوئی دھوپ میں پاراہاؤس سویا سویا نظر آتا تھا۔ باہر ٹیلوں پر ہلکی سی دھند تھی۔ انچارج گارڈ قادر خان تو ابھی تک اسپتال میں بے ہوش پڑا تھا...... سیکنڈ انچارج رفاقت ہمارے ساتھ تھا۔ وہ ہمیں مختلف مراحل سے گزار کر مین گیٹ تک لایا۔ (ہار کی ٹوٹی ہوئی لڑی میں نے اپنی جیکٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لی تھی)

ہم چہل قدمی کے انداز میں آگے بڑھے تو تین مسلح گارڈز مناسب فاصلہ رکھ کر ہمارے پیچھے ہو لیے۔ انیق نے کہا۔ ''لو جی، وہی ہوا ناں جس کا ڈر تھا۔''

''اچھا اب خاموشی سے چلتے رہو۔ دیکھتے ہیں آگے کیا ہوتا ہے۔''

ہم سیر کرنے والے انداز میں زیرِ تعمیر عمارت کی جانب چلے گئے۔ ویرانے میں واقعی یہ ایک جادو کا محل لگتا تھا۔ صاف پتا چلتا تھا کہ جب یہ مکمل ہو جائے گا تو دیکھنے سے تعلق رکھے گا۔ کم و بیش دو سو ورکر یہاں ہمہ تن مصروف دکھائی دیتے تھے۔ کچھ دیر تک باہر ہی سے اس محل کا نظارہ کرنے کے بعد ہم مشرقی جانب آ گئے۔ اب ہمارا رخ اپنی منزل کی طرف تھا۔ ہم ان جھاڑیوں کی سمت جا رہے تھے جہاں روزانہ پاراہاؤس کا کچرا پھینکا جاتا تھا اور اٹھایا جاتا تھا...... مسلح گارڈز اب بھی حفاظتی انداز میں ہمارے پیچھے آ رہے تھے۔ میں نے ایک جگہ رک کر انہیں پاس بلایا۔ وہ پہلے تو جھجکے پھر مؤدب انداز میں ہمارے پاس آ گئے۔ وہ مقامی تھے۔ میں نے ان سے کہا۔ ''ہمارے لیے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہم ذرا اکیلے گھومنا چاہتے ہیں۔''

چند لمحے توقف کرنے کے بعد ایک درمیانی عمر کے گارڈ نے کہا۔ ''جیسے آپ کا حکم سر! لیکن آپ زیادہ دور نہ جائیں۔''

''او کے، زیادہ دور نہیں جائیں گے۔''

وہ وہیں کھڑے رہے...... ہم آگے بڑھ گئے۔ کچھ آگے جا کر میں نے پلٹ کر دیکھا تو وہ پاراہاؤس کی طرف واپس جا رہے تھے۔ ہم دونوں نے اطمینان کی سانس لی۔ لیکن ہم جانتے نہیں تھے کہ ''سبزی پلاؤ'' کی تلاش میں ہمارے ساتھ کیا ''اَپ سیٹ'' ہونے والا ہے...... اور ہم حقیقت میں کتنا خطرناک کام کرنے جا رہے ہیں۔

خونریزی اور بربریت کے خلاف
صف آرا نوجوان کی کھلی جنگ
باقی واقعات آئندہ ماہ پڑھیے

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

چالیس سال

عکس فاطمہ

بچپن سنہری یادوں اور باتوں کا وہ دور ہوتا ہے جو نظروں سے اوجھل ہونے کے باوجود بھلایا نہیں جا سکتا... یادوں کا حصہ بن جانے والے ان لمحوں کی کہانی... جو جسم و جاں میں لہو بن کر گردش کررہی تھی... جس میں انتظار تھا... بھونچال تھا اور انتقام کا نہ ختم ہونے والا جذبہ...

چالیس سال پہلے رونما ہونے والے واقعے کی بازگشت.....

واقعہ چالیس سال قبل پیش آیا تھا لیکن رابرٹ کے لیے تو جیسے کل کی ہی بات ہو۔ اسے تو اب بھی وہ دن بہت اچھی طرح یاد تھا۔ شاید ہی اس کی پچاس سالہ زندگی میں کوئی دن ایسا ہو جب وہ نینسی اور اس منحوس گھڑی کو پل بھر کے لیے بھولا ہو۔ یہ نینسی کے قاتل کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کا ہی جنون تھا جس نے اسے پولیس افسر بنا دیا تھا۔ بچپن سے لے کر بڑھاپے تک وہ قاتل کا پتا چلانے کی تگ و دو کرتا رہا لیکن کوئی کامیابی نہیں مل سکی تھی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

جب اسکول میں گولی چلنے کی آواز گونجی اور لوگ پارکنگ لاٹ کی طرف بھاگے تو وہاں خون میں لت پت نینسی دم توڑ رہی تھی۔ جائے وقوعہ پر صرف خوف سے لرزتا ایڈم ہی ملا تھا۔ وہ اس قدر سہما ہوا تھا کہ لفظ اس کا ساتھ ہی نہیں دے رہے تھے۔ زبان جیسے گنگ ہوگئی ہو۔ واقعے کے کئی روز بعد تک پولیس والے اور خود اس کے والدین بھی اُس سے یہ جاننے کی کوشش کرتے رہے کہ گولی کس نے چلائی تھی لیکن اس کے تو ہونٹ جیسے سل چکے تھے۔ کئی ہفتوں کے بعد بھی جب اس نے کچھ نہ بتایا تو ماہرینِ نفسیات سے مدد لی گئی۔ انہوں نے کئی سیشن کیے اور بالآخر اپنی رائے دے دی۔

ان کا کہنا تھا کہ اس واقعے نے ننھے ایڈم کے دماغ پر اتنا شدید دباؤ ڈالا ہے کہ اگر اس کی مرضی کے خلاف پوچھ گچھ میں زبردستی کی گئی تو ممکن ہے اس کا دماغ ہی مفلوج ہوجائے۔

جس وقت نینسی کو حالتِ نزع میں پایا گیا، اُس وقت اس کے قریب لنچ باکس پڑا تھا۔ پانی کی بوتل آدھی خالی تھی البتہ باکس میں کھانا بچا ہوا تھا۔ ایڈم صرف اتنا ہی بتاسکا کہ لنچ بریک کے دوران وہ ہیم برگر کھاتا ہوا پارکنگ لاٹ کی طرف چلا گیا تھا۔ وہیں میپل کے ایک درخت کے نیچے پڑی بینچ پر بیٹھ کر وہ لنچ کر رہی تھی کہ دو تین کوے اس کے قریب منڈلانے لگے۔ نینسی ان سے پریشان ہو رہی تھی۔ وہ اس کے سینڈوچ پر جھپٹا مارنے کے چکر میں تھے۔ اس نے ادھ کھائے سینڈوچ کو باکس میں رکھا اور پانی کی بوتل سے کوؤں کو ڈرانے کے لیے پارکنگ لاٹ میں دوڑنے لگی۔ اُس وقت نینسی پانچویں اور ایڈم چوتھی جماعت میں پڑھتا تھا۔

ایڈم کا کہنا تھا کہ وہ بھی نینسی کے ساتھ کوے بھگانے کے لیے اِدھر اُدھر بھاگنے لگا۔ اسی دوران پیچھے سے دھائیں کی آواز آئی۔ اس نے گھبرا کر پیچھے کی طرف دیکھا تو نینسی اینٹوں کے فرش پر گری ہوئی تھی۔ اس کے جسم سے خون بہہ رہا تھا۔ وہ یہ خونی کہانی صرف یہیں تک کی سنا پاتا تھا۔ اس کے بعد تو جیسے اس پر دورہ پڑ جاتا ہو۔ پہلے اس کی آنکھیں نم ہوتیں، پھر اس کا جسم کانپنے لگتا اور آخر میں وہ اس طرح گھگیاتا جیسے گہری نیند میں کوئی بہت ڈراؤنا خواب دیکھ رہا ہو۔ اس حالت میں اسے دیکھ کر لگتا تھا جیسے تشنج کا دورہ پڑ گیا ہو۔ جسم جھٹکے لینے لگتا اور پھر وہ کئی گھنٹوں کے لیے بے سُدھ پڑ جاتا تھا۔

نینسی کے قتل نے ننھے ایڈم کے ذہن پر اتنا بُرا اثر ڈالا کہ چند مہینوں کے بعد والدین نے اسے اسکول سے اٹھا لیا۔ وہ اچھا طالب علم تھا لیکن اس واقعے کے بعد سے بتدریج ذہنی پسماندگی کا شکار ہوتا چلا گیا۔ والدین سمجھتے کہ یہ اسکول میں رہنے کی وجہ سے ہے جس کے سبب وہ اُس قتل کے خوف سے پیچھا نہیں چھڑا پا رہا۔ انہوں نے ایک بار پھر ماہرینِ نفسیات سے رجوع کیا اور آخرِ کار اسے دوسرے اسکول میں داخل کرا دیا گیا۔

رابرٹ، نینسی، ایڈم اور اسکول میں ساتھ پڑھنے والے کئی دوسرے بچے ایک ہی محلے میں رہتے تھے۔ روز شام کو اکٹھے کھیلنا کودنا ان کا مشغلہ تھا مگر نینسی کے قتل کے بعد چند بچوں کی زندگیوں میں غیر محسوس طور پر تبدیلیاں آچکی تھیں۔

ایڈم اب بچوں کے ساتھ کھیلنے کودنے کے بجائے گھر کا ہی ہو کر رہ گیا تھا۔ اگر کبھی اس کے والدین زبردستی پارک میں دوسرے ساتھی بچوں کے ساتھ کھیلنے کودنے کے لیے لے آتے تو وہ ان میں گھلنے ملنے کے بجائے ایک طرف خاموشی سے بینچ پر بیٹھا رہتا۔ وہ انہیں دیکھ کر خوفزدہ رہتا تھا۔

نئے اسکول میں بھی ایڈم کی کیفیت وہی رہی۔ دو سال تک فیل ہونے کے بعد اسکول کے پرنسپل نے ایک دن اس کے والدین کو بُلا ہی لیا۔

”بات تکلیف دہ ہے لیکن مسٹر اینڈ مسز نیلسن ہمیں اسے قبول کرنا ہی ہوگا۔“ رسمی گفتگو کے بعد ہمدردانہ لہجے میں اتنا کہہ کر پرنسپل خاموش ہوگیا۔ اس کے چہرے سے لگتا تھا وہ جو کچھ کہنے جا رہا ہے، اس کے لیے مناسب الفاظ تلاش کر رہا ہے۔

ایڈم کے والدین کے چہروں سے پریشانی عیاں تھی۔ وہ اندازہ کرچکے تھے کہ آخر وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ ”بہتر ہے کھل کر کہیں تاکہ ہمیں بھی کوئی فیصلہ کرنے میں آسانی ہو۔“ مسز نیلسن نے خاموشی توڑی۔

”ہمارے اسکول کا رزلٹ سو فیصد ہے لیکن ایڈم کی وجہ سے.....“ یہ کہہ کر وہ رکا اور چند لمحوں کے بعد وضاحت کی۔ ”میرے کہنے کا مطلب اس پر الزام لگانا نہیں لیکن افسوس کہ اس کی ذہنی حالت کے سبب صرف اسکول کے رزلٹ پر ہی بُرا اثر نہیں پڑ رہا بلکہ یہ خود اس کے لیے بھی بہتر نہیں ہے۔ اس کی وجہ سے وہ احساسِ کمتری کا شکار ہوسکتا ہے۔“

ایڈم کے والدین خاموش بیٹھے تھے۔ اُن کے چہروں سے پریشانی عیاں تھی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

پرنسپل بھی کچھ دیر خاموش رہا اور پھر اپنی کرسی سے اٹھ کر مسٹر نیلسن کے قریب پہنچا اور ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ''میں کوئی فزیشن یا ماہرِ نفسیات نہیں۔ بہتر ہے کہ آپ ان سے مشورہ کرکے آئندہ کا کوئی فیصلہ کریں۔'' یہ کہہ کر وہ واپس اپنی کرسی کی طرف پلٹا۔ ''میرا تجربہ اور اندازہ کہتا ہے کہ اس کے دماغ کی نشوونما پر بُرا اثر پڑا ہے۔ اس کا دماغ کسی ایک مقام پر رک سا گیا ہے۔ عمر کے حساب سے نہ تو دماغ کی افزائش ہو رہی ہے اور نہ ہی اس کا رزلٹ دیکھ کر لگتا ہے کہ وہ اپنے دماغ کو استعمال کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔''

''آپ کا کیا خیال ہے۔'' مسٹر نیلسن نے پوچھا۔

پرنسپل کچھ دیر تک چھت کو گھورتا رہا اور پھر ان کی طرف متوجہ ہوا۔ ''ایڈم کی کلاس ٹیچر کا کہنا ہے کہ وہ کلاس میں بالکل خالی الذہن بیٹھا رہتا ہے۔ لنچ بریک میں بھی کمرے سے باہر نہیں نکلتا۔ ذرا سی کوئی تیز آواز سنائی دے جائے تو پتے کی طرح لرزنے لگتا ہے۔''

''وہ ٹھیک کہتی ہیں۔'' مسز نیلسن نے تاسف سے کہا۔

''بہتر ہے کہ اسے ذہنی معذور بچوں کے اسکول میں داخل کرا دیا جائے ورنہ یہاں وہ کچھ نہیں پڑھ سکے گا۔'' پرنسپل نے مشورہ دیا۔

مسٹر اینڈ مسز نیلسن کے پاس مزید کہنے کے لیے کچھ بھی نہ تھا۔ وہ خاموش رہے اور پھر پرنسپل کی طرف دیکھا۔ ''کیا ہم اسے ابھی اپنے ساتھ واپس گھر لے جا سکتے ہیں۔'' اس وقت وہ اپنی کلاس میں تھا۔

کچھ دیر بعد ایڈم اپنے والدین کے ساتھ گھر لوٹ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں خالی خالی تھیں۔ اس نے ایک بار بھی یہ نہیں پوچھا کہ خلافِ معمول، جاری کلاس سے اٹھا کر وہ اسے کیوں لے جا رہے ہیں۔

نینسی کی موت نے بچوں کی اُس پوری ٹولی کو ہی بکھیر دیا تھا۔ رابرٹ، فریڈرک ایڈم، نینسی، جانسن، پیٹرک، اینڈریو، جولیا اور میری...... آپس میں بہت اچھے دوست اور نرسری سے پانچویں تک ایک ساتھ ہی پڑھے تھے لیکن اُس کے بعد سب ایک دوسرے سے کھنچے کھنچے رہنے لگے۔ انہیں دیکھ کر لگتا تھا کہ وہ سب کسی انجانے خوف کا شکار ہو چکے ہیں۔ اُس واقعے کے بعد سے فریڈرک نے بھی اپنے دوستوں کے ساتھ کھیلنے کی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ رابرٹ بھی تنہا رہ گیا تھا۔ نینسی اس کی سب سے قریب ترین دوست تھی۔ اُس کی موت نے اسے دہلا کر رکھ دیا تھا۔ اکثر لنچ بریک کے دوران وہ کھیلنے کودنے کے بجائے میپل کے درخت کے نیچے پڑی لکڑی کی بینچ پر بیٹھا وہ جگہ تکتا رہتا، جہاں نینسی نے دم توڑا تھا۔

ایلیمینٹری اسکول کی شہرت کو بھی جیسے اس خونی واقعے کی وجہ سے داغ لگ گیا ہو۔ والدین خوف زدہ تھے۔ وہ اپنے بچوں کو آہستہ آہستہ دوسرے اسکول میں بھیجنے لگے تھے۔ وہ قاتل کے نہ پکڑے جانے کے باعث خوفزدہ تھے کہ کہیں اگلا نشانہ ان کا بچہ نہ ہو۔ پولیس کی سرتوڑ کوششوں کے باوجود ملزم کا نہ پکڑے جانا اس خوف میں مزید اضافہ کر رہا تھا۔ وہ عدم تحفظ کا شکار تھے۔

رابرٹ کو پوری زندگی یہ افسوس رہا کہ اگر وہ واقعے کے دن اسکول گیا ہوتا تو شاید ایسا نہ ہوتا۔ وہ دونوں ساتھ لنچ کرتے تھے لیکن پارکنگ لاٹ میں نہیں اسکول کے عقبی لان میں اور وہ بھی جھولا جھولتے ہوئے۔ نینسی کو جھولا جھولنے کا بہت شوق تھا۔ لنچ بریک میں وہ اسے جھولا جھلاتا رہتا اور لنچ بھی کرتا رہتا تھا۔ جس دن نینسی کی موت ہوئی رابرٹ کو شدید بخار تھا اسی لیے ماں نے اسکول جانے سے روک دیا تھا۔

واقعے کے چھ ماہ بعد رابرٹ کے والدین ٹیکساس سے نیویارک چلے آئے۔ اس نے باقی کی تعلیم یہیں حاصل کی اور نیویارک پولیس ڈپارٹمنٹ میں افسر لگ گیا۔ وہ پولیس والا نہیں بلکہ ٹرین ڈرائیور بننا چاہتا تھا مگر نینسی کے بعد اس کی سوچ بالکل بدل گئی تھی۔ ہر وقت اسے یہی خیال ستاتا رہتا کہ اس کا قاتل زندہ تھا۔ وہ اسی کام کے لیے پولیس والا بنا تھا۔ اسے پتا تھا کہ ٹیکساس پولیس نے ایڈم کی زباں بندی، کوئی سراغ نہ ملنے اور کئی مہینوں کی سرتوڑ کوششوں کے باوجود ناکامی پر وہ کیس داخلِ دفتر کر دیا تھا۔ وہ اکثر سوچتا تھا بالفرضِ محال تفتیش جاری رہتی تو شاید قاتل پکڑا جاتا لیکن پھر بھی کچھ نہیں ہونا تھا۔ قانون، بچہ اور اتفاقی قتل کے باعث کچھ خاص فیصلہ نہیں کر پاتا۔ وہ قاتل کو انجام تک پہنچتا دیکھنے کی خواہش دل میں رکھتا تھا۔

اگرچہ یہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ نینسی پر گولی کس نے چلائی لیکن رابرٹ کو یقین تھا کہ یہ کام کسی ایسے شخص کا ہی ہوگا جس کا تعلق اسکول سے ہو۔ وہ جانتا تھا کہ کئی ساتھی بچے ایسے تھے جو ان دونوں سے خوش نہیں تھے۔ وہ ان دونوں کی دوستی توڑنا چاہتے تھے، وہ اس میں کامیاب بھی رہے اور جرم کے بعد پکڑے بھی نہ گئے۔ یہ بات ہر وقت اسے پریشان کیے رکھتی تھی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 | PAKSOCIETY

www.paksociety.com

پولیس کی اٹھائیس سالہ ملازمت کے دوران اس کی زندگی بہت مصروف رہی۔ بیس سال کی عمر میں اس نے اپنی کالج فیلو اینا سے شادی کی۔ اس کا ایک بیٹا اور بیٹی تھے۔ دونوں کامیاب ڈاکٹر بنے۔ زندگی میں کوئی ایسی خواہش نہیں تھی جو پوری نہ ہوئی ہو، ماسوائے نینسی کی موت کے ذمے دار کو انجام تک پہنچانے کی آرزو کے۔ یہ خونی آرزو اب تک تشنہ تھی۔

چالیس سال گزرنے کے باوجود وہ ایک پل کے لیے بھی ایڈم سے غافل نہ رہا۔ اس کے والدین مدتوں پہلے شکاگو منتقل ہوگئے تھے۔ شکاگو اور نیویارک کی دوری اس کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔ نینسی کی موت نے ایڈم کے دماغ پر اتنا بڑا اثر ڈالا تھا کہ وہ اڑتالیس سال کا ہونے کے باوجود ذہنی طور پر آٹھ سال کا بچہ ہی تھا۔ وہ گیارہ سال کی عمر سے لے کر اب تک ذہنی امراض کے مرکز میں داخل تھا۔ رابرٹ کے لیے وہ امید کی ایک کرن تھی مگر اتنے طویل انتظار کے باوجود ایڈم کی زبان بدستور گنگ تھی۔

رابرٹ جب سے اپنے پیروں پر کھڑا ہوا، تب سے پوری ذمے داری کے ساتھ اس کی دیکھ بھال پر اٹھنے والے اخراجات کا ایک بڑا حصہ خرچ کررہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ ایک دن وہی گولی چلانے والے کا نام بتائے گا۔ کب...... یہ بات کوئی نہیں جانتا تھا۔

ایڈم بھی رابرٹ سے بہت مانوس تھا۔ ماں باپ کے گزر جانے کے بعد اکیلا وہی تھا جو اس سے ملنے جایا کرتا تھا۔ وہ اب بھی اس سے اسکول، کلاس ٹیچر، لنچ باکس اور بستوں کی باتیں کرتا تھا۔ جب رابرٹ اسے وہیل چیئر پر بٹھا کر پارک میں ٹہلانے لے جاتا تو وہ اسے لنچ بریک سمجھتا تھا۔ وہ اکثر اپنے سارے ساتھی بچوں، ماں باپ کے بارے میں پوچھتا تھا۔ پچھلی ملاقات میں اس نے شکایتی لہجے میں کہا تھا۔ ”اسکول بہت گندہ ہے، وہ اسے گھر جانے کے بجائے کلاس میں ہی سُلا دیتے ہیں۔“ مرکز والوں نے اس کے کمرے کو چوتھی جماعت کے ایک بچے کی کلاس کی طرح سجا سنوار رکھا تھا۔

☆☆☆

اُس شام رابرٹ کی پچاسویں سالگرہ تھی۔ بیوی بچوں اور دوستوں نے گولڈن جوبلی کو دھوم دھام سے منانے کا اہتمام کیا تھا۔ شان دار پارٹی تھی۔ اس دن وہ بہت خوش تھا۔ دوسرے دن اسے ایڈم سے ملنے شکاگو بھی جانا تھا لیکن اس رات کچھ ایسا ہوا کہ وہ کئی ہفتوں تک اسپتال سے باہر نہ آسکا۔

رات کا نہ جانے کون سا پہر ہوگا کہ رابرٹ کی آنکھ گہری نیند سے اچانک کھل گئی۔ سر کے عقبی حصے میں اسے کافی درد محسوس ہورہا تھا۔ وہ اسے پارٹی کی تھکان سمجھا اور پانی پینے کے لیے اٹھ کر کھڑا ہوا۔

وہ دو قدم ہی آگے بڑھا تھا کہ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ اسے بڑی زور سے چکر آئے تھے۔ دھپ سے گرنے کی آواز پر اس کی بیوی بھی جاگ گئی۔ اسے سہارا دے کر اٹھایا لیکن اسے کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ سر میں شدید درد تھا۔

اسپتال پہنچنے کے بعد ڈاکٹروں نے اسے سکون آور دوائیں دے کر فوری طور پر تکلیف دور کرنے کی کوشش کی لیکن تشخیص کے لیے وقت درکار تھا۔ دو ہفتوں تک اسے وہیں بیڈ پر لیٹے رہنا پڑا۔ اسے دوبارہ دکھائی دینے لگا تھا۔ وہ خود کو بہتر محسوس کررہا تھا لیکن ڈاکٹر اسے ڈسچارج کرنے کے بجائے ٹیسٹ پر ٹیسٹ لیے جارہے تھے۔ دو ہفتوں کے بعد جب رزلٹ آئے تو اُن کا خدشہ درست ثابت ہوا۔ اسے برین ٹیومر تھا۔ وہ اتنا بڑھ چکا تھا کہ آپریشن کی صورت میں بھی نکالنا ناممکن تھا۔

”بتائیے...... کب اسپتال سے رہا کررہے ہیں۔“ ڈاکٹروں کی ٹیم اس کے کمرے میں پہنچی تو رابرٹ نے ہنستے ہوئے پوچھا۔ ”ایک پولیس والا ہوں لیکن اس کمرے نے مجھے قیدی بنا دیا ہے اور اسپتال کو جیل۔“

یہ سن کر سینئر ڈاکٹر البرٹ مسکرایا۔ ”یہ زندگی بھی ایک سزا ہے اور دنیا ایک جیل......“ یہ کہہ کر لمحہ بھر توقف کیا۔ ”اچھی بات یہ ہے کہ اس جیل سے روزانہ ہزاروں قیدی رہا ہوکر انجان دنیا میں لوٹتے رہتے ہیں۔“

”نہ جائیں تو جیل میں تل دھرنے کو بھی جگہ باقی نہیں بچے گی۔“ رابرٹ نے فوراً جوب دیا۔ ”دنیا کی آبادی کو کنٹرول کرنے کا یہ فطری طریقہ ہے۔“

ڈاکٹر بیڈ کے گرد گھیرا بنائے کھڑے تھے۔ ”آپ کی رہائی میں بھی تھوڑا وقت رہ گیا ہے اور یہ کہتے ہوئے مجھے سخت افسوس ہورہا ہے۔“ البرٹ نے کہا۔ اس کے چہرے سے مایوسی ٹپک رہی تھی۔

”کیا مطلب......“ وہ چونکا۔ ”میں کچھ سمجھ نہیں سکا۔ میرا مطلب ہے کہ اسپتال سے......“ اس نے بات مکمل کیے بنا چھوڑ دی۔

”تمہیں برین ٹیومر ہے۔“ ڈاکٹر البرٹ کا لہجہ افسردہ

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

تھا۔

یہ سن کر رابرٹ سکتے میں رہ گیا۔ ”تو پھر علاج کیجیے نا۔“ کچھ توقف کے بعد وہ بولا۔

”اس اسٹیج پر علاج کی نہیں دعاؤں کی ضرورت پڑتی ہے۔“ ڈاکٹر البرٹ نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ”ہم آج آپ کو اسپتال سے ڈسچارج کر رہے ہیں لیکن دوا جاری رہے گی۔“

”تو میرے مرض کا کوئی علاج نہیں۔“ رابرٹ نے اُمید بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

البرٹ نے انکار میں سر ہلا دیا۔ کمرے میں افسردہ خاموشی کا راج تھا۔

رابرٹ نے اپنے اعصاب پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”لیکن یہ سب کچھ اتنی اچانک......“

”اچانک نہیں......“ ڈاکٹر البرٹ نے کہا۔ ”کم از کم چالیس سالوں سے یہ ٹیومر تمہارے دماغ میں پرورش پا رہا تھا۔“

”لیکن اس سے پہلے مجھے کبھی کوئی ایسی تکلیف نہیں ہوئی۔“ رابرٹ نے قطع کلامی کی۔

”یہی حیرت ہے کہ جو درد تم نے کچھ دنوں پہلے محسوس کیا، وہ پہلے کیوں نہ ہوا۔“

”اوہ......“ رابرٹ نے سر پر ہاتھ رکھا۔ آنکھیں بند کیں اور پھر مسکرا کر شاعرانہ لہجے میں کہا۔ ”دل کا درد دماغ تک پہنچا۔ دل تو اپنا درد ہمیشہ محسوس کرتا رہا ہے۔“ اس کے لبوں پر اب بھی مسکراہٹ لرزاں تھی۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ قاتل کو انجام تک پہنچانے کی سوچ نے چالیس سالوں میں دماغی ناسور کی شکل لے لی تھی۔ وہ کم ہمت نہیں تھا۔ وہ بیماری اور مجرموں سے نمٹنا جانتا تھا۔ اس میں مقابلے کی ہمت ابھی باقی تھی۔

”تم کیا کہہ رہے ہو، میں کچھ سمجھا نہیں۔“ ڈاکٹر البرٹ نے حیرانی سے کہا۔

”جانے دیجیے......“ وہ مسکرایا۔ کچھ دیر پہلے کی نسبت اب وہ خاصا پُراعتماد لگ رہا تھا۔ ”جو آپ نہیں سمجھے میں سمجھ چکا۔ بس اتنا بتائیں وقت کتنا باقی ہے۔“

”چار سے آٹھ ماہ......“

”اوکے......“ وہ بستر سے اٹھ بیٹھا۔ ”واقعی اب بہت کم وقت رہ گیا ہے۔“ اس نے زیر لب کہا۔ ہونٹوں پر اب بھی مسکراہٹ تھی لیکن ذہن میں نینسی کی تصویر اور اس پر گولی چلانے والے تک پہنچنے کا تصور تھا۔

گھر پہنچنے کے بعد اس نے دو دن آرام کیا اور پھر ایڈم سے ملنے شکاگو پہنچ گیا۔ وہ رابرٹ کو دیکھ کر بہت خوش تھا۔ وہ اسے گاڑی میں لے کر سارا دن شہر بھر میں گھماتا رہا۔ اتنے طویل عرصے میں پہلی بار اسے لگا کہ ایڈم اندر سے بہت خوش ہے۔ وہ اسے لے کر شام کو ایک پارک میں پہنچا۔ اسکول کی باتیں کرتا رہا۔ وہ دونوں اس طرح باتیں کر رہے تھے کہ جیسے دو شرارتی بچے ہوں اور اسکول سے گول ہو کر پارک میں تفریح منانے پہنچ گئے ہوں۔

”تمہیں پتا ہے، کل نینسی اسپتال سے آجائے گی۔“ باتوں باتوں میں رابرٹ نے کہا۔

”کیا......“ اس نے چونک کر اس کی شکل دیکھی۔

”ہاں...... پھر وہ اسکول بھی آیا کرے گی، ہم سب پھر سے ایک ساتھ کھیلا کریں گے۔“ رابرٹ کو لگا کہ پہلی بار

ماہنامہ پاکیزہ

میں، قاری بہنوں کی دلچسپی کے لیے ایک نیا اور منفرد سلسلہ باتیں بہار و خزاں کی.... پیش کیا جا رہا ہے جس میں ہر قاری بہن دیے گئے سوالوں کے جوابات دے کر شمولیت اختیار کر سکتی ہے۔ آپ کے خیالات و احساسات ہمارے لیے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔

تو قارئین آج ہی اگست کا
ماہنامہ پاکیزہ
اپنے ہاکر سے بک کروالیں

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

نینسی کے نام پر اس کی کیفیت میں کوئی بدلاؤ نہیں آیا تھا۔
''اسے تو گولی لگی تھی نا۔'' ایڈم کی آنکھوں میں حیرانی تھی۔
رابرٹ نے اثبات میں سر ہلایا۔
''تمہیں پتا ہے اس کا بہت سارا خون نکلا تھا۔ وہ زمین پر گر گئی تھی۔'' ایڈم حیرانی سے بتا رہا تھا۔ ''تم کل اسکول نہیں آئے تھے ورنہ دیکھتے کتنا زیادہ خون بہہ رہا تھا۔'' یہ کہہ کر اس نے رابرٹ کی طرف غور سے دیکھا۔ ''اسے بہت درد ہوا ہوگا نا۔'' اس کے لہجے میں من کا پنہاں درد نمایاں تھا۔
رابرٹ نے اثبات میں سر ہلایا اور نم آنکھیں پونچھنے لگا۔
''وہ بڑا گندہ لڑکا ہے۔ اب تم اس کے ساتھ نہیں کھیلنا۔ میں بھی نہیں کھیلوں گا۔ اس نے نینسی کا کتنا خون نکالا تھا نا......'' وہ اپنی دھن میں بولے جا رہا تھا۔
یہ سنتے ہی رابرٹ بری طرح چونک گیا۔ چالیس سال سے وہ یہی سننے کی تو تمنا رکھتا تھا۔ اس کی نگاہیں اُس کے چہرے پر تھیں۔ پہلی بار وہ یہ باتیں کر رہا تھا۔
''نہیں کھیلیں گے ہم اس کے ساتھ......''
رابرٹ نے بھی اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ ''لیکن ایک بات ہے۔'' یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔
''وہ کیا......'' ایڈم نے چونک کر پوچھا۔
''میں تو کل اسکول نہیں آیا تھا، مجھے کیا پتا وہ لڑکا کون ہے۔'' رابرٹ نے چال چلی۔ ''اب جب پتا ہی نہیں تو میں اس کے ساتھ کھیل بھی تو سکتا ہوں نا۔ میں تو اسے جانتا ہی نہیں کہ کون ہے وہ پھر......''
''لیکن مجھے تو پتا ہے۔ میں نہیں کھیلوں گا اس کے ساتھ۔''
''کون ہے وہ......'' رابرٹ کی آنکھوں میں چمک نظر آ رہی تھی۔
''وہی کاؤبوائے......''
''کون کاؤبوائے......'' رابرٹ نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ ''ہمارے اسکول میں تو کئی لڑکے کاؤبوائے بنے پھرتے ہیں، مجھے کیسے معلوم ہو کہ وہ کون ہے۔''
''وہی کاؤبوائے، جس نے اپنی پستول سے نینسی پر گولی چلائی تھی۔''
''کون......'' رابرٹ نے خو پر قابو پانے کی کوشش کی۔ اس کا دماغ نہایت تیزی سے چالیس سال پہلے کے ایلیمنٹری اسکول میں بھٹک رہا تھا۔ وہ ایک ایک چہرے کو یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ساتھ ہی ایڈم پر بھی اس کی پوری توجہ تھی۔
''تمہیں پتا ہے وہ کتنا گندہ ہے۔'' ایڈم کی باتوں کا رخ یک دم بدل گیا۔ ''وہ مجھے بھی پستول مارنے کی دھمکی دے رہا تھا۔ اس نے مجھے بہت ڈرا دیا تھا۔'' یہ کہہ کر وہ رابرٹ کے کندھے سے لگ کر روتا رہا۔
''کون پیٹر، پیٹرک، الیگزینڈر......'' رابرٹ اسکول کے ان ساتھیوں کے نام یاد کر کے دہراتا رہا، جو کاؤبوائے بن کر پھرتے تھے۔
''نہیں نہیں......'' ایڈم نے روتے روتے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ ''یہ نہیں تھے۔''
''تو کون تھا وہ۔''
''فریڈرک......''
''تم ٹھیک کہہ رہے ہو؟'' رابرٹ نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔
''ہاں......ٹھیک کہہ رہا ہوں۔''
''تم نے یہ بات اپنی مما اور ڈیڈی کو بتائی تھی۔''
ایڈم نے نفی میں سر ہلایا۔ ''فریڈرک نے جب نینسی کو گولی ماری تو میں نے پلٹ کر دیکھا، سامنے فریڈرک کھڑا تھا۔'' اس کی آواز رونے کے باعث بھرائی ہوئی تھی۔ ''اس نے مجھ سے کہا تھا کہ کسی کو بتایا تو تمہیں بھی گولی مار دوں گا۔'' یہ کہہ کر وہ پھر رابرٹ سے چمٹ گیا۔ ''مجھے بچا لینا۔ میں نے تمہیں بتا دیا ہے۔ اسے پتا چلا تو مجھے بھی گولی مارے گا۔ مجھے خون سے بہت ڈر لگتا ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے رابرٹ کی آنکھوں میں دیکھا۔ ''تم مجھے بچا لو گے نا اس سے۔''
''تمہیں کوئی نہیں مارے گا۔'' رابرٹ نے اپنے اندر کے دکھ پر قابو پانے کی کوشش کی۔ دل میں بچپن کی یاد اور سر میں ٹیومر کی کسک بڑھتی جا رہی تھی۔
وہ دونوں اداس بیٹھے رہے۔ آخر ایک آئسکریم والے کی سائیکل قریب سے گزری تو اس کی گھنٹی نے دونوں کو چونکا دیا۔ وہ مچل گیا۔ ''آئسکریم کھائیں گے۔'' رابرٹ نے اس کا دل رکھنے کے لیے آئسکریم کھائی۔
''چلو......'' رابرٹ اٹھا۔ ''دیر ہو رہی ہے۔''
کچھ دیر بعد رابرٹ اسے مرکز پر چھوڑ کر سیدھا ہوٹل پہنچا۔ دوا کھائی اور سونے کے لیے لیٹ گیا۔ نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اس کے ذہن میں بار بار

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN

www.paksociety.com

فریڈرک کا چہرہ ابھر رہا تھا۔ چالیس سال پرانا راز اور نینسی کے جسم سے بہتا خون، دونوں اس کا چین تباہ کر چکے تھے۔ اس کا بس چلتا تو فوراً سے پیشتر فریڈرک کو انجام تک پہنچا دیتا لیکن وہ قانون کا محافظ تھا۔ مجرم کو بھی صفائی کا حق دینے کا پابند۔ اسے پتا نہ تھا کہ وہ کہاں ملے گا، البتہ یہ یقین تھا کہ وہ اس کی زندگی ختم ہونے سے پہلے پہلے اپنے انجام تک ضرور پہنچ جائے گا۔

فریڈرک دراز قد کا دبلا پتلا لڑکا تھا۔ چھریرے بدن اور آوارگی کو پسند کرنے والا۔ اسکول ہو یا محلہ، اسے دوسرے بچوں پر رعب جمانے کا بہت شوق تھا۔ وہ کھلونا پستول کو ہولسٹر میں ڈال کر اس طرح پھرتا تھا کہ جیسے وہ اصل کاؤبوائے ہو۔ اسکول کے کئی اور لڑکے بھی اس کے نقشِ قدم پر چل رہے تھے۔ یہ شوق اسے ورثے میں ملا تھا۔ اس کے دادا کا ٹیکساس کے نواح میں زرعی فارم تھا جہاں وہ گھوڑے پالتے تھے۔ اس کا دادا اور باپ بھی کاؤبوائے اسٹائل میں ہی زندگی گزارتے تھے۔

فریڈرک کو اسکول میں کوئی بھی پسند نہیں کرتا تھا۔ وہ نینسی کے ساتھ کھیلنا کودنا چاہتا تھا مگر وہ اس کے جھگڑالو مزاج کو سخت ناپسند کرتی تھی۔ فریڈرک نے کئی بار رابرٹ سے بھی ہاتھا پائی کی تھی۔ اسے صرف یہ دکھ تھا کہ نینسی اس کے بجائے اُس کے ساتھ کیوں کھیلتی ہے۔ وہ بچے تھے۔ یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ پانچویں کلاس کا لڑکا اتنا بے رحم بھی ہوسکتا ہے کہ صرف ناپسند کیے جانے پر کسی کی جان لے لے گا۔ مگر ایسا ہوا تھا اور ایڈم کے سب کچھ کہہ دینے کے بعد معاملہ صاف ہو چکا تھا۔ فریڈرک نے یقیناً اپنے باپ کا پستول چرا کر نینسی پر گولی چلائی تھی۔

رابرٹ ڈنر کیے بنا ہی سو گیا تھا۔ جاگا تو سر بھاری ہو رہا تھا۔ بھوک بھی لگ رہی تھی۔ اس نے گھڑی پر نظر ڈالی، صبح کے ساڑھے چھ بج رہے تھے۔ نو بجے کی فلائٹ سے اسے واپس نیویارک پہنچنا تھا۔ وہ باتھ روم کی طرف بڑھ ہی رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ ہوٹل استقبالیہ نے لائن ٹرانسفر کی۔

''مسٹر رابرٹ۔'' ایک نسوانی آواز نے تصدیق چاہی۔

''جی...... بول رہا ہوں۔''

''میں ذہنی معذوری کے بحالی مرکز سے بول رہی ہوں، کیا آپ ایڈم کو جانتے ہیں۔''

''کیا ہوا اسے، سب خیریت تو ہے؟'' رابرٹ چونک گیا۔

''آج صبح جب اٹینڈنٹ انہیں بیدار کرنے کے لیے کمرے میں گیا تو وہ اس دنیا میں نہیں تھے۔''

''کیا......'' رابرٹ چلّایا۔

''مجھے یہ بتاتے ہوئے افسوس ہو رہا ہے لیکن کیا کر سکتے ہیں۔ کل رات کسی وقت سوتے میں ان کا انتقال ہو گیا ہے۔'' خاتون کا لہجہ افسردہ تھا۔ ''میت سٹی اسپتال کے مردہ خانے منتقل کی جا رہی ہے۔ حوالگی کے لیے آپ اسپتال سے رجوع کر لیں۔''

''بہتر ہے۔'' رابرٹ نے بجھے دل سے کہا۔

''کوئی مدد چاہیے ہو تو آپ مرکز سے بھی رابطہ کر سکتے ہیں۔'' خاتون نے کہا۔

''شکریہ......'' رابرٹ نے آہستگی سے کہا اور فون رکھ دیا۔

وہ سنیچر کی شام تھی۔ رابرٹ کے پاس وقت کم تھا اور ایڈم کا کوئی ایسا نہ تھا کہ جس کے لیے تاخیر کی جاتی۔ رابرٹ نے اسی شام مقامی قبرستان میں ایڈم کی تدفین کر دی۔ آخری رسومات میں مرکز کے کئی مریض اور عملے کے ارکان بھی شریک ہوئے تھے۔

اسی رات رابرٹ ٹوٹے دل کے ساتھ نیویارک واپس پہنچ گیا۔

اگرچہ بیماری کے بعد نیویارک پولیس ڈپارٹمنٹ نے اسے مکمل سہولیات اور مراعات کے ساتھ ذمے داریوں سے سبکدوش کر دیا تھا تاہم اب بھی سرکاری پستول اس کے پاس تھا۔ اس کا جمع کرانا ابھی باقی تھا۔

نیویارک لوٹنے کے بعد رابرٹ نے تن دہی سے فریڈرک کا پتا چلانے کی کوششیں شروع کر دیں۔ کئی ساتھی پولیس افسران بھی اس کی مدد کر رہے تھے۔ آخرِ کار پتا چل ہی گیا کہ وہ کہاں رہ رہا تھا۔

ایک ہفتے کے بعد رابرٹ ٹیکساس پہنچا۔ اپنے پسندیدہ گرانڈ ہارس ہوٹل میں کمرا لیا اور پھر فون کیا۔ ''مسٹر فریڈرک......''

''بول رہا ہوں۔''

''کیا تم میری آواز پہچان سکے ہو۔'' رابرٹ نے پوچھا۔

دوسری طرف کچھ دیر خاموشی رہی۔ ''نہیں...... کون ہو؟''

''میں ہوں رابرٹ...... رابرٹ اسمتھ، ایلیمنٹری اسکول، کلاس فائیو، ابراہام ٹاؤن، جانسن اسٹریٹ......'' یہ

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

کہہ کر توقف کیا۔ ''دوسری طرف خاموشی تھی۔ ''پہچانا......''

دوسری طرف کچھ دیر خاموشی رہی اور پھر زوردار قہقہہ گونجا۔ ''حیرت ہے۔ تم نے مجھے یاد رکھا اور ڈھونڈ بھی لیا......''

''ملنے بھی پہنچ گیا۔'' رابرٹ نے بات کاٹ کر کہا۔ ''پرانے تعلق آسانی سے پیچھا نہیں چھوڑتے مسٹر فریڈرک۔'' یہ کہہ کر وہ زور سے ہنسا۔

''لیکن میں تو سب کچھ بھول بھال گیا، کون کون دوست تھا، ساتھ پڑھتا تھا۔'' فریڈرک نے دوستانہ لہجے میں جواب دیا۔ ''لیکن اچانک تم کیسے......'' اس کا لہجہ سوالیہ تھا۔

''مجھے کینسر ہوگیا ہے۔'' رابرٹ نے کہا۔

''اوہ میرے خدا......'' وہ چلّایا۔ ''ڈاکٹر کیا کہتے ہیں۔''

''چھ سے آٹھ مہینے۔'' رابرٹ نے آہستہ سے کہا۔ ''اسی لیے یہاں آیا ہوں تاکہ بچپن کی یادوں کا قرض لوٹا سکوں۔''

''تم کہاں ہو، پتا بتاؤ۔ میں ابھی پہنچ رہا ہوں۔'' فریڈرک نے بے تابی سے کہا۔

''ارے ٹھہرو...... اتنی جلدی کیا ہے۔'' وہ مسکرایا۔ ''تم سے ملنا میرے لیے بھی ضروری ہے۔''

''تو ابھی گھر آجاؤ۔''

''آج ہی تو پہنچا ہوں۔ فی الحال بہت تھکا ہوا ہوں۔ کل ملتے ہیں۔'' رابرٹ نے کہا۔

''کہاں پر......'' اس کے لہجے سے بے تابی اور خوشی کے ملے جلے جذبات کا پتا چلتا تھا۔

''وہیں...... جہاں وقت ٹھہر گیا ہے۔''

''مطلب...... کچھ سمجھا نہیں۔''

''ایلیمنٹری اسکول، پارکنگ لاٹ۔ صبح گیارہ بجے۔''

''وہ اسکول تو کب کا بند ہوچکا۔'' فریڈرک ہنسا۔ ''اب تو وہاں بھوت رہتے ہیں۔''

''ماضی بھی تو ایک بھوت ہے، ڈراؤنا بھوت، پیچھا ہی نہیں چھوڑتا۔'' رابرٹ کا انداز شاعرانہ تھا۔

''چلو...... وہیں ملتے ہیں۔'' فریڈرک آمادہ ہوگیا۔

دوسرے دن طے شدہ وقت سے کچھ پہلے رابرٹ ایک ٹیکسی لے کر ایلیمنٹری اسکول پہنچ گیا۔ وہ عمارت کے باہر کھڑا تھا لیکن ذہن بچپن میں پہنچ چکا تھا۔ چالیس سال پہلے کا گزرا وقت جیسے اچانک نگاہوں کے سامنے پلٹ آیا ہو۔ وہ بہت خوش نظر آرہا تھا۔ اس کے چہرے پر بچوں جیسی مسکراہٹ تھی۔ اچانک اس کے چہرے پر کرب کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ اسے نینسی کی یاد اور تکلیف دہ موت یاد آگئی تھی۔ اس نے سر جھٹکا اور اندر داخل ہوگیا۔

سب کچھ پہلے جیسا ہی تھا۔ عمارت بھی وہی تھی۔ بس جھاڑ جھنکار بڑھ گیا تھا۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا آگے بڑھ رہا تھا۔ ذہن بار بار ماضی میں جھانک رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ موت زندوں کو ہی نہیں عمارتوں کو بھی آتی ہے۔ کبھی وہ عمارت بچوں کے قہقہوں، اچھل کود اور شور شرابے کے باعث زندہ تھی۔ اب ایک مقبرے کی صورت کھڑی تھی...... خاموش اور افسردہ۔

وہ آگے بڑھا اور درختوں کی اوٹ میں پڑی زنگ خوردہ بینچ پر بیٹھ گیا۔ اس نے آنکھیں بند کیں۔ سامنے نینسی اور وہ دوڑتے بھاگتے پھر رہے تھے۔ دونوں دس سال کے بچے تھے۔ موسم بہار کا خوش گوار دن تھا۔ درخت نئے لباس پہن رہے تھے۔ پھول کھل چکے تھے اور وہ دونوں بچے بہت خوش تھے کہ اچانک زوردار آواز آئی۔ قریب میں کوئی کار آکر رکی تھی۔ اس آواز نے رابرٹ کا تصور توڑ دیا تھا۔ اس نے آنکھیں کھولیں اور حیرت و یاس سے اطراف پر نظر ڈالی۔ چہار سو موسم خزاں کی ویرانی اور اداسی برس رہی تھی۔ اس نے گردن گھما کر درختوں کی اوٹ سے دیکھا۔ ایک کار پارکنگ لاٹ میں آکر رک چکی تھی۔ اس نے بغلی ہولسٹر میں رکھے اعشاریہ اڑتیس کے سرکاری پستول پر ہاتھ پھیرا اور آہستہ سے اٹھ کر اوٹ سے باہر نکلا۔

سامنے سرخ رنگ کی بیوک کار کے ساتھ فریڈرک کھڑا تھا۔ وہی کاؤبوائے اسٹائل میں۔ اسے دیکھتے ہی رابرٹ کا خون کھول گیا۔ ''خوش آمدید......'' اس پر نظر پڑتے ہی فریڈرک نے ہنستے ہوئے اس کا استقبال کیا۔

رابرٹ جذبات سے عاری تھا۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھا۔ فریڈرک نے بھی چند قدم آگے بڑھائے اور عین کار کے سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔ درمیان میں صرف چند قدموں کا فاصلہ تھا۔ دونوں کی نظریں ایک دوسرے پر ٹکی تھیں۔

''کیسے ہو......'' رابرٹ نے گہری سانس لے کر بات شروع کی۔

فریڈرک مسکرادیا اور دونوں ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ''جیسا ہوں، تمہارے سامنے ہی کھڑا ہوں۔''

رابرٹ نے اس کے سراپا پر نظر ڈالی۔ کمر سے لٹکتے

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

ہولسٹر میں ریوالور تھا۔ ’’بالکل نہیں بدلے، بس ذرا سے بڑے ہوگئے۔‘‘ رابرٹ کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ تھی۔

’’کہو...... اس طرح کیوں ملنے کو بلایا۔‘‘ فریڈرک کا لہجہ سوالیہ تھا۔ ’’کسی اور اچھی جگہ پر بھی مل سکتے تھے۔‘‘ اس نے ناگواری سے چاروں طرف دیکھا۔ ’’پینتیس چالیس سال کے بعد مل رہے ہیں اور وہ بھی ایسی جگہ پر۔‘‘

’’میرے لیے یہ جگہ بہت خاص ہے۔‘‘ یہ کہہ کر اس نے لمحہ بھر توقف کیا۔ ’’تمہیں کچھ یاد آیا......‘‘ رابرٹ نے اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

’’کیا......‘‘ وہ ہنسا۔ ’’یہاں مجھے کیا یاد آئے گا۔‘‘

’’آنا تو چاہیے تھا، ہوسکتا ہے یاد آجائے۔‘‘ رابرٹ کا لہجہ معنی خیز تھا۔

’’کیا یاد دلانا چاہتے ہو؟‘‘ فریڈرک نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ ’’وہ بھی اتنے برسوں بعد ملنے پر۔‘‘

’’نینسی ...... نینسی البرٹ، 1968ء، ایلیمینٹری اسکول، پارکنگ لاٹ...... لنچ بریک۔‘‘ یہ کہہ کر رابرٹ زور سے ہنسا۔

فریڈرک ہکا بکا منہ کھولے اسے دیکھے جارہا تھا۔ آخر اس نے خود پر قابو پایا۔ ’’لگتا ہے تم سنکی ہوگئے ہو، نہ جانے کیا اول فول بک رہے ہو۔‘‘

رابرٹ ہنسا۔ ’’یاد آیا یا پھر......‘‘

’’وہ ایک حادثہ تھا۔‘‘ فریڈرک کے لہجے سے لگ رہا تھا کہ وہ سچ چھپانے کی کوشش کررہا ہے۔ ’’جتنا سب جانتے ہیں اتنا ہی میں بھی جانتا ہوں۔‘‘ اب وہ نروس نظر آرہا تھا۔

’’حادثہ......‘‘ رابرٹ نے طنز کیا اور کچھ توقف کے بعد بولا۔ ’’اچھا...... چلو مان لیتے ہیں، وہ ایک حادثہ تھا لیکن ایڈم......‘‘

فریڈرک کے چہرے پر پریشانی نمایاں تھی۔ ’’مجھے سمجھ نہیں آتا کہ چالیس سال بعد مل رہے ہو لیکن یہ باتیں......‘‘

’’چالیس سال پہلے کی ہی باتیں ہیں۔‘‘ رابرٹ نے تیزی سے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

’’ہاں......‘‘ فریڈرک نے ندامت سے سر نیچے جھکایا۔ ’’وہ ناسمجھی کے دور کی بات تھی لیکن......‘‘

’’تمہاری وہ ناسمجھی......‘‘ رابرٹ زور سے ہنسا۔ ’’نینسی کو گولی ماردی، ایڈم کو اتنا دھمکایا کہ وہ ذہنی معذور بن گیا، مجھے ناسور کا تحفہ دیا......‘‘ یہ کہہ کر وہ مسکرایا۔ ’’تمہاری ناسمجھی نے تین زندگیوں کو ضائع کیا ہے۔‘‘ یہ کہتے ہوئے اس نے کوٹ کے اندر ہاتھ ڈالا۔

’’کیا......‘‘

’’سچ کہہ رہا ہوں۔‘‘ رابرٹ کے لہجے سے افسردگی عیاں تھی۔ ’’ہفتہ بھر پہلے ایڈم اس دنیا میں ذہنی معذوری کی زندگی جی کر رخصت ہوچکا۔‘‘

’’یہ سن کر افسوس ہوا۔‘‘ فریڈرک نے کہا۔

’’افسوس مجھے بھی ہے کہ تمہیں تمہارے کیے کے بدلے اتنی آسان موت دے رہا ہوں۔‘‘ یہ کہتے ہوئے اس نے کوٹ کے اندر ہاتھ ڈالا، باہر آیا تو ہاتھ میں اعشاریہ اڑتیس کا پستول تھا۔

فریڈرک نے بھی نہایت پھرتی سے اپنا ریوالور نکالا۔ چشم زدن میں دونوں ایک دوسرے کو پستول کی زد پہ لیے ہوئے تھے۔

’’دیکھو...... احمق نہ بنو۔‘‘ فریڈرک نے غصے سے کہا۔

’’وہ چالیس سال پرانی بات تھی۔ اب گڑے مُردے کیوں اکھاڑ رہے ہو۔‘‘

’’یہ تمہاری غلط فہمی ہے، نینسی کی موت کے ساتھ جو مرے، وہ سارے مُردے اب تک گڑے نہیں۔‘‘ رابرٹ نے سرد لہجے میں کہا۔ ’’ابھی مجھے مردہ ہونے میں کچھ مہینے باقی ہیں۔ اس لیے میں تمہیں......‘‘

’’مجھے مار کر بچ نہیں سکو گے۔‘‘ فریڈرک بدستور اسے ریوالور کی زد پہ لیے کھڑا تھا۔

’’مر تو رہا ہی ہوں۔ اب ڈر کس بات کا ہوگا۔‘‘ یہ کہہ کر رابرٹ ایک قدم آگے بڑھا۔

فریڈرک خوفزدہ ہوکر پیچھے ہٹا اور کار کے بونٹ سے ٹکرایا۔

دونوں ایک دوسرے پر پستول تانے ہوئے تھے۔

’’قانون کے نام پر تمہیں سزائے موت دیتا ہوں۔‘‘ یہ کہتے ہوئے رابرٹ نے گولی چلادی لیکن فریڈرک غافل نہ تھا۔ اس نے بھی گولی چلادی۔

نشانہ دونوں کا بہت اچھا تھا۔ چند لمحوں بعد فریڈرک کی لاش اس جگہ پڑی تھی، جہاں چالیس سال پہلے نینسی نے آخری سانس لی تھی۔

رابرٹ نے فرش پہ پڑے فریڈرک پر نظر ڈالی۔ آخری ہچکی لی اور سر ایک طرف ڈھلک گیا۔

پارکنگ لاٹ کے فرش پر چالیس سال پہلے کا منظر تھا۔ فرش اُن دونوں کے خون سے سرخ ہورہا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

میں ایک ریٹائرڈ پولیس آفیسر ہوں اور میری عمر اکتالیس سال ہے۔ موجودہ دور میں یہ اوسط عمر شمار کی جاتی ہے۔ گو کہ نوجوان نسل میرے خیالات و نظریات کو جنریشن گیپ قرار دیتی ہے لیکن حقیقت میں یہ ایک گہری خلیج ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ لمبے بالوں اور تیز موسیقی کا آزادی اور امن سے کیا تعلق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میرے خیالات نوجوان نسل سے بالکل مختلف ہیں۔ یہ لوگ زندگی سے فرار چاہتے ہیں جس کا مطلب اپنے فرائض اور ذمّے داریوں سے

زباں بندی

تنویر ریاض

یہ حقیقت ہے کہ کچھ چیزیں صرف مخصوص طبقوں تک محدود نہیں رہتیں بلکہ وہ بڑھتے بڑھتے پورے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہیں... مغربی معاشرے کے ایسے ہی تاریک پہلوئوں کو عیاں کرتی تحریر... جہاں اپنے ذاتی مفادات کی خاطر دوسروں کی جان سے کھیلنا آسان ہدف بن چکا تھا... مگر کچھ خاص چہرے تھے... جو ان تاریکیوں میں چھپے جرم اور جرم کرنے والوں کو دیکھ رہے تھے...

گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی کا قتل...... وہ زباں بندی کے اصول سے ناواقف تھی......

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

پہلو تہی ہے اور اسی وجہ سے نئی نسل بے راہ روی کا شکار ہو رہی ہے۔ ایسی ہی گھر سے بھاگی ہوئی ایک لڑکی کے بارے میں معلوم ہوا کہ اس کی لاش کنگز لینڈنگ موٹیل کے برابر والی گلی میں پائی گئی ہے۔ اس جگہ کی شہرت کچھ اچھی نہیں ہے۔ یہاں شرابی اور پھیری لگانے والے مزدوروں کا جمگھٹا لگا رہتا ہے جو سبزی اور پھل پھیری لگا کر بیچتے ہیں۔ پولیس کی ملازمت کے دوران مجھے کئی بار وہاں جانا پڑا تاکہ نشے میں مدہوش مزدوروں کے درمیان ہونے والی لڑائی کو روک سکوں۔ اس کے بعد سراغ رساں کے طور پر بھی کئی کیسز کے سلسلے میں وہاں جاتا رہا۔ اس لڑکی کا قتل اس لیے بھی اخبارات کی سرخیوں کی زینت بن گیا کہ وہ ایک کانگریس مین کی بھتیجی تھی۔

اس لڑکی کا نام میریان ڈوبس تھا اور عمر سولہ سال تھی۔ میں نے ایک اخبار میں اس کی تصویر دیکھی۔ وہ بہت خوب صورت، لمبے بالوں اور بڑی بڑی روشن آنکھوں والی لڑکی تھی۔ اس کی تصویر دیکھ کر کوئی بھی کہہ سکتا تھا کہ دنیا اس کے قدموں میں تھی اور بقیہ زندگی اس کے سامنے کھلے آسمان کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے قتل کی خبر پورے ملک میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ لوگ کافی شاپ اور ریستورانوں میں اپنی ناقص معلومات کی بنیاد پر رائے زنی کر رہے تھے۔ کچھ لوگوں نے اس لڑکی کو ہی اپنی موت کا ذمے دار قرار دیا۔ ان کا خیال تھا کہ ایک مفرور لڑکی کو اس طرح کے یقینی خطرات کی توقع رکھنی چاہیے۔ گویا انہوں نے اپنے طور پر ایک نتیجہ اخذ کر لیا تھا۔ کچھ لوگ اس کے خاندان کے حوالے سے سرگوشیاں کر رہے تھے اور سوچ رہے تھے کہ کانگریس مین ولیم ڈوبس کس قسم کی خصوصی تحقیقات کا مطالبہ کر سکتا ہے۔

اس لاش کے ملنے کے دو دن بعد مجھے ہال جیسوپ کا فون موصول ہوا۔ اب وہ میری جگہ ایکٹنگ لیفٹیننٹ اور میجر کرائم اسکواڈ کے سربراہ کے طور پر کام کر رہا تھا۔ ”میں تم سے مشورہ کرنا چاہتا ہوں۔ اپنی یومیہ فیس اور متوقع اخراجات کے بارے میں بتا دو۔ تم تو جانتے ہی ہو کہ یہاں کس طرح کام ہوتا ہے۔“

میرے والد نے بڑی مشکل زندگی گزاری تھی۔ انہوں نے ہمیشہ یہی کہا کہ آدمی کو کبھی بھی گزرے ہوئے کل پر فخر نہیں کرنا چاہیے۔ یہ کوئی طاقت نہیں بلکہ تکلیف دہ کمزوری ہے۔ میں نے اس بات کو ہمیشہ ذہن میں رکھنے کی کوشش کی۔ جب میں صبح اٹھ کر اپنی بدصورت سبز یونیفارم کی قمیص کے بٹن بند کر کے کیلی فورنیا سیونگز اینڈ ٹرسٹ جانے کی تیاری کر رہا ہوتا جہاں میرا کام دروازے پر کھڑے ہو کر سیکیورٹی گارڈ کے فرائض انجام دینا تھا۔ میری پتلون لمبائی میں ایک انچ کم تھی جس کے نیچے سفید موزے صاف نظر آتے تھے۔ میرا پستول بھی پہلی جنگ عظیم کی یادگار تھا گو کہ میں نے اسے بہت اچھی حالت میں رکھا ہوا تھا لیکن مجھے بالکل بھی بھروسا نہیں تھا کہ یہ میری زندگی بچا سکتا ہے یا اسٹور میں لوٹ مار کر کے جانے والوں کو روک سکے گا۔

میں روزانہ وقت پر پہنچ جاتا اور آٹھ گھنٹے تک میرے ہاتھ کمر کی پیٹی سے چپکے رہتے۔ میں بوڑھی عورتوں کو دیکھ کر مسکراتا اور ان ماؤں کے لیے دروازہ کھولتا جن کی گود میں بچے لٹک رہے ہوتے۔

”اب تم کیا کہتے ہو؟“ ہال نے دوبارہ پوچھا۔

”تم میرے ماضی سے واقف ہو، جو کچھ میرے ساتھ ہو چکا ہے اس کے بعد......“

اس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”یہ بات پرانی ہو چکی اور لوگ اسے بھول گئے ہوں گے اور چیف وائیٹر بھی تمہاری مدد چاہتا ہے۔ کارٹر چھٹی پر ہے۔ اس کی وجہ سے اسٹاف کی کمی ہو گئی ہے۔“

میں جانتا تھا کہ ہال جیسوپ کے لیے یہ فون کرنا کتنا مشکل ہوا ہوگا کیونکہ میری رخصتی سے سب سے زیادہ فائدہ اسی کو ہوا تھا۔ وہ کبھی بھی اچھا پولیس آفیسر نہیں رہا لیکن میرے مقابلے میں دفتری اُمور بہتر طریقے سے سرانجام دیتا تھا۔

”میں تمہارے پاس آکر دیکھوں گا کہ معاملے کی نوعیت کیا ہے۔“ میں نے اپنی اونچی پتلون کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”یہ بہت اچھا ہوگا رے۔“ اس نے کہا اور میں نے محسوس کیا کہ وہ پرسکون ہو گیا ہے۔

پیتھالوجی اسسٹنٹ نے لڑکی کی لاش لاکر میں سے نکالی اور کور کی زپ کھول دی تاکہ اس کا بے جان چہرہ نظر آسکے۔ میری نظر سیدھی اس کی گردن پر گئی جہاں نارنجی اور سیاہ رنگ کے زخم دکھائی دے رہے تھے۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق اس کا گلا گھونٹا گیا تھا۔

”یہ اس بڑے گروپ کا حصہ تھی جو گزشتہ موسم سرما میں گولڈن گیٹ پارک میں پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا۔“ جیسوپ نے کہا۔ ”تم جانتے ہو کہ وہ تمام ہپیز ہر وقت ناچتے گاتے اور منشیات کے نشے میں دھت رہتے تھے اور اپنے کپڑے اُتار کر دنیا کو دکھانا چاہتے تھے کہ وہ کتنے آزاد ہیں۔“

”یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ ان کے جمع ہونے کا مقصد کیا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

"وہ ڈاکٹر ٹموتھی لیری کے پیروکار ہیں جو انہیں پُرسکون زندگی گزارنے کے لیے نشہ کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ میں نے سنا ہے کہ ایف بی آئی اس کے بارے میں تحقیقات کر رہی ہے۔"

میں نے بھی اخبارات میں اس تحریک کے بارے میں پڑھا تھا جو بڑی تیزی سے امریکی نوجوانوں کو اپنی لپیٹ میں لے رہی تھی۔ انہیں بال بڑھانے، تیز موسیقی سننے اور سرد رویہ اختیار کرنے کے لیے کہا جا رہا تھا جو بلاشبہ تباہی کا راستہ تھا جبکہ انہیں کسی سمت اور نظم وضبط کی ضرورت تھی لیکن انہیں ٹموتھی لیری جیسا رہبر ملا جو کہ معاشرے کے لیے حقیقی خطرہ تھا۔

"اگر تم دیکھ چکے ہو تو ہمیں چلنا چاہیے۔" جیسوپ نے کہا۔

"میں اس کے ہاتھ دیکھنا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"مجھے وہاں کوئی مزاحمتی زخم نظر نہیں آئے۔" جیسوپ بولا۔

پیتھالوجی اسسٹنٹ اندر آیا اور اس نے پورا کور کھول دیا۔ پھر لڑکی کے دونوں ہاتھ اس کے پیٹ پر رکھے اور پیچھے ہٹ گیا۔ میں نے جھک کر اس کے ہاتھوں کو دیکھا جو بہت چھوٹے تھے اور انگلیاں بھی پتلی تھیں۔ جیسا کہ جیسوپ نے کہا وہاں کسی ایسے زخم کا نشان نہیں تھا جو مدافعت کے نتیجے میں اسے لگا ہو۔

"اس نے اس شخص کو ضرور نوچا ہوگا جس نے گلا گھونٹنے کے لیے دونوں ہاتھ اس کی گردن پر رکھے تھے۔" میں نے کہا۔ "اس کے باوجود اس کا ایک ناخن بھی نہیں ٹوٹا۔"

"وہ یقیناً قاتل کو جانتی ہوگی۔" جیسوپ بولا۔ "وہ اس کا بوائے فرینڈ بھی ہو سکتا ہے۔"

"اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ اس کا فطری ردِعمل غالب آگیا اور وہ آخری سانس تک جدوجہد کرتی رہی۔"

میں نے مزید قریب ہو کر دیکھا اور اس کا الٹا ہاتھ پلٹ دیا۔ "کچھ بتا سکتے ہو کہ یہ کیا ہے؟" میں نے جیسوپ اور پیتھالوجی اسسٹنٹ دونوں سے پوچھا۔

دونوں آگے بڑھے اور سر جھکا کر غور سے دیکھنے لگے پھر جیسوپ نے کہا۔ "پرانا رنگ یا اس جیسی کوئی چیز ہو سکتی ہے۔"

اس کے بائیں ہاتھ کی پہلی تین انگلیوں کے پوروں پر نیلے رنگ کے مدھم نشانات تھے۔ "میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔" اسسٹنٹ نے کہا۔ "ہم نے اس پر توجہ نہیں دی۔"

میں نے اس نوجوان کی آنکھوں میں جھانکا۔ وہ نیا لگ رہا تھا اور میں نے اس سے پہلے کبھی اس کے ساتھ کام نہیں کیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ یونیورسٹی سے سیدھا یہیں آیا ہے۔

"آئندہ کبھی اونچی آواز میں یہ بات مت کہنا۔" میں نے سختی سے کہا۔

اس نے گلا صاف کیا اور بولا۔ "بہتر جناب۔"

"یہ کوئی رنگ یا سیاہی کے نشان لگتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ایک روئی کا پھایا لو اور معلوم کرو کہ یہ کیا ہے؟" یہ کہہ کر میں نے لڑکی کا ہاتھ واپس اپنی جگہ پر رکھ دیا۔

☆☆☆

کنگز لینڈنگ موٹیل کو ہرمن ہیٹی چلا رہی تھی جس کے برابر والی گلی سے لڑکی کی لاش ملی تھی۔ وہ ایک مضبوط جسامت والی بوڑھی عورت تھی جسے گیسٹ ہاؤس اور موٹیل چلانے کا تیس سالہ تجربہ تھا جن میں زیادہ تر عارضی نوعیت کے ہوتے تھے۔ میں اسے اس وقت سے جانتا تھا جب پہلی بار گشت پر نکلا۔ وہ ایک طرح سے زیرِزمین دنیا کی ملکہ تھی جسے تمام کھلاڑیوں کے نام معلوم تھے۔ جب بھی موٹیل میں ایسی صورتِ حال پیدا ہو جاتی جس پر قابو پانا اس کے بس میں نہ ہوتا تو میں اس کی مدد کیا کرتا تھا۔

وہ موٹیل کے عقب میں واقع منیجر یونٹ میں کچن ٹیبل پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے ڈھیلا ڈھالا گاؤن پہن رکھا تھا اور وہ فضا میں سگریٹ کے دھوئیں سے مرغولے بنا رہی تھی۔ وہ اس وقت یقیناً ساٹھ کے پیٹے میں ہوگی اور اس کے چہرے کی سختی بتا رہی تھی کہ اس نے زندگی میں بڑی مشکلات جھیلی ہیں۔ اس نے مجھے مشروب پیش کیا اور بولی۔

"اس لڑکی کی موت بڑی تکلیف دہ تھی۔"

"وہ یہاں دو راتیں ٹھہری تھی؟" میں نے کہا۔

"وہ یہاں ایک نوجوان شخص کے ساتھ آئی تھی۔ وہ کوئی فوجی تھا۔ اس کے بال کروکٹ تھے اور وہ کلین شو تھا۔ شاید وہ نیا نیا اکیڈمی سے آیا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں خرگوش جیسی چمک دیکھی۔"

میں جانتا تھا کہ وہ لڑکا کارل ٹیپ اس کا بوائے فرینڈ تھا۔ وہ امریکی فوج میں لازمی خدمات انجام دے رہا تھا اور اسے محاذِ جنگ پر ہونا چاہیے تھا لیکن اس قتل کی تحقیقات کی وجہ سے اسے رکنا پڑ گیا۔

"ان دونوں کے درمیان زبردست جھگڑا ہوا تھا۔" ہیٹی نے بتایا۔ "میں عام طور پر لوگوں کے معاملات سے دور رہتی ہوں لیکن وہ اتنی اونچی آواز میں بول رہے تھے کہ ایک بوڑھی عورت بھی انہیں سن سکتی تھی۔ وہ مسلسل ایک ہی بات کہے جا رہا

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

تھا کہ تمہیں مجھ کو بتانا چاہیے تھا۔"

میں جانتا تھا کہ جیسوپ نے اس فوجی سے پوچھ گچھ کی ہے اور وہ اسے ہی قاتل سمجھ رہا ہے۔ کارل کا کہنا تھا کہ انہوں نے اس کی گزشتہ چھٹی پر ملنے کا پروگرام بنایا تھا لیکن اس پر عمل نہ ہو سکا کیونکہ میریان، ہپیوں کے اس گروپ کے ساتھ چلی گئی جن سے اس کی ملاقات سان فرانسسکو میں ہوئی تھی۔ وہ اس لیے بھی پریشان تھا کہ اس کے دماغ پر ہپی سوار ہو گئے تھے۔

"کیا کوئی غیر متعلقہ شخص موٹیل کے آس پاس دیکھا گیا؟" میں نے پوچھا۔

اس نے سگریٹ کا گہرا کش لیا اور سر ہلاتے ہوئے بولی۔ "نہیں، یہاں زیادہ تر شرابی مزدور آتے ہیں اور وہ کسی ایسے شخص کی طرف نہیں دیکھتے جس کے پاس بوتل نہ ہو۔ لیکن شاید میں جانتی ہوں کہ وہ اپنے دوست سے کیوں لڑ رہی تھی۔"

☆☆☆

"مجھے سمندر پار محاذ پر ہونا چاہیے تھا۔" کارل نیپ نے کہا۔

اس کے چہرے کی رنگت فوجی تربیت کی وجہ سے تانبے جیسی ہو گئی تھی اور جسم اتنا سخت ہو گیا تھا کہ شاید اس میں دوبارہ لچک پیدا نہ ہو سکے۔ میں نے اس کی آنکھوں میں خوف اور تنہائی کی کیفیت دیکھی۔ ہم لوکل گارڈ یونٹ کی بیرک کے باہر ایک بینچ پر بیٹھے ہوئے تھے جہاں ملٹری پولیس نے اسے رکھا ہوا تھا جب تک کہ اس پر لگایا ہوا الزام دور نہ ہو جائے۔

"تم جلد ہی وہاں چلے جاؤ گے۔" میں نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی۔ "میں میریان کے ساتھ تمہاری لڑائی کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔"

"میں نے اس موٹے آفیسر کو سب کچھ بتا دیا ہے۔" اس نے کہا۔ "لیکن وہ میری کوئی بات نہیں سن رہا تھا کیونکہ وہ میرے بارے میں اپنا ذہن بنا چکا ہے۔ میں نے اسے بتایا کہ میریان کسی معاملے میں جذباتی ہو رہی تھی لیکن وہ جانتی تھی کہ مجھے محاذ پر جانا ہے۔ اس لیے وہ مجھے اس معاملے میں نہیں گھسیٹ سکتی۔"

میں نے اس کی بائیں کلائی پر خراشیں دیکھیں اور ان کی جانب اشارہ کیا تو وہ اپنے بازو کو اس طرح دیکھنے لگا جیسے پہلی بار اس پر نظر گئی ہو۔

"یہ خاردار تاروں کی وجہ سے آئی ہیں۔ ہمیں ان کے درمیان سے گزرنا ہوتا ہے۔"

"تو تم نے میریان پر اعتراض کیا تھا کہ وہ ہپیوں کے پاس کیوں گئی تھی۔ تم نے اس بوڑھے آدمی کا ذکر نہیں کیا جو موٹیل میں آیا تھا اور اس کے کمرے کا کرایہ دینے کی کوشش کی تھی۔"

کارل کی آنکھوں میں حیرت کی لہر ابھری اور وہ مضطرب نظر آنے لگا۔ "کچھ معاملات میں آدمی کو اپنا خیال خود رکھنا پڑتا ہے۔"

"میں مانتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اور اس پر بھی یقین رکھتا ہوں کہ آدمی کو ان باتوں کا اعتراف کر لینا چاہیے جو اس کے دماغ میں گردش کر رہی ہوں۔ تمہیں معلوم ہے کہ اب تک ایک سو چورانوے مجرموں کو گیس چیمبر کی سزا ہو چکی ہے۔ تم نہیں چاہو گے کہ تمہارا نمبر ایک سو پچانوے ہو۔"

کارل آگے کی طرف جھکا اور اپنے ہاتھوں کو دیکھنے لگا پھر اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ "ہم بچپن سے ایک دوسرے کو جانتے تھے اور محاذ پر جانے سے پہلے ہماری شادی ہونے والی تھی لیکن وہ اپنی ایک نئی گرل فرینڈ کے ساتھ کہیں چلی گئی جس سے اس کی ملاقات اس وقت ہوئی جب میں فورٹ اورڈ میں زیرِ تربیت تھا۔"

"اس نئی دوست کا نام کیا تھا؟"

"جینی۔ مجھے اس کا پورا نام معلوم نہیں۔ البتہ اس کے بال سرخ تھے۔" یہ کہہ کر اس نے بینچ کی پشت سے ٹیک لگا لی اور خالی آنکھوں سے آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ میرا اندازہ تھا کہ جو کچھ اس کے ذہن میں ہے، وہ حقیقت سے قریب نہیں۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ بولا۔ "اس لڑکی نے ہی میریان کو ان لوگوں میں جا کر پھنسا دیا۔ میری خواہش تھی کہ ہم پورٹ لینڈ واپس چلے جائیں اور یہ سارے ہپی یہاں سے دفع ہو جائیں۔"

"مجھے اس بوڑھے آدمی کے بارے میں بتاؤ۔" میں نے کہا۔

کارل نیپ نے مجھے کلنٹن ڈیوس نامی شخص کے بارے میں بتایا جو اپنی واکس ویگن ... پر پارک کے باہر رنگین قمیصیں اور سوتی کمبل بیچا کرتا تھا۔ نوجوان نسل کی نظروں میں وہ ایک ہیرو کا درجہ رکھتا تھا کیونکہ اس نے ہمیشہ گھر سے بھاگے ہوئے اور بھانے باز لوگوں کو کھانے کے لیے پیسے دیے۔

مجھے وہ شخص کچھ پُراسرار لگا جو خود اپنی گزر اوقات کے لیے پرانے کپڑے اور کمبل فروخت کرتا تھا۔ وہ کس طرح دوسرے لوگوں کو کھلا سکتا ہے۔ یقیناً اس کی تہ تک جانا ضروری ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کا کوئی اور ذریعۂ آمدنی بھی ہو۔ میرے لیے اس شخص کلنٹن ڈیوس سے ملنا ضروری ہو گیا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

☆☆☆

''میں ایک میل سے تمہاری خوشبو سونگھ سکتا ہوں۔'' کلنٹن نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔ اس وقت سورج پوری طرح چمک رہا تھا اور پارک میں نوجوان لڑکے لڑکیاں گھاس پر ڈیرا جمائے ہوئے تھے۔ کچھ کے ہاتھوں میں گٹار تھا اور چند ایک جنگ کے خلاف پمفلٹ بانٹ رہے تھے۔ میں نے اس کے موڈ کو بھانپتے ہوئے کہا۔

''میں پولیس والا نہیں بلکہ میریان ڈوبس کا ایک دوست ہوں۔''

یہ نام سنتے ہی اس کے چہرے سے بناوٹی مسکراہٹ غائب ہوگئی۔ وہ ایک سبز رنگ کی ویگن کے سامنے چھوٹی سی میز پر بیٹھا ہوا تھا اور اس وین پر جا بجا سیاسی نعرے اور اسٹیکرز لگے ہوئے تھے۔ اس نے نوعمر لڑکوں جیسا لباس پہن رکھا تھا۔ پرانی ہاف جینز، رنگین قمیص، سینڈل جبکہ اس نے اپنے سیاہ بالوں کو پونی ٹیل کی شکل میں باندھ رکھا تھا۔

''تم بھی اس کے بوائے فرینڈ کی طرح مجھے تنگ کرنے چلے آئے۔'' اس نے کہا۔ ''وہ لڑکا تو غصے کا بہت تیز ہے۔''

میں نے نفی میں اپنا سر ہلایا اور بولا۔ ''تم غلط سمجھ رہے ہو۔ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔''

''پھر کیوں آئے ہو؟'' وہ مجھے گھورتے ہوئے بولا۔

''میں نے بتایا ہے کہ وہ میری دوست تھی۔ مجھے اس کی موت کا بے حد صدمہ ہے۔ کسی بے رحم قاتل نے اسے بڑی سفاکی سے ہلاک کیا ہے۔ ویسے تو پولیس اپنے طور پر تفتیش کر رہی ہے لیکن مجھے قرار نہیں آ رہا۔ اسی لیے تم سے کچھ باتیں پوچھنے آیا ہوں۔''

''میں اسے نہیں جانتا۔ میرا اس سے کوئی تعلق نہیں تھا۔'' وہ تیز لہجے میں بولا۔

''اگر کوئی تعلق نہیں تھا تو تم نے اس کے کمرے کا کرایہ دینے کی کوشش کیوں کی تھی۔ کیا میں اس کی وجہ جان سکتا ہوں؟''

وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ ''میں نے گھر سے بھاگے ہوئے کئی لوگوں کی مدد کی ہے۔ انہیں کھانا، کپڑے اور ضرورت کی دوسری چیزیں مہیا کرتا ہوں۔''

اس کے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی جس نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے ایک بار پھر اس کا سر سے پاؤں تک بغور جائزہ لیا اور بے اختیار بول اٹھا۔ ''یہ تمہارے ہاتھوں پر کیا لگا ہوا ہے؟''

اس نے اپنی انگلیوں کو دیکھا جیسے کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ ''یہ رنگ کے دھبے ہیں۔ قمیصوں اور کمبلوں کو رنگنے میں بچے میری مدد کرتے ہیں۔''

صاف لگ رہا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے لیکن میں نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''کیا کبھی میریان نے بھی تمہاری مدد کی؟''

''جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے کبھی نہیں۔ وہ بہت صفائی پسند تھی اور اسے اپنے ہاتھ گندے کرنے کی عادت نہیں تھی۔''

''تم یہ کام کہاں کرتے ہو۔ اپنی وین کے باہر یا تمہارا کوئی گودام بھی ہے؟''

اسی وقت چھ یا سات نوجوانوں کا ایک گروپ وہاں آ گیا اور کلنٹن انہیں دیکھتے ہی اپنی میز سے نیچے اتر آیا۔ وہ زور زور سے گانے گا رہے تھے اور آپس میں ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ ان کے کپڑے میلے اور سر کے بال الجھے ہوئے تھے۔ میرے خیال میں انہیں طویل غسل کی ضرورت تھی۔ انہوں نے اسے کاغذ کے دو تھیلے پکڑائے جن میں ڈبوں میں بند خوراک اور سبزیاں تھیں۔ میرا اندازہ تھا کہ یہ چیزیں انہوں نے دکانوں سے چرائی ہوں گی پھر ان میں سے ایک لڑکے نے اسے نوٹوں کی گڈی پکڑائی اور میں نے دیکھا کہ وہ سب اپنی ضرورت کی چیزیں خریدنے لگے۔ کلنٹن نے ان سے کوئی بھاؤ تاؤ نہیں کیا بلکہ جس کا جو دل چاہا۔ وہ اس نے اٹھا لیا۔

''تم میں سے کوئی پورٹ لینڈ سے بھاگی ہوئی اس لڑکی کے بارے میں کچھ جانتا ہے جسے گزشتہ ہفتے قتل کر دیا گیا تھا؟'' میں نے ان سے پوچھا اور ان کے چہروں کا جائزہ لیا۔ میں نے غور کیا تو ایک لڑکی میری طرف دیکھ رہی تھی پھر میری توجہ کو محسوس کرتے ہوئے اس نے دوسری جانب نظریں پھیر لیں۔ وہ طویل قامت دبلی پتلی لڑکی تھی اور اس کے لمبے سرخ بال تھے۔

''ہمیں تم سے باتیں کر کے خوشی ہوتی لیکن مجھے اپنے خاندان کے لیے دوپہر کا کھانا تیار کرنا ہے۔'' کلنٹن نے سامان کے تھیلے اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''تم ہمارے ساتھ شامل ہو سکتے ہو بشرطیکہ ہماری آج ہونے والی گفتگو سن سکو جس کا موضوع ہے 'حکومت کا جنگی ہتھیاروں پر انحصار جن کے ذریعے وہ اپنی معیشت سدھارنا چاہتی ہے۔'

میں نے جس انداز میں اسے دیکھا۔ وہ اس مسکراہٹ سے قدرے مختلف تھا جو میں نے اپنے چہرے پر سجا رکھی تھی۔ وہ بھی جانتا تھا کہ ہماری گفتگو ابھی ختم نہیں ہوئی ہے اور اسے ایک بار پھر مجھ سے ملاقات کے لیے ذہنی طور پر تیار رہنا

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

چاہیے۔

شام چھ بجے کے قریب ہال جیسوپ نے مجھے فون کیا۔ اس وقت میں اپنے اندھیرے کمرے میں کرسی پر بیٹھا میرل ہیگرڈ کا نیا ریکارڈ سن رہا تھا۔ میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں کہ کمرے میں روشنی کیوں نہیں تھی۔ بس یہ میری عادت ہے۔ مجھے اندھیرے میں موسیقی سننا اچھا لگتا ہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد یہ میرا معمول بن گیا تھا۔ میں ڈبوں میں بند کھانا کھاتا۔ ٹیلی وژن پر جنگ کی خبریں سنتا یا اخبار میں شائع ہونے والے معمے میں سر کھپاتا۔ اس زمانے میں میرا کسی سے ملنا جلنا نہیں تھا۔ سیلیا نے عدالت میں طلاق کی درخواست دے رکھی تھی اور ہنری ولس نامی ایک مکینک کے ساتھ چلی گئی تھی۔ اب مجھے کسی بات سے پریشانی نہیں ہوتی تھی۔ نوکری نہیں رہی۔ بیوی چھوڑ کر چلی گئی۔ میں نے اسے تقدیر کا لکھا سمجھ کر برداشت کرلیا۔ میں آزردگی کا روگ پالنا نہیں چاہتا تھا۔ میرے لیے یہ ایک ایسا سفر تھا جو منزل پر پہنچنے سے پہلے ہی ختم ہو گیا ہو۔ اب بقیہ زندگی مجھے اپنے تنہا وجود کے ساتھ گزارنا تھی۔

''کانگریس مین ڈوبس چاہتا ہے کہ قاتل کو ایک ہفتے کے اندر گرفتار کرلیا جائے۔'' جیسوپ نے کہا۔

''وہ کہتا ہے کہ نیپ کا اس کی بھتیجی سے شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وہ محض اسے خواب دکھا رہا تھا۔ ویسے بھی اس لڑکے کا خاندانی پس منظر کچھ اچھا نہیں ہے اور اگر وہ پروپوز کرتا تب بھی یہ شادی نہیں ہوسکتی تھی۔''

''میں کچھ اور پہلوؤں پر بھی غور کررہا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''اور چاہتا ہوں کہ تم سان فرانسسکو پولیس کو فون کرو کہ کلنٹن ڈیوس نامی ایک شخص پر نظر رکھنی ہے۔''

جیسوپ نے ایک طویل سانس لی اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگالی۔ میں اس کی کرسی کی چرچراہٹ کی آواز سن سکتا تھا۔ مجھے یہ اندازہ لگانے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی کہ اس نے میری بات کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ وہ صرف نیپ کو موردِ الزام ٹھہرا کر کانگریس مین کی نظروں میں سرخ رو ہونا چاہ رہا تھا۔

''کیا تم یہ چاہتے ہو کہ جلد بازی میں صرف مفروضے کی بنیاد پر کسی کو اس قتل کا ملزم ٹھہرا دیا جائے۔'' میں نے جھلاتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم ایسا سوچ رہے ہو تو تم نے غلط آدمی کا انتخاب کیا ہے۔ مجھے کسی لڑکے کو جیل بھجوانے سے دلچسپی نہیں ہے کیونکہ یہ ایک سیاست داں کے لیے بہت آسان ہے۔ میرا ضمیر بالکل مطمئن ہے اور میں اسے داغ دار کرنا نہیں چاہتا۔''

''ایسی بات نہیں ہے رے۔'' جیسوپ نے کہا۔ ''کانگریس مین کو صرف یہ فکر ہے کہ جب لوگوں کو یہ معلوم ہوگا کہ اس کی بھتیجی جنگ کے خلاف تحریک میں شامل تھی اور مظاہرین کا ساتھ دے رہی تھی تو اس کے لیے وضاحت کرنا مشکل ہوجائے گا۔ تم جانتے ہو کہ ایک سیاست داں کو اپنی ساکھ کتنی عزیز ہوتی ہے اور وہ اپنے مفادات کا تحفظ کرنے کے لیے کسی حد تک بھی جا سکتا ہے۔ بہرحال تمہیں یہ نکتہ بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ اس لڑکی سے ملنے والا آخری شخص نیپ ہی تھا۔ ان دونوں کے درمیان لڑائی بھی ہوئی تھی کیونکہ میریان نے اس کا پروپوزل قبول کرنے سے انکار کردیا تھا جس پر وہ ناراض ہوگیا اور تلخ کلامی کی نوبت آگئی۔ کیا قتل کا محرک ثابت کرنے کے لیے یہ کافی نہیں ہے۔ خاص طور پر ایسی صورت میں کہ کسی اور کے ساتھ اس لڑکی کا کوئی تنازعہ ہمارے علم میں نہیں ہے۔''

ریکارڈ کی سوئی ایک جگہ اٹک گئی تھی۔ اس نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''میڈیکل ایگزامنر کی رپورٹ بھی آگئی ہے۔ اس کے مطابق لڑکی مسکن ادویات لینے کی عادی تھی۔ اس سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ وہ مزاحمت کیوں نہ کر سکی۔ اس لیے کہ ان دواؤں نے اس کی قوتِ مزاحمت کو ختم کر دیا تھا اور وہ اپنا دفاع کرنے کے قابل نہیں رہی تھی۔ ہم کانگریس مین کے کہنے پر اس رپورٹ کو پریس سے خفیہ رکھ رہے ہیں۔''

وہ کچھ اور بھی کہتا لیکن میں نے بات کاٹ دی۔ اس کانگریس مین کا ذکر سن کر میں بیزار ہو چکا تھا اس لیے جان چھڑانے کے لیے کہا۔ ''میری نظر میں ان باتوں کی اہمیت نہیں کیونکہ فی الوقت میں اس لڑکے کو ملزم نہیں سمجھ رہا بلکہ میری نظریں کہیں اور ہیں۔ میں نے تم سے کلنٹن ڈیوس کے بارے میں جو کچھ کہا ہے اس پر ضرور غور کرو۔ میں بھی مزید معلومات حاصل کرنے کی کوشش کررہا ہوں اور اس سلسلے میں تم سے کل بات کروں گا۔'' یہ کہہ کر میں نے فون بند کردیا۔

گو کہ یہ ایک پرانی چال تھی لیکن پہلے بھی یہ کامیاب رہی تھی۔ ایک ماہی گیر کی طرح جو اپنے پسندیدہ مقام پر چارا ڈالنے آتے ہیں۔ میں بھی اپنی گاڑی پارک کے باہر کھڑی کر کے شکار کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ ہی دیر بعد میں نے دو ہپی لڑکیوں کو ایک بڑے درخت کے برابر میں واقع گیٹ سے نکلتے دیکھا۔ یہ جھٹپٹے کا وقت تھا جب دن کی روشنی ماند پڑ جاتی ہے اور رات کی سیاہی پھیلنے لگتی ہے۔ میں نے اپنا اطمینان

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

کرنے کی خاطر انہیں ترچھی نظر سے دیکھا۔ ان میں سے ایک وہی سرخ بالوں والی لڑکی تھی۔ میں نے گاڑی گیئر میں ڈالی اور فٹ پاتھ کے ساتھ رینگنے کے انداز میں آگے بڑھنے لگا۔ احتیاطاً میں نے گاڑی کی ہیڈ لائٹس بجھا دی تھیں۔ وہ لڑکوں کے ایک گروپ کے پاس سے گزرتی ہوئی چلی گئیں جو ایک محراب دار گلی کے باہر کھڑا ہوا تھا۔ میرا خیال تھا کہ یہ لڑکیاں بھی اسی گروپ میں شامل ہیں لیکن وہ ان کے پاس رکے بغیر اندر چلی گئیں۔ میں کار ایک جگہ کھڑی کر کے باہر نکلا اور سڑک پار کر کے اس طرف آ گیا۔ مجھے پن بال مشین اور اندر کھیلے جانے والے کھیلوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔

''یہ تمہارا سونے کا وقت ہے ڈیڈی۔'' ایک لڑکے نے میرا مذاق اڑاتے ہوئے کہا لیکن میں اسے نظر انداز کر کے گلی میں داخل ہو گیا۔ وہاں کئی نوجوان لڑکے اور لڑکیاں مشینوں میں سکے ڈال رہے تھے اور اندھیرے میں جھلملاتی روشن اسکرین پر اپنا پسندیدہ کھیل کھیل رہے تھے۔ میری نظر اس سرخ بالوں والی لڑکی پر گئی جو کاؤنٹر پر کھڑی چینج لے رہی تھی۔ کاؤنٹر پر بیٹھا ہوا لڑکا تقریباً اس کا ہم عمر تھا اور اس کے ساتھ وقت گزاری کے لیے باتیں کر رہا تھا۔ لڑکی نے بھی جواب میں اسے مسکرا کر دیکھا اور اپنے بالوں کی لٹ سے کھیلنے لگی۔ پھر وہ پلٹی اور اسی محراب کی طرف جانے لگی جہاں سے وہ اندر داخل ہوئی تھی۔ جب وہ میرے پاس سے گزری تو میں نے یوں ظاہر کیا جیسے پن بال مشین پر کھیل رہا ہوں۔

چند لمحوں بعد میں بھی باہر آ گیا اور کچھ فاصلہ رکھ کر ان کا تعاقب کرنے لگا۔ ہوا بالکل بند تھی جس کی وجہ سے میری پشت پر پسینا بہنے لگا لیکن میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ رک کر رومال سے گردن کا پسینا پونچھ لیتا۔ دونوں لڑکیاں ایک دواؤں کی دکان کے باہر رک گئیں۔ سرخ بالوں والی نے دوسری لڑکی کو کچھ نوٹ پکڑائے اور فٹ پاتھ پر کھڑے ہو کر اس کی واپسی کا انتظار کرنے لگی۔

''جینی۔'' میں نے اس کے قریب جا کر آہستہ سے کہا تو وہ پلٹی اور حیران ہو کر مجھے دیکھنے لگی۔ شاید وہ سوچ رہی تھی کہ مجھے اس کا نام کیسے معلوم ہوا۔ میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں خوف اُمڈ آیا تھا اور وہ یوں گھبرا رہی تھی جیسے چوری کرتے ہوئے پکڑی گئی ہو۔

میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''ڈرو نہیں۔ میرا ارادہ تمہیں پریشان کرنے کا نہیں ہے۔''

اس نے اِدھر اُدھر دیکھا جیسے کسی کو اپنی مدد کے لیے بلانا چاہ رہی ہو لیکن وہاں دور دور تک کوئی نہیں تھا اور سڑک بالکل

پہچان

''مسٹر جونز۔'' ایک نوجوان نے کہنا شروع کیا۔ ''آپ...... کیا آپ مجھے......''

''ہاں میرے عزیز، تم اسے حاصل کر سکتے ہو۔'' جونز نے فوراً کہا۔

نوجوان کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔ ''کیا کسے حاصل کر سکتے ہو؟'' اس نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔

''میری لڑکی کو۔'' مسٹر جونز نے جواب دیا۔ ''آپ کا یہی مطلب تھا کہ آپ میری لڑکی سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔''

''جی نہیں۔'' نوجوان نے کہا۔ ''میں تو یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ کیا مجھے پچاس ڈالر قرض دے سکتے ہیں؟''

''ہرگز نہیں۔'' مسٹر جونز نے بے مروتی سے کہا۔ ''کیونکہ میں جانتا نہیں کہ تم کون ہو؟''

مرحا گل، درابن کلاں

سنسان پڑی ہوئی تھی۔

''تم وہی پولیس والے ہو۔'' اس نے کہا اور مجھے ناراضی سے دیکھنے لگی۔

''میں پولیس والا نہیں ہوں۔ ہماری ایک مشترکہ دوست میریان ڈوبس تھی۔ اسی کے بارے میں تم سے بات کرنی ہے۔''

یہ نام سنتے ہی اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اس نے مجھے گھورا پھر نیچے کی طرف دیکھنے لگی۔

''پولیس کا خیال ہے کہ تم اس وقت وہاں موجود تھیں جب اس کا قتل ہوا۔'' میں نے ہوا میں تیر چلایا تھا جو نشانے پر بیٹھا۔ اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے میں نے کہا۔ ''انہیں وہاں سے تمہارے سرخ بال بھی ملے ہیں۔''

وہ پلکیں جھپکا کر مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے شام کے دھندلکے میں اس پر نظر ڈالی۔ وہ واقعی بہت کم عمر اور معصوم تھی۔ ایسی لڑکیوں سے کسی جرم کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

''میں صرف اسے ایک بڑی غلطی سے بچانے کی کوشش کر رہی تھی۔'' اس نے کہا پھر اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولی۔ ''کلنٹن نہیں چاہے گا کہ میں تم سے کوئی بات کروں۔''

اتنی دیر میں دوسری لڑکی بھی آ گئی۔ اس کے ہاتھ میں

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

کچھ نوٹ اور سکے تھے۔ اس نے مجھے دیکھا اور پیسے جینی کو پکڑا دیے۔
''اب ہمیں چلنا چاہیے۔'' جینی نے کہا اور اس لڑکی کو کھینچتی ہوئی لے گئی۔
میں کچھ دیر وہاں کھڑا ان دونوں کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا پھر سڑک پار کر کے اپنی گاڑی میں آگیا۔ میں کار میں بیٹھ کر میریان ڈیوس اور ان لوگوں کے بارے میں سوچنے لگا جن سے وہ ملی تھی جبکہ میری نگاہیں کسی بار کے نیون سائن کو تلاش کر رہی تھیں جہاں ٹھنڈی بیئر مل سکے۔ میں نے سات سال سے شراب چھوڑ رکھی تھی اور اب اچانک ہی مجھے اس کی طلب ہونے لگی۔ مجھے وہاں ایسا کوئی بار نظر نہیں آیا۔ مجبوراً میں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور گھر واپس آگیا۔ کھڑکی کھولی تو ہوا کے جھونکے میرے چہرے سے ٹکرانے لگے۔ میں بستر پر لیٹ کر میریان کے بارے میں سوچنے لگا۔ اس کیس میں ابھی تک کوئی خاص پیشرفت نہیں ہوئی تھی اور میں جن خطوط پر کام کر رہا تھا، وہ اسی وقت واضح ہوتے جب کلنٹن کے بارے میں رپورٹ مل جاتی۔
دوسری صبح ٹیلی فون کی گھنٹی سے میری آنکھ کھلی۔ جیسوپ کا فون تھا۔ اس نے بتایا۔ ''کلنٹن ڈیوس تو ایک تیر کے مانند سیدھا ہے۔ اس کے پاس اکنامکس کی ڈگری ہے اور وہ ڈیڑھ سال پہلے تک سان فرانسسکو کے ایک بینک میں کام کرتا رہا ہے۔ لگتا ہے کہ وہ بھی ہپیوں کے گروپ میں شامل ہو گیا ہے۔''
''اس کا کوئی پولیس ریکارڈ نہیں ہے؟'' میں نے پوچھا۔
''جس آفیسر نے اس کی تحقیقات کیں، اس کا کہنا ہے کہ اس کا ریکارڈ بالکل صاف ہے اور اس نے کبھی کوئی جرم نہیں کیا۔ البتہ ایک بار بینک کی نوجوان کیشیئر سے شادی کرنے کی کوشش ضرور کی تھی۔ لڑکی کے والدین نے اس پر الزام عائد کرنا چاہا لیکن وہ دونوں خود ہی الگ ہو گئے۔ لڑکی کا نام.....''
میں نے فون پر نوٹ بک کے صفحے پلٹنے کی آواز سنی لیکن میں پہلے سے وہ نام جانتا تھا۔
''جینی رینالڈ'' اس نے میرے اندازے کے عین مطابق جواب دیا۔
مجھے پانچ گھنٹے انتظار کرنا پڑا۔ بالآخر میری نگرانی رنگ لائی۔ آدھی رات بیت چکی تھی جب میں نے کلنٹن ڈیوس کا تعاقب شروع کیا۔ جب وہ اپنی واکس ویگن میں پارک سے نکل کر شہر کے اس حصے کی طرف جا رہا تھا جہاں زیادہ تر گودام تھے۔ وہ ایک اسٹور کے برابر والی تنگ سڑک پر مڑ گیا۔ جہاں ہول سیلر کو کرائے پر گودام دیے جاتے تھے۔ میں نے اپنی گاڑی کی ہیڈ لائٹس بجھا دیں اور گاڑی کی رفتار بھی آہستہ کر دی۔ اس کی واکس ویگن ایک گودام کے سامنے رک گئی تھی۔ میں نے بھی گاڑی کو بریک لگائے اور آہستہ سے دروازہ کھول کر باہر آگیا۔ پھر مجھے اس کا ہیولا نظر آیا تو میں بھی بے آواز قدموں سے اس کا تعاقب کرنے لگا۔
گودام کے لوہے کے دروازے کے نیچے سے روشنی کی لکیر باہر آرہی تھی اور میں باہر کھڑا سن گن لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ میرے کانوں میں کچھ ایسی آوازیں آئیں جیسے بکس کو ہٹانے کی کوشش کی جا رہی ہو۔ میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا اور نہ ہی کوئی قانونی اختیار۔ اصولی طور پر مجھے ہال جیسوپ کو فون کرنا چاہیے تھا لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ شاید اس مہم کا کریڈٹ خود لینا چاہ رہا تھا۔ اس لیے بے دھڑک اندر چلا گیا۔
کمرے میں بہت کم روشنی تھی اور صرف ایک بلب جل رہا تھا۔ میں نے آنکھیں پھاڑ کر وہاں کا جائزہ لیا تو ہر طرف چھپے ہوئے پمفلٹوں کے ڈھیر، کاغذ کے ڈبے، سیاہی یا ڈائی کے جگ نما برتن نظر آئے۔ آخری دیوار کے ساتھ ایک لوہے کی میز رکھی ہوئی تھی جس پر مختلف رنگوں سے بھری ہوئی لوہے کی ٹرے موجود تھیں جیسے کسی آرٹ کلاس روم میں ہوتی ہیں۔ سفید ٹی شرٹس کا ڈھیر لگا ہوا تھا جن پر رنگ ہونا تھا۔ لیکن کلنٹن ڈیوس وہاں موجود نہیں تھا۔
میں نے لمحہ بھر کے لیے سوچا۔ اس کی غیر موجودگی میری سمجھ سے بالاتر تھی۔ وہ میرے سامنے اندر آیا تھا پھر کہاں چلا گیا۔ اس ہال نما کمرے میں کوئی عقبی دروازہ بھی نہیں تھا جس سے وہ باہر جا سکتا اور نہ ہی وہاں چھپنے کے لیے کوئی جگہ تھی۔ شاید میں اسے واپس جاتے ہوئے نہیں دیکھ سکا۔ میں بھی پلٹنے والا تھا کہ ایک جھنجھناہٹ والی آواز سنائی دی پھر یوں لگا جیسے کوئی مشین چل رہی ہو۔ یہ آواز دیوار کے پیچھے سے آرہی تھی اور پھر کچھ دیر بعد رک گئی۔ اب وہاں مکمل خاموشی تھی پھر میں نے کسی چیز کے کھسکنے کی آواز سنی۔ وہ دیوار اپنی جگہ سے حرکت کر رہی تھی۔ میں نے مدھم روشنی میں اپنی پلکیں جھپکائیں اور دیکھا کہ اس مصنوعی دیوار کے عقب میں واقع ایک کمرے سے کلنٹن ڈیوس برآمد ہو رہا تھا۔
اس کے ہاتھ میں ایک لمبی چوڑی غیر تراشیدہ کرنسی کی شیٹ تھی۔ اس کے عقب میں مجھے ایک بڑا پرنٹنگ پریس نظر آرہا تھا اور دیکھنے میں یہ بالکل کسی اخبار کا تہ خانہ لگ رہا تھا۔ مشین کے ایک طرف تانبے کے حروف میں ہیڈل برگ لکھا ہوا تھا۔ کلنٹن اپنی جگہ پر رک گیا اور حیرت سے مجھے دیکھنے لگا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

"تم جیسے نظر آتے ہو اس سے کہیں زیادہ بڑے انسان ہو۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ بظاہر معصوم اور بے ضرر نظر آنے والا شخص اتنا لالچی بھی ہو سکتا ہے۔"

"اس نئی دنیا میں خوش آمدید۔" اس نے ڈھٹائی سے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ہر کوئی اپنے مفاد کے لیے کام کرتا ہے۔ مجھے بھی بینک میں کام کر کے کافی دنوں بعد معلوم ہوا کہ لوگ اتنی جلدی امیر کیسے بن جاتے ہیں۔"

"اسی لیے تم نے خود نوٹ چھاپنا شروع کر دیے اور نوجوان لڑکے لڑکیوں کو اپنا آلۂ کار بنایا تاکہ وہ اسے مارکیٹ میں پھیلا سکیں۔ وہ یہ جعلی نوٹ لے کر دکانوں پر جاتے اور ان کے عوض چھوٹے نوٹ اور سکے لا کر تمہیں دے دیتے۔"

اس نے کندھے اچکائے اور بولا۔ "کاروبار ایک اچھی چیز ہے۔"

یہ تفصیل بتانے کی ضرورت نہیں کہ کلنٹن ڈیوس نے کس طرح وہاں سے بھاگنے کی کوشش کی اور کس طرح اس نے جیسوپ اور اس کے آدمیوں کا سامنا کیا جو میرے فون کرنے پر ایک لمحہ ضائع کیے بغیر وہاں پہنچ گئے تھے۔ وہ جعل سازی کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑا گیا تھا۔ پولیس نے تمام سازوسامان سمیت اس کمرے کو سیل کر دیا اور جعلی نوٹ قبضے میں لے لیے۔ وہ تمام ثبوتوں کے ساتھ گرفتار ہوا تھا اور اس الزام میں اس کے بچنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔

میریان کے قتل کا عقدہ اس وقت کھلا جب جیسوپ نے جینی رینالڈ کو گواہوں کے کٹہرے میں کھڑا کیا اور اسے جتا دیا کہ اگر اس نے حقائق چھپانے کی کوشش کی تو اسے بھی جیل کا منہ دیکھنا پڑے گا اور عورتوں کے لیے وہاں کی زندگی بہت سخت اور تکلیف دہ ہوتی ہے۔

"تم واپس آجاؤ اور ہمارے ساتھ مل کر کام کرو۔" جیسوپ نے پولیس اسٹیشن کے باہر سیڑھیوں پر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"اس بارے میں سوچوں گا۔" میں نے اسے ٹالنے کے لیے کہہ دیا لیکن میرے ساتھ جو کچھ ہو چکا تھا اس کے بعد پولیس کی ملازمت میں جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

کلنٹن کی گرفتاری کے دوسرے روز ہی کارل نیپ کو مشتبہ افراد کی فہرست سے نکال دیا گیا اور وہ محاذ کے لیے روانہ ہو گیا۔ میں نے صرف دل سے دعا مانگی کہ وہ بخیر و عافیت واپس آجائے لیکن سچی بات یہ ہے کہ مجھے اس کے بارے میں کوئی خبر نہیں ملی۔

کلنٹن ڈیوس پر قتل کا مقدمہ دو ہفتے تک چلتا رہا اور اس دوران کئی انکشافات ہوئے اور حکومت کے خلاف چلنے والی تحریک کے تاریک پہلو بھی سامنے آئے اور یہ حقیقت بھی واضح ہو گئی کہ لالچ صرف مراعات یافتہ طبقے تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ اس نے پورے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ کلنٹن کو قتل کے جرم میں موت کی سزا سنائی گئی۔ سب سے اہم شہادت جینی رینالڈ کی تھی جس نے عدالت میں کلنٹن کا کچا چٹھا کھول کر رکھ دیا کہ کس طرح وہ گھر سے بھاگے ہوئے لوگوں کو ریاست کے خلاف بھڑکاتا تھا۔ اس نے ان کے ذہنوں میں یہ بات بٹھا دی تھی کہ وہ ایک اعلیٰ مقصد کے لیے قانون شکنی کر رہے ہیں۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ کسی نئی تحریک کا حصہ بننے جا رہے ہیں جبکہ کلنٹن انہیں بڑی ہوشیاری سے اپنی تیار کردہ جعلی کرنسی کے پھیلاؤ کے لیے استعمال کر رہا تھا۔

مقدمے کی سماعت کے دوران ہی یہ بات بھی سامنے آئی کہ ایک سہ پہر میریان ڈوبس بھی جینی کے ہمراہ کلنٹن کے پریس گئی تاکہ جنگ کے خلاف چھپنے والے پمفلٹ کی تیاری میں مدد دے سکے لیکن وہاں جا کر اسے معلوم ہوا کہ اس پرنٹنگ پریس میں جعلی کرنسی چھاپی جا رہی تھی۔ میریان سے یہ برداشت نہ ہو سکا۔ اس نے جینی سے کہا کہ وہ پولیس اور اپنے چچا کو یہ بات ضرور بتائے گی۔ اس پر جینی اسے بہلا پھسلا کر واپس موٹیل لے آئی اور خاموش کرنے کے لیے مسکن دوا دے دی۔ جینی نے اپنے بیان میں کہا کہ اسے بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ کلنٹن رات میں کسی وقت موٹیل پہنچ کر میریان کو قتل کر دے گا۔ میریان دوا کے زیراثر بے ہوش تھی۔ اس لیے وہ کوئی مزاحمت نہ کر سکی اور نہ ہی اسے کچھ محسوس ہوا۔ اگر اسے ذرا سا بھی اندازہ ہوتا کہ کلنٹن کے عزائم کیا ہیں تو وہ کبھی اسے نشہ آور دوا نہ دیتی۔

کانگریس مین ولیم ڈوبس نے واپس جا کر اپنی بہادر بھتیجی کے نام پر ایک پارک بنایا۔ پورٹ لینڈ سے بھاگی ہوئی اس لڑکی نے اپنے ضمیر کا سودا کرنا گوارا نہ کیا اور اس کی قیمت بھی ادا کر دی۔ اس کے لیے بہت آسان تھا کہ وہ خاموش رہ کر اپنی جان بچا لیتی لیکن شاید وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ کلنٹن جیسے درندے اپنے مفاد کی خاطر کسی کو قتل کرنے سے بھی نہیں باز آتے۔ میں دوبارہ اپنے کام پر چلا گیا اور ایک بار پھر اونچی پتلون پہن کر عورتوں کے لیے دروازہ کھولنے لگا۔ رات کو تنہا کھانا کھاتے وقت یہ احساس بڑی شدت سے ستانے لگتا ہے کہ میں نے اس دنیا کو سمجھنے میں بڑی دیر کر دی۔ ایک طرح سے یہ اچھا ہی ہوا ورنہ میرا انجام بھی کلنٹن سے مختلف نہ ہوتا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

DOWNLOADED FROM
PAKSOCIETY.COM

آوارہ گرد

قسط 28

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھنائونے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہورہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابل نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگارنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

تحیر... سنسنی اور ایکشن میں ابھرتا ڈوبتا دلچسپ سلسلہ...

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

شہزاد احمد خان شہزی نے ہوش سنبھالا تو اسے اپنی ماں کی ایک ہلکی سی جھلک یاد تھی۔ باپ اس کی نظروں کے سامنے تھا، مگر سوتیلی ماں کے ساتھ۔ جلد ہی باپ اسے نئی عورت کے ایما پر اطفال گھر چھوڑ گیا جو یتیم خانے کی جدید شکل تھی، جہاں بوڑھے بچے سب ہی رہتے تھے۔ یہاں زیادہ تعداد ایسے بچوں کی تھی جو ماں باپ کے ہوتے بھی یتیم تھے۔ ان میں ایک لڑکی عابدہ بھی تھی، شہزی کو اس سے انسیت ہو گئی تھی۔ بچے اور بوڑھوں کے سنگم میں چلنے والا یہ ادارہ اطفال گھر ایک خدا ترس آدمی، حاجی محمد اسحاق کی زیر نگرانی چلتا تھا۔ ادھر ہی شہزی کی دوستی ایک بوڑھے سرمد بابا سے ہوگئی، جن کی حقیقت جان کر شہزی کو بے حد حیرت ہوئی کیونکہ وہ بوڑھا لاوارث نہیں بلکہ ایک کروڑ پتی شخص تھا۔ اس کے جوان اکلوتے بیٹے نے بے حسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی بیوی کے کہنے پر سب کچھ اپنے نام کروا کر اسے اطفال گھر میں پھینک دیا تھا۔ ایک دن اچانک سرمد بابا کو اس کی بہو عارفہ ادارے سے لے کر اپنے گھر چلی گئی۔ شہزی کو اپنے اس بوڑھے دوست کے یوں اچانک چلے جانے پر بے حد دکھ ہوا۔ دینی و دنیوی تعلیم و تربیت کے ساتھ یہ ادارہ کامیابی سے چل رہا تھا۔ پھر یوں ہوا کہ یہاں رفتہ رفتہ جرائم پیشہ عناصر کا قبضہ ہونے لگا، پھر سب کچھ بدلنے لگا۔ اس نے اپنے چند ساتھیوں سمیت اطفال گھر سے فرار ہونے کی کوشش کی مگر ناکام رہا جس کے نتیجے میں دلشاد خان المعروف گگل خان اور اس کے حواری نے ان پر خوب تشدد کیا، اشرف اور بلال ان کے ساتھی شہزی گروپ کے دشمن بن گئے۔ گگل خان اپنے کسی دشمن گروپ کے ایک اہم آدمی اول خیر کو اطفال گھر میں یرغمال بنالیتا ہے، شہزی اس کی مدد کرتا ہے اور وہ اس کا دوست بن جاتا ہے۔ شہزی کا دوست اول خیر چوہدری ممتاز خان کے حریف گروپ جس کی سربراہ ایک جوان خاتون مختاری بیگم ہے، سے تعلق رکھتا تھا۔ وہاں وہ چھوٹے استاد کے نام سے جانا جاتا تھا۔ بڑا استاد کبیل دادا ہے جو زہرہ بانو کا خاص دست راست اور اس کا یکطرفہ چاہنے والا بھی ہے۔ زہرہ بانو درحقیقت ممتاز خان کی سوتیلی بہن ہے۔ دونوں بھائی بہنوں کے بیچ زمین کا تنازعہ عرصے سے چل رہا تھا۔ زہرہ بانو، شہزی کو دیکھ کر بے ہوش ہوجاتی ہے۔ کبیل دادا، شہزی سے خار کھانے لگتا ہے۔ اس کی وجہ زہرہ بانو کا شہزی کی طرف خاص التفات ہے۔ چھتے کے معاملے میں شہزی اور اول خیر، کبیل دادا سے بھڑ جاتے ہیں، زہرہ بانو المعروف "بیگم صاحبہ" اول خیر کو گروہ سے بے دخل کر دیتی ہے، بیگم صاحبہ کے سخت ترین حریف، چوہدری ممتاز خان کو شہزی ہر محاذ پر شکست دیتا چلا آرہا تھا، زہرہ بانو، لئیق شاہ نامی ایک نوجوان سے محبت کرتی تھی جو درحقیقت شہزی کا ہم شکل ہی نہیں، اس کا بچھڑا ہوا بھائی بھی ہے۔ شہزی کی جنگ پھیلتے پھیلتے ملک دشمن عناصر تک پہنچ جاتی ہے۔ ساتھ ہی شہزی کو اپنے ماں باپ کی بھی تلاش ہے۔ وزیر جان جو اس کا سوتیلا باپ ہے، اس کی جان کا دشمن بن جاتا ہے۔ وہ ایک جرائم پیشہ گینگ "اسپیکٹرم" کا زونل چیف ہے، جبکہ چوہدری ممتاز خان اس کا حلیف۔ رینجرز فورس کے میجر ریاض باجوہ ان ملک دشمن عناصر کی کھوج میں تھے لیکن دشمنوں کو سیاسی اور عوامی حمایت حاصل تھی۔ لوہے کو لوہے سے کاٹنے کے لیے شہزی کو اعزازی طور پر بھرتی کرلیا جاتا ہے اور اس کی تربیت بھی پاور کے ایک خاص تربیتی کیمپ میں شروع ہوجاتی ہے، بعد میں اس میں شکیلہ اور اول خیر بھی شامل ہوجاتے ہیں، ایک چھوٹی سی غلطی کی صورت میں پاور کو مصلحتاً ڈراپ کر دیا جاتا ہے۔ عارفہ علاج کے سلسلے میں امریکا جاتے ہوئے عابدہ کو اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔ اسپیکٹرم کا سربراہ جوڈان ہے لولوش، شہزی کا دشمن بن چکا ہے، وہ۔ جے بی سی (جیوش بزنس کمیونٹی) کی ملی بھگت سے عابدہ کو امریکی سی آئی اے والوں کے چنگل میں پھنسا دیتا ہے اور اس سازش میں بالواسطہ عارفہ بھی شریک ہے جسے اپنی جان بچانے کی زیادہ فکر ہے۔ باسکل ہولارڈ، ایک یہودی نژاد کٹر مسلم دشمن اور جے بی سی کے خفیہ دنیائے مسلم کے خلاف سازشوں میں ان کا دست راست ہے۔ باسکل ہولارڈ کی فورس ٹائیگر فیگ شہزی کے پیچھے لگ جاتی ہے۔ باسکل ہولارڈ کی لاڈلی بیٹی انجیلا، لولوش کی بیوی ہے۔ اڈیسہ کمپنی کے شیئرز کے سلسلے میں عارفہ اور سرمد بابا کے درمیان چپقلش آخری نہج پر پہنچ جاتی ہے، جسے نولوش اپنی ملکیت سمجھتا ہے، ایک نو دولتیا سیٹھ نوید سانچے والا مذکورہ شیئرز کے سلسلے میں ایک طرف تو لولوش کا ٹاؤٹ ہے اور دوسری طرف وہ عارفہ سے شادی کا خواہش مند ہے۔ اس دوران شہزی اپنی کوششوں میں کامیاب ہوجاتا ہے اور وہ اپنی ماں اور باپ کو تلاش کرلیتا ہے۔ اس کا باپ تاج دین شاہ، درحقیقت وطن عزیز کا ایک گمنام بہادر غازی سپاہی تھا۔ وہ بھارت کی خفیہ ایجنسی کی قید میں تھا۔ بھارتی خفیہ ایجنسی بلیو ٹلسی کا ایک افسر کرنل سی جی بھجوانی، شہزی کا خاص ٹارگٹ ہے۔ شہزی کے ہاتھوں بیک وقت اسپیکٹرم اور بلیو ٹلسی کو ذلت آمیز شکست ہوتی ہے اور وہ دونوں آپس میں خفیہ گٹھ جوڑ کرلیتے ہیں۔ شہزی، کبیل دادا اور زہرہ بانو کی شادی کرنے کی بات چلانے کی کوشش کرتا ہے جس کے نتیجے میں کبیل دادا کا شہزی سے نہ صرف دل صاف ہوجاتا ہے بلکہ وہ بھی اول خیر کی طرح اس کی دوستی کا دم بھرنے لگتا ہے۔ باسکل ہولارڈ، امریکا میں عابدہ کا کیس دہشت گردی کی عدالت میں منتقل کرنے کی سازش میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ امریکا میں مقیم ایک بین الاقوامی مبصر اور رپورٹر آنسہ خالدہ، عابدہ کے سلسلے میں شہزی کی مدد کرتی ہے۔ وہی شہزی کو مطلع کرتی ہے کہ باسکل ہولارڈ، سی آئی اے میں ٹائیگر فیگ کے دو ایجنٹ اس کو اغوا کرنے کے لیے خفیہ طور پر امریکا سے پاکستان روانہ کرنے والا ہے۔ شہزی ان کے شکنجے میں

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

آجاتا ہے، ٹائیگر گینگ کے مذکورہ دونوں ایجنٹ اسے پاکستان سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جہاز راں کمپنی اڈیسہ کے شپرز کے سلسلے میں لولووش برما (رنگون) میں مقیم تھا۔ اس کا دست راست سے جی کوہارا، شہزی کو ٹائیگر گینگ سے چھین لیتا ہے اور اپنی ایک لگژری بوٹ میں قیدی بنالیتا ہے وہاں اس کی ملاقات ایک اور قیدی، بشام چھلگری سے ہوتی ہے۔ شہزی کو میجر ریاض باجوہ کی بریفنگ کے دوران یاد آجاتا ہے کہ یہ وہی آرکیالوجسٹ بشام چھلگری ہے جو کبھی اسپیکٹرم کا ایک ریسرچ آفیسر تھا جو بعد میں تنظیم سے کٹ کر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ لاڑکانہ میں روپوشی کی زندگی گزار رہا ہے۔ یہ وہ دور تھا جب اسپیکٹرم کو واقعی ایک بین الاقوامی معتبر ادارے کی حیثیت حاصل تھی، اور مسٹر ڈی کارلو اس کے چیف ڈائریکٹر اور لولووش ان کا نائب تھا، جو ایک جرائم پیشہ شخص تھا، وہ اسپیکٹرم جیسی معتبر تنظیم کو اپنے مجرمانہ مقاصد کے لیے اسے ہائی جیک کر کے خود اس کا سربراہ بن جاتا ہے۔ بشام اسے پاکستان میں موئن جو دڑو سے برآمد ہونے والے طلسم نور ہیرے کے راز سے آگاہ کرتا ہے۔ جو چوری ہو چکا ہے اور تین ممالک ہٹلر کی طرح اس ہیرے کی آڑ میں تیسری عالمی جنگ چھڑوانا چاہتے ہیں۔ جسے انہوں نے ورلڈ بگ بینگ کا نام دے رکھا ہے۔ لولوش اور سی جی بھجوانی کے ایک مشترکہ معاہدے کے تحت سے جی کوہارا کی بوٹ بلیو تلسی کے چندرناتھ، شیام اور کوریلا آتے ہیں۔ وہ شہزی کو آنکھوں پٹی باندھ کر بلیو تلسی کے ہیڈ کوارٹر لے جاتے ہیں، وہاں پہلی بار بلیو تلسی کے چیف سی جی بھجوانی کو شہزی اپنی نظروں کے سامنے دیکھتا ہے، کیونکہ یہ وہی درندہ صفت شخص تھا جس نے اس کے باپ پر اس قدر تشدد کے پہاڑ توڑے تھے کہ وہ اپنی یادداشت کھو بیٹھا تھا۔ اب پاکستان میں شہزی کے باپ کی حیثیت ڈکلیئر ہو گئی تھی کہ وہ ایک محب وطن گمنام سپاہی تھا، تاج دین شاہ کو ایک تقریب میں اعلیٰ فوجی اعزاز سے نوازا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے شہزی کی اہمیت بھی کم نہ تھی، یوں بھجوانی اپنے منصوبے کے مطابق اس کی رہائی کے بدلے شہزی کے ساتھیوں، زہرہ بانو اور اول خیر وغیرہ سے پاکستان میں گرفتار شدہ اپنے ایک جاسوس سندرداس کو آزاد کروانا چاہتا ہے۔ ایک موقع پر شہزی، اس برمی قصاب، سے جی کوہارا اور اس کے ساتھی بھوک کو بے بس کر دیتا ہے، سوشیلا اس کی ساتھی بن جاتی ہے۔ سوشیلا کے ایل ایڈوانی سے اپنی بہن، بہنوئی اور اس کے دو معصوم بچوں کے قتل کا انتقام لینے اور طلسم نور ہیرا حاصل کرنے کے لیے شہزی کی ساتھی بن جاتی ہے۔ دونوں ایک خونی معرکے کے بعد ایک ساحل پر جا پہنچتے ہیں۔ وہاں ایک بوڑھا جونگی بابا ان کو اپنی جھونپڑی میں لے جاتا ہے۔ شہزی کی حالت بے حد خراب ہوتی ہے۔ وہ جونگی بابا اس کا علاج کرتا ہے، وہیں پتا چلتا ہے کہ یہ بوڑھا جونکوں کے ذریعے لوگوں کا خون نچوڑتا تھا۔ شہزی کے دشمن مسلسل تعاقب کرتے ہوئے اس جھونپڑی تک آپہنچتے ہیں مگر شہزی اس بوڑھے سمیت جھونپڑی کو آگ لگا دیتا ہے اور سوشیلا کے ہمراہ ایک ڈاکٹر کے پاس جا پہنچتا ہے۔ دگرگوں حالات کے باعث شہزی کی حالت اور خراب ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر اسے سرائے میں لے جاتا ہے۔ ڈاکٹر مہارانی اور جونگی کے بارے میں حیرت انگیز انکشافات کرتا ہے۔ شہزی کو ایک صبح کلینک سے مہارانی کے کارندے زبردستی اپنی حویلی لے جاتے ہیں۔ مہارانی ان کو قید میں ڈال دیتی ہے۔ اس اثنا میں پولیس کے ہمراہ شہزی کے دشمن حویلی پر دھاوا بول دیتے ہیں، ان کی گرفت میں آنے سے پہلے ہی شہزی سوشیلا کے ہمراہ فرار ہو جاتا ہے...... اور بھٹکتے بھٹکتے ایک بستی میں جا پہنچتا ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

"شہزی......!"

مجھے نیچے سے کوہارا کی وحشیانہ دہاڑ سنائی دی۔ اس کے خونخوار لہجے سے بڑی زخمی اور منتقمانہ غراہٹ بھی محسوس ہوتی تھی۔

"تمہاری یہ خوب صورت ساتھی اس وقت میرے رحم و کرم پہ ہے...... میں تمہیں سامنے آنے کے لیے صرف چند سیکنڈوں کی مہلت دیتا ہوں، بصورتِ دیگر میں اس کے سر میں گولی اُتار دوں گا۔"

میرے ہونٹ باہم پیوست تھے۔ مجھے اس وقت اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ مجھے ٹنکی کی چھت پر چڑھنے سے پہلے سوشیلا کو آواز دے کر بلا لینا چاہیے تھا، تاہم میں نے بھی اپنی اس غلطی پر ماتم کرنے میں مطلق وقت ضائع نہیں کیا اور اسی طرح ٹنکی کی چھت پر رینگتا ہوا، بالکل سرے پر پہنچ کر نیچے سوشیلا کو اپنی مہیب گن کی نال کے نشانے پر لیے کھڑے، کوہارا پر درانہ وار جا پڑا۔

بلاشبہ یہ میری ایک خطرناک حرکت صحیح مگر سریع الحرکت ضرور تھی، اسی سبب مجھے اُسے بغیر کسی جانی نقصان کے بچھاڑنے میں کامیابی بھی ہوئی۔

میں اُس کے گینڈے جیسے جسم کو اپنے تنومند وجود کے زور پر رگیدتا لے گیا، یہاں تک کہ ہم دونوں کے ہاتھوں سے گن چھوٹ گئی۔ کوہارا نے اپنے بھاری بھرکم جثے کے برعکس غیر معمولی پھرتی کا مظاہرہ کیا تھا جس کی مجھے کم ہی توقع تھی، بس ادھر ہی میں مار کھا گیا، اس کا ہتھوڑے جیسا گھونسا میرے جبڑے پر پڑا تو میرا دماغ جھنجھنا گیا، ایک لمحے کو

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے جبڑے کی ہڈی یا کم از کم جوڑ تو ضرور ہل گیا ہوگا، میری آنکھوں میں اندھیرا سا چھانے لگا۔ مگر یہ وقت میرے ڈھے جانے کا نہیں تھا، ورنہ اس کی مجھے ہی نہیں سوشیلا کو بھی بڑی کربناک قیمت چکانا پڑتی۔

میں نے اپنے سر کو ایک دو بار جھٹکے دیے، پل کے پل ہوش سنبھالا اور پھر اپنی دائیں ٹانگ کا گھٹنا سکیڑ کر اس کی ناف کے نیچے پوری قوت سے رسید کر ڈالا۔ کوہارا کے حلق سے جنگلی بھینسے جیسی ڈکراہٹ بلند ہوئی اور وہ ڈھیلا سا پڑنے لگا تو میں نے لیٹے ہی لیٹے اپنے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو جوڑ کر ''ڈبل پنچ'' بنا کر پوری طاقت سے اس کی ناک پر رسید کر دیا، اس کے اندر رہی سہی طاقت اور حواس بھی کھونے لگے، تو میں تیزی سے اُٹھا، عین اسی وقت چندر ناتھ میرے سامنے گن تانے آ گیا، اپنے تئیں اس نے بڑی پھرتی کا مظاہرہ کیا تھا مگر اس سے شاید ایک غلطی یہ ہوگئی تھی کہ وہ اپنی جھونک اور جوش تلے میرے بہت قریب آ چکا تھا۔ چونکہ اس وقت سارا کھیل وقت سے پہلے قدم بڑھانے اور بدِمقابل کو بچھاڑنے کا تھا اسی لیے میں ایک پل بھی ضائع کیے بغیر اپنے دائیں پاؤں کی ایڑی پر گھوما اور ایک لیفٹ راؤنڈ سرکل کک چندر ناتھ کے منہ پر رسید کر دی۔ یہ کک عموماً جان لیوا ثابت ہوتی تھی۔ اس سے گردن کی ہڈی کو بڑا زبردست جھٹکا لگتا تھا۔ چندر ناتھ کی قضا آئی ہوئی تھی کہ وہ اس ''مار'' کو نہ سہہ سکا اور کک کھاتے ہی وہ زمین سے چند انچ اُچھل کر گھوما اور دھب سے گرا تو پھر نہ اُٹھ سکا۔

مجھے سرِدست میدان صاف لگا۔ مگر اسی وقت.....

چاند کی روشنی میں مجھے اپنے بائیں جانب زمین پر کسی کا وجود رینگتا ہوا سا دکھائی دیا۔ یہ کوریلا تھی جو خاصی زخمی ہونے کے باوجود مجھے بچھاڑنے کی ایک آخری کوشش میں چھت سے گرنے کے بعد اس طرف نکل آئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں گن دبی ہوئی تھی۔ میں نہتا تھا، سوشیلا کی بھی اس پر میرے فوراً بعد ہی نگاہ پڑی تھی، کوریلا ابھی اپنی گن سے میرا نشانہ لینے میں مصروف تھی کہ میں نے بہ سرعت اپنی جگہ سے حرکت کی اور اس کے برسٹ فائر کرنے سے محض چند پل پہلے ہی میں اپنی جگہ چھوڑ چکا تھا۔

ٹھیک اسی وقت پولیس سائرن کی آواز گونجی۔ میں تشویش زدہ سا ہو گیا۔ بھارتی پولیس کے چنگل میں جانے کا مطلب میرے لیے خاصا خطرناک نکل سکتا تھا۔ اسی لیے میں نے رہا سہا محاذ اور کوہارا سمیت کوریلا کو بھی چھوڑا، پھر سوشیلا کو پکارا۔

''سوشی! اس طرف دوڑو...... جلدی......'' کہتے ہوئے میں سرائے کی اس دیوار کی جانب بڑھا جو عقب سے گھوم کر بائیں جانب مڑ رہی تھی۔ میری حرکت اور آواز پر سوشیلا نے بھی متحرک ہونے میں چنداں دیر نہیں لگائی تھی۔

رات کی تاریکی اور بھگدڑ کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے ہم دونوں سرائے کی کچھ ڈھے شدہ دیواروں سے چور راستہ بناتے ہوئے باہر تاریک ویرانے میں آ گئے اور پھر نہیں رکے، دوڑتے ہی چلے گئے۔

☆☆☆

پولیس کی گرفت سے بچنے اور عام لوگوں کی مشکوک نظروں سے بچتے ہوئے ہم نے آبادی سے ہٹ کر فرار کا راستہ اپنایا تھا۔

کافی دور جا کر ہم ایک جگہ پر ٹھہرے۔ ہم دونوں کی سانسیں پھولی ہوئی تھیں۔ ذرا دیر رک کر چڑھی ہوئی سانسوں کو بحال کیا تو کچھ بولنے کے قابل ہوئے۔

''ہمیں یہ شہر چھوڑ کر ممبئی کا رخ کرنا ہوگا۔'' میں نے گرد و پیش کی تاریکی میں نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔

''پولیس کا ہی نہیں بلکہ ہمارے دشمنوں کا بھی پورا زور ہماری تلاش میں بھگت گڑھ کو کھنگالنے میں صرف ہوتا رہے گا۔''

''ممبئی پہنچنے سے زیادہ مجھے اب کسی اور بات کی بھی تشویش ہونے لگی ہے۔'' سوشیلا بولی۔

''وہ کیا؟'' میں نے پوچھا۔

''اس اچانک نازل ہونے والی مہم میں تم نے اپنے بیشتر خطرناک دشمنوں کو تو بچھاڑ ہی دیا ہے مگر پولیس اب ہمارا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔ وہ سب سے پہلے کاشی رام اور اس کے سرائے سے ہمارے بارے میں تفتیش کی ابتدا کرے گی۔ معاملہ قتل و غارت گری کے زمرے میں چلا جائے گا اور ہم دونوں کے لیے بھی مشکل کھڑی ہو جائے گی۔''

''کاشی رام کے سرائے کو میدانِ جنگ بنانے میں ہمارا کوئی قصور نہیں تھا اور یوں بھی یہ مارا ماری غیر متوقع تو نہیں تھی۔ دشمنوں نے اچانک ہی ہم پر حملہ کر دیا تھا۔'' میں نے ٹھنڈی ہوئی سنجیدگی سے جواب دیا۔ مجھے یوں لگا تھا شاید سوشیلا نے مجھ پر طنز کرتے ہوئے ان تمام حالات کی ذمے داری میرے کاندھوں پر ڈال دی تھی۔ میں نے

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
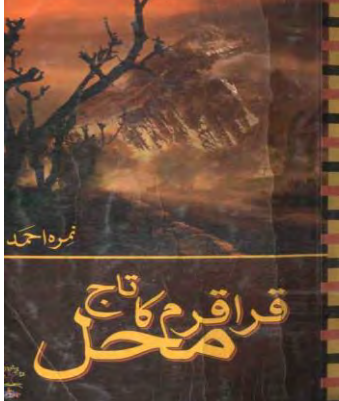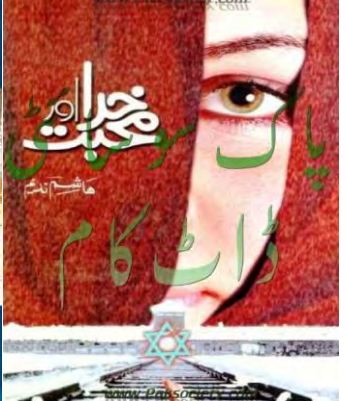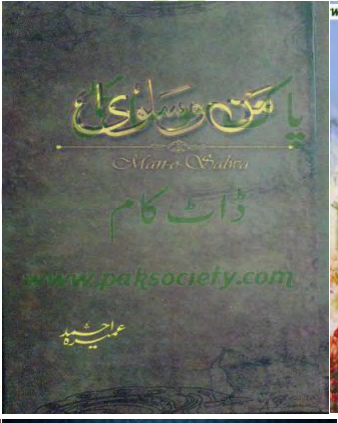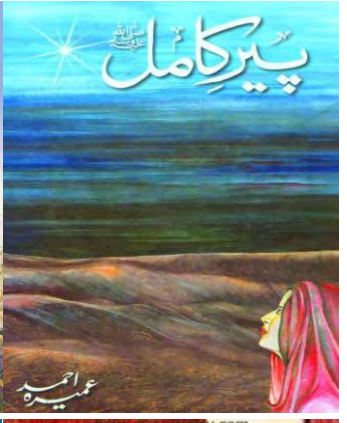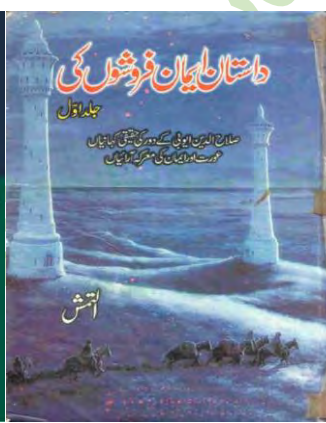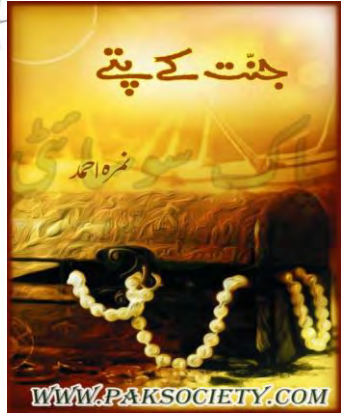
دیکھا، وہ میری اس بات پر بے اختیار مسکرائی تھی۔ چٹکی ہوئی چاندنی میں اس کی مسکراہٹ میں مجھے بڑی گیرائی آمیز... اپنائیت سی محسوس ہوئی تھی، وہ بڑے پیار بھرے انداز میں قدرے شوخی سے میرے سر کے بالوں کو چھیڑ کر بولی۔

''ایک تو تم بڑی جلدی جذباتی ہو جاتے ہو...... میرا مطلب یہ نہیں تھا کہ اس میں تمہارا قصور ہے۔ ظاہر ہے ہم جن حالات سے دوچار ہیں، وہاں کسی بھی وقت دشمنوں سے ٹکراؤ ہونے کے امکانات رہتے ہیں۔ میں نے تو محض ایک خدشے کی بات کی تھی کہ اب ان حالات میں ہمیں اپنا اسٹریٹیجک پلان ذرا تبدیل کرنا پڑے گا......''

سوشیلا کے اس لگاوٹ بھرے انداز پر بے اختیار میں بھی اپنا سر جھٹک کر دھیرے سے مسکرانے پر مجبور ہو گیا۔

پیش آمدہ تازہ کار اعصاب شکن لمحات کے بعد میں خود کو نجانے کیوں کافی پُرجوش سا محسوس کرنے لگا تھا، وجہ شاید یہی تھی کہ میں نے یہاں آتے ہی اپنے دشمنوں کے مشترکہ ٹولے کو بڑی زک پہنچائی تھی۔ بلیوتلسی کے دو ٹاپ ایجنٹوں، چندرناتھ اور شیام کو واصلِ جہنم کیا تھا اور کوریلا بھی خاصی زخمی ہوئی تھی میرے ہاتھوں، جبکہ سے جی کو ہارا کے قریبی بری ساتھی بھومک کو میں دوسرے محاذ میں پہلے ہی فنا گھاٹ کر چکا تھا، نیز کوہارا کو رنگون سے پہنچنے والی کمک میں اس کے مزید بری ساتھی بھی میرے ہاتھوں انجام کو پہنچے تھے اور اب میں تصور کی آنکھ سے بلیوتلسی کے سی جی بھجوانی اور اسپیکٹرم کے جبری اور غاصبانہ قابض......لولوش کو خارش زدہ کتوں کے مانند شکست خوردہ انداز میں غراتے ہوئے دیکھ رہا تھا مگر یہ حقیقت بھی اپنی جگہ مسلمہ تھی کہ...... یہ سب متذکرہ بالا افراد، ''چھوٹے بڑے'' تفاوت کے ساتھ محض مہرے تھے۔ جب تک سی جی بھجوانی اور لولوش زندہ تھے، یہ مہرے میری راہ میں آتے رہیں گے...... اسی لیے میرا اصل شکار یہی دونوں افراد تھے۔ لولوش مجھ سے دور سہی، لیکن میں اس تک پہنچنے والا تھا، جبکہ سی جی بھجوانی کے شہرِ خرابے میں، پہلے ہی میں اسے واصل جہنم کرنے کے لیے موجود تھا۔ لہٰذا ایک نظر گردوپیش پر ڈالنے کے بعد میں نے سوشیلا سے کہا۔

''ہمیں اب اپنے آئندہ کے لائحہ عمل میں تھوڑی ترامیم...... کرنا پڑے گی اور بہرصورت ہمیں فوری طور پر ممبئی کا رخ کرنا ہوگا۔''

''کیا وہاں تمہارا کوئی خاص شکار ابھی زندہ باقی ہے؟''

''ہاں!'' میں نے اثبات میں اپنے سر کو جنبش دی تھی۔ ''میں نے تمہیں بتایا تو تھا کہ مجھے دشمنوں کے اصل ٹھکانے ''سورت'' پہنچنا ہے۔'' میں نے اسے یاد لاتے ہوئے اسے اُکسایا بھی، تاکہ وہ مجھ سے بلیوتلسی وغیرہ کے سلسلے میں زیادہ پوچھ گچھ نہ کرے۔ اسی لیے آگے بولتا رہا۔

''میں دراصل جلد از جلد...... سورت والی مہم (سی جی کو جہنم واصل کرنا) کو مکمل کر کے ایل ایڈوانی کے پیچھے پڑنا چاہتا ہوں۔ مجھے ہر صورت میں وہ ہیرا اس کے قبضے سے حاصل کرنا ہے، جس کے پیچھے دنیا کے تین جنگی جنونی جرنیل، دنیا کو تیسری عالمی جنگ میں جھونکنے کی مذموم اور گھناؤنی سازش میں مصروف ہیں۔''

میں جانتا تھا کہ ایل ایڈوانی سے متعلق یہ موضوع سوشیلا کے لیے کس قدر ''مچی'' تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ فوراً بولی۔

''ہاں! میں خود بھی یہی چاہتی ہوں کہ جلد سے جلد تمہاری یہ مہم پایۂ تکمیل کو پہنچے اور پھر اس نامراد اور سفاک جرنیل کے ایل ایڈوانی کی بھی باری آئے۔''

اس میں کوئی شک نہ تھا کہ اب طلسم نور ہیرے کی برآمدگی والی مہم خود میرے لیے بھی خاصی ذاتی نوعیت کی حامل ہو چکی تھی کہ وہ ہیرا (طلسم نور) میرے وطن کی امانت تھی، نیز اس سے بڑھ کر اگر عالمی انسانیت کے جذبے کی نظر سے دیکھا جاتا تو اس مشن کی اس لیے بھی اہمیت دوچند ہو جاتی تھی کہ تیسری عالمی جنگ کی صورت میں کس قدر بے گناہ زندگیاں اس جنگ میں جھونک دی جاتیں۔

مجھے یاد تھا، جب میں اطفال گھر میں تھا تو وہاں جنگِ عظیم اول اور دوم کی دستاویزی فلم دکھائی جاتی تھی اور اس میں کتنے ہی بے گناہ لوگوں کو موت کے منہ میں جاتے دکھایا گیا تھا۔ ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرانے سے جو ہلاکتیں ہوئیں سو ہوئیں، مگر کہا جاتا ہے کہ اس ایٹمی تابکاری کے اثرات کے باعث بعد میں بھی وہاں پیدا ہونے والے لوگ عرصے تک کسی نہ کسی مہلک بیماریوں میں مبتلا ہو کر سسکتی زندگی گزارتے رہے تھے۔ اب ایٹمی ماہرین کے تجزیے کے مطابق اس بار اگر دنیا کو تیسری ایٹمی جنگ میں جھونکا گیا تو کوئی ملک نہیں بچے گا۔ اس کی وجہ... ماہرین یہی بتاتے تھے کہ برسوں پہلے والے ایٹمی بموں کے مقابلے میں آج کے ایٹمی ہتھیار پچاس گنا سے بھی زیادہ تباہ کن اور مہلک اثرات والے ثابت ہو سکتے تھے۔ شاید یہی وجہ

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

تھی کہ آج کے تین بڑے جنگی جنونی جرنیلوں (امریکا، روس، بھارت) نے اپنے اس گھناؤنے منصوبے کو ''ورلڈ بگ بینگ'' کا نام دیا تھا اور سب سے پہلے وہ تین ممالک پاکستان، ایران اور چین کے درمیان ورلڈ بگ بینگ کی آگ بھڑکانے کا ارادہ رکھے ہوئے تھے۔ یوں تو وہ اس گھناؤنے عالمی منصوبے کی ابتدا جنوبی ایشیا سے کرنے کا ارادہ رکھے ہوئے تھے، جن میں سات ممالک ہیں۔ انڈیا، پاکستان، سری لنکا، بنگلہ دیش، مالدیپ، نیپال اور بھوٹان، جبکہ انڈیا سیاسی، معاشی، سماجی وسعتِ رقبہ کی برتری کی وجہ سے ان سب ممالک میں ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ شاید اسی سبب انڈیا خود کو بڑے غرور سے جنوبی ایشیا کی منی سپر پاور سمجھنے کے زعم میں مبتلا رہتا ہے۔ تبت (عوامی جمہوریہ چین) کو بھی بعض معاشی، سیاسی اور ثقافتی وجوہات کی بنا پر جنوبی ایشیا کا ہی ملک سمجھتے ہیں، جبکہ ایران، پاکستان کے قریبی برادر اسلامی ملک ہونے کے باعث، اسے بھی جنگ کی آگ میں جھونکنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ اس کے بعد تیسری عالمی جنگ کا دائرۂ کار جنوبی مغربی ایشیا اور پوری دنیا تک وسیع ہو جاتا۔ جس طرح کا یہ ''ورلڈ بگ بینگ'' کا گھناؤنا منصوبہ بنایا جا رہا تھا، لگتا ایسا ہی تھا کہ اس کے پیچھے صرف تین ہی جرنیل کارفرما نہیں ہوسکتے تھے، ایک پوری مضبوط لابی ان کی پشت پر ہوسکتی تھی۔ یہ تین جرنیل تو محض ان کے مہرے ہی ہوسکتے تھے۔

بہرکیف میں نے سوشیلا کی بات پر کہا۔ ''میں اسی لیے جلد از جلد ممبئی جانا چاہتا ہوں......''

''میں متفق ہوں...... یوں بھی ہمارا اب یہاں بھگت گڑھ میں زیادہ دیر ٹھہرنا خطرے سے خالی نہ ہوگا، لیکن......'' وہ کچھ کہتے کہتے رکی تو میں نے کہا۔

''لیکن کیا......؟''

''اس کاشی رام کی وجہ سے ہم وہاں ممبئی جا کر بھی پھنس سکتے ہیں، کیونکہ پولیس کاشی رام کو ہی سب سے پہلے تفتیش کے سلسلے میں تختۂ مشق بنائے گی، اور وہ میرا ایسا سچا عاشق بھی نہیں ہے کہ اپنی جان چھڑانے کے لیے پولیس کو میرے اور ممبئی میں میری رہائش گاہ کے بارے میں نہ بتائے...... یوں ہمارے ممبئی پہنچنے سے پہلے ہی پولیس وہاں پہنچی ہوئی ہوگی، ہمیں گرفتار کرنے کے لیے۔''

''یہ خدشہ میرے ذہن میں بھی تھا۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن کیا ضروری ہے کہ ہم ممبئی جاتے ہی تمہاری رہائش گاہ کا رخ کریں؟'' میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو وہ بولی۔

''تمہاری تجویز بھی بری تو نہیں...... لیکن وہاں ایسا کوئی ٹھکانا ہمیں بلکہ مجھے ہی تلاش کرنا ہوگا، جہاں محفوظ طریقے سے رہتے ہوئے ہم اپنے مشن کو آگے بڑھا سکیں۔''

''یقیناً...... میں بھی یہی چاہتا ہوں۔''

''ابھی یہاں سے تو نکلو...... اس سے پہلے کے ناکا بندی ہو جائے، پھر سوچتی ہوں۔'' وہ بولی اور ہم نے آگے قدم بڑھا لیے۔

ہمارے پاس کوئی سواری نہیں تھی۔ ہم پیدل تھے۔ دشمنوں سے تو ابھی فوری طور ہمیں کوئی خطرہ نہیں تھا لیکن بھگت گڑھ کی پولیس ہمارے پیچھے ضرور لگ چکی تھی اور ان کے پیشِ نظر صرف واردات تھی، یہ نہیں تھا کہ کون کس کا اور کیوں دشمن تھا۔ یہی سبب تھا کہ وہ اس واردات کو سنسنی خیز اور سنگین قرار دینے میں ذرا بھی بخل سے کام نہیں لیتے۔ کیونکہ اس میں میرے ہاتھوں کئی افراد مارے گئے تھے۔ بلیو ٹکسی کا چندر ناتھ اور شیام کی ہلاکت یقیناً سی جی بھگوانی کو بلبلانے کے لیے کافی تھی اور وہ یہاں میری تلاش میں بھارت کا کونا کونا چھان مارنے سے بھی دریغ نہیں کرے گا۔ تازہ کار واقعے کے بعد تو ہوسکتا ہے، وہ پولیس کو بھی ہائی کمانڈ کے ذریعے بدستور ہمارے تعاقب میں لگانے کے احکامات جاری کروا سکتا تھا۔

سوشیلا نے بھگت گڑھ کے ریلوے اسٹیشن کا رخ کیا تھا۔

اسٹیشن تک پیدل جاتے ہوئے سوشیلا نے بتایا تھا کہ بالاسور سے ممبئی تک کا سفر کم و بیش اٹھارہ سو کلومیٹر پر محیط ہے، نیز وہاں تک یہاں سے کوئی سیدھی ٹرین بھی جاتی ہے یا نہیں اس کا اُسے کوئی علم نہ تھا۔ بہرطور اسٹیشن وہاں سے کچھ زیادہ دور نہ تھا، تھوڑی دیر بعد ہی ہم وہاں پہنچ گئے، اسٹیشن کیا تھا...... بس ایک پیلی سی مٹیالے رنگ کی سالخوردہ سی دیوار تھی، جس کی پیشانی پر لگے ایک پھیکے یرقان زدہ بلب کی روشنی میں مٹے مٹے الفاظ میں ''بھگت گڑھ ریلوے اسٹیشن'' لکھا ہوا نظر آیا۔ بلب کے گرد مچھروں کا جھرمٹ گردش کر رہا تھا۔

عمارت کے پیچھے ریلوے ٹریکس باہر سے ہی دکھائی دے رہے تھے، کیونکہ دائیں بائیں کی دیواریں منہدم تھیں۔ پلیٹ فارم کا پلستر بھی اکھڑا ہوا نظر آتا تھا۔ اِکا دُکا لوگ ہی پلیٹ فارم کے کسی لیمپ پوسٹ کی روشنی میں مٹرگشت کے انداز میں دکھائی دے رہے تھے، وہ بھی اپنی

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

مخصوص یونیفارم سے عملے کے ہی افراد نظر آتے تھے۔ باقی اسٹیشن پر سناٹے کا راج تھا۔ میں نے ایک ایسے ہی آدمی کو روک کر ممبئی جانے والی کسی مسافر ٹرین کا پوچھا تو وہ خاصی حیرت سے پہلے میرا اور پھر میرے ساتھ کھڑی سوشیلا کا چہرہ تکنے لگا، جیسے وہ ہمیں کچھ زیادہ ہی انجان سمجھا ہو، پھر کچھ طنز سے بولا۔

''آپ سے کس نے کہہ دیا کہ یہاں سے کوئی ٹرین سیدھی ممبئی جاتی ہے؟''

''کہا تو کسی نے نہیں بھائی! لیکن آپ ہی بتا دیں کہ ہم پھر کیا کریں؟ ہمارے کسی عزیز کا وہاں ممبئی میں دیہانت ہو گیا ہے اور ہمیں ترنت پہنچنا ہے۔'' اس بار سوشیلا نے اس سے مخاطب ہو کر کہا تو وہ بولا۔

''بہن جی! پھر تو آپ لوگ بالکل صحیح وقت پر آئے ہیں۔ کیونکہ ابھی تھوڑی دیر میں امارا وتی ایکسپریس آنے والی ہے جو بھبھنیشور تک جائے گی اور وہاں سے آپ کو سیدھی ممبئی جانے والی دھاولی ایکسپریس مل سکتی ہے۔''

''بھیا! تمہارا بہت شکریہ......'' سوشیلا نے جلدی سے کہا۔ ''ابھی یہ مسافر ٹرین کتنی دیر میں پہنچنے والی ہوگی؟''

''بس! آرہی ہے۔'' وہ آدمی سامنے دور پٹریوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''وہ دیکھو...... اس کے انجن کی لائٹ بھی نظر آنے لگی ہے۔ آپ جلدی سے جا کر ٹکٹ خرید لیں، یہ چھوٹا اسٹیشن ہے، ٹرین یہاں زیادہ دیر نہیں رکے گی۔'' وہ یہ کہہ کر آگے بڑھ گیا۔

ہم دونوں نے اس بھلے مانس آدمی کے اشارے پر اس طرف دیکھا تھا جہاں ایک مدور نما تیز لائٹ لحہ بہ لحہ قریب آتی نظر آرہی تھی۔

ہم فوراً پاس بنے ایک آفس کی کھڑکی کے سامنے پہنچے، یہاں وہی شخص ایک کرسی پر براجمان تھا اور ہماری طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا، اس نے ہمیں اس طرف آتے دیکھتے ہی دو ٹکٹ بھبھنیشور کے کاٹ دیے تھے۔ سوشیلا نے پیسے دیے اور ہم دونوں جلدی سے واپس اسی جگہ آکر کھڑے ہو گئے، جہاں پہلے موجود تھے۔ ٹرین وسل دیتی ہوئی آئی اور پلیٹ فارم پر رک گئی۔ چند ہی مسافر اُترے تھے اور اب اس میں سوار ہونے والے بھی کچھ مسافر نظر آنے لگے تھے۔ میں اور سوشیلا ایک ایسی بوگی میں داخل ہو گئے جس میں مسافروں کا رش نسبتاً کم ہی تھا۔

ہمارے سیٹوں پر بیٹھتے ہی ٹرین نے وسل دی اور رینگنا شروع کر دیا۔ گویا مزید کسی مصیبت میں پڑے بغیر بھگت گڑھ سے ہم بہ خیر و عافیت کے روانہ ہو چکے تھے۔

ٹرین اب خاصی رفتار پکڑ چکی تھی۔ میں اور سوشیلا آمنے سامنے کی لمبی سیٹوں پر بیٹھے تھے۔ ہمارے آگے پیچھے والی سیٹوں پر بھی کچھ مسافر مرد و عورتیں موجود تھیں، کوئی اُوپر برتھ پر سو رہا تھا تو کوئی نیچے ہی خالی لمبی سیٹ پر لیٹا ہوا تھا، وہ سب گہری نیند میں تھے، بوگی میں ہم فقط دو ہی مسافر جاگ رہے تھے۔ بوگی کی بیشتر بتیاں گل تھیں۔ مسافر زیادہ نہیں تھے۔ یہ ایکسپریس ٹرین تھی اور صرف بڑے جنکشن ٹائپ کے اسٹیشنوں پر رکتی تھی۔ رات اپنے آخری پہر میں تھی۔ باہر کے مناظر تاریک تھے۔ میں نے یونہی کھڑکی سے ذرا باہر نظر ڈالی۔ ٹرین ایک چھوٹے اور ویران اسٹیشن کو بغیر رکے کراس کر رہی تھی۔ میں سوشیلا کی طرف متوجہ ہوا۔

''تمہارا کیا خیال ہے کہ ہمیں بھبھنیشور پہنچ کر آگے ممبئی جانے کے لیے دوسری ٹرین پکڑنا چاہیے؟''

''شاید تمہارے ذہن میں بھی وہی خدشہ پل رہا ہے جو میرے ذہن میں بھی اس ٹرین میں سوار ہوتے وقت اُبھرا تھا۔'' اس نے کہا۔ وہ خاصی زیرک دماغ تھی۔ میرے سوال کی تہ میں چھپے اس خدشے کو بھانپ گئی تھی جس کے تحت میں اس کی آئندہ کے سفر کی رائے لینا چاہتا تھا۔

''ہاں! تم نے ٹھیک اندازہ لگایا سوشی! بے شک عارضی طور پر سہی، ہم بھگت گڑھ کی پولیس کو چکما تو دے آئے ہیں...... لیکن اس کے باوجود ہمیں ازحد محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ بھگت گڑھ کی پولیس اپنی تفتیش کا دائرہ اسٹیشن اور لاری اڈوں تک وسیع کرنے کے دوران اس ٹکٹ والے سے بھی ہمارے بارے میں پوچھ کچھ کر سکتی ہے اور اسٹیشن پر صرف ہم دونوں کی موجودگی کے باعث اس ٹکٹ بابو کو ہماری صورتیں بھی ازبر ہوں گی۔''

''بھبھنیشور پہنچتے ہی ہم کسی اور ٹرین میں سوار نہیں ہوں گے۔ باہر نکل کر کسی بس وغیرہ میں سفر کو ترجیح دیں گے۔'' اس نے جواب دیا۔

''تمہارے پاس کتنے پیسے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''کچھ زیادہ تو نہیں، لیکن...... کھینچ کھانچ کر بس کا کرایہ تو ہو ہی جائے گا۔''

میں نے مایوسی سے اپنے ہونٹ بھینچ لیے اور کھڑکی سے باہر پیچھے بھاگتے ہوئے تاریک مناظر کو دیکھنے لگا۔

''کیا ہوا! شہزی......؟'' سوشیلا نے بے اختیار پوچھا۔

''میرا خیال تھا اگر ہمارے پاس کچھ زیادہ پیسے

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

ہوتے تو ہم بھینیشور سے آگے کسی ٹرین یا بس کے بجائے کوئی کرائے کی کار کروا لیتے، اس طرح وقت بھی بچ جاتا اور کچھ تحفظ بھی رہتا۔" میں نے کہا۔ وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ رقم کا معاملہ واقعی گمبھیر تھا جبکہ ممبئی دور، سفر جلد پاٹنا تھا اور محفوظ طریقے سے بھی۔ ان ساری باتوں کے لیے رقم کی اہمیت اپنی جگہ تھی۔

"کاشی رام اس سلسلے میں ہماری مدد کرنے کے لیے تیار تھا۔" بالآخر اس نے تبصرہ کرنے والے انداز میں کہا۔ "لیکن بدقسمتی سے وہ موقع ہی نہ آسکا اور اس سے پہلے دشمنوں نے دھاوا بول دیا۔ ورنہ کاشی رام ہمارے بہت کام آسکتا تھا۔"

بیتے ہوئے پر ماتم کرنا میری عادت تھی نہ فطرت، جو گزر گیا وہ گیا۔ جو موجود ہے وہ آپ کا ہے، بصورت دیگر یہ بھی ہاتھ سے جاتا۔ اس لیے میں کاشی رام والے سنہری موقع کے ضائع چلے جانے پر کوئی متاسفانہ تبصرہ کیے بغیر بولا۔

"ان حالات میں بس کا سفر ہی بہتر رہے گا۔ مگر تم اس پر بھی کہہ رہی ہو کہ بس کا کرایہ بھی کھینچ کھانچ کر ہو جائے گا...... کیا اس کے لیے بھی کم ہیں پیسے؟"

"شاید...... کم پڑ جائیں۔" وہ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر بولی۔ "کیونکہ ٹرین کے مقابلے میں ایک تیز رفتار لگژری کوچ کا کرایہ بہت زیادہ ہوگا۔"

میں نے تھوڑا غور کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ موجودہ حالات میں جلد بازی کسی نقصان کا پیش خیمہ بھی ہو سکتی ہے۔ یوں بھی غور کرنے پر مجھے اندازہ ہوا تھا کہ بس کے مقابلے میں ٹرین کا سفر ہمارے لیے زیادہ محفوظ ہو سکتا تھا۔ لیکن اس میں ایک ہی قباحت...... تھی کہ میں اور سوشیلا ٹکٹ دینے والے عملے کے ایک آدمی کی نظروں میں "ٹھیک ٹھاک" طریقے سے آچکے تھے۔ اسی لیے پولیس سب سے پہلے ریلوے پاتھ کو ہی کڑی نگرانی میں لینے کی کوشش کرتی اور کوئی بعید نہیں تھا کہ اگر بھگت گڑھ کی پولیس نے ذرا غیر معمولی چابک دستی دکھائی تو اُسے یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ مذکورہ اسٹیشن سے کون سی ٹرین کس وقت گئی ہے تو وہ اگلے کسی اسٹیشن میں، فون جیسے فوری رابطے کا استعمال کرتے ہوئے ہمارے لیے مشکل کھڑی کر سکتی تھی۔ گویا ہمیں ہر آنے والے اسٹیشن پر جہاں یہ گاڑی رکتی، یا روک دی جاتی، محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔

"کیا سوچنے لگے؟" سوشیلا نے سیٹ پر تھکے تھکے انداز میں ذرا آرام لینے کی غرض سے پھیلتے ہوئے بیٹھ کر مجھ سے پوچھا۔

میں نے اُسے اپنے ذہن رسا میں پلنے والے اندیشناک خدشات سے آگاہ کیا تو وہ بھی چونک سی گئی۔ بولی۔ "اُف شہزی......! تم کس قدر باریکیوں میں جا کر سوچتے ہو، اس طرف تو میرا ابھی دھیان نہیں گیا تھا، مجھے تو واقعی ڈر لگنے لگا ہے۔"

"کمال ہے، اتنے خوفناک حالات سے گزرنے کے بعد بھی تمہیں ڈر لگنے لگا ہے؟" میں نے ماحول کی کدورت دھونے کی غرض سے ذرا مسکراتے ہوئے کہا تو وہ بھی بے اختیار مسکرا دی اور بولی۔

"ایسی بات، نہیں میں نے تو محض روا روی میں یہ کہہ ڈالا تھا۔ ورنہ تو میں بہت پُرجوش ہوں اور ذہنی طور پر تیار بھی۔"

اسی وقت ٹرین نے اپنی رفتار گھٹانا شروع کر دی۔ شاید کوئی اسٹیشن آنے والا تھا۔

"ابھی تو ایک اسٹیشن پر رکی تھی؟ اب دوبارہ......؟" سوشیلا کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے بڑبڑائی۔ اس کا خیال ٹھیک ہی تھا۔ کیونکہ یہ کوئی لوکل ٹرین نہیں تھی کہ ہر اسٹیشن پر رکتی، ابھی وہ ایک اسٹیشن پر چند منٹوں کے لیے رکی تھی، وہ ایک جنکشن اسٹیشن تھا، اور اتنی جلدی دوبارہ کوئی جنکشن اسٹیشن نہیں آسکتا تھا۔

میں نے ذرا کھڑکی سے باہر جھانکا، مجھے ذرا دور کسی اسٹیشن کی روشنی دکھائی دینے لگی۔

"کوئی اسٹیشن آرہا ہے......" میں نے جلدی سے اور نیچی آواز میں کہا۔ "تم ایسا کرو دوسری طرف کی کھڑکی سے ذرا باہر جھانک کر دیکھو اور کوئی بھی غیر معمولی بات محسوس کرو تو مجھے بتاؤ، پتا نہیں پلیٹ فارم کس طرف آتا ہے؟" اس نے میری بات پر اثبات میں سر ہلایا اور پھر دوسری جانب کی کھڑکی کی طرف بڑھ گئی۔

ٹرین جب کسی متوقع اسٹیشن کے ذرا نزدیک پہنچی تو مجھے اسٹیشن کا وہ شیڈ نظر آ گیا جو میری طرف کی کھڑکی کی طرف تھا۔ میں نے تب بھی سوشیلا کو دوسری کھڑکی سے ہلنے نہیں دیا، کہ کہیں پولیس نے دونوں جانب سے ٹرین کو گھیرے میں نہ لے رکھا ہو۔

میرا دل یکبارگی تیزی سے دھڑکنے لگا۔ کیونکہ ٹرین کا انجن شیڈ میں داخل ہو چکا تھا اور مجھے پلیٹ فارم صاف نظر آنے لگا تھا۔ مگر وہاں مجھے چند مسافروں کے علاوہ پولیس

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

وردی میں ملفوف کوئی آدمی نظر نہیں آیا۔ یہی کچھ سوشیلا نے بھی مجھے بتایا۔ وہ اب دوبارہ سیٹ پر آکر بیٹھ گئی تھی، جبکہ میں اب بھی کھڑکی سے باہر ہی تکنے میں مصروف تھا۔ اسٹیشن زیادہ بڑا نہیں تھا۔ ہیئت ایسی ہی تھی اس کی، جیسی کہ کسی دور اُفتادہ چھوٹے دیہاتی علاقے کے ریلوے اسٹیشن کی ہو سکتی تھی۔

ٹرین رینگنے کے انداز میں آہستہ آہستہ پلیٹ فارم میں داخل ہو رہی تھی اور میری نظریں وہاں نیچے کھڑے مسافروں پر جمی ہوئی تھیں۔ دفعتاً میں چونکا۔ میری چھٹی حس نے خطرے کا الارم بجایا۔ بہ ظاہر مسافر بنے کھڑے ان لوگوں کے بشرے کچھ اور ہی تاثر دیتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ ان کے پاس سامان کے نام پر ایک بُغچی تک نہیں تھی۔

''خطرہ......''

میرے ذہن میں اچانک ہی ابھرا اور پھر جیسے ہی ٹرین رکی۔ ان میں سے ہر ایک آدمی دوڑ کر ایک ایک بوگی میں سوار ہو گیا۔ ایک آدمی ہماری بوگی میں بھی داخل ہوا تھا۔

''اُٹھو، میرے ساتھ آؤ جلدی......'' میں نے فوراً سوشیلا سے کہا اور پھر سیٹ چھوڑ دی۔

اس سے پہلے کہ وہ آدمی ہمارے قریب آتا ہم اپنی سیٹ چھوڑ چکے تھے۔ ابھی ہم بوگی کی راہداری میں ہی تھے کہ اچانک میں نے انہی جیسے اور آدمیوں کو بھی تیزی کے ساتھ ٹرین کی مختلف بوگیوں میں سوار ہوتے دیکھا اور میری کنپٹیاں تک سنسنا اُٹھیں۔ یہ شاید پولیس کے ہی اہلکار تھے، جو دانستہ سادہ لباس میں تھے۔ دو تین مزید افراد اگلے دروازے سے اندر داخل ہو گئے۔ اب ہم دونوں طرف سے پھنس گئے تھے۔ یہ تو شکر تھا کہ ابھی ہم دونوں ان میں سے کسی کی نظروں میں نہیں آئے تھے مگر زیادہ دیر ایسا نہیں چل سکتا تھا۔

درمیان کا ایک دروازہ دیکھ کر میں نے اسی جانب رخ کیا اور بڑی پھرتی کے ساتھ پرلی طرف کے دروازے سے سوشیلا کو لے کر نیچے اُتر گیا۔ مگر اس کے ساتھ ہی میرے عقب سے ایک تیز اور کرخت سی آواز اُبھری تھی۔

''رک جاؤ......''

''دوڑو سوشیلا......!'' میں چلایا اور پھر ہم دوسری طرف نیچے اُترتے ہی اندھا دھند دوڑ پڑے۔ اسی وقت پے در پے سیٹیاں بج اُٹھیں۔ ایک دو فائر بھی ہوئے، یہ شاید ہوائی فائر تھے۔

میں اور سوشیلا رات کی تاریکی کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے ایک قریب کھڑی مال گاڑی کی آڑ میں چلے گئے۔ مڑ کر دیکھا تو تاریکی میں کئی ہیولے اسی طرف بڑھتے ہوئے نظر آئے۔ ان کے ہاتھوں میں ٹارچیں تھیں۔ مگر ہم نہیں رکے اور دوڑتے ہی چلے گئے۔ یہاں تک کہ اسٹیشن کی حدود سے باہر نکل آئے۔

ایک جانب کچے پکے مکانوں کا بے ترتیب سلسلہ پھیلا ہوا تھا، ہم نے ادھر کا ہی رخ کیا۔ اُدھر پولیس کے سادہ لباس اہلکار بدستور سیٹیاں بجاتے اسی طرف ہی دوڑے چلے آ رہے تھے۔ وہ اکا دکا فائر بھی کیے جا رہے تھے۔

ہم مکانوں کی گلیوں میں داخل ہو گئے جو سنسان پڑی ہوئی تھیں۔ انہی گلیوں میں سوشیلا اور میں دوڑتے چلے گئے، بالآخر ہمیں رکنا پڑا۔ آگے گلی بند تھی۔ ہمارے عقب میں پولیس کی سیٹیاں گونج رہی تھیں۔ میں ہونٹ بھینچے کھڑا سوچتا رہا۔ عقب میں دیکھا۔ واپسی کا در بند تھا، اگر اس گلی سے باہر نکلنے کی کوشش کرتے تو دھر لیے جاتے۔

''اب کیا ہو گا......؟ یہ گلی تو بند ہے آگے سے...... جلدی سے واپس پلٹو۔'' سوشیلا نے پریشانی سے کہا۔

''واپسی کا در بند ہو چکا ہے......'' میں نے ڈرامائی لہجے میں کہا۔ جانے کیوں ایسی کسی سچویشن میں میرے دل و دماغ میں ایک عجیب سا جوش سوار ہو جایا کرتا تھا۔ میرا اندر کچھ کرنے پر مائل ہونے لگتا تھا۔ عقب میں پولیس کی بدستور وسلیں جاری تھیں اور اب تو گہری نیند میں ڈوبے ہوئے لوگ بھی جاگنے لگے تھے۔ اچانک میری گردشی نظروں نے اس بند گلی کے آخری سرے پر ایک گھر کا دروازہ دیکھا، وہ بند تھا، مگر اس کی جھری سے روشنی آتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ یہ جھری دروازے کے دونوں پٹوں کے درمیان تھی اور اس قدر چوڑی تھی کہ مجھے گمان ہوا کہ دروازہ کھلا پڑا تھا۔

''آؤ جلدی......'' میں نے اسی گھر کی طرف قدم بڑھا دیے۔ سوشیلا حیران پریشان سی میرے ساتھ آگے بڑھی، وہ شاید سوچ رہی تھی کہ مجھے اس بند گلی میں ایسا کیا نظر آ گیا تھا، جو میں نے فوراً آگے بڑھنے کا اعلان کر ڈالا تھا۔

میں دروازے کے قریب پہنچا ہی تھا کہ اچانک گلی کے دوسرے سرے پر مجھے تیز سیٹی کی آواز سنائی دی اور ساتھ ہی متعدد دوڑتے ہوئے بھاری قدموں کی آواز بھی اُبھری تھی۔

میں نے اسی وقت آؤ دیکھا نہ تاؤ...... دروازے کے

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

قریب پہنچتے ہی اسے قدرے آہستگی سے اندر کی طرف دھکیلا۔ وہ کھلتا چلا گیا۔ میں سوشیلا سمیت غڑاپ سے اندر گھس گیا۔ مختصر سے نیم پختہ صحن پر مشتمل یہ مکان بھائیں بھائیں کرتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ سامنے چھوٹا برآمدہ تھا اور دو کوٹھری نما کمرے دکھائی دیتے تھے۔ ایک کا دروازہ بند اور دوسرے کا کھلا تھا۔ اندر روشنی تھی۔

میں نے پہلے جلدی سے دروازہ بند کیا اور سوشیلا کو وہیں صحن میں ہی کھڑے رہنے کا کہا پھر اس کے بعد خود دبے پاؤں کھلے دروازے والے کمرے کی طرف بڑھا۔

باہر سے سیٹیوں کی اب وقفے وقفے سے آوازیں آرہی تھیں۔

اس کوٹھری نما کمرے کے دروازے کے قریب پہنچ کر میں رکا اور ذرا اندر کی طرف جھانکا تو جیسے یکایک میرے سینے میں سانسیں اٹکنے لگیں۔ اندر کا منظر ہی کچھ ایسا چکرا دینے والا تھا کہ میں مبت سا بن گیا۔

☆☆☆

کمرے میں روشنی تھی۔ جس کی محدود فضا میں ہلکی سی خوشبو کے علاوہ ایک عجیب بو بھی خلط ملط ہوگئی تھی۔ کمرے میں پھولوں کی پتیاں بکھری ہوئی تھیں، کچھ دیواروں پر بھی چپکائی گئی تھیں۔ چارپائی کے گرد بھی کہیں کہیں سستے اور رنگین کاغذوں کی پٹیاں لگی ہوئی نظر آتی تھیں۔ جو سیج کا منظر پیش کرتی تھی۔ بہ ظاہر یہ سارا منظر شبِ زفاف کا ہی نظر آتا تھا، کیونکہ چارپائی پر دو نئے نویلے دولھا دلہن بھی موجود تھے، اس طرح کہ دونوں لیٹی ہوئی حالت میں ایک دوسرے کو اپنی بانہوں میں لیے ہوئے تھے، لیکن دو دلوں کو ارمانوں کے ہنڈولوں پر جھولا جھولنے سے پہلے ہی نجانے کن ظالموں نے موت کی اندھیری گود میں پہنچا دیا تھا۔ وہ اب لاشوں کی صورت میں چارپائی پر پڑے ہوئے تھے۔ دلہن کے چہرے پر نو دمیدہ ارمانوں کی مسکراہٹ، گویا اچانک جھپٹنے والی موت نے اس طرح چھین لی تھی کہ اس کے حنائی لب اسی طرح ہی وا رہ گئے تھے اور وہ مسکراہٹ بھی ثبت رہ گئی تھی۔

مجھے دونوں کی عمروں کا اندازہ، بیس، اکیس اور چوبیس، پچیس سے زیادہ کا نہ ہوسکا۔ غریب گھرانے سے ہی اس بدنصیب نئے نویلے جوڑے کا تعلق لگتا تھا، ان کے عروسی لباس بھی عام اور سستے سے دکھائی پڑتے تھے۔ دونوں کے جسم خون کی چھپڑی میں پڑے ہوئے تھے۔ انہیں شاید تیز دھار آلے کی مدد سے پے در پے وار کر کے اور

سبق

استاد نے شاگرد سے کہا۔ ”اب جبکہ تم نے یہ سبق اچھی طرح پڑھ لیا ہے۔ یہ بتاؤ کہ بیٹے نے باپ کے سامنے اس کا پسندیدہ درخت کاٹنے کا اعتراف کرلیا تو باپ نے اسے کیوں نہ مارا؟“

”اس لیے کہ اسے معلوم تھا کہ ابھی بیٹے کے ہاتھ میں کلہاڑا ہے۔“

☆☆☆

ملٹری کے ایک سپاہی کو شراب پینے کے جرم میں رنگے ہاتھوں پکڑا گیا مگر وہ ایک اچھا سپاہی تھا۔ اس لیے کیپٹن نے مناسب سمجھا کہ پیار کے ساتھ اسے سمجھائے۔

”دیکھو ڈیوڈ! ایک دن تم سارجنٹ بن سکتے ہو بلکہ ترقی کر کے لیفٹیننٹ تک بن سکتے ہو، بشرطیکہ تم شراب پینے سے باز آجاؤ۔“

”سچ کہتے ہو کیپٹن۔“ سپاہی نے کہا۔ ”لیکن تمہیں نہیں معلوم کہ حلق سے نیچے چند قطرے اترتے ہیں اور میں کیپٹن بن جاتا ہوں۔“

کراچی سے امجد علیم کی عنایت

بڑی بیدردی سے موت کے گھاٹ اُتارا گیا تھا اور یقیناً اسی وقت اُتارا گیا ہوگا جب یہ دونوں اپنی پھولوں سے سجی، محبت اور ارمانوں بھری سہاگ رات کی شروعات کرنے لگے تھے کہ کسی ظالم نے ان کی خوشیوں پر ایسا شب خوں مارا کہ اس بے چارے بدنصیب جوڑے کو تو مرتے وقت پتا بھی نہ چلا ہوگا کہ ان کے ساتھ ہوا کیا ہے؟ حملہ کرنے والے ایک سے زائد بھی ہوسکتے تھے۔

”او...... مائی گاڈ......!“

دفعتاً مجھے اپنے عقب سے سوشیلا کی کپکپاتی سی آواز سنائی دی۔ میں نے قدرے چونک کر اس کی طرف پلٹ کے دیکھا، وہ جانے کب میرے پیچھے آکر آن کھڑی ہوئی تھی۔ حالانکہ میں نے اسے باہر صحن میں ہی کھڑے رہنے کی تاکید کی تھی، لیکن شاید مجھے اندر کوٹھری نما اس کمرے میں کھڑے زیادہ دیر ہوگئی تھی، اس لیے وہ تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کے یہاں چلی آئی تھی۔

”ی ی...... یہ، کیا ہوا، کس نے قتل کیا ہے ان کا؟“ وہ بولی۔

”کم از کم میں نے انہیں قتل نہیں کیا۔“ میں ایک

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

ٹھنڈی سانس خارج کر کے بولا۔

''تمہاری بات نہیں کر رہی ہوں میں......'' وہ بولی۔

''تو پھر تمہارا سوال ہی بے وقوفانہ ہے۔'' میں نے کہا۔ ٹھیک اسی وقت باہر دروازے پر کچھ لوگوں کے زور زور سے باتیں کرنے کی آوازیں ابھریں۔ میں چونکا۔ پھر باہر سے دروازے پر زور زور سے دستک دینے کی آوازیں آنے لگیں۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے دروازہ ہی توڑ ڈالیں گے۔ میرا پہلا خیال پولیس کی طرف ہی گیا تھا اور میرے دماغ کے گویا چودہ طبق روشن ہو گئے تھے۔ ہم دونوں اندر موجود تھے اور اندر دو لاشیں پہلے ہی سے ہمارے استقبال کے لیے موجود تھیں۔ باہر پولیس تھی اور جو ہماری تلاش میں یہاں تک آ گئی تھی۔ ان دونوں لاشوں کی موجودگی میں ہمارا دھر لیا جانا، پرایا گناہ اپنے سر لینے کے مترادف تھا، چاہے زبردستی ہی سہی۔

میں نے سوشیلا کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور فوراً ہی کمرے کی روشنی گل کر دی۔ اب پورا گھر اندھیرے کی آماجگاہ بن چکا تھا۔ میں نے سوشیلا کا ہاتھ پکڑا اور باہر صحن میں آ کر اس طرف کا رخ کیا جہاں پہلے ہی ایک کونے میں بنے ہوئے حوائج ضروریہ کے نام پر ایک چھوٹی سی چار دیواری کھڑی کی گئی تھی۔ اور ساتھ ہی رسوئی تھی، ان کے درمیان ... مختصر سا خلا تھا جہاں کاٹھ کباڑ اور جانے کیا الا بلا ٹھنسا پڑا... تھا۔ میں سوشیلا کو لیے اس...... میں گھس گیا، جگہ تنگ تھی، مگر میں اور سوشیلا کسمسا کر اس میں سما گئے اور اسی دوران ہی میرا ہاتھ کسی شے سے ٹکرایا اور میرے ذہن میں ایک جھماکا ہوا، یہ کسی مین سوئچ کا بورڈ تھا۔ میں نے بروقت ہاتھ ہٹا لیا کہ کہیں کرنٹ ہی نہ لگ جاتا۔

ٹھیک اسی وقت دروازہ توڑ دیا گیا۔ کئی افراد اندر داخل ہو گئے۔ اسی وقت مجھے روشنیوں کے جھماکے بھی دکھائی دیے۔

میری دم بہ خود سماعتوں نے کئی آوازیں سنی تھیں۔

''ہائے رام......! اندر کیا ہوا، دوڑو، دیکھو......'' یہ کسی سن رسیدہ مرد کی آواز تھی، لہجے کی کپکپاہٹ سے تو یہی لگا تھا مجھے پھر دوسری آواز ابھری۔

''دروازہ کھلا ہے، اس کوٹھری کا، اسی طرف آؤ۔''

''رک جاؤ تم سب......'' معاً میری ٹھٹکی ہوئی سماعتوں نے ایک کرخت آواز سنی تھی۔

''پہلے ہم جا کر دیکھیں گے کہ اندر ماجرا کیا ہے۔ رمیش! تم پہلے جلدی سے جا کر باہر کا دروازہ بند کر دو......اور تم رندھیر! دوسری کوٹھری میں جاؤ۔ باقی میرے ساتھ آؤ۔''

''ہے سرکار......! یہ تو ظلم ہے، آدمی ہمرے جان کو ہیں یا جیندہ ہیں، ہمیں بھی تو دیکھ لینے دو۔''

یہ ایک جوان مرد کی آواز تھی، جبکہ ظاہر یہی ہوتا تھا کہ پہلے والے کرخت لہجے کا کوئی پولیس انسپکٹر ہی لگتا تھا۔ میرے ذہن طباع میں فوراً ہی ابھرا تھا کہ لاشوں کے وارث اور پولیس، ایک ساتھ ہی ہمیں ڈھونڈتی ہوئی یہاں آدھمکی تھی۔ پولیس تو ہمارے پیچھے پڑی ہوئی ہی تھی، مگر لاشوں کے وارث یہاں کیسے پہنچے تھے اور کس کی اطلاع پر......؟ اس کا مجھے سردست کوئی اندازہ نہ ہو سکا تھا۔

بہرکیف......صورتِ حال گمبھیر تھی۔ ہم اگر دھر لیے جاتے تو دونوں گروہ کی طرف سے ہی عتاب کا نشانہ ٹھہرتے۔ جبکہ پولیس نے باہر کا دروازہ بھی بند کروا دیا تھا۔

''تم اپنی چونچ بند رکھو...... اور پولیس کو اپنا کام کرنے دو، ابھی سب کو پتا چل جاتا ہے۔ ہم سب بھی ادھر ہی ہیں۔'' وہی کڑک دار آواز ابھری۔

''اوئے رامشے! ذرا شانت رہ۔ سرکار (پولیس) ٹھیک کہہ رہی ہے۔ اگر کوئی مجرم ہے تو یہی لوگ اسے پکڑیں گے۔'' اسی عمر رسیدہ آدمی نے جوشیلے نوجوان کو سمجھایا۔

میں نے جھانک کر دیکھا۔ صحن میں پولیس اور دیگر لوگ کھڑے تھے۔ میرا دل سینے میں تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ خطرہ سر پر تھا۔ مفر کی کوئی راہ تک سجھائی نہیں دیتی تھی۔

تھوڑی ہی دیر میں وہاں کہرام مچ گیا۔ چیخ و پکار، دہائیاں اور دھمکیاں، بدلہ و انتقام کی باتیں۔ یہ یقیناً اس بدنصیب جوڑے کے وارث ہی تھے جو اس طرح کے غم و غصے کا اظہار کر رہے تھے اور پولیس کو انہیں سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا، یہاں تک کہ وہاں اور بھی لوگ آدھمکے، پولیس گھر کی تلاشی لینا چاہتی تھی، مگر وارثین پولیس کے اس عمل کو بے کار سمجھ رہے تھے کہ وہ اس طرح محض وقت ضائع کریں گے، جبکہ قاتل اپنا کام کر کے جا چکے تھے اور پولیس کو ترنت ان کی تلاش میں نکلنا چاہیے تھا، اب انہیں کیا معلوم تھا کہ پولیس تو خود ہماری تلاش میں یہاں پہنچی تھی اور یہاں یہ نیا معاملہ ان کے گلے آن پڑا تھا۔ مشتعل مجمع پولیس کی ایک بھی سننے کو تیار نہ تھا اور وہ جوش اور طیش میں پولیس سے بھی دو دو ہاتھ کرنے کو تیار ہو گئے تھے۔ ایسی نازک صورتِ حال میں پولیس کو بھی مجبوراً مصلحت کوشی پر اترنا پڑتا ہے۔ ایک چھوٹے سے گھر میں لوگوں کا رش دم بہ دم بڑھتا ہی جا رہا تھا، ان میں اب عورتیں بھی شامل ہو گئی تھیں، لگتا ایسا ہی تھا کہ

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

مقتولین اور ان کے وارثین کا اسی علاقے سے تعلق تھا۔

یہ لوگ بار بار کسی گلوے لال نامی گروپ کا ذکر کر رہے تھے کہ یہ حرکت انہی کی ہو سکتی تھی۔ ان لوگوں کی آپس کی چلا چلا کر گفتگو اور یقین کی حد تک ہونے والی قیاس آرائیوں سے یہی لگتا تھا کہ یہ خالصتاً رشتے کے سلسلے میں کوئی پرانا تنازع تھا، لڑکی مخالف گروہ کی تھی اور لڑکا ان کے گروپ سے تعلق رکھتا تھا۔ دونوں نے محبت کی شادی کی تھی، اور اب مخالف گروپ نے انتقاماً دونوں کو ہی عین سہاگ رات کو موت کے گھاٹ اُتار دیا تھا، یہ ایک ایسا نازک اور سنگین معاملہ تھا اگر ہم ایسے نازک وقت میں ان کے ہتھے چڑھ جاتے تو ہماری خیر نہیں تھی۔ یہ لوگ یہاں پولیس کی موجودگی کی پروا کیے بغیر پل کے پل میری اور سوشیلا کی تکا بوٹی کر ڈالتے۔

لوگوں کا رش اتنا بڑھ گیا کہ کھوے سے کھوا چھلنے لگا تھا۔ میرے ذہنِ رسا میں ایک خیال بجلی کی سی تیزی کے ساتھ آیا۔

''اب نہیں تو کبھی نہیں......''

میرے ذہن میں ابھرا اور پھر میں نہیں رکا، میں نے اسی مین سوئچ کے بورڈ کو بڑی احتیاط سے ٹٹولا اور پھر سوئچ آف کر دیا، ایکا ایکی گھٹا ٹوپ تاریکی چھا گئی، اگرچہ میں جانتا تھا کہ ان لوگوں کے پاس ٹارچیں بھی تھیں، مگر اتنی نہیں تھیں کہ وہ اس کی روشنی کو پھیلا سکتے۔ میں نے سوشیلا کا ہاتھ پکڑا اور خلا سے باہر نکل گیا، پھر اسی تاریکی سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے، لوگوں کی بھاری نفری کے درمیان پھنس پھنسا کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ بلاشبہ یہ میرا ایک خطرناک اور رسکی اقدام تھا، اگر کسی کو ہم پر شبہ بھی ہو جاتا یا ہم ادھر ہی دھر لیے جاتے تو اپنی صفائی پیش کرنے سے پہلے ہی ہماری تکا بوٹی کر دی جاتی۔ پرائی آگ میں بھسم ہونے سے پہلے ہی ہمیں ہر صورت میں یہاں سے نکل جانا تھا۔

شکر تھا کہ دروازے تک ایسا کوئی ''حادثہ'' پیش نہیں آیا، لیکن جیسے ہی ہم دروازے سے نکلے تو اندر سے کسی نے چلا کر خبردار کیا۔

''ہمیں کوئی دھکے دے کر باہر کو نکلا ہے۔ ہوشیار! جانے نہ پائے......''

جوشِ غیظ سے غراتی ہوئی اس آواز کے ابھرتے ہی وہاں تھرتھلی مچ گئی۔ مجمع بکھرنے لگا۔

باہر بھی لوگ باگ موجود تھے اور یہ دیکھے بغیر کہ اندر اب کسی کے تل دھرنے کو جگہ نہیں بچی تھی، پھر بھی اندر گھسنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ یہاں برائے نام ہی چند لوگوں نے ٹارچیں تھامی ہوئی تھیں۔

باہر نکلتے ہی میری گردشی نظروں نے قریب ہی ایک پولیس جیپ دیکھ لی، جیپ کی حالت کھٹارا سی تھی مگر اس سنگین تر نازک وقت میں وہ مجھے کسی جیٹ طیارے سے کم نہیں لگی۔ وہ کچھ فاصلے پر تھی اور وہاں اس کے قریب میں دو انڈین پولیس اہلکار خاکی وردی میں موجود تھے، ان میں سے ایک کے ہاتھ میں وائرلیس قسم کی کوئی شے تھی، جبکہ دوسرے کے ہاتھ میں گن تھی اور وہ مجمع کی طرف ہی دیکھ رہا تھا، دونوں ہی کچھ بوکھلائے ہوئے تھے۔

''سوشیلا! ہمت کرو...... ورنہ آج گئے۔'' میں نے اس کے کان میں سرسراتی ہوئی سرگوشی کی اور پھر اسے اپنے پیچھے آنے کا کہا۔ لوگوں کے ہجوم میں راستہ بناتے ہوئے ہم جیپ کی طرف بڑھ رہے تھے، جبکہ اندر مکان سے ابھرنے والی ہوشیار اور خبردار آواز نے ہمیں ہی خبردار کیا تھا، باقی لوگوں کو ابھی اس کا ادراک نہ ہو سکا تھا یا پھر اس کی آواز نقار خانے میں طوطی کی آواز کی طرح محض گونج کر رہ گئی تھی، بہرحال جو کچھ بھی تھا، ایسا زیادہ دیر تک نہیں چل سکتا تھا۔

ہجوم، اندھیرا اور افراتفری کا فائدہ اُٹھاتے ہی میں نے بالکل مناسب وقت میں ''ٹائمنگ'' کا بھی خیال رکھتے ہوئے، سریع الحرکت کا مظاہرہ کیا۔ کسی طرح ان دونوں کی نظروں میں آئے بغیر جیپ کے قریب پہنچا۔ جیپ بغیر ہڈ کی تھی اور حسبِ توقع مجھے اس کے اگنیشن سوئچ میں چابی، ایک بڑے چھلے کی صورت میں جھولتی ہوئی بھی نظر آ گئی۔ بس! میں یہی تسلی کرنا چاہتا تھا، اس کے ساتھ ہی میری عقابی گردش کرتی نظریں، مکان اور مشتعل ہجوم کی طرف بھی لگی ہوئی تھیں، جسے اب میں کچھ پھیلتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ شاید کافی سے زیادہ لوگوں کو کچھ شک ہو چلا تھا، ان میں پولیس والے بھی تھے۔

میں نے سب سے پہلے گن بردست اہلکار کی پشت پر لات جمائی اور اس سے پہلے اس کی گن پر ہاتھ مارا تھا، نتیجتاً اس کی گن میرے ہاتھ میں تھی اور وہ خود، دور لڑھکتا چلا گیا، وائرلیس والا اپنے ساتھ کھڑے ساتھی کو اُچھلتا پا کر خود بھی اُچھلا تھا اور اپنی سی پھرتی کے ساتھ اس نے، پشت پر سے گن اُچکنے کی بھی سعی چاہی تھی، مگر میں اسے کہاں موقع دینے والا تھا۔ میری دوسری لات کے مکمل طور پر حرکت میں آنے تک وہ بھی پرے جا گرا، اور میرے لیے اتنا ہی موقع کافی تھا، پہلے میں اور بعد میں سوشیلا نے کھلی جیپ میں جمپ لگائی

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

اور تب تک میں جیپ اسٹارٹ کر چکا تھا۔
جیپ غرائی اور تیزی کے ساتھ اس بند گلی میں ریورس ہوتی چلی گئی۔ ہجوم میں زوردار واویلا مچانے کے انداز میں چیخنے چلانے کی آوازیں ابھریں اور اس کا رخ ہماری طرف ہو گیا۔ مگر تب تک میں جیپ کو گلی سے نکال کر آبادی کے بیرونی ... راستے میں ڈال چکا تھا۔
تاریکی میں جیپ غراتی ہوئی دوڑنے لگی۔
''او...... گاڈ! یو آر گریٹ شہزی! آج تو بال بال بچے......'' وہ پچھلی سیٹ سے میرے برابر والی سیٹ پر جمپ مار کر بیٹھتے ہوئے، چہک کر بولی۔
''آج نہیں اکثر بچتے رہے ہیں۔ جب تک اللہ کی مدد شاملِ حال ہے، ایسے ہی چلتا رہے گا۔'' میں نے ونڈ اسکرین پر اپنی نظریں مرکوز رکھتے ہوئے کہا۔
''لیکن تم نے اللہ کی عطا کی ہوئی عقل کو بھی تو خوب استعمال کیا ہے، ایسا ہر کوئی نہیں کرتا۔'' وہ بولی۔
''مجھے تو یہ کسی ہیرو کی ایکشن مووی کا سین لگ رہا ہے۔''
اس کی زبان سے اللہ کا ذکر سُن کر مجھے حیرت آمیز خوشی ہوئی تھی۔ ورنہ اگر وہ اس کی جگہ بھگوان کا نام لیتی تو میری طبیعت یقیناً مکدر ہو جاتی۔
بہرکیف اس کی بات پر کوئی تبصرہ کیے بغیر میری ساری توجہ اب جیپ دوڑانے پر لگی ہوئی تھی۔
مجھے مین روڈ کی تلاش تھی۔ مختلف راستوں سے ہوتا ہوا، بالآخر میں ایک لمبی چوڑی سڑک پر جیپ کو لے آیا تھا۔ انڈین اہلکار سے چھینی ہوئی گن اب میرے کہنے پر سوشیلا نے سنبھال لی تھی۔
''کیا تم کوئی محفوظ مقام بتا سکتی ہو؟''
''شاید نہیں......''
''کوئی اندازہ یا مشورہ......؟ آخر کو یہ تمہارا ہی دیش ہے۔''
''ماسوائے اس کے کہ تم گاڑی مضافات میں لے چلو، یہاں شہر میں ہمارے لیے کوئی ٹھکانا محفوظ نہیں ہو سکتا۔'' بالآخر وہ مشورہ دینے کے انداز میں بولی تو میں نے پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔
جیپ رات کی گھور تاریکی اور پُرہول ویران سناٹوں میں دوڑتی ہوئی شہری آبادی سے خاصی دور نکل آئی تھی۔ اس دوران سوشیلا روڈ سائڈ لگے سنگِ میل دیکھنے اور پڑھنے کی کوشش بھی کرتی جا رہی تھی، اسی کی رہنمائی میں اس نے مجھے بتایا تھا کہ میں سرِ دست یہی راستہ اختیار کیے رہوں، کیونکہ سڑک آگے دو بڑے بائی پاس کو کراس کرے گی اور وہاں سے ہمیں کوئی مسافر بس مل سکتی تھی۔
میں نے ایسا ہی کیا۔ چند کلومیٹر کے سفر کے بعد مجھے اس سڑک کے اُوپر سے ایک اوورہیڈ جاتا دکھائی دیا اور بالکل ایک ایسا ہی ... اوورہیڈ دوسری جانب سے بھی نظر آیا تھا اور ایک مقام پر دونوں کا انٹرچینج بنا تھا۔ وہاں خاصی بھاری گاڑیاں اور ٹریلر ٹرک گزرتے ہوئے بھی نظر آ رہے تھے۔ وہیں مجھے ایک چوکی بھی دکھائی دی تھی جو شاید موٹر وے سے تعلق رکھنے والے عملے سے ہی ہو سکتی تھی۔
اب جیپ سے پیچھا چھڑانا ازبس ضروری ہو گیا تھا، یوں بھی اس کا قبول محدود رہ گیا تھا۔ لہٰذا میں نے ایک نظر دائیں جانب ڈالی اور جیپ اسی طرف جھاڑیوں میں موڑ لی۔ اندر ذرا گہرائی میں گھسنے کے بعد جب مجھے اطمینان ہو گیا کہ یہ اب کسی کو فوری طور پر نظر آنے والی نہیں ہے تو میں اور سوشیلا نیچے اُتر گئے۔ گن بھی ہم نے وہیں چھوڑ دی۔ یہ میں نے محض اس احتیاط کے پیشِ نظر ساتھ رکھ لی تھی کہ پولیس کے تعاقب میں آنے کی صورت میں ان سے مقابلہ کر سکوں۔ لیکن ہم پولیس کو اپنے راستے کی بھنک دیے بغیر اس طرح راہِ فرار اختیار کیے ہوئے تھے کہ وہ فوری طور پر ہماری گرد کو بھی نہ چھو سکی تھی، لیکن ظاہر ہے کہ ایسا زیادہ دیر نہیں چل سکتا تھا۔ جلد یا بدیر پولیس ہمارا کھوج نکال سکتی تھی، جب تک کہ ہم یہاں سے بھی دور نہیں نکل جاتے۔

☆☆☆

ہمارے گرد و پیش میں گھور سناٹا تھا۔ آگے رَکّو تھا۔ آس پاس جھینگر پھیلے ہوئے تھے، ہلکی ہلکی خنک سی ہواؤں کی اسرار بھری شائیں شائیں جاری تھی۔
قریب ڈھینگروں کے درمیان تنگ سا راستہ اُوپر اوورہیڈ برج کی طرف چلا جاتا تھا۔ وہاں سڑک کنارے لگے الیکٹرک پولز ایستادہ تھے۔ انٹرچینج پر کچھ گاڑیاں رکی ہوئی تھیں اور وہاں اچھی خاصی روشنی ہو رہی تھی۔
ہم دونوں ڈھینگروں کے درمیان سے چلتے ہوئے انٹرچینج کے دفتری عملے سے کافی دور ہو کر اُوپر چڑھنے لگے۔ میں ان کی نظروں میں نہیں آنا چاہتا تھا کہ بعد میں پولیس کو یہاں سے ہمارے متعلق کوئی انفارمیشن ملتی۔
اوورہیڈ کا یہ ڈھلانی راستہ خاصا عمودی تھا، جس سبب میرا تو اتنا نہیں البتہ سوشیلا کا اچھا خاصا دم پھول گیا تھا۔ تاہم میں نے اس کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا اور اسے کھینچنے کے انداز میں

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

اُوپر چڑھ رہا تھا۔ بالآخر اس نے بھی ہمت نہیں ہاری اور ہم اب ایک لمبی چوڑی ڈبل سڑک کے کنارے پر تھے۔ اس کے اُوپر بھی ایک سڑک جارہی تھی۔ تلے اُوپر سڑکوں کا ایسا ٹیکنیکل جال پاکستان میں بھی پھیلنے لگا تھا۔ یہ تو سڑک تھی، میرے پیارے پاک وطن کے ماہر انجینئروں اور کاریگروں نے تو دو دریاؤں تک کو ایک دوسرے کے اُوپر سے گزار رکھا تھا۔

یہ والی سڑک خاصی چوڑی اور ڈبل تھی۔ ٹریفک رواں دواں تھی، زیادہ تر لوڈڈ اور ہیوی باربردار ٹرک گزر رہے تھے، تیز رفتار لگژری کوچز بھی گزر رہی تھیں۔ پرائیویٹ گاڑیاں بھی کچھ نظر آجاتی تھیں۔ قدرے بلندی پر ہونے کی وجہ سے یہاں ہواؤں کا زور بھی تیز تھا۔

یہاں سے کوئی لفٹ ملنا مجھے عبث ہی نظر آرہا تھا بلکہ کوئی مسافر کوچ وغیرہ کا بھی یہاں ٹھہرنا ناممکن ہی ہوسکتا تھا۔ مگر میرے ذہن میں تھا کہ مجھے آگے کیا کرنا تھا۔ لیکن اس سے پہلے میں منزل کا تعین کرنا چاہتا تھا کہ ہمیں سڑک کے کس رخ پر اپنا آگے کا سفر جاری رکھنا چاہیے تھا۔ چنانچہ ذرا دیر ستانے کے بعد میں نے سوشیلا سے یہی کہا تو وہ جواباً سڑک کے دونوں طرف ایک نگاہ ڈالنے کے بعد بولی۔

''کوئی ٹریفک سائن بورڈ دیکھے بغیر مجھے بالکل اندازہ نہیں ہوگا شہزی! شہروں کے نام پڑھنا ضروری ہیں۔ تب ہی میں ٹھیک طرح سے بتا پاؤں گی۔''

اس کی بات معقول تھی۔ ذرا فاصلے پر ایک بڑا اسافل روڈ کور سائن بورڈ دونوں طرف دکھائی دے رہے تھے۔ جن پر مختلف شہروں کے ناموں کے ساتھ ان کی روڈ ڈائریکشن بھی دی گئی تھی۔ ہم اس طرف بڑھ گئے، یوں ہم نے باری باری دونوں طرف کی سڑک کے یہ مذکورہ سائن بورڈ چیک کیے تو ہمیں دوسری والی سڑک پر بھنیشور درج نظر آگیا، جو سامنے کے رخ پر تھا۔ ممبئی تک جانے کے لیے اسی شہر کا روٹ ہمیں درکار تھا۔ یوں ہم اسی ڈائریکشن پر سڑک کے کنارے کھڑے ہوگئے۔ میں اب گردوپیش کا جائزہ لینے لگا۔

''اگر تم یہ سوچ رہے ہو کہ یہاں سے ہمیں کوئی سواری مل جائے گی تو بے کار ہے یہ سوچنا۔ تم دیکھ ہی رہے ہو کہ یہاں سے بغیر رکے گولی کی رفتار سے ٹریفک رواں دواں ہے۔'' سوشیلا نے مجھے سوچتا پا کر کہا تو میں نے کہا۔

''اس بات کا مجھے بھی اندازہ ہے۔ ہمیں چوری چھپے ہی کسی گاڑی میں سوار ہونا پڑے گا۔''

''اس کے لیے بھی کسی گاڑی کا رکنا ضروری ہے، تم دیکھ ہی رہے ہو کہ یہاں ٹریفک کتنی تیز رفتار ہے۔'' وہ بولی۔

''اس کا حل ہے میرے پاس۔'' میں نے کہا۔ ''ہمیں انٹرچینج تک جانا ہوگا۔ یہاں سے گزرنے والی گاڑیاں ٹول ٹیکس ادا کرنے کے لیے وہاں ذرا دیر کو رکتی ہیں۔''

''مگر اس طرح ہم متعلقہ عملے کی نظروں میں آسکتے ہیں۔''

''تم آؤ میرے ساتھ۔'' میں نے باتوں میں وقت ضائع کرنے کے بجائے یہ کہتے ہوئے قدم آگے بڑھا دیے۔

ابھی ہم انٹرچینج سے تھوڑا ہی قریب پہنچے ہوں گے کہ اچانک میری آنکھوں میں چمک ابھری، انٹرچینج کے ٹول پلازہ کو کراس کرنے کے بعد ایک ٹرک روانہ ہوا مگر ذرا آگے جا کر رک گیا، میں نے دیکھا اس کا ڈرائیور نیچے اتر کر بونٹ کی طرف بڑھا، اس میں شاید کوئی خرابی پیدا ہوگئی تھی۔

''جلدی آؤ، میں اس سنہری موقع کو ضائع نہیں کرنا چاہتا۔'' میں نے کہا اور تیز تیز قدموں سے اس کی طرف بڑھنے لگا۔ سوشیلا میرے عقب میں تھی۔ ہم ٹرک کے عقب میں ذرا نزدیک پہنچ کر رک گئے۔ ٹرک میں دو ہی افراد تھے، ایک ڈرائیور اور دوسرا اس کا کوئی نوعمر ساتھی لڑکا تھا۔ وہ بھی نیچے اترا ہوا تھا اور ڈرائیور کی مدد میں شامل تھا۔ ٹرک درمیانے سائز کا تھا اور باربرداری کے کام آتا تھا۔ اس کے عقبی حصے میں بوریاں اور لکڑی کی پیٹیاں لدی ہوئی تھیں اور درمیان میں تنگ سہی لیکن اتنی گنجائش نظر آتی تھی کہ میں اور سوشیلا اس درمیان میں ''پھنس پھنا'' کرسا سکتے تھے۔

میں نے پھر اس موقع سے فائدہ اٹھانے میں ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا تھا۔ پہلے خود اس کے پچھلے حصے میں سوار ہوا، اس کے بعد میں نے سوشیلا کا بھی ہاتھ پکڑ کر اسے اُوپر کھینچ لیا۔

تھوڑی دیر بعد ٹرک کے ڈرائیونگ کیبن میں کھٹر بڑ کی آواز ابھری، اس کے دروازے کھلے تھے، شاید وہ دونوں مذکورہ افراد اس میں سوار ہوگئے تھے۔ ذرا ہی دیر بعد ٹرک اسٹارٹ ہوکر آگے بڑھ گیا۔ میں نے سکھ کا سانس لیا ہی تھا کہ اچانک میری سماعتوں میں تیز سائرن کی سمع خراش آواز سنائی دی اور میں بری طرح ٹھٹکا۔

''پولیس۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

میرے ذہن میں اُبھرا۔ سوشیلا بھی اس آواز پر یہی اندازہ قائم کر کے متوحش سی نظر آنے لگی، میں نے ذرا آگے سرک کر جھانکا۔ مجھے انٹر چینج کی طرف ایک بڑی سی پولیس گاڑی رکتی دکھائی دی تھی، جس کی چھت پر سرخ اور نیلے رنگ کا گردشی ہوٹر گونج رہا تھا۔ ٹرک اس سے لحہ بہ لحہ دور ہوتا جا رہا تھا اور میں یہی دعا مانگ رہا تھا کہ یہ ٹرک کسی طیارے کی رفتار پکڑ لے۔ کوئی بعید نہ تھا کہ پولیس سیٹیاں بجا کر اس ٹرک کو روکنے کا حکم دے ڈالتی، یوں تو وہاں چند اور بھی گاڑیاں کھڑی تھیں۔

خیر ہوئی کہ ٹرک سست روی سے ہی سہی ان سے بہت دور چلا گیا، حتیٰ کہ انٹر چینج اور پولیس کی گاڑی نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

''ضروری نہیں ہے کہ ہم اس ٹرک کے ذریعے اپنی منزل کے قریب پہنچ سکیں۔'' ذرا سکون کے لمحات میسر آئے تو سوشیلا نے کہا۔ ''یہ اپنا رخ تبدیل بھی کر سکتا ہے، اس صورت میں ہم اپنے اصل راستے سے بھٹک جائیں گے۔''

''مجھے بھی اس بات کا ادراک ہے۔'' میں نے کسمسا کر ایک کونے میں خود کو اٹکاتے ہوئے جواب دیا۔

''ابھی تو ایک بات ہمارے حق میں ہوئی ہے کہ ہم فوری طور پر ایک بڑے خطرے سے باہر نکل جانے میں کامیاب ہو چکے ہیں، رہی بات اس ٹرک کے رخ بدلنے کی تو فی الحال یہ ہماری مطلوبہ سمت کی طرف ہی بڑھ رہا ہے، اب یہ تم دیکھو گی کہ کہاں سے اس کا راستہ بدلتا ہے، تو وہیں سے ہم بھی اُتر جائیں گے۔''

''کیا چلتے ٹرک سے چھلانگ لگا دو گے؟'' وہ ہنس کر بولی۔ میں نے کہا۔

''اس کی رفتار ہی اتنی ہے کہ بندہ اترے اور پیشاب وغیرہ سے فارغ ہو کے دوبارہ اس میں بہ آسانی سوار ہو جائے۔'' میری بات پر سوشیلا کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''شش...... آہستہ ہنسو! ڈرائیور کیبن دور نہیں ہے یہاں سے، جہاں ہم چھپے بیٹھے ہیں۔'' میں نے اسے ٹوکا۔

''اس ٹرک کے کھڑکھڑانے کا شور ہی اتنا ہے کہ ہماری آوازیں ان تک نہیں پہنچ سکتیں۔'' وہ بولی۔

''پھر بھی احتیاط ضروری ہے۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔

سفر خاموشی سے جاری تھا۔ ہم پر تھکن غالب تھی اور بھوک پیاس کا بھی غلبہ طاری ہونے لگا تھا۔ تب پھر میرا دھیان ان بوریوں اور پیٹیوں کی طرف چلا گیا۔ ممکن تھا ان میں کھانے پینے کی اشیا ہوں۔ میں نے سوچا اور پھر ایک بوری پر ''طبع آزمائی'' شروع کر دی۔ بوری کینوس کی تھی، مگر میں نے کسی طرح اُس کا ایک سرا پھاڑ ڈالا، اس کے اندر سے کوئی ترکاری جھانکنے لگی۔ یہ کوئی کدو قسم کی سبزی تھی، اسے کون کھاتا، وہ بھی کچا، میں نے ایک اور بوری کو تختۂ مشق بنایا، اس میں کھیرے نکلے، یہ کھائے جا سکتے تھے، میں نے چار پانچ کھیرے نکال لیے۔ میں اور سوشیلا اسی سے پیٹ کی آگ بجھانے لگے۔ بوریوں میں شاید اسی قسم کی کچی ترکاریاں تھیں، کچھ سوچ کر میں چوبی پیٹیوں کی طرف متوجہ ہوا۔ ایک کو کسی طریقے سے کھولا تو دل خوش ہو گیا، اس میں فروٹ تھے، سیب، دوسری میں کیلے۔ ''ویٹ'' فروٹ سے پیٹ بھرنے کے ساتھ ساتھ پیاس کا بھی کافی حد تک مسئلہ حل ہو گیا۔ خالی معدہ ان مقوی خوراکوں سے پُر ہوا تو نیند نے اپنا غلبہ دکھانا شروع کر دیا۔

سوشیلا شاید تھک کر سو گئی تھی، کیونکہ ذرا ہی دیر بعد اس کے خراٹوں کی آوازیں آنے لگیں۔ مجھے بھی نیند آنے لگی تھی، مگر میں سونا نہیں چاہتا تھا، وگرنہ راستہ کھو دیتا، کیونکہ ابھی مجھے ٹرک کے راستوں کا تعین کرنا تھا۔ سوشیلا کے محتاط اندازے کے مطابق بھبنیشور کوئی ڈیڑھ سو کلومیٹر دور تھا، سوشیلا کے مطابق ہم اب بالاسور، بھگت گڑھ سے یہاں تک بیس تیس کلومیٹر کا سفر تو پاٹ ہی چکے تھے۔

میں سوشیلا کو سوتا چھوڑ کر ذرا آگے کو سرک آیا، اور اب ٹرک کے سرے پر تھا۔ میری نظروں کے سامنے سڑک جیسے پیچھے سے نکلی جا رہی تھی۔ دور پو پھٹنے کے آثار نو دمیدہ ابھرنے لگے تھے۔ اب تک ٹرک کہیں نہیں رکا تھا اور اس کی رفتار میں بھی کچھ اضافہ لگتا تھا، یوں میرے اندازے کے مطابق وہ ابھی تک ہماری مطلوبہ سمت کی طرف ہی بڑھتا چلا جا رہا تھا اور میں خدا سے یہی دعا مانگ رہا تھا کہ اس ٹرک کی منزل کم از کم بھبنیشور تک تو ضرور ہو، تاکہ ممبئی تک کافی حد تک فاصلہ طے پا جائے۔ اس کے بعد ہماری منزل زیادہ دور نہیں ہوتی۔ سوشیلا نے بتایا تھا کہ اس سے پہلے یہاں سے سیدھا راستہ ممبئی تک رائے پور سے ہی جاتا تھا۔ اس سے پہلے جو عام سڑک تھی اس میں دیر لگتی تھی۔ اس ہائی وے کے بننے کے بعد راستہ سہل اور مختصر ہو گیا تھا، اسی لیے اس کا یہی مشورہ تھا کہ ہمیں اسی ہائی وے پر رہتے ہوئے اپنی منزل کی جانب پیش قدمی کرتے رہنا چاہیے تھا۔ ظاہر ہے سوشیلا ایک بھارتی لڑکی تھی اور اسپیکٹرم کی ایک پرانی فیلڈ ورکر بھی، اُسے راستوں کا اندازہ تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

روشنی اچھی خاصی پھیلنے لگی تھی، ٹرک کے اندر کا حصہ روشن ہونے لگا تھا، ایک طرف مجھے سوشیلا بوریوں اور پیٹیوں کے درمیان آڑی ترچھی بے سدھ سی پڑی نظر آئی، وہ بے چاری اس قدر گہری نیند سو رہی تھی کہ اپنے شریر کے تڑنے مڑنے کی بھی اسے پروا نہیں رہی تھی۔ نیند ہوتی ہی ایسی ہے کہ سولی پر بھی آجاتی ہے۔ خود میرا اپنا بھی نیند سے بُرا حال ہو رہا تھا۔ جی چاہ رہا تھا کہ میں بھی سوشیلا کی طرح ادھر ہی کہیں بوریوں اور پیٹیوں کے درمیان پڑ کر سو جاؤں...... اور پھر ایسا ہو بھی گیا، میں ابھی کہیں ٹک کر بیٹھا ہی تھا کہ پتا ہی نہ چلا کب میری بھی آنکھ لگ گئی۔

☆☆☆

میری آنکھ کھلی تو کوئی مجھے زور زور سے جھنجوڑ کر جگانے کی کوشش کر رہا تھا۔

''کک...... کون...... کون؟'' میں بھی یک دم ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ نیند سے یک دم جاگو تو ابتدا میں دماغ ماؤف رہتا ہے، آہستہ آہستہ حواسوں میں آنے پر ہی بتدریج ادراک ہوتا ہے کہ ہوا کیا تھا۔ مجھے بھی کچھ سیکنڈوں کا وقت لگا تھا۔ حواس بحال ہوئے تو مجھے پہلی آواز سوشیلا کی ہی معلوم ہوئی تھی۔ وہ ہولے ہولے کہہ رہی تھی۔

''شہزی...... شہزی! اُٹھو...... پلیز! جاگ جاؤ۔''

اس کی آواز پہچان کر میں نے اسے دیکھنے کی کوشش چاہی تھی مگر عبث...... میں اسے دیکھنے تک سے قاصر تھا، بلکہ مجھے تو کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے گھٹا ٹوپ تاریکی کے سوا کچھ بھی نہ تھا بلکہ ہاتھ کو ہاتھ تک سجھائی نہ دیتا تھا۔

''میں جاگ گیا ہوں...... مگر یہ تاریکی......؟'' میں نے کہا۔

''ٹرک پر شاید کینوسی ٹاپ کور چڑھا دیا گیا ہے۔'' سوشیلا نے نیچی آواز میں کہا۔

''ہم ابھی تک ٹرک میں ہی سوار ہیں؟''

''ہاں! مگر ٹرک رکا ہوا ہے، کہاں؟ اس کا مجھے اندازہ نہیں ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''میری خود ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی آنکھ کھلی تھی، تو مجھے بھی تاریکی محسوس ہوئی تھی۔ لیکن میں نے ٹٹول ٹٹول کر احساس کر لیا تھا کہ یہ تاریکی کس قسم کی ہے۔ اندازہ ہونے کے بعد ہی میں نے تمہیں جگایا ہے۔''

میں چند ثانیے پُرسوچ انداز کی خاموشی کے بعد ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''آؤ ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر ذرا جائزہ اور کچھ سن گن لینے کی کوشش کرتے ہیں۔''

سوشیلا نے اپنا نرم و نازک ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیا۔ ہم دونوں دوسرے ہاتھ سے گرد و پیش کو اندھوں کی طرح ٹٹولتے ہوئے ایک اندازے سے ٹرک کے اس حصے کی طرف بڑھنے لگے جو سرے تک جاتا تھا۔ یہاں پہنچ کر ہم رکے، اس جانب ٹرک کا ٹاپ کور ذرا نیچے کو جھکا ہوا تھا، میں نے اسے چھو کر اندازہ لگانے کی کوشش تو احساس ہوا کہ یہ اتنا موٹا نہیں تھا کہ اس سے باہر کی روشنی کراس نہ ہوتی ہو، صاف مطلب تھا کہ ٹرک مال سمیت کسی گودام کے اندر کھڑا کر دیا گیا تھا اور گودام کی بتیاں مکمل طور پر گل تھیں۔ شکر تھا کہ ہمارے سونے کے دوران مال ''ان لوڈ'' نہیں کیا گیا تھا ورنہ ہم کسی کی بھی نظروں میں آسکتے تھے۔ دوسرے یہ کہ وقت کا بھی ابھی صحیح طور اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا۔ تاہم مجھے یاد تھا کہ جس وقت مجھ پر نیند کا غلبہ طاری ہونے والا تھا اس وقت صبح ہونے لگی تھی۔

بہرحال کسی ذی نفس کی دور قریب یا اطراف میں غیر موجودگی کی تسلی کر لینے کے بعد میں آہستگی کے ساتھ کینوسی ٹاپ کور ہٹانے کی کوشش میں لگ گیا، سوشیلا بھی ساتھ دینے لگی، ٹاپ کور کو چھونے کے بعد محسوس ہوا کہ وہ خاصا گیلا ہو رہا تھا۔ ممکن تھا کہ راستے میں بارش کی وجہ سے اس پر یہ ٹاپ کور چڑھا دیا گیا ہو، تب بھی ہماری قسمت ہی تھی کہ ہم ٹاپ کور چڑھاتے ہوئے کسی کی نظروں میں نہیں آسکے تھے، اس کی وجہ بھی شاید یہی رہی ہوگی کہ ہم ٹرک کے اندر کافی گہرائی تک اور بوریوں، پیٹیوں میں پھنس پھنسا کر گھسے چھپے بیٹھے تھے۔

کور خاصی مضبوطی سے اور کس کسا کر ڈالا گیا تھا، مگر ہم نے کون سا سارا کور ہٹانا تھا، ایک کونا سرکا کر آدم گزار سا سوراخ بنا کر سب سے پہلے میں نے نہایت محتاط انداز میں باہر جھانکا تو کچھ جگنو جیسی روشنی کا ادراک ہونے لگا، یہ ایک باریک جھری جیسی روشنی تھی، جو ایک عمودی سی کرن کی صورت میں نظر آرہی تھی، غالباً یہ گودام کے گیٹ یا دروازے کی کوئی باریک، متوازی جھری تھی، اور چونکہ روشنی بھی باہر سے آرہی تھی اسی لیے مجھے یہ سوچ کر حیرت ہوئی کہ باہر رات ہو چکی تھی، اگر یہ اندازہ درست تھا تو اس کا مطلب تھا ہم کئی گھنٹے اسی طرح بے سدھ اور طویل نیند میں غرق رہے تھے کہ رات یا شام آن پڑی تھی۔ میں دھک سے رہ گیا۔ اگر ایسا تھا تو اس کا مطلب تھا ہم اسی

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

ٹرک کے ساتھ اپنے راستے سے خاصی دور تک بھٹک چکے تھے بلکہ اپنی منزل سے بھی کوسوں دور ہو چکے ہوں گے۔ اس بات نے مجھے خاصا پریشان کر دیا۔ جبکہ مجھے جلد از جلد ممبئی پہنچ کر سورت کے کسی نواح میں واقع بلیوتلسی کے ہیڈ کوارٹر میں گھس کر بلیوتلسی کے چیف کرنل سی جی بھجوانی کو جہنم واصل کرنا تھا۔ اس کے بعد کے ایل ایڈوانی کا بھی قصہ پاک کرنے کے ساتھ اس کے قبضے سے اپنے وطن عزیز کی امانت طلسم نور ہیرا بھی حاصل کرنا تھا، جبکہ ہیرے سے متعلق میرا جذبۂ حب الوطنی اپنی جگہ، مگر اس کے حصول کا میری اور سوشیلا کی نگاہ میں ایک عالمی جذبۂ انسانیت اور بے گناہ جانوں کو کسی بھیانک جنگ کی آگ سے بچانے کا بھی کارفرما تھا۔ کیونکہ وہ ہیرا تیسری عالمی جنگ کی سازش کا ذریعہ بھی بنایا جا رہا تھا۔

خدا جانے اب یہ ٹرک ہمیں کہاں لے آیا تھا اور کس علاقے یا شہر میں کہ ہمیں کوئی اندازہ نہ تھا۔ میں اور سوشیلا نیچے اتر گئے۔ میں دبے پاؤں اسی جھری کی طرف بڑھا اور اس سے اپنی ایک آنکھ چپکا دی۔ سامنے مجھے خاصا بڑا احاطہ نما میدان نظر آیا۔ اسی باریک جھری سے میں نے ذرا کوشش کر کے مقدور بھر اطراف کا بھی جائزہ لینے کی کوشش چاہی، تو مجھے ذرا ذرا فاصلے پر آہنی پائپ پر گلوب لگے ہوئے بھی دکھائی دیے تھے۔ یوں یہ منظر کسی فیکٹری کا ہی لگتا تھا۔ باقی یہ بات درست ثابت ہوئی تھی کہ ہم سارا دن سوتے رہے تھے اور باہر شام کا ملگجا اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ اب یہ نہیں پتا چلتا تھا کہ یہ ٹرک کب سے یہاں آن کھڑا ہوا تھا؟ باہر ہلکی ہلکی بوندا باندی بھی ہو رہی تھی۔ کچھ لوگ سگریٹ پیتے ہوئے بھی اِدھر اُدھر مٹرگشت کرتے نظر آئے، یہ اپنی وضع قطع سے مزدور کم اور چوکیدار قسم کی شے زیادہ محسوس ہو رہے تھے۔ میں نے دروازے کو کھولنے کی کوشش چاہی تو وہ باہر سے بند ملا۔ گودام میں یقیناً سوئچ بورڈ ہو سکتا تھا، مگر روشنی کر دینے سے کسی کو اندر موجودگی کا شبہ ہو سکتا تھا، لہٰذا لائٹ جلانے کا ارادہ میں نے ترک کر دیا۔

''کیا ہے باہر؟'' سوشیلا نے ہلکی آواز میں پوچھا۔

''کوئی کارخانہ یا فیکٹری لگتی ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''حیرت کی بات ہے، ٹرک اپنے ٹھکانے پر پہنچ کر بھی ان لوڈ نہیں کیا گیا۔''

''اچھا ہی ہوا۔'' میں نے ہولے سے کہا۔ ''ورنہ ہماری ٹرک میں موجودگی کا پول کھل جاتا۔''

''یہ بات بھی بہتر ہوئی۔ لیکن، آخر ہم یہاں سے نکلیں گے کیسے؟ اور نجانے اتنی طویل نیند کے بعد ہم کہاں سے کہاں آن پہنچے ہیں؟ کہیں دور ہی نہ نکل آئے ہوں، اپنی اصل منزل سے۔'' سوشیلا کے لہجے سے بھی تشویش اور فکرمندی ہویدا تھی۔ میں نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کے سرگوشی میں کہا۔

''یہ تو اب یہاں سے نکلنے کے بعد ہی پتا چل سکے گا۔ میں یہاں سے نکلنے کی کوئی تدبیر کرتا ہوں۔''

ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک مجھے باہر سے کسی کی باتوں کی آوازیں آتی سنائی دیں، میں چونکا۔ میں نے دوبارہ ذرا جھک کر جھری سے آنکھ لگانی چاہی تا کہ باہر دیکھ سکوں کہ اچانک وہ آوازیں دروازے کے بالکل قریب آ گئیں اور اس کے ساتھ ہی دروازہ کھلنے کی کھڑبڑاہٹ ابھری۔ میں فوراً سوشیلا کو لیے ٹرک کے پیچھے جا چھپا۔ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اسی وقت دروازہ کھلا۔ تین چار افراد اندر داخل ہوئے۔ پھر کسی نے لائٹ آن کر دی۔ میں نے ٹرک کی آڑ سے ذرا اپنا سر ابھار کر دیکھا۔ ان میں ایک تو ٹرک کا ڈرائیور تھا باقی دو اجنبی تھے لیکن اس کے ساتھ وہ ''چھوکرا ٹائپ'' لڑکا نہیں تھا جو اس کا ہیلپر تھا۔

''مال گیلا تو نہیں ہوا ہے؟'' ایک موٹے آدمی نے ڈرائیور سے دریافت کیا۔

''نہیں بابو! تم دیکھ رہے ہو کہ میں نے بارش کے چھینٹے پڑتے ہی ٹرک راستے ہی میں روک کر کپڑا چڑھا دیا تھا۔'' ڈرائیور نے جواب دیا۔

''ہوں ں......'' موٹے آدمی نے ایک لمبی ہمکاری بھری۔ وہ شاید کوئی ٹھیکے دار ٹائپ کی شے تھا۔ بولنے کا انداز بھی تحکمانہ تھا۔ موٹے کا ساتھی بانس کی طرح لمبا اور پتلا تھا۔ وہ اس سے مخاطب ہو کر بولا۔

''چل ارجن! سیٹھ کرشن داس کا مال اُتروا اور نوڈی صاحب کا مال لوڈ کرا دے۔''

''میں ابھی مزدور لگواتا ہوں، آپ فکر ہی نہ کرو، سنتوش بابو!'' ارجن نامی آدمی نے کہا۔

''دونوں کام ذرا ترنت کروا دینا ارجن! میں نے آج رات ہی روانہ ہونا ہے۔'' ڈرائیور نے کہا۔

''ابھی ہو جاتا ہے سارا کام، تم جاؤ مارواڑی کے پاس جا کر بھوجن پانی کرو جب تک۔'' ارجن نے اس سے کہا۔ اس کے بعد یہ تینوں باہر نکل گئے۔ پھر وہی ہوا، جس کا

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

مجھے کچھ اندازہ سا تھا، یعنی جاتے وقت انہوں نے گودام کا دروازہ بند نہیں کیا تھا۔ کامیابی کے احساس سے میرا دل بھی یکبارگی زور سے دھڑکا تھا۔

''جلدی نکل چلو سوشیلا! اس سے پہلے کہ گودام میں مزدور داخل ہو جائیں۔'' ان تینوں کے گودام سے نکلتے ہی میں نے سرگوشی کی اور پھر ہم دونوں محتاط روی کے ساتھ ٹرک کی آڑ سے ابھرے اور دروازے سے باہر نکل آئے۔

ایک طرف کاٹھ کباڑ بکھرا ہوا تھا، اس کے ساتھ والی چھ فٹ باؤنڈری وال کی دیوار کے ساتھ چپکے چپکے چلتے ہوئے ہم کھلے احاطے میں آگئے اور پھر وہاں سے باہر آگئے۔

اس کے بعد ہم نہیں رکے اور تیز تیز قدموں سے نامعلوم سمت کی طرف بڑھتے ہی چلے گئے۔ یہاں تک کہ اس گوادم والے ایریا سے کافی دور چلے گئے۔ یہ مجھے کوئی بڑی آبادی والا شہر ہی لگا تھا۔ کیونکہ کافی دور آنے کے بعد پُررونق بازار، مصروف چوراہا اور ایک طرف رہائشی علاقے کے آثار نظر آنے لگے۔

اب ہم یہاں مٹرگشت کے انداز میں گھومنے لگے اور کوشش تھی کہ کسی سے کچھ اس طور راہنمائی لیتے کہ اُسے ہم پر کوئی شبہ بھی نہیں ہوتا۔

''اوہو...... ہم تو نکارہ گوا میں ہیں۔'' میرے ساتھ قدم بہ قدم چلتے ہوئے سوشیلا نے متحیر آواز میں کہا۔ اس کے لہجے سے خوشی کی جھلک کو محسوس کر کے مجھے یہ ادراک ہونے میں مطلق دیر نہیں لگی تھی کہ ہم ابھی اپنی منزل سے بھٹکے نہیں تھے، بلکہ کچھ اور بھی قریب ہو گئے تھے۔

''تمہیں کیسے اندازہ ہوا کہ یہ کون سا شہر ہے؟'' پھر بھی میں نے پوچھ لیا اور جواباً سوشیلا اپنا ایک ہاتھ اُٹھا کر اُنگلی سے ایک دکان کی پیشانی پر لگے بورڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

''وہ دیکھو دکان کے نام کے ساتھ ایڈریس بھی اور نیچے جلی حروف میں اس شہر کا نام درج ہے۔'' مجھے اس کی بیدار مغزی کا قائل ہونا پڑا۔ اُمید بھرے لہجے میں اس سے مستفسر ہوا۔

''تمہارا مطلب یہ تو نہیں کہ اس شہر سے ہماری منزل اور قریب ہو گئی ہے اور ہم اپنی منزل کے اور قریب ہو گئے ہیں؟''

''یہی مطلب تھا میرا۔'' وہ جوشِ مسرت و کامیابی سے بولی۔ ''ہم نے اپنی منزل تک کا ایک طویل سفر پاٹ لیا ہے، اب اسے میں حسنِ اتفاق ہی کہوں گی کہ اس ٹرک نے

ہمیں بھٹکایا نہیں، جس کا ہمیں خدشہ تھا۔''

''ممبئی اب کتنے فاصلے پر رہ گیا ہے یہاں سے؟'' میں نے بھی جلدی سے پوچھ لیا۔

''بس! صرف ایک ڈیڑھ گھنٹے کی مسافت پر۔'' اس نے خاصے خوشگوار لہجے میں جواب دیا۔

''تو پھر نکلنے کی کرو۔'' میں نے بھی جلدی سے کہا۔

تب ہی مجھے خیال آیا کہ ممبئی میں بھی ہمارے لیے ایک بڑا خطرہ پہلے سے موجود ہو سکتا تھا، وجہ اس کی یہی تھی کہ بھگت گڑھ میں میرے اور دشمنوں کے بیچ ہونے والے ایک بڑے ٹکراؤ اور ان کی شکست کے دوران پولیس کے کود پڑنے پر انہوں نے سرائے کے مالک اور سوشیلا کے دوست بقول سوشیلا، اس کے ''بدھو عاشق'' کاشی رام کو پولیس والوں نے پوچھ گچھ کے لیے تختۂ مشق بنایا ہوگا اور اُس نے میرے بارے میں تو اتنا نہیں البتہ سوشیلا کے بارے میں اس کا سارا کچا چٹھا کھول دیا ہوگا، یوں ہمارے سلسلے میں پولیس کا دائرۂ تفتیش ممبئی تک وسیع ہو سکتا تھا اور یہ بھی بعید نہ تھا کہ پولیس کے جاسوسوں کے ساتھ ساتھ بلوتنسی کے ''ہارپ ایجنٹ'' بھی پہلے ہی سے ممبئی میں میرے خلاف حرکت میں آچکے ہوں۔ اگر کسی مصلحت کی وجہ سے ہماری تصاویر نہ بھی جاری کی ہوں، مگر خفیہ طور پر تو ہماری تلاش ممبئی میں بھی ہو سکتی تھی۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ ہم اپنے اصل چہرے چھپا کے ممبئی میں داخل ہوتے۔ لیکن چہرے بدلنے کی بھی کوئی سبیل نہیں دکھائی نہیں دیتی تھی۔ بس! اب تو تن بہ تقدیر ہونے کے سوا کیا چارہ رہ جاتا تھا؟ سوچل سوچل کے مقولے پر ہی عمل پیرا تھے۔

''ممبئی پہنچنے کی اتنی جلدی ہمیں نہیں کرنی چاہیے، کیا تم بھول گئے کاشی رام کو؟'' بالآخر سوشیلا نے مجھے یہی کچھ یاد دلا دیا تو مجھے اپنی اُمیدوں پر اوس پڑتی سی محسوس ہوئی، ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔

''ہاں! مجھے یاد ہے۔ تمہارا یہ بدھو عاشق جو ہمارے لیے ایک بڑا مددگار ثابت ہونے والا تھا، اب ہمارے لیے سب سے بڑی مصیبت بن سکتا ہے، لیکن کیا ضروری ہے کہ وہ پولیس کے سامنے تمہارے بارے میں سب کچھ اُگل دے؟'' میں نے کسی اُمید کے سہارے آخر میں کہا تو سوشیلا ایک نگاہ گرد و پیش میں ڈالنے کے بعد بولی۔

''اگر ہم نے اس اہم نقطے کو نظر انداز کر دیا یا معمولی سمجھا تو ہم ایک بڑی مصیبت میں پھنس جائیں گے۔ اس لیے احتیاط کا دامن تھامے رکھنا ان حالات میں نہایت

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

ضروری ہوگا۔ کوئی بعید نہیں کہ ہمارے دشمن بھی کاشی رام کو پوچھ گچھ کے لیے ''یوز تو'' کرنے کی کوشش کریں۔''

''میں تمہارے اس خدشے کو رد نہیں کرسکتا۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن تم نے کہا تو تھا کہ اس صورتِ حال میں تم اس کا کوئی نعم البدل سوچو گی، کیونکہ تم جانتی ہو کہ یہاں میں اپنے ایک بڑے دشمن (سی جی بھجوانی) کو جہنم واصل کرنے کی نیت سے ہی نہیں بلکہ جنونی جرنیل کے ایل ایڈوانی سے بھی ایک فیصلہ کن معرکہ کرنے کا ارادہ رکھے ہوئے ہوں اور اس کے لیے یہ ازبس ضروری ہے کہ ہمیں ممبئی میں کوئی محفوظ ٹھکانا تلاشنا ہوگا۔''

''میں اس بارے میں غور کرتی رہی ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''لیکن مجھے اس وقت فون کی اشد ضرورت ہے۔ میں اپنی موسی کو فون کرنا چاہتی ہوں تاکہ وہاں کی صورتِ حالات کا کچھ اندازہ ہوسکے۔''

''معذرت کے ساتھ پوچھوں گا، کیا تمہاری موسی قابلِ بھروسا تو ہے؟ میرا مطلب یہ تھا کہ وہ زیادہ ڈرپوک تو نہیں ہے ناں؟''

''نہیں، وہ ایک دلیر خاتون ہیں، اور تم کیا اُسے کوئی بوڑھی عورت سمجھے ہوئے ہو؟'' سوشیلا مسکرائی۔

''میرے پوچھنے کا مقصد صرف یہی تھا کہ وہ ذرا ہوشیار سی تو ہے ناں؟ کہیں پولیس کے ڈر خوف کے باعث وہ اُلٹا ہمیں پھنسا تو نہیں دے گی؟ اور یہ کہ اگر ہم اُسے کوئی تاکید کریں تو کیا وہ اسے بہ خیر و خوبی انجام دے سکے گی؟''

''یقیناً۔ وہ ایک پچاس سالہ خاتون ہیں مگر لگتی چالیس کی ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ یوگا کی بھی ماہر ہیں اور بھارت کی معروف ایکٹریس ریکھا کی یوگا اکیڈمی بھی جوائن کررکھی ہے اور باقاعدگی سے یوگا کرتی ہیں۔''

''اوہ...... پھر تو وہ واقعی چلت پھرت والی خاتون ہوگی۔'' میں مسکرایا۔ ''میں تمہاری موسی کو ایک عام سی عمر رسیدہ اور گھریلو خاتون ہی سمجھا تھا۔ ویسے یوگا کرنے والے بیدار مغز اور چابک دست ہوتے ہیں۔ مگر......'' میں رکا۔

''مگر کیا؟''

''تم فون پر اپنی رہائش گاہ کے لینڈ لائن پر ان سے بات کرو گی تو اس میں بھی خطرہ ہے کہ تمہارا فون ٹریس نہ کیا جارہا ہو۔'' میں نے کہا۔ حالانکہ وہ ایک فون پہلے بھی انہیں کرچکی تھی، جب ہم بھگت گڑھ میں کاشی رام کی سرائے میں فروکش تھے۔ لیکن اس وقت حالات کچھ اور تھے مگر اب کشیدہ صورتِ حال تھی۔

''یہ تم نے مجھے اچھا یاد دلایا، اتنی اہم غلطی کو میں فراموش کیے ہوئے تھی، لیکن میں ممبئی پہنچ کر موہن سے رابطہ کروں گی۔''

''یہ کون ہے؟''

''موہن میرے جیجاجی کا چھوٹا بھائی ہے۔ تمہاری ہی عمر کا ہوگا۔ وہ میرے جیجاجی کا چہیتا بھائی ہی نہیں بلکہ میری دیدی کا لاڈلا دیور بھی ہے۔ ہے تو عام سا نوجوان، مگر اپنے بھائی کی ہلاکت کا اُسے بھی غم و غصہ ہے۔ جب اُسے اس حقیقت کا علم ہوگا کہ ہم اس کے بھائی کی ہلاکت کا انتقام لینے کے مشن پر عمل پیرا ہیں تو وہ ہمارا بھرپور طریقے سے ساتھ دے گا۔''

''تو کیا اُسے علم ہے کہ اس کے بھائی کا قاتل کون ہے؟''

''ہاں!'' سوشیلا نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''جب میں اس درندہ صفت انسان کے ایل ایڈوانی کے چنگل سے اپنی بہن اور اس کے پریوار کی رہائی کے لیے کوشاں تھی تو موہن میرے ساتھ تھا۔''

''اوہ...... پھر تو یہ بھی ہمارے لیے کام کا ثابت ہوسکتا ہے۔'' میں نے بھویں اُچکاتے ہوئے کہا۔ ''کیونکہ یہ بہرحال ابھی پولیس یا ہمارے کسی دشمن کی نظروں میں نہیں آیا ہوگا۔ لیکن اس سے ٹیلی فونک رابطہ کرنے سے پہلے مجھے اس کے حدود اربع سے آگاہ ہونا ہوگا، یہ کرتا کیا ہے؟ اکیلا رہتا ہے یا بیوی بچے بھی ہیں اس کے......؟''

''اپنے بڑے بھائی کے سوا اس کا اور کوئی نہ تھا۔ غیر شادی شدہ ہے۔ اب اپنے بھائی کا کاروبار سنبھالتا ہے، جو درحقیقت ان کے باپ کا ہی تھا۔''

''کیا کاروبار کرتا ہے؟''

''ماروتی گاڑیوں کی سب سے بڑی ڈیلر شپ اسی کے پاس ہے۔ یہی کاروبار ہے اس کا۔ بڑے بڑے معروف بھارتی ایکٹر اور ایکٹریس اس سے نئے ماڈل کی فل لوڈڈ گاڑیاں بک کرواتے رہتے ہیں۔''

''ہوں ں......'' میں نے ایک پُرسوچ سی ہمکاری بھری اور گومگو سے لہجے میں کہا۔ ''چلے گا......''

اب اسے فون کرنے کا مسئلہ تھا۔ سوشیلا نے کہا۔ ''اگر موہن سے ٹیلی فون پر رابطہ ہوجاتا ہے تو پھر ہمیں کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہوگی، وہ خود ممبئی سے ہمیں یہاں لینے کے لیے پہنچ جائے گا یا گاڑی بھجوادے گا۔''

''یہ تو اور بھی اچھی بات ہوگی۔ چلو پھر اسے فون

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

کرنے کی کوئی سبیل تلاشتے ہیں۔''

ہم آگے بڑھ گئے۔

موبائل اور اسمارٹ فون، فری پیکیجز اور واٹس ایپ، امو...... اور وائبر وغیرہ کی وجہ سے اب پبلک ٹیلی فون بوتھ سے لے کر عام پبلک کال آفس تک کا تصور بھی ناپید ہو چکا تھا۔ اس سبب ہمیں فون کرنے کی پریشانی لاحق تھی۔ بات بھی ایسی تھی کہ کسی کے سامنے نہیں کی جا سکتی تھی۔ ورنہ تو کسی دکان وغیرہ میں گھس کر درخواست کر سکتے تھے۔

بالآخر ہم نے کسی راہ گیر کو ''اسنیچ'' کرنے کا ارادہ کیا، عمل تو غلط تھا مگر اس کا مقصد نیک۔ لہٰذا سوشیلا کو میری تجویز بری نہیں لگی تھی۔ ہم اس مقصد کے لیے ایک گلی میں داخل ہو گئے۔ گلی میں لوگوں کی آوک جاوک برائے نام تھی، شام ڈھل چکی تھی اور رات کا اندھیرا پھیلنے لگا تھا، میرے پاس کوئی ہتھیار تو نہیں مگر میرے ہاتھ بھی ہتھیار سے کم نہیں تھے۔ جلد ہی ہمیں ایک ''شکار'' دکھائی دے گیا۔ اب ضروری تو نہیں تھا کہ اس کے پاس سیل فون ہوتا مگر آج کل بھلا کس کے پاس سیل فون جیسی ''ایزی ایکسز'' سہولت موجود نہ تھی؟ شکار بھی اپنی وضع قطع سے ٹھیک ٹھاک لگتا تھا۔ وہ زیادہ عمر کا نہیں تھا۔ اس نے ہماری طرف دیکھا تھا، میرے ساتھ سوشیلا جیسی ایک حسین لڑکی تھی، اس لیے کون شبہ کرتا کہ میں ''اسنیچنگ'' کرنے والا تھا؟

وہ جیسے ہی قریب آیا میں نے اسے کوئی پتا پوچھنے کے بہانے روکا، اس نے ایک نگاہ غلط سی پہلے سوشیلا پر ڈالی پھر مجھ پر۔ میں نے بجلی کی سی سرعت کے ساتھ اسے دبوچ لیا۔ وہ اس صورتِ حال پر پہلے تو بُری طرح گڑبڑا گیا مگر جب یہ دیکھا کہ میں نہتا ہوں تو مقابلے پر اُتر آیا۔

''شرافت سے اپنا سیل فون نکال کر میرے حوالے کر دو۔'' میں نے غرا کر کہا مگر اس نے مجھ پر گھونسا چلانے کی کوشش چاہی تھی کہ میں نے اس کی گردن دبوچ لی اور ساتھ ہی ہلکی سی ''ڈوز'' کے طور پر اس کا ٹینٹوا دبایا۔ وہ خرخرانے لگا۔

''اب کوئی حرکت مت کرنا، ہمیں صرف تمہارا سیل فون ایک ایمرجنسی کی صورت میں استعمال کرنا ہے اور بس۔ پھر تمہیں واپس لوٹا دیں گے۔''

اس نے فوراً اپنا سیل فون میرے حوالے کر دیا جو میں نے سوشیلا کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''بات کر لینے کے بعد اپنا ڈائلنگ نمبر ڈیلیٹ کر دینا''۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا اور ذرا پرے جا کر اپنا مطلوبہ نمبر ملانے لگی۔

میں اس شخص کو دبوچے کھڑا رہا۔ اسے بھی احساس ہو گیا تھا کہ ہم کوئی ضروری بات کر کے اس کا سیٹ اسے واپس لوٹانے کا ''نیک'' ارادہ رکھتے تھے۔ اس لیے اس نے مزید کوئی چون و چرا نہ کی اور یہی غنیمت جان کر چپکا کھڑا رہا۔ ذرا دیر بعد سوشیلا بات کر کے فارغ ہوئی اور اس طرف آگئی جدھر میں شکار کو دبوچے کھڑا تھا۔

میں نے پہلے معذرت اور پھر شکریہ کہتے ہوئے اسے اس کا سیل فون لوٹا دیا پھر میں اور سوشیلا وہاں سے فوراً رفوچکر ہو گئے۔

''بات ہو گئی تمہاری موہن سے؟'' ذرا آگے جا کر میں نے اس سے پوچھا۔

''ہاں!'' وہ جواباً بولی۔ ''وہ خود ہمیں لینے آ رہا ہے۔ اس نے مجھے ایک اسپاٹ کا نام بتایا ہے، جو یہاں کے کسی مشہور ریسٹورنٹ کا ہے۔ ہم وہاں کچھ کھا پی لیتے ہیں، تب تک وہ وہاں پہنچ جائے گا۔''

''ریسٹورنٹ میں کھانے پینے کے پیسے کون ادا کرے گا؟'' میں نے کہا۔ ''جبکہ میرے پاس تو کیا تمہارے پاس بھی اب ایک پھوٹی کوڑی نہیں بچی ہو گی۔''

''ہم پوری شان سے اس ریسٹورنٹ میں کھائیں گے پئیں گے۔ تب تک موہن بھی آ جائے گا اور وہی بل پے کر دے گا۔'' اس کی بات پر میں نے شانے اُچکا لیے۔ مجبوری تھی کیا کیا جا سکتا تھا، مجبوری کا نام شکریہ کہتے ہوئے میں مسکرا بھی دیا تھا۔ یوں ہم مذکورہ ہوٹل کی طرف بڑھ گئے، ہمیں کچھ اندازہ تو نہیں تھا کہ وہ کس طرف اور کتنی دور تھا، تاہم کسی سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ وہ یہاں سے زیادہ دور نہ تھا۔ چنانچہ ہم پیدل ہی وہاں جا پہنچے۔ ایک بڑے سے چمکتے دمکتے نیون سائن بورڈ پر ''بیچ ریسٹورنٹ'' کے الفاظ جل بجھ رہے تھے۔

یہاں بھی ہم نے کسی قسم کی جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ پوری طرح سے محتاط تھے، گویا یہ بیچ کے نام سے ریسٹورنٹ تھا، جو واقعی ساحلِ سمندر کے کنارے بنا ہوا تھا۔ ہم نے اس میں داخل ہونے سے پہلے اچھی طرح اطراف کا جائزہ لیا تھا، بہ ظاہر ہمیں کوئی مشکوک ذی نفس دکھائی نہیں دیا۔ اس کے تین ڈائننگ ہال تھے، اوپن، انر اور واٹر ہال، ہم واٹر والے ہال میں آ گئے۔ یہاں مدھم مدھم سی روشنی تھی۔ فرش لکڑی کا تھا، چوبی تختوں کے درمیان گیپ تھا اور اس کے نیچے سے پانی لہروں کی صورت میں بہہ رہا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

پیروں میں دیکھنے سے یوں لگتا جیسے ہم چلتی ناؤ میں بیٹھے ہوں، یہی اس ہال کی خوبی تھی۔ شاید اسی لیے اس کا نام واٹر ہال رکھا تھا۔ یہ اچھا خاصا مہنگا ہوٹل لگتا تھا اور یہاں موجود لوگ بھی ہائی سوسائٹیز سے تعلق رکھنے والے ہی نظر آتے تھے۔ ایک باوردی ویٹر مینیو لے آیا۔ کھانے کا آرڈر دینے کے بعد میں نے ایک نظر اردگرد بیٹھے لوگوں پہ ڈالی۔ اس کے بعد سوشیلا پر ذرا جھک کر بولا۔

''تمہارا یہ موہن وقت پر آتو جائے گا ناں......؟ ایسا نہ ہو کہ وہ نہیں آسکا اور بل ہمارے گلے پڑ جائے۔ یہ خاصا مہنگا ہوٹل لگتا ہے۔'' میری بات پر سوشیلا کے حلق سے ہلکے قہقہے کی صورت ہنسی نکل گئی۔ جس پر لوگ ہماری طرف متوجہ ہوئے، میں ذرا جھینپ کر اپنے سیدھے ہاتھ کی جانب کھلے سمندر کا نظارہ کرنے لگا۔

میرے بائیں ہاتھ کی ایک ٹیبل پر ٹین ایجر ''کپل'' بیٹھا تھا۔ لڑکی خاصی خوب صورت تھی۔ اس نے ہلکے نیلے رنگ کا میکسی اسٹائل فراک پہن رکھا تھا جو بغیر بازوؤں کا تھا، یوں اس لڑکی کے مرمریں گورے بازو برہنہ نظر آرہے تھے۔ بالوں میں ریشم کی سی ملائمت اور چمک صاف محسوس ہوتی تھی۔ لڑکی بیک وقت معصومیت اور حسن کا دلفریب نمونہ نظر آتی تھی، آنکھیں بھی اس کی گہری اور کشادہ تھیں، بلاشبہ وہ ایشوریا رائے ہی لگتی تھی۔ لڑکا بھی کم خوبرو نہ تھا۔ قد اس کا درمیانہ تھا۔ دونوں پر بھارتی ہیروز کی چھاپ صاف نظر آتی تھی۔ یہ تو چلو ان کا ملک تھا اور ان کی فلمیں تھیں، ایسی چھاپ کا کریز تو پاکستان میں بھی مجھے دیکھنے کو ملتا تھا۔ بھارتی ہیرو ہیروئن کا گیٹ اَپ اپنانے کا ایک کریز پروان چڑھا ہوا تھا۔ کوئی خود کو سلمان خان سمجھے ہوئے تھا تو کوئی عامر خان یا شاہ رخ خان۔ یہی حال لڑکیوں کا تھا، کوئی ریکھا بنی ہوئی تھی تو کوئی رانی مکرجی یا ایشوریا رائے کا ہیئر کٹ اپنائے ہوئے تھی۔

''یہاں یہی سب چلتا ہے۔'' معاً سوشیلا نے کہا۔ اس نے شاید مجھے اس کپل کو دیکھتے ہوئے بھانپ لیا تھا کہ میں ان میں کیا ''دیکھ'' رہا تھا۔

''یہاں ہی نہیں، یہ سب کچھ میرے ملک میں بھی چلتا ہے۔'' میں نے بھی جواباً ہلکی مسکراہٹ سے کہا۔ ''ہمارے مشہور ہیرو وحید مراد کے بالوں کا اسٹائل تو اس قدر مشہور ہوا تھا کہ ہر کسی کو دیکھو یہی اسٹائل اپنائے رکھتا تھا۔'' میں نے دانستہ کسی بھارتی ہیرو کا ذکر نہیں کیا تھا۔ حالانکہ پاکستانی مشہور چاکلیٹی ہیرو وحید مراد کے دور کو تو ایک طویل عرصہ بیت چکا تھا، مگر اس کا اسٹائل اپنانے کے رواج سے تو میں آگاہ تھا۔

''یہاں تمہیں عامر خان سے لے کر اجے دیوگن، سلمان خان اور انیل کپور سب ہی نظر آئیں گے۔ اسی طرح لڑکیاں، کوئی رانی مکرجی بنی ہوگی تو کوئی ایشوریا رائے یا مادھوری ڈکشٹ تو کوئی کاجل......'' سوشیلا کی بات جاری تھی۔

''ویسے ہم بھی اگر کچھ بننا چاہیں تو اسی وقت کسی مشہور بھارتی ہیرو ہیروئن کے رُوپ میں آسکتے ہیں۔''

''کیا مطلب؟''

''یہاں ایک چینجنگ روم بھی ہے، جسے فیشن روم کہا جاتا ہے۔ رقم ادا کرو، اور اندر چلے جاؤ، لباس سے لے کر میک اپ تک ہر چیز پرووائڈ کریں گے، جس ہیرو یا ہیروئن پر ذرا بھی شائبہ آتا ہو، بنادیں گے میک اپ کے زور پر۔'' وہ بولی۔ ''تو پھر کیا خیال ہے، چلیں ہم بھی اندر؟ پیسے موہن آکر ادا کردے گا۔ ویسے تم تو بنے بنائے جیکی شیروف ہو۔ تم پر زیادہ محنت نہیں کرنی پڑے گی۔ وہی لمبا چوڑا قد کاٹھ، تنومند جسم اور مردانہ وجاہت...... حتیٰ کہ شکل بھی اسی سے ملتی ہے۔ مونچھوں کا تمہاری اسٹائل بھی وہی ہے۔ بس، فرق اتنا ہے کہ تمہاری پیشانی ذرا چوڑی ہے۔''

''بس...... بس...... مجھے ایسا کوئی بے کار کا شوق نہیں ہو رہا، نہ ہی مجھے اس طرح کی فضول مماثلتوں سے کوئی دلچسپی بھی ہے۔'' میں نے ہاتھ اُٹھا کر بیزاری سے کہا۔

''چلو ناں...... مزہ آئے گا۔'' وہ اصرار کرنے لگی۔ ''مجھے سونم بننے کا شوق ہے۔ اس طرح بھیس بدلنے کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔'' میں اس کی بات پر چونکا۔ اس کی تجویز بری نہیں تھی، مگر بات وہی تھی کہ ہمارے پاس رقم کم تھی، تاہم جب ہم نے پتا کیا تو ہمارے ہوش اُڑ گئے، میک اپ وغیرہ کا خرچہ ایک لاکھ سے چار لاکھ تک تھا۔ کوئی چوری کی شے تو تھی نہیں کہ ہم کوئی اور طریقہ اختیار کرتے، البتہ سوشیلا نے یہ کہہ کر مجھے مطمئن کرنے کی کوشش کی تھی کہ موہن کو آلینے دو، اس کے بعد یہ مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔

اثنائے راہ ویٹر اپنے دونوں ہاتھوں میں دو ٹرے اُٹھائے آگیا۔

یوں یہ فضول موضوع ادھر ہی دفن ہوگیا۔ وہ ہماری میز پر کھانا سرو کرنے لگا۔ کھانے کے دوران اچانک میری نگاہ اسی ٹین ایجر کپل کی میز کے بالکل ذرا ہی پیچھے ایک اور میز پر پڑی اور میں چونکا۔ وہاں ایک پختہ العمر آدمی

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک موٹا سگار تھا، اس نے بیش قیمت سفاری سوٹ پہن رکھا تھا۔ وہ پہلے گاہے بہ گاہے، پھر یک ٹک میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے ذرا دیر پہلے ہی یہ محسوس کیا تھا کہ وہ مجھے اسی طرح تکے جا رہا تھا، بڑے غور سے، جب میری نظر اس کپل پر پڑی تھی، اس وقت میں نے اس کی نگاہ کو سرسری معنی دیے تھے، مگر اب جو میں نے دیکھا تو وہ مجھے باقاعدہ اور بغور گھورتے ہوئے پایا۔ اب کی بار میں چونکا تھا اور اسی لیے میں بھی اس مرتبہ اس کے چہرے سے اپنی نظر نہیں ہٹا پایا تھا، یوں وہ مجھے بھی ٹکٹکی باندھے دیکھتے پا کر ہولے سے مسکرایا تھا اور پھر دوسری طرف دیکھنے لگا۔ میں کچھ ایسی صورتِ حالات سے دوچار تھا کہ مجھے اپنے سائے سے بھی محتاط رہنا پڑتا تھا جبکہ پکی عمر کا یہ آدمی میری طرف یوں گھور رہا تھا جیسے یہ مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو، حالانکہ بھلا یہاں بھارت میں میرا کون واقف کار تھا۔ وہ اکیلا تھا، مجھے بے چینی کھانے لگی، جلد ہی میں نے اس کی میز پر دو اور افراد کو بھی بیٹھتے دیکھا، اس میں ایک خاصی فیشن ایبل خاتون تھی، جس کی عمر کا اندازہ مجھے، تیس، پینتیس، کے درمیان تک ہی ہو سکا تھا، جبکہ دوسرا ایک درمیانی عمر اور ٹھگنے قد کا شخص تھا۔ جانے کیا بات تھی کہ مجھے بظاہر ان میں کوئی ایسی خطرناک بات اب محسوس نہیں ہوتی تھی۔

کچھ دیر اور گزر گئی، ہم کھانے سے بھی فارغ ہو گئے، لیکن موہن نہیں آیا۔ اب تو میری ہی نہیں، بلکہ سوشیلا کی بھی بے چینی بڑھنے لگی۔

''اتنے بڑے ہوٹل میں پرتکلف کھانے کا آرڈر دے کر تم نے پھنسوا ہی دیا۔ اب بل کون ادا کرے گا؟''

بالآخر میں نے سوشیلا سے نیچی آواز میں کہا۔

''مجھے پورا وشواش تھا کہ وہ ضرور آئے گا، بلکہ میں نراش نہیں ہوئی ہوں ابھی تک......'' وہ بولی۔

''ٹھیک ہے، مگر یہ تو سوچو، اُسے راستے میں دیر بھی ہو سکتی ہے۔ راستے میں کچھ بھی ہونا ناممکن نہیں ہوتا۔''

''یہ تو تمہاری بات ٹھیک ہی ہے، مگر......'' اس کی بات درمیان میں رہ گئی۔

اچانک ہال میں ہلکا سا شور ابھرا۔ میں چونکا اور دیکھا، چند نوجوان قہقہے لگاتے ہوئے اندر داخل ہوئے تھے۔ یہ چار تھے تعداد میں۔ ان میں بھارتی اداکاروں کی چھاپ نمایاں تھی۔ ٹائٹ جینز اور بنیان ٹائپ کی چست شرٹس پہن رکھی تھیں، یہ دولت مند خاندانوں کے بگڑے

ہوئے رئیس زادے نظر آتے تھے۔ ہلا گلا سا مچاتے ہوئے یہ وہاں ایک ٹیبل پر بیٹھ گئے اس ینگ کپل کے بائیں ہاتھ پر تھی، یوں یہ چاروں نوجوان اُس سفاری سوٹ والے پراسرار آدمی اور ینگ کپل کے درمیان والی میز پر براجمان تھے۔ ہماری ٹیبل ان کے چوتھے رخ پر تھی اور تینوں میزوں کے تقریباً قریب ہی تھی۔

اس ہوٹل میں وھسکی بھی چل رہی تھی۔ یقیناً اس فائیو اسٹار ہوٹل کو ''شراب نوازی'' کا پرمٹ ملا ہوا ہوگا۔ یوں بھی یہ بھارت تھا اور وھسکی کا حصول کیا مشکل تھا۔

''تم بار بار اس طرف کیوں دیکھ رہے ہو؟ کھانا لگ چکا ہے۔'' معاً سوشیلا نے مجھے چونکایا اور میں اس طرف متوجہ ہوا۔ ویٹر کب کا کھانا سرو کر کے جا چکا تھا۔

میں سوشیلا سے کسی بات کا اظہار کیے بغیر کھانے میں مشغول ہو گیا، اور جو جانی پہچانی ڈشز تھیں انہیں کا انتخاب کیا تھا میں نے ہندوؤں کے ''کھاجوں'' سے متعلق میں نے کچھ عجیب وغریب ڈشز سن رکھی تھیں اس لیے یہ احتیاط رکھی تھی۔ اگرچہ کھانے کا آرڈر میں نے ہی مینیو دیکھ کر دیا تھا، مگر اس میں سوشیلا نے بھی اپنی پسند کا کچھ انتخاب کیا تھا۔ نیز آرڈر دینے کے بعد اس نے مجھ سے یہ بات بھی کہی تھی، اس طرح کے بعض ریسٹورنٹ اپنی طرف سے بھی کوئی خصوصی ڈش پیش کر دیتے ہیں۔

بہرحال...... میں اور سوشیلا خاموشی سے کھانے میں مگن ہو گئے اور چند منٹوں تک ہمارے درمیان کوئی گفتگو نہیں ہوئی تھی، وجہ اس کی شاید یہی رہی ہوگی کہ ہمیں بہت بھوک لگی ہوئی تھی، اس قدر کہ پیٹ جیسے کمر سے جا لگا ہو...... پھر کھانا بھی خاصا پرتکلف اور مزیدار تھا۔ سوشیلا نے اپنے لیے وھسکی منگوائی تھی۔ مجھے اس کا اپنے ساتھ وھسکی پینا سخت ناگوار گزرا، اس قدر کہ میرا اسے بری طرح ٹوکنے کو جی چاہا تھا مگر میں نے اپنا ارادہ بدل لیا۔ بے شک میری سوشیلا کے ساتھ کوئی ایسی ذاتی نوعیت کی انڈراسٹینڈنگ نہیں تھی کہ میں اس کی ''ذاتی عادات'' سے متعلق اعتراض کرتا، یا اس پر حکم چلانے کی کوشش کرتا، البتہ ایک اہم مشن کی حد تک ہمارے درمیان ایک دوسرے کا ساتھ دینے کی ہم آہنگی ضرور پائی جاتی تھی۔

''اے مسٹر......! اپنا ہاتھ ذرا دور رکھو......'' معاً میرے کان سے ایک نسوانی آواز ٹکرائی۔ مجھے شائبہ گزرا کہ کہیں میرے ہاتھ کی کہنی تو کسی کی پشت سے نہیں ٹکرا رہی تھی۔ لیکن جلد ہی مجھے پتا چلا کہ یہ اس ینگ کپل کی نوجوان

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

حسین لڑکی کی آواز تھی، جو اس نے اپنے ذرا ہی عقبی رخ پر دھری اس میز پر موجود ان چاروں نوجوانوں میں سے ایک کو بڑے غصے سے مخاطب کر کے کہی تھی۔ وہ نوجوان اپنی کرسی پر کچھ زیادہ ہی ''پھیل'' کر بیٹھا تھا۔ اس طرح کہ اس نے اپنے ہاتھ پہلو پر لٹکا رکھے تھے اور اس کے دائیں ہاتھ کی کہنی اس خوب صورت لڑکی کی پشت سے ''مس'' ہو رہی تھی۔ اب پتا نہیں وہ یہ اوباشانہ حرکت دانستہ کر رہا تھا یا نہیں، لیکن میں نے دیکھا اس نوجوان پر کچھ اثر نہیں ہوا، اس کے برعکس ان نے اپنی گردن قدرے گھما کر اس ینگ حسینہ کی طرف بڑے لوفر انداز سے گھورا اور مغرور لہجے میں بولا۔

''کوئی اور اس طرح ارجن کو ٹوکنے کی ہمت کرتا تو اس کے دانت ادھر ہی میز پر بکھرے ہوتے، کیا......؟'' وہ خالص فلمی اسٹائل میں لڑکی سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''مگر وہ کیا ہے کہ...... تمہاری جیسی حسین لڑکی اپن کی ہمیشہ سے کمزوری رہی ہے ناں...... اسی لیے چلے گا......'' یہ کہتے ہوئے اس نے لڑکی کی طرف ایک ہوائی بوسہ بھی اچھال دیا۔ جس پر لڑکی کے نوجوان ساتھی کو بھی طیش آ گیا۔

''اے...... ذرا منہ سنبھال اپنا اور اُدھر ہو کر بیٹھ۔'' وہ غصے سے بولا تو وہی اوباش نوجوان ایک جھٹکے سے اپنی کرسی پیچھے کھسکا کر اُٹھ کھڑا ہوا، اس پر کچھ زیادہ ہی فلمی سین کا بھوت سوار تھا، وہ تھا بھی خاصا دراز قامت اور تنومند...... اس نے اپنے دائیں ہاتھ کا ایک پنجہ پھیلا کر اتنے زور سے ان کی میز کے درمیان میں مارا کہ میز پر سرو کی ہوئی کولڈ ڈرنکس اور دوسری اشیا اُچھل کر اس کپل کے کپڑوں پہ گریں۔

''تیرے نام کا کتا پالوں...... تُو مجھے...... یعنی ارجن کو......'' انتہائی غصیلے لہجے میں اپنا جملہ اُدھورا چھوڑ کر اس نے نوجوان کی گردن دبوچ لی۔ وہ بے چارہ اس کے مقابلے میں نک سک سا اور دبتا ہوا نوجوان تھا۔ اس کی ساتھی لڑکی چلائی۔ اسی وقت دو ویٹرز دوڑتے ہوئے وہاں آ گئے۔ تب تک وہ اوباش نوجوان لڑکی کے ساتھی کو کرسی سمیت دھکیل کر گرا چکا تھا۔ اس کے باقی تینوں ساتھی اسی طرح اطمینان سے مسکراتے ہوئے کرسیوں کی پشت گاہ سے ٹیک لگائے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔

اس دوران وہ دونوں ویٹر اس بدمعاش لڑکے کے قریب آنے لگے تو باقی تین اوباش ساتھیوں نے یک دم اپنی جگہ سے حرکت کی اور ان کا راستہ روک کے کھڑے ہو گئے، پھر ایک نے ان سے کہا۔

''ناں آف یور بزنس......''

ویٹرز خود بھی نہیں چاہتے تھے کہ بات بڑھے، کیونکہ یہ ان کے ہوٹل کی ساکھ کا معاملہ بھی تھا یا پھر ایسی باتیں معمول پر محمول کی جاتی تھیں کہ وہاں موجود لوگوں میں بھی کچھ زیادہ بے چینی دکھائی نہیں دے رہی تھی، اسی طرح میں اور سوشیلا بھی اسی طرف دیکھ رہے تھے، جیسے محوِ چشم تماشا کیے ہوئے ہوں۔

''دیکھیے جناب! اپنے ساتھی کو روکیے...... یہ پبلک اسپاٹ ہے اور......'' ایک ویٹر نے ان سے مخاطب ہو کر کہا تو ان تینوں میں سے ایک نے کہا۔

''ہمارا ساتھی ارجن خود رک جائے گا، اسے روکنے کی کوشش کی گئی تو یہاں سب کچھ اُلٹ پلٹ ہو جائے گا۔''

دونوں ویٹر فوراً وہیں سے ہی واپس پلٹ گئے۔ وہ شاید اس کی اطلاع منیجر کو دینے گئے تھے۔

''چھوڑ دے مجھے ذلیل، کمینے......'' میں نے دیکھا وہی ارجن نامی بدمعاش لڑکے کو کرسی سمیت گرانے کے بعد اس کی گرل فرینڈ کے مرمریں برہنہ بازو کو سہلا رہا تھا۔ گرا ہوا نوجوان غصے اور غیرت کی شدت سے اٹھا تو ارجن کے باقی تینوں ساتھیوں نے اسے پکڑ لیا۔

''ارجن جب تک تجھے ''کس'' نہیں کرے گا، نہیں چھوڑے گا۔'' اس اوباش نے لڑکی کو دبوچ کر لوفرپن سے کہا۔ اس دوران لوگ باگ اپنی میزیں چھوڑنے لگے، بھلا کون پرائی آگ میں کودتا ہے، آج کے دور میں......؟ لڑکی بے بس نظر آنے لگی، ارجن اپنا مکروہ منہ لڑکی کے حسین چہرے کی طرف کرنے لگا۔

''لیو ہر الون...... پلیز!'' اس کا ساتھی لڑکا بے بسی سے چلایا۔ اُسے دبوچنے والے ارجن کے تینوں ساتھی لڑکے اس کی بے بسی پر ہنس رہے تھے۔ ٹھیک اسی وقت جب ارجن لڑکی کا بوسہ لینے کی کوشش میں تھا، اچانک ایک خالی کرسی کھسکتی ہوئی ارجن نامی اس لڑکے سے بڑے زور کے ساتھ ٹکرائی۔ وہ لڑکھڑا سا گیا اور جب سنبھلا تو اس کا چہرہ پُرغیظ اور آنکھوں سے شرارے پھوٹتے نظر آنے لگے۔ تب ہی اس کی تیزی سے گردش کرتی نظر مجھ پر جم گئی، میں تب تک اپنی ''کارروائی'' کر کے اپنی کرسی پر بیٹھ چکا تھا، کارروائی کیا تھی، بس اتنا ہی کیا تھا کہ اپنے قریب والی کرسی کو ایک زوردار لات رسید کر دی تھی جو تیزی سے کھسکتی ہوئی ارجن نامی اس بدمعاش سے جا ٹکرائی تھی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

میں اسی طرح اطمینان سے اپنی کرسی کو میز سے ذرا ہٹا کر اور سامنے پاؤں پھیلا کر بیٹھا رہا۔ سوشیلا میری اس حرکت پر پریشان سی نظر آنے لگی تھی۔ اُس نے مجھ سے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولنا چاہا تھا کہ میں نے اسے اشارے سے خاموش رہنے کی تلقین کر ڈالی۔

''اس لڑکی سے دور ہوجا، ورنہ ایک اور کرسی تیرے سر پہ پڑے گی......'' میں نے وہیں اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے ارجن سے کہا۔

''تیرے نام کا کتا پالوں...... تیری یہ جرأت......''

ارجن اپنا فلمی مکالمہ دہراتا ہوا میری جانب لپکا اور جیسے ہی اُس نے مجھ پر غراتے ہوئے حملہ کرنا چاہا میں نے کرسی چھوڑ دی اور اُٹھ کر اپنے دائیں ہاتھ کے شکنجے میں اس کی گردن دبوچ لی اور اپنا فوری طور پر تیار کیا ہوا خود ساختہ ڈائیلاگ اسے اسی کے لہجے میں سنا ڈالا۔

''میں تو تیرے نام کا کتا بھی پالنا پسند نہ کروں، غلیظ گٹر کی گندگی میں رینگنے والے کیڑے......''

''فنٹاسٹک......''

ہال میں ایک آواز ابھری۔ میں نے ایک نگاہ اس طرف ڈالی اور چونکا، یہ وہی ادھیڑ عمر سگار پیتا شخص تھا، جو تھوڑی دیر پہلے مجھے غور غور سے دیکھ رہا تھا۔ ٹھیک اسی وقت مجھے شاید غافل دیکھ کر ارجن نے، جس کا چہرہ میرا جوابی ڈائیلاگ سننے کے بعد مزید لال بھبوکا ہونے لگا تھا، اپنے ایک ہاتھ کا گھونسا میرے چہرے پر جڑنے کی کوشش چاہی تھی کہ میں نے بہ سرعت اس کا گھونسا اپنے بائیں ہاتھ پر روکا، مگر اس کی گردن نہیں چھوڑی اور اسی طرح اسے رگیدتا ہوا، ایک میز پر اس کا سر زور سے دے مارا، اسی وقت اس کے تینوں ساتھی لڑکے کو چھوڑ کر میری جانب جارحانہ انداز میں بڑھے، ردِعمل کے طور پر میں ان کی طرف سے بھی محتاط تھا۔ ارجن کو اس کے حال پر چھوڑ کر میں بجلی کی سی تیزی کے ساتھ ان کی طرف پلٹا تھا۔ انداز میرا اطمینان بخش تھا، میرے اس قدر پُراعتماد انداز نے اُنہیں وہیں رکنے پر مجبور کردیا، وہ شاید میرے ''فائٹ'' کرنے کا انداز دیکھ چکے تھے، اسی لیے کچھ خفیف سے نظر آنے لگے۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ رکھے تھے، اسی وقت مجھے اپنے عقب میں ہلکا شائبہ محسوس ہوا اور پھر میری بائیں ٹانگ حرکت میں آئی، سنبھل کر مجھ پر عقب سے وار کرنے والا ارجن اُچھل کر بہت دور کسی میز پر جا پڑا تھا۔ میری گھورتی ہوئی نظریں ابھی تک اپنے سامنے ٹک ٹک کھڑے اس کے تینوں ساتھیوں پر جمی ہوئی تھیں۔

''آجاؤ، یا پھر یہاں سے چلے جاؤ......'' میں نے دانت پیس کر کہا۔ اسی وقت ایک موٹا اور ٹھگنا سا آدمی سوٹ کوٹ میں ملبوس، ویٹروں کی فوج کے ساتھ وہاں نمودار ہوا اور میری طرف بڑھا۔ اُسے شاید غلط فہمی ہوگئی تھی، مجھ سے وہ بڑے غصے میں مخاطب ہو کر بولا۔

''میں آپ کو دنگا فساد کرنے کے جرم میں اندر کروا دوں گا۔ بل پے کرو اور یہاں سے نکل جاؤ۔''

اس سے پہلے کہ میں بھی اس کے ساتھ سخت جوابی کارروائی کرتا، وہی ادھیڑ عمر شخص اپنا ہاتھ اُٹھاتے ہوئے منیجر کی طرف بڑھا، وہ شاید اسے جانتا تھا، کیونکہ اس نے اس کا نام لے کر اسے مخاطب کیا تھا۔

''سوشیل! اس کا کوئی قصور نہیں ہے، وہ دیکھ رہے ہو، چاروں بدمعاش......'' اس نے ارجن اور اس کے تینوں ساتھیوں کی طرف اشارہ کیا، جو مجھے معاندانہ نظروں سے گھورتے ہوئے وہاں سے کھسکنے کے انداز میں جانے لگے تھے۔

اس دوران وہ کپل بھی میری حمایت میں آگے بڑھا تھا اور منیجر سے میری صفائی میں وہی کچھ کہا جو اس ادھیڑ عمر شخص نے کہا تھا، ازیں علاوہ، وہاں موجود دیگر لوگوں نے بھی میرے حق میں گواہی دے ڈالی تو منیجر نے مجھ سے بڑے فدویانہ انداز میں سوری کہا اور واپس چلا گیا۔

ذرا دیر بعد سب معمول پہ آگیا۔

''میں آپ کا کس منہ سے شکریہ ادا کروں؟ آپ نے مجھے ان بدمعاشوں سے بچایا اور گندہ ہونے سے بھی......''

ایک مترنم سی معصومیت بھری آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ یہ وہی معصوم صورت حسین لڑکی تھی۔ میں نے اس کی طرف گھوم کر دیکھا، قریب سے اس کا...... حسن الگ ہی بہار دکھاتا محسوس ہوا۔ اس کا ٹک سک سا ساتھی اپنا لباس درست کر رہا تھا۔ میں نے اس لڑکی سے مسکراتے ہوئے جواباً کہا۔

''شکریہ کس بات کا؟ کسی شریف انسان کے ساتھ یوں زیادتی ہوتے تو کوئی بھی نہیں دیکھ سکتا......''

''بالکل دیکھ سکتے ہیں...... اور یہی ہمارے بے حس سماج کا دستور بن چکا ہے۔'' اچانک ایک تیسری آواز ابھری تھی، میں نے اس سمت دیکھا اور بے اختیار ایک ٹھنڈی سانس بھر کے رہ گیا۔ یہ وہی ادھیڑ عمر آدمی تھا، جواب تک میرے لیے پُراسرار بنا ہوا تھا۔ وہ میرے

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

کاندھے پر دوستانہ انداز میں اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔
''کیوں ینگ مین! میں نے غلط کہا؟'' مجھ سے ابھی کوئی جواب نہیں بن پڑا تھا کہ وہی لڑکی بولی۔
''آپ صحیح کہہ رہے ہیں انکل! اس وقت یہاں کتنے لوگ موجود تھے، ان میں بیشتر تو کھسک ہی گئے تھے، باقی جو بیٹھے تھے وہ تماشائی بنے بیٹھے تھے۔''
''چلو رینا! دیر ہو رہی ہے۔'' اچانک اس کا ساتھی لڑکا اس کے قریب آ کر بولا۔ مجھے اس لڑکے کی بے اعتنائی پر ایک ناگوار سی حیرت ہوئی تھی۔ مجھے کسی کے شکریے کی پروا تو نہ تھی مگر اس لڑکے کی بے حسی مجھے کھل کر رہ گئی تھی، جس نے جھوٹے منہ سہی، مجھ سے شکریے کا ایک لفظ تک ادا نہیں کیا تھا۔ شاید اس میں خود اس کی بھی سبکی ہوئی تھی جو اس کے لیے جھینپ کا باعث بن رہی تھی، اور وہ اسی لیے وہاں سے جلد از جلد نکل جانا چاہتا تھا۔
''مہیش! یہ کیا؟ تم ان کا شکریہ ادا نہیں کرو گے؟'' رینا نامی اس لڑکی نے اپنے ساتھی لڑکے مہیش سے کہا تو وہ ذرا جزبز ہو کے گویا چاروناچار مجھ سے بولا۔
''شکریہ آپ کا......'' انداز وہی بے اعتنائی والا تھا۔
خیر مجھے اس کی کیا پروا تھی۔ سوشیلا تب تک میرے ساتھ آن کھڑی ہوئی تھی، میں خاموشی سے اپنی میز کی طرف بڑھ گیا، سوشی میرے عقب میں تھی۔ اپنی کرسی پر براجمان ہونے کے بعد میں نے دیکھا رینا کو اس کا بوائے فرینڈ مہیش بازو سے پکڑے گویا زبردستی اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش میں تھا، جبکہ رینا کی یک ٹک سی نگاہیں ہنوز مجھ پر ہی جمی ہوئی تھیں۔ وہ مجھ سے اور بھی کچھ کہنا چاہتی تھی، اب پتا نہیں شاید وہ مہیش سے کترا رہی تھی یا پھر میری ساتھی سوشیلا سے۔ اس کی نگاہوں میں میرے لیے ستائش تو تھی ہی، مگر ایک تاثراتی شائبہ بھی جھلکتا محسوس ہوتا تھا، بالآخر اسی اثر پذیری کے زیر اثر وہ اپنے ساتھی کی گرفت سے اپنا مرمریں بازو چھڑا کر میری میز کی طرف بڑھی، اس کا ساتھی اس حرکت پر بھونچکا سا کھڑا اسے تکتا رہ گیا۔
''وہ پھر تمہاری طرف آ رہی ہے۔ ہوشیار......'' سوشیلا نے ترچھی نگاہوں سے رینا کی طرف گھورتے ہوئے مجھ سے کہا۔
''اِف یو ڈونٹ مائنڈ...... میں آپ کا نام جان سکتی ہوں......''
''شہزاد خان۔'' میں نے اپنا نام اصل نام بتایا۔
''بہت کیوٹ نام ہے، بالکل آپ کی طرح......'' وہ مسکرائی۔ موتیوں کی لڑی جیسی اس کے دانتوں کی جھلک اور نرم و گداز لبوں کا تھرکتا نظارہ، دل لبھانے جیسا ہی تھا۔
''شکریہ۔'' میں نے ہولے سے کہا۔
''وہ...... وہ درحقیقت میں یہ کہنے آئی تھی کہ آپ نے میری خاطر ان بدمعاشوں سے لڑائی کر تو لی ہے، مگر مجھے ڈر ہے کہ وہ باہر کہیں تاریکی میں آپ کی گھات میں بیٹھے نہ ہوں...... یہ بہت کینہ پرور معلوم ہوتے ہیں، خاص طور پر ان کا سرغنہ ٹائپ ساتھی ارجن......''
''نائس گرل! اس کا اندازہ یقیناً شہزاد صاحب کو بھی ہو گا۔ آپ اس کی چنتا نہ کریں، میں ان کے ساتھ ہوں......'' یہ وہی پُراسرار ادھیڑ عمر شخص تھا جو میرے لیے مسلسل ایک چیستان بنا ہوا تھا۔ وہ ہماری میز کے قریب ہی کھڑا ہوا تھا اور اس نے بھی مجھے اپنا نام بتاتے ہوئے سن لیا تھا۔
''ہیلو مسٹر شہزاد! مجھے نارائن گھوتراجی کہتے ہیں۔'' اس نے یہ کہتے ہوئے مصافحے کے لیے اپنا ہاتھ میری جانب بڑھایا۔ ''تم سے مل کر خوشی ہوئی اور اس سے زیادہ تمہارا ریئل انداز...... جو میں نے آج تک صرف فلموں میں ہی دیکھا ہے۔ کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟''
''شیور...... گھوتراجی! پلیز ہو ایے سیٹ'' مجھ سے پہلے سوشیلا نے اسے مخاطب کر کے کہا جبکہ میری طبیعت منغض سی ہونے لگی۔ طوعاً و کرہاً میں نے بھی اس سے ہاتھ ملا دیا۔ اس موٹے گھوتراجی کے درمیان میں ٹپک پڑنے سے وہ رینا نامی لڑکی بجھی بجھی سی نظر آنے لگی تھی۔ شاید وہ مجھے کوئی آفر کرنے والی تھی یا پھر کوئی نیک مشورہ...... وغیرہ، لیکن اس گھوتراجی کے یہ کہنے پر کہ...... چنتا کی کوئی ضرورت نہیں میں ان کے ساتھ ہوں۔'' وہ مایوس سی ہو گئی تھی۔
''رینا...... چلو...... دیر ہو رہی ہے......؟'' اس دوران وہی بے رخا سا اس کا ساتھی لڑکا مہیش اس کے قریب آ کر ذرا سخت لہجے میں بولا۔
رینا تذبذب میں مبتلا تھی۔ وہ اپنے ساتھی سے جواباً ذرا سخت لہجے میں بولی۔ ''مہیش! تم تھوڑی دیر خاموش نہیں رہ سکتے؟ تم نہیں جانتے ان بدمعاشوں کی کینہ پرور فطرت کو؟ شہزاد صاحب ہمارے محسن ہیں اور تمہارے بھی...... انہوں نے ہمیں بلکہ مجھے ایک مصیبت سے بچایا ہے اور ہمارا ابھی فرض بنتا ہے کہ ان کے دفاع کے لیے کچھ سوچیں...... تم دیکھ نہیں رہے ہو مہیش کہ ان کے ساتھ بھی ایک خاتون

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

ہیں۔''

مجھے رینا کی بات ٹھیک لگ رہی تھی، کسی بے نام سی اُنسیت کی غلط فہمی میں پڑے بغیر اس کا میرے لیے اس قدر تفکر بالکل جائز تھا اپنی جگہ۔

''مجھے یہی چنتا ہو رہی ہے کہ وہ آپ کو کوئی نقصان نہ پہنچا دیں۔'' وہ پھر مجھ سے بولی۔ ''اگر آپ برا نہ منائیں تو میں اپنے دڈو کو فون......''

''سنیے مس......؟'' گھوترا جی نے پھر مداخلت کی اور استفساریہ لہجے میں اس لڑکی سے نام پوچھنا چاہا۔

''رینا......''

''جی مس رینا! آپ کا بوائے فرینڈ آپ کا بے چینی سے منتظر ہے آپ چلی جائیں اور شہزاد صاحب کی بالکل چنتا نہ کریں، میں ان کے ساتھ ہوں۔''

''آپ ہیں کون آخر؟ کوئی پولیس والے یا فوجی؟'' رینا نے چڑ کر کہا۔ ''میرے دڈو کو آپ لوگ نہیں جانتے، وہ ایک بڑے ریٹائرڈ جنرل ہیں...... کے ایل ایڈوانی کا نام بھی سنا ہے آپ نے؟''

اس نام پر میں اندر سے تھرا گیا تھا اور یقیناً سوشیلا کی بھی یہ نام سن کر مجھ سے زیادہ حالت غیر ہوئی ہوگی۔ میں ڈرا نہیں تھا، بس! اس نام کا اب تک حوالہ ہی کچھ اس قسم کا بن چکا تھا کہ ہمارا ''دھک'' رہ جانا بھی معنی رکھتا تھا۔ ذہن میں ایک لمحے کو مبہم سا یہ سوال ضرور ابھرا تھا کہ کیا یہ واقعی اسی جرنیل کا نام تھا جو ان تین جنگی جنونی جرنیلوں میں شامل تھا جو دنیا کو ''ورلڈ بگ بینگ'' کے نام سے تیسری عالمی جنگ میں جھونکنا چاہتے تھے؟

''اوہ...... اچھا! چلو پھر تو میرا تعارف بھی سن لو تم......'' گھوترا جی بھی پیچھے ہٹنے والے نظر نہیں آرہے تھے۔ بڑی عجیب صورت حال ہوگئی تھی۔ ایک طرف رینا تھی اور دوسری جانب یہ گھوترا جی...... اب یہ اپنا کون سا چونکا دینے والا تعارف کروانے والے تھے، مجھے اور سوشیلا کو تو کم از کم کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

''ہم ہیں، نارائن گھوترا جی...... بس! کافی ہے اتنا تعارف ہمارا......''

''آپ ممبئی فلم انڈسٹری کے کوئی پروڈیوسر یا ڈائریکٹر ٹائپ کی کوئی شے ہوں گے اور یہ ''ہیچ ریسٹورنٹ'' ایسی ہی جگہ ہے جہاں آپ جیسے لوگ ہی نہیں، اداکار بھی آتے رہتے ہیں، عام لوگ اسی لیے اس ریسٹورنٹ کا رخ کرتے ہیں، تاکہ کسی اداکار یا مشہور فلم ساز سے ٹکراؤ ہوجائے تو کم از کم ایک عدد سیلفی ہی بنالی جائے، مگر گھوترا جی مجھے ایسا کوئی شوق ہی نہیں اسی لیے میں آپ سے قطعاً متاثر نہیں ہوئی۔'' رینا نے کہا۔ میرا خیال تھا کہ گھوترا جی رینا کی بات کا برا منالے گا، مگر اس کے برعکس وہ اسرار بھرے انداز میں مسکراتے ہوئے لڑکی سے بولا۔

''ایک دم برابر بولا تم چھوکری! جو فلموں کا ذوق نہیں رکھتے وہ شوق بھی نہیں رکھتے، تو پھر متاثر ہونا کیسا؟ لیکن آپ کا یہ جھوٹ آپ کا ایشوریا رائے والا یہ گیٹ اَپ ظاہر کر رہا ہے کہ آپ کو بھی اس لائن سے تھوڑی بہت دلچسپی تو ہے ہی، اینی وے...... رہی بات آپ کے جرنیل دڈو کی تو یہ بات سوچنے کی ہے کہ ہم سب کو ان کی عزت کرنی چاہیے، آخر کو وہ اس دیش (بھارت) کے رکھوالوں میں سے ہیں۔ میں انہیں سلام پیش کرتا ہوں۔'' گھوترا جی نے بڑی معاملہ فہمی دکھائی تھی، تاہم اس کے تعارف پر میں نے قدرے اطمینان کا سانس لیا تھا۔ میرے لیے اس وقت گھوترا جی بالکل بھی دلچسپی کا باعث نہ تھا، جبکہ رینا میرے لیے ایک دم اہم بن گئی تھی۔ رہی بات اس کے معصومیت بھرے حسن کی، تو یہ اسی حد تک تھا جیسے ایک خوش رنگ پھول، بھلا کسے متاثر نہ کرتا ہوگا۔ مگر اب اس میں دلچسپی لینے کی ایک ٹھوس وجہ فوراً ہی سامنے آگئی تھی، اگرچہ ابھی تک پوری طرح اس کا علم بھی نہ تھا کہ رینا آیا اسی جنونی جرنیل کی پوتی تھی یا...... اس کا ''دڈو'' کوئی اور تھا۔ مگر کے ایل ایڈوانی اور اس کا ''لاحقہ'' اس قدر ٹیپیکل تھا کہ مغالطے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ میں نے دانستہ رینا سے مدد لینے کا فیصلہ کرلیا۔ اگرچہ طلسم نورہیرے کا مشن دوسرے مرحلے کا تھا، لیکن اگر لگے ہاتھوں یہ پہلے مکمل ہونے کی امید پر تھا تو کیا مضائقہ تھا؟

''آپ بالکل درست کہہ رہی ہیں، مس رینا!'' بالآخر میں نے اس کی بات کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن...... یہ کچھ اچھا نہیں لگتا مجھے کہ میں اُلٹا آپ پر ہی بار بن جاؤں۔''

''بار کیسا؟'' وہ کھل کر بولی۔ ''میں خود بھی اب اس ریسٹورنٹ سے باہر جانے سے کترا رہی ہوں۔ میں ابھی دڈو کو کال کرتی ہوں۔ وہ مسلح محافظ ادھر بھیج دیں گے۔ پھر آپ جہاں جانا چاہیں جاسکتے ہیں۔''

میں اس کی بات پر عجیب قسم کے شش و پنج کا شکار ہو گیا۔ موہن کا کچھ پتا نہ تھا۔ ابھی کھانے کا بل بھی دینا تھا۔ رینا کے ہمراہ جانا بھی اب میرے اہم ترین مشن کا حصہ بن چکا تھا۔ اس کی ہمراہی بے شک مختصر سہی، مگر راہ و رسم کی کچھ

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

راہیں کھلنے کی اُمید تو تھی کہ بعد میں اسے اپنے مشن کے لیے ''یوز ٹو'' تو کرنے کی کوشش کر ہی سکتا تھا۔

''میرا خیال ہے مس رینا ٹھیک کہہ رہی ہیں، وہ غنڈے باہر ہماری تاک میں ہی ہوں گے اور دھوکے سے ہم پر حملہ کر کے ہمیں نقصان پہنچا سکتے ہیں۔'' سوشیلا نے اس سلسلے میں پہلی بار لب کشائی کی، میں نے اس کے بظاہر پُرسکون لہجے کی تہ میں ایک عجیب قسم کے جوش کی تپش محسوس کی تھی، جس کی ''وجہ'' بھی میں سمجھ سکتا تھا۔ باقی رہی سہی تصدیق اس کے مجھے ہلکے سے پہلو میں ٹہوکا مارنے نے کر دی، یعنی مجھے رینا کی بات اور مشورے پر ہی عمل کر لینا چاہیے تھا اور اس گھوتراجی کو چلتا کرنا چاہیے تھا۔

''جب تک آپ کے دڈو کے مسلح محافظ نہیں آجاتے تو ہمیں ادھر ہی ایک ساتھ بیٹھ جانا چاہیے، اچھا خاصا خوشگوار ماحول بن جائے گا اور وقت بھی خوب پاس ہوگا۔'' گھوتراجی نے پھر مداخلت کی۔ بات ٹھیک تھی اسی لیے ہم سب ایک ہی میز پر دائرے کی صورت بیٹھ گئے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ کھانا ہم کب کا کھا چکے تھے، ویٹر ہماری میز سے برتن بھی سمیٹ چکا تھا۔ تو پھر ابھی تک بل ٹرے اس نے کیوں نہیں ہمیں پیش کی تھی۔

مجھے کچھ شک ہوا، اسے دور کرنے کے لیے میں یونہی خود کلامیہ بڑبڑایا۔ ''یہ ویٹر ابھی تک بل کیوں نہیں لایا؟''

''بل میں آپ کا ادا کر چکا ہوں۔'' نارائن گھوتراجی نے میری جانب دیکھ کر ہلکی سی مسکراہٹ سے کہا۔

''بل آپ دے چکے ہیں؟ مگر کیوں؟ کھانا تو میں نے اور میری ساتھی نے کھایا ہے۔'' میں نے سوالیہ نظروں سے گھوتراجی کی طرف دیکھا۔ اس نے اس سلسلے میں جواب دینے کے بجائے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر اپنا وزیٹنگ کارڈ میری جانب بڑھایا اور عجیب سے لہجے میں کہا۔

''سمجھو تو یہ تمہارے لیے بڑی خوش نصیبی کی بات ہے، کیونکہ ابھی میں تمہیں جو آفر کرنے والا ہوں اس کے لیے نجانے کتنے لوگ جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں، مگر کامیابی کا ایک ذرہ بھی حاصل نہیں کر پاتے ہیں، عام لوگوں کی طرح کچھ اندازہ تو اس کا تمہیں بھی ہوگا ہی، اس لیے میں نہیں سمجھتا کہ تم اپنی اس خوش بختی کو ٹھوکر مارو گے۔ خیر!...... ممبئی فلم انڈسٹری کا ایک بڑا ڈائریکٹر تمہیں خود اپنا وزیٹنگ کارڈ پیش کرتے ہوئے یہ آفر دے رہا ہے کہ جتنی جلد ممکن ہو سکے، میرے اسٹوڈیو میں آجانا، میں تمہیں اپنی ایک نئی بننے والی فلم میں مرکزی رول دینے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ بھاری معاوضے کے ساتھ، جس کی نصف ادائیگی بھی پیشگی ہوگی۔''

بلاشبہ یہ ایک بڑی آفر تھی مگر میرے لیے اس میں کوئی کشش نہ تھی۔ نہ ہی میرا یہ ایم تھا۔ میں تو کسی اور ہی اسٹیج کا اداکار تھا، اور یہ اسٹیج تقدیر میرے لیے بہت پہلے سجا چکی تھی۔ لہٰذا میں نے کہا۔

''گھوتراجی آپ کی آفر کا شکریہ اور بل ادا کرنے کا بھی۔ مگر آپ کے شاید علم میں نہیں ہے کہ میں پہلے ہی ایک فلم میں کام کر رہا ہوں۔''

''کیا؟'' گھوتراجی پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ ''کک...... کیا تم پہلے سے ہی بنے بنائے اداکار ہو؟ کس فلم میں کام کر رہے ہو؟ ہدایت کار کون ہے؟''

''تقدیر......'' میں نے جواب دیا۔

''فنٹاسٹک......'' وہ چہک کر بولا۔

''گھوتراجی! تقدیر میرے لیے ایک اسٹیج سجا چکی ہے اور اب میں اس پر اپنا کردار ادا کر رہا ہوں، کب تک ادا کروں، یہ میرے ہدایت کار تقدیر کو پتا ہے۔''

''بڑی گہری چوٹ کھائے ہوئے لگتے ہو۔ جوان! سچ کہو تو ہمارے رائٹر کو تمہارے لیے مکالمے لکھنے کی ضرورت ہی نہیں پیش آئے گی، بعض اداکار اپنے مکالمے خود ترتیب دیتے ہیں، تم بھی انہی میں سے ہو گے۔ میری آفر مان لو، فائدے میں رہو گے۔'' گھوتراجی بڑے گھاگ لہجے میں بولا۔

میں نے اس کا کارڈ نجانے کیا سوچ کر اپنی شرٹ کی جیب میں رکھ لیا اور بولا۔ ''میں غور کروں گا۔''

''میں منتظر رہوں گا۔'' وہ یکدم خوش ہو کر بولا۔ ''باقی اداکاری کی فکر نہ کرو، میری نظریں بھانپ رہی ہیں کہ تم بنے بنائے اداکار ہو، تم پر اتنی زیادہ محنت نہیں کرنی پڑے گی۔''

سوشیلا اس موضوع میں بھرپور دلچسپی لے رہی تھی مگر رینا بالکل بھی نہیں، جبکہ اس کا ساتھی تو بری طرح بیزار اور غصے میں نظر آرہا تھا۔

رینا اس دوران اپنے ''دڈو'' کو فون کر چکی تھی۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔ اس کم بخت گھوتراجی نے مجھے ایک فضول کی بحث میں الجھا لیا تھا، ورنہ میں سوچنا چاہتا تھا کہ مجھے اب اس معجزانہ اتفاق سے کیسے فائدہ اُٹھانا چاہیے تھا؟ یہ سر پھرا ڈائریکٹر گھوتراجی میرا پیچھا چھوڑتا تو میں کچھ سوچتا۔ اب اس نے ہم پر بل کی ادائیگی کا احسان بھی کر لیا تھا، اس لیے میں اس کے ساتھ رکھائی سے بھی پیش نہیں آسکتا تھا۔ لہٰذا بولا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

''گھوتراجی! آپ سے مل کر مجھے واقعی بہت خوشی ہوئی ہے، یہ ... میری خوش قسمتی ہوگی کہ میں آپ کی آفر کو قبول کروں، لہٰذا میں وعدہ تو نہیں کرتا لیکن آپ کے اسٹوڈیو آؤں گا ضرور......''

''یہ ہوئی ناں بات......'' وہ یک دم خوش ہوکر بولا۔ ''یقین کرو مسٹر شہزاد! اگر میں تمہیں ممبئی کے فلمی اُفق پر چمکتا ہوا ستارہ نہ بنادوں تو میرا نام گھوتراجی سے بھوتراجی رکھ دینا۔ چلتا ہوں...... ویسے ان صاحبہ کا آپ نے ابھی تک تعارف نہیں کروایا؟'' اس نے آخر میں اپنی کرسی سے اُٹھتے ہوئے سوشیلا کی طرف اشارہ کرکے کہا۔

''یہ میری دوست ہے۔''

''او...... اچھا اچھا! چلتا ہوں......'' وہ ایک بار پھر بڑی گرم جوشی کے ساتھ مجھ سے مصافحہ کرکے چلتا بنا، اس کے ہمراہ جو دو افراد تھے وہ بھی ساتھ ہولیے تھے، پتا نہیں کون تھے وہ دونوں؟ اور اس گھوتراجی سے ان کا کیا تعلق تھا، مجھے نہ پتا چل سکا، نہ ہی اُنہوں نے قریب آنے اور کسی گفتگو میں حصہ لینے کی کوشش چاہی تھی۔

گھوتراجی کے جاتے ہی میں نے ہی نہیں بلکہ رینا نے بھی سکھ کا سانس لیا تھا۔ اس کا ساتھی مہیش بار بار میری طرف گھور کے دیکھ رہا تھا، میں اس کی نظروں میں رقابت اور ناگواری کے تاثرات بھانپ رہا تھا۔ علاوہ ازیں میرا ذہن بھی تیزی سے سوچنے کے عمل سے گزر رہا تھا، ایک مشن دور تھا اور دوسرا نزدیک، جبکہ نزدیک والے مشن کی ابھی اتنی جلدی قریب آنے کی توقع ہی نہیں تھی۔ کم اہمیت کا حامل تو یہ مشن بھی نہیں تھا۔ تاہم میں نے اب فیصلہ کرلیا تھا کہ یہ تو یہی سہی...... یوں میں اندر ہی اندر ایک لائحہ عمل ترتیب دے چکا تھا۔ سوشیلا کی ذہنی کیفیت اس وقت کیا ہورہی ہوگی اس کا میں بہ خوبی اندازہ لگا سکتا تھا اور وہ خود بھی خوش ہی ہوگی کہ اس کا دیرینہ مشن اس کی منزل تک پہنچنے سے پہلے ہی گویا خود ہی چل کر ہمارے اتنے قریب آگیا تھا، اسی لیے وہ اس ''سنہری موقع'' کو گنوانا نہیں پسند کرسکتی تھی، البتہ اس نے اس کی تکمیل کے مکمل اختیارات میری صوابدید پر چھوڑ رکھے تھے۔

ادھر اُدھر کی باتوں میں تھوڑی دیر اور بیت گئی کہ اچانک ریسٹورنٹ میں دو افراد نمودار ہوئے اور سیدھے ہماری طرف لپکے۔ ان کا انداز مؤدبانہ اور نہایت محتاط تھا۔ دونوں سفید اور بے داغ کوٹ سوٹ میں ملبوس تھے۔

''او مائی گاڈ......!'' ان کے نمودار ہوتے اور ہماری طرف بڑھتے ہی میرے ساتھ کھڑی سوشیلا کے حلق سے بے اختیار یہ جملہ خارج ہوا تھا جو میرے لیے چونکا دینے کا باعث تھا۔ غیر ارادی طور پر میری نظر اس پر پڑی تھی۔ پل کے پل اس کا چہرہ دھلے ہوئے لٹھے کی طرح سفید ہوگیا تھا اور آنکھوں میں خوف نمایاں ہوکر جھلکنے لگا تھا، جبکہ اس کی پھٹی پھٹی سی نگاہیں دونوں افراد میں سے ایک پر جم کر رہ گئی تھیں۔

فوری طور پر تو میں سوشیلا کی اس اچانک بدلتی ہوئی سراسیمہ کیفیات کا مطلب نہیں جان سکا تھا۔ لیکن میں نے دیکھا کہ نہ صرف سوشیلا بلکہ وہ آدمی بھی ہمارے قریب آتے ہی سوشیلا کو دیکھ کر ایک لمحے کے لیے ٹھٹکا تھا اور تب ہی اس نے اپنے ساتھی کے کان میں کوئی سرگوشی کی تھی، میری چھٹی حس پل کے پل خطرے کی بو محسوس کرنے لگی تھی کہ اچانک ان دونوں آدمیوں کے ہاتھ کوٹ کی اندرونی جیب میں رینگ گئے۔ دوسرے ہی لمحے جب باہر آئے تو ان میں پستولیں دبی ہوئی تھیں اور ان کا رخ میری اور سوشیلا کی طرف تھا۔ اس اچانک اور عجیب سی اُفتاد پر میرا پورا وجود سنسنا اٹھا تھا۔

''ی ی...... یہ کیا کر رہے ہو تم لوگ......؟'' رینا چلائی۔ ''یہ وہ غنڈے نہیں ہیں، وہ تو بھاگ چکے ہیں۔''

''آر یو آل رائٹ بے بی؟'' ان میں سے ایک نے، جو مجھ پر بدستور اپنی گن کی نال تانے ہوئے تھا، رینا کو مخاطب کرتے ہوئے مؤدبانہ لہجے میں کہا، البتہ اس کے انداز سے محتاط روی بھی جھلکتی تھی۔ مجھے یہ ادراک ہوچکا تھا کہ یہ دونوں رینا کے ڈیڈو (جنرل کے ایل ایڈوانی) کے بھیجے ہوئے محافظ ہی تھے۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں، بٹ...... پلیز! پٹ دی گن ڈاؤن...... یہ مسٹر شہزاد ہیں اور میرے محسن ہیں، انہوں نے ہی ہمیں ان غنڈے لڑکوں سے بچایا تھا۔''

رینا ان کی طرف دیکھ کر بولی۔ وہ شاید یہی سمجھ رہی تھی کہ اس کے ڈیڈو کے بھیجے ہوئے یہ دونوں مسلح محافظ مجھے اور سوشیلا کو وہی بدمعاش سمجھے ہوئے تھے، مگر مجھے سوشیلا کی ان دونوں کو دیکھتے ہی یکدم بدلنے والی کیفیات کو بھانپ کر اندازہ ہوچکا تھا کہ معاملہ کچھ اور...... نیز اس سے زیادہ گمبھیر تھا۔

''بے بی! تم نہیں سمجھوگی۔ یہ معاملہ صرف بدمعاشوں سے تمہاری مکتی (جان چھڑائی) کا نہیں، کچھ اور ہے۔'' یہ وہی آدمی تھا، جسے دیکھتے ہی سوشیلا خوف زدہ ہوگئی تھی۔ وہ

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

ایک تنومند اور خاکستری رنگت والا کرخت صورت آدمی تھا، جو بار بار بڑی کینہ توز نظروں سے میری اور سوشیلا کی طرف گھورے جا رہا تھا جبکہ اس کا ساتھی بھی کم خطرناک نہیں نظر آتا تھا، وہ ایک گینڈے جیسی جسامت کا حامل گورے رنگ اور ٹھگنے قد کا تھا۔ اب میں کچھ باتیں محسوس کر کے سمجھنے لگا تھا کہ یہ معاملہ کیا ”رخ“ اختیار کرنے جا رہا تھا۔

”تم دونوں کو ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔“ وہی کرخت صورت شخص میری جانب گھور کے بولا تو میں نے بڑے اطمینان سے اپنے کاندھے اُچکا کر کہا۔

”مجھے کوئی اعتراض نہیں تمہارے ساتھ جانے میں...... اگرچہ میں جانتا ہوں کہ آپ کو کم از کم میرے سلسلے میں ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ لیکن بہتر ہوتا کہ مجھے بتایا تو جاتا کہ میرا قصور کیا ہے؟“ میں نے دانستہ اپنے لیے ”ہم“ کے بجائے ”میں“ کا صیغہ لگایا تھا، میں خود کو سوشیلا سے الگ رکھنا چاہتا تھا۔ جان تو گیا تھا کہ سوشیلا نے اپنی بہن اور اس کی فیملی کو بچانے کے لیے ان لوگوں کے ساتھ ٹکر لی تھی، یا یوں کہہ لیں ان کے ساتھ ہیرے کے سلسلے میں ”ڈیلنگ“ کی تھی، جسے ان خبیثوں نے حاصل کر لینے کے باوجود انسانیت سوز بربریت کا مظاہرہ کرتے ہوئے، سوشیلا کو بے وقوف بنا کر اس کی بڑی بہن، اس کے دونوں چھوٹے معصوم بچوں سمیت شوہر کو بھی قتل کروا دیا تھا۔ یوں صورتِ حال کی گمبھیر تا میری سمجھ میں آتی چلی گئی تھی۔

رینا کا چہرہ غصے اور کافی حد تک شرمندگی کے باعث سرخ ہو رہا تھا۔ وہ اپنے ”محسن“ کے ساتھ بھلا ایسے کسی سلوک کی کب توقع رکھے ہوئے تھی؟ ایک بار پھر اپنے محافظوں سے تڑخ کر بولی۔

”یو شٹ اپ نان سینس! میں کہتی ہوں اپنی پستولیں ہٹا لو اور دفع ہو جاؤ یہاں سے...... نہیں ضرورت ہے مجھے تمہاری مدد کی، میں ابھی اپنے ڈڈو سے بات کرتی ہوں۔“

بڑی عجیب صورتِ حالات ہو گئی تھی۔ میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا، ادھر رینا نے اپنے سیل پر ڈڈو سے رابطہ کیا، میرا دل تیزی دھڑک رہا تھا۔ طلسم نور ہیرے جیسے انتہائی حساس اور اس سے بڑھ کر خطرناک معاملے سے متعلق ایک بڑا جرنیل غیر متوقع طور پر ہی میرے سامنے آنے والا تھا، یہ ایک حادثاتی اتفاق سہی، مگر ابھی ہم ذہنی طور پر اس مشن کے لیے تیار ہی نہیں ہوئے تھے، اس کی وجہ بڑی ٹھوس تھی، سر دست ہمیں بلوتسی اور اسپیکٹرم سے خطرہ دو چار تھا، جبکہ مجھے بلوتسی کے سربراہ کرنل سی جی بھجوانی کو

آج کل تو ہر انسان شوگر کی مرض سے سخت پریشان ہے۔ کیونکہ شوگر انسان کو اندر ہی اندر کھوکھلا اور اعصابی طور پر کمزور کر دیتی ہے۔ ہم نے دیسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں پر ریسرچ کر کے خاص قسم کا ایک ایسا شوگر نجات کورس ایجاد کر لیا ہے جس کے استعمال سے ان شاء اللہ شوگر سے مستقل نجات مل سکتی ہے شفاء منجانب اللہ پر ایمان رکھیں۔ شوگر کے وہ مریض جو آج تک اپنی شوگر سے نجات حاصل نہیں کر سکے وہ ایک بار ہمارا شوگر نجات کورس بھی آزما کر دیکھ لیں۔ آج ہی گھر بیٹھے فون پر اپنی تمام علامات بیان کر کے بذریعہ ڈاک وی پی VP شوگر نجات کورس منگوالیں۔

المُسلم دارالحکمت رجسٹرڈ
ضلع حافظ آباد۔ پاکستان
0300-6526061
0301-6690383
فون اوقات
صبح 10 بجے سے رات 8 بجے تک

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

بھی ٹھکانے لگاتا تھا، اس کے بعد ہی میں ایڈوانی مہم کے لیے سوشیلا کی مدد سے کوئی مربوط لائحہ عمل تیار کرتا۔ مگر یہاں تو بعد والی مہم پہلے گلے پڑتی نظر آرہی تھی، میرے ادراک کے مطابق کرخت صورت والا شخص جو ظاہر ہے ایڈوانی جیسے درندہ صفت آدمی کا گماشتہ ہی تھا، سوشیلا کا ان سے ماضی میں ٹکراؤ ہونے کی نسبت سے اسے پہچان رہا تھا۔ سوشیلا نے اپنی بدنصیب بہن اور اس کی فیملی کو بچانے کی خاطر ہی ایک ڈیل کے ذریعے وہ ہیرا (طلسم نور) ایڈوانی کے حوالے کیا تھا مگر اس درندہ صفت اور سفاک آدمی نے ہیرا حاصل کرنے کے بعد بھی سوشیلا کی بڑی بہن اور اس کے دونوں چھوٹوں بچوں سمیت اس کے شوہر کو بھی ختم کرا دیا تھا۔ کوئی بعید نہ تھا کہ وہ سوشیلا کو بھی راستے سے ہمیشہ کے لیے ہٹانے کی کرتا، کیونکہ ایڈوانی ہیرے والے راز کو اپنے تک ہی محدود رکھنا چاہتا ہوگا کہ وہ ہیرا اب اس کے قبضے میں ہے۔ سوشیلا خطرہ محسوس کرتے ہی منظر سے غائب ہوگئی تھی مگر ایڈوانی سے اپنی بدنصیب بہن اور اس کی پوری فیملی کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بدلے کا عزم بھی کیے ہوئے تھی۔ تاہم اب معاملہ یوں تھا، جس کا مجھے ادراک ہونے لگا کہ یہ کرخت صورت آدمی، سوشیلا کو ماضی کے اسی بھیانک اور انسانیت سوز واقعے کی نسبت سے پہچان چکا تھا اور سوشیلا بھی...... اسی لیے یہ سارا بکھیڑا پڑ چکا تھا۔

''لو...... میرے دڈو سے بات کرلو۔''

رینا نے اپنے دڈو (جنرل ایڈوانی) سے بات کرنے کے بعد اپنا سیل اس کرخت صورت محافظ کی طرف بڑھا دیا۔ اپنے ''دڈو'' سے بات کرنے کے دوران میں نے اندازہ لگایا تھا کہ وہ اپنے دڈو کی خاصی لاڈلی پوتی تھی۔

کرخت صورت محافظ نے ایک بار پھر میری اور سوشیلا کی طرف معاندانہ نظروں سے دیکھا اور پھر رینا سے سیل فون لے کر اپنے کان سے لگایا۔

''ہیلو، سر......!'' کہہ کر اس نے چند سیکنڈ تک خاموشی اختیار رکھتے ہوئے دوسری جانب سے شاید ایڈوانی کے کچھ استفساریہ جملے سنے تھے، اس کے بعد ذومعنی لہجے میں بولا۔

''سر! یہاں کی صورتِ حال کچھ اور ہے، جو بے بی کی سمجھ میں نہیں آسکتی، وہ اپنی نادانی میں خود کو خطرے میں ڈال دیں گی۔ باقی فون پر ہم آپ کو کوئی تفصیل نہیں بتا سکتے۔ آپ بے بی کو سمجھا دیں۔'' ایک بار پھر قلیل سا وقفہ آیا، پھر اس نے سیل رینا کی طرف بڑھا دیا۔ ریسٹورنٹ رفتہ رفتہ لوگوں سے خالی ہونے لگا تھا، منیجر نے ایک بار پھر مداخلت کرنا چاہی تو کرخت صورت محافظ کے ساتھی نے اسے بری طرح جھڑک کر خاموش رہنے پر مجبور کر دیا۔

''جی دڈو؟'' اس نے استفساریہ کہا اور دوسری جانب سے اپنے دڈو کی باتیں سنتی رہی، میری نظریں اس کے چہرے پہ مرکوز تھیں، اب نجانے اس کا دڈو اپنی اس لاڈلی پوتی کو کیا بتا رہا تھا کہ اس کا چہرہ سُتنے کے قریب ہوگیا، بالآخر بولی۔

''ٹھیک ہے دڈو! اگر یہ بات ہے، اور مجھے یقین ہے کہ آپ کے آدمیوں کو کوئی غلط فہمی ہی ہوئی ہے، میرے محسن شہزی اور ان کی ساتھی کو کسی قسم کا کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہیے، آپ کو معلوم ہے ناں کہ میں اس سلسلے میں کس قدر تُنکی ہوں؟'' اس کے بعد اس نے رابطہ منقطع کر دیا اور میری طرف شرمندہ سی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے معذرتی سے لہجے میں بولی۔

''شہزی صاحب! میرے دڈو کی مجبوری یہ ہے کہ وہ دیش کے ایک اہم اور کلیدی منصب پر فائز رہے ہیں، انہیں، بلکہ ان کے ان دونوں آدمیوں کو شبہ ہے کہ آپ ان کے مخالفین سے تعلق رکھتے ہیں، انہیں اس کی کوئی پروا نہیں، مگر وہ آپ دونوں کو اپنے روبرو دیکھ کر چند سوالات کریں گے اور پھر معاملہ ختم......''

''یہ تو کوئی بات نہیں مس رینا!'' اچانک سوشیلا، جسے اس صورتِ حال نے کچھ ماؤف سا کر رکھا تھا، یکدم ہمت کر کے تڑ سے بول پڑی۔ ''تمہارے دڈو کے آدمیوں کو اگر یہاں موجود کسی بھی شخص پر اپنے مخالفین کا شبہ ہو تو کیا وہ انہیں اپنے روبرو پیش ہونے کا حکم دے ڈالیں گے؟ یہ تو کھلی بدمعاشی اور ناانصافی ہے۔''

''پھر ہمیں زبردستی کرنا پڑے گی۔'' کرخت صورت والے آدمی کے ساتھی نے سوشیلا سے جارحانہ لہجے میں کہا تو. رینا نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

''آپ کو اگر ایسا کوئی خطرہ یا شبہ محسوس ہوتا ہے تو آپ میرے دڈو کے سامنے پیش ہو کر اس کی گلاخلاصی کروا لیں، لیکن میرا یہ وعدہ ہے، چاہے آپ دونوں ان کے مخالفین میں سے کیوں نہ ہوں، میں آپ پر آنچ تک نہیں آنے دوں گی، آپ نہیں جانتے کہ دڈو کی جان کسی دیو کی طرح میرے شریر میں قید ہے۔ کم از کم میری موجودگی میں دڈو آپ دونوں کا بال تک نہیں بگاڑ سکیں گے۔'' رینا نے پورے استحکام کے ساتھ گویا خم ٹھونک کر یہ بات ہم سے کہی

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

تھی، مگر سوشیلا مطمئن نہیں تھی، جبکہ میں بات کی تہ تک پہنچ چکا تھا اور سوشیلا نے کچھ کہنے کے لیے اپنا منہ کھولا ہی تھا کہ میں نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور رینا سے مسکرا کر بولا۔

''مجھے آپ پر پورا بھروسا ہے۔ چلیں! ہم تیار ہیں آپ کے ساتھ چلنے کے لیے۔'' سوشیلا نے پھیلی ہوئی آنکھوں سے میری جانب دیکھا مگر بول نہ پائی، میرے اور اس کے درمیان پہلے ہی یہ معاہدہ ہو چکا تھا کہ وہ میرے کسی بھی حتمی فیصلے پر کوئی چون وچرا نہیں کرے گی۔ سو وہ خاموش ہی رہی، وگرنہ تو اس کا بس چلتا تو وہ یہاں سے بھاگ جاتی۔ (اگرچہ یہ بھی اس کے لیے آسان نہیں ہوتا)

میں نے دیکھا رینا کا حسین چہرہ کھل کر نکھر اُٹھرا ہو گیا۔ پھر اس نے خاصے تیز لہجے میں اس کرخت صورت محافظ کو پہلی بار مخاطب کرتے ہوئے تحکمانہ سی آواز میں کہا۔

''بلراج سنگھ! یہ ہمارے ساتھ جا رہے ہیں، تم دونوں اب اپنے پستول جیبوں میں ڈال لو...... ورنہ میں بھی یہاں ان کے ساتھ کھڑی رہوں گی اور اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوں گی۔''

''بلراج سنگھ...... بلراج سنگھ۔''

اس شناسا سے نام کی میرے سوچتے ہوئے ذہن میں سوالیہ سی گردان ہونے لگی۔

اوہو...... یہ تو وہی بلراج سنگھ تھا، جس کے بارے میں سوشیلا نے مجھے بتایا تھا کہ یہ جنرل کے ایل ایڈوانی کا قریبی دستِ راست تھا اور اسی نے وہ ہیرا اس سے لے کر ایڈوانی کو دیا تھا، بعد میں ایڈوانی کے حکم پر اس نے اس کی بہن اوشا اور اس کے شوہر اور بچوں کو زندہ جلا دیا تھا۔ اس نام کے مع حوالے کے یاد آتے ہی میرے اندر تھرتھراہٹ سی عود کر آئی، جو کسی دہشت یا خوف سے نہیں بلکہ جوش بھری وہ لہر تھی جس نے میری رگوں میں خون کی گردش تیز کر دی تھی۔

اب مجھے ٹھیک طرح اندازہ ہو پایا تھا کہ سوشیلا کیوں بلراج سنگھ کو دیکھتے ہی اس قدر خوف زدہ سی ہو گئی تھی۔ یہ بھی مجھے جنرل ایڈوانی کا قریبی اور چہیتا گماشتہ محسوس ہوا تھا۔

ایک فیصلہ کن ارادہ باندھ کر میں نے ان کے ساتھ روانگی کی ہامی بھر لی تھی۔ رینا کا بھی مجھے اندازہ تھا کہ وہ اپنے ڈڈو کے کس قدر قریب اور اس کی لاڈلی تھی۔ لیکن وہ شاید اپنے ''ڈڈو'' کے کالے کرتوتوں سے آگاہ نہیں تھی۔ شاید اسی سبب مجھے کچھ خوش فہمی سی تھی کہ ایڈوانی اتنی جلدی ہمارے ساتھ کوئی سفاکانہ سلوک کرنے سے قاصر ہی رہے گا۔

بہرکیف رینا کی بات پر بلراج سنگھ نے منہ بناتے ہوئے اپنا پستول جیب میں ڈال لیا تھا اور اس کے ساتھی نے بھی اسے دیکھ کر اس کی تقلید کی تھی۔

ہم ریسٹورنٹ سے باہر آ گئے۔ پچ ریسٹورنٹ میں اگرچہ پارکنگ ایریا خاصا وسیع تھا، مگر گیٹ کے بالکل سامنے ہی ایک لمبی سی چمکتی ہوئی کار کھڑی تھی جو یقیناً بلراج سنگھ کی تھی۔ باوردی دو گیٹ مین خاصے پریشان سے نظر آ رہے تھے۔ گاڑی غلط اور زبردستی پارک تھی، یہی وجہ مجھے ان کی پریشانی کی سمجھ میں آئی تھی اور انہیں دیکھ کر گیٹ مین نے سکون کا سانس لیا تھا۔

رینا اور اس کے بوائے فرینڈ کی کار پارکنگ ایریا میں کھڑی تھی، میں سوشیلا کے ساتھ دانستہ رینا کے پیچھے چلا تو بلراج نے پھر مجھ پر حکم چلایا۔

''تم ہمارے ساتھ بیٹھو گے، ہماری گاڑی میں......''

''ایز یو وش......'' میں نے کندھے اُچکائے اور اس کے ساتھ ہوا تو رینا نے پکارا۔

''نہیں مسٹر شہزاد! تم میری گاڑی میں بیٹھو گے۔'' میں نے فوراً سوشیلا کا ہاتھ پکڑا اور رینا کے ساتھ ہو لیا، وہ دونوں اپنے دانت پیستے رہ گئے۔ مہیش البتہ بری طرح مجھ پر خار کھائے بیٹھا تھا، بول ہی پڑا۔

''رینا! ان دونوں کو انہی کی گاڑی میں جانے دو ناں...... کیا فرق پڑتا ہے، ہم بھی تو وہیں جا رہے ہیں۔''

''تم پلیز خاموش رہو مہیش! یا پھر میں تمہیں ڈراپ کرتی چلوں گی۔'' رینا نے اس سے بھی رکھائی کے ساتھ کہا اور پھر مجھے آنے کا کہا۔ ''آئیں آپ لوگ......''

تھوڑی دیر بعد ہم رینا کی کار میں عقبی سیٹوں پر براجمان تھے۔ رینا کی کار بھی کم قیمت نہیں لگتی تھی۔ نامعلوم منزل کی طرف سفر شروع ہو چکا تھا۔ بلراج سنگھ کی گاڑی پہلے تو آگے رہی، مین روڈ پر آتے ہی وہ ہمارے عقب میں ہو گئی۔ ڈرائیونگ سیٹ رینا نے ہی سنبھالی ہوئی تھی، جبکہ اس کے برابر والی سیٹ پر مہیش براجمان تھا۔

دونوں گاڑیاں فراٹے بھرنے لگیں۔ سفر خاموشی سے جاری رہا۔ گاڑی شہر کے وسطی علاقوں اور بھری پُری آبادی کے درمیان سے گزرتی رہی۔ رات اپنے پہلے پہر میں تھی۔ نصف گھنٹے بعد رینا نے مہیش کے منع کرنے کے باوجود اُسے اس کے گھر پر ڈراپ کر دیا۔ اس کا گھر متمول علاقے میں تھا اور وہ بھی کسی بڑے آدمی کی اولاد معلوم ہوتا تھا، اس کی کوٹھی خاصی شاندار تھی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

وہاں سے روانگی کے بعد ریتا نے اسٹیئرنگ پر ہاتھ جماتے ہوئے مجھ سے کہا۔ ''تم آگے آسکتے ہو۔''
''نہیں، بس میں ادھر ہی ٹھیک ہوں۔'' میں نے کہا، ریتا نے دوبارہ اصرار نہیں کیا۔
پندرہ بیس منٹ بعد ہی دونوں گاڑیاں شہر کی حدود سے باہر اس کے مضافات میں آگئیں۔ میں اس سارے راستے کو اچھی طرح ذہن نشین کرتا جا رہا تھا۔ یہاں تک کے مہیش کی رہائش گاہ بھی ازبر تھی۔ مضافات میں بھی سفر کا اختتام تیس چالیس منٹ بعد ہی ہوگیا۔
آبادی سے الگ تھلگ یہ حویلی نما بنگلا عنابی رنگ کی اینٹوں سے بنا ہوا تھا، جس کے گرد خوب صورت لان پھیلا ہوا تھا اور اندر سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آ رہی تھیں، صاف لگتا تھا کہ انہوں نے دو اجنبیوں کی آمد کی بو سونگھ لی تھی۔
لمبا چوڑا گیٹ آٹو سلا ''مڈ ہوا اور دونوں گاڑیاں اندر داخل ہوگئیں۔ سوشیلا کی حالت خاصی پتلی ہو رہی تھی۔ میں نے اس کو مطمئن کرنے کے لیے اس کا ہاتھ دبایا تھا۔
سوشیلا جس خوف کا شکار تھی، وہ اس پر حق بجانب بھی تھی۔ ایڈوانی اور بلراج سنگھ کا اس کے ساتھ پہلے بھی ٹکراؤ ہو چکا تھا اور وہ ان کی سفاکانہ فطرت سے بہ خوبی واقف تھی۔ لیکن مجھ پر وہ بھروسا بھی کافی کرتی تھی۔ اس لیے اس نے بھی خود کو تن بہ تقدیر کر دیا تھا۔
کار پورچ میں دونوں گاڑیاں ایک جھٹکے سے رکیں اور پھر ہم سب نیچے اُتر آئے۔
بلراج سنگھ تیر کی طرح ہماری طرف بڑھا تھا۔ اس کے انداز میں عجلت اور ایک درشت آمیز جوش سا اُمڈتا محسوس ہوتا تھا۔ اس نے اپنے ساتھی سمیت ہمیں کور کرنے کی کوشش کرنی چاہی تھی، لیکن ریتا ان کے آڑے آگئی۔
''بے بی! انہیں دوسرے کمرے میں جانا ہوگا۔'' بالآخر جب ریتا نے انہیں کوئی موقع نہ دیا تو بلراج کو ہی کہنا پڑا۔
''یہ مہمان ہیں اور اندر ڈرائنگ روم میں ہی بیٹھیں گے۔'' ریتا نے ٹھنڈی ہوئی سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''اور جب تک یہ یہاں ہیں، میں انہیں اپنی نگاہوں سے ایک پل کے لیے بھی اوجھل نہیں ہونے دوں گی۔''
ریتا کا ہمارے حق میں انداز و اطوار کافی حوصلہ افزا تھا۔ وہ بڑی سمجھداری کے ساتھ اپنے ڈیڈ کو یہ بھی باور کروا چکی تھی کہ اگر ہم ان کے مجرم ہوئے بھی تو وہ کم از کم اپنی موجودگی میں ان کے خلاف کوئی بھی ایسا ویسا قدم اُٹھانے نہیں دے گی۔ یہ بات اس کی کافی تسلی بخش تھی۔ اب ہمیں ایڈوانی کے روبرو کیا موقف اختیار کرنا تھا، وہ میں اپنے ذہن میں مرتب کر چکا تھا۔ جبکہ سوشیلا نے اُس بد بخت کو اپنی طرف سے کیسے قائل کرنا تھا، یہ میں راستے ہی میں مختصراً اشارتی گفتگو میں اسے سمجھا چکا تھا۔
بلراج سنگھ، ریتا کے مسکت جواب پر ایک بار پھر بے بسی سے اپنے دانت پیس کر رہ گیا تھا۔
میں غیر محسوس طریقے سے بنگلے کے اطراف کا جائزہ لیتا رہا۔ ریتا کی تقلید میں اندر قدم اٹھاتے ہوئے ہم ایک بڑی سی شاہانہ طرز کی نشست گاہ میں آگئے۔ ریتا نے ہمیں یہاں ایک آرام دہ صوفے پر بیٹھنے کو کہا اور مجھ سے مخاطب ہو کر بولی۔
''شہزاد صاحب! آپ دونوں یہاں سے کسی کے کہنے پر ہلیے گا بھی نہیں، آپ کسی قسم کی چنتا مت کریں، آپ نے چاہے کتنا ہی بڑا جرم کیا ہو، مجھے اس کی پروا نہیں ہے۔ بس! آپ اس وقت میرے محسن ہیں اور میرے ساتھ ہیں۔ میں ابھی آتی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ کسی اندرونی گوشے کی طرف کھلنے والے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔
میں اور سوشیلا وہاں اکیلے رہ گئے۔ نشست گاہ کی سج دھج میں خاصی نفاست اور امارت ٹپکتی تھی۔ بیش قیمت شو پیس خوب صورت کارنس پر اور صوفوں کے قریب رکھے نظر آ رہے تھے۔ دیواروں پر بھی پورٹریٹ اور خاندان کے پرکھوں کی بڑی بڑی شیشے کے فریم والی تصاویر ٹنگی ہوئی تھیں، یہ مجھے نہیں معلوم تھا کہ ان میں ایڈوانی کی کون سی تصویر تھی، نہ ہی مجھے یہ جاننے کی جلدی تھی، کیونکہ ابھی کسی بھی وقت میرا اور اس کا سامنا ہونے ہی والا تھا۔
میں نے ایک بار پھر دھیمے لہجے میں سوشیلا کو کچھ سمجھایا۔ ہمیں ابھی وہاں بیٹھے چند منٹ ہی ہوئے ہوں گے کہ ریتا نمودار ہوئی۔ سوشیلا اور میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس کے ہمراہ مجھے ایک خاصا دراز قامت اور چوڑے شانوں والا شخص بھی ساتھ ہی نمودار ہوتا نظر آیا۔ اس نے نفیس قسم کا قیمتی سلیپنگ گاؤن پہن رکھا تھا۔ عمر کا اندازہ پچپن ساٹھ کا ہی ہوا تھا مجھے، رنگت گندمی تھی اور سر کے بال بیچ سے اُڑے ہوئے جبکہ کنپٹیوں پر اپنی جگہ نیلگوں مائل سفیدی کی جھلک دکھاتے نظر آتے تھے۔ اس کی ناک موٹی اور آنکھیں چندی چندی سی تھیں، جن میں عجیب سا تاثر جھلکتا محسوس ہوتا تھا، جیسے وہ مدمقابل کا ایکسرے لے رہی ہوں۔ پیشانی تنگ تھی۔ چہرے پہ سنجیدگی کھنڈی ہوئی تھی

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

جواس کی کرخت مزاجی کی غماز ہی نظر آتی تھی۔ کیا شک تھا کہ یہی شخص جنرل ایڈوانی تھا۔

''یہ مسٹر شہزاد ہیں اور یہ ان کی ساتھی سوشیلا......'' رینا نے قریب آتے ہی ہمارا اس سے تعارف کروایا۔ اُس نے ہمارے قریب آنے کی زحمت تک گوارانہ کی تھی اور ہمارے سامنے والے صوفے کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا تھا۔ میں بھی اپنی جگہ صوفے پر جم کر بیٹھا رہا تھا اور میری سناٹے دار نظریں اس درندہ صفت اور جنگی جنونی شخص پر جمی رہیں۔

''اور...... یہ میرے دڈو ہیں، آرمی کے ایک مایۂ ناز جرنیل کے ایل ایڈوانی جی......''

(میں نے یہاں دیکھا تھا کہ کوئی آدمی خود کو بڑی شخصیت ظاہر کرنے کے لیے اپنے نام کے آگے ''جی'' ضرور لگاتا تھا، جیسے گھوتراجی...... وغیرہ، پتا نہیں یہ گھوتراجی...... مجھے اس نازک اور حساس وقت میں کیوں یاد آ گیا تھا؟)

''بڑی خوشی ہوئی آپ کے دڈو جان سے مل کر......'' میں نے اسی طرح صوفے پر بیٹھے بیٹھے کہا، میری عقابی نظریں ایڈوانی پر جمی ہوئی تھیں اور اس کی سوشیلا کے چہرے پہ، جبکہ اس کے ذرا ہی دیر بعد اس کے وہ دونوں کارپرداز خاص چیلے بلراج سنگھ اور اس کا ساتھی بھی وہاں آن موجود ہوئے تھے اور دونوں ہاتھ باندھے اس کے دائیں بائیں کھڑے تھے۔

ایڈوانی، سوشیلا کو دیکھ کر اندر سے پریشان تو ضرور ہوا ہوگا، مگر اسے تسلی بھی ہوئی ہوگی کہ بھلا اب یہ اکیلی کمزور سی لڑکی اس کا کیا بگاڑ لے گی جو اس کی بربریت اور انسانیت سوز سفاکی کا ایک مظاہرہ دیکھتے ہی، نجانے کہاں بھاگ کر غائب ہو گئی تھی کہ کہیں اس کی بھی شامت نہ آ جائے، تاہم اب ایک اجنبی کے ساتھ اسے دیکھ کر وہ اپنے ذہن میں کس قسم کے اندازے قائم کر رہا ہوگا، اس کا مجھے جو وجدانی ادراک ہو پایا، اس کے مطابق میں اپنے ذہن کے کمپیوٹر میں ایک ''پلانٹڈ'' میموری فیڈ کر چکا تھا۔

''تم اس لڑکی کے کیا لگتے ہو؟'' دفعتاً کشادہ سی نشست گاہ میں اس کی کھرکھراتی ہوئی جھٹکے دار آواز ابھری، اس آواز میں مجھے ایک آمرانہ دبدبہ سا محسوس ہوا تھا۔

''یہ میری دوست ہے۔ ایک بین الاقوامی این جی او میں ہم دونوں ساتھ کام کرتے ہیں۔'' میں نے بہ یک ترنت مگر نارمل سے لب و لہجے میں جواب دیا۔ اچھی طرح جانتا تھا میں کہ میرے سامنے کوئی معمولی آدمی نہیں بیٹھا تھا، ایک جرنیل تھا جس کی زندگی جنگوں اور تیر و تفنگ میں گزری تھی اور وہ بہ مقابل یا تخاطب کی آواز اور لہجے سے ترنت یہ اندازہ قائم کر سکتا تھا کہ اس کے سامنے کوئی عام آدمی بیٹھا تھا یا ایک تربیت یافتہ...... کمانڈو...... یہی وجہ تھی کہ میں نے محسوس کیا اس نے میرے جواب کو بڑے غور سے سنا اور میری جانب ایکسرے کرتی نظروں سے دیکھا تھا۔

میری پروفیشنل آبزرویشن کے مطابق وہ یہ جاننے کی کوشش میں تھا کہ آیا میں واقعی سوشیلا کا کوئی ساتھی کولیگ ہی ہو سکتا تھا یا، اس نے مجھے کسی مقصد کی خاطر ''ہائر'' کر رکھا ہے۔ لامحالہ ایڈوانی جیسے جگادری جنگجو آدمی کے لیے ایسا سوچنا ایک فطری بات تھی۔

''تمہارے ساتھ بیچ ریسٹورنٹ میں کیا ہوا تھا؟'' اس نے اپنی لاڈلی پوتی کی طرف دیکھ کر پوچھا جو اس کے قریب ہی صوفے پر بیٹھی تھی۔ ایک نگاہ مجھ پر ڈالنے کے بعد اپنے دڈو سے بولی۔

''دڈو! میں اور مہیش بیچ ریسٹورنٹ میں بیٹھے تھے۔ کچھ اوباش قسم کے لڑکے آئے اور ہم سے بدمعاشی کرنے لگے، انہوں نے مہیش کو پیٹا اور میرے ساتھ بدتمیزی کرنے لگے، وہاں موجود باقی لوگ تماشائی بنے ہوئے تھے مگر اِنہوں نے نہ صرف مجھے اُن بدمعاشوں سے بچایا بلکہ ان کے ایک ساتھی لڑکے ارجن کی خوب ٹھکائی بھی لگا دی، وہی زیادہ ولن بننے کی کوشش کر رہا تھا۔''

''وہ بن نہیں رہا تھا، اُسے کسی نے خود ہیرو بننے کے لیے، ولن کا کردار ادا کرنے کو کہا ہوگا تا کہ وہ تمہاری نگاہوں میں ہیرو بن جائے اور تم سے راہ و رسم استوار کرنے کی کوشش کرے۔''

اچانک ہی ایڈوانی کاٹ دار طنز سے، ایک کڑوی سی نظر میرے چہرے پہ ڈال کر رینا سے بولا۔ ''یہ سب فلمی نقشے بازی ہے، بیٹی! تم ابھی معصوم ہو نہیں سمجھو گی یہ سب باتیں۔ بہرحال......'' وہ یہ کہتے ہوئے میری طرف متوجہ ہو کر گمبھیر لہجے میں بولا۔

''تمہارا شکریہ مسٹر......! یا جو بھی تمہارا نام ہے۔'' پھر اس نے پاس کھڑے اپنے مقربِ خاص کارپرداز بلراج سنگھ سے کہا۔

''ان دونوں کو کچھ پیسے دے دو اور انہیں ان کے گھر تک بھی چھوڑنے کا بندوبست کر دو۔ میں سونے جا رہا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ صوفے سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

''ایک منٹ سر......!'' اچانک میں نے کہا۔ خود میں نے بھی اس کے ساتھ ہی صوفہ چھوڑ دیا تھا اور سوشیلا نے بھی

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

اس کی فوراً تقلید کی تھی۔

وہ رُکا اور میری طرف گھورنے کے انداز میں خاموشی سے دیکھنے لگا۔ اس کا خیال تھا کہ میں روایتی طور پر پیسے لینے کے معاملے میں کسی غیرت یا جو کچھ اس نے بکواس کی تھی اس کی صفائی میں کچھ کہوں گا۔ اس نے میرے بارے میں جو غلط اندازہ قائم کیا تھا، میں نے اس پر کوئی بحث کرنا یوں بھی ضروری نہیں سمجھا تھا کہ وہ مجھے واقعی ایسا ہی سمجھنے کی غلطی پر کارفرما ہے تو اچھا تھا، یعنی اس کا مطلب تھا کہ میں نے ایک خوب صورت لڑکی کو متاثر کرنے کے لیے یہ عامیانہ حرکت کی تھی تو یہی سہی، لیکن میں نے اس کے بالکل برعکس ایک عمومی مسکراہٹ سے کہا۔

''آپ کی بڑی مہربانی ہوگی کہ اگر آپ ہمیں کم از کم اتنی رقم عنایت کر دیں کہ ہم بہ آسانی کوئی ٹیکسی وغیرہ پکڑ کر اپنے ٹھکانے تک پہنچ سکیں۔''

''رقم بھی مل جائے گی تمہیں، اس کی چنتا مت کرو، گاڑی ہماری ہوگی، بلراج سنگھ تم دونوں کو جہاں تم کہو گے چھوڑ آئے گا۔''

''دڈو! میں بھی ان کے ہمراہ جاؤں گی۔'' اچانک رینا نے اپنی جگہ سے کھڑے ہو کر ایڈوانی سے کہا۔ اس کا چہرہ غصے اور جوش تلے اینٹھا ہوا تھا، صاف ظاہر تھا کہ اسے اپنے دڈو کی بات بُری لگی تھی۔ ''کیونکہ آپ نے جس انداز سے انہیں یہاں بلایا تھا، اس سے انہیں آپ سے یا آپ کے آدمیوں سے ڈر تھا کہ وہ انہیں کسی قسم کا نقصان پہنچانے کی کوشش کریں گے۔''

رینا نے اپنی بات مکمل کی۔ ایڈوانی نے اس موضوع کو زیادہ طول نہیں دیا۔ محض اثبات میں اپنا سر ہلا کر آگے بڑھ گیا۔

القصہ کوتاہ اگلے چند منٹوں بعد ہم دوبارہ کار میں تھے، مگر اس بار رینا کے بجائے بلراج سنگھ کی گاڑی تھی۔ اسٹیئرنگ اسی کے ساتھی نے سنبھالے رکھا تھا، جبکہ وہ خود اس کے برابر والی سیٹ پر براجمان تھا۔ پچھلی نشست پر میں، سوشیلا اور رینا براجمان تھے۔ سفر بہ ظاہر خاموشی سے جاری تھا۔

میں سمجھ رہا تھا کہ تقدیر بھرپور طریقے سے میرا ساتھ دے رہی تھی۔ یہ چیز میرے جوشِ جنوں کو فزوں تر کرنے کا باعث بنتی تھی۔ ایڈوانی سے غیر متوقع ملاقات اور اس کے ٹھکانے کا پتا لگنا، بلراج سنگھ سے آمنا سامنا، یہ سب میرے ایڈوانی مشن سے قبل از وقت تھا اور خوب تھا، میں نہیں جانتا تھا کہ ایڈوانی مجھ سے مطمئن ہوا تھا یا نہیں، لیکن مجھے اندازہ تھا کہ ایڈوانی جیسا آدمی مجھ سے بالکل بھی مطمئن نہیں ہوا تھا ورنہ وہ میرے ساتھ اتنے مختصر سوالات نہیں کرتا۔ نہ ہی اس کی ہم سے ملاقات کا دورانیہ اس قدر قلیل ہوتا۔ ضرور اس کے شیطانی ذہن میں میرے اور سوشیلا کے خلاف کوئی اور خطرناک منصوبہ پل رہا ہوگا، جس کے ''تار و پود'' وہ پہلے سے ہی تیار کر چکا ہوگا، میں اگر اس کا نشانہ نہ بھی ہوتا تو سوشیلا کو دیکھنے کے بعد وہ اسے بھی ختم کروانے کی پوری کوشش کرے گا، کیونکہ وہ اس کے گھناؤنے منصوبے سے ہی آگاہ نہ تھی بلکہ وہ یہ راز بھی جانتی تھی کہ وہ بیش قیمت پُراسرار ہیرا طلسم نور...... ایڈوانی کے پاس ہے۔ بلکہ کوئی بعید نہ تھا کہ بلراج سنگھ کے ذریعے ہم دونوں کو ختم کرنے کی کوشش پر اب تک عمل پیرا بھی ہو چکا ہوتا، اگر اس کی لاڈلی پوتی رینا کا معاملہ درمیان میں نہ آتا۔ لیکن اب بھی وہ اپنے تئیں یہی سمجھ رہا ہوگا کہ ترپ کا پتا اس کے ہاتھ تو آ ہی چکا ہے، یعنی سوشیلا اس کے سامنے تھی، بلراج کو ساتھ بھیجنے کا مقصد بھی یہی ہوگا کہ اس طرح وہ ہمارے ٹھکانے سے آگاہ ہونا چاہتا تھا۔ اس کے بعد وہ ہمارے خلاف کوئی خفیہ جارحانہ کارروائی عمل میں لاتا۔

اسی باعث سوشیلا کو ایڈوانی کی رہائش گاہ سے روانگی کے وقت اطمینان حاصل نہیں ہوا تھا بلکہ اس کی تشویش آمیز پریشانی میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔

خطرے کی بُو مجھے اب بھی محسوس ہو رہی تھی۔ رینا کا کیا تھا، اس نے واپس لوٹ جانا تھا، پھر میں کون تُو کون......؟ بعد میں میرے اور سوشیلا کے ساتھ کیا ہوتا، اس کا بھلا اُسے کیا پتا چلنا تھا کہ ہم کہاں اور کس حال میں تھے؟

''یہاں اُتار دو۔'' دفعتاً میں نے ایک برج کراس ہوتے ہی کہا۔ یہاں گرد و پیش میں کسی آبادی کے آثار نظر آتے تھے۔

''یہاں کہاں اُترو گے تم؟'' بلراج نے کار روکنا تو کجا اس کی رفتار تک کم کیے بغیر کہا۔

''گاڑی ادھر ہی روک دو بلراج سنگھ......! ہمیں یہیں اُترنا ہے۔'' میں نے اس بار ذرا سخت لہجے میں کہا تو رینا بھی تحکمانہ لہجے میں اس سے مخاطب ہو کے بولی۔

''کار روک دو بلراج!''

بلراج نے غصے سے اپنے دانت بھینچ کر کار کو اس زور سے بریک لگائے کہ ہمیں اچھا خاصا جھٹکا لگا، کوئی اور موقع ہوتا تو میں اس کی اس حرکت کا مزہ چکھا دیتا، لیکن ابھی معاملہ فہمی آڑے آ رہی تھی اسی لیے میں اپنے طیش کو پی

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

گیا۔ صاف ظاہر تھا کہ بلراج کا ہمارا ٹھکانا دیکھنے کا خواب پورا نہیں ہوسکا تھا۔ (یوں بھی بھلا ہمارا کہاں ٹھکانا تھا؟)

میں اور سوشیلا فوراً کار سے اُترے تو رینا بھی دوسری طرف کا دروازہ کھول کے نیچے اُتر آئی۔

وہ ہم سے مخاطب ہونا چاہتی تھی کہ اچانک اس کا سیل فون سریلی ٹون میں گنگنایا۔ اس نے فون کان سے لگالیا۔

ہمارے اطراف میں خاموشی اور رات کی تاریکی پھیلی ہوئی تھی، رینا اچانک آنے والی کال کو سننے میں بزی تھی کہ میں نے دیکھا اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہوگیا اور وہ فون اپنے کان سے لگائے ہوئے میری طرف خوف زدہ سی نگاہوں سے دیکھنے لگی اور پھر جیسے پل کے پل کایا ہی کلپ ہوگئی۔ وہ قریب کھڑے بلراج سنگھ سے میری طرف ہاتھ کی اُنگلی کا اشارہ کرتے ہوئے چلا کر بولی۔

''بلراج ای ی...... یہ پاکستانی دہشت گرد ہے......''

رینا کا یہ کہنا تھا کہ میرے اندر چیختے ہوئے سناٹے اُترتے چلے گئے۔

بلراج سنگھ تو جیسے پہلے ہی مجھ پر اُدھار کھائے بیٹھا تھا، اس نے گویا ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں پستول نکال کر مجھ پر تان لیا۔ سوشیلا کا چہرہ دھواں دھواں ہوگیا تھا۔

صورتِ حال کی اس اچانک بدلتی ہوئی ''کایا کلپ'' پر میں سرتاپا سنسنا کر رہ گیا تھا کہ آخر یہ ماجرا کیا ہوا تھا......؟

پہر رات کے اس دم بہ خود اور سائیں سائیں کرتے سناٹوں میں، جیسے ہم سب کو ہی سانپ سونگھ گیا تھا کہ یہ بات ہی ایسی تھی، جس نے ہمیں ہی نہیں ہمارے مدمقابل کو بھی یک گونہ سی ٹھٹکا دینے والی خاموشی میں مبہوت کرکے رکھ دیا تھا۔ یہ بات بلراج سنگھ وغیرہ کے لیے ایک انکشاف کی صورت سہی، مگر میرے اور سوشیلا کے لیے تو سنسنی خیز اس لیے بھی تھی کہ رینا، جواب تک ہمارا خیر خواہی کے فرائض بڑی خوش اسلوبی سے بجالا رہی تھی، اسی نے ہی ہمیں ایک دم مجرم ثابت کرڈالا تھا اور وہ بھی محض ایک فون کال پر......

یوں اس نے گویا ہم پر خار کھائے ہوئے بلراج سنگھ کی چاندی کرڈالی تھی اور اسے ہم پر ہاتھ ڈالنے کا کھل کر موقع مل گیا تھا۔

اب بلراج سنگھ نے مجھے گن پوائنٹ پر لے لیا تھا جبکہ سوشیلا کو اس کے ساتھی نے فوراً دبوچ لیا تھا، اب اس کے ہاتھ میں بھی سیاہ پستول نظر آرہا تھا۔ سوشیلا کا حسین چہرہ خوف و دہشت سے سُت کررہ گیا تھا۔

''مس رینا! کیا آپ اپنی بات کی وضاحت کرنا پسند کریں گی؟'' میں نے اپنے اندر کی سنسناتی اُتھل پتھل پر قابو رکھتے ہوئے، اس کی طرف دیکھ کر سنجیدگی سے پوچھا۔

''شٹ اَپ!'' رینا کے بجائے بلراج سنگھ نے بہ دستور مجھے گن پوائنٹ پر لیے ہوئے درشتی سے کہا اور پھر رینا سے پوچھا۔

''بے بی، کس کی فون کال تھی؟''

میری برماتی ہوئی نظریں رینا پر جم گئیں۔ خود میں بھی یہ جاننا چاہتا تھا کہ آخر کس نے رینا کو فون کرکے یہ انکشاف کیا تھا اور ہمیں عین وقت پر پھنسوا دیا تھا۔

''مہیش کی کال تھی۔'' رینا نے جواب دیا۔ ''اس نے ٹی وی نیوز دیکھی تھی، اس وقت ملک کے ہر چینل پر اسی کی اور اس کی ساتھی کی تصویر دکھائی جارہی ہے۔ مہیش کے پیا مہلوک شرما ایس پی ہیں، انہیں بھی آج شام ہی یہ انفارمیشن ملی ہیں کہ سوشیلا اور شہزاد احمد خان نامی ایک پاکستانی دہشت گرد چوری چوری سرحد پار کرکے مذموم کارروائیاں کرنے کے لیے بھارت ماتا میں داخل ہوا ہے اور اس نے ممبئی کا رخ کیا ہے۔ جب مہیش نے ان سے رابطہ کیا تو انہوں نے یہ تفصیل بتائی۔ میں کبھی بھی اپنے ملک کے دشمن کا ساتھ نہیں دے سکتی۔'' رینا کے لہجے میں ایکا ایکی جوش اُمڈ آیا تھا۔

''میں نے تو تمہیں پہلے ہی کہا تھا بے بی کہ سر ایڈوانی تو انہیں پہلے ہی پہچان چکے تھے۔'' بلراج نے ایک زہریلی نظر مجھ پر ڈالنے کے بعد رینا سے کہا۔

پھر رینا نے سوشیلا سے مخاطب ہوکر کہا۔ ''تمہیں شرم نہیں آتی، تم ایک دیش دورہی (دشمن) کے ایجنٹ کی ساتھی بنی ہوئی ہو اور اس کے ساتھ مل کر اپنے ہی پیارے دیش کی جڑیں کھوکھلی کررہی ہو۔''

سوشیلا نے میری جانب ایسے دیکھا جیسے میں اس کے لیے ایکا ایکی کوئی اجنبی صورت اختیار کرگیا ہوں۔ اس کے بعد جواب میں وہ رینا سے جو کچھ بولی، اس نے مجھے بری طرح چونکا کے رکھ دیا۔

''مجھے اس کا بالکل بھی علم نہ تھا، میرا وشواس کرو رینا جی! اس نے تو مجھے یہی بتایا تھا کہ یہ ادھر ہی کا رہنے والا ہے اور حالات کا ستایا ہوا ہے۔ اس کے دشمن اسے جان سے مارنا چاہتے ہیں اور اس پر ایک جھوٹا قتل کا مقدمہ قائم کیے ہوئے ہیں، یہ ممبئی پہنچ کر اپنے کسی جاننے والے کے ساتھ مل کر اپنے قانونی دفاع کے لیے مقدمہ لڑنا چاہتا ہے۔''

''یہ جھوٹ بول رہی ہے، بے بی! اس کی باتوں میں اب مت آنا۔'' بلراج نے زہریلے لہجے میں رینا سے کہا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

''میں ابھی مہیش سے بات کرتی ہوں کہ وہ اپنے پپا کو بتادے کہ اس دیش دروہی کو ہم نے اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔ وہ پولیس کی بھاری نفری کے ساتھ ابھی یہاں پہنچ جائیں گے۔'' یہ کہہ کر وہ اپنے سیل فون پر ایک بار پھر مہیش سے رابطہ کرنے لگی۔ میرے اندر بری طرح پکڑ دھکڑ مچی ہوئی تھی۔ یہ میری بدقسمتی تھی کہ رینا کا وہ بوائے فرینڈ بھارت کی پولیس کا ایک ایس پی کا بیٹا نکلا تھا۔

اب رینا ساتھ چھوڑ چکی تھی، کم وبیش سوشیلا بھی اپنی جان بچانے کے لیے یہی کچھ کرنے والی تھی۔ یہ ''دشمن ایجنٹ'' یا ''دیش دروہی'' ایک تھا ہی ایسا ''ایلیمنٹ'' جو کسی بھی دیس کے عام آدمی کے بھی خیالات بدل ڈالنے کا سبب بن سکتا تھا جبکہ رینا تو تھی ہی ایک بھارتی ریٹائرڈ جرنیل کی پوتی...... سوشیلا کا معاملہ تھوڑے سے تفاوت کے ساتھ مختلف سہی...... مگر تھی وہ بھی آخر کو اسی ملک کی شہری، ایک ''دیش دروہی'' کا ساتھی بننا اسے غدار بنانے کے لیے کافی تھا اور وہ اس ''لیبل'' سے بچنا چاہتی تھی، یہ معاملہ ہی اتنا حساس اور نازک تھا کہ وہ اپنا اور میرا مشترکہ مشن بھی بھلا بیٹھی تھی شاید۔

''گڈ بے بی!'' بلراج سنگھ چہک کر بولا۔ ''تم ایک اور کام کرو، مہیش سے کہو کہ وہ اپنے پپا کو جنرل صاحب کی رہائش گاہ میں بھیج دے...... اور......''

''ٹھیک اسی وقت میں نے اسے تھوڑا غافل پا کر بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اپنی جگہ سے حرکت کی۔ بلراج بھی میری طرف سے کم محتاط نہ تھا، جیسے ہی میں نے اپنی سی انتہائی کوشش کرتے ہوئے، اس کے ٹارگٹ کو ''بلینک پوائنٹ'' کیا تو اس نے غیر ارادی اور کچھ ہوشیاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے پستول کی لبلبی دبادی۔

''ڈز'' کی آواز سے گولی چلی، جو میرے بجائے اس کے ساتھی کے کہیں لگی، وہ کریہہ انگیز چیخ سے تڑپا، سوشیلا اس کی گرفت سے آزاد ہوئی، بلراج نے سنبھل کر دوبارہ مجھے نشانہ بنانے کی کوشش کی، تب تک میں بلراج سے جا بھڑا تھا، میں نے اسے اپنے وجود کی بڑی زبردست ٹھوکر رسید کی تھی، اس قدر کہ پستول بھی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا تھا۔ خود وہ بھی اپنی گاڑی سے اس بری طرح ٹکرایا تھا کہ میری یہ طوفانی ٹکر وہ کبھی نہیں بھلا پاتا، کیونکہ وہ کار سے ٹکرا کر چھپکلی کی طرح پٹ سے زمین پر گرا تھا۔ میں پستول اٹھانے کے لیے لپکا، تب تک سوشیلا اپنے مدمقابل کا پستول اپنے قبضے میں لے چکی تھی۔ پستول اس نے رینا پر تان لیا تھا۔ جواب خاصی خوف زدہ نظر آنے لگی تھی۔

''شہزی! رینا کو ساتھ لے چلو اسی گاڑی میں، جلدی، ہمارے پاس وقت نہیں بچا۔'' سوشیلا کو میں نے خود سے یہ کہتے سنا تو مجھے ایک خوشگوار سی حیرت ہوئی، اس کا حب الوطنی کا جذبہ نجانے کہاں عنقا ہو چکا تھا یا پھر کوئی اور بات تھی، بہرکیف جو کچھ بھی تھا، فوراً حرکت میں آنے کا متقاضی تھا۔

سوشیلا نے تب تک رینا کا سیل فون چھین کر ایک طرف اچھال دیا جو اس نے ٹھیک ہی کیا تھا کیونکہ اس میں ''لوکیشن میپ'' آن ہونے کا خطرہ موجود تھا۔ وہ رینا کو دبوچے کار کی طرف بڑھی، بلراج نے غراتے ہوئے زمین سے اٹھنے کی کوشش چاہی تھی کہ میں نے اسے اپنی جگہ محبوس رہنے کا درشت حکم دیا۔

''تم دونوں نہیں بچ سکتے...... بے بی کو چھوڑ دو۔'' وہ گرجا۔ میں نے طیش تلے ہونٹ بھینچ کر ایک لات اس کے پیٹ پر رسید کر دی اور وہ بری طرح کراہ کر رہ گیا پھر آناً فاناً ہم کار میں سوار ہوئے اور آگے بڑھ گئے۔

رینا اب ہمارے قبضے میں تھی۔ سوشیلا نے اسے گن پوائنٹ پر لے رکھا تھا۔ وہ اب بھی تھوڑا ہمت کیے ہوئے تھی اور سوشیلا کی ملکی حمیت کو جگانے کی کوشش میں لگی ہوئی تھی۔ سوشیلا نے اسے بُری طرح جھڑک دیا تھا۔

''کہاں چلنا ہے؟'' میں نے اسٹیئرنگ پر ہاتھ اور نظریں ونڈ اسکرین کے پار سامنے مرکوز رکھتے ہوئے سوشیلا سے پوچھا۔

''مہیش کی رہائش گاہ پر......'' سوشیلا نے بدلے ہوئے لہجے میں کہا اور مجھے جیسے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ بے اختیار ہی میرے منہ سے نکلا۔

''واٹ......؟ تم پاگل ہوگئی ہو؟''

ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ میری گدی سے پستول کی سرد نال آ لگی...... ساتھ ہی سوشیلا کی پھنکارتی ہوئی زہریلی آواز اُبھری۔

''جو میں نے کہا ہے وہی کرو...... ورنہ تمہاری گردن میں سوراخ کردوں گی......''

خونی رشتوں کی خود غرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN

www.paksociety.com

مسافت گذیدہ

زویا اعجاز

زندگی کا سفر کیسے اور کب بیت جاتا ہے... اس کا اندازہ وقت کی گردشیں تمام ہونے کے بعد ہوتا ہے... اور کسی کو تو تب بھی نہیں ہوتا... سود و زیاں کے احساس سے ناآشنا... کیا کھویا... کیا پایا... ایک ایسے شخص کی مسافت گذیدگی...... جو دولت کے ڈھیر پر فخر و غرور سے بیٹھا تھا... اور اس غلط فہمی میں مبتلا تھا کہ سونے کی ہر وہ ڈلی جو جمع کی ہے... اس سے ایک ایسا غیر مرئی رشتہ ہے جو... دوسرے افراد کے خیالوں اور خواہشوں کو اس کے خیالات اور خواہشات سے مربوط کرتا ہے... عظمت، فتح مندی اور عظیم فاتح کی حیثیت سے زندگی پر حکمرانی کرنے والے تہی داماں کا دلوں کو مسمار کرتا شاہکار پارہ...

تقسیم ہند سے پہلے اور اس کے بعد وقوع پذیر حالات و واقعات کی حقیقی تصویر کشی

دہلی کے مالوائی محلے میں روایتی طرزِ تعمیر کا تمام تر حُسن سمیٹے اس حویلی کی شان اور کروفر آج بھی دیکھنے والے کو مبہوت و مسحور کر دیتے تھے۔ حویلی کا اندرونی حصہ معمولی سی تبدیلیوں کے ساتھ مغلیہ طرزِ تعمیر کا عکس معلوم ہوتا تھا۔ کمروں میں بیش قیمت قدیم طرز کے غالیچے، فانوس اور فرنیچر نے اسے ایک ''اینٹیک'' بنا رکھا تھا۔ اس حویلی کی سب سے بڑی خواب گاہ کی شان تو اور بھی نرالی تھی دنیا کے ہر ملک سے منگوائے گئے قدیم ترین نوادر اور بہترین سجاوٹ سے مزین یہ

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

کمرا دیکھنے والی ہر آنکھ کو خیرہ کرتا تھا۔ اس عجائب خانہ نما کمرے میں اس وقت صرف ایک انسانی وجود موجود تھا۔ منقش مسہری پہ نیم دراز ایک مفلوج بوڑھا خالی نظروں سے چھت کو تک رہا تھا۔ خاموشی اور بے چینی اس کے وجود سے مکمل طور پر مترشح تھی۔ اس کی جسمانی حالت گو کافی خستہ تھی لیکن اس کے چہرے پر دم خم اور وقار جوں کا توں برقرار تھا۔ وہ کسی گہری سوچ اور اضطراب کا شکار دکھائی دے رہا تھا۔ چند دنوں سے اسے حویلی میں کسی بے عنوان اضطراب کا کہر چھایا محسوس ہو رہا تھا۔ اسے بخوبی علم تھا کہ اس کی بیماری اور جسمانی حالت کے پیشِ نظر اسے گھریلو معاملات سے دور رکھا جاتا ہے تاہم زمانے کے سرد و گرم سے آگاہ اس کا ذہن مکمل طور پر بیدار اور چوکنا رہتا تھا۔ عمیق نگاہیں آج بھی معمولی سی تبدیلی فوری بھانپ لیتی تھیں۔ اس کی نگاہوں میں آج ایک پیاس موجزن دکھائی دے رہی تھی۔ دو دن سے اسے اپنا بیٹا بالکل دکھائی نہ دیا تھا۔ وہ بار بار دیوار گیر گھڑیال کی طرف دیکھتا اور منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا کر خاموش ہو جاتا۔

☆☆☆

''انیس بیٹا! اٹھ بھی جاؤ اب۔ کیا مُردوں سے شرط لگا کے سوتے ہو برخوردار؟'' ایک خلیق آواز اس کی سماعت میں پڑی تو اس نے منہ بناتے ہوئے لحاف سے سر نکالا۔ اس کے والد اپنی مخصوص مسکراہٹ اور آنکھوں میں بے تحاشا محبت سموئے سامنے کھڑے تھے۔ سات سالہ انیس بیزاری سے لحاف اتار کر مسہری سے اترا اور پاؤں پٹختا ہوا کمرے سے باہر چل دیا۔ منیب احمد دکھ اور تاسف سے اسے جاتے دیکھتے رہے۔

انیس احمد ان کا اکلوتا بیٹا تھا جس کی پیدائش کے وقت کسی اندرونی پیچیدگی کے باعث ان کی اہلیہ داعیِ اجل کو لبیک کہہ گئی تھیں۔ منیب احمد نے بیٹے کو بہت ناز و نعم میں پالا تھا۔ اس کی ہر خواہش پوری کی جاتی تھی تاہم مذہبی فرائض میں وہ اسے کوئی رعایت دینے کو تیار نہ تھے۔ بیسویں صدی کی تیسری دہائی اپنے اختتام کی جانب گامزن تھی۔ اقتدار میں ایک نامحسوس تبدیلی در آئی تھی لیکن منیب احمد کا گھرانا ابھی ان تبدیلیوں کی زد میں نہ آیا تھا۔ وہ اپنی آبائی حویلی میں چھوٹے بھائی مبین احمد کے ساتھ رہائش پذیر تھے۔ مبین کے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی جو انیس کے ٹھیکرے کی مانگ تھی۔ دہلی کے بازار میں ان کی مشہور صرافہ کی دکان تھی۔ وہ اس کاروبار سے پشتوں سے منسلک تھے۔ زندگی بہت سہل انداز میں رواں دواں تھی لیکن انیس احمد کا ضدی رویہ انہیں کبھی کبھی بہت ہلکان کر دیتا تھا۔ وہ ایک بہت مشکل نفسیات کا حامل بچہ تھا جس کی بات کو رد کرنا ایک طوفان کو مدعو کرنا تھا۔

''چلیں بھائی جان؟ جماعت کا وقت گزر رہا ہے۔'' مبین احمد کی آواز نے انہیں یک دم چونکا دیا۔

''ہاں، چلو۔'' وہ ایک ٹھنڈی آہ بھر کے بولے۔

انیس چہرے پر بیزاری طاری کیے ہمراہ تھا۔ اس کے دونوں چچازاد بھی سر پہ ٹوپی جمائے نماز کے لیے تیار تھے۔ ان کے بشرے سے جھلکتی طمانیت اور خشوع نے منیب احمد کے دل میں ایک کسک پیدا کر دی تھی۔ نماز کی ادائیگی کے بعد مولانا صاحب نے انہیں روک لیا۔ انہیں انیس سے ڈھیروں شکایتیں تھیں جو ابھی تک ناظرہ کے اسباق ہی مکمل نہ کر پایا تھا۔ آئے دن مدرسے سے غیر حاضر رہتا تھا۔ منیب احمد کے خاندان کو پرکھوں کے وقت سے حفاظِ قرآن ہونے کی سعادت حاصل تھی لیکن اب لگتا تھا یہ لڑی مربوط نہ رہ پائے گی۔ واپسی پر انہوں نے بہت نرمی سے اس سے استفسار کیا۔

''انیس بیٹا! آپ باقاعدگی کیوں نہیں اختیار کرتے مدرسے میں۔'' وہ اس کے بال سہلا کر بولے۔

''میرا دل نہیں چاہتا بابا جان۔'' وہ اکھڑ انداز میں گویا ہوا۔

''دل کیوں نہیں چاہتا بھئی؟ اب دیکھو ناں نعمان اور سبحان بھی تو ہیں، کتنے شوق سے پڑھتے ہیں وہ۔ ان کا ناظرہ مکمل ہو چلا ہے۔''

''ان کی بات نہ کیجیے بابا جان! مجھے ان میں کوئی دلچسپی نہیں۔'' وہ منہ بنا کر بولا۔

''پھر کس چیز میں دلچسپی ہے؟'' وہ پچکار کر بولے۔

''وہ پنچھی دیکھ رہے ہیں آپ بابا جان؟'' انیس آسمان کی طرف انگشتِ شہادت کر کے بولا۔ ''میں ان جیسا بننا چاہتا ہوں۔''

''آپ اشرف المخلوقات ہو بیٹا! پرندے تو آپ کے تابع ہیں۔ پھر آپ ان جیسے کیوں بننا چاہتے ہیں؟'' وہ تحمل سے بولے۔

''بس مجھے نہیں معلوم۔ مجھے وہی پسند ہیں۔''

''اگر آپ کو وہ پسند ہیں تو ہم اپنے بیٹے کو ڈھیر سارے پرندے لا دیں گے لیکن پھر آپ کو مدرسے میں باقاعدگی سے جانا پڑے گا۔''

''مجھے نہیں کرنا حفظ۔ مولانا صاحب بہت سختی کرتے ہیں سب پہ۔ مجھے نہیں پسند وہاں جانا۔'' وہ ہونٹ چباتے ہوئے بولا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

''وہ آپ کی بہتری ہی کے لیے ڈانٹتے ہیں نا۔''

''نہیں! وہ ہر بات پر یہی کہتے ہیں۔ تم پہ خدا کی مار ہو انیس احمد! جہنم میں جلو گے اگر نہیں پڑھو گے تو۔ اور پھر وہ مرغا بنا دیتے ہیں۔ بس مجھے نہیں جانا وہاں۔'' وہ ضدی لہجے میں بولا۔

منیب احمد گہری سانس لے کر خاموش ہو گئے اور اسے سمجھانے کا ارادہ کچھ وقت کے لیے موخر کر دیا۔ دکان پر پہنچ کر بھی وہ ہمہ وقت انیس ہی کے متعلق سوچتے اور خود کو دلا سے دیتے رہے کہ ابھی بچہ ہی تو ہے۔ سنبھل جائے گا آہستہ آہستہ۔

☆☆☆

انیس احمد کی من مانیاں وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی جا رہی تھیں۔ محلے کے لونڈے لپاڑوں کے ساتھ گلی ڈنڈا کھیلنا، پتنگ بازی اور کبوتر بازی اس کے محبوب مشاغل تھے۔ منیب احمد کو اس کی سرکشی کا دکھ اندر ہی اندر گھن کی طرح چاٹ رہا تھا۔ ان کی صحت روبہ زوال تھی۔ موسمی بخار کی لپیٹ میں آ کر وہ ایک روز خاموشی سے سانسوں کی ڈور منقطع کر گئے۔ انیس پر اس حادثے نے بہت منفی اثرات مرتب کیے۔ چچا کی محبت اور چچی کی شفقت کے باوجود وہ اپنی ذات میں ایک مہیب سناٹا اور خلا محسوس کرتا تھا۔ اس کے ذہن نے تبدیلیوں سے خائف ہونا شروع کر دیا۔ مبین احمد نے اکلوتے بھتیجے کی پرورش میں کوئی کسر... نہ رکھی۔ اسے حتی الامکان یتیمی کی کڑی دھوپ کی تپش سے محفوظ رکھا لیکن اس کی ضدی طبیعت پر قابو پانے میں وہ بھی یکسر ناکام رہے۔ کاروبار کی دہری ذمے داریوں نے انہیں بہت مصروف کر دیا تھا۔ بھائی کی وفات کے بعد اب وہ صحیح معنوں میں خود کو تنہا محسوس کرتے تھے۔ ان کے تینوں بچے عادات و اطوار کے معاملے میں انتہائی شائستہ تھے۔ لیکن انیس کا طرزِ حیات انہیں بہت کھلتا تھا۔ اس سے صرف ایک رشتہ تو تھا نہیں۔ اکلوتی بیٹی کی نسبت بھی تو ٹھہرائی جا چکی تھی اس سے۔ لہٰذا پریشانیوں کا بار بھی فزوں تر تھا۔ لیکن ایک وہ تھا، گیارہ سال کا ہو چکا تھا لیکن احساس نام کی شے ہی ناپید تھی۔ سارا دن گلیاں ناپتا۔ اس کے سبھی دوست غیر مسلم تھے جن کی سنگت میں اسے عجیب سا احساسِ برتری محسوس ہوتا تھا۔ اس کی زبان و بیان میں رونما ہوتی واضح تبدیلیاں بھی خاندانی اقدار و روایات سے متصادم تھیں۔

☆☆☆

''کیا بات ہے رے انیس! تو اسکول نہیں گیا آج؟''

موہن داس نے اسے ایک دکان کے چبوترے پر بیٹھا دیکھ کر حیرانی سے پوچھا۔

''نہیں گیا۔ تجھے کوئی مسئلہ ہے۔'' وہ رکھائی سے بولا۔

''نہیں رے! مجھے کیا مسئلہ ہونا ہے بھلا؟'' موہن بے پروائی سے بولا۔

''ہاں سارے مسئلے تو میرے ساتھ ہی ہیں بس۔'' اس کا چڑچڑاپن عروج پر تھا۔

''مگر ہوا کیا ہے؟ کچھ منہ سے بھی تو پھوٹ۔'' موہن نے بچپن کی بے تکلفی اور دوستی کے استحقاق سے کہا۔

''ہونہہ! ہونا کیا ہے؟ سمجھتے ہیں انیس احمد کو نماز، قرآن نہیں آتا تو بس اس سے بڑھ کر نکما ہی کوئی نہیں۔'' وہ کلس کر بولا اور حقیقت بھی یہی تھی کہ اسکول میں ہم جماعت لڑکوں کی مذہبی تعلیم میں برتری اسے ایک نفسیاتی دباؤ کا شکار رکھتی تھی۔ سونے پہ سہاگا چچازاد بھائیوں کی وہاں موجودگی، اساتذہ کا ان کے ساتھ ہمہ وقت موازنہ اور ساتھیوں کا خود پہ طنز و مزاح اس کی ہمالیہ سے بلند ترانا پہ بڑی کاری ضرب لگاتا تھا۔ اپنی کوتاہیوں کو وہ کبھی تسلیم نہیں کرتا تھا اور اب اسکول سے بھی بدظن ہوتا جا رہا تھا۔

''بس! اتنی سی بات پر انہوں نے تجھے نکما بنا ڈالا؟'' موہن الجھ کر بولا۔ ''ہمارے اسکول میں تو ہمیں گیتا اور رامائن کے یاد نہ ہونے سے کچھ بھی نہیں کہتے۔''

''ہائیں! کیا واقعی موہن؟''

''ہاں نا! ہمارے اسکول میں ہمیں کوئی نکما نہیں کہتا۔'' وہ معصومیت سے بولا۔

''ارے واہ موہن! تیری تو موجیں ہیں یار۔'' انیس حسرت سے بولا۔

''تو بھی آ جانا ہمارے اسکول میں۔ مل کر موجیں کریں گے۔'' موہن جیسے چٹخارہ لے کر بولا۔

انیس کے ذہن نے فوری طور پر آئندہ کا ایک لائحہ عمل ترتیب دے لیا۔ شام تک کا وقت اس نے گلی میں کنچے کھیلتے ہوئے صرف کیا اور مبین احمد کی واپسی پر اُن کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا۔

''مجھے بات کرنی ہے آپ سے...... ضروری۔'' وہ الفاظ چبا کر بولا۔

مبین احمد کی پیشانی پر بل پڑ گئے تاہم وہ تحمل سے گویا ہوئے۔ ''کر لیا برخوردار! ہم کہیں بھاگے تو نہیں جا رہے۔''

''میں اسکول نہیں جاؤں گا۔'' بالآخر بلی تھیلے سے باہر آ ہی گئی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

''لیکن کاہے کو؟'' وہ بھونچکا رہ گئے۔ ''پہلے مدرسہ چھوڑا اور اب اسکول بھی۔ آخر کرنا کیا چاہتے ہیں آپ انیس میاں؟''

''میں موہن اور روی کے اسکول جاؤں گا اب۔'' وہ بڑے سکون سے بولا۔

''وہ غیر مسلموں کا اسکول ہے بیٹا۔ آپ کا وہاں کیا کام بھلا؟''

''وہاں میرے سبھی دوست پڑھتے ہیں اور آپ نے مجھے وہاں نہ بھیجا..... تو میں کسی اور اسکول نہ جاؤں گا۔'' وہ پیر پٹختا وہاں سے چلا گیا۔ مبین احمد اس نئی افتاد پر سر تھام کر بیٹھ گئے۔

☆☆☆

اس رات مبین احمد بہت بے آرام اور ذہنی تناؤ کا شکار تھے، عائشہ بیگم سے ان کی پریشانی مخفی نہ تھی۔ انہیں مجازی خدا کی ذہنی حالت کا بخوبی اندازہ تھا بلکہ وہ تو دہرے عذاب کا شکار تھیں۔ انیس احمد کی شوریدہ سری انہیں مریم کے مستقبل سے بہت خائف کیے ہوئے تھی۔ اب بھی موقع غنیمت جان کر وہ دبے لفظوں میں بولیں: ''انیس میاں کی من مانیاں بڑھتی ہی چلی جا رہی ہیں جی۔ ان کی منہ زوری کو لگام کیونکر ڈالی جا سکے گی؟''

''ہنہ..... ہنہ! ہمیں بھی یہی فکر لاحق ہے، سختی ہم سے ممکن ہی نہیں۔ بھائی جان کی اکلوتی نشانی ہے۔ تند نگاہ سے دیکھتے ہوئے بھی کلیجا شق ہونے لگتا ہے۔'' وہ پُرسوچ انداز میں بولے۔

''آپ کی بات بجا لیکن ان کا مزاج یونہی سوا نیزے پر رہا تو مریم کا وجود کہیں جھلس نہ جائے..... وہ تو.....''

یکدم اہلیہ کی بات کاٹ کر وہ بولے۔ ''ایک بات واضح کر لیجیے بیگم!! میں بھائی جان کو دیے گئے قول سے انحراف ہرگز نہ کروں گا۔ رہی بات مریم کی تو یہ آپ کی ذمے داری ہے کہ اس کی تربیت انہی خطوط پر کریں۔ عورت کی فرمانبرداری اور نرم مزاجی سرکش سے سرکش مرد کا دل بھی موم کر دیا کرتی ہے۔'' ان کے اس دوٹوک انداز پر عائشہ بیگم دل مسوس کر رہ گئیں۔

☆☆☆

بنی نوع انسان جب اپنے نظریۂ حیات اور محور سے بھٹک جائے تو کوئی نہ کوئی دوسرا نظریہ اسے اپنے اندر ضم کرنے کے لیے کوشاں رہتا ہے۔ مبین احمد کو بھی قطعی اندازہ نہ تھا کہ انیس کی یہ ضد پوری کر کے وہ اسے گمراہی کا ایک نیا پروانہ تھما رہے ہیں۔ نئے اسکول میں وہ بے حد مسرور رہتا تھا۔ مذہبی معاملات سے اسے مکمل استثنا حاصل ہو چکا تھا۔ چچا کی خدا خوفی اور محبت کے باعث اسے روپے پیسے کی کبھی کوئی کمی نہ رہی تھی۔ اپنے دوستوں پر بے دریغ خرچ نے اسے کافی مقبول بنا دیا تھا۔ دوست احباب اس کا دم بھرتے تو اس کی انا کو عجیب سی تسکین ملتی۔ اسکول میں راگ رنگ اور موسیقی کا استعمال اسے بے حد بھاتا تھا۔ جب تمام بچے باآواز بلند ایک مخصوص لے اور ترنم سے

سارے جہاں سے اچھا، ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی، یہ گلستاں ہمارا

پڑھتے تھے تو اس کی رگوں میں خون پارے کی طرح مچلنے لگتا۔ رفتہ رفتہ یہ نغمہ اپنے مجازی معنوں میں اس کے وجود میں مکمل طور پر سرایت کر گیا۔

گھر میں اس کے وہی مشاغل جاری تھے۔ نعمان اور سبحان سے وہ بہت لیے دیے انداز میں رہتا تھا۔ ان کی تعلیمی قابلیت اس کے حسد وعناد میں اضافہ کرتی تھی۔ مریم کے لیے البتہ اس کے دل میں نرم گوشہ ضرور موجود تھا۔ ہر گزرتا دن اس کے التفات میں اضافہ کر رہا تھا لیکن اس التفات میں بھی ایک دھونس اور احساسِ برتری نمایاں تر تھی۔ مریم صوم وصلوٰۃ کی پابند ایک ذہین اور حساس لڑکی تھی جس کا اوڑھنا بچھونا ہی کتابیں تھیں۔ وہ انیس سے اپنی منگنی سے بخوبی واقف تھی اور اس آگاہی نے اس کی نازک سوچوں کو لہولہان کر دیا تھا۔

☆☆☆

عہدِ شباب کی آمد نے اس کے مزاج کو مزید درشت بنا دیا۔ اس کی سوچ اور خیالات میں ناقابلِ فہم کج روی پیدا ہو چکی تھی۔ بے مہار دوستیاں چونکہ مذہبی حدود وقیود سے مبرا تھیں لہٰذا زندگی عیاشیوں کی ایک نئی ڈگر پر چل پڑی۔ میٹرک کا امتحان اس نے مارے باندھے دیا... اور چچا کے سامنے ایک نیا مطالبہ پیش کر دیا:

''میرے حصے کا کاروبار کب کر رہے ہیں میرے حوالے آپ؟'' وہ یونہی یکدم پیروں تلے سے زمین کھینچا کرتا تھا۔

''وہ آپ ہی کا ہے انیس میاں۔ آپ چاہیں تو پڑھائی سے بچنے والا وقت میرے ساتھ گزار سکتے ہیں۔ اچھا ہے کاروباری رموز سے واقف ہو جائیں گے۔'' مبین احمد دل ہی دل میں خوش تھے کہ اسی بہانے وہ اپنے حلقہ احباب سے تو دور رہے گا۔

''پڑھائی..... ہونہہ۔'' وہ استہزائیہ انداز میں بولا۔ ''مجھے پڑھائی میں چنداں دلچسپی نہیں ہے چچا میاں۔ مجھے

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

کاروبار میں قدم جمانے ہیں۔ اور شادی کی بھی تیاری رکھیے بس۔"

"انیس میاں! پڑھائی بے حد ضروری ہے۔ کاروبار آپ ہی کا ہے لیکن زندگی کے فیصلے یوں ہتھیلی پہ سرسوں جما کے نہیں ہوتے برخوردار۔" ضبط کے مارے ان کا خون کنپٹیوں میں جوش مارنے لگا۔

"میری زندگی میں آپ کا عمل دخل بس یہیں تک محدود تھا چچا میاں۔ اب میں جانوں اور میرا کام جانے۔ بہتر ہے آپ اپنی راہ لیجیے۔" وہ انتہائی بدتمیزی سے گویا ہوا۔

"ہم نے کب دخل اندازی کی آپ کی زندگی میں انیس میاں؟ ہمیشہ ہی تو اپنی من مانی کرتے آئے ہیں آپ۔" وہ دکھ کی انتہا پر تھے۔

"تو اب کاہے کو بحث کر رہے ہیں۔ جایئے اپنا رستہ ناپیے۔" وہ جھٹکے سے اٹھ کر کمرے سے باہر چلا گیا اور مبین احمد سوچوں کے ایک لامتناہی سلسلے میں الجھے وہیں بیٹھے رہے۔

☆☆☆

زندگی کے تمام تر معاملات میں کھوٹا سکہ ثابت ہونے والے انیس احمد نے کاروباری معاملات اس قدر خوش اسلوبی سے سنبھالے کہ بھی واقف کار انگشت بدنداں تھے۔ حلقۂ احباب کی جانب سے بھی اسے بھرپور معاونت حاصل تھی۔ کاروباری دنیا میں قدم جماتے ہی اس کے مزاج کی فرعونیت حد سے سوا ہوگئی۔ اس کا نفس ایک سرکش گھوڑے کے مانند اسے سرپٹ دوڑائے چلا جا رہا تھا۔ شراب و کباب کے بعد اب شباب کی جولانیاں اسے ایک نئے جہان کی تسخیر کی طرف مائل کر رہی تھیں۔ شہر کا وہ کونسا بالاخانہ تھا جہاں اس کے قدم نہ پڑے ہوں۔ مبین احمد سے اس کی یہ سرگرمیاں پوشیدہ نہ تھیں۔ وہ اپنے مرحوم بھائی کو دیئے گئے قول کو نبھانے کی جان توڑ کوشش کرتے لیکن اب دونوں بیٹے بھی ڈھکے چھپے الفاظ میں اس رشتے سے انکار کے لیے مصر تھے۔ وہ اپنی اکلوتی بہن کے لیے انیس احمد جیسی آنکھوں دیکھی مکھی نگلنے کو قطعی راضی نہ تھے۔ لیکن مبین احمد شاید اب بھی کسی معجزے کے منتظر تھے۔

☆☆☆

تبدیلیوں سے خائف انیس احمد کا ملک اس وقت بہت بڑی تبدیلی کی زد میں تھا۔ سن چھیالیس کے انتخابات کے بعد فضائیں اجنبیت کا لبادہ اوڑھ ہی چکی تھیں اب قرائن بتا رہے تھے کہ وائسرائے کی آمد ایک بہت بڑے طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہونے والی تھی۔ لیکن وہ تقسیم کے اس تمام تر عمل کے اسباب و اثرات سے جذباتی طور پر کوسوں دور تھا اور اسے ایک احمقانہ اور بچکانہ فیصلہ قرار دیتا تھا۔ نفرتوں اور وحشتوں بھری اس فضا میں انیس کا حلقۂ احباب حیرت انگیز طور پر اس کے ساتھ بہت مخلص تھا۔ ہندو دوست اس کا دم بھرتے نظر آتے تھے اور اس کی متوقع ہجرت سے قدرے اداس بھی دکھائی دیتے تھے۔ اس دن ایک محفل میں موہن داس بے اختیار کہہ اٹھا:

"یارو! اب کہاں رہیں گی یہ رونقیں؟ کوئی دم کے مہمان ہیں ہمارے انیس بابو اب تو ہمارے پاس۔" وہ ٹھنڈی آہیں بھرتے ہوئے بولا۔

"کیوں رے! کیا موت کا فرشتہ میرے مرنے کی خبر دے گیا تجھے؟" انیس تیکھے چتونوں سے اسے دیکھ کر بولا۔

"مریں تمہارے دشمن انیس بابو! بھئی اب تم اپنے نئے ملک چلے جاؤ گے تو ہم بے چارے تمہیں کہاں یاد رہیں گے؟" وہ دل گرفتگی سے بولا۔

"لو بھلا یہ بھی کوئی طریقہ ہے! صدیوں سے اکٹھے رہنے والے عوام کو بھیڑ بکریوں کی طرح ہنکا کر الگ الگ کر دو۔ ہم کوئی ریوڑ ہیں کیا؟ اپنی مرضی کے مالک ہیں۔ کیوں چھوڑیں اپنا گھر، اپنی زمین۔" اس نے غراتے ہوئے کہا۔

"سولہ آنے درست کہہ رہت انیس بابو! لیکن تہار گھر میں تو کوئی اور ہی کہانی چل رہت ہے۔" کالی چرن نشے میں سرخ آنکھیں گھماتے ہوئے بولا۔ "تہار چچا کے لونڈے تو جناح کے ہر جلسے میں پہنچے ہووت ہیں۔ ان کی لگام بھی تو کس کے رکھو۔ ای نہ ہو کسی روج تہار کو چونا لگائی کے چلے جائیں پاکستان۔"

انیس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اس کا جلال عروج پر تھا۔ گھر پہنچتے ہی اس نے نعمان اور سبحان کو کٹہرے میں لاکھڑا کیا اور ان کے خوب لتے لیے۔

"یہاں تمہیں کس چیز کی کمی ہے آخر؟ کیوں اپنا مستقبل داؤ پہ لگا رہے ہو؟" اس کی دہاڑ ناقابلِ برداشت تھی۔

"مستقبل یہاں کوئی ہے نہیں ہمارا بھائی جان! تو داؤ پر کیسے لگے گا؟" نعمان ضبط سے بولا۔

"یہ ہمارا ملک ہے بے عقلو! یہاں سے جا کے اپنی زندگیاں برباد کرو گے۔" وہ انتہائی تلملایا ہوا تھا۔

"عزت سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ہوتی بھائی جان! یہاں رہے تو غلامی کے طوق ہی میں رہیں گے۔ اور غلام کا کوئی مستقبل اور کوئی عزت نہیں ہوتی۔" سبحان پہلی بار اس گفتگو کا حصہ بنا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

"اپنی چھت، اپنا روزگار چھوڑ کے جانا چاہتے ہو تم لوگ؟ اور کس کے پیچھے۔ ایک وہ جو انگریزی لباس پہنے، سگار تھامے انگریزی بابو بنا پھرتا ہے اور دوسرا وہ جو نواب خاندان کا لونڈا ہے۔ انہیں کیا واسطہ تمہارے مستقبل سے۔ اپنے پیروں پر خود کلہاڑی مار رہے ہو جاہلو!"

"بس بھائی جان بس!" نعمان کا ضبط بھی چھلک اٹھا۔ "آپ کو کوئی حق نہیں، ان کے خلوص کی یوں تضحیک کریں۔ ہم اپنے وطن میں روکھی سوکھی کھا کر گزارا کر لیں گے لیکن یہاں بے عزتی اور غلامی میں زندگی بسر نہیں کر سکتے۔ لیکن یہ باتیں آپ کی سمجھ میں کہاں آئیں گی؟ آپ تو خود اپنے نفس کے غلام بنے جی رہے ہیں۔" اس نے تڑخ کر کہا۔

انیس احمد کی آنکھیں لہو چھلکانے لگیں۔ اس نے جھٹکے سے نعمان کا گریبان پکڑا اور پھنکارتے ہوئے بولا۔ "تمہاری یہ جرأت۔ اپنی حد سے بڑھ رہے ہو تم۔"

سبحان نے آگے بڑھ کر اسے پیچھے دھکیلا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ "حد سے آپ بڑھ رہے ہیں بھائی جان لیکن نہیں! حدود سے تو آپ واقف ہی نہیں پھر بھلا کیسے جانیں گے کہ کس چڑیا کا نام ہے یہ۔"

"ٹھیک ہے۔ تم لوگوں کو جہاں جانا ہے جاؤ۔ مگر مریم یہیں رہے گی۔ میرے عقد میں۔ یہ شادی آج ہی ہوگی۔" وہ کف اُڑاتے ہوئے بولا۔ اس کی کھولن کی اصل وجہ سامنے آ ہی گئی تھی۔

"بس کیجیے انیس احمد!" اسی پل کمرے کی کھڑکی کے عقب سے ایک مترنم آواز ابھری۔ "مجھے آپ کی بے ہنگم زندگی کا حصہ بننے میں پہلے بھی کوئی دلچسپی نہ تھی۔ مگر آج تو آپ نے حد ہی کر دی۔ سوچیے گا بھی مت کہ میں آپ سے عقد کر کے اس ملحد ملک میں رہوں گی۔ مجھے زہر پھانک لینا زیادہ سہل لگے گا۔" مریم کے لہجے میں چٹانوں کی سی سختی تھی۔

انیس کا وجود یکدم زلزلے کی زد میں آ گیا۔ اس کی انا کا بت بڑے زوردار دھماکے سے پاش پاش ہوا۔ "ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ زمین کے اس ٹکڑے کو مجھ پہ فوقیت دے رہے ہو تم لوگ۔ بلاؤ اپنے باپ کو اور اپنی دکان کا سودا مجھ سے کر کے جہاں مرضی جاؤ۔ میرے لیے مر گئے تم سبھی آج۔" وہ سرد لہجے میں کہتا وہاں سے چلا گیا۔

☆☆☆

تقسیم ہند سے جہاں کروڑوں لوگوں کی زندگی میں مثبت تبدیلیاں در آئی تھیں وہیں انیس کی زندگی میں ایک سفاکیت در آئی تھی۔ ظرف اور احساس تو خیر پہلے ہی اس میں ناپید تھے اب وہ وحشت و دیوانگی کا شکار ہو چلا تھا۔ مبین احمد کے حصے کا کاروبار اس نے اونے پونے داموں میں خرید لیا۔ اپنی زمانہ شناسی کی بدولت انہوں نے اعلانِ تقسیم سے پہلے ہی ہجرت کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا جو بعد ازاں بہت سود مند ثابت ہوا۔ کچھ خدشات کے پیش نظر انہوں نے انیس کو اپنی روانگی کا مصدقہ وقت و تاریخ بتانے سے گریز ہی کیا تھا۔ ورنہ اس کی خرد ماغی سے کچھ بعید نہ تھا کہ وہ انہیں نقصان پہنچانے کی غرض سے کوئی انتہائی قدم اٹھا لیتا۔ وہ چچا کا ادب و لحاظ بالکل فراموش کر چکا تھا۔ اس کی راتیں دہلی کے بالاخانوں میں شراب کے جام لنڈھاتے ہوئے گزرتی تھیں۔ اسی ایک تاریک رات میں وہ دکھی دل اور برستی آنکھوں کے ساتھ اپنی آبائی حویلی کو خیر باد کہہ گئے۔

غدر میں ہونے والا تاریخی قتل و غارت اس کے پتھر دل کو بالکل بھی موم نہ کر سکا۔ وہ تنفر اور حقارت سے ایک ہی بات کہتا: "اب اوکھلی میں سر دیا ہے تو موسلوں سے کیوں ڈرتے ہیں۔ مبلائیں اپنے ناخداؤں کو اور اپنے بیڑے پار لگوائیں۔"

اس کا حلقہ احباب اس موقع پر اس کے لیے بہت بڑی ڈھال ثابت ہوا تھا اور یوں انیس احمد کی زندگی کے ایک نئے باب کا آغاز ہوا......

☆☆☆

وقت کی سب سے بڑی خوبی اور خامی یہی ہوتی ہے کہ اس کا سفر ہمیشہ جاری رہتا ہے لیکن اس کے مسافروں کی کوتاہیاں اور غلطیاں زادِ راہ کے طور پر ہمیشہ ساتھ رہتی ہیں جن کا تاوان بعد ازاں یہ خوب وصولتا ہے۔ یہی وقت انیس احمد کا بے دام غلام بنا ہوا تھا۔ صرافہ بازار میں اس کی ساکھ بہت مضبوط ہو چکی تھی۔ انیس کی ازلی ہٹ دھرمی بھی اسے اپنی غلطیوں کا احساس ہونے ... نہ دیتی تھی۔ چچازاد بھائیوں کی باتیں اور مریم کے انکار نے اس کے وجود میں کانٹوں کی آبیاری کی تھی۔ اس کی مردانگی پہ لگا وہ زخم رفتہ رفتہ ناسور بنتا جا رہا تھا۔ اپنے فیصلے کی درستگی ثابت کرنے کے لیے اس نے اپنا وجود آتشِ انتقام میں جھونک دیا۔ تنہائی، منفی سوچوں اور منتقم مزاجی نے اس کے دل کو زہر آلود کر رکھا تھا۔ "پاکستان" یہ یک حرفی لفظ اس کے لیے ایک رقیب کی حیثیت رکھتا تھا۔

دونوں ممالک کے سیاسی حالات سنبھلتے ہی مبین احمد نے حویلی کے پتے پر اسے متعدد خطوط روانہ کیے لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ اپنے آخری خط میں انہوں نے بہت دکھ سے اسے مخاطب ہو کے لکھا تھا: "جانے آپ کیوں خفا ہوئے بیٹھے

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

ہیں انیس میاں! اپنے باپ جیسے بھائی کی رحلت کے بعد ہم نے ان کی آخری نشانی کو انہی جیسا پیار و شفقت دینے کی بھرپور کوشش کی لیکن وقت کے جانے کس لمحے ہم سے چوک ہوئی جو آپ ہم لوگوں سے اتنے دور ہوتے چلے گئے۔ دعا گو رہوں گا میرے بیٹے کہ اپنے اس آخری فیصلے پہ آپ کو بھی کوئی ملال نہ ہو۔ آپ بے خبر ہیں کہ اس وقت آپ تلوار کی دھار جیسے تیز دانتوں میں زبان کی طرح ہیں۔ یہ بوڑھا چچا دعا کرتا رہے گا کہ کلمے کی ڈور سے بندھے ہمارے پاکستان کی قدر و قیمت کا احساس آپ کو کسی بڑے زیاں سے پہلے ہی ہو جائے۔ سکھی رہو آباد رہو۔"

"ہونہہ!! یہ ڈھکوسلے مجھ پہ اثر نہ کریں گے بڑے میاں۔ میرا کوئی بھی فیصلہ کبھی غلط ثابت ہوا ہے نہ ہوگا۔" وہ سر جھٹک کر بڑبڑایا۔

لیل و نہار کی گردش جاری رہی۔ اس نے ضمنی کاروبار میں بھی قسمت آزمائی اور دھنی ثابت ہوا۔ اسلحہ سازی اور ٹیکسٹائل ملز میں بھی اگلے ڈیڑھ عشرے میں اس نے گراں قدر کامیابیاں سمیٹیں۔ جلد ہی اس کا شمار دہلی کے امرا میں ہونے لگا اور وہ سیٹھ انیس کہلانے لگا۔

شادی کی ضرورت اسے کبھی محسوس ہی نہ ہوتی تھی۔ سارا دن کاروباری سرگرمیوں میں مصروف رہنے کے بعد شامیں رنگینیوں میں بسر کرنا اس کا معمول تھا۔ وہ کئی کلبز کا اعزازی ممبر تھا۔ یہ معمول یونہی جاری رہتا اگر اس کے کاروباری حریف نجی محفلوں میں اس کی سونی زندگی کو مستقل موضوعِ گفتگو نہ بنا لیتے۔ دوست احباب بھی اکثر باتوں باتوں میں اسے چٹکیاں بھرتے۔

"اجی سیٹھ انیس! مغل تو اپنی خانہ آبادی کے لیے بہت اتاولے ہوا کرتے تھے پھر آپ نے وہ روایت کیوں نہ قائم رکھی۔"

"کرلیں گے شادی بھی۔ ایسی بھی کیا جلدی ہے؟" وہ ہونٹ بھینچ کر کہتا۔

"بھئی! لگتا ہے انیس میاں کی شادی کے ارمان بھی پاکستان ہجرت کر گئے ہیں۔ لوٹنا ناممکن ہی سمجھو۔" کوئی دوست لقمہ دیتا۔

وہ کبھی ہنس کر اور کبھی جوابی طنز کی صورت میں ادھار چکا دیا کرتا تھا تاہم اب وہ سنجیدگی سے گھر بسانے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ قرعہ فال دہلی کے مشہور تاجر کی بیٹی نورین کے نام نکلا جو آکسفورڈ کی تعلیم یافتہ اور اسی کی طرح "لبرل اور سیکولر" سوچ کی مالک تھی۔

شادی کے کچھ دن بعد ہی ہندوستانی افواج نے پاکستان پر شب خون مارا۔ یہ خبر اس کے لیے انتہائی پُرجوش تھی۔ وہ لاشعوری طور پہ اب بھی چچا کے خاندان کی گھٹنے ٹیکتی واپسی کا منتظر تھا۔ شادی کی خوشی میں حلقہ احباب کو دی گئی ضیافت میں پاکستان پر متوقع قبضہ ہی موضوعِ گفتگو رہا۔ کسی من چلے نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔ "بھارت ماتا کی وجے کے بعد اور کوئی فائدہ میں رہے نہ رہے، مبین احمد کا خاندان ضرور دھنی رہے گا۔"

وہ کیسے بھلا۔" سیٹھ گوپال نے استفسار کیا۔

"بھئی! ان کا بھتیجا جو موجود ہے یہاں۔ ان کی سہائتا ضرور کرے گا یہیں بس جائیں گے وہ پہلے کی طرح۔"

"نادان اور پگلے بچے جب غلطی کرتے ہیں تو انہیں کان سے پکڑ کر سزا دی جاتی ہے، انہیں مزید لاڈ پیار دے کر شہ نہیں دی جاتی۔ ان کی اصل جگہ دکھائی جاتی ہے۔" انیس نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ "ایسا وقت جب آئے گا تو پھر دنیا دیکھے گی کہ کیا ہوتا ہے؟"

لیکن کاتبِ تقدیر کی جانب سے دنیا کو کچھ اور ہی دکھانا مقصود تھا۔ "نادان بچوں" کی جانب سے ایک نہ بھولنے والا زخم بطور سوغات ملا تو تمام تر بلند و بانگ دعوے خاک میں مل گئے۔

☆☆☆

شادی کے بعد نورین نے اپنی معمول کی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ وہ شمعِ محفل تھی۔ خاتونِ خانہ جیسی محدود زندگی گزارنا اس کی سرشت ہی نہ تھی۔ ان کی پہلی اولاد باہمی رضامندی سے شادی کے پانچ سال بعد تولد ہوئی۔ رئیس احمد کی پیدائش پر انیس خوشی سے پھولا نہ سما رہا تھا۔ اس موقع پر اس نے جی بھر کر شراب و شباب کی محفلیں سجائیں۔ بیٹے کی آمد وہ اپنے لیے بہت خوش قسمتی گردانتا تھا کیونکہ اس کا "رقیب" دولخت ہو گیا تھا۔ یہ خبر اسے دلی طور پر سرشار کر گئی۔ اس نے ایک بہت بڑی ضیافت کا اہتمام کیا جس میں شراب پانی کی طرح بہائی گئی۔ انیس کی وحشت اسے بالکل ہی جامے سے باہر لے آئی تھی۔ وہ نشے میں مخمور شرکا سے باآواز بلند مخاطب ہو کر مغلظات بکنے لگا۔ ہاتھ میں پکڑا جام لہراتے ہوئے وہ لڑکھڑاتی آواز میں بولا؛

"میرا فیصلہ بالکل درست تھا۔ آج دیکھ لیا سب نے کہ اس سرزمین کو ٹھکرا کر جانے والے اپنا گھر ہی سنبھال نہیں پا رہے۔ بڑے آئے تھے انقلاب پرست۔ اب آئے گی عقل ان کو...... اب بھی نہیں آئے گی تو کب آئے گی؟" وہ دیوانہ وار

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

معیوب لگ رہا تھا۔

شرکائے محفل اسے استہزا اور تاسف کے ملے جلے ردِعمل سے دیکھتے اس کی ضیافت کے مزے اُڑاتے رہے۔ اس کی حالت زار اگلے کئی دن کاروباری حلقوں میں زبان زدِ عام رہی۔ خود کو عقلِ کل سمجھنے والا انیس احمد نادانستگی میں اپنی ذات کے مخفی گوشے طشت از بام کر چکا تھا۔

☆☆☆

اولاد کے معاملے میں وہ کافی خوش قسمت ثابت ہوا۔ رئیس احمد کی پیدائش کے بعد بالترتیب پانچ اور آٹھ سال بعد نفیس احمد اور مغیث احمد کی آمد نے اس کا خاندان مکمل کر دیا۔ خواہش کے باوجود وہ بیٹی جیسی رحمت سے محروم رہا تھا۔ ہر گزرتا سال کامیابیوں اور کامرانیوں کے نئے در وا کر رہا تھا۔ اولاد کا خمیر مکمل طور پر اپنے بیج جیسا تھا۔ ان کی پرورش و تربیت اور مذہبی خطوط کو حرفِ غلط کی طرح نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ سرزمینِ ہند کا تعلیمی نظام تو ویسے بھی ایشیائی ممالک میں ایک مسلّمہ حیثیت کا حامل تھا۔ ابتدائی تعلیم کے بعد انہیں بیرونِ ممالک میں بہترین اداروں میں داخل کروایا گیا۔ موروثی بے حسی کے ساتھ مغربی اقدار و روایات نے انہیں اچھا خاصا ''کندن'' بنا ڈالا تھا۔ شاندار اکیڈمک ریکارڈ کے علاوہ ان کی ''آف دی ریکارڈ'' سرگرمیاں کم عمری ہی سے عروج پہ تھیں۔ اس کے وجود میں افزائش پانے والا بغض، نفرت اور حسد اپنے اصل ماخذ سے کئی سو گنا ضرب پانے کے بعد دھیرے دھیرے تینوں بیٹوں میں منتقل ہو رہے تھے۔ اور حاصل ضرب کے طور پہ وہ بے حسی، خود غرضی اور نفس پرستی میں اپنی اپنی جگہ ایک کامل شاہکار ثابت ہونے والے تھے۔

☆☆☆

عملی زندگی کے آغاز کے بعد انیس احمد انتہائی ماہرانہ انداز میں ہندو مسلم فریقین میں توازن قائم رکھے ہوئے تھا۔ زندگی سہل انداز میں مہینوں اور سالوں کا سفر طے کرتی چلی جا رہی تھی لیکن اسے اپنے وجود میں جانے کیوں اب ایک خلا سا محسوس ہونے لگا تھا۔ ایک بے عنوان کسک اس کا دل کبھی کبھار بوجھل کرنے لگی تھی لیکن اولاد کی تعلیمی کامیابیاں دل بہلا دیا کرتی تھیں۔ اپنے ملک سے اس کا تمام تر خاندان بلاشبہ انتہائی حد تک وفادار اور مخلص تھا۔ اس نے اپنے ماضی کے تمام تر قصے بڑے فخر سے بیٹوں کے گوش گزار کیے تھے۔ وہ جب بھی کبھی چھٹیوں میں ایک ساتھ اکٹھے ہوتے تو مبین احمد کا خاندان لامحالہ طور پر زیرِ بحث آ ہی جایا کرتا تھا۔ پاکستان میں اپنے مبینہ کزنز کی موجودگی ان کے لیے کافی سنسنی خیز تھی۔ وہ اکثر انیس سے استفسار کیا کرتے تھے۔ ''ڈیڈ! کیا آپ نے ایک بار بھی ان لوگوں کو ٹریس نہیں کیا؟''

''مجھے اس کی ضرورت ہی کبھی محسوس نہیں ہوئی۔'' وہ سگار کا دھواں اُڑاتے ہوئے کہتا۔

''مگر ڈیڈ!! کیا وہ اب بھی وہیں رہائش پذیر ہوں گے جس ایڈریس سے آپ کو خطوط آتے تھے؟'' نفیس نے تجسس سے پوچھا۔

''مجھے کیا خبر۔'' وہ رعونت سے بولا۔ ''آخری خط میرے شملہ میں قیام کے دوران آیا تھا یہاں۔ کافی دن بعد پڑھا تو نعمان نے باپ کے انتقال کی خبر دی تھی۔'' اس کے سرسری انداز میں انسانیت کی کوئی رمق نہ تھی۔

''آپ کو جانا چاہیے تھا ایک بار وہاں۔'' نورین نے لقمہ دیا۔

''ارے ہٹاؤ بھی!! جئیں یا مریں۔ میرے لیے تبھی مر گئے تھے جب اس حویلی سے گئے تھے۔''

''پھر بھی پتا تو چلتا کہ کس حال میں ہیں وہ۔'' وہ نزاکت سے گویا ہوئی۔

''فرش پہ رینگ رہے ہوں گے۔ اُدھر کے حالات پتا تو ہیں آپ کو۔'' رئیس نے اپنا فتویٰ جاری کیا۔

''ڈیڈ! کیا خیال ہے کبھی چل کے دیکھیں ان سلمز slums کو۔'' مغیث کو ایک نیا ایڈونچر سوجھ رہا تھا۔

''کوئی ضرورت نہیں ان کے در پہ جانے کی مغیث!'' وہ گھُرکتے ہوئے بولا۔ ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا۔ مجھے ان کے دیش سے کوئی لینا دینا نہیں۔'' انیس کا لہجہ انتہائی سرد تھا لیکن ٹھکرائے جانے کی تپش آج بھی اسے جھلساتی تھی۔ وہ عم زاد بھائیوں اور مریم کی اونچی ناک اور خودداری کا سب سے بڑا شاہد تھا۔ اپنی اولاد کے سامنے وہ ان کے ہاتھوں کسی نئے ''زخم'' کا ہرگز متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ زندگی میں حکمتِ عملی کو ہمیشہ فوقیت دیتا تھا۔ لیکن وقت کی تلوار جب چلتی ہے تو انسانی ارادوں کے مضبوط سے مضبوط تر جال بھی جنبشِ نوک سے کٹ جایا کرتے ہیں۔

☆☆☆

''مام! آپ ہی بتائیں۔ کیا میں کچھ غلط کہہ رہا ہوں؟'' رئیس اکھڑ لہجے میں نورین سے مخاطب تھا۔ ڈرائنگ روم میں اس وقت وہ اپنی بیوی اور والدین کے ہمراہ موجود تھا۔

''نہیں، غلط تو کچھ نہیں کہہ رہے مگر......'' وہ متذبذب لہجے میں بولتی کن انکھیوں سے انیس کو دیکھنے لگی۔

اکیسویں صدی اپنی تمام تر حشر سامانیوں سمیت طلوع

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

ہو چکی تھی۔ اس کے دونوں بڑے بیٹے کاروبار میں مکمل طور پر معاون تھے۔ رئیس تیس کے عشرے میں موجود تھا۔ اور اب باپ سے اپنا کاروبار مستقل طور پر دوسری ریاستوں میں منتقل کرنے کے لیے مُصر تھا۔

''یہاں کیا مسئلہ ہے تمہیں آخر؟'' انیس جھنجلاہٹ کا شکار تھا۔

''ہمارے پاس پیسہ ہے ڈیڈ! ٹیلنٹ ہے، مواقع ہیں تو کیا اسے مزید کیش کروانا غلط ہے۔ آپ نے دہلی سے باہر بھی کیوں نہ قدم جمائے؟ اور یہ بھی تو سوچیں جتنا ہمارا کاروبار پھیلے گا اتنا ہی ہمارے دیش کو فائدہ ہوگا۔'' وہ انیس کی اس جذباتی کمزوری سے خوب واقف تھا۔

''ٹھیک ہے تمہاری بات بھی۔ مگر تم لوگ اتنی دور چلے جاؤ گے۔'' وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولا۔ وہ اب عمر کے اس حصے میں آچکا تھا کہ رشتے ناتے اس کی کمزوری بن چکے تھے۔

رئیس نے کوفت کے عالم میں اس کی بات کاٹ کر کہا: ''کم آن ڈیڈ! کیا ہوگیا ہے آپ کو؟ آپ جذبات سے کیسے سوچنے لگ گئے؟ اور دور بھیجنا آپ کے لیے کونسی نئی بات ہے؟ ہم کسی دوسرے دیش تو نہیں جا رہے۔''

انیس کی قوتِ ارادی اب کمزور ہوتی جا رہی تھی۔ نفرت اور انتقام کی یہ مسافت نامحسوس طریقے سے اس کی روح کا آزار بن چکی تھی۔ اس نے بادلِ ناخواستہ کاروبار میں اس کے تمام تر حصے سے اسے گجرات میں طلائی زیورات کا ایک شاندار شوروم بنوا دیا۔ رئیس اپنی بیوی اور دو کم عمر بچیوں کے ساتھ وہاں ذاتی بنگلا خرید کر منتقل ہوگیا۔ مگر انیس کو ایک محرومی و کسک کسی امربیل کی طرح اپنے وجود سے لپٹتی محسوس ہوتی تھی۔

''شاید میں واقعی اب بوڑھا ہو چلا ہوں۔ ہے نا نورین!'' تھکاوٹ اس کے ہر انداز سے عیاں تھی۔

''ایسی منفی باتیں سوچتے رہیں گے تو واقعی ہو جائیں گے۔'' وہ مسکرا کر اس کی وجیہہ شخصیت کو دیکھتے ہوئے بولی۔

انیس جواب میں صرف مسکرا کر رہ گیا۔ وہ آج بھی روزِ اول جتنا بے خبر تھا کہ دنیا ایک بازگشت ہے۔ جہاں ہر صدا پلٹ کر ماضی کے نقوش کو ضرور منعکس کرتی ہے۔

☆☆☆

رئیس کی منتقلی کے بعد نفیس نے بھی کاروبار میں خود مختاری کے لیے اصرار شروع کر دیا۔ انیس اولاد کی خودسری کے سامنے خود کو مکمل مجبور محسوس کرتا تھا۔ اس مرتبہ نورین بھی شوہر کی حامی تھی۔ لیکن جوان اولاد جب تناور درخت کے مانند تن کر کھڑی ہو جائے تو والدین بوڑھے اشجار کی طرح خزاں رسیدہ ہوتے چلے جاتے ہیں۔ نفیس کی خواہش کے مطابق اسلحہ سازی کا تمام تر کاروبار اس کے حوالے کر دیا گیا اور وہ اپنی خواب نگری ممبئی میں جا بسا...... رنگینیوں، روشنیوں اور خوبوں کا ایک تاریخی شہر۔

نورین روانگی سے قبل بیٹے کی شادی کرنے کی متمنی تھی لیکن وہ پابندِ سلاسل ہونے کا روادار نہیں تھا۔ مغیث لندن میں زیرِ تعلیم تھا۔ حویلی میں اب سناٹوں کا راج تھا۔ انیس اور نورین سماجی حلقہ احباب میں مگن رہنے کی بھرپور سعی کرتے لیکن یہ مصنوعی زندگی ان کے وجود میں عجیب سی خاموشی پیدا کر رہی تھی۔ اسے ماضی کے نقوش اور چچا کے خطوط بری طرح یاد آتے تھے۔ لیکن اب بھی اسے اپنی تمام تر مسافت پر فخر و غرور تھا۔ غرور نے تو ابلیس کو راندۂ درگاہ ٹھہرایا تھا تو کیا بشر کی بساط!

☆☆☆

کمرے میں تین نفوس کی موجودگی کے باوجود مکمل سناٹا غالب تھا۔ چند ثانیوں بعد ڈاکٹر مشرا نے گلا کھنکھارتے ہوئے کہا:

''ویل مسٹر انیس! میڈیکل سائنس میں ہم نے کئی چمتکار ہوتے دیکھے ہیں۔ آپ کی مسز کے کیس میں بھی ہم نراش نہیں ہیں ابھی۔'' اس کا انداز پروفیشنل تھا۔

وہ اس وقت دہلی کے نامور نیورو فزیشن کے سامنے موجود تھے۔ پچھلے کچھ ماہ سے وقفے وقفے سے جاری سر درد اور اعصابی کھنچاؤ اس قدر جان لیوا ٹیومر ثابت ہوگا، انہیں قطعی اندازہ نہ تھا۔

''کتنا وقت ہے میرے پاس ڈاکٹر؟'' نورین کا لہجہ ڈوب رہا تھا۔

''آپریشن کی صورت میں ایک سال سے زائد نہیں۔'' ڈاکٹر مشرا نے سپاٹ انداز میں کہا۔

''میں ہر صورت تمہارا بہترین علاج کرواؤں گا۔ دنیا کے بہترین ڈاکٹرز کی ٹیم لاکھڑی کروں گا۔ ڈونٹ یو وری۔'' انیس احمد چغتائی لہجے میں بولا اور اس نے اپنا قول نبھایا بھی۔ لیکن بہترین ڈاکٹرز کا جدید ترین علاج بھی نورین کی موت نہ ٹال سکا۔ بیٹوں نے ماں کے جنازے میں رسمی انداز میں شرکت کی اور بعد ازاں اپنی اپنی سرگرمیوں میں مشغول ہو گئے۔ رشتوں سے ایسی لاتعلقی بیج ہی کا تو خمیر تھا۔

☆☆☆

نورین کی وفات کے بعد انیس کے لیے کاروباری

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

سرگرمیوں میں مشغول ہونے کے سوا کوئی اور چارہ نہ تھا۔ دوست احباب اکثر ایک ہی مشورہ دیتے پائے جاتے تھے۔

''اکیلے کیسے رہیں گے سیٹھ صاحب! دوبارہ گھر بسا لیجیے۔''

''اب اس عمر میں کیا گھر بسانا بھئی۔'' وہ مسکرا کر ٹال دیتا۔''اب تو بیٹوں کا بیاہ کریں گے دھوم دھام سے۔''

''اور اس کے بعد؟ اس کے بعد کیا کریں گے بھلا؟ بیٹے اپنی زندگیوں میں مصروف ہوجائیں گے تو مزید تنہا ہوجائیں گے۔ اس سے پہلے ہی کچھ کرلیجیے۔''

''کہتے تو ٹھیک ہو بھئی۔ ڈھونڈتے ہیں پھر کوئی خوش نصیب جو ہماری زندگی کا حصہ بن سکے۔'' وہ ہلکے پھلکے انداز میں کہتا۔

''اجی! آپ کو ڈھونڈنے کی کیا ضرورت بھلا؟'' وہ مصنوعی حیرت سے آنکھیں پھیلا کر کہتے۔''آپ تو ایک اشارہ کیجیے بس۔ کچے دھاگے میں بندھے چلے آئیں گے سرکار۔''

انیس کا جوابی قہقہہ فلک شگاف ہوتا تھا۔ جلد ہی اس نے دوسری شادی کے انتظامات مکمل کرلیے لیکن بحر حیات اب اس پہ پہلے جیسا مہرباں نہ رہا تھا۔ اس نے جس فصل کی آبیاری بڑے اہتمام سے کی تھی، اس کی کٹائی کا موسم آچکا تھا۔

چھوٹے موٹے جھگڑے اور فسادات وہاں ایک معمول تھے۔ ان کے عوامل واسباب پر اس نے کبھی غور ہی نہ کیا تھا مگر اب تعصب کا عفریت اپنی خونخواری کے ساتھ نمودار ہوا اور اس کی دنیا تہ وبالا کرگیا۔ گجرات میں بھڑکنے والے آتشِ فسادات نے اس کا نشیمن بھی جلا ڈالا۔ انتہا پسندوں کی جانب سے رئیس احمد کے شوروم پر ایک منظم حملہ کیا گیا۔ حملے کے وقت وہ بغلی ریسٹ روم میں ایک سیلز گرل کے ساتھ دادِ عیش میں مصروف تھا۔ حملہ آوروں نے ریسٹ روم کا بیرونی قفل لگا کر خوب تسلی سے لوٹ مار کی اور دیگر ملازمین کو رسن بستہ کرنے کے بعد شوروم نذرِ آتش کردیا۔ بیٹے کی سوختہ لاش جب حویلی پہنچی تو انیس کو اپنا دل تیز، نکیلے پنجوں سے کھرچتا ہوا محسوس ہوا۔ تعزیتی کلمات بھی وہ غائب الدماغی سے سنتا رہا۔ اس کا ذہن ایک ہی نقطے پر مرکوز رہا۔

''یہ تو کہتے ہیں کہ ہزاروں مرے ہیں۔ مرے ہوں گے۔ ان کا اور ہمارا کیا جوڑ؟ وہ انیس احمد کی اولاد تو نہ تھے۔ فرق تو تھا ان میں اور میرے بیٹے میں...... میں تو ملک کے لیے سب کچھ کرتا آیا ہوں پھر اسے کیوں مارا؟ لُوٹ کر چلے جاتے۔ مارا کیوں؟'' اس کی سوچیں اور ذہن بہت منتشر تھے۔

☆☆☆

انتشار اب دھیرے دھیرے اس کی زندگی پر حاوی ہوتا جارہا تھا۔ بیوہ بہو اور یتیم پوتیوں کے چہرے اسے بے کل رکھتے تو دوسری طرف مستقبل قریب کے خدشات اسے ہولاتے تھے۔ بہو اگر اپنی زندگی کی نئی راہیں متعین کرلیتی تو پوتیوں کو باپ کا پیار ملنا کیونکر ممکن ہوتا؟ پھر کسی خیال کے تحت اس نے نفیس احمد کے سامنے جھولی پھیلا دی۔ وہ بھی باپ کی اس فرمائش پر ششدر رہ گیا اور بے رخی سے بولا۔

''آپ چاہتے ہیں کہ میں اپنی عمر سے بڑی عورت سے شادی کرلوں جو رشتے میں میری بھاوج رہ چکی ہے اور دو بچوں کی ماں بھی ہے۔''

''وہ بچیاں تمہاری بھی کچھ لگتی ہیں نفیس۔''

''تو میں کب انکار کررہا ہوں؟ میرا ان سے رشتہ اپنی جگہ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں ساری زندگی کے لیے ان کا ڈھول گلے میں لٹکا لوں۔''

''اس میں حرج ہی کیا ہے نفیس؟ یتیم بچیوں کو کیسے جانے دوں؟ باہر تو درندے کھلے گھومتے ہیں۔'' وہ ضبط کے آخری مراحل میں تھا۔

نفیس کی آنکھوں میں ایک چمک لہرائی اور قدرے توقف کے بعد بولا۔''میرا ایک مخصوص سوشل سرکل ہے ڈیڈ! میں وہاں اسما بھابی کو ساتھ لیے نہیں پھر سکتا۔ میری بھی کوئی ساکھ ہے معاشرے میں۔''

''تم چاہو تو اپنی مرضی سے بھی کرلینا بیاہ جہاں تم چاہو۔ میں نہیں روکوں گا تمہیں۔ اسما اور بچیاں یہیں رہ لیں گی۔'' انیس نے فی الفور کہا۔

''قائم رہیے گا اپنی اس بات پر ڈیڈ! اور مت بھولیے گا کہ میں آپ کے لیے بہت بڑی قربانی دے رہا ہوں۔'' اس کا انداز معنی خیز تھا۔

''نہیں بھولوں گا۔ کیونکہ میں جانتا ہوں...... تم بھولنے ہی نہ دو گے۔'' انیس کے لبوں پر ایک زخمی مسکراہٹ ابھری۔

''ان سے بھی تو پوچھ لیجیے۔ وہ راضی ہوں گی بھی یا نہیں'' وہ سرسری انداز میں کہہ کر موبائل فون کی طرف متوجہ ہوگیا۔ انیس احمد نے ایک گہری سانس بھر کے صوفے کی پشت سے سر لگا دیا۔ ابھی ایک اور پل صراط باقی تھا۔

☆☆☆

انیس نے ہزار ہا جتن کرکے اسما کو بھی شادی کے لیے راضی کر ہی لیا تھا۔ نفیس احمد کی پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

کڑاہی میں تھا۔ اسما جیسی پُرشباب عورت مالِ غنیمت کی طرح تو ملی ہی تھی، باپ پر بھی ایک نفسیاتی برتری حاصل ہو گئی تھی۔ وہ ممبئی کی ایک ماڈل کی زلفوں کا اسیر ہو چکا تھا۔ باپ کی لبرل سوچ سے اسے کوئی خدشہ تو نہ تھا لیکن مونیکا کی کچھ متنازعہ ویڈیوز نے ابھی اسے یہ راز طشت از بام کرنے سے محتاط کر رکھا تھا۔ اب موقع غنیمت جان کر اس نے باپ کا خوب استحصال کیا اور مونیکا سے شادی کر کے ممبئی کی رنگینیوں میں مکمل ڈوب گیا۔ انیس نے ایسا بے بس خود کو کبھی بھی نہ پایا تھا۔ مغیث کی تعلیم مکمل ہو چکی تھی۔ اس کی واپسی سے اس کے دل کو قدرے تقویت ملی۔ آنے والے چند سال اپنے جلو میں بہت سی تبدیلیاں سمیٹ لائے تھے۔ مغیث کی شادی اور دہلی میں سکونت کے فیصلے نے اسے سرشار کر دیا تھا۔ لیکن نفیس کی جانب سے اسے بہت اضطراب لاحق رہتا تھا۔ ملکی سیاسی افق پہ تبدیلیوں کے سحاب اور مسلم قوم کے ساتھ مجموعی برتاؤ اسے ہمہ وقت مبین احمد کے آخری خط کی یاد دلاتے۔ اندیشوں کے ناگ اس کے ذہن میں کنڈلی مارے ڈستے رہتے تھے۔ اس کے بارہا اصرار کے باوجود نفیس ممبئی کی ہنگامہ پرور زندگی چھوڑ کر واپسی کے لیے بالکل آمادہ نہ تھا۔

☆☆☆

اولاد کے مصائب کسی الہام کی صورت والدین پر ظاہر ہو جایا کرتے ہیں۔ انیس کے تمام تر خدشات بھی بالآخر ایک بھیانک وجود اختیار کر گئے۔

اسلحہ سازی کے... کاروبار کے آغاز سے قبل چند بھی خواہوں کے پُرخلوص مشوروں کو اس نے درخورِ اعتنا سمجھا ہی نہ تھا۔ انتقام کے عفریت نے ہوش و حواس مختل کر رکھے تھے۔ اس نے اپنے علاوہ اولاد کے لیے بھی ایک ایسا ایندھن خرید ڈالا تھا جس کی تپش آبلہ پائی میں مزید اضافہ کرنے کے لیے بھڑک اٹھی تھی۔

اکیسویں صدی کے آٹھویں سال کا اختتام ہندوستان کی تاریخ میں ایک نیا خونی باب رقم کر گیا تھا۔ ممبئی حملوں کے بعد اس نے بیٹے کی واپسی کے لیے مزید دباؤ ڈالنا شروع کر دیا۔ نفیس بھی اب سنجیدگی سے اثاثے سمیٹنے میں مصروف تھا۔ باپ اس کے فیصلے سے بہت خوش تھا۔ وہ روزانہ اسے فون کر کے اس کی کوششوں کا احوال دریافت کرتا۔ تبھی اچانک نفیس سے تمام روابط منقطع ہو گئے۔ اس کا فون مستقل آف رہنے لگا۔ رہائش گاہ کا فون بھی کوئی نہ اٹھاتا تھا۔ انیس کا دل کسی انہونی کی گواہی دے رہا تھا۔ اس نے فوری طور پر ممبئی کے لیے رختِ سفر باندھا تھا۔ وہاں پہنچ کر جو صورتِ حال اس کے سامنے آئی، اس نے گویا پیروں تلے سے زمین ہی نکال دی۔

”زندگی میں یہ دن بھی دیکھنا باقی تھا کیا؟“ اس نے خود کلامی کی۔

☆☆☆

”میرے بیٹے کو قربانی کا بکرا مت سمجھو آفیسر۔ وہ کسی گرے پڑے خاندان سے نہیں ہے جو تم لوگ اس کے ساتھ کچھ بھی کر گزرو۔“ وہ اس وقت ایک انڈین ایجنسی آفیسر کے سامنے بیٹھا تھا۔

”تمہارا بیٹا نردوش ہے۔ یہ تم کہہ رہے ہو مسٹر انیس! لیکن ہماری تحقیقات تو کچھ اور ہی کہانی سناتی ہیں۔“ امیش مہتا نامی اس کرخت صورت افسر نے درشتی سے کہا۔

”اوہ ریئلی! کیا کہتی ہیں آپ کی تحقیقات؟“ اس نے طنزیہ استفسار کیا۔

”اس کی پارٹیز میں مشکوک لوگوں کی آمد اور روابط پر ہماری نظر پہلے ہی تھی۔ اب بھی وہ یہاں سے شفٹ ہونے کے پروگرام بنائے بیٹھا تھا۔ یہ ٹائمنگ محض اتفاق نہیں تھی۔“

”یہ اتفاق ہی تھی مسٹر مہتا!“ انیس دوٹوک انداز میں بولا۔ ”میرے بیٹے کا ممبئی حملوں میں کوئی کردار نہیں۔“

”تو پھر تمہارے اس خاندان کا ہو گا جو پاکستان میں رہتا ہے۔“ اس کا ہوم ورک بھی مکمل تھا۔

”میرا یا میرے بیٹوں کا ان سے کوئی تعلق واسطہ نہیں آفیسر۔ تم بے پر کا کوا بنا رہے ہو۔“

امیش مہتا نے ایک زہریلا قہقہہ لگایا اور بولا: ”تمہیں لگتا ہے انڈین ایجنسیز گھاس چرتی ہیں؟“

”پہلے تو نہ لگا تھا کبھی۔ مگر اب کچھ یہی لگ رہا ہے۔“

امیش کی چندی آنکھوں میں طیش اور غضب کی ایک لہر اٹھی اور وہ سفاکی سے بولا: ”تم اس وقت صرف ہوم منسٹر سے تعلقات کی بنا پر میرے سامنے موجود ہو مسٹر انیس۔ ورنہ میں تو تمہارے بھی حلق سے اگلوا لوں اگلے پچھلے بھی کارنامے۔“

اتنی بے عزتی پہ انیس کاٹو تو لہو نہیں کے مصداق ساکت رہ گیا اور شرربار نظروں سے اسے دیکھتا ہوا وہاں سے اٹھ گیا۔

☆☆☆

اپنے تمام تر وسائل بروئے کار لانے کے بعد وہ انڈین ایجنسیز کے چنگل سے نفیس کو جس دشواری سے بازیاب کروا سکا، یہ ایک الگ ہی داستان ہے۔ اس کے دیرینہ حلقہ احباب نے بھی اس کی بھرپور معاونت کی۔ ایک رات کچھ خفیہ اہلکار ایک وین میں نفیس کو اس کی رہائش گاہ کے سامنے پھینک گئے۔ گیٹ کیپر ملازمین کے ہمراہ جب اسے اندر لائے تو

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

www.paksociety.com

انیس کو اس کی حالت دیکھ کے غش آنے لگے۔ اس کا خوبرو، صحت مند بیٹا اس وقت مدقوق ڈھانچا لگ رہا تھا۔ پچکے ہوئے گال، کٹا پھٹا جسم اور منہ سے ٹپکتی رال اس پہ برپا قیامت کا منہ بولتا احوال تھا۔ اس کی آنکھوں میں زندگی کی کوئی رمق نہ تھی اور سر مسلسل بائیں جانب جھکا ہوا تھا۔

اسے فوری طور پہ اسپتال منتقل کیا گیا۔ بہترین علاج معالجے کے باوجود اس کی حالت میں رتی بھر تبدیلی نہ آئی۔ ڈاکٹرز اب بالکل مایوس ہو چکے تھے۔ نازونعم میں پروردہ نفیس، جس نے زندگی میں کبھی کانٹا چبھنے کی تکلیف تک نہ سہی تھی، اس قدر وحشیانہ تشدد سہنے کے بعد اپنا دماغی توازن کھو بیٹھا تھا۔ صرف سانسوں کی آمدورفت ہی اس میں زندگی کی واحد علامت تھی۔ انیس دکھی دل سے اسے بیوی اور ایک بچی سمیت واپس لے آیا۔

☆☆☆

مونیکا کی حویلی میں آمد پر اسما نے بہت ناک بھوں چڑھائی لیکن اسے وہاں سے چلتا نہ کرسکی۔ پینتیس سے متجاوز مونیکا کافی عملی سوچ کی مالک تھی۔ اسے بخوبی علم تھا کہ ماڈلنگ اور فلم نگری میں اس کا وقت اب ''ایکسپائر'' ہو چکا ہے۔ بچی کے ساتھ اکیلی عورت کا مستقبل بھی اس کی زمانہ شناس نظروں سے اوجھل نہ تھا۔ لہٰذا اس نے شوہر کے ساتھ رہنے کا انتہائی دانشمندانہ فیصلہ کیا تھا۔ شوہر کی جائداد تک رسائی کا اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی تو نہ تھا۔

حویلی میں ایک ماتمی فضا کا راج تھا۔ نفیس کے لیے بہترین میل نرسز کا تقرر کر دیا گیا۔ انیس کے لیے یہ دکھ رئیس کی موت سے بھی کئی گنا زیادہ تھا۔ امیش مہتا کی الزام تراشیوں نے اس کے وجود میں ایک الاؤ دہکا دیا تھا۔ جس کی تپش جب حد سے سوا ہوتی تو وہ مبین احمد اور اس کے خاندان کے لیے مغلظات بکنے لگتا۔

''خود تو جانے کہاں مر کھپ گئے ہوں گے۔ مجھے اس عذاب میں مبتلا کر گئے۔ وہی ذمے دار ہیں نفیس کی اس حالت کے۔ انہی کے ملک کا تحفہ ہے یہ سب۔ کبھی خوش نہیں رہے ہوں گے وہ۔ اور نہ اب رہیں گے۔''

''بس کیجیے ڈیڈ! وہ ذمے دار نہیں ہیں اس سانحے کے۔ کیوں ہلکان کر رہے ہیں خود کو آپ؟'' مغیث سے رہا نہ گیا تو چڑچڑے پن سے بولا۔

''نہیں۔ وہی ہیں۔ تمہیں کچھ نہیں پتا۔''

''پتا ہے مجھے سب ڈیڈ! وہ بہت پُرسکون ہیں اپنی زندگیوں میں۔ ایک آپ ہی ہیں جو اُن سے بیر باندھے بیٹھے ہیں۔'' وہ بے پروائی سے بولا۔

انیس کا ذہن بھک سے اُڑ گیا۔ ''کیا؟ کیا کہا تم نے؟ تم کیسے جانتے ہو...... تم ملے اُن سے...... تت...... تت...... تم...... کہاں؟'' شدتِ حیرت اس کی ہکلاہٹ سے عیاں تھی۔

''ہاں۔ میں گیا تھا پاکستان؟'' وہ سکون سے بولا۔

''کب؟''

''چار سال پہلے۔ جب بھارتی کرکٹ ٹیم وہاں کے دورے پر تھی؟''

''لل...... لیکن تم تو لندن میں تھے تب...... اور وہاں کا ایڈریس کس نے دیا تمہیں......''

مغیث کے ذہن میں کچھ سال پہلے کی ایک سہانی شام تازہ ہو گئی۔

☆☆☆

مغیث فطری طور پر بہت تجسس پسند تھا۔ نت نئے کارنامے سرانجام دینا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ مبین احمد فیملی کے متعلق باپ کی شعلہ فشانیوں نے اس کے اندر بہت کھلبلی مچا رکھی تھی۔ وہ ہندوستان کی نئی نسل کا وہ نوجوان تھا جسے پاکستانی دنیا دریافت کرنے کا بہت شوق تھا۔ انیس احمد کے لاکر میں موجود پرانے خطوط پر موجود لاہور کا ایڈریس حاصل کرنا اس کے لیے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ وہ خطوط انیس احمد نے نفسیاتی تسکین کے لیے بھی ضائع نہ کیے تھے۔ چچا کی التجائیں اور تڑپ اسے بہت فرحت دیتی تھیں۔ اس کی اس ''بے احتیاطی'' نے مغیث کی راہیں مزید آسان کر دیں۔

لندن میں اس کے تمام تر دوست بھی اسی کی طرح ایڈونچر پسند تھے۔ ان دنوں بھارتی کرکٹ ٹیم پاکستان کے دورے پر تھی اور انہیں ایک میچ لاہور میں کھیلنا تھا۔ سمسٹر بریک کے سبب وہ بھی ان دنوں فارغ تھے لہٰذا انہوں نے اپنے ملٹی پل ویزوں سے استفادہ کرتے ہوئے میچ دیکھنے کا منصوبہ بنا لیا جو مغیث کے لیے نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوا۔

پاکستان آمد کے بعد اس نے وہ عسرت، بے اطمینانی و بے سکونی بہت تلاش کی جو ہندوستانی عوام کو ''دکھائی اور بتائی'' جاتی رہی تھی۔ لیکن بے سود۔ لوگوں میں ایک عجب شانِ بے نیازی، اطمینان اور سرشاری دیکھ کر وہ حیران ہونا بھی بھول گیا تھا۔ اسے لاہور اور دہلی ''دو بچھڑے بھائی'' لگ رہے تھے۔ موسم اور عمارات میں یکسانیت سے اسے کافی اپنائیت محسوس ہو رہی تھی۔ میچ ختم ہونے کے بعد اگلے دن وہ اپنے دوستوں سے بہانہ کر کے مبین احمد کے خاندان کی تلاش میں نکل پڑا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

قدرت بھی اس کا بھرپور ساتھ دے رہی تھی اور جلد ہی وہ لاہور کے ایک کشادہ اور صاف ستھرے علاقے میں پھولوں اور بیلوں سے ڈھکے ایک گھر کے سامنے موجود تھا۔ اطلاعی گھنٹی پہ ہاتھ رکھے وہ اپنی دھڑکنوں پہ قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا جب دائیں طرف سے کسی نے نرمی سے مخاطب کیا۔

''کس سے ملنا ہے آپ کو بیٹا؟''

اس نے چونک کر اس آواز کے ماخذ کی جانب دیکھا تو انیس احمد ہی کی عمر کے ایک شخص کو کھڑے پایا۔ سر پر ٹوپی جمائے وہ شاید مسجد سے لوٹا تھا۔ سنہری چشمے کے عقب سے جھانکتی ذہین آنکھوں کی بناوٹ اسے بے حد مانوس لگی۔ وہ بے اختیار بولا۔

''آپ شاید نعمان احمد ہیں۔''

اس بزرگ کے ہونٹوں پر ایک جاندار مسکراہٹ ابھری جس نے اس کے چہرے کو مزید روشن کر دیا تھا۔ ''میں سبحان احمد ہوں برخوردار۔ لیکن آپ بھی تو تعارف کروائیے اپنا۔ ہمیں تو حیران ہی کر دیا آپ نے؟'' وہ متبسم لہجے میں بولے۔

اس کے دوستانہ انداز اور شخصیت نے مغیث پر ایک خوشگوار اثر ڈالا اور وہ دھیرے سے بولا۔ ''انکل! میں...... مغیث احمد ہوں...... انیس احمد کا بیٹا۔''

سبحان کے چہرے پہ خوشی، حیرت اور تشکر کے اس قدر خوبصورت رنگ ابھرے کہ مغیث حیران رہ گیا۔ اس کا ہاتھ گرمجوشی سے تھامے سبحان احمد اسے اندر لے آئے۔ ایسا پُرتپاک استقبال اس کی سوچ اور تصور سے بالاتر تھا۔ گھر کا اندرونی حصہ بھی نہایت کشادہ اور صاف ستھرا تھا۔ وہ اسے ایک کمرے میں لے آئے جہاں نعمان احمد ایک کرسی پہ بیٹھے نماز کی ادائیگی میں مصروف تھے۔ مغیث کا تعارف ان کے لیے بھی کسی خوشگوار حیرت سے کم نہ تھا۔ انہوں نے فرطِ محبت سے اسے گلے لگا لیا۔

''بھائی جان کیسے ہیں مغیث بیٹا؟ وہ کیوں نہ آئے آپ کے ساتھ؟'' انہوں نے نم آواز میں پوچھا۔

''انہیں خبر ہی نہیں انکل کہ میں یہاں آیا ہوں۔'' وہ نظریں چرا کر بولا۔ ان کی والہانہ محبتیں اسے عجیب سی ندامت میں مبتلا کر رہی تھیں۔ اس کے جواب نے کچھ ثانیوں کے لیے فضا بوجھل کر دی پھر سبحان احمد ہلکے پھلکے انداز میں بولے۔

''ارے! یہ کیا آپ نے انکل کی رٹ لگا رکھی ہے؟ بھئی! ہم آپ کے چچا ہیں۔ آپ ہمیں اسی رشتے سے پکاریے نا؟''

مغیث نے اپنا دل یکلخت پگھلتا ہوا محسوس کیا۔ اس گھر کے درودیوار میں اسے سکون اور فرحت کی لہریں موجزن دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ لاشعوری انداز میں یہاں موجود ہر شے کا موازنہ اپنے گھر سے کرنے لگا۔

تھوڑی ہی دیر بعد ان دونوں بھائیوں کی اولادیں بھی اس سے بہت اخلاق اور محبت سے ملیں۔ وہ بھی مختلف شعبہ ہائے زندگی میں بہت کامیاب تھے۔ ان کی باہمی محبت اور ذہنی ہم آہنگی اس کے لیے بالکل انوکھی چیز تھی کیونکہ اس نے اپنے خاندان کو اس چیز سے قطعی ناآشنا پایا تھا۔ باتوں باتوں میں وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا۔ وہ دونوں بھائی آج بھی انیس سے آخری جھگڑے کی وجہ سے بہت ملول تھے۔

''وہ ہمیں جو مرضی کہا کرتے، ہم نے کبھی اُف نہ کی تھی لیکن اپنے قائدین کی ہرزہ سرائی ہم سے برداشت ہی نہ ہوئی اور وہ سب ہو گیا جو ہم نے کبھی تصور نہ کیا تھا۔'' نعمان نے دکھ سے بوجھل آواز میں کہا۔

''ابا جان آخری وقت تک اُن کے منتظر رہے۔ وہ ہم سے کہیں زیادہ اُن سے محبت کرتے تھے۔'' سبحان کے لہجے میں اپنے باپ کی محرومی اور دکھ کسک بن کر جھلکی تھی۔

''آپ کبھی آئے کیوں نہیں وہاں؟'' مغیث نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

''کیسے آتے؟ یہاں نئے سرے سے زندگی کا آغاز

مقصد

انگریزی کی کلاس میں استانی نے جان سے کہا کہ وہ ڈائریکٹ آبجیکٹ (براہِ راست مقصد ظاہر کرنے والا) کوئی فقرہ سنائے۔

جان نے کہا۔ ''مس! ہر شخص کا خیال ہے کہ آپ بہت خوب صورت ہیں۔''

استانی شرم سے گلابی ہو کر لمحہ بھر کے لیے ساری گرامر بھول گئی اور بولی۔ ''شکریہ جانی! بہت اچھا فقرہ ہے۔'' پھر پوچھا۔ ''یہ بتاؤ کہ اس میں براہِ راست مقصد کیا ہے۔''

''مس! اگلے ماہ کے رپورٹ کارڈ میں اچھے نمبر حاصل کرنا۔'' جانی نے معصومیت سے جواب دیا۔

بنگرام سے کاشف عبید کا جواب

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

آسان بہر حال نہ تھا لیکن صد شکر کہ پروردگار نے ہمیں سرخرو کیا اور بھائی جان کے مزاج کی وجہ سے ارادہ باندھنے کے باوجود ہمت ٹوٹ جاتی تھی لیکن بہت یاد آتا ہے دہلی، اپنا محلہ، اپنا گھر......اور۔''

''اور کیا چچا؟'' اس نے بے قراری سے پوچھا۔

''اور...... بھائی جان بھی بیٹا۔ کاش وہ بھی آجاتے جب ہم نے انہیں ابا جان کی وفات کی اطلاع دی تھی۔''

''انہیں آپ کا وہ خط بہت تاخیر سے ملا تھا۔'' اس نے باپ کے دفاع کی کمزور کوشش کی۔ ''انہوں نے خود بتایا تھا۔''

''چلیں ہمارے لیے یہی بہت ہے کہ ہم انہیں یاد تو ہیں۔'' وہ مسکرا کر بولے۔

مغیث ان کے لب و لہجے، شائستگی اور خلوص سے کافی متاثر ہو چلا تھا۔ وہ پاکستان میں اس کے بقیہ قیام کے لیے یہیں منتقلی کے لیے مُصر تھے لیکن اس نے سہولت سے ٹال دیا۔ تاہم وہ روز شام کا وقت ان کے گھر میں گزارنے لگا۔ مریم کو جب اس کی آمد کی اطلاع ملی تو وہ بھی اسے بہت محبت سے ملی۔ حویلی کا ذکر کرتے ہوئے وہ آبدیدہ ہوگئیں۔

''بہت یاد آتی ہے ہمیں حویلی اپنی۔ بچپن اور والدین کی بہت یادیں وابستہ ہیں وہاں۔''

مغیث کو یہ نرم خو، سادہ مزاج اور پاکیزہ اطوار خاتون بہت بھلی لگی تھی۔ اسے اپنے باپ کے بلاوجہ جواز پر آج بہت افسوس ہوا تھا۔ ان سب کے ساتھ پل بڑھ کر بھی وہ ہر اعتبار سے ان کا متضاد تھے۔ بہت سی سہانی یادیں اور تاسف سمیٹے وہ وہاں سے لوٹ آیا تھا۔ لندن سے دہلی آنے کے بعد اس نے گھر کے تمام تر افراد اور حویلی کی تصاویر کے البم لاہور بھیج دیے۔

''نعمان چچا، سبحان چچا اور مریم پھپھو کے لیے...... محبت اور خلوص کے ساتھ۔''

☆☆☆

''بہت غلط کیا ڈیڈ آپ نے! اپنے ساتھ بھی اور ان کے ساتھ بھی۔'' مغیث نے صم بکم کی عملی تفسیر بنے بیٹھے انیس سے کہا۔ ''وہ اس سلوک کے حقدار نہ تھے۔''

''تمہارا رابطہ ہے اب بھی اُن سے؟'' اس کی آواز کسی گہرے کنوئیں سے آتی محسوس ہوئی۔

''سوچا تو تھا کہ رکھوں گا لیکن پھر مصروفیت میں وقت ہی نہ ملا اتنا۔''

انیس کے لیے وہ وقت بہت کڑا تھا۔ دل کے نہاں خانوں میں موجزن خونی رشتوں کی محبت اسے ایک بار ملنے پہ مجبور کرتی تھی لیکن انا اور ضد کا دم خم آج بھی اس پر حاوی تھا۔ انڈین آفیسر کی جانب سے اپنی وفاداری پر شکوک نے اسے مزید ضدی اور کسی حد تک بزدل بنا دیا تھا۔ اسے چچا کے خاندان سے رابطہ کرنے میں خوف محسوس ہوتا تھا۔ بیٹے کی معذوری اور اپنی بے ثمر مسافت کا احساس اس کی روح کے ریشے ادھیڑتا تھا۔ ہمہ وقت اپنی سوچوں سے الجھتا اب وہ اپنی زندگی کے اس موڑ پر تھا جب ہر انسان اپنے اصل کی طرف لوٹنے لگتا ہے۔ نفرتوں کی اس مسافت نے اسے تھکاوٹ سے چور کر ڈالا تھا۔ اس کی سماعت میں باپ اور چچا کی شفیق آوازیں گونجا کرتیں تو کبھی کوئی بھولی بسری یاد اسے دنوں تک ملول رکھتی۔ بے چینی حد سے سوا ہوتی تو بچپن میں مولانا صاحب کے الفاظ یاد آتے جب وہ مدرسے کے تمام بچوں کو بار بار ایک ہی بات کہتے تھے۔

''دلوں کا سکون صرف اللہ کی یاد میں ہے۔''

اس کا نفع و نقصان میں الجھا ذہن اسے ایک نئی راہ سجھانے لگا۔ بغاوت کے سفر کا آغاز جس نکتہ سے کیا تھا اسی مقام سے دوبارہ وہ زندگی کا نیا آغاز کرلے تو کیا مضائقہ ہے؟ لیکن تقدیر اس کی تمام تر تدابیر پر دور کھڑی خندہ زن تھی۔ ابھی اس کے ذمے کئی حسابات واجب الادا تھے۔ ابھی تو کچھ اور تاوان بھی وصول ہونا باقی تھا۔

☆☆☆

حویلی کے اس آراستہ کمرے میں لیٹا انیس احمد ماضی کے دریچوں سے جھلکتی ان پرچھائیوں سے نظریں چرانے کی ناکام سعی میں ہلکان ہو رہا تھا۔ اردگرد پھیلے سناٹوں میں اسے کسی انہونی کی آہٹ واضح سنائی دینے لگی تھی۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے سرہانے لگی گھنٹی کا بٹن دبایا اور دباتا ہی چلا گیا۔ کچھ ہی لمحوں بعد اس کی بہو سر جھکائے کمرے میں داخل ہوئی۔

''کیا بات ہے روحی؟ اتنی خاموشی کیوں چھائی ہے؟ کہاں ہیں سب کے سب؟'' اس نے نحیف آواز میں پوچھا۔

''یہیں ہیں ڈیڈی جی سب۔ بس ذرا مصروف ہیں ناں تبھی آپ کو خاموشی محسوس ہو رہی ہے۔'' وہ نظریں چراتے ہوئے بولی۔

''مغیث کہاں ہے؟''

''وہ کولکتہ گئے ہوئے ہیں ضروری کام کے سلسلے میں۔ آجائیں گے ایک دو دن میں۔''

''اس کا فون بھی نہیں مل رہا۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

''میٹنگز میں مصروف ہوں گے تبھی آف کر دیا ہوگا۔''
''اچھا! ٹھیک ہے۔ اس کا کوئی فون آئے تو میری لازمی بات کروانا۔''
''جی بہتر'' وہ کمرے سے پلٹ گئی اور انیس کی ذہنی رو ایک بار پھر مغیث کی جانب مڑ گئی۔

☆☆☆

ان دنوں وہ قرآن ناظرہ کے بھولے بسرے اسباق دہرانے کی کوشش میں جتا رہتا تھا لیکن مقدس الفاظ کی ادائیگی اور تلفظ ایک دشوار ترین امر محسوس ہو رہا تھا۔ مغیث احمد کے بدلتے ہوئے تیور بھی اس کی عقابی نگاہوں سے اوجھل نہ تھے لیکن وہ شتر مرغ کی طرح ریت میں سر دبائے بالکل لاتعلق بن گیا تھا۔

وقت کچھ مزید آگے سرکا تو مغیث نے کاروبار مکمل طور پر اپنے تصرف میں کر لیا۔ وہ تا حال اولادِ نرینہ سے محروم تھا۔ اس کی تین بیٹیاں تھیں۔ پوتے کی شدید آرزو نے انیس کو ایک دائمی کسک میں مبتلا کر رکھا تھا۔ مغیث کے نفس کی شیطانیت ایک رات اسے مونیکا کے کمرے میں لے گئی۔ شراب کے نشے میں دھت اس نے مونیکا کی عزت پامال کر ڈالی۔ اس حادثے نے انیس کے فشارِ خون کا توازن بری طرح بگاڑ ڈالا اور وہ فالج کے حملے کا شکار ہو کر بستر جیسی بدترین محتاجی کا قیدی بن گیا۔ مونیکا کی منت سماجت کے بعد اس نے ان ماں بیٹی کو ایک الگ فلیٹ میں منتقل کر دیا۔ ورنہ وہ مغیث پر کیس کرنے کا مصمم ارادہ کیے ہوئے تھی۔ اسما کو بھی اب اپنی اور بچیوں کی عزت کے معاملے میں بہت سے تحفظات لاحق تھے۔ اس نے انیس کی ایک نہ مانی اور معذور شوہر کو چھوڑ کر بچیوں کے ساتھ اپنے بھائیوں کے گھر چلی گئی جنہوں نے بھانجیوں کے ......خرچوں کی تمام تر ''اصولی ذمے داری'' دادا کے سپرد کر دی۔

نصف صدی سے زائد کاروبار میں مشغول رہنے والے انیس کے لیے بستر کی قید بہت بڑی سزا تھی۔ جسم ناکارہ ہونے کے باوجود ذہن کسی آتش فشاں کے مانند کھولتا رہتا تھا۔ سارا دن یادوں کے جگنو چمکتے اور دل جلاتے۔ باپ کی بے لوث محبت، چچا کی شفقت، خطوط، ان کی صدائیں اور تڑپ بے طرح یاد آتیں، نعمان اور سبحان کو ایک بار گلے لگانے کے لیے خون جوش مارتا مگر کہیں کوئی مداوا نہیں تھا۔ کوئی امید بر نہ آتی تھی، کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔

☆☆☆

انیس کو اس وقت اپنا دل کسی شکنجے میں جکڑا محسوس ہو رہا تھا۔ ایک یاسیت، اضطراب اور سنسنی اس کی ذہنی حالت مزید ابتر کر رہی تھی۔ کمرے میں خاموشی وخدشات کا بے ہنگم رقص جاری تھا۔ قدیم گھڑیال کی ٹک ٹک اس کے ذہن پر ہتھوڑے برسا رہی تھی۔ یکایک اسے چیخ و پکار اور ماتمی آوازیں سنائی دیں۔ اس کا کلیجا دھک سے رہ گیا۔ سمع خراش آوازیں اس کے اعصاب پہ قیامت ڈھا رہی تھیں۔ اس نے دیوانوں کی طرح سرہانے لگی گھنٹی کا بٹن دبایا لیکن کوئی کمرے میں آکر ہی نہ دیا۔ وہ حلق پھاڑ پھاڑ کر ملازمین کو آوازیں دینے لگا مگر جواب ندارد۔ اپنی معذوری اسے بال نوچنے پر مجبور کر رہی تھی۔ اس کی آواز بالکل بیٹھ چلی تھی جب ایک ملازم ہانپتا کانپتا کمرے میں داخل ہوا۔

''کہاں مر گئے ہو سب کے سب حرام خورو؟ کب سے آوازیں دے رہا ہوں۔'' وہ پھنسی پھنسی آواز سے بولا۔ ''کیا ہنگامہ ہے یہ باہر؟''

ملازم لرزتے ہوئے بولا۔ ''مغیث صاحب کل جانوروں کی خریداری کے لیے خود منڈی گئے تھے۔ وہاں کچھ انتہا پسندوں نے گائے کی خریداری کرنے والوں پر فائرنگ کر دی۔ ان کے گارڈ تو موقع پر ہی دم توڑ گئے تھے...... اور......'' وہ کہتے ہوئے خاموش ہو گیا۔

''اور میرا بب...... بب...... بیٹا'' انیس نے ڈوبتے دل سے پوچھا۔

''وہ زخمی حالت میں اسپتال میں تھے۔ آج ان کا بھی انتقال ہو گیا۔ ابھی میت لائے ہیں گھر۔''

انیس گنگ تھا۔ اسے لگا حویلی اپنے درو دیوار سمیت اس کے وجود پر آگری ہے۔ یہ کیا ہو گیا۔ آج آخری سہارا بھی ختم ہو گیا۔ اسے یقین ہی نہ آرہا تھا کہ خود کو جس معاشرے کا حصہ ثابت کرنے کے لیے اس کی عمر کی نقدی ختم ہو گئی تھی، اسی معاشرے نے اس کی تمام سرمایہ کاری منوں مٹی تلے ابدی نیند سلا دی تھی۔ وہ دہاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ مبین احمد کے الفاظ کی قدر ہوئی بھی تو کب؟ جب وہ تہی داماں تھا اور نو عورتوں کی کفالت اپنے مفلوج وجود پر لاد بیٹھا تھا۔ وہ بلکتے ہوئے چچا کو پکارنے لگا۔ اسے سامنے دیوار پر اپنی ہی شبیہ نظر آنے لگی جو لہک لہک کر اسے کہہ رہی تھی۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی، یہ گلستاں ہمارا

کمرے میں موجود ہر شے اب انہی الفاظ کی نوحہ کنی کر رہی تھی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

بہروپیا

جمال دستی

اپنے اپنے وطن کی سلامتی کے لیے ہر وہ چیز جائز ہو جاتی ہے جو عام حالات میں ممکن نہیں ہو... یعنی محبت اور جنگ میں سب جائز ہے... اس نے بھی اسی مقولے پر عمل کیا تھا... اور وہ کچھ کر گزرا تھا... جو کسی طور ممکن نظر نہیں آتا تھا... آنکھوں کے سامنے ہوتے بھی وہ نظروں سے اوجھل تھا... عالمی طاقتیں کہلانے والی دو سپر مملکتوں کے ایجنٹوں کے گرد گھومتی پُراسرار... پیچیدہ اور گنجلک کہانی کے الجھے تانے بانے...

اس شخص کی معاملہ فہمی جسے کبھی ناکامی کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا......

دو انجن والے ایزٹیک نامی ہوائی جہاز نے ٹیک آف کیا تو ٹاور میں بیٹھا ائرکنٹرولر اس کی اڑان پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ وہ جہاز فضا میں بلند ہوتے ہوئے ایک نقطے کے مانند نظر آرہا تھا اور اس کا رخ شمال میں واقع پہاڑیوں کی جانب تھا۔ ٹھیک دو منٹ بعد ایک اسٹاف سارجنٹ کو کچھ گڑبڑ کا احساس ہوا۔ ایزٹیک کو اب تک زیادہ بلندی پر جا کر انقرہ کی سمت رخ کر لینا چاہیے تھا۔ اس نے پائلٹ سے رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوسکا۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

جہاز پہاڑیوں سے ٹکرا رہا تھا اور پائلٹ کسی ہدایت پر عمل نہیں کرسکتا تھا۔
''زیرو ون۔ جہاز کو قابو کرو۔'' لیکن یہ وارننگ رائگاں گئی۔ آخری لمحات میں ریڈیو پر ایک آواز گونجی۔
''مے ڈے۔ مے ڈے۔'' اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔
ریڈار پر نظر آنے والا نقطہ غائب ہو گیا اور سارجنٹ وحشت کے عالم میں ریڈار کو دیکھتا رہا۔

☆☆☆

میں نسلاً آئرش ہوں لیکن میرے آباؤ اجداد کافی عرصہ ساؤتھ ویلز میں مقیم رہے۔ اس لیے مجھ میں آئرش اور ویلش دونوں کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ جہاز کریش ہونے کے چوبیس گھنٹے بعد میں انقرہ سے انکرمیک پہنچا۔ جہاز سے اُترنے والا آخری مسافر پیری کوریس تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ وہ ہیڈ کوارٹر سے آنے والا سراغ رساں ہے لیکن اسے سادہ لباس میں دیکھ کر یقین ہو گیا کہ وہی پیری کوریس ہوسکتا ہے۔ اس نے سرمئی رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا جو اس کے متناسب جسم پر خوب جچ رہا تھا۔
میں نے اسے آواز دی تو وہ میری طرف متوجہ ہو گیا۔ تب میں نے غور سے اسے دیکھا۔ وہ تقریباً میری ہی عمر کا تھا۔ اس کا چہرہ صحیح سلامت تھا اور کہیں کوئی زخم کا نشان نظر نہیں آرہا تھا۔ اس نے مجھے حیرت سے دیکھا اور بولا۔
''تم سی آئی اے ایجنٹ جیک روگن ہو؟''
''میرے سوا اور کون ہوسکتا ہے۔'' میں نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''یہاں کچھ لوگ ہمارا انتظار کررہے ہیں۔ چلو، میرے پاس جیپ ہے۔''
''پہلے میں شیو نہ کرلوں؟''
''جہاز کے حادثے کے بعد کل سے کسی نے شیو نہیں کیا ہے۔ تم ان لوگوں میں بالکل فٹ نظر آؤ گے۔''
کوریس نے اپنا بیگ جیپ کی عقبی نشست پر رکھا اور میرے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ہم ایک ہموار سڑک پر آئے تو وہ بولا۔ ''انہوں نے مجھے تفصیل بتائے بغیر جہاز میں بٹھا دیا۔ بائی داوے یہ کونرز کون تھا؟''
میں نے اسے بتایا کہ کونرز ائرفورس میں میجر تھا جسے لیزن آفیسر کے طور پر سی آئی اے میں خدمات کی انجام دہی کے لیے بھیجا گیا تھا۔
''کیا اس کا تعلق یوٹو آپریشن سے تھا؟''
''تم یوٹو کے بارے میں کیا جانتے ہو؟'' میں نے اسے ترچھی نظر سے دیکھتے ہوئے کہا۔
''مجھے معلوم ہے کہ سی آئی اے کا اونچی اڑان والا یہ جہاز جاسوسی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔''
''واہ! یہ تو کسی میگزین کی کور اسٹوری معلوم ہوتی ہے۔'' میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔
''کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ طیارے روسی علاقے پر پرواز کرتے ہیں۔''
''لوگ اس سے بھی زیادہ سوچتے ہیں۔''
''کونرز کے ساتھ کیا مسئلہ تھا؟''
''وہ کسی کیبرے ڈانسر کے چکر میں پڑ گیا تھا۔ جب اس کی بیوی کو معلوم ہوا تو وہ نروس بریک ڈاؤن کا شکار ہو گئی۔ اس نے ماہرِ نفسیات کو یہی کہانی سنائی تھی۔''
''اگر کونرز نے بیوی سے بے وفائی کر کے کیبرے ڈانسر سے دل لگا لیا تو کیا اسے عالمی بحران کہا جا سکتا ہے؟''
''کونرز کو یوٹو مشن کے بارے میں معلومات تھیں جس کی وجہ سے محکمے میں اسے اونچا مقام مل گیا تھا۔''
''کوئی مقامی ایجنٹ بھی اس معاملے کو دیکھ سکتا تھا پھر مجھے یہاں کیوں بھیجا گیا؟''
''تم اس کھیل میں شکاری کتے کا کردار ادا کرسکتے ہو کیونکہ ایک دفعہ تمہارا سامنا سارجنٹ روستوف سے ہو چکا ہے۔''
''روستوف کا اس معاملے سے کیا تعلق ہوسکتا ہے؟''
''کچھ عرصہ پہلے ٹرکش نیشنل سیکیورٹی سروس نے انقرہ کی ایک بیلے ڈانسر کے بارے میں معلومات اکٹھا کی تھیں جو ایک روسی ایجنٹ سے ملا کرتی تھی۔ انہوں نے اس ڈانسر کو لیلیٰ ڈیمیر اور ایجنٹ کو سارجنٹ روستوف کے طور پر شناخت کیا۔ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ روسی ایجنٹ نے اس ڈانسر کو انقرہ سے ادانا منتقل ہونے کی ترغیب دی جہاں امریکی فضائی اڈا ہے اور وہیں سے سی آئی اے کے انتہائی خفیہ مشن کی مدد کی جاتی ہے۔ البتہ اس الزام کی تصدیق نہ ہو سکی۔ لہٰذا اس ڈانسر کو جانے دیا گیا جہاں وہ کونرز کی توجہ کا مرکز بن گئی۔''
کچھ دور آگے جانے کے بعد سی آئی اے کمپاؤنڈ نظر آنے لگا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں ایک بہت بڑا ہینگر تھا جہاں یوٹو طیارے کھڑے ہوئے تھے۔
''میں تین ہفتے کی چھٹی پر یونان جا رہا تھا اور میری ساری تیاری مکمل تھی۔'' کوریس نے شکوہ کرنے کے انداز میں کہا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

بریفنگ روم میں سی آئی اے اور فوجی افسر اس واقعے کی رپورٹ سن رہے تھے۔ ایک کرنل کے رینک کا افسر منہ میں سگار دبائے بیٹھا ہوا تھا، جسے جلانے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ وہ تھوڑا سا آگے کو جھکا اور وہاں موجود لوگوں کو سوالات کرنے کی دعوت دی۔

''جس جگہ حادثہ ہوا، وہاں سے کچھ سراغ ملا؟'' ایک سی آئی اے سپروائزر نے پوچھا۔

''وہاں کچھ بھی نہیں بچا۔'' کرنل نے جواب دیا۔ ''جس سے حادثے کی تفتیش کرنے والی ٹیم کو کوئی مدد ملتی۔''

''پھر یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ حادثہ فنی خرابی کے باعث پیش آیا، یا پائلٹ نے خودکشی کی؟''

''پہاڑی سے ٹکرانے سے پہلے کونرز نے مئی ڈے کا پیغام بھیجا تھا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے خودکشی نہیں کی۔''

میرے برابر میں بیٹھا ہوا کوریس بولا۔ ''معذرت کے ساتھ کرنل! یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ پائلٹ نے یہ پیغام اس لیے بھیجا ہو کہ یہ حادثہ نظر آئے کیونکہ خودکشی کی صورت میں اس کی بیوی تمام فوائد سے محروم ہو جاتی۔ یہ میرا اندازہ ہے لیکن ہم فرض کر لیتے ہیں کہ اس نے کسی سے سمجھوتا کیا اور اپنا کیریئر بچانے کے لیے اہم راز منتقل کر دیے۔ بعد میں اسے احساس ہوا کہ وہ خود بھی کسی وقت بلیک میل ہو سکتا ہے چنانچہ اس نے اپنی زندگی ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔''

میز کے گرد بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے کسی نے کوریس سے سارجنٹ روستوف کے بارے میں پوچھا تو وہ بولا ''میں نے کبھی اسے نہیں دیکھا۔ اس کا نام ایک ترکی مخبر سے بات چیت کے دوران سامنے آیا تھا۔ اس مخبر کے کہنے کے مطابق روستوف کا قد چھ فٹ سے ایک یا دو انچ کم ہے۔ مضبوط جسم اور عمر تقریباً پینتیس سال۔ اس میں اس کے علاوہ اور کوئی خوبی نہیں کہ وہ چالاک اور بہت ذہین ہے۔''

''کیا ترکش نیشنل سیکیورٹی سروس نے اس مخبر سے اس کے بارے میں پوچھ گچھ نہیں کی؟'' کرنل نے پوچھا۔

''مجھ سے بات کرنے کے چند گھنٹے بعد اس مخبر کا قتل ہو گیا۔ اگر ہم تمام واقعات کو جوڑیں تو لگتا ہے کہ روستوف ہی اس کا قاتل ہے۔''

میں اس کی بات پر یقین کر سکتا تھا۔ میری دراز میں سارجنٹ روستوف کی فائل ہے لیکن اس میں اس کی کوئی تصویر نہیں ہے اور اس کا پس منظر بھی اتنا دھندلا ہے کہ اس سے کچھ نتیجہ اخذ نہیں کیا جا سکتا۔ وہ کے جی بی میں لیفٹیننٹ کرنل تھا اور ایک زمانے میں ایک ایسے ایجنٹ کے طور پر کام کر چکا تھا جسے خفیہ ایجنسی کے نشانے پر آتے ہوئے لوگوں کو دور غلانے کی تربیت دی گئی ہو۔

کرنل نے اپنا گلا صاف کیا اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تم کیا کہتے ہو روگن؟''

''اس سے سوال سامنے آتا ہے کہ کیا روستوف نے لیلیٰ ڈیمیر کو کونرز سے سمجھوتا کرنے کے لیے استعمال کیا؟'' میں نے کہا۔ ''یہ جاننے کا ایک ہی راستہ ہے کہ اسے ایک اور ہدف دیا جائے جسے وہ اپنی زلفوں کا اسیر بنا سکے۔ وہ شخص اپنے آپ کو کونرز کے متبادل کے طور پر ظاہر کرے گا۔''

''تمہارے ذہن میں ایسا کوئی شخص ہے؟'' کرنل نے پوچھا۔

''ہم آفس آف اسپیشل انویسٹی گیشن کو کیوں نہیں استعمال کرتے۔'' میں نے کوریس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''تم یہ ذمے داری کیوں نہیں سنبھال لیتے روگن؟'' اس نے کہا۔ ''یہ تمہارا ہی آئیڈیا ہے۔''

''میں اس کیبرے میں جاتا رہتا ہوں جہاں وہ ڈانس کرتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہاں کا کوئی ویٹر مجھے جانتا ہو۔ اس کے علاوہ...'' میں نے طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اس کام کے لیے مجھ جیسے آئرش کی نہیں بلکہ کسی شریفانہ چہرے والے شخص کی ضرورت ہے۔ وہ تمہاری پیش قدمی کو نہیں ٹھکرا سکے گی۔''

''شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں۔'' کرنل نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے چہرے پر یہ نشان کیسا ہے؟''

''میرا بچپن اور جوانی ایسی جگہ گزری جہاں آئے دن ٹھگوں اور بدمعاشوں سے واسطہ پڑتا تھا۔ ایسی ہی ایک لڑائی میں میرے چہرے پر یہ زخم لگ گیا۔''

سب لوگوں نے میری طرف حیرت سے دیکھا۔ شاید انہیں یقین نہیں آیا کیونکہ میرا قد چھ فٹ، پانچ انچ اور مضبوط جسم ہے۔

''کیا تم نے ان سے بدلہ نہیں لیا؟'' کرنل نے پوچھا۔

''کیوں نہیں۔ آئرش لوگوں کی یہی خوبی ہے کہ وہ کسی کو معاف نہیں کرتے۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

یانی بار ایک چار دیواری کے اندر واقع تھا۔ احاطے
میں پتھروں کے راستے کے ساتھ میزیں لگی ہوئی تھیں اور سر
پر رنگین بلبوں کی جھالر لٹکی ہوئی تھی۔ جب میں پہنچا تو کافی
لوگ وہاں پہلے سے موجود تھے۔ میں نے کوریس کو دیکھا جو
اسٹیج کے ساتھ والی میز پر بیٹھا ہوا تھا۔ ایک اونچے پلیٹ
فارم پر چار سازندے مائیکروفون کے سامنے کوئی دھن بجا
رہے تھے جو دو اسپیکرز سے جڑا ہوا تھا۔ چند لڑکیاں مردوں
کے ساتھ ڈانس کر رہی تھیں۔ میں نے کوریس سے کافی
فاصلے پر ایک میز کا انتخاب کیا اور اپنے لیے بیئر منگوائی۔
جیسے ہی بیرے نے وہ مشروب میرے سامنے رکھا تو وہ دھن
ختم ہوگئی اور ان کے لیڈر نے مائیکروفون پر لیلیٰ ڈیمیر کی آمد
کا اعلان کیا۔ میں پہلے بھی اس کا رقص دیکھ چکا تھا۔ اس کا
ہیجان خیز جسم اور سیاہ بال، تماشائیوں کو مسحور کر دیتے تھے اور
یہ جان کر روستوف سے حسد ہونے لگتا کہ وہ کبھی اس کا
محبوب رہ چکا تھا۔

جیسے ہی وہ نمودار ہوئی، ہر طرف سے شور اور تالیوں
کی آواز گونجنے لگی۔ اس نے دونوں بازو اوپر اٹھائے
ہوئے تھے اور کولھے مٹکاتی روشنی کے ہالے میں رقص کر رہی
تھی۔ پھر وہ لہراتی ہوئی میزوں کے درمیان سے گزری۔
میں نے دیکھا کہ کوریس آگے کی طرف جھکا اور اشارے
سے اسے اپنی طرف متوجہ کرنے لگا۔ اس نے اپنی انگلیوں
میں ایک بڑا نوٹ پکڑا ہوا تھا۔ لیلیٰ نے اپنا راستہ بدلا اور
اس کے سامنے کھڑے ہو کر ناچنے لگی۔ کوریس نے اپنی جگہ
سے اٹھ کر وہ نوٹ اسے پکڑا دیا۔ رقاصہ کے چہرے پر
مسکراہٹ دوڑ گئی اور اس نے اپنی نظریں کوریس پر جما
دیں۔ کئی منٹ بعد موسیقی بند ہوگئی اور لیلیٰ بھی روشنی کے
ہالے سے باہر نکل گئی۔

بعد میں وہ سیاہ لباس میں نمودار ہوئی جو اس کے لمبے
بالوں سے میل کھا رہا تھا۔ اس نے اپنا ایک ہاتھ کولھے پر
رکھا ہوا تھا اور اس کی نظریں ہجوم کا جائزہ لیتی ہوئی کوریس پر
آکر ٹھہر گئیں۔ کوریس کا دیا ہوا نوٹ یقیناً زیادہ مالیت کا تھا
جس کی وجہ سے وہ اس کی جانب متوجہ ہوئی۔ پھر وہ بڑی ادا
سے آگے بڑھی اور اس کی میز پر آکر بیٹھ گئی۔

میں نے اپنے لیے ایک اور بیئر منگوائی۔ کوریس
اسے رجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے کوئی ایسی بات
کہی جس سے اس کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی پھر ان
کے درمیان نظروں کا تبادلہ ہوا اور وہ کچھ دیر بعد اس میز
سے اٹھ کر ایک پرائیویٹ کیبن میں چلے گئے۔ ایک بیرا
شیمپئن کی بوتل اور گلاس اس کیبن میں رکھ کر آگیا۔

کیبرے کا وقت ختم ہونے سے آدھ گھنٹے پہلے میں باہر
آگیا۔ جہاں ایک قطار میں گھوڑا گاڑیاں کھڑی ہوئی
تھیں جنھیں مقامی زبان میں ارابہ کہا جاتا ہے۔ میں
درختوں کے سائے میں چلتا ہوا جیپ تک گیا اور
ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد لوگ چھوٹی
ٹولیوں کی شکل میں کیبرے سے باہر آنا شروع ہوگئے۔
میں نے کوریس اور لیلیٰ کو ایک ارابہ میں سوار ہوتے
دیکھا۔ ان کے بیٹھتے ہی کوچوان نے دونوں گھوڑوں کی
باگیں ڈھیلی کیں۔ میں اسے جاتا ہوا دیکھتا رہا جب تک
کہ اس کے اطراف میں لگے ہوئے پیتل کے لیمپ
اندھیرے میں گم نہیں ہوگئے۔

میں ہوٹل کے کمرے میں کوریس کا بے چینی سے
انتظار کر رہا تھا۔ ٹیبل لیمپ کی مدھم روشنی دیواروں پر پڑ رہی
تھی اور میں بستر پر لیٹا چھت پر لگے پنکھے کو دیکھ رہا تھا اور
میرا ذہن روستوف میں الجھا ہوا تھا۔

سراغ رسانی کے اس کھیل میں ایک ہوشیار جاسوس کو
معلوم ہوتا ہے کہ ضرورت اور صبر میں کس طرح توازن
برقرار رکھا جائے۔ اسے دباؤ میں آکر پُرسکون رہنے، صفائی
سے جھوٹ بولنے اور ناخوشگوار انداز میں کسی کو مارنے کی
تربیت ہونی چاہیے۔ وہ اخلاقی قدروں کا لحاظ کیے بغیر کام
کرتا ہے جو اس کے ضمیر کے خلاف ہے۔ اسے کئی چیزوں
میں مہارت ہوتی ہے لیکن اس کا استعمال ایک آرٹ ہے۔
میں روستوف کے بارے میں بہت کم جانتا تھا اسی لیے اسے
خطرناک حریف تصور کر رہا تھا اور اب میری ساری توقعات
کوریس کے مشن سے وابستہ تھیں۔

رات تین بجے کے قریب اس کی واپسی ہوئی۔ جیسے
ہی اس نے کمرے میں قدم رکھا، میں بستر سے اٹھ کر بیٹھ گیا
اور بولا۔ ''اس کے ساتھ کیسا وقت گزرا؟''

''ہم نے دریا کے عقب میں واقع سڑک پر ارابہ
میں ہی موج مستی کرلی۔''

میں پہلے ہی اس کی آنکھوں میں نظر آنے والی چمک
اور چہرے سے پھوٹتی خوشی سے اندازہ لگا چکا تھا کہ وہ خالی
ہاتھ واپس نہیں آیا ہے۔''

''کیا تم نے اسے وہ ساری معلومات فراہم کردیں
جن کے بارے میں ہم بات کرچکے تھے۔ مثلاً تم کس یونٹ
سے تعلق رکھتے ہو۔ تمہارا عہدہ کیا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔''

''میں نے اپنے آپ کو ظاہر کیے بغیر اسے بہت کچھ

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

بتادیا ہے۔"

"اس نے تمہاری بیوی کے بارے میں پوچھا؟"

"ہاں، لیکن یہ ایک فضول شام نہیں تھی۔"

"تم سچی محبت کی کوئی قیمت نہیں لگا سکتے۔" میں نے کہا۔ "دوبارہ اس سے کب ملو گے؟"

"کل رات۔ میں نے اسے بتادیا ہے کہ آخری شو دیکھنے آؤں گا۔"

"اگر وہ تمہاری طرف مائل ہوگئی ہے تو مزید پیسے خرچ کرنے کی ضرورت نہیں۔ البتہ اپنے گردوپیش پر نگاہ رکھو۔ اگر روستوف اس معاملے میں ملوث ہے تو وہ تم سے زیادہ دور نہیں ہوگا۔"

"میں اس سے نمٹ سکتا ہوں۔"

"یہ دعویٰ مت کرو۔" میں نے کہا۔

اگلے روز کورلیس اکیلا ہی یانی بار گیا لیکن لیلیٰ وہاں نہیں آئی۔ وہ بار بند ہونے تک اس کا انتظار کرتا رہا پھر اس نے ایک گھوڑا گاڑی کرائے پر حاصل کی اور ہوٹل واپس آگیا۔

"میرا اندازہ ہے کہ وہ تم پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔" میں نے کہا۔ "یقین نہیں آتا کہ وہ اتنے خوش قسمت ہو سکتے ہیں۔ کونرز کا جہاز کریش ہوگیا تو تم نے اس کی جگہ لے لی اور تم بھی یوٹو آپریشن میں شامل ہو۔"

"انہیں کیسے معلوم ہوا کہ کونرز مر چکا ہے۔"

"اخبارات میں اس حادثے کی خبر شائع ہوئی تھی گو کہ اس میں پائلٹ کا نام ظاہر نہیں کیا گیا لیکن اس کا رینک ضرور بتایا تھا۔"

وہ کھڑکی کے پاس کھڑا پردے کی اوٹ سے جھانک رہا تھا۔ سڑک پر سناٹا تھا اور لیمپ کی مدھم روشنیوں نے ماحول کو پُراسرار بنادیا تھا۔ وہ میری طرف پلٹ کر کہنے لگا۔ "میں نہیں جانتا روگن، لیکن مجھے یقین نہیں کہ انہیں بے وقوف بنایا جاسکتا ہے۔"

"تمہیں امید اور جھوٹ کا دامن نہیں چھوڑنا چاہیے۔ جاسوسی کے کھیل میں دلیر ہونا سب سے بڑی خوبی ہے۔"

اگلی شب وہ دوبارہ کیبرے گیا۔ اس مرتبہ اس کی واپسی صبح سے پہلے نہیں ہوئی۔ وہ رات اس نے لیلیٰ کے اپارٹمنٹ میں گزاری جو سوسرا اسٹیڈیم کے نزدیک تھا۔ ہم ہوٹل کی چھت پر چلے گئے۔ میں نے ناشتے میں کافی اور پیسٹری منگوائی۔ سڑک پر ٹریفک چلنا شروع ہوگیا تھا اور یہاں سے بیدار ہوتے ہوئے شہر کا نظارہ بہت اچھا لگ رہا تھا۔

"کیا تم نے اس کے اپارٹمنٹ میں کوئی غیر معمولی چیز دیکھی؟"

اس نے کافی کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ "ہاں، میری نظر سنگھار میز پر رکھی ہوئی فیس کریم کی شیشی کے ڈھکنے پر گئی جس میں ایک ادھ جلا سگریٹ پڑا ہوا تھا۔ اگر وہ روسی برانڈ نہ ہوتا تو شاید میں اس پر توجہ نہ دیتا۔"

"تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ وہ سگریٹ اس کا نہیں تھا؟"

"میں نے اسے کبھی اس برانڈ کا سگریٹ پیتے ہوئے نہیں دیکھا۔ میرا خیال ہے کہ ہمارے پہنچنے سے پہلے اس کمرے میں کوئی اور بھی تھا۔"

تیسری رات وہ دو بجے کے قریب ہوٹل واپس آیا۔ میں نیم بیداری کی کیفیت میں بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ جیسے ہی اس نے کمرے میں قدم رکھا تو میں نے اس میں ایک تبدیلی محسوس کی۔ وہ آرام کرسی پہ گر گیا اور اس نے وہی کچھ بتایا جس کا مجھے پہلے سے اندازہ تھا۔ یعنی لیلیٰ ڈیمیر کے اپارٹمنٹ میں لگے ہوئے خفیہ کیمرے نے ان دونوں کی تصویریں لے لی تھیں جب وہ پیار کے سمندر میں ڈبکیاں لگا رہے تھے۔

"وہ کیا چاہتی ہے؟" میں نے پوچھا۔

سوال، جواب

☆ فنونِ لطیفہ کسے کہتے ہیں؟

"وہ فنون جن میں لطیفے ایجاد کیے جاتے ہوں؟"

☆ دو آدمی ایک کمرا دس دن میں بناتے ہیں تو دس آدمی اس کمرے کو کتنے دن میں بنائیں گے؟

"بنانے کی ضرورت ہی نہیں۔ دو آدمی پہلے ہی وہ کمرا بنا چکے ہیں!"

☆ مرزا غالب کون تھے؟

"ایک اسٹیج ڈرامے کے ہیرو...... ان کا اصل نام معلوم نہیں!"

☆ میرے پاس سو روپے تھے، دس خرچ ہوگئے، بتاؤ اب میرے پاس کتنی رقم بچی ہے؟

"معلوم نہیں...... میرے پاس کیلکولیٹر نہیں ہے۔"

☆ تاریخ پڑھاتے ہوئے استاد نے جماعت سے پوچھا۔ "نور جہاں کے بارے میں تم کیا جانتے ہو؟"

"بہترین گلوکارہ۔" جواب ملا۔ "میرے نغمے تمہارے لیے ہیں...... ان کا بہترین گانا ہے۔"

کراچی سے نہال خرم کا تعاون

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

www.paksociety.com

''یہ میں اس سے معلوم نہیں کرسکا۔ کل شام میں کسی سے مل رہا ہوں۔ اس نے مجھے آٹھ بجے یانی بار بلایا ہے اور وہ مجھے اس کا پتا دے گی۔''

''روستوف؟'' میں نے پوچھا۔

''اس کے علاوہ اور کون مجھ سے ملنا چاہے گا؟''

''ظاہر ہے کہ وہ تم سے کوئی ناجائز مطالبہ کرے گا ورنہ وہ اتنی تیزی سے آگے نہ بڑھتے۔''

''اگر انہوں نے کونرز کی بھی قابلِ اعتراض حالت میں تصاویر لی ہوں گی تو پھر اس کی خودکشی کی وجہ سمجھ میں آتی ہے۔''

''سوال یہ ہے کہ کیا اس نے خودکشی کرنے سے پہلے انتہائی خفیہ معلومات کسی کے حوالے کردی تھیں؟''

اگلی شب آٹھ بجے کے قریب کورلیس یانی بار گیا جبکہ میں نے اپنی جیپ احاطے کی بیرونی دیوار کے ساتھ کھڑی کر دی۔ وہ کیبرے میں زیادہ دیر نہیں رکا۔ میں نے اسے چند منٹوں بعد واپس آتے ہوئے دیکھا۔ اس نے باہر نکل کر سگریٹ سلگائی اور ایک گھوڑا گاڑی میں سوار ہوگیا۔ میں نے جیپ کی اگلی بتیاں بجھا دیں اور کچھ فاصلہ رکھ کر اس کا تعاقب کرنے لگا۔ کچھ دور جانے کے بعد ارابہ ایک کچی سڑک پر مڑ گئی اور میدان عبور کر کے ایک پرانے علاقے میں داخل ہوگئی۔ وہاں پوری طرح تاریکی کا راج تھا۔ البتہ بند کھڑکیوں سے لیمپ کی روشنی باہر آرہی تھی۔ مجھے پریشانی یہ تھی کہ کہیں ارابہ میری نظروں سے اوجھل نہ ہو جائے۔ ارابہ ایک تنگ راستے سے ہوتی ہوئی چڑھائی پر واقع کمپاؤنڈ کے آہنی گیٹ کے سامنے رک گئی۔ میں نے بھی اپنی جیپ کچھ فاصلے پر اس طرح کھڑی کی کہ وہ کسی کی نظروں میں نہ آئے۔

کورلیس نے ارابہ سے اتر کر کوچوان سے کچھ کہا اور کمپاؤنڈ کی جانب بڑھ گیا۔ اس کے جانے کے بعد کوچوان بھی نیچے اتر آیا اور اس نے دونوں گھوڑوں کے منہ پر چارے کے تھیلے باندھ دیے۔ میں خود بھی دیوار کی آڑ میں ایک ایسی جگہ پر کھڑا ہوگیا جہاں سے گیٹ کا نظارہ کیا جاسکتا تھا۔ پھاٹک پر ایک پولیس والا محافظ کے فرائض انجام دے رہا تھا اور کمپاؤنڈ میں جانے والے ہر شخص کی تلاشی لے رہا تھا۔ میں نے کورلیس کو ہاتھ اوپر اٹھاتے دیکھا۔ پولیس والے نے اس کی تلاشی لی اور اندر جانے کا اشارہ کردیا۔

پتھروں سے بنی لین کی دوسری جانب دو قطاروں میں مکان بنے ہوئے تھے۔ ان کی کھلی کھڑکیوں اور بالکونیوں سے نیم عریاں طوائفیں سڑک پر کھڑے ہوئے لوگوں کو دیکھ رہی تھیں جن کی اکثریت مل مزدوروں پر مشتمل تھی۔ چند لڑکیاں متوقع گاہکوں پر طنزیہ جملے کس رہی تھیں اور میں سوچ رہا تھا کہ روستوف نے ملاقات کے لیے مثالی جگہ کا انتخاب کیا ہے۔ ممکن ہے کہ اس مجمع میں اس کا کوئی آدمی یہ دیکھنے کے لیے موجود ہو کہ امریکی جاسوس تنہا ہی آیا ہے۔

پینتالیس منٹ گزر گئے تو مجھے پریشانی ہونے لگی۔ کورلیس کو اب تک واپس آجانا چاہیے تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس کی جانب سے ہونے والی غیر ضروری حرکت نے روستوف جیسے تجربہ کار جاسوس کو چوکنا کردیا ہو اور اب اس کی سربریدہ لاش کمپاؤنڈ کے کسی کونے میں پڑی ہوئی ہو۔ روسیوں سے ایسی درندگی کی توقع کی جاسکتی تھی۔ اس خیال کے آتے ہی مجھے جھرجھری آگئی۔

پانچ منٹ اور گزرے تو میں نے اس کی تلاش میں اندر جانے کے بارے میں سوچا۔ پھر اچانک ہی میں نے اسے پھاٹک سے نکلتے ہوئے دیکھا۔ مجھے یقین تھا کہ مجمع میں کوئی شخص اس کی نگرانی کررہا ہوگا۔ اس لیے میں ایک دیوار سے چپک گیا۔ کورلیس تیز قدموں سے چلتا ہوا گھوڑا گاڑی کی طرف بڑھا اور کسی جانب دیکھے بغیر اس میں سوار ہوگیا۔ میں نے بھی فاصلہ رکھ کر اس کا تعاقب شروع کر دیا۔ ارابہ اسی راستے سے گزرتی ہوئی شہر میں داخل ہوئی اور ہوٹل کے سامنے جاکر رک گئی۔ کورلیس نے کوچوان کو کرایہ ادا کیا اور سڑک پر کھڑے ہو کر اس کے جانے کا انتظار کرنے لگا۔ جب ارابہ نظروں سے اوجھل ہوگئی تو میں نے جیپ کا ہارن بجایا۔ وہ میری طرف مڑا اور تیزی سے جیپ میں سوار ہوگیا۔ جیسے ہی میں نے جیپ آگے بڑھائی تو اس نے پوچھا۔

''کیا تم نے روستوف کو دیکھا؟''

''نہیں، یہ بات دوسری ہے کہ وہ مزدوروں کے بھیس میں باہر نکل گیا ہو۔''

''دفع کرو اسے روگن۔ تم جانتے ہو، انہوں نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا۔ وہ مجھے تہ خانے میں لے گئے اور اس کے جانے کے بعد بھی وہاں روکے رکھا۔ وہ یقینا تمہارے پاس سے گزرا ہوگا۔''

''تمہیں کس نے روک رکھا تھا؟''

''ایک ترک نے۔ اس نے مجھ پر چاقو تان رکھا تھا۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

"چاقو کو بھول جاؤ۔ یہ بتاؤ کہ تم نے روستوف کو اچھی طرح دیکھا تھا؟"

"تہ خانے میں تاریکی تھی اور ہلکی سی روشنی جالی سے اندر آرہی تھی۔ ویسے بھی اس نے بھیس بدلا ہوا تھا۔"

"وہ تم سے کیا معلوم کرنا چاہ رہا تھا؟"

"اسے پہلے سے اڈے پر موجود یوٹو جہازوں اور ان کے پائلٹس کی تعداد کا علم ہے۔ اب وہ ہوابازوں کے نام، مستقبل میں ہونے والی پروازوں کی تاریخ اور ان کے راستوں کے بارے میں جاننا چاہتا ہے۔ اس نے مجھے صرف چوبیس گھنٹے کی مہلت دی ہے۔ لگتا ہے کہ وہ بہت جلدی میں ہے۔"

میں نے جیپ کا رخ دریا پر بنے ہوئے پرانے رومن برج کی جانب موڑ لیا۔ یہ راستہ فضائی اڈے کی طرف جاتا تھا۔ "ہم اسے ہوابازوں کے نام اور کچھ فرضی راستوں کے بارے میں بتائیں گے۔" میں نے کہا۔

"تم غلطی کر رہے ہو روگن۔ میرا خیال ہے کہ روستوف یہ سب کچھ پہلے سے جانتا ہے۔ میں شرط لگانے کو تیار ہوں کہ کونرز نے مطلوبہ معلومات اس کے حوالے کر دی ہیں اور اب وہ صرف اس کی تصدیق کرنا چاہ رہے ہیں۔ روستوف کو یہ سوچنے کا موقع کیوں دیا جائے کہ اسے غلط معلومات دی گئی ہیں۔ وہ ان تصویروں کو میرے خلاف استعمال کر سکتا ہے۔ یہ فرض کرتے ہوئے کہ وہ کونرز سے ملنے والی معلومات کی تصدیق کرنا چاہ رہا ہے۔ ہمیں اسے اصل تاریخیں اور پروازوں کے روٹس بتا دینا چاہیے۔"

"اس طرح تو سارا شیڈول اس کے علم میں آجائے گا۔" میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ یوٹو طیارہ اتنی بلندی پر پرواز کرتا ہے کہ روسی جہاز اور میزائل کی اس تک پہنچ نہیں ہوتی اور اسے نیچے نہیں گرایا جا سکتا۔ اگر اگلے مشن کے بارے میں حقیقی معلومات فراہم کر دی جائیں تو روستوف اور کے جی بی کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کچھ دیر ہم خاموشی سے سفر کرتے رہے پھر میں نے کہا۔ "یہ چال کامیاب ہو سکتی ہے، اس کے لیے مجھے اوپر والوں سے اجازت لینا ہوگی۔"

جاسوسی میں ہمیشہ دھوکے اور جھوٹ کا سہارا لیا جاتا ہے لیکن بعض اوقات سچ سب سے بڑا فریب ثابت ہوتا ہے۔ کے جی بی کو پروازوں کے اصلی روٹس سے آگاہ کرنا بھی ایک جوا ہوتا جس میں ایک خطرہ یہ بھی تھا کہ ڈبل ایجنٹ کے طور پر کورلیس کی سابقہ زندگی کے بارے میں معلومات حاصل ہو جاتیں۔

ایک بار پھر میں بار بند ہونے کے وقت باہر جیپ میں بیٹھا انتظار کر رہا تھا۔ لوگ باہر آنا شروع ہو گئے تھے لیکن کورلیس اور لیلیٰ ڈیمیر سب سے آخر میں برآمد ہوئے اور ایک گھوڑا گاڑی میں سوار ہو گئے۔ میں نے فاصلہ رکھ کر ان کا تعاقب کیا لیکن وہ صرف ریلوے اسٹیشن تک ہی گئے جو تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا اور صرف اسٹیشن ماسٹر کے کمرے کی لائٹ جل رہی تھی۔ اسٹیشن کے باہر بنے ہوئے اسٹینڈ پر تین ٹیکسیاں کھڑی ہوئی تھیں اور ان کے ڈرائیور سو رہے تھے۔ اس جوڑے نے ارابہ کو فارغ کیا اور ایک ٹیکسی میں سوار ہو گئے۔ یہ ایک پرانی رینالٹ کار تھی جس نے کبھی اچھے دن دیکھے ہوں گے۔ وہ ٹیکسی دھواں چھوڑتی ہوئی شمال کی جانب روانہ ہو گئی۔ میں نے بھی اس کا تعاقب شروع کر دیا۔ اس اندھیرے میں میری نظریں اس کی پچھلی لائٹوں پر تھیں۔

سڑک آگے جا کر ایک چھوٹی پہاڑی پر چڑھ گئی۔ جس کے دوسری طرف اواتا کی جھیل تھا۔ چاند کی مدھم روشنی میں جھیل کی سطح چمک رہی تھی اور یہ نظارہ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا پھر میں نے ٹیکسی کو نیچے آتے ہوئے دیکھا جو ساحل پر جا کر رک گئی تھی۔ مجھے وہاں درختوں کے کنارے ایک ہٹ نظر آیا۔ میں نے انجن بند کیا اور جیپ میں ہی بیٹھا رہا۔ ٹیکسی سے کورلیس اترا اور ہٹ میں چلا گیا۔ اس رات وہ اپنے ساتھ ایک فاؤنٹین پین لایا تھا جس میں ایک بہت ہی چھوٹا مائیکروفون اور ٹرانسمیٹر لگا ہوا تھا۔ ہمیں توقع تھی کہ اس طرح رستوف کی آواز اور اس سے ہونے والی گفتگو سن سکیں گے لیکن جب میں نے ریسیور اپنے کانوں سے لگایا تو مجھے کوئی آواز نہیں سنائی دی۔

ہر طرف سناٹا اور خاموشی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ ہر شے ساکت ہو چکی ہے۔ اس کے باوجود کورلیس کے ٹرانسمیٹر سے کوئی آواز نہیں آئی اور میں سوچ رہا تھا کہ سگنل نہ آنے کی وجہ کیا ہو سکتی ہے۔ ایک بار پھر میرے ذہن میں وہی بھیانک تصویر ابھری کہ کورلیس پتھر کے فرش پر لیٹا ہوا ہے اور اس کی کٹی ہوئی گردن سے خون بہہ رہا ہے۔ کہیں وہ غلط جگہ پر تو نہیں آ گیا۔ عقل یہ ماننے کو تیار نہیں تھی کہ روستوف ایسی جگہ آنے کا خطرہ مول لے گا جس کے بارے میں اسے کوئی شبہ ہو۔

میرے اعصاب پر سے بوجھ اس وقت ختم ہوا جب

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

میں نے کورلیس کو باہر آتے دیکھا۔ وہ بڑے اطمینان سے ٹہلتا ہوا ٹیکسی کی طرف جارہا تھا جیسے اسے کوئی جلدی نہ ہو۔ میں نے اندھیرے میں دیکھنے والی دوربین نکالی اور ہٹ کی طرف دیکھنے لگا۔ مجھے دروازے میں ایک سایہ نظر آیا لیکن دھند کی وجہ سے میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ کوئی مرد تھا۔ میں نے دوربین کو فوکس کیا لیکن وہ سایہ وہاں سے غائب ہو گیا پھر میں نے دیکھا کہ وہ سایہ ہٹ سے دور ہوتا جارہا تھا۔

''اگلی مرتبہ تم مجھے خفیہ ریکارڈنگ کرنے والا آلہ دینا۔'' کورلیس نے فاؤنٹین پین میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''جس کے بارے میں تمہیں یقین ہو کہ وہ کام کرے گا۔''

اس وقت ہم دونوں ہوٹل کی چھت پر بیٹھے کافی پی رہے تھے۔ میں نے پین کا کیپ اتارا تو دیکھا کہ انٹینا کا تار نکلا ہوا تھا۔

''میں اسے بے وقت کی خرابی کہوں گا۔'' کورلیس نے وضاحت پیش کی۔ ''میں تو سمجھ رہا تھا کہ تم تک آواز پہنچ رہی ہوگی۔''

''تمہیں یقین ہے کہ ہٹ میں روستوف ہی تھا؟''

''ہاں، وہی تھا۔ وہ بڑے تحمل سے کام کرنے والا شخص ہے۔ اس کی آنکھیں سیاہ تالاب کے مانند ہیں جن کی گہرائی نظر نہیں آتی۔ تم کبھی نہیں جان سکتے کہ وہ کیا سوچ رہا ہے۔ ایک منٹ پہلے وہ تمہیں دیکھ کر مسکرا رہا ہوگا اور دوسرے لمحے وہ تمہارا گلا کاٹ دے گا۔''

''کیا اس نے تمہیں رابطے کا کوئی ذریعہ بتایا؟''

''ہاں، لیلیٰ ڈیمیر۔''

''اچھا انتخاب ہے۔ کسی شخص کو قابو کرنے کے لیے اس سے اچھی ترغیب نہیں ہوسکتی۔''

ہم کافی پیتے اور سڑک سے آنے والی آوازوں کا شور سنتے رہے۔ میں نے اسے بتایا کہ گزشتہ احکامات منسوخ ہو گئے ہیں اور اسے دوبارہ انکریمیک بھیجا جارہا ہے۔

''کتنے عرصے کے لیے؟'' اس نے پوچھا۔

''اس کا انحصار روستوف پر ہے۔''

''میری چھٹی اور یونان جانے کا کیا بنے گا؟''

''تمہیں یہ پروگرام ملتوی کرنا پڑے گا۔''

''شاید ایسا نہ کرسکوں کیونکہ اس بارے میں پہلے ہی لیلیٰ سے بات کرچکا ہوں۔ وہ بھی یونانی ہے۔ اس لیے اس کا ساتھ میرے لیے سودمند رہے گا۔''

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ چھٹی پر جانے سے اس کی ساکھ متاثر نہیں ہوتی لیکن منسوخ ہونے کی صورت میں شبہات جنم لے سکتے تھے۔ میں نے اس سے کہا کہ مجھے فائل میں رکھنے کے لیے اس کا تحریری بیان درکار ہوگا جس میں گزشتہ شب ہٹ میں ہونے والی کارروائی کی پوری گفتگو تفصیل سے درج ہو۔

''اگر وہ پین کام کرتا تو اس کی ضرورت پیش نہ آتی۔'' اس نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

اگلے روز کورلیس ایک فوجی کارگو جہاز کے ذریعے ایتھنز روانہ ہوگیا۔ میں رن وے پر کھڑا جہاز کو فضا میں بلند ہوتے ہوئے دیکھ رہا تھا لیکن نہ جانے اس وقت مجھے کیوں بے چینی سی محسوس ہونے لگی جیسے کوئی مچھلی میرے ہاتھ سے پھسل کر دریا میں گر گئی ہو۔ اس کی وجہ میں نہیں جانتا تھا۔ شاید یہ بھی آزمائش ہونے کی کوئی نشانی ہو۔

چار دن بعد یوٹو پائلٹ گیری پاورز جو کہ روس کی فضائی حدود میں پرواز کے مشن پر تھا۔ حادثے کا شکار ہو گیا۔ اس کے بارے میں فرض کرلیا گیا کہ جہاز کریش ہونے یا خودکشی کے نتیجے میں وہ مرچکا ہے۔ اس بارے میں اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ نے جو بیان جاری کیا۔ اس کے مطابق بہت زیادہ بلندی پر جانے کے بعد جہاز میں آکسیجن کی کمی واقع ہوگئی تھی جس کے سبب یہ حادثہ پیش آیا لیکن روسی حکومت نے اس کی تردید کرتے ہوئے کہا کہ وہ زندہ ہے۔

اس خبر کے منظرعام پر آنے کے ایک گھنٹے بعد ہی میں نے روستوف کے معاملے اور کوئنرز کی خودکشی کے بعد پیش آنے والے واقعات کا بغور جائزہ لینا شروع کردیا۔ اس شام میں اس توقع پر یانی بار گیا کہ وہاں کے جس بیرے کو میں جانتا ہوں شاید اس سے کچھ معلومات مل سکیں۔ وہ غلامانہ ذہنیت رکھنے والا شخص تھا اور ایک بڑے کرنسی نوٹ کے عوض اس سے بہت کچھ معلوم کیا جاسکتا تھا۔ جب میں نے اس سے لیلیٰ ڈیمیر کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ اس نے ملازمت چھوڑ دی ہے اور ادانا سے چلی گئی ہے۔

''اس کے پاس یونانی پاسپورٹ تھا۔ سنا ہے کہ وہ اپنے وطن واپس چلی گئی ہے لیکن میں نہیں جانتا کہ یہ سچ ہے یا نہیں۔''

فضائی اڈے واپس آتے ہوئے میرے دل میں مزید شبہات پیدا ہونے لگے۔ یہ کورلیس ہی تھا جس نے یوٹو پروازوں کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کی تجویز پیش کی تھی تاکہ ڈبل ایجنٹ کے طور پر اس کا اعتبار قائم رہے۔ اس تمام عرصے میں روستوف اندھیرے میں چھپا رہا۔ صرف

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

کوریس نے ہی اسے قریب سے دیکھا تھا اور عین وقت پر ٹرانسمیٹر بھی دھوکا دے گیا۔ اب کوریس ایتھنز میں چھٹیاں گزار رہا تھا۔ کیا لیلی ڈیمیر بھی اس کے پاس چلی گئی ہے۔

گیٹ پر کھڑے ہوئے امریکی محافظ نے مجھے دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور میں چھاؤنی کے علاقے سے گزرتا ہوا سی آئی اے کمپاؤنڈ تک پہنچ گیا۔ میں اپنے دفتر کی میز پر بیٹھ کر کوریس کا بیان پڑھنے لگا۔ بظاہر اس میں کوئی خاص بات نہیں تھی لیکن ایک جملے نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے لکھا تھا۔ ''میں نے روستوف کو بتا دیا تھا کہ پاورز کے پاس ایک زہریلی سوئی ہوگی جس کے ذریعے وہ پکڑے جانے کی صورت میں اپنے آپ کو ہلاک کر لے گا۔''

میں نے کرسی کی پشت سے سر لگا دیا اور معاملے کی تہ میں پہنچنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں اس میٹنگ میں موجود تھا جس میں کوریس کو مشن کے بارے میں ان تفصیلات سے آگاہ کیا گیا جو اسے روستوف تک پہنچانا تھیں۔ ان میں زہریلی سوئی کا کوئی ذکر نہیں تھا البتہ ان سائنائیڈ کیپسول کے بارے میں ضرور بتایا گیا جو یوٹو کے ہوابازوں کو اس مقصد کے لیے فراہم کیے جاتے تھے۔ پھر کوریس کو زہریلی سوئی کا کیسے پتا چلا۔ اس سوال نے مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔ یقیناً پاورز نے ہی لیلی ڈیمیر یا روستوف کو اس کے بارے میں بتایا ہوگا اور کوریس کو یہ بات اسی صورت میں معلوم ہو سکتی تھی اگر وہ شروع ہی سے دوسری پارٹی یعنی روسیوں کے لیے کام کر رہا ہوتا۔

ایتھنز ائیرپورٹ پر ایک ائیرفورس پولیس آفیسر میرا منتظر تھا جسے میں نے انگرلیک بیس کمانڈر کے تحریری احکامات پکڑائے جن میں کوریس کو فوراً گرفتار کرنے کے لیے کہا گیا تھا۔ ہم نے ایک یونانی پولیس آفیسر کو ساتھ لیا اور آسٹر بیچ پر واقع ریسورٹ ہوٹل کی طرف روانہ ہو گئے جہاں کوریس ٹھہرا ہوا تھا۔ یونانی پولیس آفیسر کو ساتھ لے جانے کا مقصد یہ تھا کہ ایک دوسرے ملک میں معاملے کو آسانی سے نمٹایا جا سکے۔

کوریس کے کمرے پر ڈونا ٹ ڈسٹرب کی تختی لگی ہوئی تھی۔ ہوٹل کے منیجر نے دروازے پر دستک دی لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔ دوسری اور تیسری کوشش بھی رائگاں گئی تو اس نے ماسٹر کی، سے دروازہ کھول دیا۔ کمرے میں قدم رکھتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ کھیل ختم ہو گیا ہے۔ منیجر نے کھڑکیوں کے پردے ہٹا دیے تا کہ سورج کی روشنی اندر آسکے۔ ڈبل بیڈ خالی پڑا ہوا تھا اور الماری کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ وہاں بھی کوئی سوٹ یا دوسرے کپڑے نہیں تھے۔ باتھ روم میں رکھی ہوئی ٹوکری میں لپ اسٹک کے دھبے لگے ہوئے ٹشو پیپر پڑے ہوئے تھے اور مجھے یہ اندازہ لگانے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی کہ ان ٹشو کو کس نے استعمال کیا ہوگا۔ سنگھار میز پر میں نے آئرش وہسکی کی ایک بوتل اور روسی سگریٹ کا پیکٹ دیکھا جس کے ساتھ ہی ایک خط رکھا ہوا تھا۔ میں نے لپک کر اسے اٹھایا۔ اس میں لکھا تھا۔

روگن۔

اگر تم اس خط کو پڑھ رہے ہو تو اس کا مطلب ہے کہ تم نے اس رپورٹ میں وہ غلطی پکڑ لی جو لکھتے وقت مجھ سے سرزد ہو گئی تھی۔ اس غلطی کا احساس ہوتے ہی مجھے اپنی چھٹی مختصر کر کے یہاں سے رخصت ہونا پڑ رہا ہے۔ وہسکی کی بوتل میری طرف سے ایک تحفہ ہے جو تمہیں ہمارے کامیاب اشتراک کی یاد دلاتی رہے گی جس کی وجہ سے پہلے یوٹو کو اتارنا ممکن ہو سکا۔ سگریٹ کا پیکٹ دیکھ کر تمہیں روستوف ضرور یاد آئے گا جو تمہارے ساتھ شروع سے آخر تک رہا، جب تمہاری اس سے پہلی ملاقات جہاز سے اترتے ہوئے ہوئی اور تم ہی اسے یونان جانے کے لیے رخصت کرنے آئے تھے۔ مجھے حیرت ہے کہ تم جیسا ذہین جاسوس بھی اسے نہ پہچان سکا اور وہ بہروپیا تمہارے ساتھ شروع سے آخر تک چپکا رہا۔ اگر کبھی ماسکو آنا ہو تو ہم سے ضرور ملنا۔ ہم ساتھ بیٹھ کر ڈرنک کریں گے اور گزرے ہوئے وقت کی یادیں تازہ کریں گے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے بہروپ بھر کر تمہیں دھوکا دیا لیکن محبت اور جنگ میں سب جائز ہے۔

نیک خواہشات کے ساتھ

پیری کوریس

میں نے کھڑکی کے پاس جا کر آسمان پر نظر ڈالی۔ پھر واپس گھوما اور زور زور سے ہنسنے لگا۔ حالانکہ یہ رونے کا مقام تھا۔ یہ میری زندگی کی سب سے بڑی ناکامی تھی۔ اس کے باوجود میں ہنس رہا تھا۔ کمرے میں موجود تینوں افراد نے مجھے حیرت سے دیکھا لیکن میری ہنسی نہیں رکی۔ میں اس کی وجہ نہیں بتا سکتا۔ شاید یہ بھی آئرش ہونے کی نشانی ہے جو اپنی ناکامی اور حماقت پر بھی سنجیدہ نہیں ہوتے اور خود ہی مذاق اڑاتے ہیں۔ یہی حال میرا بھی تھا۔ ایک روسی جاسوس مجھے بے وقوف بنا کر چلا گیا۔ اس پر ہنسنے کے سوا اور کیا کر سکتا ہوں؟

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

جوتے کی گواہی

تمسکین رضا

مقتول کی لاش دریافت ہو چکی تھی... وہ ایف بی آئی کا ایجنٹ تھا... پوری سراغرساں کمپنی قتل کے محرک اور قاتل کی تلاش میں مصروفِ عمل تھی... مگر کوئی سرا ہاتھ نہیں آرہا تھا... زیرک اور ذہین سراغرساں کی مشاہداتی عادت کہ اس کی نظر نے جوتوں کے تلے میں چھپی حقیقت کو کھوج لیا...

جرم کی گتھیوں میں الجھی منفرد کہانی...... گواہوں کے بیانات کے سوا کوئی شہادت نہ تھی......

آئیوی موک نے اپنا پرس، آئی پاڈ اور پانی کی بوتل سنبھالی اور نائٹ ڈیوٹی پر جانے کے لیے تیار ہو گئی۔ اس نے لمحہ بھر کے لیے فیملی روم میں قدم رکھا جہاں اس کا شوہر بستر پر نیم دراز ٹی وی پر کوئی میچ دیکھ رہا تھا۔

"میں جا رہی ہوں۔ چار بجے تک واپس آجاؤں گی۔" آئیوی نے باہر کی طرف جھانکتے ہوئے کہا۔ "تم دوبارہ لان میں گھاس کاٹنے مت چلے جانا۔"

موک نے اسکرین پر سے نظریں ہٹائے بغیر کہا۔ "تم... دن بھر سوتی رہیں۔ دوپہر میں بارش بھی ہوتی رہی۔ اس مرطوب موسم میں بازو کی تکلیف اتنی بڑھ جاتی ہے کہ میں گھاس کاٹنے والی مشین کو اسٹارٹ بھی نہیں کر سکتا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن اگر یوڈرز نے کارپوریشن والوں کو فون کر دیا تو..."

"اگر وہ ہمارے یارڈ کی صفائی کے لیے فون کرے گا تو میں انہیں فون کر کے ان کے ٹرک کے بارے میں بتا دوں گا جو ہمارے گھر کے سامنے پچھلے مہینے سے کھڑا ہوا ہے اور جس کے دو ٹائروں میں ہوا نہیں ہے۔"

آئیوی نے ایک گہری سانس لی اور کچھ کہے بغیر چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد موک نے دوبارہ اپنی نظریں ٹی وی اسکرین پر جما دیں۔

سراغ رساں لیفٹیننٹ سائرس اوبرن ناشتا کر رہا تھا کہ اس کے سیل فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری جانب سے سارجنٹ ڈولنگر بول رہا تھا۔ "تم نے آج کی خبریں دیکھیں؟"

"صبح کے چھ بجے تم یہ توقع کیسے کر سکتے ہو؟" اوبرن نے کہا۔ "ابھی تو میری آنکھ بھی پوری طرح نہیں کھلی۔ خیر تم بتاؤ کیا خبر ہے؟"

"ایک نامعلوم شخص کی لاش چیس ٹیرس ویسٹ کے علاقے میں مکان کے عقبی صحن سے ملی ہے۔ وہ سفید فام ہے اور اس کی عمر چالیس کے لگ بھگ ہو گی۔"

"قتل کیسے ہوا؟"

"اس کے سینے میں دو گولیاں ماری گئی ہیں۔"

"لاش کے قریب سے اسلحہ ملا؟ کیا کسی اور طرح سے اس کی شناخت ممکن ہے؟" اوبرن نے پوچھا۔

"کوئی ہتھیار نہیں ملا۔ اس کی جیبیں بھی خالی ہیں۔ ہاتھ پر گھڑی ہے اور نہ انگلی میں انگوٹھی۔ اس کے جسم کے کسی حصے پر کوئی ٹیٹو بھی نہیں بنا ہوا۔"

گو کہ ڈولنگر کو حال ہی میں سارجنٹ کے عہدے پر ترقی ملی تھی لیکن وہ ایک تجربہ کار اور قابل سراغ رساں تھا اور اپنے طور پر کسی بھی قتل کی ابتدائی تفتیش کرنے کی پوری صلاحیت رکھتا تھا۔ تاہم اس نے اپنے سینئر افسر کو بروقت اطلاع دینا ضروری سمجھا تاکہ وہ لاش کے ہٹائے جانے سے پہلے جائے وقوعہ پر پہنچ جائے۔ جو اس وقت ناشتا کرنے اور لباس تبدیل کرنے کے مرحلے سے گزر رہا تھا۔

جب وہ چیس ٹیرس کے چودھویں بلاک پر پہنچا تو سورج پوری طرح نکل آیا تھا۔ بلاک کے قریب ٹی وی چینل

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

کی گاڑیاں اور تماشائیوں کا ایک گروپ وہاں پہلے سے موجود تھا۔ اوبرن نے دیکھا کہ گلی کے ایک سرے کو ڈونلگر کی کار اور دوسرے سرے کو پولیس کی گاڑی نے بلاک کر رکھا ہے۔ اس نے اپنی گاڑی بغلی سڑک پر کھڑی کی اور گلی کی طرف پیدل چل دیا جہاں میڈیکل آفیسر اور ہیڈ کوارٹر کی وین کھڑی تھیں۔ یہاں کچھ مکانوں میں گیراج تھے اور کچھ میں نہیں۔ ان میں سے ایک مکان کے عقب میں گشت پر مامور ٹیرون ایک کنکریٹ کی سطح کے نزدیک پہرے داری کر رہا تھا جو کبھی کسی گیراج کا فرش رہی ہوگی۔ اوبرن کو دیکھتے ہی وہ چوکس ہو گیا اور بولا۔ ''گڈ مارننگ سر۔'' وہ اوبرن کا پرانا پڑوسی اور اس کی طرح سیاہ فام امریکی تھا۔

اوبرن نے اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''سب سے پہلے لاش کس نے دیکھی؟''

''مسز موک نے، وہ روزانہ صبح چار بجے کام سے واپس آتے ہوئے اس گلی سے گزرتی ہے۔ اس کی ڈیوٹی اگلے بلاک میں واقع ایک اسٹور پر ہوتی ہے۔ پہلے اس نے سوچا کہ کوئی شخص شراب کے نشے میں مدہوش پڑا ہوا ہے۔ اس نے گھر جا کر شوہر کو بتایا اور جب اس نے باہر آکر دیکھا تو اسے یہ جاننے میں بالکل بھی دیر نہ لگی کہ وہ شخص مر چکا ہے۔ طبی عملے کے آنے سے پہلے میں یہاں پہنچ چکا تھا۔''

وہ لاش ایک سفید فام درمیانی جسامت رکھنے والے مرد کی تھی۔ وہ زمین پر کمر کے بل چت لیٹا ہوا تھا اور اس کے بازو و ٹانگیں باہر کی جانب پھیلی ہوئی تھیں۔ قمیص کے بٹن سینے کے پاس سے کھلے ہوئے تھے۔ شاید طبی عملے نے انہیں کھلا چھوڑ دیا تھا۔ اس کی چھاتی پر چھ انچ کے فاصلے سے دو سیاہ سوراخ نظر آ رہے تھے۔ ہمیشہ کی طرح اسٹیمی نے خندہ پیشانی سے اوبرن کا استقبال کیا جبکہ کیسٹرل کی پوری توجہ اپنے کام پر تھی۔ اس نے اوبرن کی آمد کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ اسٹیمی نے مقتول کی قمیص پر خون آلود سوراخوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اس کی قمیص یا جسم پر پاؤڈر کے نشانات نظر نہیں آ رہے۔'' پھر اس نے دوبارہ قمیص کھولی اور ایک زخم کی طرف اشارہ کیا جہاں سے خون بہتے بہتے برائے نام ہی خشک ہوا تھا اور آدھا راستہ طے کرنے کے بعد خون کی دھار نوے درجے کے زاویہ پر مڑ گئی تھی۔

''جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں پانی کبھی اونچائی کی طرف نہیں جاتا جبکہ خون اس کے مقابلے میں گاڑھا ہوتا ہے۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ اسے کسی اور جگہ گولی ماری گئی اور خون کا رساؤ بند ہونے سے پہلے اس کی لاش کو یہاں

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

لایا گیا۔"

"یہ بھی ممکن ہے کہ اس کی پوزیشن صرف دو میٹر کے بعد ہی بدل گئی ہو۔" کیسٹرل نے خیال ظاہر کیا۔ "خون بہہ جانے کے بعد بھی وہ کافی دیر تک زندہ رہ سکتا تھا۔"

"شاید نہیں۔" اسٹیمی نے اس سے اختلاف کیا۔ "سینے میں دو گولیاں لگنے کے بعد یہ کیسے ممکن ہے؟"

اوبرن کو اس بحث سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ لہٰذا وہ مکان کی طرف چل دیا۔ دروازہ کھولنے والی ایک فربہ اندام عورت تھی جس نے اوبرن کا کارڈ دیکھ کر اسے اندر آنے کی اجازت دے دی۔ اس نے گہرے نارنجی رنگ کا پینٹ سوٹ پہن رکھا تھا جو غالباً اس کی یونیفارم تھی جس کی جیب پر اس کا نام لکھا ہوا تھا۔ "آئیوی۔"

"وہ اُدھر ہیں۔" اس نے سامنے والے کمرے کی جانب اشارہ کیا جہاں سے ڈولنگر کے بولنے کی آواز آرہی تھی۔

"کیا تم ہی مسز موک ہو؟" اوبرن نے پوچھا۔

"ہاں۔"

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم نے لاش کو گھر آتے ہوئے دیکھا جب تم کام سے واپس آرہی تھیں۔"

"میں پہلے ہی تین مختلف لوگوں کو پوری بات بتا چکی ہوں۔" وہ شکایت آمیز لہجے میں بولی۔ "لیکن کسی نے بھی کچھ لکھنے کی زحمت نہیں کی۔"

"ٹھیک ہے۔ میں اپنے سارجنٹ سے تفصیل معلوم کرلوں گا۔" اوبرن نے کہا۔ "کیا تم اس شخص کو جانتی ہو؟ اسے پہلے کبھی دیکھا تھا؟"

"میں نے دوسرے لوگوں سے بھی یہی کہا ہے کہ اسے نہیں جانتی۔"

"گزشتہ شب تم کس وقت کام پر گئی تھیں؟"

"جب نائٹ ڈیوٹی ہو تو آٹھ بجے گھر سے نکلتی ہوں۔"

"تم یقین سے کہہ سکتی ہو کہ جب کام پر گئیں تو یہ لاش وہاں موجود نہیں تھی؟"

"یہی کہہ سکتی ہوں کہ اگر یہ لاش وہاں تھی تب بھی میں نے اندھیرے کی وجہ سے اسے نہیں دیکھا۔"

"شاید اتنا اندھیرا نہ ہو جتنا اس وقت تھا جب تم کام سے واپس آرہی تھیں۔"

وہ جواب دینے کے بجائے کمرے کی جانب مڑی اور چلاتے ہوئے بولی۔ "ڈیل۔"

صاحبِ خانہ اس کی آواز سن کر کچن کی طرف چلا آیا۔ اس کے ساتھ ڈولنگر بھی تھا۔

"میرا دماغ کھانے کے لیے ایک اور آگیا۔" وہ ناگوار لہجے میں بولی۔ اوبرن اور ڈولنگر کے درمیان نظروں کا تبادلہ ہوا لیکن انہوں نے شناسا ہونے کا تاثر نہیں دیا۔ وہ اسی لہجے میں اپنے شوہر سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔ "کیا تم انہیں باہر لے جاکر سڑک پر لگی ہوئی اسٹریٹ لائٹ دکھا سکتے ہو جس کی روشنی ہمارے عقبی بیڈروم کی کھڑکی سے رات بھر اندر آتی رہتی ہے۔"

موک نے بیڈروم سلیپرز پہن رکھے تھے اور وہ کافی خستہ حال نظر آرہا تھا۔ اس کی دونوں کلائیوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ نصف شب کے قریب سو گیا تھا۔ اس کی آنکھ چار بجے کھلی جب اس کی بیوی نے اسے سوتے سے جگا کر بتایا کہ کوئی شخص ان کے صحن کے عقب میں سو رہا ہے۔ اس کے سینے میں گولیوں کے نشان دیکھ کر اس نے نو گیارہ کو اطلاع دی۔ اس نے رات میں گولی چلنے یا کوئی اور غیر معمولی آواز نہیں سنی اور نہ ہی پہلے کبھی اس مردہ شخص کو دیکھا تھا۔

موک ایک معمار تھا اور کام کے دوران چوٹ لگ جانے کی وجہ سے ان دنوں طبی رخصت پر تھا۔ اس کی بیوی ایک اسٹور میں کیشیئر کے طور پر کام کرتی تھی اور اسے ہفتے میں چار سے چھ مرتبہ نائٹ ڈیوٹی کرنا ہوتی تھی۔ جب اوبرن اور ڈولنگر باہر آئے تو پٹرول مین پیٹی فورڈ اپنی ڈیوٹی ختم کر کے جا چکا تھا جبکہ کیسٹرل بھی لاش کی تصاویر اور دیگر حاصل شدہ نمونے لے کر وہاں سے روانہ ہو چکا تھا۔ وہاں رہ جانے والوں میں اسٹیمی بے ڈھنگے انداز سے گلی میں ٹہل رہا تھا۔ اوبرن نے ڈولنگر سے پوچھا۔

"کیا تم نے کسی پڑوسی سے کوئی بات کی؟"

"صرف دو لوگوں سے بات ہو سکی۔ زیادہ تر لوگ کام پر جا چکے ہیں یا صبح کے چھ بجے سوالوں کے جواب دینا پسند نہیں کرتے۔ موک کے برابر میں رہنے والے شخص کا کہنا ہے کہ اس نے گزشتہ شب کوئی آواز نہیں سنی۔"

انہوں نے اسٹیمی سے مختصراً معلومات حاصل کیں اور اپنی اپنی کاروں میں ہیڈ کوارٹر کی جانب روانہ ہو گئے۔ اوبرن کو ابھی تک یہ معلوم نہیں تھا کہ فرٹز نے اسے صبح سویرے کیوں فون کیا تھا۔ دفتر پہنچ کر اوبرن اور ڈولنگر نے ان رپورٹوں کا جائزہ لیا جو ریڈیو اور ٹی وی کی خبروں میں جاری کی گئی تھیں۔ ان رپورٹوں کے نشر ہونے کے باوجود کسی جانب سے اس لاش کی شناخت کے بارے میں کوئی

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

واضح بات سامنے نہیں آئی۔ اس دوران میں ڈولنگر نے وہ تمام رپورٹس دیکھ ڈالیں جو لاپتا افراد، لاوارث کاروں، موٹل سے غائب ہو جانے والے مہمانوں اور اسپتالوں یا نرسنگ ہوم سے بھاگ جانے والے مریضوں کے بارے میں تھیں۔ اوڈیل اور آئیوی موک کے بارے میں بھی گوگل سے کچھ زیادہ معلومات نہ مل سکیں۔

سہ پہر کے وقت وہ دونوں پولیس کے مردہ خانہ گئے جہاں اسٹیمی مرنے والے کے کپڑوں کا معائنہ کر رہا تھا۔ اس کی قمیص ہلکے رنگوں کی تھی جبکہ انڈرویئر اور موزے بھی درمیانی کوالٹی کے لیکن اچھی حالت میں تھے۔ البتہ اس کے جوتے، لباس سے مطابقت نہیں رکھتے تھے۔ اس لیے فوراً ہی توجہ کا مرکز بن گئے۔ یہ اعلیٰ کوالٹی کے جوتے تھے جو کہ کام کے دوران پہنے جاتے ہیں۔ یہ جوتے بھی خراب حالت میں تھے۔ ان کے اوپری حصے اور تلے میں کئی طرح کے دھبے نظر آرہے تھے۔ اس کی جیبیں بھی خالی تھیں۔

فارنسک پیتھالوجسٹ ڈاکٹر ویلنٹائن نے کمرے میں داخل ہو کر جیکٹ اتاری اور گاؤن پہن لیا۔ گو کہ وہ ریٹائرمنٹ کے قریب تھا لیکن اس کے باوجود اپنا کام پوری دلچسپی اور لگن سے کرتا تھا۔ دونوں سراغ رساں اور اسٹیمی پوسٹ مارٹم ٹیبل کے ساتھ لگی ہوئی پارٹیشن کے پیچھے کھڑے ہو گئے۔ ڈاکٹر ویلنٹائن نے لاش کے بیرونی حصوں کا معائنہ کرتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

''کلین شیو، حال ہی میں بال کٹوائے گئے۔ کانوں میں کوئی چھید نہیں، کانٹیکٹ لینس بھی نہیں لگے ہوئے۔ ناک پر بھی کوئی نشان نہیں اور دانت بھی عمدہ حالت میں ہیں۔''

مرنے والا درمیانے قد اور متناسب جسم کا تھا۔ اس کی جلد بالکل صاف تھی اور کہیں سے بھی گرمی کے سبب جھلسی ہوئی نظر نہیں آرہی تھی۔ اسٹیمی نے جائے وقوعہ پر مقتول کے ہاتھوں کی تصویریں لی تھیں جس میں اس کے ٹوٹے ہوئے ناخن اور تازہ خراشیں نظر آرہی تھیں جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ مرنے سے پہلے اس کی کسی کے ساتھ ہاتھا پائی ہوئی تھی۔

جب ڈاکٹر ویلنٹائن اور مردہ خانے کے خدمت گار جولیس نے لاش کو پلٹا تو انہیں پشت کی جانب ایک واضح نشان نظر آیا۔ یہ گردن کے عقبی حصے میں ایک سکڑے ہوئے زخم کا نشان تھا۔ ''یہ کسی تیز دھار آلے کا کٹ لگنے سے ہوا ہے۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''لگتا ہے کہ بال کٹوانے کے دوران میں کسی حجام کے استرے سے یہ زخم لگا ہے۔ آگے بڑھنے سے پہلے ہم اس کی تصویر اتار لیتے ہیں۔''

اس کے بعد پوسٹ مارٹم کے دوران کھوپڑی کا معائنہ ہوا۔ ڈاکٹر نے اعشاریہ اڑتیس سے چلائی ہوئی دو گولیاں بھی نکال لیں۔ اس کے بعد معدے کے اجزاء کا جائزہ لیا گیا جس سے معلوم ہوا کہ مقتول نے مرنے سے کئی گھنٹے پہلے تک کچھ نہیں کھایا تھا۔ اسٹیمی نے مقتول کے کپڑوں اور جوتوں کا بنڈل بنا کر اوبرن کے حوالے کیا تا کہ وہ انہیں کیسٹرل تک پہنچا دے۔ اس کام سے فارغ ہو کر ڈولنگر ایک بار پھر چیس ٹیرس کے لیے روانہ ہو گیا تا کہ موک کے پڑوسیوں سے مزید معلومات حاصل کر سکے۔

اس شام مقامی خبروں میں مقتول کی گردن کی پشت پر پائے جانے والے زخم کا کلوز اپ دکھایا گیا۔ مقتول کی خالی جیبوں سے ثابت ہوتا تھا کہ اس کے قتل کا محرک ڈاکا زنی نہیں تھا۔ چیس ٹیرس سے اس کی لاش ملنے کا مطلب یہی لیا جا سکتا تھا کہ اسی علاقے میں قتل کیا گیا ہے۔ ایف بی آئی نے انگلیوں کے نشانات سے معلوم کر لیا کہ وہ کسی معروف مجرم سے نہیں ملتے البتہ عام شہریوں کے نشانات سے ان کا موازنہ کرنے کے لیے کافی وقت درکار تھا۔ پولس کی اپیل کے باوجود کوئی حجام یا دوسرا شخص سامنے نہیں آیا جو لاش کی گردن پر پائے جانے والے زخم کے بارے میں کچھ بتا سکتا۔ اس سے یہی نتیجہ اخذ کیا گیا کہ مقتول کسی دوسرے شہر سے آیا تھا۔

دوسری صبح اوبرن کو ایک ای میل موصول ہوئی جو جائے وقوعہ سے متعلق کیسٹرل کی رپورٹ پر مشتمل تھی جس کے ساتھ تصویروں کا ایک پلندا بھی تھا۔ اس نے مقتول کے کپڑوں کے بارے میں تفصیل سے بیان کیا تھا۔ جیب سے نکلنے والی مٹی کو اس نے بڑی باریک بینی سے چیک کیا تھا لیکن اس میں کسی دوسری چیز کی ملاوٹ نظر نہیں آئی۔ البتہ جوتوں کے سول ایک پیچیدہ کہانی سنا رہے تھے۔ کیسٹرل نے تلے کے کھانچوں میں ایک خاص قسم کا میٹریل دریافت کیا جسے دو گروپوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے گروپ میں اسفالٹ کے ساتھ ساتھ کم از کم دو واٹر پروف پروڈکٹ موجود ہیں۔ جن میں سے ایک پولی سلفیٹ جو چھتوں کی پیوند کاری میں استعمال ہوتا ہے اور دوسرا اپاکسی گراؤٹ جسے کنکریٹ کے فرش کی مرمت کے لیے کام میں لایا جاتا ہے۔ ریت کے بے شمار باریک اور موٹے ذرات اس میٹریل پر جم گئے تھے۔ اس میٹریل کی جوتوں کے تلے میں موجودگی ظاہر کر رہی تھی کہ مقتول نادانستہ طور پر کسی ایسے فرش پر چلتا رہا ہے جو نیا نیا بنا تھا اور جس کی سطح پوری طرح خشک نہ ہوئی تھی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 | PAKSOCIETY

www.paksociety.com

اس کے بعد انہوں نے شہر کی ڈائریکٹری اور نقشوں کی مدد سے ایسی جگہوں کے بارے میں جاننے کی کوشش کی جن کے اطراف میں یہ میٹریل پائے جاتے ہوں۔ کافی کوشش کے بعد وہ دو ایسے مقامات کا پتا چلانے میں کامیاب ہو گئے۔ ان میں سے ایک کریڈ کارپوریشن تھی۔ وہ اس کے دفتر میں داخل ہوئے جہاں استقبالیہ پر بیٹھی ایک درمیانی عمر کی عورت خلا میں گھور رہی تھی۔ ان دونوں کو دیکھ کر وہ خیالوں کی دنیا سے باہر آ گئی لیکن جب ان دونوں نے اپنے آپ کو پولیس سراغ رساں کے طور پر متعارف کروایا تو اس کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار نمودار ہونے لگے تاہم ڈولنگر نے اسے یقین دلا دیا کہ یہ محض معمول کی کارروائی ہے۔

اس کا نام جینی کریڈ تھا اور وہ یہاں کی مالکن تھی جو اپنے دو بیٹوں کے ساتھ مل کر یہ فرم چلا رہی تھی۔ یہ کاروبار اس کے مرحوم شوہر نے شروع کیا تھا۔ اس وقت دونوں بیٹے کام کے سلسلے میں باہر گئے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ انہوں نے تین چار جزوقتی ملازم بھی رکھے ہوئے تھے۔ انہوں نے مسز کریڈ کو آمادہ کرلیا کہ وہ انہیں عمارت کے اس حصے کی جانب جانے کی اجازت دے دے جہاں اوزار اور میٹریل رکھے جاتے تھے۔ فضا میں تارکول اور دوسرے کیمیکلز کی بو بسی ہوئی تھی۔ دیوار کے ساتھ سیمنٹ کی بوریاں، رنگ کی بالٹیاں اور پولی سلفیٹ کے ڈبے رکھے ہوئے تھے۔ عقبی حصے میں کاٹھ کباڑ اور لوہے کا سامان نظر آ رہا تھا جبکہ درمیانی حصے میں کچھ مشینیں نصب تھیں۔ بیرونی حصے میں ٹرک اور ٹریلرز کھڑے ہوئے تھے جبکہ ایک جانب بنے شیڈ میں ریت اور پتھروں کی ڈھیریاں پڑی تھیں۔

اس جگہ کا جائزہ لینے کے بعد وہ اگلی منزل کی جانب روانہ ہوئے۔ بینور روڈ پر میلوں دور تک تجارتی عمارتیں واقع تھیں۔ ان میں زیادہ تر چھوٹے کارخانے مثلاً مشین شاپ، ویلڈنگ شاپ، انجن اوورہال، ریڈی ایٹر کی مرمت اور چھوٹے پرزے بنانے کے کارخانے شامل تھے۔ دو ایکڑ پر پھیلے ہوئے رقبے میں ایش فورڈ کنسٹرکشن کا احاطہ تھا جس کا فرش پختہ کنکریٹ سے بنایا گیا تھا۔ ویب سے حاصل ہونے والی معلومات کے مطابق ایش فورڈ اس علاقے میں رہائشی اور تجارتی عمارتیں بنانے والے سب سے بڑے ٹھیکے دار تھے۔ اس کے علاوہ یہ فرم پورے شہر اور ملک میں پختہ فرش بنانے کے ٹھیکے بھی لیا کرتی تھی۔

دفتر کے عقب میں انہیں پانچ عمارتیں اور شیڈز نظر آئے جن کے درمیان بھاری ٹرک، بلڈوزر، کھدائی کرنے والی مشینیں۔ رولرز، تاربوائلرز، سیمنٹ مکسر وغیرہ کھڑے ہوئے تھے۔ وہ دفتر میں داخل ہوئے تو کمپیوٹر پر بیٹھے ہوئے شخص نے انہیں مڑ کر دیکھا۔ اس کی عمر لگ بھگ تیس کے قریب ہوگی وہ بولا۔ ”میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟“

انہوں نے اسے اپنے شناختی کارڈ دکھائے۔ اس کا نام گریگ ڈیرل تھا اور وہ فورمین ہونے کے ساتھ ساتھ قائم مقام آفس منیجر کے فرائض بھی انجام دے رہا تھا۔ انہوں نے صبح کے اخبار میں شائع ہونے والی تصویر دکھائی تو وہ بولا۔ ”میرا واسطہ دن میں کئی لوگوں سے پڑتا ہے۔ ان میں گاہک، انسپکٹرز، سیلزمین، میکینک، سرکاری حکام، پولیس والے، دوسرے ٹھیکے دار اور مزدور سب ہی شامل ہیں۔ اس کے باوجود یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اس شخص کو کبھی نہیں دیکھا۔“

اس نے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھا کر کسی کو ہدایت دی کہ تمام لوگ ڈاک پر جمع ہو جائیں پھر وہ ان دونوں کو عقبی دروازے سے باہر لے گیا جہاں سات مرد اور دو عورتیں پہلے سے موجود تھے۔ ان میں سے کوئی بھی تصویر دیکھ کر مرنے والے کو شناخت نہ کر سکا۔ ڈیرل نے بتایا کہ تقریباً ایک درجن ورکر ڈیوٹی پر نہیں تھے جبکہ چار کارکن چھٹی پر ہیں۔ اس کے بعد اس نے انہیں عمارت کا دورہ کروایا تاکہ وہ اچھی طرح اطمینان کرلیں۔ رخصت ہونے سے قبل اوبرن نے کہا۔ ”ممکن ہے کہ ہم دو دن بعد دوبارہ یہاں آئیں۔“

ایک میل دور جانے کے بعد انہوں نے گاڑی ایک خالی جگہ پر کھڑی کی اور اپنے جوتوں کے تلے پر لگے ہوئے موی پیڈز اتارنے لگے پھر انہوں نے ان پیڈز کو احتیاط سے پلاسٹک کی تھیلیوں میں رکھا اور انہیں کیسٹرل کے حوالے کر کے چار بجے کے قریب اپنے دفتر واپس آ گئے۔ لیفٹیننٹ کے عہدے پر ترقی پانے کے بعد اوبرن کو ایک الگ کمرا مل گیا تھا۔ اس کے پاس آنے والے ہر شخص کو ڈیسک کلرک باربیا سے ملنا پڑتا تھا جو استقبالیہ کے علاوہ بھی کئی دوسرے فرائض انجام دیتی تھی۔ وہ اپنے آپ کو مصروف رکھنے کے لیے ہر آتے جاتے شخص سے باتیں کیا کرتی اور اس طرح اسے دفتر میں ہونے والے ہر واقعے کی خبر ملتی رہتی تھی۔

اس نے اپنی عادت کے مطابق دروازے پر دیکھا تو وہاں نیلے سوٹ میں ملبوس ایک مضبوط ڈیل ڈول کا شخص نظر آیا۔ وہ کچھ کہے بغیر اوبرن کے کمرے کی طرف چلا گیا تو باربیا اپنی جگہ پر تلملا کر رہ گئی۔ وہ شخص اوبرن کے لیے بھی اجنبی تھا۔ اس نے اپنا کارڈ دکھایا۔ وہ بالٹی موڑ میں مامور

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

ایف بی آئی کا ایجنٹ آئن مورگن تھا۔ اس وقت ڈولنگر ریکارڈ روم میں مصروف تھا۔ آنے والے شخص نے راہداری کا دروازہ بند کیا اور اوبرن کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا پھر اس نے اپنا بریف کیس کھول کر کچھ کاغذات نکالے اور اوبرن کے سامنے رکھے۔ ان میں مرنے والے شخص کی تصویر بھی تھی جو ایف بی آئی کے ریکارڈ سے لی گئی تھی اور وہ شخص ایجنٹ برنارڈ لیمسی تھا۔

”تم نے برنارڈ کی جو تصویر شناخت کے لیے جاری کی تھی اس نے ہمیں چوکنا کر دیا۔ یہ شخص تین دن سے رابطے میں نہیں تھا۔ میں اس کی پوسٹ مارٹم رپورٹ اور اب تک تم نے جو معلومات حاصل کی ہیں ان کے بارے میں جاننا چاہوں گا۔“

”ہم کچھ زیادہ معلوم نہیں کر سکے بلکہ ہمیں تو یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ کون تھا۔ ابھی تک لیبارٹری ٹیسٹ کے نتائج نہیں آئے جس کی وجہ سے پوسٹ مارٹم رپورٹ نامکمل ہے۔ البتہ میں تمہیں ابتدائی رپورٹ کا پرنٹ دے سکتا ہوں۔“

یہ کہہ کر وہ پرنٹر کی جانب بڑھا اور پرنٹ نکالتے ہوئے بولا۔ ”کیا تم جانتے ہو کہ برنارڈ کس کیس پر کام کر رہا تھا؟“

مورگن کے چہرے کی سختی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ وہ خشک لہجے میں بولا۔ ”اس علاقے میں چوروں کا ایک گروہ کام کر رہا ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ یہ لوگ قومی سطح پر منظم ہیں۔ یہاں کی مقامی برانچ .... سلے سلائے کپڑوں کو راستے میں ہی اغوا کر لیتی ہے جب یہ سامان فیکٹریوں سے ہول سیلرز یا تقسیم کار کمپنیوں کو بھیجا جاتا ہے۔“

اوبرن نے اسے برنارڈ کے جوتے کے تلے میں چپکے ہوئے میٹریل کے بارے میں بتایا اور اس بارے میں جو کارروائی انہوں نے اس روز سہ پہر میں کی تھی، اس سے بھی مطلع کیا۔ ”شاید ہمیں دو دن بعد رپورٹ مل سکے کہ ہمارے جوتوں پر لگا ہوا میٹریل کس نوعیت کا ہے۔ کیا برنارڈ یہیں ٹھہرا ہوا تھا یا بالٹی مور سے آیا کرتا تھا؟“

”اسے خفیہ رکھا گیا تھا۔ بیورو کے پاس ریمسی کورٹ میں واقع کیمرون اپارٹمنٹ میں ایک کمرا ہے۔ مجھے وہاں سے کچھ معلوم نہیں ہوا۔ تم چاہو تو کسی بندے کو بھیج کر وہاں سے کوئی ثبوت تلاش کر سکتے ہو۔“

اوبرن نے سر ہلا کر رضامندی ظاہر کر دی۔ مورگن نے ایک نظر پوسٹ مارٹم رپورٹ پر ڈالی اور بولا۔ ”برنارڈ

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

کے پاس بھی اعشاریہ تین آٹھ کا ریوالور تھا اور اس کے سینے سے بھی اسی سائز کے خول برآمد ہوئے ہیں۔ ہمیں ان دونوں کا موازنہ کرنا ہوگا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ اپنے ہی ریوالور سے ہلاک ہوا ہو۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنے بریف کیس سے ایک کاغذ اور نکالا۔"دو باتیں اور۔ برنارڈ کی کار اپارٹمنٹ کے پارکنگ لاٹ یا کسی قریبی سڑک پر کھڑی نہیں کی گئی۔ میں تمہیں اس کی مکمل تفصیلات اور رجسٹریشن نمبر دے رہا ہوں۔ ممکن ہے کہ تمہاری گشتی ٹیم کی نظر اس پر پڑ جائے۔ اس کے علاوہ یہ بھی مشورہ دینا چاہوں گا کہ پریس کو یہ معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ مرنے والے کی شناخت ہوگئی ہے۔ اگر یہ بات ظاہر ہوگئی تو وہ لوگ بھی خاموشی اختیار کر لیں گے جو اس بارے میں کچھ جانتے ہیں۔"

اگلے دو روز اوبرن دوسرے معاملات میں الجھا رہا اور اس کی توجہ وقتی طور پر ایف بی آئی کے ایجنٹ کے قتل سے ہٹ گئی۔ اس دوران کیسٹرل نے ایف بی آئی کے اپارٹمنٹ کا اچھی طرح معائنہ کیا لیکن وہاں اسے کوئی چیز نہیں ملی جو مرنے والے کے جوتوں کے تلے میں پائی گئی تھی۔ البتہ یہ بات ضرور سامنے آئی کہ کیسٹرل کے وہاں جانے سے ایک دن پہلے ایجنٹ مورگن اس کمرے میں رہائش پذیر تھا۔

اوبرن اور ڈولنگر کا تجربہ کامیاب رہا۔ وہ اپنے جوتوں پر موم کی تہ چڑھا کر کریڈ کارپوریشن اور ایش فورڈ کنسٹرکشن کی عمارتوں کی جانب گئے تھے اور جیسا کہ توقع تھی، دونوں جگہوں سے فرش میں شامل اجزاء بڑی تعداد میں موم سے چپک گئے لیکن ایش فورڈ کے احاطے سے ملنے والے دھاگے اور ریشے ان اجزاء سے قریب تر تھے جو ایجنٹ برنارڈ کے جوتوں کے تلے سے چپکے ہوئے تھے۔ کیسٹرل نے یہ بات نوٹ کی کہ کریڈ کارپوریشن سے ملنے والے اجزاء میں کوئی اونی ریشہ موجود نہیں تھا۔ اسی طرح اوبرن اور ڈولنگر بھی کریڈ کارپوریشن سے ملحقہ پانچ اسٹورز کے گردوپیش کا جائزہ لے چکے تھے۔ وہاں انہیں سوتی اور پولیسٹر کے دھاگے تو نظر آئے لیکن برنارڈ کے جوتے کے تلے میں پھنسے ہوئے میٹریل سے موازنہ کیا تو کوئی اونی دھاگا نظر نہیں آیا۔

یہ ثبوت واضح طور پر اشارہ کر رہا تھا کہ برنارڈ کے جوتوں میں پھنسے میٹریل کا ماخذ ایش فورڈ کنسٹرکشن کا احاطہ ہے اور غالباً وہیں اس کی موت بھی واقع ہوئی ہوگی۔ ایش فورڈ کے احاطے میں ان دھاگوں کی فراوانی کو کپڑوں کی ہائی جیکنگ سے جوڑا جاسکتا تھا جس کی تحقیقات برنارڈ کر رہا تھا۔ جس اپارٹمنٹ میں وہ ٹھہرا ہوا تھا اس کے فرش سے کسی خاص ثبوت کی عدم موجودگی یہ ظاہر کرتی تھی کہ برنارڈ نے مرنے سے کچھ دیر پہلے ہی یہ میٹریل اٹھایا ہوگا۔ ان کا اگلا قدم تو یہ ہونا چاہیے تھا کہ وہ ایش فورڈ کے احاطے میں کھڑی گاڑیوں کی جانچ پڑتال کرتے لیکن ابھی ان کے پاس سرچ وارنٹ کی درخواست دینے کے لیے کافی ثبوت موجود نہ تھے۔

جمعے کی سہ پہر صورتِ حال میں نئی تبدیلی واقع ہوئی جب پولیس کی پٹرول کار نے معمول کے گشت کے دوران متروک فارم ٹریک کو جانے والی سڑک پر ایک کار دیکھی جس پر میری لینڈ کی نمبر پلیٹ لگی ہوئی تھی۔ مورگن کو اطلاع دینے سے پہلے اوبرن اور ڈولنگر نے انٹرنیٹ پر اس جگہ کی سیٹلائٹ تصاویر کا معائنہ کیا۔ انہیں بڑا کرنے پر خالی کھیتوں، ریلوے ٹریک اور گھاس سے بھرے گڑھوں کے سوا کچھ نظر نہیں آیا۔ انہوں نے حساب لگایا تو معلوم ہوا کہ اس جگہ سے ایش فورڈ کنسٹرکشن کا فاصلہ آدھے میل سے تھوڑا سا زیادہ تھا۔

مورگن سے اس کے سیل فون پر رابطہ کیا گیا تو وہ فوراً ہی اس جگہ پہنچنے کے لیے رضامند ہوگیا۔ جب اوبرن اور ڈولنگر وہاں پہنچے تو مورگن پہلے موجود تھا اور برنارڈ کی کار کے علاوہ اس کے قرب وجوار کی بھی تصویریں لے رہا تھا۔ وہ کار سڑک سے پچاس گز کے فاصلے پر دو کھیتوں کے درمیان ایک پتھریلے راستے پر کھڑی کی گئی تھی۔ کار کے دروازے مقفل تھے اور اس کی باڈی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا۔ انہوں نے پتھروں پر قدموں کے نشان تلاش کرنے کی کوشش کی جس پر مٹی کی تہ جمی ہوئی تھی۔

وہ تینوں درمیانی فاصلہ عبور کرتے ہوئے ایش فورڈ کنسٹرکشن کے احاطے تک پہنچ گئے جس کے چاروں طرف خاردار تاروں کی باڑ تھی۔ برنارڈ کے ہاتھوں اور کپڑوں پر آئی خراشوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس نے مرکزی گیٹ سے اندر داخل ہونے کے بجائے عقبی حصے سے باڑ پر سے چھلانگ لگائی ہوگی۔ مورگن کے کہنے پر انہوں نے ایسی علامات تلاش کرنے کی کوشش کی جن سے برنارڈ کے اس فعل کی تصدیق ہوسکے۔ باڑ کے ساتھ ساتھ بے ترتیب گھاس اور جھاڑیوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ اچانک ڈولنگر کی نظر جوتوں کی جوڑی پر گئی۔ مورگن ان جوتوں کی تصویریں بنا رہا تھا کہ اسے بائیں پاؤں کے جوتے کی ٹو میں سے

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

چابیوں کا گچھا ملا۔

''میرا خیال ہے کہ اس نے اپنے جوتے اتار کر باہر رکھ دیے تھے اور کام والے بوٹ پہن کر اندر گیا ہوگا۔''

مورگن نے کوئی جواب نہیں دیا اور مزید تصویریں لینے لگا۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ دوبارہ اسی راستے پر ہولیا جس پر چل کر وہ اس جگہ تک آئے تھے۔ اوبرن اس کے پیچھے آتے ہوئے بولا۔ ''کیا یہ طریقہ مناسب تھا۔ میرا مطلب ہے کہ وارنٹ کے بغیر رات کے اندھیرے میں تنہا اندر جانا۔''

اس بار بھی مورگن نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن اوبرن بولے بغیر نہ رہ سکا۔ ''کیا تمہارے یہاں کام کرنے کا یہی طریقہ ہے یا اس نے تم لوگوں کو بھی لاعلم رکھا کہ وہ کیا کرنے والا ہے۔''

''ہاں، وہ اپنے طریقے سے کام کررہا تھا۔'' مورگن نے بس اتنا ہی کہا۔

کار کے قریب پہنچ کر مورگن نے اس کا دروازہ کھولا۔ برنارڈ کا بٹوا، ریوالور مع ہولسٹر اور سیل فون، گلوز باکس میں موجود تھے۔ مورگن نے ایش فورڈ کنسٹرکشن کی جانب مڑ کر دیکھا۔ ''ہمیں اندر جا کر تفتیش کرنا ہوگی۔ یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اندر کے کسی آدمی نے ہی برنارڈ کو قتل کیا ہے۔''

اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ اپنے ساتھی ایجنٹ کے قاتل کو پکڑنے کے لیے پُرعزم ہے۔ اس نے اوبرن اور ڈونلگر کو یقین دلایا کہ اب تک انہوں نے جو ثبوت و شواہد اکٹھے کیے ہیں ان کی بدولت سرچ وارنٹ حاصل کرنا زیادہ مشکل نہیں ہوگا اور وہ اس سلسلے میں ان کی پوری مدد کرے گا۔

واپسی میں ڈونلگر سیکنڈ ڈسٹرکٹ کوارٹر چلا گیا اور اوبرن، مورگن کے ساتھ کچہری کی جانب روانہ ہوگیا۔ دن ڈھل رہا تھا اور مورگن کی کوشش تھی کہ وہ مجسٹریٹ کے جانے سے پہلے کچہری پہنچ جائے۔ خوش قسمتی سے ایک نوجوان جج ریو فاکنز ابھی موجود تھا لیکن اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ بھی اپنا سامان سمیٹ کر جانے کی تیاری کررہا ہے۔ مورگن نے اسے کیس کی نوعیت سے آگاہ کیا تو وہ ان کی درخواست پر سرچ وارنٹ جاری کرنے پر تیار ہو گیا۔ اس وارنٹ میں تفتیشی افسر کو نہ صرف ظاہری ثبوت تلاش کرنے کا اختیار دیا گیا تھا بلکہ کمپیوٹر میں موجود ڈیٹا، ڈیجیٹل آلات، سیل فون اور انٹرنیٹ تک لامحدود رسائی کی اجازت بھی دی گئی تھی۔

مورگن اس وارنٹ کی تکمیل کے لیے فوراً ہی ایش فورڈ کنسٹرکشن کے احاطے میں جانا چاہ رہا تھا لیکن اوبرن نے اسے سمجھایا کہ ثبوت جمع کرنے کے ماہر اور مناسب نفری کے بغیر وہاں جانا سودمند نہ ہوگا اور یہ انتظامات صبح سے پہلے ممکن نہیں۔ سڑک کے دوسری جانب واقع فرسٹ ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر میں اوبرن نے اپنے سابق کیپٹن سیوگ سے رابطہ کیا جو انہیں مسلح نفری دینے پر تیار ہوگیا۔ دوسری صبح سورج نکلنے سے پہلے اوبرن، ڈونلگر، مورگن اور کیسٹل ایش فورڈ کنسٹرکشن کے گیٹ سے چوتھائی میل کے فاصلے پر جمع ہوئے۔ ان کی مدد کے لیے دو پٹرول مین بھی اپنی کروزر میں موجود تھے۔ اوبرن کالج کے دنوں میں کنسٹرکشن کا کام کرچکا تھا۔ اس لیے اسے معلوم تھا کہ گرمیوں کے موسم میں کام جلدی شروع ہوجاتا ہے تاکہ گرمی کی شدت اور دھوپ کی تمازت میں اضافے سے پہلے دو تین گھنٹوں میں زیادہ سے زیادہ کام نمٹا لیا جائے۔ فلڈ لائٹ کی روشنی میں گیٹ کے اندر کا منظر صاف نظر آرہا تھا۔ کچھ لوگ ٹرکوں پر سامان لاد رہے تھے اور کچھ مشینری چیک کررہے تھے اور جن کے پاس کوئی کام نہیں تھا وہ ایک کونے میں بیٹھے کافی سے دل بہلا رہے تھے۔

یہ پوری ٹیم احاطے میں داخل ہوئی تو وہاں موجود لوگوں میں ہلچل سی مچ گئی اور وہ سب بے یقینی کے عالم میں ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ اوبرن اور مورگن سیدھے دفتر میں چلے گئے۔ انہیں دیکھتے ہی فورمین ڈیرل بولا۔ ''تم نے کہا تھا کہ واپس آؤ گے اور واقعی آگئے۔''

اس بار اس کا رویہ جارحانہ تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ کمپنی کا مالک پیرس ایش فورڈ بھی وہاں موجود تھا اور اپنی میز پر بیٹھا عقابی نظروں سے ان دونوں کو گھور رہا تھا۔ اس نے نخوت بھرے انداز میں اپنا تعارف کروایا اور انتظار کرنے لگا کہ یہ سرکاری افسر اگلا قدم کیا اٹھاتے ہیں۔

اوبرن نے اپنی جیب سے وارنٹ نکالا لیکن اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی مورگن بول اٹھا۔ ''فیڈرل ایجنٹ برنارڈ لیسی کو کسی نے منگل کے روز قتل کردیا ہے۔ ہمارے پاس یہ یقین کرنے کی واضح وجوہات ہیں کہ اسے یہاں قتل کیا گیا یا اغوا کر کے کسی اور جگہ لے جا کر مار دیا۔ یہ واقعہ پیر کی شب پیش آیا۔''

''واضح وجوہات سے تمہاری کیا مراد ہے؟'' ایش فورڈ بولا۔ وہ چھ فٹ سے بھی زیادہ لمبا اور دیکھنے میں کوئی

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

پیشہ ور باسکٹ بال کا کھلاڑی لگ رہا تھا۔

''ہم اپنی تفتیش کا آغاز باہر کھڑے ہوئے ٹرالر نما ٹرک سے کریں گے۔ ہمیں اگنیشن کی اور کارگو کمپارٹمنٹ کی چابی چاہیے۔''

''یہ ٹرک میرا نہیں بلکہ میرے سالے کا ہے۔'' ایش فورڈ نے کہا۔ ''میں نے اسے باڑ کے اندر پارک کرنے کی اجازت دے رکھی ہے تاکہ لوٹ مار سے محفوظ رہ سکے۔ اس کی چابیاں بھی اسی کے پاس ہیں لیکن میں نہیں سمجھتا کہ وہ ٹرک مقفل ہے۔''

ٹرک کا کارگو اپارٹمنٹ بالکل خالی تھا۔ کیسٹرل نے اندر جا کر دیکھا۔ کچھ سونگھنے کی کوشش کی اور سیمپل لینے کے لیے وہیں رک گیا۔

''ہم غیر ضروری طور پر تمہارے کاروبار میں مداخلت نہیں چاہتے۔'' مورگن نے کہا۔ ''لیکن ہم ہر اس گاڑی کو دیکھنا چاہیں گے جو یہاں سے روانہ ہوگی۔''

اس دوران ڈیرل دفتر میں بیٹھا روزمرہ کے کام نمٹاتا رہا جبکہ ایش فورڈ ایک عمارت سے دوسری عمارت میں جا کر دوسرے لوگوں سے کام کے بارے میں باتیں کرتا رہا لیکن پولیس کی آمد اور تلاشی کے بارے میں کوئی بات نہیں ہوئی۔

احاطے کے وسط میں اینٹوں سے بنی ہوئی عمارت دوسری عمارتوں کے مقابلے میں بڑی اور پرانی لگ رہی تھی شاید ایش فورڈ کے یہ جگہ خریدنے سے پہلے اس میں کوئی چھوٹا کارخانہ یا گودام رہا ہوگا۔ اس کی تمام کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں جو کہ ایک خلافِ معمول بات تھی۔

''شاید تم لوگ زیادہ دیر یہاں نہ گزار سکو۔'' ایش فورڈ نے انہیں وارننگ دیتے ہوئے کہا۔ ''رات والے چوکیدار نے ایک ڈرم گھسیٹتے ہوئے گرا دیا اور تقریباً بیس گیلن تیل زمین پر بہہ گیا۔ غنیمت ہے کہ اس وقت اس کے منہ میں سگریٹ نہیں دبا ہوا تھا ورنہ یہ ساری عمارت بھک سے اڑ جاتی۔''

ہال سے آنے والی بُو نہ صرف وارنش کی طرح تیز تھی بلکہ پرانے کچرے کی طرح ناگوار... بھی تھی۔ یہ عمارت بظاہر ناکارہ اور غیر استعمال شدہ مشینری اور میٹریل کے گودام کے طور پر استعمال ہوتی تھی کیونکہ اس کے زیادہ تر کمرے چھوٹے اور ان کے دروازے تنگ تھے۔ چھت میں لگے زیادہ تر بلب ناکارہ تھے اور ہال میں نیم تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ اس کے باوجود تفتیشی ٹیم نے اس جگہ کی مکمل تلاشی لی۔

تلاشی ختم ہونے کے بعد مورگن ایک لفظ کہے بغیر دوبارہ دفتر میں چلا گیا جہاں ڈیرل بڑے انہماک سے کمپیوٹر پر کام کر رہا تھا۔ ایش فورڈ اپنی میز پر بیٹھا تفتیشی ٹیم کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ تھی۔

''تم نے پوچھا تھا کہ وہ کون سی وجوہات ہیں جن کی بنا پر ہم سوچ رہے ہیں کہ برنارڈ کو یہاں قتل کیا گیا تھا۔'' مورگن نے اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''نمبر ایک، اس کی کار تمہارے احاطے کے قریب پائی گئی جہاں سے گیٹ تک کا پیدل فاصلہ دس منٹ کا ہے۔ نمبر دو، اس نے اپنے جوتے باڑ کے باہر ہی چھوڑ دیے تھے اور اندر آنے کے لیے ورک بوٹ استعمال کیے جو وہ مرتے وقت بھی پہنے ہوئے تھا۔ نمبر تین، اس کے جوتوں کے تلے میں وہی نشانات ملے ہیں جو تمہارے احاطے کے اندر فرش پر پھیلے ہوئے میٹریل سے ملتے ہیں۔ جس کا مطلب ہے کہ وہ یہاں آیا تھا۔''

''ممکن ہے کہ وہ یہاں آیا ہو۔'' ایش فورڈ نے تسلیم کرتے ہوئے کہا۔ لیکن میرے کسی آدمی نے اسے نہیں دیکھا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ درمیانی شب میں ایک پرائیویٹ پراپرٹی میں کیا لینے آیا تھا۔ کیا یہ غیر قانونی مداخلتِ بے جا نہیں ہے یا کانگریس نے بنیادی حقوق کے قانون میں کوئی ترمیم کر دی ہے؟''

''تمہارا کہنا ہے کہ کسی آدمی نے اسے نہیں دیکھا۔ یہ ثابت ہونا ابھی باقی ہے۔ مجھے ان تمام لوگوں کی فہرست چاہیے جو گزشتہ سوموار کو یہاں کام کر رہے تھے۔ ان میں مستقل ملازمین کے علاوہ جز وقتی، عارضی اور بیرونی ٹھیکے داروں کے نام بھی شامل ہونے چاہئیں۔ تم نے سرچ وارنٹ دیکھ لیا ہے۔ اگر تم صرف اپنا پے رول اور ادائیگی کی فائلیں کھول لو تو میں خود ہی پرنٹ نکال لوں گا۔''

ایش فورڈ تھوڑا سا جھکا اور جھلاتے ہوئے بولا۔ ''تم یہاں کب تک رکو گے؟''

''جب تک مجھے کچھ سوالوں کے جواب نہیں مل جاتے۔'' مورگن نے کہا۔ ''جب تک مجھے یہاں کام کرنے والا وہ شخص نہیں مل جاتا جو یہ جانتا ہو کہ برنارڈ کے ساتھ کیا ہوا تھا۔''

یہ سننے کے بعد ایش فورڈ کو فیصلہ کرتے میں دس سیکنڈ لگے پھر اس کا لہجہ بالکل بدل گیا اور وہ بولا۔ ''میں نے کبھی مسٹر برنارڈ کو نہیں دیکھا لیکن تمہیں ان جوتوں کے بارے میں کچھ بتا سکتا ہوں۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

''وہ کیا؟'' مورگن نے اشتیاق سے پوچھا۔
''وہ جوتے میرے ہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے مائیک اٹھایا اور کسی کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ ''رابرٹ فرانسس، میرے دفتر آؤ۔''
چند منٹ خاموشی رہی پھر رابرٹ دفتر میں داخل ہوا۔ اسے دیکھ کر ایش فورڈ بولا۔ ''سب کچھ ختم ہوگیا رابرٹ۔ میں تمہارے لیے جو کرسکتا تھا وہ کیا لیکن جب تم نے ایف بی آئی کے آدمی پر ہاتھ ڈالا...''
مورگن آہستہ آہستہ اس کے قریب ہورہا تھا۔ تبھی ڈولنگر نے مداخلت کی اور رابرٹ کو اپنا شناختی کارڈ دکھاتے ہوئے کہا کہ وہ کرسی پر بیٹھ جائے اور برنارڈ کے بارے میں جو کچھ جانتا ہے وہ سچ سچ بتادے۔ رابرٹ کے پاس حکم کی تعمیل کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ کمرے کے وسط میں رکھی ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور باقی سب لوگ اس کے گرد دائرہ بنا کر کھڑے ہوگئے۔ رابرٹ نے ایک گہری سانس لی اور بولنا شروع کیا۔
''میں رات میں سیکیورٹی کی ڈیوٹی کرتا ہوں اور میرے اوقات رات نو بجے سے صبح یارڈ کا دروازہ کھلنے تک ہیں۔ پیر اور منگل کی درمیانی شب ایک بجے کے قریب میں نے ایک شخص کو ٹارچ ہاتھ میں لیے کچھ تلاش کرتے دیکھا۔ میں اسے دیکھنے کے لیے آگے بڑھا۔ شاید اس نے مجھے آتے ہوئے دیکھ لیا یا میرے قدموں کی چاپ سنی۔ بہرحال اس نے ٹارچ کی روشنی سیدھی میری آنکھوں پر ماری۔ وہاں میری حفاظت کرنے والا کوئی نہ تھا اور نہ ہی میں اس کی گولی کا نشانہ بننا چاہتا تھا لہٰذا میں نے پہلے فائر کردیا اور بے سوچے سمجھے دو گولیاں چلادیں جو اس کے سینے میں لگیں اور وہ موقع پر ہی دم توڑ گیا۔''
''کیا اس کے پاس کوئی ہتھیار تھا؟'' ڈولنگر نے پوچھا۔
''میں نے نہیں دیکھا لیکن مجھے یہ معلوم نہیں تھا۔''
''کیا اس نے کچھ کہا تھا؟''
''بس ایک ہلکی سی غراہٹ نکلی تھی جب پہلی گولی اسے لگی۔''
''کیا تمہارے پاس اسلحے کا لائسنس ہے؟''
''ہاں۔''
''تمہارا اعشاریہ تین آٹھ کا ریوالور کہاں ہے؟''
''دریا میں۔ اس کے ساتھ ٹارچ، کیمرا اور جوتے بھی پھینک دیے۔''
''جوتے کیوں؟'' مورگن نے پوچھا۔
''اس نے جوتوں پر فولاد کی پتری چڑھائی اور اس طرح وہ باڑ پر چڑھ گیا۔ اس کے پاس کوئی شناختی کارڈ یا کاغذات نہیں تھے اور میں نہیں جانتا کہ وہ کوئی پولیس والا تھا یا کوئی چور لیکن مجھے ڈر تھا کہ اگر میں نے اس کے پیروں میں جوتے چھوڑ دیے تو کوئی بھی شخص سمجھ جائے گا کہ وہ کس مقصد کے لیے استعمال کیے گئے تھے۔''
''لہٰذا۔'' ایش فورڈ نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ''فولادی پٹیاں اتارنے کے بجائے تم میرے لاکر میں گئے اور وہاں سے میرے ورک بوٹ لاکر اسے پہنادیے۔''
''جیسا کہ میں نے تمہیں بتایا تھا باس۔ لاکر میں وہی جوتے سب سے بڑے تھے۔''
''تمہیں اس واقعے کا کب پتا چلا؟'' ڈولنگر نے ایش فورڈ سے پوچھا۔
''کل صبح۔''
''تمہارے علاوہ اور کون اس بارے میں جانتا ہے؟''
ایش فورڈ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اوبرن کے اشارے پر ڈولنگر نے ان دونوں کو گرفتار کرلیا لیکن اس سے پہلے ایش فورڈ کے فائدے کے لیے رابرٹ کا ریکارڈ شدہ بیان اسے سنایا گیا۔ ڈولنگر نے دونوں کی تلاشی لی لیکن ہتھکڑی نہیں لگائی اور بولا۔ ''تم دونوں کو وکیل کی ضرورت پیش آئے گی۔''
اس کارروائی کے ختم ہوتے ہی کیسٹرل پسینے میں شرابور دوبارہ نمودار ہوا اور کہنے لگا۔ ''لیفٹیننٹ، میں تمہیں اینٹوں سے بنی ہوئی عمارت کے عقبی حصے میں کچھ دکھانا چاہتا ہوں۔''
''کیا پھر کوئی زہریلی گیس دریافت ہوگئی؟'' اوبرن نے پوچھا۔
''میں نے میتھائل ایتھائل کیسٹون اور اسٹائرین کے خالی ڈرم دیکھے ہیں اور جنوبی باڑ کی طرف جانے والے راستے پر ان کے نشانات بھی نظر آرہے ہیں۔''
''اس کا مطلب ہے کہ ان کیمیکلز کو جان بوجھ کر گرایا گیا تاکہ ہم زیادہ دیر تک وہاں نہ ٹھہر سکیں۔'' اوبرن نے کہا۔
''میں تو یہ کہوں گا کہ کسی دوسری بُو کو چھپانے کے لیے ایسا کیا گیا۔'' کیسٹرل نے خیال ظاہر کیا۔
جب وہ عمارت پر پہنچے تو کیسٹرل اسے دائیں طرف

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

والی راہداری کے آخری سرے پر لے گیا اور ٹیوب لائٹس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''یہ خراب نہیں ہیں بلکہ انہیں ڈھیلا کردیا گیا ہے۔ گرد پر دستانوں کے نشان صاف نظر آرہے ہیں اس کا مطلب ہے کہ یہ کارروائی حال ہی میں کی گئی ہے اور یہ رکاوٹیں بھی گزشتہ روز کھڑی کی گئی ہیں۔ ان میں لگایا ہوا سیمنٹ ابھی تک گیلا ہے۔''

اوبرن نے اضطراب کے عالم میں کوریڈور پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ ''وہ کیا چھپانے کی کوشش کررہے تھے؟''

جواب میں کیسٹرل نے ایک دیوار پر ٹارچ کی روشنی ڈالی جس پر تازہ تازہ پینٹ کیا گیا تھا اور کئی کیڑے اس سے چپکے ہوئے تھے۔

''اس دیوار پر تیزی سے خشک ہونے والا پرائمر لگایا گیا ہے۔ جس میں شامل الکحل مکھیوں کو اپنی جانب کھینچتی ہے اور وہ اس سے چپک کر رہ جاتی ہیں۔ اس کے بعد کسی شخص نے اس جگہ کی صفائی کیے بغیر سفید رنگ کردیا۔''

''گویا تمہارا خیال ہے کہ اس دیوار پر گزشتہ ایک دو روز میں رنگ کیا گیا ہے؟'' اوبرن نے پوچھا۔

''میرا تو خیال ہے کہ صرف رنگ نہیں بلکہ یہ دیوار ہی گزشتہ ایک دو روز میں بنائی گئی ہے۔'' تم چاہو تو اسے چیک کرسکتے ہو۔''

گوکہ دیکھنے میں اس دیوار کا پلاستر بے جوڑ نظر آرہا تھا لیکن اس میں آٹھ فٹ کا حصہ اندر سے کھوکھلا تھا۔ اوبرن نے اس جگہ پر زور سے ہاتھ مارا تو ایک گونج پیدا ہوئی۔ فوراً ہی دو کدال منگوائے گئے اور اوبرن کے ساتھ آئے ہوئے سپاہیوں نے دیوار کے اس حصے کو گرانا شروع کردیا۔ وہاں ایک دروازہ نمودار ہوا۔ جس کے ساتھ ہی تہ خانے کی سیڑھیاں تھیں۔ جب وہ تہ خانے میں گئے تو ان کی آنکھیں حیرت سے پھٹی رہ گئیں۔ وہاں لاکھوں ڈالر مالیت کے مسروقہ کپڑے رکھے ہوئے تھے جن میں مردانہ، زنانہ اور بچوں کے ملبوسات شامل تھے اور ان میں سے بیشتر مشہور ترین ڈیزائنرز کے تیار کردہ تھے۔

ایجنٹ مورگن کا خیال تھا کہ وہ فرانسس کو اپنے ساتھ ہی بالٹی مور لے جائے گا تاکہ وکیل کے آنے سے پہلے وہ اس سے پوچھ گچھ مکمل کرلے۔ لیکن اس نئی دریافت کے بعد اسے وقتی طور پر رکنا پڑ گیا۔ جس کے نتیجے میں ایک درجن سے زیادہ لوگوں کو گرفتار کیا گیا۔ جن پر بڑے پیمانے پر کپڑے چرانے کا الزام تھا۔ اس کے علاوہ فرانسس اور ایش فورڈ پر ایف بی آئی ایجنٹ برنارڈ کے قتل کا بھی الزام تھا۔

اتوار کی سہ پہر اوبرن اور ڈولنگر اپنے دفتر میں بیٹھے رپورٹ تیار کررہے تھے۔ تبھی اوبرن نے کہا۔ ''میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ جب ہم پہلی بار اس عمارت میں گئے تھے تو تم نے ان سیڑھیوں کی موجودگی پر توجہ کیوں نہیں دی؟''

''میری تمام توجہ ان چیزوں پر تھی جو میرے راستے میں آرہی تھیں۔'' ڈولنگر نے جوابی حملہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اور میں بھی یہ نہیں سمجھ پارہا کہ جب تم دوسری بار عمارت میں گئے تو ان سیڑھیوں کی غیر موجودگی کا نوٹس کیوں نہیں لیا؟''

''میں بہت مصروف تھا۔'' اوبرن نے کہا۔ ''ویسے میں نے پہلی بار بھی وہ سیڑھیاں نہیں دیکھی تھیں۔''

ایک لمحہ کے توقف کے بعد اوبرن نے کہا۔ ''میں اب تک یہ نہیں سمجھ پایا کہ تم نے منگل کے روز سورج نکلنے سے پہلے مجھے فون کیوں کیا؟ حالانکہ یہ ایک معمول کا کیس تھا اور اس کی ابتدائی کارروائی تم خود بھی کرسکتے تھے۔''

''وہ ایک خوب صورت صبح تھی۔ میں نے سوچا کہ تمہیں بھی اس کارروائی میں شریک کرلوں۔''

''میں اصل وجہ جاننا چاہتا ہوں۔'' اوبرن نے اس کے چہرے کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''بات دراصل یہ ہے۔'' ڈولنگر ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ''موک کی کمپنی نے ڈیڑھ سال قبل میرے گھر پر نئی چھت ڈالی تھی لیکن ہر بارش کے موقع پر وہاں سے پانی ٹپکنے لگتا۔ میں نے بارہا ان کی توجہ اس جانب دلائی لیکن وہاں سے کوئی نہیں آیا۔ لہٰذا میں نے بھی ان کے پیسے روک لیے۔ میں نہیں سمجھتا کہ سوٹ اور ٹائی میں وہ مجھے پہچان سکتا تھا لیکن میں اپنے طور پر اس کیس کی گہرائی میں نہیں جانا چاہ رہا تھا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ مجھ پر مفادات کے ٹکراؤ کا الزام لگ جائے۔''

اوبرن مسکراتے ہوئے بولا۔ ''تم نے اصل بات اب بھی نہیں بتائی۔ پھر بھی میں یہ مان لیتا ہوں کہ تمہاری بتائی ہوئی پہلی وجہ مجھے بہتر لگی۔ واقعی وہ ایک سہانی صبح تھی جس سے ہم ایک نئے انداز میں لطف اندوز ہوئے۔''

اوبرن جانتا تھا کہ ڈولنگر نے اسے فون کرکے کیوں بلایا تھا۔ اصل بات یہ تھی کہ کسی واضح ثبوت کے نہ ہونے کی وجہ سے ڈولنگر کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ تفتیش کا آغاز کہاں سے کرے۔ اسے اوبرن کی مہارت اور صلاحیت کا اندازہ تھا۔ اس لیے اس نے اسے فون کردیا اور اب ڈولنگر کو اطمینان تھا کہ اس نے فیصلہ کرنے میں غلطی نہیں کی تھی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com

www.paksociety.com

وہ ایک بڑی گاڑی تھی جس کو دھکیلتا ہوا بہت دور تک لے آیا تھا۔

یہ ایک تقریباً نئی گاڑی تھی۔ چمکتی ہوئی اور قیمتی۔ اس کے شیشے قیمتی تھے۔ اس کے ٹائر قیمتی تھے اور اس کے اندر لگا ہوا ڈیک بھی قیمتی تھا۔

اس کی تجربہ کار نگاہوں نے ایک ہی نگاہ میں اُن سب چیزوں کی مالیت کا اندازہ کرلیا تھا۔ کم از کم بھی پچاس ہزار کی مالیت کا سامان تھا۔

ایک غلطی

سرور اکرام

کوئی غلطی ایک بار ہوتی ہے... اور وہی آخری غلطی کا درجہ حاصل کرلیتی ہے... ایک ماہر چور کی چور بازیاں... اس کا ہاتھ لگتے ہی ہر قفل کھل جا سم سم کے مانند کھلتا چلا جاتا... مگر ایک دن اس سے معمولی سی چُوک ہوگئی...

اپنے ماحول میں گھومتی مختصر شگفتہ کہانی

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

اس کا طریقۂ واردات بہت سائنٹیفک تھا۔ وہ کسی بھی گاڑی کو ایک نظر میں بھانپ کر اور یہ دیکھ کر کے اس کا مالک آس پاس نہیں ہے، اس کی جگہ سے دھکیلتا ہوا کہیں دور لے جاتا۔

اس کے لیے کسی گاڑی کے لاک ہونے یا نہ ہونے کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ اگر لاک بھی ہو تو اس کے ایک اشارے پر گاڑی کا لاک کھل جاتا تھا۔

گاڑی کو وہاں سے دور ہٹا کر وہ اپنی کارروائی میں مصروف ہو جاتا۔ اس دوران ابراہیم کاکا کو فون بھی کر دیتا۔ ابراہیم کاکا اپنی پرانی وین لے کر اس کے بتائے ہوئے مقام پر پہنچ جاتا۔ وین گاڑی کے آگے کھڑی کر دی جاتی۔ اس کا دروازہ کھول دیا جاتا۔

پھر اس کے کاریگر ہاتھ اس گاڑی سے سامان نکال نکال کر کاکا کی وین میں منتقل کرتے رہتے۔ آس پاس سے گزرنے والے حتیٰ کہ خود پولیس والے بھی گزرتے ہوئے یہی خیال کرتے کہ شاید خراب ہو گئی ہے اور اس کا سامان کسی وجہ سے مکینک کی گاڑی میں شفٹ کیا جا رہا ہے۔

یہ کام بہت عرصے سے کامیابی کے ساتھ چل رہا تھا۔

نواز ابھی تک گرفت میں نہیں آسکا تھا۔ کیونکہ وہ یہ سارا کام انتہائی ہوشیاری سے کرتا۔ ابراہیم کاکا بہت عقلمندی سے سامان کو ٹھکانے لگاتا اور رقم میں سے اپنا کمیشن کاٹ کر بقیہ پوری ایمانداری کے ساتھ نواز کے حوالے کر دیتا۔

نواز کو زیادہ کی ہوس بھی نہیں تھی۔ اس معاملے میں وہ بہت محتاط تھا۔ مہینے میں صرف ایک یا دو گاڑیاں اس کا نشانہ بنتیں۔ بقیہ سارا مہینہ وہ انہی پیسوں میں گزارا کرنے کی کوشش کرتا۔

اس نے یہ کاریگری ایک ماہر اُستاد سے سیکھی تھی۔

دس برس اس نے استاد کی خدمت کی تھی۔ اس استاد کا یہ کہنا تھا کہ دنیا میں ایسی کوئی گاڑی ابھی تک نہیں بنی ہے جو استاد کے ہاتھوں کو روک سکے۔

محفوظ سے محفوظ گاڑیاں بھی استاد کی انگلیوں کا لمس پا کر موم کی طرح پگھل جاتی تھیں اور استاد ان سے اپنی مرضی کا سامان اس طرح وصول کر لیتا جیسے یہ اس کی گاڑی ہو۔

استاد نے اس کام کے کئی اُصول بنا رکھے تھے۔

جیسے کبھی کسی غریب کی گاڑی کو مت چھیڑنا۔ یہ بے چارے پیسہ پیسہ جوڑ کر گاڑیوں میں قیمتی چیزیں لگواتے ہیں جب بھی ہاتھ ڈالو، بڑی گاڑی پر ڈالو۔ پندرہ بیس لاکھ کی گاڑی لینے والا پچاس ساٹھ ہزار یا ایک لاکھ تک کا صدمہ آسانی سے برداشت کر جاتا ہے۔

گاڑی کا سامان اسی جگہ نہ نکالو جہاں وہ کھڑی ہوئی ہو۔ بلکہ اسے کچھ فاصلے پر لے جاؤ۔ اس کے علاوہ اس بات کا بھی اندازہ لگا لو کہ گاڑی کا مالک کتنی دیر میں واپس آنے والا ہے۔

گاڑی شاپنگ مال کے سامنے کھڑی ہے تو مالک کو واپسی میں دیر لگ جائے گی۔ اگر کسی چھوٹی دکان کے سامنے کھڑی ہے تو فوراً آجائے گا۔

اگر شادی ہال کے باہر کھڑی ہے تو آرام سے کام کرو۔ چار پانچ گھنٹوں سے پہلے وہ باہر نہیں آئے گا لیکن پھر بھی اس کی گاڑی کو اس جگہ سے دور لے جاؤ۔

اس کے علاوہ اُستاد نے ہر قسم کے لاک کھولنے کی ترکیب بھی سکھا دی تھی۔ اس نے ایک کرم یہ بھی کیا کہ ابراہیم کاکا جیسے آدمی سے ملوا دیا تھا۔ یہ چوری کے مال کے پیسے فوراً ہی دے دیا کرتا تھا۔

اپنی تکنیک کی وجہ سے وہ ابھی تک گرفت میں نہیں آسکا تھا۔

لطف یہ ہے کہ خود پولیس والے بھی اسے چوری کرتے ہوئے دیکھ کر آگے بڑھ جاتے تھے۔

اس مہینے کا کوٹا وہ پورا کر چکا تھا لیکن شاہینہ اس کے پیچھے پڑ گئی تھی۔ ”مجھے آج ہر حال میں شاپنگ کرنی ہے۔“ اس نے فون پر نواز کو بتایا۔

”تو کرلو شاپنگ، کس نے منع کیا ہے؟“

”نہیں، تمہارے ساتھ کرنی ہے اور تمہارے پیسوں سے کرنی ہے۔“ اس نے کہا۔

”یار کیوں بُور کر رہی ہو۔ فی الحال میرے پاس کچھ نہیں ہے۔“

”یہ میں نہیں جانتی۔ آج ہی، کہیں سے بھی لاؤ۔“

”اچھا بابا، لے آؤں گا کہیں سے۔“

شاہینہ کی کوئی بات ٹالنا اس کے بس میں نہیں تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو ٹوٹ کر چاہتے تھے۔ نواز کی خشک زندگی میں شاہینہ نے خوشیوں کے رنگ بھر دیے تھے۔ ورنہ اس کی تنہائیاں اس کی جان لے لیتیں۔

اس نے شاہینہ کو اپنے اصل کام کے بارے میں کچھ

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

نہیں بتایا تھا اور بتا ہی نہیں سکتا تھا۔

وہ خود ایک پڑھی لکھی اور اچھے گھرانے کی لڑکی تھی۔ ایک دفتر میں جاب کرتی تھی۔ نواز نے اپنے بارے میں یہی بتایا تھا کہ وہ بھی کسی فرم میں جاب کرتا ہے اور اس کی سیلری اچھی خاصی ہے۔ اس لیے وہ مہینے میں یا دو مہینوں میں شاہینہ کو شاپنگ بھی کروادیا کرتا۔

اس بارے میں بھی استاد نے ہی اسے ایک اصول بتایا تھا۔

''دیکھو بیٹا، جب کہیں سے پیسے آجائیں تو بہت احتیاط سے خرچ کرنا۔ ہمیشہ اپنے آپ کو مفلس ظاہر کرتے رہنا۔ ایسا نہ ہو کہ پیسے آتے ہی خود کو بادشاہ سمجھنے لگو۔ اب یہ دو کوڑی کے چھچھورے اسی لیے تو پھنس جاتے ہیں کہ دولت ان سے ہضم نہیں ہوتی۔ وہ نمائش کرنے لگ جاتے ہیں۔ گاڑی خرید لی۔ قیمتی موبائل لے لیا۔ اپنی محبوبہ کو مہنگی شاپنگ کروادی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ شک میں پڑ جاتے ہیں اور پولیس تو ایسے شکار کی تلاش میں ہی رہتی ہے، سمجھ گئے نا۔''

''ہاں استاد میں سمجھ گیا۔ بے فکر رہو، میں اتنا چھچھورا نہیں ہوں۔''

اس لیے اس نے شاہینہ کے ساتھ بھی اپنا رویہ بہت محتاط رکھا تھا بس کبھی کبھی شاپنگ کرادی یا کسی اچھے سے ہوٹل میں کھانا کھلادیا۔

شاہینہ بھی یہی کہا کرتی کہ پیسے بچا کر رکھو، ہمارے آئندہ کام آئیں گے۔ وہ یہ تصور کر چکی تھی کہ مستقبل میں وہ اور نواز ایک ہونے والے ہیں۔

اسی لیے نواز بہت محتاط تھا۔

اس نے کبھی اپنے دوستوں کو بھی شک نہیں ہونے دیا تھا۔ محلے والے بھی یہی سمجھا کرتے کہ وہ ایک تعلیم یافتہ آدمی ہے اور کسی مناسب جگہ ملازمت بھی کرتا ہے۔

نواز یہ کام خود ہی کرتا تھا۔

اس نے کبھی کسی کو اپنے ساتھ شامل نہیں کیا۔ یہ بھی اس کے استاد کا مشورہ تھا۔ وہ کہا کرتا۔ ''خود اپنے آپ پر بھروسا کرو، اس قسم کے کام میں جہاں دو آدمی یا اس سے زیادہ ہو جاتے ہیں وہیں گڑبڑ ہو جاتی ہے۔ بس ایک ابراہیم کاکا تمہارے لیے بہت ہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی نہ ہو۔ گاڑی کو دھکا دے کر دوسری جگہ لے جانا ہو تو بھی کسی اور سے مدد نہ لیا کرو، خود محنت کرو۔''

آج بھی وہ استاد کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے گاڑی کو اس جگہ سے بہت دور لے آیا تھا جہاں مالک نے کھڑی کی تھی۔

وہ پسینے پسینے ہو رہا تھا۔ گاڑی ایک مناسب جگہ روک کر اس نے ابراہیم کاکا کو اپنی لوکیشن بتادی۔ ابراہیم کاکا کی وین پانچ منٹ کے اندر پہنچ چکی تھی۔

کارروائی شروع کر دی گئی۔ نواز کے لیے سب بہت معمولی باتیں تھیں۔ وہ اب اتنا ماہر ہو چکا تھا کہ پندرہ بیس منٹ کے اندر اندر کسی بھی گاڑی کا قیمتی سامان کاکا کی وین میں منتقل ہو جاتا تھا اور دیکھنے والے برابر سے دیکھتے ہوئے گزر جاتے۔

اچانک پولیس کی ایک موبائل اس کے پاس آکر رک گئی۔ کچھ دیر کے لیے اس کا دل دھڑکا تھا لیکن وہ بے پروائی کے ساتھ اپنے کام میں مصروف رہا۔

ایک پولیس آفیسر اس کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ ''کیا ہو رہا ہے یہ سب؟'' اس نے کرخت لہجے میں پوچھا۔

''جناب گاڑی خراب ہو گئی ہے۔'' نواز نے بتایا۔

''اس گاڑی کے کاغذات کہاں ہیں؟''

''کاغذات تو میں نہیں لایا۔ گھر پر ہیں۔ پھر کیا میں آپ کو چور دکھائی دے رہا ہوں۔ کیا آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ میں کسی اور کی گاڑی کا سامان وین میں ڈال رہا ہوں۔''

''میں نے یہ تو نہیں کہا لیکن اب یہ گاڑی تمہیں تھانے سے ملے گی۔ ہم اس کو اپنے ساتھ لے جا رہے ہیں۔ اور تم بھی ہمارے ساتھ چلو گے۔ تھانے پہنچ کر گھر سے کاغذات منگوا لینا۔''

''لیکن کیوں، میں نے ایسا کون سا جرم کر دیا ہے؟''

''کیا تمہیں معلوم نہیں کہ یہ شہر کا حساس ترین علاقہ ہے۔ یہاں آس پاس غیر ملکی سفارت کاروں کے بنگلے ہیں اور یہاں گاڑی کھڑی کرنا یا پارک کرنا سخت منع ہے۔ وہ دیکھو، وہ سامنے بورڈ بھی لگا ہوا ہے۔'' پولیس آفیسر نے ایک بورڈ کی طرف اشارہ کیا جس پر ''پارکنگ سختی سے منع ہے'' لکھا ہوا تھا۔

''بس اب تم ہمارے ساتھ بیٹھ جاؤ اور وین والے کو بھی ساتھ بٹھا لو۔ دونوں گاڑیاں تھانے پہنچ رہی ہیں۔''

وہ احتجاج بھی نہیں کر سکا تھا۔ کیونکہ استاد نے اس صورت حال کے بارے میں کوئی نصیحت نہیں کی تھی

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

حصار

محمد فاروق انجم

حصار خوابوں کا ہو... گلابوں کے موسم کا ہو... اندر تک سیراب کردیتا ہے... کسی کسی کی زندگی میں دلکشی و رعنائی کے اسرار کم... دولت و لالچ... بے حسی... اور خوف و دہشت کے حصار زیادہ ہوتے ہیں... ایسے ہی کرداروں کے گرد گھومتی کہانی... جو اپنی اپنی جگہ کسی نہ کسی حصار میں مقید تھے... ان کی خواہش و تمنائوں کا حصار اس قدر مضبوط تھا کہ وہ کسی طور اس سے نکل نہیں پارہے تھے... چاروں جانب ہوس و لالچ کی پختہ دیواریں کھڑی تھیں...

ہم پرست کے موضوع پر ایک منفرد کہانی... سرورق کا تیکھا رنگ...

ریسٹورنٹ کے ڈائننگ ہال میں ہلکی ہلکی رومانس سے بھری موسیقی اپنا رنگ بکھیر رہی تھی۔ شام کے سائے کچھ دیر قبل ہی دن کے اُجالے پر براجمان ہوئے تھے اس لیے ریسٹورنٹ میں ابھی رش نہیں تھا۔ پورے ڈائننگ ہال میں تین میزوں پر لوگ بیٹھے دکھائی دے رہے تھے۔ ایک میز پر ایک جوڑا اپنے دو بچوں کے ساتھ موجود تھا، دوسری پر دو افراد تھے جو کھانے پینے سے زیادہ شاید اپنی کاروباری بات چیت میں مصروف تھے جبکہ ایک میز جو اُن سے الگ دیوار کے ساتھ لگی ہوئی تھی، اس پر براجمان جوڑا اردگرد سے بے نیاز اپنی ہی دنیا میں مخمور تھا۔

وہ خوبرو اور نوجوان جوڑا تھا۔ لڑکے کا نام کاشف حسن تھا۔ وہ کلین شیو تھا، اس کے سر پر چھوٹے چھوٹے بال تھے اور اس نے جینز کے ساتھ آسمانی رنگ کی شرٹ زیب تن کی ہوئی تھی جبکہ اوپر اس نے کوٹ پہنا ہوا تھا۔ اس کے سامنے بیٹھی لڑکی کا نام تمثیلہ تھا جو اپنے نام کی طرح بہت خوبصورت تھی اور اس نے اپنے سنہری بال کھلے چھوڑے ہوئے تھے۔ اس کی غزالی آنکھوں میں عجیب سی کشش تھی جو کسی کو بھی اپنے حصار میں لینے کے لیے کافی تھی۔

دونوں باتیں کررہے تھے اور اس بات سے بے خبر تھے کہ ان کے دائیں بائیں کیا ہورہا ہے۔

کاشف اپنی نوکری کے سلسلے میں اس شہر میں ڈھائی سال سے مقیم تھا۔ کمپنی کا مالک منظر علی اس پر بہت اعتماد کرتا تھا۔ اس کی دانست میں کاشف جیسا ذہین اور کاروباری باریکیوں کو سمجھنے والا، اس کی کمپنی میں کوئی دوسرا نہیں ہے۔ اپنے تمام اہم کام وہ کاشف کے ہی سپرد کرتا تھا۔ کاشف نے کبھی منظر علی کو مایوس نہیں کیا تھا بلکہ اس کی توقع سے بھی بڑھ کر نتیجہ دیا تھا۔ اس لیے منظر علی نے کاشف کو رہنے کے لیے ایک گھر بھی دیا تھا جہاں کاشف اکیلا رہتا تھا۔ آنے جانے کے لیے کاشف کے پاس کمپنی کی دی ہوئی گاڑی تھی۔ کاشف اپنی نوکری سے خوش تھا اور جو کام بھی اس کے

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

ذمے ہوتا تھا وہ پوری ذمے داری سے نبھاتا تھا۔

نیلم امیر ماں باپ کی آزاد خیال لڑکی تھی۔ دونوں کی ملاقات اچانک چند ہفتے قبل ہوئی تھی اور دونوں ہی ایک دوسرے کو اپنا دل دے بیٹھے تھے۔ نیلم ہمیشہ کاشف جیسے لڑکے کے ہی خواب دیکھتی تھی۔ نیلم امیر ماں باپ کی بیٹی تھی لیکن اس کا باپ کوئی بزنس نہیں کرتا تھا بلکہ وہ ایک بڑا سرکاری آفسر تھا اور پیسہ جانے کہاں سے اور کیسے برس رہا تھا، نیلم کی ماں اور خود نیلم کو یہ جاننے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ ایک خوش حال زندگی گزار رہی تھیں اور انہیں اپنے عیش و آرام سے سروکار تھا۔ دونوں ماں بیٹی کو خرچ کرنے کے لیے کھلا پیسہ ملتا تھا اور کہیں بھی آنے جانے کی مکمل آزادی تھی۔

نیلم اس وقت بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ اس نے اپنے ہونٹوں پر ہلکی سرخ لپ اسٹک لگا رکھی تھی اور سرخ رنگ کی قمیص زیب تن کی تھی جبکہ سر کے بالوں کو پیچھے کی طرف لے جا کر اس نے خوبصورت انداز میں کھلا چھوڑا ہوا تھا۔

''کاشف ایک بات پوچھوں؟'' ہلکی ہلکی موسیقی میں نیلم نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ایک چھوڑ...... ہزار پوچھ۔'' کاشف مسکرایا۔ وہ اس وقت بہت اچھے موڈ میں تھا۔

''مجھے تمہاری یہ بات بہت اچھی لگی کہ تم نے مجھے صاف بتا دیا تھا کہ مجھ سے پہلے تمہاری نوشین سے دوستی تھی۔'' نیلم بولی۔ ''اور میں نے بھی اپنے بارے میں تمہیں سچ بتایا تھا کہ میں بھی اپنے کزن کو پسند کرتی تھی لیکن جب تم سے ملاقات ہوئی تو میں نے اس کا خیال دل سے نکال دیا۔ کیونکہ تم ہی وہ مرد ہو جس کی میرے دل نے خواہش کی تھی۔ اب میری زندگی میں صرف تم ہو۔ میرے دل و دماغ میں کسی اور کا خیال بالکل بھی نہیں ہے۔ لیکن نوشین تم سے اب بھی ملتی ہے، تم اسے چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟'' نیلم کی نگاہیں کاشف کے چہرے پر تھیں اور اس کی انگلیاں گلاس کے کنارے پر رقص کر رہی تھیں۔ اس نے وہ بات مختصر تمہید کے بعد کہہ دی تھی جو اس کے دل میں کھٹک رہی تھی۔

نیلم کی بات سن کر کاشف کے چہرے پر متانت آگئی۔

''یہ سچ ہے کہ میں اسے دل سے نکال چکا ہوں اور اب صرف میرے دل میں تم ہو۔ لیکن وہ میرا پیچھا نہیں چھوڑ رہی۔ وہ ضدی اور جذباتی لڑکی ہے۔ میں اس سے بہت پیچھے ہٹ گیا ہوں۔ لیکن اسے صاف کہنے سے اس لیے ڈرتا ہوں کہ وہ کہیں کوئی ہنگامہ نہ کردے۔ میں آہستہ آہستہ اس کو نظر انداز کرتے ہوئے اسے یہ احساس دلانے کی کوشش کررہا ہوں کہ وہ خود ہی سمجھ جائے اور بغیر کسی ہنگامہ آرائی کے وہ میرا پیچھا چھوڑ دے۔ نوشین کے اندر برداشت کی

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

طاقت نہیں ہے، اور وہ فوراً غصے میں آجاتی ہے۔‘‘

’’لیکن اس کے باوجود اسے جب بھی موقع ملتا ہے وہ تم سے ملاقات کرنے تمہارے سامنے موجود ہوتی ہے۔‘‘ نیلم نے کہا۔

’’وہ میرے سرد رویّے سے کچھ سمجھ ہی نہیں رہی ہے۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ کچھ بھی ہو، مجھے اس سے دوٹوک اور واضح الفاظ میں کہنا پڑے گا کہ وہ میری زندگی سے نکل جائے۔ اب میرے دل میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔‘‘ کاشف نے کہنے کے بعد جوس کا گلاس اپنے ہونٹوں سے لگایا اور ایک گھونٹ لے کر گلاس رکھ دیا۔

’’میں بھی یہی چاہتی ہوں کہ تم اسے صاف اور واضح کہہ دو۔ اب مجھ سے یہ برداشت نہیں ہوتا ہے کہ وہ تم سے بات بھی کرے۔‘‘ نیلم کے لہجے میں یکدم ترشی آگئی تھی۔

’’میں تمہارے ساتھ اب کسی کو نہیں دیکھنا چاہتی۔ کیونکہ میں چاہتی ہوں کہ ہم اب شادی کرلیں۔‘‘

’’ہاں مجھے ایسا ہی کرنا چاہیے۔ مجھے ہمت سے کام لے کے اُسے بتادینا چاہیے۔ میری بات سن کے وہ کتنا بولے گی اور میری بات پر کتنا ہنگامہ کرلے گی۔ اپنے دل کا غبار نکال کر وہ خود ہی چپ ہوجائے گی۔ اس کے بعد سب ختم ہوجائے گا اور پھر کبھی اس سے میرا سامنا نہیں ہوگا۔‘‘ نیلم کی بات نے شاید کاشف کے اندر ہمت پیدا کردی تھی۔ جس کام کے لیے وہ سستی کا مظاہرہ کررہا تھا، اب وہ اس کام کو کرنے کے لیے تیار ہوگیا تھا۔ کاشف کا یہ جوش دیکھ کر نیلم مسکرائی۔

’’کاشف مجھے تم سے بہت محبت ہے۔‘‘ اس نے اس کی طرف بدستور دیکھتے ہوئے کہا۔

’’میں جانتا ہوں۔‘‘ وہ مسکرایا۔

’’کیا خیال ہے اب چلیں۔ بہت دیر ہوگئی ہے۔‘‘ نیلم نے گھڑی میں وقت دیکھا۔

’’ابھی تو چھ بجے ہیں۔‘‘ کاشف کا بھی دھیان اپنی گھڑی کی طرف چلا گیا۔

’’سردیوں میں چھ بجے کا وقت بھی ایسا لگتا ہے جیسے بہت رات ہوگئی ہو اور پھر مما کے بھی دو میسج آچکے ہیں۔ وہ مجھے جلد گھر آنے کا کہہ رہی ہیں ویسے دیکھ رہی ہوں کہ مما اور پپا کچھ پریشان دکھائی دے رہے ہیں۔‘‘ نیلم نے اپنا پرس اُٹھایا۔ کاشف نے ویٹر کو بلا کر بل ادا کیا اور دونوں ریسٹورنٹ سے باہر آگئے۔

کاشف نے نیلم کو اس کے گھر سے کچھ فاصلے پر اتارا۔

دونوں نے محبت بھری نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور نیلم اپنے گھر کی طرف چل دی جبکہ کاشف نے کار آگے بڑھا دی۔ کاشف کا گھر وہاں سے دور نہیں تھا۔ کاشف اور نیلم اس بات سے بے خبر تھے کہ ان دونوں کو ایک ساتھ نوشین نے اچانک چوراہے پر اس وقت دیکھ لیا تھا جب لال بتی کی وجہ سے کاشف نے کار روکی تھی۔ ان دونوں کو دیکھ کر نوشین کے تن بدن میں جیسے آگ بھر گئی تھی۔

☆☆☆

سورج ابھی ڈوب رہا تھا جب ایک پولیس اہلکار نے اپنی کھٹارا سی موٹر سائیکل ایک طرف کھڑی کی اور سامنے کی عمارت کی طرف تیز تیز قدم اُٹھا دیے۔

اس عمارت میں کئی کمرے تھے اور زیادہ تر وہاں دوسرے شہر سے آئے طلبا اور نوکری کی غرض سے اس شہر میں مقیم لوگ کرائے پر رہا کرتے تھے۔ پولیس اہلکار تیز تیز سیڑھیاں چڑھ کر دوسری منزل پر گیا اور ایک بند دروازے کے سامنے کھڑا ہو کر اسے زور زور سے بجانے لگا۔ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس کی سانس پھول گئی تھی اور اس کی توند تیزی سے آگے پیچھے ہورہی تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد دروازہ کھلا تو ایک شخص کا چہرہ نمودار ہوا جس کی شیو بڑھی ہوئی تھی اور بال کھچڑی ہورہے تھے۔ شاید وہ کئی دن سے نہیں نہایا تھا اور نہ ہی اس نے سر کے بالوں میں کنگھی کی تھی۔ اس کا نام خیام تھا۔ اس نے پولیس اہلکار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

’’کیا بات ہے خیر تو ہے؟‘‘

پولیس اہلکار اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے اندر چلا گیا اور خود ہی اس نے دروازہ بند کردیا۔

’’نکلنے کی تیاری کرو۔ تمہارے خلاف بیس لاکھ روپے کا چیک کیش نہ ہونے کا مقدمہ درج ہوگیا ہے۔‘‘ اس نے اپنی آواز دھیمی رکھتے ہوئے اسے اطلاع دی۔

پولیس اہلکار کی بات سن کر خیام کے چہرے پر پریشانی عیاں ہوگئی۔ ’’کیا کہہ رہے ہو تم؟‘‘

’’میں وہی کہہ رہا ہوں جو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ تم نے اپنے بزنس پارٹنر کو جو چیک دیا تھا، وہ کیش نہیں ہوا اور تم اس کو کئی دنوں سے مل بھی نہیں رہے۔ اس لیے آج دوپہر کو وہ آیا اور اس نے تمہارے خلاف مقدمہ درج کرادیا ہے۔ اب وہ خود تمہیں تلاش کرے گا اور پولیس کو اطلاع کر کے تمہیں گرفتار کرادے گا۔‘‘

’’میرے خلاف آج دوپہر کو پرچہ کٹا اور تم مجھے اب

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

www.paksociety.com

اطلاع دے رہے ہو۔ اس دوران اگر وہ مجھے تلاش کر لیتا تو میں تو گیا تھا جیل۔'' خیام نے اسے گھور کر دیکھا۔

''کمال ہے۔ میں ڈیوٹی چھوڑ کر کیا تمہیں اطلاع دینے آجاتا۔ جو موبائل نمبر تم نے تبدیل کیا ہے، وہ مجھے نہیں دیا اور میرا تمہارا دور کا تعلق ہے اس لیے جیسے ہی موقع ملا، تمہیں اطلاع دینے آ گیا۔'' اہلکار نے کہا۔

خیام بے چینی سے سوچنے لگا۔ وہ پریشان ہو گیا تھا۔ وہ اہلکار پھر بولا۔ ''میرا مشورہ مانو پیسے دے دو۔ پکڑے گئے تو ضمانت نہیں ہوگی۔''

''میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ تم جاؤ میں دیکھتا ہوں کہ کیا کرنا ہے۔'' خیام بولا۔

''اب ایسے ہی چلا جاؤں؟ تمہیں اطلاع دی ہے۔ موٹر سائیکل کا پیٹرول جلایا ہے۔'' اہلکار نے اپنے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

خیام نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا اور جیب میں ہاتھ ڈال کر پانچ سو کا نوٹ نکالا اور اس کی طرف ایسے بڑھا دیا جیسے وہ پیسے دیتے ہوئے شدید تکلیف سے دوچار ہو۔ اہلکار نے جھٹ پانچ سو کا نوٹ لے کر جیب میں ڈالا اور چلا گیا۔

خیام کمرے میں ٹہلتا اور سوچتا رہا پھر اس نے جلدی سے اپنا سامان ایک بیگ میں ڈالا شیو کی، بالوں کو گیلا کر کے ان میں کنگھی کی اور آئینے میں اپنا جائزہ لیا۔

خیام کی عمر پینتالیس سال کے لگ بھگ تھی۔ اس کا رنگ صاف اور چہرہ کئی دنوں کے بعد مونچھ داڑھی سے مبرّا ہونے کے بعد فریش دکھائی دے رہا تھا۔ خیام کے ماتھے پر اکثر سلوٹیں دکھائی دیتی تھیں۔ اس وقت وہ سلوٹیں اور بھی واضح ہو جاتی تھیں جب وہ گہری سوچ میں ہوتا تھا۔ ویسے بھی خیام ایک زیرک اور مشاق شخص تھا۔

باتھ روم سے باہر نکل کر اس نے اپنا بیگ اُٹھایا اور تھوڑا سا دروازہ کھول کر باہر جھانکا اور پھر تیزی سے سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ وہ سیڑھیاں ایسے اترا جیسے ہوا میں اُڑ رہا ہو۔ اندھیرا چھا گیا تھا۔ عمارت سے نکلتے ہی وہ تیز تیز قدم اُٹھاتا تاریکی میں گم ہو گیا۔

☆☆☆

کاشف کا گھر گلی کے نکڑ پر تھا اور اس کے دو دروازے لگتے تھے۔ ایک مین گیٹ تھا جبکہ دوسرا دروازہ گھر کے دائیں جانب تھا۔ وہ دروازہ سیدھا ٹی وی لاؤنج میں کھلتا تھا۔ اسے چھوٹا دروازہ کہتے تھے۔ کاشف سے ملنے والے اسی دروازے سے آتے جاتے تھے۔ اسی دروازے کی طرف اس علاقے کا پارک تھا۔

کاشف نے اپنی کار کھڑی کی اور اتر کر گیٹ کا تالا کھولا اور گیٹ کھول کر پھر اپنی کار میں بیٹھا اور کار اندر لے گیا۔ وہ وسیع گیراج تھا جہاں بیک وقت دو کاریں کھڑی ہو سکتی تھیں۔ کار کھڑی کرنے کے بعد وہ کار سے باہر نکلا اور گیٹ بند کرنے لگا۔ ابھی وہ گیٹ کو لاک بھی نہیں کر پایا تھا کہ اچانک ایک طرف سے نکل کر خیام اندر داخل ہو گیا۔ خیام کو یکدم اندر آتا دیکھ کر کاشف ایک لمحے کے لیے ٹھٹکا اور دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ خیام نے خود ہی گیٹ بند کر دیا۔

''خیام تم...... اچانک اس طرح کیوں میرے گھر میں داخل ہوئے ہو؟'' کاشف نے متحیر نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کیا ہم اندر بیٹھ کر بات کریں؟'' خیام کا لہجہ دھیما تھا۔

''میں اس وقت بہت تھکا ہوا ہوں اس لیے براہ مہربانی تم چلے جاؤ، اگر کوئی بات کرنا چاہتے ہو تو کل میرے آفس آجانا۔'' کاشف بولا۔

''کاشف اس وقت میں ایک بڑی مصیبت میں ہوں۔ پچھلے ایک گھنٹے سے سامنے پارک کے پودوں کے پیچھے چھپ کر بیٹھا تمہارا انتظار کر رہا تھا۔''

''تم وہاں چھپ کر کیوں بیٹھے تھے؟'' کاشف نے اس کی طرف مشکوک نظروں سے دیکھا۔

''اس جگہ بات کرنے کے بجائے بہتر ہے کہ ہم اندر جا کر بات کریں۔ میں نہیں چاہتا کہ ہماری آواز باہر تک جائے۔'' خیام کے لہجے میں استدعا تھی۔

کاشف کا دل تو نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ اس سے بات کرے، مگر بادلِ ناخواستہ اس کے ساتھ اندر کی طرف چل پڑا۔

دونوں لاؤنج میں بیٹھ گئے۔ اندھیرے میں ڈوبے ٹی وی لاؤنج کو کاشف نے اندر آتے ہی روشن کر دیا تھا۔ کاشف اور خیام ایک ساتھ اسی کمپنی میں کام کرتے رہے تھے جہاں کاشف اب بھی کام کرتا تھا۔ پھر اچانک خیام نے نوکری چھوڑ دی اور کسی کے ساتھ مل کر کاروبار شروع کر دیا۔ اس کے بعد گاہے گاہے ان کی ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔ اب کئی مہینوں کے بعد اچانک وہ اس کے گھر میں اس طرح داخل ہوا تھا۔

خیام تیز طرار اور شاطر آدمی تھا۔ اس کی بہت سی باتوں

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

سے کاشف کو اختلاف تھا اور یہی وجہ تھی کہ وہ اسے پسند نہیں کرتا تھا۔ بلکہ دورانِ ملازمت خیام نے کاشف سے کچھ رقم ادھار بھی لی تھی جو آج تک واپس نہیں کی تھی۔

''بولو کیا بات ہے؟'' کاشف نے پوچھا۔ اس کا انداز ایسا تھا کہ جیسے وہ اس بات کا متمنی ہو کہ خیام اپنی بات کہے اور وہ اسے چلتا کر دے۔ اس کا لہجہ بیزار کن تھا۔

''اس سردی میں تم مجھے چائے کا نہیں پوچھو گے؟'' خیام نے کہا۔

''جو شخص بہت پریشان ہو اسے کھانے پینے کی کب سوجھتی ہے؟'' کاشف نے اس کی طرف دزدیدہ نگاہوں سے دیکھا۔

خیام اس کی بات سن کر زیرِ لب مسکرایا اور اپنی بات کا آغاز کیا۔ ''کاشف تم جانتے ہو کہ میں نے کاروبار شروع کر دیا تھا۔ کاروبار میں سرمایہ کسی کا تھا اور کام میں کرتا تھا۔ کاروبار میں رفتہ رفتہ ہمارا لین دین بھی ہو گیا۔ مارکیٹ سے میں نے ادھار مال اُٹھا لیا تھا۔ بروقت ادائیگی پر ان کا اعتماد بڑھا اور انہوں نے مجھے بیس لاکھ روپے کا ادھار مال دے دیا۔ میں نے اس کے عوض بیس لاکھ کا چیک دے دیا۔ ایسا پہلے بھی کئی بار ہو چکا تھا کیونکہ میرا بزنس پارٹنر چیک کی تاریخ کے مطابق پیسے میرے اکاؤنٹ میں جمع کرا دیتا تھا اور بروقت ادائیگی ہو جاتی تھی لیکن اس بار اس نے سارا مال مارکیٹ میں دیا، مجھ سے بہانے سے بل بھی لے لیے اور جب بیس لاکھ روپے کی ادائیگی کا وقت آیا تو وہ رفوچکر ہو گیا۔ پیسے کا تقاضا مجھ سے ہونے لگا۔ پھر ان کو یہ بھی پتا چل گیا کہ میرا پارٹنر بھاگ گیا ہے۔ انہوں نے مجھے وارننگ دی۔ میرے پاس بیس ہزار بھی نہیں ہیں۔ میں ان کی وارننگ کے مطابق کیسے ادائیگی کر سکتا تھا۔ اب انہوں نے چیک باؤنس ہونے کا میرے خلاف پرچہ کٹوا دیا ہے اور میری گرفتاری کے لیے وہ سرگرم ہیں۔ میں کئی دنوں سے چھپ رہا ہوں اور اس وقت تمہارے پاس ہوں۔'' خیام بات کرتے ہوئے اپنے ہاتھ میں پکڑے اسمارٹ فون کو بھی غیر ارادی طور پر گھما رہا تھا اور اس کی بات سنتے ہوئے کاشف کی نگاہیں اس کے ہاتھوں کی طرف کئی بار گئی تھیں۔

''مجھے تمہاری اس کہانی پر یقین نہیں ہے۔'' کاشف نے صاف کہہ دیا۔

''تم میرا یقین کرو، میں سچ کہہ رہا ہوں۔'' اس نے یقین دلانے کی کوشش کی۔

''بہرحال...... اب تم کیا چاہتے ہو؟'' کاشف بغیر کسی بحث میں پڑنے کے بات کو سمیٹنا چاہتا تھا۔

''تم کسی طرح سے بیس لاکھ کا انتظام کر دو۔ میری اس کیس سے جان چھوٹ جائے تو میں جلد ہی بیس لاکھ کا انتظام کر کے تمہیں واپس لوٹا دوں گا۔'' وہ بولا۔

''تم واپس لوٹا دو گے؟'' کاشف کے چہرے پر تمسخرانہ مسکراہٹ آ گئی۔ ''اگر تم مجھے لوٹا سکتے ہو تو تم وہ پیسہ ان لوگوں کو دے کر اپنی جان کیوں نہیں چھڑا لیتے۔''

''گاؤں میں ہماری زمین ہے۔ میرے والد صاحب اتنے پڑھے لکھے نہیں ہیں کہ وہ اکیلے زمین کا سودا کر سکیں۔ ویسے بھی ان کو میں نے اس معاملے سے بے خبر رکھا ہوا ہے۔ اتنا ضرور بتایا تھا کہ میں نے اپنے پارٹنر سے علیحدگی اختیار کر لی ہے اور اب مجھے کاروبار کرنے کے لیے سرمائے کی ضرورت ہے تو میرے والد صاحب نے کہا تھا کہ تم وہ زمین بیچ دو۔ اب میں وہ زمین کیسے بیچ دوں۔ مجھے تو ہر لمحہ گرفتاری کا ڈر ہے۔'' خیام نے تفصیل بتائی۔

''پھر ایسا کرتے ہیں کہ میں تمہاری ڈیل کرا دیتا ہوں۔ میں ان سے اس زمین کے بارے میں بات کرتا ہوں۔ انہیں کیس واپس لینے پر مجبور کرتا ہوں اور تم ان کو وہ زمین دے کر اپنی جان چھڑا لو۔'' کاشف نے تجویز پیش کی۔

''ہماری وہ زمین تقریباً ساٹھ لاکھ مالیت کی ہے۔ اگر ہم نے ان سے لین دین کی بات کی تو مجھے وہ آدھی رقم پر ہی ٹرخانے کی کوشش کریں گے۔ ایسے معاملات میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ اس لیے تم میری مدد کرو اور بے شک تم خود وہ زمین بیچ کر اپنے پیسے اپنے پاس رکھ کر باقی مجھے دے دینا۔'' خیام نے کہا۔

''تمہارے ہاتھ میں پکڑا یہ موبائل فون کتنے کا ہے؟'' اچانک کاشف نے پوچھا۔

''یہ جب میں نے لیا تھا تو اس کی قیمت چالیس ہزار روپے تھی۔ ...... لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''مجھے لگا کہ یہ کافی قیمتی موبائل فون ہے۔ اسے بیچ کر بھی تم کچھ پیسے اکٹھے کر سکتے ہو لیکن خیر...... دیکھو خیام میرے پاس اتنی بڑی رقم نہیں ہے۔ میں تمہاری اس معاملے میں کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ اس لیے تم میرے پاس بیٹھ کر وقت ضائع کرنے کے بجائے کسی اور کا دروازہ کھٹکھٹاؤ تو بہتر ہے۔'' کاشف کھڑا ہو گیا جیسے وہ کہہ رہا ہو کہ میں نے جو کہنا تھا وہ کہہ دیا ہے اب تم جاؤ۔

''میں کہیں نہیں جا سکتا۔ تم اپنے باس سے بیس لاکھ روپے مانگ لو۔ صرف ایک ماہ کے لیے۔ وہ تم پر بہت اعتماد

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

کرتے ہیں۔ وہ تم کو بیس لاکھ دے دیں گے۔'' خیام اپنی جگہ اڑا رہا۔

''میرا اپنا ذاتی معاملہ بھی ہو تو میں کبھی ان سے ایک پائی نہ مانگوں۔ چاہے وہ مجھ پر کتنا ہی اعتماد کرتے ہوں۔'' کاشف نے کہا۔

''پھر کچھ کرو۔ میں بری طرح سے پھنسا ہوا ہوں۔'' خیام نے منت کی۔ ''تمہارے سوا میں اور کہیں نہیں جاسکتا۔''

کاشف نے دوٹوک لہجہ اپنالیا۔ ''میں کچھ نہیں کرسکتا۔ تم پلیز چلے جاؤ۔ میں تھکا ہوا ہوں اور سونا چاہتا ہوں۔''

''میں کہیں نہیں جاسکتا۔ مجھے گرفتاری کا خوف ہے۔'' اس کا رنگ اُڑ رہا تھا۔

''تو میں کیا کروں۔ پلیز نکلو میرے گھر سے۔'' کاشف نے اس کا بازو پکڑا اور چھوٹے دروازے کی طرف بڑھا۔

''پلیز میری مدد کرو۔ مجھ پر ترس کھاؤ۔ میں تمہارا دوست ہوں۔'' خیام نے التجا کی۔ کاشف اس کی بات نظر انداز کر کے اسے دروازے کی طرف کھینچ کر لے جارہا تھا۔

''میں تمہاری وجہ سے کسی مصیبت میں نہیں پڑنا چاہتا۔'' کاشف اس کی ایک بات بھی سننے کو تیار نہیں تھا۔ اس کی مزاحمت کے باوجود وہ اسے کھینچ کر دروازے تک لے گیا اور کنڈی کھول کر اسے باہر نکال کر ہی دم لیا۔ باہر جاتے ہی وہ چپ ہوگیا۔ وہ بول کر کوئی مصیبت مول لینا نہیں چاہتا تھا۔

کاشف نے دروازے کی کنڈی لگائی اور اپنے کمرے میں آگیا۔ اس نے کپڑے بدلنے کے لیے کوٹ اتارا اور باتھ روم چلا گیا۔ تولیا سے ہاتھ منہ خشک کرتا ہوا باہر نکل آیا۔ اچانک اس کی سماعت میں بیل کی آواز پڑی۔

کاشف نے ناگواری سے خیام کے بارے میں سوچا اور دل ہی دل میں کہا کہ یقیناً خیام ہی ہوگا۔ کاشف غصے سے دروازے کی طرف بڑھا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ صاف کہہ دے گا کہ وہ اگر یہاں سے نہ گیا تو وہ خود پولیس کو بلا لے گا۔ لیکن جیسے ہی اس نے دروازہ کھولا، چونک گیا۔ سامنے نوشین کھڑی تھی۔

نوشین کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ شدید غصے میں ہے۔ کاشف کو دیکھتے ہی اس کے چہرے پر کئی تاثرات ابھرے اور معدوم ہوئے۔ نوشین کو اچانک دیکھ کر کاشف نے ناگواری سے کہا۔

''نوشین تم......؟''

نوشین فوراً اندر چلی آئی۔ کاشف نے دروازہ بند کردیا۔ نوشین چلتی ہوئی کچھ آگے کھڑی ہوگئی اور کاشف کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھنے لگی۔ کاشف بھانپ گیا تھا کہ کوئی ایسی بات ہوئی ہے جس کی وجہ سے نوشین کا چہرہ اس کے غصے کی غمازی کررہا ہے۔

''میں چائے بنانے لگا تھا، تم چائے پیوگی؟'' کاشف پوچھتا ہوا امریکن اسٹائل کے اوپن کچن کی طرف بڑھا جہاں کھانا پکاتے ہوئے عین سامنے دیوار پر لگی ایل ای ڈی پر کوئی بھی پروگرام دیکھا جاسکتا تھا۔

''میں یہاں چائے پینے نہیں آئی۔ مجھے شک تھا کہ تم مجھے ایسے ہی نظر انداز نہیں کررہے ہو، ضرور کوئی بات ہے جس کا آج مجھے علم ہو ہی گیا ہے۔'' نوشین نے غصے سے کہا۔

''کیا علم ہوگیا ہے؟'' کاشف نے ساس پان اُٹھاتے ہوئے پوچھا۔

''تم نیلم کے ساتھ پیار محبت کا ڈراما کررہے ہو؟'' نوشین کی آواز بلند ہوگئی۔

کاشف نے نوشین کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''اچھا ہوا کہ تمہیں پتا چل گیا۔ میں وضاحت کردوں کہ میں اس کے ساتھ پیار محبت کا ڈراما نہیں رچا رہا بلکہ ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔''

''اگر تم اس کے ساتھ محبت کرتے ہو تو میرے ساتھ کیا کرتے رہے تھے؟'' وہ بولتی ہوئی اس کے پاس ہی کچن کے ایریے میں چلی گئی۔

کاشف بولا۔ ''وہ میری بے وقوفی تھی۔''

''کیا کہا تم نے؟ وہ تمہاری بے وقوفی تھی؟'' نوشین کا غصہ اور بھی دوچند ہوگیا۔ ''میری محبت کو تم بے وقوفی کا رنگ دے رہے ہو؟''

''شور مچانا بند کرو اور کان کھول کر سن لو کہ اچھا ہوا تمہیں سب پتا چل گیا ہے ورنہ میں تمہیں بتانے ہی والا تھا۔ میں اور نیلم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اور جلد شادی کرنا چاہتے ہیں۔ مجھے نیلم جیسی لڑکی چاہیے تھی۔ وہ مجھے مل گئی ہے۔ اور تم میرے دل سے نکل گئی ہو۔ اب تم میرا خیال اپنے دل سے نکال دو۔'' کاشف نے صاف الفاظ میں کہہ ڈالا۔

''یہ ناممکن ہے۔ نیلم نے میرے پیار پر ڈاکا ڈالا ہے۔ میں ابھی اس کے پاس سے آرہی ہوں، اس کی اوقات یاد

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

دلا دی ہے میں نے۔'' نوشین اسی لہجے میں بولی۔
''تم نیلم کے پاس گئی تھیں؟'' کاشف کو سن کر غصہ آ گیا۔
''ہاں اسی کے پاس سے آرہی ہوں۔ میں نے اسے بتا دیا ہے کہ تم جس گندی مٹی کی رہنے والی ہو اسی جگہ کے خواب دیکھو۔'' نوشین کا غصہ کم نہیں ہوا تھا۔
''نوشین تم نیلم کے پاس کیوں گئی تھیں۔'' کاشف نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا اور اس کا لہجہ بلند ہو گیا۔
''کیوں نہ جاتی؟ اس نے میری محبت پر ڈاکا ڈالا ہے۔ میں چپ چاپ بیٹھی رہتی۔'' نوشین کا غصہ اور بھی دو چند ہو گیا۔
''اس نے ڈاکا نہیں ڈالا۔ مجھے وقت سے پہلے ہوش آ گیا تھا اس لیے میں نے تمہیں چھوڑ دیا۔'' کاشف بولا۔
''تم میرے ساتھ ایسا نہیں کر سکتے۔ تمہیں نیلم کو چھوڑنا ہوگا۔'' نوشین نے چلا کے کہا۔ غصے، توہین سے اس کا برا حال تھا۔
''یہ خیال اپنے دل سے نکال دو اور دفع ہو جاؤ یہاں سے۔'' کاشف دہاڑا۔
اس بات نے نوشین کے تن بدن میں مزید آگ لگا دی۔ ''تم مجھے دفع ہو جانے کا کہہ رہے ہو؟ مجھے؟''
''چلی جاؤ یہاں سے۔'' کاشف نے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔
''ٹھیک ہے میں چلی جاتی ہوں لیکن اب میں نیلم کے باپ کے پاس جاؤں گی۔'' وہ دو قدم پیچھے ہٹی۔
''خبردار جو تم وہاں گئیں۔'' کاشف نے غصے سے اسے خبردار کیا۔
''تم نیلم کا خیال دل سے نکال دو ورنہ مجھے تم اس کے باپ کے پاس جانے سے نہیں روک سکتے۔'' وہ بضد تھی۔
''اگر تم گئیں تو یاد رکھنا......'' کاشف کا غصہ اس کے پورے جسم کو حصار میں لیے ہوئے تھا۔
''کیا کر لو گے تم میں جاؤں گی اور ابھی جاؤں گی۔'' نوشین غصے سے چیخی۔ کاشف کے لیے اس کی یہ چیخ پکار برداشت سے باہر ہوگئی اور غیر ارادی طور پر اس نے تیز دھار چھری اُٹھائی اور محض اسے ڈرانے کے لیے اس نے چھری کو تیزی سے اس کے سامنے بائیں سے دائیں لہرایا لیکن عین اس وقت نوشین اسے کچھ اور کہنے کے لیے ایک قدم آگے ہوگئی اور جس تیزی سے چھری بائیں سے دائیں

گئی تھی، اس کی تیز دھار اس کی گردن پر پھر گئی۔ ایک لمحہ لگا اور نوشین کی گردن پر بڑا سا کٹ دکھائی دینے لگا اور خون نکل کر تیزی سے بہنے لگا۔
نوشین کی متوحش نگاہیں اسے دیکھ رہی تھیں اور گردن کٹ جانے کی تکلیف اس کے چہرے سے عیاں تھی لیکن اس کے منہ سے کوئی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ کاشف دم بخود اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اسے پتا بھی نہیں چلا اور چھری اس کی گردن پر پھر گئی۔ نوشین کے جسم سے نکلنے والا خون اس کے سینے پر پھیل گیا تھا۔ اچانک نوشین نیچے گری اور کچھ دیر تڑپنے کے بعد اس کا جسم ساکت ہو گیا۔
کاشف ہاتھ میں چھری پکڑے اپنے قدموں میں گری نوشین کی لاش کو ششدر نگاہوں سے دیکھے جا رہا تھا۔ اس نے محض نوشین کو ڈرانے کے لیے غصے میں چھری گھمائی تھی اور چھری نے اس کا گلا کاٹ دیا تھا اور وہ قتل ہو گئی تھی۔ کاشف نے اسے جان سے مارنے کا سوچا بھی نہیں تھا۔
دیوار پر لگی گھڑی کی سوئی کی آواز اس سکوت میں صاف سنائی دے رہی تھی جیسے وہ اسے بتا رہی ہو کہ کاشف اب قاتل بن چکا ہے۔ اب ہر گزرنے والا لمحہ اسے جیل کی سلاخوں کے پیچھے لے جائے گا جہاں اس کی متحرک دنیا کا باب بند ہو جائے گا اور عدالت میں ہونے والا فیصلہ اس کی زندگی کو جانے کن اندھیروں میں دھکیل دے گا۔ کاشف خوف کی علامت بنا کھڑا تھا۔
ٹھیک اسی وقت دروازے کی بیل ہوئی اور کاشف کی ڈر سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ اس نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ وہ مسلسل دروازے کو تکتا رہا۔ جانے کون تھا۔ اس کا دل ایسے دھڑکنے لگا جیسے ابھی وہ اس کا سینہ چیر کر باہر نکل آئے گا۔
ایک بار پھر بیل ہوئی۔ اس بار جیسے کاشف کو ہوش آ گیا۔ اس نے چھری ایک طرف رکھی اور اپنے کپڑوں کا جائزہ لیا۔ اس کے کپڑے نوشین کے خون کے چھینٹوں سے محفوظ تھے۔
ایک دم کاشف کو خیام کا خیال آیا۔ اس نے سوچا کہ یقیناً خیام ہوگا۔ وہ اسے اس کی مدد کرنے کا جھانسا دے کر اس لاش کو کہیں ٹھکانے لگانے کا انتظام کر سکتا ہے۔ جب لاش ٹھکانے لگ جائے گی تو وہ اسے چلتا کر دے گا۔ اس اچانک آنے والے خیال نے کاشف کو کچھ حوصلہ دیا تھا۔
کاشف یہ سوچ کر دروازے کی طرف چلا گیا۔ اس نے دروازے کے شیشے سے باہر جھانکا تو باہر نیلم کھڑی تھی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

کاشف نے دروازہ کھول دیا۔ نیلم کے اندر آتے ہی کاشف نے یکدم سے دروازہ بند کر کے مقفل کر دیا۔ نیلم اپنے غصے کو دباتے ہوئے بولی۔

''نوشین کی کار باہر کھڑی ہے، کیا وہ اندر ہے۔ وہ کُتیا میرے پاس بھی آئی تھی اور......''

کاشف نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر نیلم کو بولنے سے روک دیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر نوشین کی لاش کے پاس لے گیا۔ نوشین کی لاش دیکھتے ہی نیلم نے اپنے دونوں ہاتھوں کا پیالہ اپنے چہرے پر رکھ لیا۔ ایک بار پھر خاموشی چھا گئی اور کچھ دیر کے بعد اس نے اپنے چہرے کے آگے سے ہاتھ ہٹائے اور کاشف سے گھبرائی ہوئی آواز میں بولی۔

''یہ...... یہ کیا ہے؟ تم نے نوشین کو قتل کر دیا ہے؟''

''اِدھر آجاؤ، میں سب سمجھاتا ہوں۔'' کاشف اسے صوفے کی طرف لے گیا اور اسے بتانے لگا کہ نوشین کا قتل کیسے ہوا۔ نیلم سنتی رہی اور پھر وہ اپنے آپ کو نارمل کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ کچھ دیر کے بعد نیلم کے چہرے سے خوف کسی حد تک معدوم ہو چکا تھا۔

''ویسے اچھا ہی ہوا یہ مر گئی۔ اس نے میری بہت بے عزتی کی تھی۔ دیکھو کاشف ہم اس لاش کو ٹھکانے لگا دیتے ہیں۔ میرے سوا کوئی نہیں جانتا کہ نوشین کا خون تمہارے ہاتھوں ہوا ہے۔ لاش جیسے ہی ٹھکانے لگے گی، یہ قصہ ختم ہو جائے گا۔'' نیلم نے کہا۔

''لیکن اسے کہاں لے کر جائیں؟'' کاشف نے پوچھا۔

''تم اسے کسی چادر میں لپیٹ دو۔ پھر ہم اسی کی گاڑی میں ڈال کر اسے کہیں دور لے جاتے ہیں اور اس کی کار کو چھوڑ کر واپس آجائیں گے۔'' نیلم نے کہا۔

''راستے میں پولیس ناکے ہوتے ہیں۔'' کاشف بولا۔

''ہم کہیں دور نہیں جائیں گے۔ لاش کو اسی کی کار میں ڈالیں گے اور اس کالونی سے کہیں باہر اس کی کار کھڑی کر کے آجائیں گے۔'' نیلم اس کی طرف دیکھ رہی تھی اور اس کا لہجہ دھیما تھا۔ البتہ اس کا دل مسلسل دھڑک رہا تھا۔

کاشف سوچنے کے بعد بولا۔ ''تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ ہمیں اس کی لاش کو ٹھکانے لگا دینا چاہیے۔''

''اب جلدی کرو۔ دیر مت کرو۔ یہ کام جتنی جلدی ہو جائے اتنا ہی بہتر ہے۔'' نیلم نے کہا۔

کاشف اُٹھا، اس نے الماری سے بستر کی ایک چادر نکالی اور اسٹور سے پلاسٹک کی بڑی سی شیٹ لے آیا۔

کاشف نے پہلے نوشین کے پرس سے کار کی چابی نکالی اور اس کے بعد اس نے نوشین کی لاش کو اس پلاسٹک میں لپیٹا اور نیلم کی مدد سے چادر میں لپیٹ دیا...... دونوں نے اچھی طرح سے نوشین کی لاش کو لپیٹ لیا۔ کاشف نے اس کا پرس بھی اس کی لاش کے ساتھ ہی لپیٹ دیا تھا۔ اس کام سے فارغ ہو کر کاشف نے فرش پر پڑا خون کا ایک ایک قطرہ صاف کیا۔

''میں نوشین کی کار اندر لے کر آتا ہوں۔'' کاشف کہتا ہوا گیٹ کی طرف بڑھا۔

کاشف نے گیٹ کھولا اور باہر نکل کر وہ نوشین کی کار میں بیٹھا اور اسے اندر لے آیا۔ کار سے باہر نکل کر اس نے گیٹ بند کیا اور بھاگتا ہوا اندر چلا گیا۔

کاشف، نوشین کی لاش کو کھینچ کر دروازے تک لے آیا۔ اس کے بعد دونوں نے...... لاش کو اُٹھایا اور کار کی ڈکی میں ڈال دیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر ایک بار پھر کاشف اور نیلم نے اچھی طرح سے فرش کو صاف کیا اور ہر ثبوت مٹانے کی کوشش کی۔ اچھی طرح سے صفائی کے بعد دونوں نے جائزہ لیا اور کار کی ڈکی پر سے بھی اپنی انگلیوں کے نشان صاف کرنے لگا۔ اس کے بعد کاشف نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔

کاشف نے کار باہر نکالی۔ نیلم نے گیٹ بند کیا اور کاشف کے برابر میں بیٹھ گئی۔ کاشف نے کار فوراً ایک طرف بڑھا دی۔

اپنی گلی سے نکل کر کاشف نے کار دوسری گلی میں ڈال دی، وہاں سے وہ کالونی کی مین سڑک پر چلا گیا۔ وہاں کمرشل مارکیٹیں بھی تھیں جو ابھی تک کھلی ہوئی تھیں اور وہاں آنے جانے والوں کی چہل پہل تھی۔

''اس سڑک پر کار لانے کی کیا ضرورت تھی۔'' نیلم نے کہا۔

''گھبراؤ نہیں۔'' کاشف نے کار کی رفتار بڑھا دی۔ اچانک دائیں طرف سے پولیس وین نکلی اور دونوں گھبرا گئے۔ ان کا خوف فطری تھا حالانکہ وہ وین ان کے برابر سے گزر گئی۔

کاشف نے کار کی رفتار بڑھا دی تھی۔ اس سڑک سے نکل کر وہ ایک دوسری سڑک پر چلے گئے تھے۔ اب ان کی کالونی پیچھے رہ گئی تھی۔ دونوں کے چہروں سے خوف اور پریشانی عیاں تھی۔

کار کافی آگے چلی گئی تھی۔ دائیں بائیں ویرانی بھی

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

تھی۔ کاشف نے کار کی رفتار آہستہ کردی۔ وہ مناسب جگہ دیکھ رہا تھا۔

''یہاں کھڑی کردو۔'' نیلم نے ایک طرف اشارہ کیا۔

کاشف نے جیسے ہی کار اس طرف لے جانے کے لیے اسٹیئرنگ گھمایا جانے کہاں سے پولیس وین نکل کر ان کی طرف آنے لگی۔ دونوں ایک بار پھر بری طرح سے گھبرا گئے۔ اس وقت پولیس کا معمول کا گشت شروع ہوجاتا تھا۔

''اپنے چہرے سے کسی طرح کا خوف واضح نہ ہونے دینا۔'' کاشف نے کہا اور کار روکنے کا ارادہ بدل کر اس نے آگے بڑھا دی۔ جیسے جیسے پولیس وین ان کے قریب آتی جارہی تھی، ان کی گھبراہٹ اور خوف بڑھتا جارہا تھا۔ پولیس وین رک گئی اور اندر سے پولیس والے کا ہاتھ نمودار ہوا جو انہیں رکنے کا اشارہ کررہا تھا۔

''کار مت روکو...... بھگادو......'' نیلم نے مشورہ دیا۔

''اس طرح ہم پھنس جائیں گے۔'' کاشف نے کہتے ہوئے کار روک دی۔ ایک پولیس والا باہر نکلا اور ان کی کار کی طرف بڑھا۔

''ڈرنا مت...... ایسا ظاہر ہو کہ ہم دونوں میاں بیوی ہیں۔'' کاشف نے سرگوشی کی اور نیلم پُراطمینان انداز میں بیٹھ گئی۔

پولیس والا ان کے قریب آیا اور کاشف کی طرف جھک کر شیشہ نیچے کرنے کا اشارہ کیا۔ کاشف نے شیشہ نیچے کر دیا۔ پولیس اہلکار نے اندر کا جائزہ لیا اور کاشف سے پوچھا۔

''اِدھر کہاں جارہے ہیں آپ؟''

''بائی پاس کی طرف جانے کے لیے یہ شارٹ کٹ ہے اس لیے اس طرف آگئے ہیں۔'' کاشف نے پُراعتماد انداز میں جواب دیا۔

''یہ راستہ شام ہوتے ہی ویران ہوجاتا ہے اور کوئی نہ کوئی واردات بھی ہوجاتی ہے۔'' پولیس والے نے کہا۔

''ایک عزیز کی فوتگی ہوگئی تھی وہاں پہنچنے کے لیے یہ راستہ اختیار کرنا پڑا۔'' کاشف بولا۔

پولیس اہلکار نے ایک بار پھر دونوں کا جائزہ لیا اور بولا۔

''اس جگہ سے چار کلومیٹر کے فاصلے پر بائی پاس ہے۔ کار کی رفتار تیز رکھنا۔ خودتم لوگ احتیاط کرتے نہیں ہو اور جب گڑبڑ ہوجاتی ہے تو سارا الزام ہم کو دے دیتے ہو۔'' پولیس والا اپنے روایتی لہجے پر آگیا اور ان کو جانے کا اشارہ کیا۔ کاشف نے کار آگے بڑھا دی۔

بہت آگے جا کر ان کے دل کی دھڑکنیں ٹھیک ہوئیں۔ کاشف نے کار کو بڑی سڑک سے نیچے اتار کر ایک چھوٹی سڑک پر ڈال دیا۔ وہاں ویرانی تھی اور آس پاس کیا کہیں دور بھی کوئی نہیں دکھائی دے رہا تھا۔ وہ میدانی علاقہ تھا جہاں سر اُٹھائے جھاڑیاں ایستادہ تھیں اور جابجا اونچے نیچے ٹیلے دکھائی دے رہے تھے۔

کاشف نے اچھی طرح سے جائزہ لینے کے بعد نیلم سے کہا۔ ''اب ہم کار اس جگہ نہیں چھوڑیں گے۔ کیونکہ پولیس نے اس کار کو دیکھ لیا ہے۔ ہم نوشین کی لاش یہاں کہیں پھینک دیں گے اور کار آگے کہیں چھوڑ دیں گے۔''

''میں بھی یہی سوچ رہی تھی۔'' نیلم نے اس کی بات سے اتفاق کیا۔

کاشف نے کار ایسی جگہ کھڑی کی تھی جہاں دو درخت ایک ساتھ اور اونچی جھاڑیاں تھیں۔ اس کی دائیں جانب ڈھلان تھی۔ کوئی بھی آتا جاتا ان کی کار کو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ آسمان پر چاند نہ ہونے کی وجہ سے دور تک اندھیرا تھا۔ اچھی طرح سے اطمینان کرنے کے بعد کاشف نے نیلم کو باہر نکلنے کا **اشارہ** کیا اور دونوں باہر نکلے، ڈکی کھول کر نوشین کی لاش کو باہر نکالا اور کاشف نے نوشین کی لاش کو ڈھلان سے نیچے پھینک دیا...۔ وہ یہ کام کرتے ہی کانپتے جسم کے ساتھ کار کی طرف بڑھا۔ دونوں تیزی سے کار میں بیٹھے پھر کاشف نے کار اسٹارٹ کی اور وہاں سے نکال کر لے گیا۔ ان کی کار کی تیز رفتاری کی وجہ سے مٹی کی دھول کے بادل سے چھاگئے تھے۔ اس کام کو کرنے کے بعد دونوں اس قدر خوفزدہ ہوگئے تھے کہ ایک دوسرے سے بات بھی نہیں کررہے تھے۔

کار اس ویرانے سے نکل کر پکی سڑک پر آگئی تھی وہاں سے وہ اسے شہر کی بارونق سڑکوں پر لے آیا تھا...۔ **پھر اس** نے کار پارکنگ میں کھڑی کرکے لمبے لمبے سانس لیے اور نیلم سے کہا۔ ''اپنی انگلیوں کے نشان اچھی طرح سے مٹادو۔''

نیلم اپنے دوپٹے سے اس جگہ سے انگلیوں کے نشان مٹانے لگی جہاں اس کی دانست میں اس نے ہاتھ لگایا تھا۔ کاشف بھی ہر جگہ سے اپنی انگلیوں کے نشان مٹارہا تھا۔ جب ان کو تسلی ہوگئی کہ انہوں نے انگلیوں کے نشان مٹادیے ہیں تو وہ ایک ساتھ کار سے باہر نکلے اور انہوں نے اپنا اپنا دروازہ احتیاط سے بند کردیا۔ دروازہ کھولتے اور بند کرتے ہوئے بھی ان کے ہاتھ کپڑے میں لپیٹے ہوئے تھے۔

دونوں تیز تیز قدم اُٹھاتے ایک طرف چل دیے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

دونوں کی سانسیں تیز تھیں اور دل کی دھڑکنیں منتشر تھیں۔ خوف اور ڈر نے ان کو اپنے حصار میں لیا ہوا تھا۔

دونوں اس سڑک سے نکل کر بڑی سڑک پر جانے کے بجائے دوسری طرف چل رہے تھے، وہاں سے وہ ایک گلی میں چلے گئے اور اس گلی سے ہوتے ہوئے وہ اس علاقے کے مین بازار میں آگئے...... کار کسی محفوظ جگہ کھڑی کرنے کے چکر میں وہ کافی آگے نکل آئے تھے۔

دونوں ایک رکشے کی طرف بڑھے۔ کاشف نے رکشے کے پاس جاتے ہی اسے سول اسپتال چلنے کو کہا اور دونوں رکشے میں بیٹھ گئے۔

رکشے نے انہیں سول اسپتال پہنچا دیا۔ کاشف نے کرایہ ادا کیا اور اندر چلے گئے۔ وہ گھوم کر اسپتال کی دوسری جانب سے باہر نکلے اور وہاں سے ایک رکشا لے کر نیلم کے گھر کی طرف چل پڑے۔

کاشف نے رکشا والے کو اس کے گھر کی گلی سے کچھ فاصلے پر ہی رکوالیا تھا۔ دونوں باہر نکلے اور پیدل چلنے لگے۔

''دیکھو گھبرانا نہیں ہے۔ اور یہ یاد رکھنا کہ ہمیں اس کام کو کرتے ہوئے کسی نے نہیں دیکھا۔'' کاشف نے اسے تسلی دی۔

''میں آہستہ آہستہ نارمل ہو جاؤں گی۔'' نیلم بولی۔ ''تم اپنا خیال رکھنا۔''

کاشف نے ایک بار پھر اس کو تسلی دی اور اپنی چال آہستہ کردی کہ نیلم اس سے آگے نکل گئی اور کاشف پیچھے رہ گیا۔

آگے چوک تھا اور وہاں سے کاشف بائیں جانب چل پڑا۔ گلی عبور کرنے کے بعد وہ اس کالونی کے مین بازار میں پہنچ گیا۔ وہاں سے اس نے ٹیکسی لی اور اپنے گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔

☆☆☆

کاشف نے چابی گھما کر اپنے گھر کا چھوٹا دروازہ کھولا اور اندر جاتے ہی اسے مقفل کر دیا۔ جاتے ہوئے اس نے گھر کی ہر بتی بجھا دی تھی۔ وہ اندھیرے میں چلتا ہوا سوئچ بورڈ تک پہنچا اس نے ایک بٹن دبایا تو ٹی وی لاؤنج میں لگا زیرو پاور کا بلب روشن ہو گیا جس کی روشنی کی مدد سے وہ کچن تک گیا۔ اس نے فریج سے بوتل نکال کر پانی پیا اور اپنے آپ کو نارمل کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

وہ اپنے دماغ سے اس وحشت ناک واقعے کو محو کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

کچھ دیر کے بعد وہ اپنے آپ کو بہتر محسوس کر رہا تھا۔ اب وہ سو جانا چاہتا تھا تاکہ اور بھی زیادہ پُرسکون ہو سکے۔

ابھی اس نے اپنے کمرے میں جانے کا ارادہ کیا ہی تھا اور ایک قدم اُٹھانا چاہا تھا کہ گہرے سکوت میں ایک آواز نے اسے چونکا دیا۔

''لاش ٹھکانے لگا آئے ہو؟''

یہ آواز جیسے ہی کاشف کی سماعت میں پڑی، وہ بری طرح سے چونک پڑا۔ اس نے آواز کی سمت دیکھا۔ سامنے صوفے پر کوئی ہیولا سا دکھائی دیا۔ کاشف کی متحیر نگاہیں اس کا چہرہ دیکھنے کے لیے مضطرب ہوگئیں۔ وہ جلدی سے سوئچ بورڈ کی طرف بڑھا اور اس نے ایک ساتھ کئی بٹن دبا دیے۔ پورا ٹی وی لاؤنج روشن ہو گیا۔ جیسے ہی روشنی ہر طرف پھیلی اور اس نے اس ہیولے کی طرف دیکھا، وہ حیرت کی تصویر بن گیا۔ اس کی خیرہ نگاہیں اسی جگہ جم گئیں اور سانس جیسے رک گئی ہو۔ دل کی دھڑکن ایسی منتشر ہوئی کہ ابھی سینہ پھاڑ کر دل باہر نکل آئے گا۔ اس صوفے پر پرسکون انداز میں بیٹھا مکاری مسکراہٹ لیے کچھ آگے جھکا ہوا خیام...... اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پیوست کی ہوئی تھیں اور دونوں ہاتھوں کا مُکا سا بنا کر اپنی ٹھوڑی کے نیچے رکھا ہوا تھا اور اس کی گہری نگاہیں کاشف پر مرکوز تھیں۔

''تم......؟'' کاشف کے منہ سے بمشکل نکلا۔

''ہاں میں۔ تمہارا دوست خیام۔'' وہ پُرسکون تھا۔

''تم یہاں کیا کر رہے ہو؟'' کاشف کے دل کی دھڑکنیں بدستور تیز تھیں۔

''تم نے تو مجھے زبردستی اپنے گھر سے نکال دیا تھا۔ جبکہ میں نے تمہیں اپنی مشکل بھی بتائی تھی۔ اور یہ بھی کہا تھا کہ مجھے ہر لحہ خوف ہے کہ مجھے پولیس گرفتار کر کے نہ لے جائے۔ اب جیسے ہی تم نے مجھے اپنے گھر سے باہر نکالا، میں سوچنے لگا کہ کہاں جاؤں۔ میرے سر پر خوف ایسا تھا کہ جیسے ابھی پولیس کہیں سے نکل آئے گی اور مجھے گرفتار کر لے گی۔'' وہ اطمینان سے کہتا ہوا چپ ہو گیا۔ جبکہ کاشف بت بنا اس کی طرف دیکھتے ہوئے اس کی بات غور سے سن رہا تھا۔

کچھ توقف کے بعد خیام نے سلسلہ کلام جوڑنے سے پہلے اپنے دونوں ہاتھوں کو ایک دوسرے سے الگ کر کے صوفے کی پشت سے ٹیک لگالی۔ ''اچانک مجھے خیال آیا کہ جب میں گیٹ کے اندر سے تمہارے گھر میں داخل ہوا تھا تو گیٹ میں نے بند کیا تھا اس کا کنڈا ابھی اندر سے نہیں لگایا تھا اور ہم باتیں کرتے ہوئے ٹی وی لاؤنج میں چلے گئے تھے۔ میں فوراً گیٹ کی طرف چلا گیا۔ گیٹ کھلا تھا۔ میں اندر آیا،

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

گیٹ کو بند کیا اور دبے پاؤں ٹی وی لاؤنج میں چلا گیا۔ اس وقت وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں اس سامنے والے کمرے میں چھپ گیا۔''

وہ بولتے ہوئے پھر چپ ہوگیا۔ اس کے چہرے پر ایک عجیب سی مسکراہٹ تھی اور کاشف کا جسم حیرت کی تصویر بنا ہوا تھا۔ اس کی دانست میں تو جو کچھ اس گھر میں ہوا تھا، اس کی بھنک کسی کو بھی نہیں ہے لیکن خیام کی موجودگی نے اس کی رگوں میں خون جما دیا تھا۔

وہ پھر بولا۔ ''اچانک نوشین آگئی......تم نے اس کا نام نوشین ہی لیا تھا۔ میں نے تم دونوں کی بحث سنی تو اپنا موبائل فون نکالا اور تم دونوں کی ریکارڈنگ کرنے لگا پھر تم نے اسے قتل کر دیا۔''

''میں نے اسے قتل نہیں کیا تھا۔ وہ ایک اتفاقی حادثہ تھا۔'' کاشف یکدم بولا۔

''یہ تم کہہ رہے ہو لیکن میرے موبائل فون میں بننے والی ویڈیو میں صاف دیکھا جاسکتا ہے کہ تم نے اسے چھری ماری تھی اور اس کا گلا کاٹ دیا تھا۔ بہرحال اس گھر میں جو کچھ بھی ہوا، وہ میرے موبائل فون میں محفوظ ہوگیا۔ تم نیلم کے ساتھ نوشین کی لاش کو ٹھکانے لگانے چلے گئے اور میں نے اس ویڈیو کا میموری کارڈ نکالا اور اپنے ایک دوست کے گھر کا رخ کیا۔ وہ میموری کارڈ اسے دیا اور اسے ایک خاص قسم کی ہدایت دی اور واپس آگیا۔ اس گھر سے نکل کر اپنے دوست کے پاس جانا اور واپس آنا بہت اعصاب شکن تھا لیکن میں نے یہ کام کیا۔'' اس نے تفصیل سے آگاہ کیا۔

''تم نے وہ کارڈ اپنے دوست کو دے دیا۔'' اس کی بات سن کر کاشف کا منہ مزید لٹک گیا۔

''گھبراؤ نہیں۔ وہ کچھ نہیں دیکھے گا اور کچھ نہیں کرے گا۔ وہ بس میری ہدایت پر عمل کرے گا۔ اس کی جیب میں، میں نے کچھ نوٹ بھی ڈالے ہیں۔ ویسے وہ ویڈیو میرے موبائل فون میں بھی محفوظ ہے، دیکھنا چاہو گے۔''

''تم نے وہ میموری کارڈ اپنے دوست کو کیوں دیا؟'' کاشف مضطرب ہوگیا۔

''کیونکہ مجھے اپنی جان بچانے کے لیے بیس لاکھ کی ضرورت ہے۔ میں جیل نہیں جانا چاہتا۔ اب تم مجھے بیس لاکھ کا انتظام کر کے دو گے ورنہ میں نے جو اسے وقت دیا ہے اس وقت تک میں نے اس سے رابطہ نہ کیا تو وہ میموری کارڈ پولیس کے پاس چلا جائے گا۔'' خیام کا لہجہ خطرناک اور سرد تھا۔

''تم مجھے بلیک میل کر رہے ہو؟'' کاشف بولا۔

جوتا

استانی نے بچے سے پوچھا کہ وہ اسکول میں تاخیر سے کیوں آیا ہے۔ بچے نے شرمندگی سے بتایا کہ گھر میں اس کی ممی اور ڈیڈی میں لڑائی ہو رہی تھی۔

''اس سے تمہارا کیا تعلق...... انہیں لڑنے دیتے اور خود اسکول... وقت پر چلے آتے۔''

''مس! میں ننگے پاؤں کیسے آتا؟'' بچے نے بے چارگی سے کہا۔ ''میرا ایک جوتا ممی کے ہاتھ میں تھا، دوسرا ڈیڈی کے ہاتھ میں۔''

کراچی سے ولید بلال کی بے چارگی

''نہیں بالکل بھی نہیں۔ تم سے اپنی جان بچانے کے لیے مدد مانگ رہا ہوں۔ اس وقت ہم دونوں ایک حصار میں قید ہیں۔ تم میری مدد کرو گے تو ہم دونوں اپنے اپنے حصار سے آزاد ہوجائیں گے۔''

''یہ مدد مانگنے کا طریقہ ہے؟'' کاشف نے کہا۔

''میں نے تو تم سے طریقے سے ہی مدد مانگی تھی لیکن تم نے میری ایک نہیں سنی اور مجھے گھر سے نکال دیا۔ یہ طریقہ اختیار کرنے پر میں مجبور ہوں۔ اب تم اپنی جان بچانا چاہتے ہو تو مجھے بیس لاکھ کا انتظام کر کے دو۔ ورنہ......'' خیام کے لہجے میں یکدم تغیر آگیا اور اس نے آنکھیں نکال کر کاشف کی طرف دیکھا۔

کاشف پھنس گیا تھا۔ اس کے جسم میں بے چینی زہر بن کر دوڑنے لگی۔ مکمل سکوت میں خیام نے موبائل فون میز پر اس طرح سے رکھا کہ کاشف اس پر چلتی ویڈیو دیکھ سکتا تھا۔ خیام نے وہ ویڈیو چلا دی۔ کاشف اور نوشین کی تکرار اور پھر کاشف کا اس پر چھری سے حملہ کرنا سب کچھ اس میں محفوظ تھا۔ کاشف وہ سب دیکھ کر اور بھی پریشان ہوگیا۔ اس کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں نمودار ہوگئی تھیں۔

''بند کرو اسے۔'' کاشف چیخا اور یکدم اسے احساس ہوا کہ اسے اپنی آواز اتنی بلند نہیں کرنی چاہیے۔ اس نے فوراً دائیں بائیں دیکھا جیسے اسے ڈر ہو کہ کوئی سن نہ رہا ہو۔

خیام نے مسکراتے ہوئے موبائل فون میں چلتی ریکارڈنگ بند کر دی اور اس کی طرف دیکھا۔ ''اب تم کیا کہتے ہو؟''

کاشف نے اپنے سر کے بالوں میں انگلیاں پھیریں

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

اور سوچتے ہوئے پانی کی بوتل کی طرف بڑھا۔ اس نے دو گھونٹ پانی پیا اور بولا۔

''تم جانتے ہو کہ میرے پاس اتنی بڑی رقم نہیں ہے۔ میں تم کو بیس لاکھ روپے نہیں دے سکتا۔''

''اپنی دوست نیلم سے لے لو۔ وہ بھی تو لاش کو ٹھکانے لگانے میں .... شریکِ جرم ہے۔''

''مجھے اس سے بات کرنی پڑے گی لیکن اتنی بڑی رقم کا بندوبست کرنا اس کے بس کا بھی کام نہیں ہے۔''

''تو پھر جو بھی کرو، میری جان اس عذاب سے بچاؤ جو میں سہہ رہا ہوں۔ لیکن یہ یاد رکھنا کہ اگر اس گھر میں مجھے کچھ ہوا اور تم نے میری بات نہ مانی تو وہ ریکارڈنگ پولیس اسٹیشن پہنچ جائے گی۔'' خیام نے اسے خبردار کیا۔

کاشف بے بسی سے اپنا نچلا ہونٹ چبانے لگا۔ وہ خیام کی طرف کھا جانے والی نظروں سے دیکھتا رہا۔

''میں اپنے کمرے میں جا رہا ہوں۔ میں سوچنا چاہتا ہوں کہ کیا ہو سکتا ہے۔''

''بہت خوب...... تمہیں سوچنا چاہیے۔ تم سوچو گے تو کوئی حل نکلے گا۔'' خیام کے چہرے پر وہ پریشانی جو کاشف کو اس وقت دکھائی دی تھی جب وہ اس کے گھر میں داخل ہوا تھا، اب معدوم ہو گئی تھی اور اس کے لہجے سے لگ رہا تھا کہ وہ اب مطمئن ہے۔ شاید اسے یقین تھا کہ اب کاشف اپنی جان بچانے کے لیے اس کی مدد ضرور کرے گا اور بیس لاکھ روپے کا انتظام کر کے دے گا۔ بالکل ایسی صورتِ حال تھی جیسے کسی کے پاس اچانک دوڑنے والا گھوڑا آ جائے اور وہ اپنے اس گھوڑے کی مدد سے اپنا مقصد حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے۔

''کل صبح بات ہو گی۔'' کاشف کا چہرہ تھکا ہوا لگ رہا تھا۔

''کچن میں کچھ کھانے کو ہے؟'' خیام نے پیچھے سے آواز دی۔

''فریج میں دیکھ لو۔'' کاشف کو اس کی بات سن کر غصہ تو بہت آیا لیکن وہ اتنا کہہ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ خیام اپنی جگہ بیٹھا مکاری سی مسکراہٹ بکھیرتا رہا۔

کاشف جیسے ہی اپنے کمرے میں داخل ہوا، اسے نیلم کا پیغام موصول ہوا۔ نیلم نے پوچھا تھا کہ تم ٹھیک ہو؟

کاشف نے ایک لمحہ سوچ کر اسے پیغام بھیجا کہ اگر تم جاگ رہی ہو تو میں کال کروں، جواب میں نیلم نے کال کر دی۔

''کیا بات ہے خیریت ہے؟'' نیلم نے پوچھا۔

''خیریت نہیں ہے۔'' وہ ڈھیلے انداز میں بولا۔

''کیوں کیا ہوا؟'' نیلم چونکی۔

کاشف نے ایک لمحے کے توقف کے بعد سب کچھ نیلم کو بتا دیا۔ جب کاشف چپ ہوا تو نیلم کی حیران کن آواز سنائی دی۔

''اوہ...... یہ کیا ہو گیا؟''

''اب اگر ہم نے اسے بیس لاکھ روپے نہ دیے تو وہ کچھ بھی کر دے گا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ کچھ بھی کر سکتا ہے کیونکہ اس وقت وہ مرا ہوا ہے اور وہ ہمیں بھی مار دے گا۔'' کاشف پریشان تھا۔

''اب کیا کریں؟'' نیلم نے پوچھا۔

''نیلم...... کیا تم کچھ پیسوں کا انتظام کر سکتی ہو؟'' کاشف نے پوچھ ہی لیا۔ ''میں وہ رقم تم کو واپس لوٹا دوں گا۔''

''میں پیسوں کا انتظام کسی نہ کسی طرح ضرور کر دیتی لیکن میں جیسے ہی گھر پہنچی تو مما بہت پریشان تھیں۔ میں نے پوچھا تو مما نے بتایا کہ پپا پر انکوائری لگ گئی ہے۔ ان پر ناجائز پیسہ لینے اور پراپرٹی خریدنے کا الزام ہے۔ پپا بھی بہت پریشان ہیں۔ سنا ہے کہ ان کا اکاؤنٹ بھی بند کر دیا ہے۔ گھر میں بہت پریشانی چل رہی ہے۔'' نیلم نے بتایا۔

''یہ تو بہت برا ہوا۔'' کاشف اور بھی پریشان ہو کر بولا۔

''پپا کہہ رہے تھے کہ میں اور مما فی الحال کسی رشتے دار کے گھر چلے جائیں۔'' نیلم بولی۔

''یہ تو اور بھی مشکل ہو گئی ہے۔ اب خیام کا کیا کروں۔ ورنہ ہم دونوں پھنس جائیں گے۔'' کاشف نے مضطرب انداز میں کہا۔

''میں کچھ سوچتی ہوں اور کل ناشتے کے وقت تمہارے پاس آؤں گی۔ تم بھی سوچو، میں بھی سوچتی ہوں۔''

''میرا تو دماغ کام کرنا چھوڑ گیا ہے۔ وہ کمینہ اس گھر میں تھا اور مجھے پتا بھی نہیں چلا۔'' کاشف کے لہجے میں تاسف تھا۔

''اب جو ہونا تھا، وہ ہو چکا ہے۔ بہتر ہے کہ ہم آگے کی سوچیں کہ ہمیں آگے کیا کرنا ہے۔'' نیلم بولی۔ ''تم آرام کرو میں صبح آؤں گی تو کوئی حل نکالتے ہیں۔''

''او کے۔'' کاشف نے ڈھیلے سے انداز میں کہہ کر فون بند کر دیا اور بیڈ پر ڈھے گیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

www.paksociety.com

☆☆☆

کاشف رات ٹھیک سے سو نہیں سکا تھا۔ کئی بار وہ سویا اور کئی بار وہ جاگ جاتا۔ اس کی سوچ کا محور خیام تھا کہ اگر اس نے اس کے لیے پیسوں کا انتظام نہ کیا تو وہ انہیں گرفتار کرا دے گا۔ وہ خیام کی فطرت سے بخوبی واقف تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس نے جو کہانی اسے سنائی تھی کہ کس طرح سے اس کے شراکت دار نے اپنے پیسے نکال کر اسے پھنسا دیا، وہ یقیناً جھوٹی ہوگی اور اس نے کوئی نہ کوئی گڑبڑ کی ہوگی۔ خیام کسی کو بھی ڈس سکتا تھا۔ ماضی میں اس نے خود دیکھا تھا کہ خیام نے اپنے ہی دوستوں کے ساتھ کیا کیا تھا۔ اس نے کاشف سے ادھار پیسے لے کر کبھی واپس نہیں کیے تھے۔

جیسے تیسے رات گزر گئی۔ کاشف صبح سویرے ہی اُٹھ گیا اور باتھ روم چلا گیا۔

کاشف نہا دھو کر اپنے کمرے سے باہر نکلا تو خیام مزے سے کچن میں ناشتا کر رہا تھا۔ اس نے کاشف کو دیکھتے ہی کہا۔

''گڈ مارننگ۔''

''میرا سکون برباد کر کے تم کہتے ہو گڈ مارننگ۔'' کاشف نے کہہ ہی دیا۔

وہ ہنسا۔ ''میں نے کچھ نہیں کیا۔ جو تم نے کیا، میں نے صرف وہ محفوظ کیا ہے۔ اپنی زندگی کا سکون تم نے خود خراب کیا ہے بلکہ تم کو بے سکون ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ تم میرا کام کر دو تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''مجھے بلیک میل کرنے کا تمہیں خوب موقع مل گیا ہے۔'' کاشف نے اسے گھورا۔

''یقین کرو میں ایسا بالکل بھی نہ کرتا اگر میں پھنسا نہ ہوتا۔ یقین کرو کہ مجھ پر بیس لاکھ روپے بوگس چیک دینے کا مقدمہ درج ہے۔'' اس نے کہہ کر چائے کا گھونٹ لیا۔

کاشف اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ خیام نے کیتلی کی طرف اشارہ کر کے بتایا کہ اس میں چائے ہے۔

کاشف نے چائے کپ میں انڈیلی اور اس کے گھونٹ لینے لگا۔ خیام نے پوچھا۔ ''کیسی چائے بنائی ہے؟''

''اس وقت مجھے ہر چیز زہر لگ رہی ہے اور سب سے بڑھ کر تم مجھے زہر لگ رہے ہو۔''

وہ ڈھٹائی سے ہنسا۔ ''پریشانی میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ بہرحال تم نے میرے کام کا کیا سوچا ہے؟''

''ابھی میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے۔ میرا دماغ کچھ نہیں سوچ رہا ہے۔'' کاشف بولا۔

''دیکھو اگر تم دیر کرو گے تو پھر دیر ہی ہو جائے گی۔'' خیام کے لفظوں میں دھمکی پوشیدہ تھی۔ اس کی بات سن کر کاشف نے اسے گھورا۔

''تم بہت چالاک ہو۔''

''مجھے یہ سب کہنے سے بہتر ہے کہ تم پیسوں کا انتظام کرو تاکہ ہم دونوں اپنی اپنی مشکل سے آزاد ہو سکیں۔ ویسے میں جانتا ہوں کہ میں کتنا چالاک ہوں اور میرے اندر کیسی کیسی صلاحیتیں ہیں اس لیے تم نہ ہی بتاؤ تو اچھا ہے۔''

کاشف نے اسے پھر گھورا۔ ''کاش میں تمہارا سر پھوڑ سکتا۔''

''اگر میں نے وہ میموری کارڈ اس جگہ سے باہر نہ پہنچایا ہوتا تو تم مجھے آسانی سے مار سکتے تھے۔ میں مر جاتا اور ثبوت مٹ جاتا۔ اس لیے میں نے رسک لیا اور جیسے تیسے وہ کارڈ باہر پہنچا دیا۔ اس لیے اب تم مجھے ایک خراش کا زخم بھی نہیں دے سکتے ہو۔''

کاشف کچھ نہ کہہ سکا۔ وہ ناچار اسے دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے سے لگتا تھا کہ وہ دل ہی دل میں کچھ ایسا سوچ رہا ہے جس پر وہ عمل نہیں کر سکتا۔

ٹھیک اسی وقت بیل ہوئی اور دونوں چونک گئے۔ کاشف کا خیال تھا کہ نیلم آئی ہوگی۔ وہ اُٹھ کر دروازے کی طرف چلا گیا۔ جیسے ہی اس نے دروازہ کھولا، سامنے نیلم ہی کھڑی تھی۔ وہ اسے اندر لے آیا اور دروازہ بند کر دیا۔ نیلم نے ایک نظر خیام کی طرف دیکھا جبکہ خیام نے اپنی نظریں اس پر جماتے ہوئے مکارانہ مسکراہٹ کے ساتھ اپنے ہاتھ کی دو انگلیوں کو ہلایا۔

''نیلم......'' خیام نے اسی جگہ بیٹھے بیٹھے مسکرا کر اس کا نام لیا۔ ''بالکل نیلم کی طرح ہو...... کس کا دل نہ چاہے گا اس نیلم کو اپنی انگوٹھی میں فٹ کرنے کا۔''

''اس کا نام اپنی زبان سے لینے کی ضرورت نہیں ہے۔'' کاشف نے اسے ڈانٹا اور خیام نے ڈھٹائی سے مسکرا کر اپنے کندھے اچکا دیے اور چائے کے گھونٹ لینے لگا۔

''میں نے تو اس کی تعریف کی ہے۔''

''یہ خیام ہے۔ اس نے ہماری ویڈیو بنائی ہے۔'' کاشف نے اسے آہستہ سے بتایا۔

''کمینہ......'' نیلم نے زیرِلب کہا۔

''کوئی راستہ ہے تمہارے پاس۔'' کاشف نے

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

پوچھا۔ اس کا لہجہ دھیما ہی تھا کہ خیام تک ان کی آواز نہیں جارہی تھی۔

''رات پاپا کو کچھ لوگ اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ مما مجھے رات ہی کہیں بھیج دینا چاہتی تھیں لیکن میں نے ان سے کہا کہ میں کل اپنی دوست کی طرف چلی جاؤں گی۔ اس لیے اب یہاں ہوں اور کچھ بھی کرنا میرے لیے ممکن نہیں ہے۔'' نیلم نے بتایا۔

''کوئی بات نہیں، تم گھبراؤ نہیں میں کچھ نہ کچھ کرتا ہوں۔'' کاشف نے اسے تسلی دی۔

''کیا تم دونوں مجھے اپنی کھسر پھسر میں شامل کر کے بتاؤ گے کیا چل رہا ہے۔'' خیام جو ان کی باتیں سننے کی کوشش کر رہا تھا اور جب اسے کچھ پتا نہ چلا تو اس نے مداخلت کی۔

''تم اپنی بکواس بند رکھو۔'' کاشف نے اسے ڈانٹ دیا۔

وہ ہنسا۔ ''میں جانتا ہوں کہ تم مجھ پر صرف برس سکتے ہو۔ میرا خون نہیں کر سکتے۔ ورنہ وہ میموری کارڈ...... کوئی بات نہیں۔''

''بار بار ایک بات کو مت دہراؤ۔''

''میں دہرا نہیں رہا بلکہ تم کو یاد کرا رہا ہوں۔''

''مجھے یاد کرانے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''یاد تو کراتا رہوں گا تاکہ تمہارا لہو گرم رہے۔'' وہ پھر مسکرایا۔ ''تمہارا لہو گرم رہے گا تو تم میرا کام کرنے میں زیادہ پھرتی دکھاؤ گے۔''

اچانک کاشف کا موبائل فون بجا۔ اس نے اسکرین پر نمبر دیکھ کر فون کان کو لگا لیا۔ دوسری طرف اس کا باس منظر علی بات کر رہا تھا۔

''کہاں ہو کاشف ابھی تک تم آفس نہیں پہنچے۔''

''سر میں آپ کو فون کرنے ہی والا تھا دراصل میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔'' کاشف نے جلدی سے کہا۔

''بھئی کچھ بھی کرو اور فوراً رائل ہوٹل میں پہنچو۔ وہاں مظہر ایوب آیا ہوا ہے۔ تم جانتے ہو کہ ہمارا اُن کے ساتھ کئی سالوں سے بزنس ہو رہا ہے۔ وہ ساؤتھ افریقہ کے لیے ہمارا مال ہم سے خریدتا ہے۔ کروڑوں کی ڈیل ہوتی ہے ان سے۔'' منظر علی نے اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں کہا۔

''جی جانتا ہوں۔ لیکن وہ اچانک بغیر اطلاع دیے آگئے۔ وہ اس سے پہلے کبھی اطلاع دیے بغیر نہیں آتے تھے۔'' کاشف بولا۔

''اس کی میل تو مجھے ہفتہ پہلے مل گئی تھی۔ میں نے سوچا تھا کہ ایک آدھ دن پہلے تمہیں آگاہ کر دوں گا لیکن مصروفیت کی وجہ سے میرے ذہن سے ہی نکل گیا۔ رات اس کا فون آیا تو مجھے یاد آیا۔ اب تم فوراً وہاں پہنچو۔''

''ٹھیک ہے سر، میں جاتا ہوں۔'' کاشف کا وہاں جانا ناگزیر تھا اس لیے اس نے انکار نہیں کیا۔

''تم ان سے ڈیل کر لینا اور میرے ساتھ ڈنر کا کہہ دینا۔ میں ان سے ڈنر پر ملاقات کروں گا۔'' منظر علی نے کہا۔

''بہتر سر۔'' کاشف نے سر ہلا دیا۔

کاشف نے کہہ کر فون بند کر دیا۔ خیام کی نظریں اور کان اسی کی طرف تھے۔ نیلم نے پوچھا۔

''کیا ہوا؟''

''ہماری ایک پارٹی ہے مظہر ایوب، وہ ساؤتھ افریقہ میں بزنس کرتا ہے۔ اور ہم سے بھاری مالیت کا مال خریدتا ہے۔ مجھے ہوٹل جانا ہے۔ کیونکہ اس کی ڈیل میرے ساتھ ہی ہوتی ہے۔'' کاشف نے بتایا۔

''تم اگر وہاں مصروف رہے تو میرا کام کیسے ہوگا؟'' خیام جلدی سے بولا۔ ''میں زیادہ انتظار نہیں کر سکتا۔''

''ہماری لمبی چوڑی میٹنگ نہیں ہوتی ہے۔ وہ مجھے آرڈر کی لسٹ دے گا اور پے منٹ کی بات کرے گا۔ ہم کچھ کام کی باتیں کریں گے اور میٹنگ ختم ہو جائے گی۔ اس کے بعد میں فری ہو جاؤں گا۔'' کاشف نے بتایا۔

''دیکھ لو کاشف، وقت ہاتھ سے نکل رہا ہے۔''

''کتنا وقت ہے ہمارے پاس؟'' کاشف نے پوچھا۔

خیام نے حساب لگایا اور بولا۔ ''بائیس گھنٹے ہیں۔ اس کے بعد وہ میموری کارڈ پولیس اسٹیشن پہنچ جائے گا۔''

''میں جلدی کام ختم کر کے آتا ہوں۔'' کاشف نے کہا۔ ''اگر میرا جانا ضروری نہ ہوتا تو میں کوئی نہ کوئی بہانہ کر دیتا۔''

''جتنی جلدی ہو سکے، میرا کام کر دو۔ میں بہت دیر ایک ہی جگہ چھپ کر بیٹھنے کا عادی نہیں ہوں۔'' خیام بولا۔

''تم اپنے آدمی کو فون کر کے روک لو۔ یہ کام چٹکی بجاتے ہی نہیں ہو جائے گا۔'' کاشف نے کہا۔

''اب میں ایسا کچھ نہیں کروں گا۔ بائیس گھنٹے ہیں تمہارے پاس، پیسے کا انتظام کر دو یا پھر اپنا انجام بھگتنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔'' خیام نے دوٹوک کہہ دیا۔

''تم......'' کاشف دانت پیس کر اس کی طرف بڑھا لیکن رک گیا۔ وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

خیام کا لہجہ درشت ہوگیا۔ ”تم وقت ضائع مت کرو۔ اور مجھے آنکھیں نکال کر دکھانے کی ضرورت نہیں ہے۔“

کاشف نے نیلم کی طرف دیکھا۔ ”میں چلتا ہوں۔ تم یہیں رہنا۔“ پھر کاشف نے خیام کی طرف دیکھا۔ ”یاد رکھنا خیام اگر تم نے نیلم کے ساتھ کوئی بدتمیزی کی تو مجھ سے یہ برداشت نہیں ہوگا۔“

”میں کیوں اس کے ساتھ بدتمیزی کروں گا۔“ خیام نے بے پروائی دکھائی۔ ”میری جان کو بنی ہوئی ہے، مجھے کچھ سوجھ نہیں رہا ہے اور تم بدتمیزی کی بات کر رہے ہو۔“

کاشف نے نیلم کا ہاتھ پکڑا اور اسے اپنے بیڈ روم میں لے گیا۔ اس نے سامنے والی الماری کا پٹ کھولا اور لٹکتے ہوئے کپڑے ایک طرف ہٹائے تو سامنے ایک دراز دکھائی دی۔ اسے کھولا تو اس کے اندر ایک ریوالور اور کچھ گولیاں پڑی تھیں۔

”تم ضرورت کے وقت اسے استعمال کر سکتی ہو۔“

نیلم مرجھائے انداز میں بولی۔ ”دل کی تسلی کے لیے ہم یہ سوچ بھی نہیں سکتے۔ تم جانتے ہو کہ اگر ہم نے اس کے ساتھ کچھ برا کیا اور اس کی مقررکی ہوئی مدت پوری ہوگئی تو ہمارا ثبوت پولیس اسٹیشن پہنچ جائے گا اور ہم.....“ نیلم کہتی کہتی خود ہی چپ ہوگئی۔

کاشف نے اس کی طرف ناچاری سے دیکھا اور ہونٹ بھینچ کر رہ گیا۔ وہ بولا۔ ”بہرحال اپنا خیال رکھنا۔ تم باہر چلو میں کپڑے بدل لوں۔“

نیلم باہر چلی گئی اور کاشف تھوڑی دیر میں کپڑے بدل کر باہر آگیا۔ خیام ایک طرف بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ کاشف نے اس کی طرف عجیب سی غصیلی نظروں سے دیکھا تو جواباً خیام کے چہرے پر ایک شاطری سی مسکراہٹ آگئی۔

کاشف نے اپنی نگاہیں نیلم کی طرف پھیر لیں۔ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے تسلی دی اور نیلم اس کے بیڈ روم میں چلی گئی۔ کاشف گیراج کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

کاشف نے ہوٹل پہنچ کر اس کمرے کے دروازے پر ہلکی سی دستک دی جہاں مظہر ایوب ٹھہرا تھا۔ وہ بہت عرصہ قبل ساؤتھ افریقہ میں آباد ہوگیا تھا اور وہاں ہی اس نے کاروبار شروع کر دیا تھا۔ مظہر سال میں کم از کم تین چکر اس ملک کے لگاتا تھا اور یہاں سے وہ مختلف فیکٹریوں سے مال بنوا کر ان پر اپنا مارکہ لگوا کر ساؤتھ افریقہ کے لیے منگوا لیتا تھا۔

مظہر میٹنگ میں تب ہی دیر لگاتا تھا جب اسے نئی ڈیل کرنی ہوتی تھی۔ اگر پرانی ہی ڈیل پر اسے آرڈر اور پے منٹ کرنی ہوتی تھی تو ایک گھنٹے میں کام ختم ہوجاتا تھا۔

مظہر نے دروازہ کھولا تو اس نے کاشف کو دیکھتے ہی اپنے چہرے پر مسکراہٹ سجائی۔ دونوں بغل گیر ہوگئے اور مظہر اسے خوش دلی سے اندر لے گیا۔

مظہر ایوب کا جسم پتلا، قد درمیانہ اور رنگ گورا تھا۔ دونوں ایک طرف بیٹھ گئے اور کاشف نے اپنے باس کو بھی اطلاع کر دی کہ وہ ہوٹل پہنچ گیا ہے۔

کاشف اور مظہر کے درمیان گپ شپ ہونے لگی۔ چائے آگئی اور وہ اس سے لطف اندوز ہونے لگے۔ کاشف پریشانی کے باوجود اس کے ساتھ ہنستے ہوئے خوش دلی سے بات کر رہا تھا۔ اس دوران کاروباری باتیں ہوتی رہیں اور مظہر ایوب نے اپنے بریف کیس سے ایک کاغذ نکال کر کاشف کی طرف بڑھا دیا۔ اس پر مظہر نے اپنی ڈیمانڈ کے مطابق آرڈر لکھا تھا جو اچھا خاصا تھا اور کاشف کو یقین تھا کہ اس کا باس آرڈر کو دیکھے گا تو اس کی باچھیں کھل جائیں گی۔

”پے منٹ آج ہی آپ کے اکاؤنٹ میں منتقل ہو جائے گی۔“ مظہر نے کہا۔

اسی وقت مظہر کا موبائل فون بجا اور اس نے موبائل فون کو کان سے لگالیا۔ رسمی بات چیت کے بعد مظہر اپنی جگہ سے اُٹھا اور ایک طرف رکھا دفتری بیگ اُٹھا کر اپنے پاس لے آیا۔ اس نے زپ کھولی اور اندر سے دو چیک نکالے اور ان کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ”میرے پاس دو چیک ہیں۔ یہ میرے بھائی کے چیک ہیں جو اسی شہر میں بزنس کرتا ہے۔ آپ میرے پاس آجائیں میں آپ کو آج ہی کی تاریخ کے دونوں چیک بھر دوں گا۔ چیک خالی اس لیے چھوڑے ہیں کہ مجھے معلوم نہیں ہے کہ آپ کا بل کتنا بنتا ہے، کیونکہ کچھ کلیم بھی کاٹنا ہے۔“ مظہر چپ ہو کر سننے لگا اور پھر بولا۔ ”کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ ستر لاکھ روپے کا بل بھی ہوا وہ بھی آج ہی کی تاریخ کا چیک دے کر آپ کو کلیئر کر دوں گا۔ آپ ابھی آجائیں۔“ مظہر پھر چپ ہو کر سننے لگا جبکہ کاشف کے کان اس کی باتوں اور اس کے ہاتھ میں پکڑے چیکوں پر نظر تھی۔

مظہر پھر بولا۔ ”اچھا آپ چار بجے آئیں گے اور ابھی ساڑھے بارہ ہوئے ہیں۔ کوئی بات نہیں آجائیں۔“ اس کے بعد کچھ باتوں کے بعد فون بند کر دیا اور مظہر ہاتھ میں پکڑے چیک واپس بیگ میں رکھتے ہوئے بولا۔ ”یہ

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

کاروباری آدمی نہیں ہے۔ بات کچھ کرتا ہے اور مال کچھ بناتا ہے۔ تھوڑے سے پیسے ہیں اس کے بھی کوئی ساٹھ، ستر لاکھ روپے میں نے بھائی سے چیک لے لیے کہ اسے یہیں سے فارغ کردوں۔''

''ہوتے ہیں کچھ لوگ ایسے بھی۔'' کاشف نے لقمہ دیا۔ ''میرا خیال ہے کہ اب مجھے چلنا چاہیے۔'' کاشف نے گھڑی کی طرف دیکھا۔

''آپ بیٹھنا چاہیں تو مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ میری اگلی میٹنگ تین بجے ہے۔'' مظہر نے کہا۔

''مجھے یہ آرڈر دینا ہے اور مال کی تیاری کے لیے آج سے ہی کام شروع کرنا۔ ہم ڈنر پر ملیں گے۔'' کاشف بولا۔

''جیسی آپ کی مرضی۔'' وہ دونوں ملے اور کاشف کمرے سے باہر نکل گیا۔

کاشف ابھی لفٹ کے پاس پہنچا ہی تھا کہ لفٹ کا دروازہ کھلا اور ایک خوبصورت خاتون باہر نکلی۔ اس کا نام ردا تھا اور روشنیوں کے شہر میں اس کا بہت بڑا بوتیک تھا۔ چند ہفتے قبل نیلم نے اس سے کاشف کی ملاقات بھی کرائی تھی۔ وہ اس شہر میں بھی بوتیک کھولنا چاہتی تھی شاید وہ اسی سلسلے میں یہاں آئی تھی۔ ردا اور نیلم اچھی دوست تھیں۔

''ارے کاشف آپ۔'' وہ کاشف کو دیکھتے ہی رک گئی۔

''آپ یہاں؟''

''میں کمرا نمبر دو سو سولہ میں ٹھہری ہوں۔ رات ہی آئی تھی۔'' ردا نے بتایا۔ ''مصروف تھی اس لیے نیلم کو فون نہیں کرسکی۔''

''میں نیلم کی طرف ہی جارہا ہوں۔ میں اسے بتادوں گا۔'' کاشف نے کہا۔

''آجائیں ہم کچھ دیر بیٹھتے ہیں۔''

''مجھے ذرا جلدی ہے۔ میں نیلم کو اطلاع کردوں گا۔'' کاشف کہہ کر اجازت لے کر چلا گیا۔

کاشف اپنی کار میں بیٹھا۔ اس نے پہلے باس کو ساری صورتِ حال سے آگاہ کیا اور طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر کے چھٹی لی اور کہا کہ وہ ڈنر پر ضرور موجود ہوگا۔ اس کے بعد وہ اپنے گھر کی طرف چلا گیا۔ اندر گیا تو خیام مزے سے ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ کاشف سیدھا بیڈ روم میں چلا گیا۔ وہاں نیلم موجود تھی وہ اسے باہر لے آیا۔ کاشف اور نیلم بھی خیام کے پاس ہی بیٹھ گئے۔

''دونوں میری بات غور سے سنو۔ مظہر ایوب ہماری پارٹی ہے۔ وہ ہوٹل کے کمرا نمبر دو سو چودہ میں ٹھہرا ہے۔ اس کے پاس دو اوپن چیک ہیں جن پر دستخط موجود ہیں۔ تم دونوں ہوٹل میں پہنچو۔ اس کے کمرے میں جا کر مظہر کو قابو کر کے باندھ دو اور ایک چیک پر بیس لاکھ روپے بھر کر مجھے باہر دے دو۔ میں وہ چیک کیش کرا کے خیام کو پیسے دے دیتا ہوں۔ تمہاری ضرورت پوری ہوجائے گی اور ہمارا جو ثبوت تمہارے پاس ہے وہ تم ہمیں واپس کردو گے۔''

''تو کیا مجھے ہوٹل میں جانا پڑے گا۔'' کاشف کے چپ ہوتے ہی خیام نے برا سامنہ بنایا۔

''تم جاؤ گے تو اسے قابو کرو گے۔'' کاشف نے کہا۔

''میں باہر نہیں نکل سکتا۔ مجھے ڈر ہے کہ پولیس مجھے پکڑ نہ لے۔'' خیام نے انکار کرتے ہوئے اندیشہ ظاہر کیا۔

''اگر تم باہر نہیں نکل سکتے تو پھر میں اس کے سوا کچھ نہیں کرسکتا۔'' کاشف نے بھی ہتھیار پھینک دیا۔

''یہ بہت بڑا رسک ہے۔'' خیام نے کہا۔

''ہم اپنی جان بچانے کے لیے یہ رسک لے رہے ہیں۔ میں اس کے سامنے جا کر یہ کام نہیں کرسکتا۔ تمہارے ساتھ نیلم ہوگی اور میں تمہیں اپنا ریوالور بھی دوں گا۔'' کاشف بولا۔

''لیکن مجھے گولی چلانی نہیں آتی۔ اس سے پہلے میں نے کبھی ایسا کام نہیں کیا۔'' خیام تذبذب میں تھا۔

''کون گدھا کہتا ہے کہ تم گولی چلانا۔ ریوالور خالی ہوگا۔ وہ اس سے ڈر جائے گا۔'' کاشف بولا۔

''ٹھیک ہے، میں تیار ہوں۔ اس مسئلے سے نجات کے لیے مجھے رسک لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔'' نیلم نے جلدی سے ہامی بھرلی۔

''بولو خیام کیا کہتے ہو وقت کم ہے۔ ورنہ جس کو اس نے چیک دینے ہیں، وہ آکر چیک لے جائے گا۔'' کاشف نے اس کی طرف دیکھا۔

''اوکے ہم جاتے ہیں۔ لیکن اس کام کے بعد ہمارے لیے چھپنا مشکل ہوجائے گا۔ ہماری شکلیں وہ دیکھ لے گا۔'' خیام نے کہا۔

''کچھ نہیں ہوگا۔ وہ یہاں سے تین چار روز میں چلا جائے گا۔ تم ایک ہفتے کے لیے کہیں چلے جانا اور نیلم کا میں خود ہی انتظام کردوں گا۔ اب وقت ضائع مت کرو اور مزید سنو کہ کیا کرنا ہے۔'' اس کے بعد کاشف نے ایک ایک بات ان کو سمجھائی کہ انہیں کیسے ہوٹل کے اندر جانا ہے اور کس طرح سے انہوں نے مظہر کو قابو کر کے اس سے چیک لے کر اس

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

تک پہنچانا ہے اور تب تک انہوں نے مظہر کے کمرے سے باہر نہیں نکلنا ہے جب تک وہ انہیں فون کے ذریعے یہ نہ بتادے کہ اس نے بینک سے پیسے لے لیے ہیں۔ اس کے بعد ان کو کہاں ملنا ہے۔ خیام اور نیلم غور سے کاشف کی ایک ایک بات سن رہے تھے۔

''کاشف اس کے پاس کیش بھی تو ہوگا۔'' خیام نے اس کی بات سننے کے بعد پوچھا۔

''وہ کیش بالکل نہیں رکھتا۔ اس کے پاس ضرورت کے پیسے یا پھر کریڈٹ کارڈ ہوتا ہے۔'' کاشف نے کہا۔

جب کاشف چپ ہوا تو نیلم نے کہا۔ ''کاشف ہم مظہر کے کمرے تک کیسے جائیں گے۔ کیونکہ اس ہوٹل میں تب تک کمرے تک جانے کی اجازت نہیں ہوتی جب تک استقبالیہ پر جاکر یہ نہ بتایا جائے کہ کس سے ملنا ہے۔ اور وہ متعلقہ آدمی سے فون کرکے پوچھ نہ لیں۔''

''اس کا بھی انتظام ہو چکا ہے۔ تم کو یاد ہے کہ تم نے مجھے ایک بار اپنی دوست ردا سے ملوایا تھا۔ ردا اس ہوٹل کے کمرا نمبر دو سو سولہ میں ٹھہری ہوئی ہے۔ وہ اس شہر میں اپنے کام کے سلسلے میں آئی ہوئی ہے۔ تم استقبالیہ پر جاکر اس سے ملنے کی بات کروگی۔ وہ اصول کے مطابق ردا سے رابطہ کریں گے۔ تم دونوں اوپر چلے جانا۔ اور کچھ دیر اس کے پاس جاکر بیٹھنا اور بہانہ کرکے اُٹھ جانا کہ تم دونوں یہاں کسی اور سے ملنے آئے ہو اور ان سے مل کر واپس آتے ہو۔''

''اگر ردا نے پوچھا کہ اس سے میرا کیا تعلق ہے تو؟'' نیلم نے خیام کی طرف اشارہ کیا۔

''ہم کہہ دیں گے کہ ہم دوست ہیں۔'' خیام بلا تامل مسکراتے ہوئے بولا۔

کاشف اور نیلم نے بیک وقت اسے گھورا۔ ''کہہ دینا کہ تم دونوں بزنس پارٹنر ہو۔ تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اب اُٹھو اور تم دونوں نکلو۔'' کاشف نے کچھ اور سمجھانے کے بعد ان کو اٹھنے کے لیے کہا۔

کاشف اپنے کمرے میں گیا اور خالی ریوالور لے آیا۔ اس نے وہ ریوالور خیام کو دے دیا۔

''باہر نکلنے سے مجھے ڈر لگتا ہے، لیکن جانا ہی پڑے گا۔'' خیام ریوالور کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ''آج یہ ایڈونچر بھی ہو جائے۔'' اس نے ریوالور پتلون میں اُڑس لیا۔ ریوالور کا دستہ باہر تھا۔ اوپر سے اس نے کوٹ پہن لیا اور اب کوئی یہ نہیں جان سکتا تھا کہ خیام کے پاس ریوالور بھی ہے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

خیام نے کاشف کا اسکارف گلے میں ڈال لیا اور نیلم کے گلے میں پہلے ہی اس کا پھولدار اسکارف موجود تھا۔

کاشف دونوں کو اپنی کار میں ہوٹل تک لے گیا اور دونوں کو ہوٹل سے کچھ فاصلے پر اتار دیا۔

نیلم اور خیام ہوٹل کی طرف پیدل چل پڑے۔ خیام نے اس انداز سے اسکارف گردن کے گرد لپیٹا تھا کہ اس کا چہرہ واضح نہ ہوسکے۔ وہ پھر بھی دائیں بائیں دیکھ رہا تھا۔

ہوٹل کے اندر جاکر دونوں استقبالیہ کی طرف بڑھے۔ نیلم نے کہا۔ ''کمرا نمبر دو سو سولہ میں ردا حبیب کو اطلاع کیجیے کہ نیلم آئی ہے۔''

استقبالیہ پر موجود لڑکے نے فون اُٹھا کر ایک نمبر ملایا۔ خیام پُراعتماد انداز میں کھڑا تھا لیکن اس کی نگاہیں چاروں طرف گھوم رہی تھیں۔ بات کرنے کے بعد وہ لڑکا، نیلم سے مخاطب ہوا۔ ''آپ چلی جائیں۔''

نیلم اور خیام لفٹ کی طرف چلے گئے۔ جب نیلم نے ردا کے کمرے پر دستک دی تو ردا خوشگوار حیرت سے باہر نکلی اور نیلم کے گلے لگ گئی اور دونوں کو اپنے کمرے میں لے گئی۔

☆☆☆

کاشف اپنی کار دوڑاتا ہوا ایک پسماندہ سے محلے میں چلا گیا۔ اس نے کار ایک طرف کھڑی کی اور تیز تیز چلتا ہوا پان سگریٹ کے ایک کھوکھے کے پاس چلا گیا۔ وہاں ایک نوجوان منہ میں پان ڈالے کھڑا تھا۔ کاشف کو دیکھتے ہی وہ مسکرایا تو اس کے سرخ دانت واضح ہوگئے۔

''ارے کاشف باؤ آج اِدھر کا راستہ کیسے بھول گئے؟''

''بس اِدھر سے گزر رہا تھا تو آگیا۔ سناؤ کیا حال ہے۔'' کاشف نے اس سے ہاتھ ملایا۔

''سب ٹھیک ہے۔ آپ سنائیں۔''

''میں بھی ٹھیک ہوں۔ وہ چنگیزی کہاں ہوتا ہے آج کل؟'' کاشف نے پوچھا۔

''ابھی دو منٹ پہلے وہ اپنے گھر گیا ہے۔'' اس نے بتایا۔

''اچھا میں ذرا اس سے مل آؤں۔ آخر میرا پرانا محلے دار ہے۔'' کاشف مسکرایا اور ایک طرف چل پڑا۔

ایک تنگ سی گلی کے آخر میں ایک چھوٹا سا مکان تھا۔ کاشف نے اس کا دروازہ بجایا تو تھوڑی دیر کے بعد دروازہ کھلا اور ایک پتلا دبلا سا نوجوان باہر نکلا۔ اچانک کاشف کو دیکھ کر اس کا چہرہ کھل سا گیا۔ اور دونوں نے مصافحے کے لیے اپنا اپنا ہاتھ ایک دوسرے کی طرف بڑھا دیا۔

چنگیزی اور کاشف ایک ہی محلے میں رہتے تھے۔ چنگیزی کا اُٹھنا بیٹھنا اچھے لوگوں کے ساتھ نہیں تھا اس لیے وقت نے اسے جیب تراش، جواری اور جانے کیا کیا بنادیا تھا۔ وہ کسی کا خون نہیں کرسکتا تھا، باقی وہ پیسے کے لیے ہر کام دلیری سے کرنے پر آمادہ ہوجاتا تھا۔

''آجائیں اندر بیٹھتے ہیں۔'' چنگیزی نے کہا۔

''مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔'' کاشف آہستہ سے بولا۔

''کوئی خاص بات ہے؟'' چنگیزی نے بھی اپنی آواز کو دھیما رکھا۔

''ہاں خاص بات ہے۔ میری کار پان شاپ کے پیچھے کھڑی ہے۔ میں جارہا ہوں میرے پیچھے آجاؤ۔''

''آپ چلیں میں آرہا ہوں۔'' چنگیزی نے کہا اور کاشف اپنی کار کی طرف چلا گیا۔

کاشف جاکر اپنی کار میں بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد چنگیزی دوسری طرف سے کار کے پاس آیا اور کاشف کے برابر میں بیٹھ گیا۔

کاشف اپنی کار وہاں سے آگے لے گیا اور محلے کے دوسری طرف کھڑی کردی۔

کاشف نے وقت ضائع کیے بغیر کہا۔ ''بینک سے ایک چیک کیش کرانا ہے۔ تمہارے پاس شناختی کارڈ کی فوٹو کاپی ہونی ضروری ہے۔ لیکن مجھ سے یہ مت پوچھنا کہ چیک کس کا ہے اور کیا ہے۔''

''مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں ہے کہ چیک کس کا ہے اور کیوں کیش کرانا ہے۔ مجھے اپنے پیسوں سے مطلب ہوتا ہے۔'' چنگیزی بولا۔

''تمہیں ابھی میرے ساتھ چلنا ہے۔ کیونکہ میرے پاس وقت کم ہے۔'' کاشف نے کہا۔

''میں ویسے بھی شہر چھوڑ کر جانے والا تھا۔ آپ دو منٹ لیٹ ہوجاتے تو مجھ سے نہ مل پاتے۔'' چنگیزی بولا۔

''تم شہر چھوڑ کر کیوں جارہے ہو؟'' کاشف نے اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

''علاقے کا تھانیدار پیچھے پڑ گیا ہے۔ سوچا مہینہ دو مہینہ کے لیے شہر سے چلا جاؤں۔''

''چلو تم میرا یہ کام کرو اور شہر سے چلے جانا۔''

''آپ کا کام کرنے کے بعد شہر سے نکل جانا تو اور بھی ضروری ہوجائے گا۔'' وہ مسکرایا۔

''میرا کام کرنے میں کوئی مسئلہ تو نہیں ہے؟'' کاشف

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

نے پوچھا۔

''مجھے کیا مسئلہ ہو سکتا ہے۔ میرا جیب خرچ بن جائے گا۔'' چنگیزی نے بے پروائی سے سر ہلایا۔

''تو پھر چلیں۔'' کاشف بولا۔

''میں اپنا سامان لے آؤں، بس ابھی دس منٹ میں آیا۔'' چنگیزی اتر کر چلا گیا۔ چنگیزی اس چھوٹے سے خستہ حال مکان میں اکیلا ہی رہتا تھا۔ یہ مکان اس کے استاد کا تھا۔

وہ ٹھیک دس منٹ بعد واپس آگیا اور کاشف نے کار آگے بڑھا دی۔ وہ سارے راستے اُسے سمجھاتا رہا کہ چیک کیش کرانے کے بعد اسے رقم کہاں دینی ہے۔

☆☆☆

ردا اپنی دوست نیلم کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ وہ اس شہر میں اپنے تیار کردہ ملبوسات کی مارکیٹنگ کے لیے آئی تھی۔ وہ کچھ مردانہ اور زنانہ ملبوسات نیلم کو دکھانے لگی۔ ردا واقعی اپنے کام کی ماہر تھی۔ اس کا تیار کردہ ہر لباس زبردست تھا۔

نیلم کچھ دیر اپنی دوست کے پاس بیٹھی رہی اور پھر بولی۔ ''ردا ہم یہاں کسی اور سے ملنے آئے ہیں۔ ہم ان سے مل کر واپس تمہارے پاس آتے ہیں۔''

''ابھی تو ہم نے کوئی بات ہی نہیں کی۔'' ردا نے جلدی سے کہا۔

اس کی بات سن کر خیام دل ہی دل میں مسکرایا کہ پچھلے بیس منٹ سے وہ ایک پل کے لیے بھی چپ نہیں ہوئی تھیں۔ نیلم کے اچانک آنے پر وہ اس قدر خوش تھی کہ اس کی باچھیں کھلی ہوئی تھیں اور اب وہ کہہ رہی تھی ابھی انہوں نے کوئی بات ہی نہیں کی۔

''ہم آکر بات کریں گے اور ڈھیر ساری باتیں کریں گے۔'' نیلم اپنی جگہ سے اُٹھی۔

''ویسے یہ کون ہیں۔ تم نے تعارف نہیں کرایا؟'' ردا نے ایک نظر خیام کی طرف دیکھ کر آہستہ سے پوچھا۔ خیام پھر مسکرایا کہ شکر ہے کہ اس پر بھی اس کی نظر پڑ ہی گئی۔

''ہم دونوں نے مل کر ایک بزنس شروع کیا ہے۔'' نیلم نے مختصر بتایا۔ ''یہ میرے ساتھ شراکت دار ہیں۔''

وہ چونکی۔ ''بزنس......؟ کیسا بزنس؟ کونسا بزنس شروع کیا ہے۔ مجھے بھی بتاؤ۔''

''ہم واپسی پر بات کرتے ہیں اور میں تم کو تفصیل سے بتاؤں گی؟'' نیلم مسکرائی۔

''او کے جلدی آجانا۔ میں انتظار کر رہی ہوں۔'' ردا .... بولی اور وہ دونوں کمرے سے باہر نکل آئے۔

اب دونوں کا رخ مظہر کے کمرے کی طرف تھا جو وہاں سے کچھ فاصلے پر اسی راہداری پر تھا۔ مظہر کے کمرے کے پاس جا کر خیام نے پہلے کمرا نمبر دیکھا اور پھر ہلکی سی دستک دی تھوڑی دیر کے بعد اندر سے مظہر کی آواز آئی۔

''کون ہے؟''

''سر آپ کے لیے میسج ہے۔'' خیام نے پُراعتماد لہجے میں کہا تو چند لمحوں بعد تھوڑا سا دروازہ کھلا اور اس نے دونوں کی طرف حیرت سے دیکھا۔

''سر کیا ہم اندر آسکتے ہیں؟'' خیام نے پوچھا۔ اس کا چہرہ اسکارف کی وجہ سے واضح نہیں تھا۔

''آپ کون ہو؟'' مظہر نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

''شکریہ سر۔'' خیام اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے ایسے اندر بڑھا جیسے اس نے ان کو اندر آنے کی اجازت دے دی ہو۔ اندر قدم رکھتے ہی خیام نے ریوالور نکال کر اس کا رخ مظہر کی طرف کر دیا۔ ریوالور دیکھ کر مظہر یکدم گھبرا گیا۔ نیلم نے جلدی سے دروازہ بند کر دیا۔

''کوئی شور نہیں۔ ہم پُر امن ڈاکو ہیں۔ یہاں بیٹھ جاؤ۔'' خیام نے کہا اور مظہر خوف سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کرسی پر بیٹھ گیا۔ نیلم اپنے ساتھ نائیلون کی رسی لے کر آئی تھی۔ اس نے پرس سے نکال کر خیام کی طرف بڑھا دی اور اس کے ہاتھ سے ریوالور خود لے لیا۔

''تم کون لوگ ہو اور کیا چاہتے ہو؟'' مظہر اس اچانک آفت پر گھبرا گیا تھا۔ ''تم لوگ میرے کمرے تک کیسے آئے؟''

''سوال جواب کا بالکل بھی وقت نہیں ہے۔'' خیام نے کہتے ہوئے اس کے دونوں ہاتھ پیچھے کی طرف لے جا کر باندھ دیے۔ ریوالور کی زد میں مظہر نے بالکل بھی مزاحمت نہیں کی۔

''تم دونوں کیا چاہتے ہو؟'' مظہر نے پھر پوچھا۔

''کچھ نہیں چاہتے۔ بس تم خاموش رہو۔'' خیام نے اس کے ہاتھ باندھنے کے بعد اسے کرسی پر بٹھایا اور اس کو کرسی کے ساتھ رسی سے مضبوطی سے باندھنا شروع کر دیا۔ مظہر اتنا گھبرا گیا تھا کہ وہ کوئی مداخلت نہیں کر رہا تھا۔ جب خیام نے اسے اچھی طرح سے باندھ دیا تو کاشف کی ہدایت کے مطابق نیلم نے متلاشی نگاہوں سے اس بیگ کی طرف

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

www.paksociety.com

دیکھا جس کے بارے میں کاشف نے بتایا تھا کہ وہ سیاہ دفتری بیگ ہے جس کے اندر چیک ہیں۔

وہ بیگ ایک طرف رکھا نظر آرہا تھا۔ نیلم نے آگے بڑھ کے بیگ اٹھالیا اور اس کے اندر دونوں چیک تلاش کیے اور پھر سارا بیگ اُلٹ دیا۔

''کیش کہاں ہے؟'' خیام نے پوچھا۔ کاشف نے ان کو ہدایت کی تھی کہ وہ پہلے کیش کا تقاضا کریں تاکہ اسے شک نہ ہو کہ وہ صرف چیک کے لیے آئے تھے۔

''میرے پاس کیش نہیں ہے۔'' مظہر نے کہا۔

''سیدھی طرح کیش دے دو ورنہ کھوپڑی میں سوراخ کردوں گا۔'' خیام نے دھمکی دی۔ اس نے نیلم کے ہاتھ سے ریوالور لے کر مظہر کی کنپٹی پر رکھ دیا تھا۔

''میرے پاس کیش نہیں ہوتا لیکن میں کیش منگوا سکتا ہوں۔ مجھے کوئی نقصان مت پہنچانا۔'' مظہر نے ڈرتے ہوئے کہا۔ اسے اپنی زندگی عزیز تھی اس لیے اس نے فوراً کہہ دیا۔

''یہ چیک ہیں؟'' نیلم نے اسی جگہ بیٹھے بیٹھے چیک خیام کو دکھائے۔

''یہ چیک کتنے کے ہیں۔'' خیام نے ان چیکوں کی طرف دیکھا اور پھر مظہر سے سوال کیا۔

''اوپن ہیں۔ ان پر دستخط ہو چکے ہیں۔'' مظہر کے جواب دینے سے قبل نیلم نے بتادیا۔

''اوپن چیک ہیں...... اس اکاؤنٹ میں پیسے ہیں؟'' خیام نے اپنا چہرہ مظہر کی طرف پھیرا۔

''ہاں ہیں۔'' مظہر نے تھوک نگل کر اثبات میں گردن بھی ہلائی۔

''کتنا کیش ہے۔'' خیام نے پوچھا۔

''مجھے معلوم نہیں ہے۔'' اس جگہ مظہر نے جان بوجھ کر سچ بولنے سے اجتناب کیا۔

''بتاتے ہو کہ گولی مار کر تمہارا کام تمام کردوں۔'' خیام کا درشت لہجہ کام کر گیا اور مظہر فوراً بولا۔

''ستر لاکھ کے قریب ہے۔''

ستر لاکھ روپے کا سن کر خیام کی آنکھوں کی چمک دوچند ہوگئی تھی۔ اس کا منہ پانی سے بھر گیا۔

''ٹھیک ہے ہم یہ چیک کیش کرا لیتے ہیں۔'' خیام ایک طرف ہٹ گیا۔

خیام، نیلم کے پاس چلا گیا اور چیک کو دیکھا۔ چیک دستخط شدہ تھے اور رقم بھرنی باقی تھی۔

''اس پر جلدی سے بیس لاکھ روپے بھر لو تاکہ میں چیک باہر دے آؤں۔'' نیلم نے سرگوشی کی۔ نیلم نے مظہر کے بیگ سے پین بھی نکال لیا تھا۔ وہ پین اس نے خیام کی طرف بڑھا دیا۔

خیام نے اس کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا اور چیک پکڑ کر ایک طرف چلا گیا اور چیک پر رقم بھرنے لگا۔ پھر اس نے چیک نیلم کی طرف بڑھا کر کہا۔ ''جاؤ دے آؤ۔''

نیلم نے چیک کی طرف دیکھ کر سرگوشی کی۔ ''تم نے پچاس لاکھ روپے کا چیک بھر دیا؟''

''وقت ضائع مت کرو اور اسے چیک دے آؤ اور اسے بولنا کہ سارے پیسے میرے ہیں۔ ایک پائی بھی کم نہ ہو۔'' خیام کی نیت بدل گئی تھی۔

''تم صرف بیس لاکھ روپے لینا چاہتے تھے؟'' نیلم کا لہجہ بدستور دھیما تھا۔

''سمندر کے سامنے کھڑے ہو کر میں نے صرف چلّو بھرا ہے ورنہ پانی تو ابھی بھی اس میں بہت ہے۔ چاہتا تو میں پورے ستر لاکھ روپے کا چیک بھر لیتا۔'' خیام نے کہا۔

''تم......'' نیلم اسے کچھ کہنا چاہتی تھی۔

''خاموش...... تم جان بوجھ کر وقت ضائع کر رہی ہو۔'' خیام نے اسے چپ کرا دیا اور نیلم تلملاتی ہوئی باہر نکل گئی۔

نیلم لفٹ سے نیچے آئی اور ہوٹل سے باہر نکل کر پیدل ہی اس جگہ تک چلی گئی جہاں کاشف اس کا منتظر تھا۔ اس نے چیک کاشف کی طرف بڑھاتے ہوئے سرگوشی کی۔

''اس نے پچاس لاکھ روپے کا بھر دیا ہے۔''

''کمینہ......'' کاشف کو غصہ آگیا لیکن وہ اس وقت کسی بحث میں پڑنا نہیں چاہتا تھا۔ زندگی میں پہلی بار وہ ایسا کام کر رہا تھا۔ اب اس کی کوشش تھی کہ کسی طرح سے یہ کام جلدی ہو جائے اور معاملہ کسی ثبوت کے بغیر ختم ہو جائے۔

''سب ٹھیک ہے ناں کوئی گڑبڑ تو نہیں ہے۔'' کاشف نے پوچھا۔

''سب ٹھیک ہے۔'' نیلم نے بتایا۔

''تم جاؤ اور میرے فون کا انتظار کرنا۔'' کاشف نے چیک جیب میں ڈالا اور اپنی کار کی طرف بڑھا جو کچھ فاصلے پر کھڑی تھی۔

اپنی کار میں بیٹھ کر اس نے چیک چنگیزی کی طرف بڑھایا۔ ''یہ قریبی برانچ کا چیک ہے جو یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ چیک کیش کرا کے تم تیس ہزار روپے اپنے

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

لے لینا اور باقی رقم اس بیگ میں ڈال کر اس جگہ پہنچ جانا جہاں کا میں نے بتایا ہے۔''

بیس ہزار کا سن کر چنگیزی خوش ہو گیا تھا۔ کاشف نے وقت دیکھا اور کار آگے بڑھا دی۔ اس کی کار کا رخ بینک کی طرف تھا جو محض دس منٹ کی مسافت پر تھا۔

☆☆☆

کاشف نے چنگیزی کو بینک سے پہلے ہی اتار دیا اور وہ پیدل بینک کی طرف چل پڑا۔

کاشف کار کو پارکنگ کی طرف لے گیا جہاں ٹوکن پر کار کھڑی کی جا سکتی تھی۔ اس نے کار کھڑی کی اور خراماں خراماں بینک کی طرف چلا گیا۔ اس کا دل گھبرا رہا تھا اور خوف اس کے چہرے سے مترشح تھا۔ اسے یقین تھا کہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ اس برانچ سے اس سے بھی بڑی رقم لینا کوئی دشوار کام نہیں تھا۔ لیکن اسے خیام پر شدید غصہ بھی آ رہا تھا کہ جس نے چیک پچاس لاکھ روپے کا بھر دیا تھا۔

کاشف بینک کے اندر چلا گیا۔ بینک میں رش تھا۔ بہت سے لوگ اپنی باری کے انتظار میں کرسیوں پر براجمان تھے۔ کاشف نے دیکھا کہ ایک طرف چنگیزی ہاتھ میں اپنا ٹوکن لیے بیٹھا ہے۔ کاشف ایک طرف بیٹھ گیا اور اخبار پڑھنے لگا۔

اخبار کے ایک صفحے پر نوشین کی خبر بھی چھپی تھی۔ خبر پڑھ کر کاشف کو حیرت ہوئی تھی کہ جس ویران جگہ پر اس نے لاش ڈھلان میں گرائی تھی، وہاں سے لاش کیسے برآمد ہو گئی؟ کیا اس جگہ کوئی موجود تھا؟ کاشف سوچتا رہا لیکن وہ اس سوال کے جواب تک نہیں پہنچ سکا۔

کاشف نے وہ خبر کئی بار پڑھی۔ اس کی گھبراہٹ دوچند ہو گئی۔ کاشف نے اخبار ایک طرف رکھ دیا اور غیر محسوس انداز میں دیکھا کہ چنگیزی اپنی باری پر کیش لینے کے لیے کاؤنٹر کی طرف چلا گیا تھا۔ کاشف کے دل کی دھڑکنیں اور بھی تیز ہو گئی تھیں۔ وہ دائیں بائیں دیکھنے لگا۔ وہ بے حد مضطرب تھا۔

☆☆☆

مظہر کرسی پر بندھا بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر ابھی تک گھبراہٹ تھی اور وہ بے بسی سے دونوں کی طرف دیکھ بھی لیتا تھا۔ خیام اور نیلم اس سے کچھ فاصلے پر دوسری طرف منہ کیے بیٹھے تھے۔ دونوں اپنی صورت اس کی آنکھوں کے سامنے زیادہ نہیں رکھنا چاہتے تھے۔

''ایک بات کہوں آپ سے۔'' اچانک خیام نے

کہکشاں کی اولاد

ایک پڑھا لکھا، شہر زدہ نوجوان چھٹی پر گاؤں آیا اور اپنے دیہاتی والد کو اپنے ساتھ تفریح کے لیے مرغزار لے گیا۔ وہاں پھولوں سے لدے ہوئے ایک وسیع سبزہ زار میں دونوں نے مل کر خیمہ نصب کیا، گھومے پھرے، کھانا کھایا اور شب بسری کے لیے خیمے میں سو گئے۔

رات گئے باپ نے بیٹے کو گہری نیند سے جگایا اور کہا۔ ''اوپر دیکھو...... کیا نظر آ رہا ہے؟''

بیٹے نے ایک گہرا سانس لے کر کہا۔ ''تاروں بھرا آسمان...... میرے علم فلکیات کی رُو سے اس پُراسرار آسمان میں اربوں ستارے، لاکھوں کہکشائیں اور نظام بکھرے ہوئے ہیں...... ہمارا علم ابھی تک پوری طرح ان کا احاطہ نہیں...... !''

باپ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ اس نے بیٹے کو ایک تھپڑ رسید کر کے غصے سے کہا۔ ''ابے کہکشاں کی اولاد! کوئی ہمارا خیمہ چرا کر لے گیا ہے اور ہم کھلے آسمان تلے پڑے ہیں!''

شکیل کاظمی، اسلام آباد

متانت سے نیلم کی طرف دیکھا۔ نیلم نے چونک کر اس کی طرف دیکھا لیکن کوئی لفظ منہ سے نہیں نکالا۔ وہ خود ہی بولا۔ ''آپ بہت خوبصورت ہو۔''

اس کے منہ سے اپنی تعریف سن کر نیلم نے اپنا منہ دوسری طرف کر لیا۔ وہ کھسک کر کچھ اور اس کے پاس ہو گیا اور دھیمے لہجے میں بولا۔ ''میرے پاس بہت پیسہ ہے۔ میں اپنے پارٹنر کو چیک دے کر پھنس گیا تھا اور اس نے مجھ پر کیس کر دیا۔ اگر میں چاہتا تو رقم دے کر اپنی جان چھڑا سکتا تھا۔ لیکن میں نے سوچا کہ اپنے دوستوں کو آزمایا جائے۔ اگر کوئی مجھے بیس لاکھ روپے دینے پر آمادہ ہو جائے گا تو میری جان چھوٹ جائے گی۔ میں نے کاشف کو مجبور کیا کہ وہ کسی طرح مجھے بیس لاکھ روپے دے دے۔ دراصل میں اس بہانے کسی دوست کو بھی چونا لگانے کے چکر میں تھا کیونکہ میں ملک سے باہر جانا چاہتا ہوں۔ میرا ویزا لگ رہا ہے اور میرا دوست وہ کام کر رہا ہے۔'' وہ چپ ہوا تو نیلم نے اس کی

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN

www.paksociety.com

طرف گھورتے ہوئے کہا۔

''تم کیسے انسان ہو جو وقت آنے پر اپنے دوستوں کو بھی معاف نہیں کرتا ہے۔''

''دوست اسی لیے تو ہوتے ہیں کہ ان سے کام لیا جائے۔ ورنہ دوستوں کا کیا اچار ڈالنا ہوتا ہے۔'' خیام بولا۔

''تم مطلب پرست اور کمینے شخص ہو۔'' نیلم نے نفرت سے کہا۔

''تم مجھے جو کچھ بھی کہہ لو لیکن میں ایک اچھا انسان ہوں۔ خوبصورت لڑکیوں کے لیے تو مجھ سے اچھا انسان ہو ہی نہیں سکتا ہے۔'' خیام مسکرا رہا تھا۔

''چپ کر کے بیٹھ جاؤ اور مجھ سے بات کرنے کی کوشش مت کرو'' نیلم نے کہہ کر منہ دوسری طرف کر لیا۔

ڈھیٹ خیام نیلم کے اور قریب ہو گیا اور بولا۔ ''اب مجھے پچاس لاکھ روپے مل جائیں گے۔ بیس لاکھ روپے ان کا دے دوں گا اور باقی پیسہ اپنے اکاؤنٹ میں جمع کرا کے یہاں سے اڑ جاؤں گا۔ اگر تم چاہو تو تم بھی میرے ساتھ جا سکتی ہو۔''

''اپنی بکواس بند کرو'' نیلم نے اسے سرگوشی میں ڈانٹا۔

''دیکھو میں تو ملک چھوڑ کر چلا جاؤں گا اور اس کے ہتھے نہیں آؤں گا۔ تم اور کاشف یہیں رہو گے اور پکڑے جاؤ گے۔ کیونکہ تمہارا چہرہ اس کی نظر کے سامنے ہے۔'' خیام نے اسے ڈرانے کی کوشش کی۔

''تم اپنی فکر کرو ہم اپنا انتظام خود کر لیں گے۔'' نیلم نے دوٹوک کہا۔

''تم پھنس جاؤ گی۔ میری مانو اور کاشف کا دھیان چھوڑ کر میرے ساتھ چلو۔'' خیام نے اس کے مزاج کی پروا نہ کرتے ہوئے پیشکش کر دی۔

''شٹ اَپ۔'' نیلم نے کوشش کی کہ اس کا لہجہ دھیما ہی رہے۔

''کاشف تم کو وہ خوشیاں نہیں دے پائے گا جو تمہیں مجھ سے مل سکتی ہیں۔'' خیام بولا۔

''تم اپنی بکواس بند نہیں کر سکتے۔'' نیلم کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا تھا۔

''پھر بھی تم سوچ لو۔ ابھی وقت ہے۔'' خیام پر اس کے غصے کا کوئی اثر نہیں تھا۔ وہ کہہ کر وہاں سے اُٹھا اور کچھ فاصلے پر بیٹھ گیا۔ مظہر نا چاری سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ان کی ایک بات بھی اس کی سماعت تک نہیں پہنچی تھی۔

☆☆☆

کاشف کے دل کی دھڑکن بدستور بڑھتی جا رہی تھی۔ کیشیئر نے چنگیزی کے ہاتھ سے چیک لے لیا تھا اور اس کی انگلیاں کی بورڈ پر رقص کر رہی تھیں۔ چنگیزی کے چہرے پر کوئی خوف نہیں تھا وہ اس میدان کا پرانا کھلاڑی تھا۔ وہ مطمئن کھڑا تھا اور ایسا لگتا تھا جیسے وہ اپنے ذاتی اکاؤنٹ سے پیسے لینے آیا ہو۔

کاشف بار بار مضطرب پہلو بدل رہا تھا۔ اس کے بعد کیشیئر نے نوٹوں کی گڈیاں گن کر چنگیزی کے حوالے کرنا شروع کر دیں تو کاشف کو اطمینان ہوا اور وہ اُٹھ کر بینک سے باہر نکل گیا۔

کاشف کو اب اطمینان ہو گیا تھا کہ چنگیزی کو رقم مل چکی ہے۔ اب بس جیسے ہی وہ بینک سے باہر نکلے گا، چنگیزی بیگ اس کے حوالے کر دے گا۔ چنانچہ اس نے اپنے موبائل فون سے نیلم کو کال کی۔ رابطہ ہوتے ہی اس نے کہا۔

''کام ہو گیا ہے۔ یہاں سے نکلو اور یاد رکھنا کہ اسے کھولنا مت۔''

''ٹھیک ہے۔'' دوسری طرف سے نیلم کی آواز آئی۔

کچھ دیر وہ باہر کھڑا رہا پھر ایک طرف چلا ہی تھا کہ ایک گاڑی وہاں رکی اور تین نوجوان باہر نکلتے ہی بینک کی طرف بڑھے۔ کاشف کو انہیں دیکھ کر کچھ حیرت بھی ہوئی اور اس کی چھٹی حس نے جیسے اسے چونکا سا بھی دیا کہ کچھ گڑبڑ ہونے والی ہے۔

وہ جیسے ہی بینک کی طرف گئے، ایک نوجوان نے سرعت سے چوکیدار کو قابو کیا اور کھینچتا ہوا بینک کے اندر لے گیا۔ کاشف کی توجہ ان کی طرف تھی اس لیے جیسے ہی اس نے وہ سب دیکھا اس کے ماتھے کی سلوٹیں واضح ہو گئیں اور اس نے دل میں کہا۔ ''بینک ڈکیتی......''

بینک میں ان آدمیوں نے جاتے ہی اسلحہ نکال لیا۔ یکدم سے اودھم مچ گیا۔ جو لوگ بینک میں تھے، وہ ڈر کر ایک طرف ہو گئے۔ بینک کا عملہ بے بس ہو گیا۔ وہ تینوں بینک میں داخل ہوئے تھے لیکن ان کے دو ساتھی بینک میں پہلے سے موجود تھے اس لیے لوٹ مار شروع ہو چکی تھی۔

چنگیزی رقم لے کر بیگ میں ڈال چکا تھا۔ اور وہ باہر جانے کے لیے بڑھ رہا تھا، جب ڈاکو بینک میں داخل ہوئے تھے تو اسی وقت چنگیزی نے رقم کا بھرا بیگ فرش پر رکھا اور اسے پاؤں کی ٹھوکر سے صوفے کے نیچے دھکیل دیا اور خود دوسرے لوگوں کے ساتھ فرش پر بیٹھ گیا۔ اس نے یہ کام

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

بڑی سرعت سے کیا تھا کہ کوئی عام آدمی ایسا کام اتنی جلدی کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ کیونکہ چنگیزی اس صورتِ حال میں گھبرایا نہیں تھا۔ اس نے اپنی آنکھیں اور دماغ کھلا رکھا تھا۔

ان پانچوں میں سے دو نے اسلحہ تانا ہوا تھا جبکہ دو رقم لوٹ کر اپنے ساتھ لائے بیگز میں ڈال رہے تھے جبکہ ایک نے چوکیدار کو قابو کیا ہوا تھا۔ ان کے ہاتھ بڑی تیزی سے چل رہے تھے۔ اور وہ اپنا کام جلدی سے ختم کر کے بینک سے نکل جانا چاہتے تھے۔

ان کے ہاتھ میں جو لگا، انہوں نے اسے ہی غنیمت جانا اور بینک سے نکلنے لگے۔ اسی اثنا میں چنگیزی بھی اُٹھا اور اپنا بیگ نکال کر ان کے پیچھے ہی بینک سے نکل گیا۔ چنگیزی کو یہ ہوشیاری مہنگی پڑ گئی۔

دور کھڑا کاشف دیکھ رہا تھا کہ بینک میں کچھ گڑبڑ ہے۔ وہ مشکوک آدمیوں کو بینک میں جاتا دیکھ کر ایک طرف کھڑا ہو گیا تھا۔ اور جب ڈاکو بینک سے باہر نکلے تو اسے یقین ہو گیا کہ بینک میں ڈکیتی ہو گئی ہے۔ اس کے ساتھ کاشف کو اس خوف نے بھی گھیر لیا کہ ڈاکوؤں نے یقیناً چنگیزی کا بیگ بھی لے لیا ہو گا۔ رقم نہ ملنے کی صورت میں خیام اس کا ثبوت پولیس کو دے دے گا۔ وہ پریشان ہو گیا تھا۔

پھر اچانک کاشف نے دیکھا کہ ڈاکوؤں کے پیچھے ہی چنگیزی بھی باہر نکل آیا ہے۔ چنگیزی کے ہاتھ میں بیگ تھا۔ کاشف کے لیے یہ حیرت کی بات تھی کہ چنگیزی ان کے ساتھ باہر کیسے آ گیا؟ کہیں وہ بھی ان کا ہی تو ساتھی نہیں ہے؟ بینک ڈکیتی میں وہ ان کی منصوبہ بندی کا حصے دار ہو؟

ڈاکو باہر نکلتے ہی اپنی کار کی طرف بڑھے اور انہوں نے کار میں بیٹھ کر کار گھمائی اور سڑک پر دوڑا دی۔ جبکہ چنگیزی بینک سے باہر نکلتے ہی غیر محسوس انداز میں ان سے الگ ہوا اور ایک طرف تیزی سے چل پڑا۔ کاشف کی نگاہیں چنگیزی پر مرکوز تھیں۔ وہ بھی اس کے پیچھے ہی چل پڑا۔ چنگیزی کا رخ اس جانب تھا جہاں کاشف نے اسے رقم کا بیگ پہنچانے کا کہا تھا۔

وہ جگہ اس بینک سے کچھ دور تھی۔ جس پتلی گلی میں چنگیزی کو رقم سے بھرا بیگ پہنچانا تھا اس گلی کا دو مارکیٹوں کی طرف راستہ تھا۔ اس گلی کے دائیں بائیں مارکیٹیں تھی جبکہ اس تنگ گلی میں رہائشیں تھیں جن کے دروازے بند دکھائی دیتے تھے اور آتے جاتے ہی کھلتے تھے۔ منصوبے کے مطابق چنگیزی کو ایک طرف سے اس تنگ گلی تک پہنچ کر بیگ گلی میں پھینک دینا تھا جبکہ کاشف نے دوسری طرف سے آ کر وہ بیگ اُٹھا کر اسی طرف سے نکل جانا تھا۔

کاشف نہیں جانتا تھا کہ پولیس موقع پر پہنچ گئی ہے۔ کیونکہ جب پولیس کو اطلاع دی گئی تو وہ بینک سے کچھ فاصلے پر تھی۔ اس لیے انہیں بینک پہنچنے میں دیر نہیں لگی۔ یوں پولیس نے ڈاکوؤں کا تعاقب شروع کر دیا تھا اور چنگیزی کی بدقسمتی یہ تھی کہ ایک ریٹائر پولیس والا جو بینک کے باہر موجود کسی کام سے کھڑا تھا، اس نے دیکھا کہ ڈاکو کار میں بیٹھ گئے ہیں جبکہ ان کا ایک ساتھی ایک طرف چل پڑا ہے۔ اس نے فوراً اپنی موٹر سائیکل ایک طرف کھڑی کی اور چنگیزی کے پیچھے چل دیا۔

☆☆☆

کاشف کی کال موصول ہوتے ہی نیلم نے خیام کو چلنے کا اشارہ کیا تو خیام نے ہاتھ میں پکڑا ریوالور اس کی طرف بڑھا دیا جو اس نے اپنے بیگ میں رکھ لیا۔

خیام نے باہر نکلنے سے پہلے تھوڑا سا دروازہ کھول کر باہر کا جائزہ لیا۔ راہداری میں کوئی بھی نہیں تھا۔ دونوں ایک ساتھ باہر نکلے اور ابھی وہ کچھ آگے ہی گئے تھے کہ عین اس وقت ردا کے کمرے کا دروازہ کھلا۔ وہ باہر جا رہی تھی لیکن جیسے ہی اس نے دونوں کو دیکھا اس نے نیلم کو مخاطب کیا۔

''نیلم تم مجھ سے ملے بغیر جا رہی ہو......؟''

ردا کی آواز سنتے ہی نیلم نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا اور متذبذب لہجے میں بولی۔ ''وہ اچانک فون آ گیا تھا اس لیے جانا پڑا۔''

''ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ میرے پاس آؤ تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔'' ردا نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے اپنے کمرے کی طرف لے کر چلی۔

نیلم نے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا۔ ''ایک جگہ ہمارا انتظار ہو رہا ہے۔ ہم کل ملاقات کریں گے۔''

''ایک منٹ کے لیے میرے ساتھ تو آؤ۔'' نیلم کے انکار کے باوجود اس نے نیلم کا ہاتھ نہیں چھوڑا اور اپنے کمرے کی طرف لے گئی۔ خیام بار بار اپنے سر کے بالوں میں اپنے ہاتھ کی انگلیاں پھیرتے ہوئے پیچھے لے جا رہا تھا۔ وہ مضطرب تھا اور جلدی سے اس جگہ سے جانا چاہتا تھا۔ لیکن ردا ان دونوں کو کمرے میں لے ہی گئی۔ جب خیام

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

کمرے میں داخل ہو رہا تھا تو اس نے مظہر کے کمرے سے اس کے چلّانے کی آواز سنی۔ وہ کسی کو مدد کے لیے پکار رہا تھا اسی اثنا میں ایک ویٹر آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک ٹرے تھی جس پر دو گلاس جوس کے رکھے تھے وہ مظہر کے کمرے کی طرف جا رہا تھا۔ خیام صورتِ حال بھانپ گیا تھا۔ یقیناً مظہر کے چلّانے کی آواز ویٹر تک جائے گی اور ویٹر اس کے کمرے میں اگر چلا گیا تو اس ہوٹل سے ان کے لیے باہر نکلنا مشکل ہو جائے گا۔

خیام نے کمرے میں جا کر دروازہ بند کر دیا اور اب وہ نیلم کو صورتِ حال سے آگاہ کرنا چاہتا تھا لیکن ردا اس کو کاغذ پر بنایا ہوا ایک اسکیچ دکھا رہی تھی۔ نیلم بادلِ ناخواستہ 'ہوں ہاں' کر رہی تھی۔ خیام نے اشاروں سے نیلم کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ نیلم سمجھ گئی کہ وہ اس سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔

''ایک گلاس پانی ملے گا۔'' اچانک نیلم نے کہا تو ردا جلدی سے فریج کی طرف چلی گئی اس دوران خیام نے سرگوشی میں سب کچھ بتا دیا۔ جسے سن کر وہ پریشان ہو گئی۔ ردا پانی کا گلاس لے کر آ گئی تھی۔ نیلم نے دو گھونٹ پی کر گلاس ایک طرف رکھ دیا اور ردا پھر اسے اپنے نئے اسکیچ کے بارے میں بتانے لگی۔ اس دوران خیام دھیرے دھیرے چلتا دروازے تک پہنچا اور اس نے تھوڑا سا دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ مظہر کے پاس دو ویٹر اور کچھ اور افراد کھڑے تھے۔ مظہر بول رہا تھا۔

''وہ دونوں اس ہوٹل میں داخل کیسے ہوئے...... ابھی اپنی سیکیورٹی کو الرٹ کریں، اگر وہ ہوٹل کے اندر ہیں تو وہ باہر نہ جانے پائیں......''

''میں نے ریسپشن پر بتا دیا ہے۔ سیکیورٹی الرٹ ہے۔'' نوجوان نے بتایا۔

خیام نے دروازہ بند کیا اور پاس پڑے کاغذ پر ساری صورتِ حال لکھ کر نیلم کی طرف بڑھا دیا۔ نیلم نے پڑھا اور اب اس کے لیے اس جگہ سے نکلنا ناگزیر ہو گیا تھا۔

''ردا تم کہیں جا رہی تھیں۔'' نیلم نے پوچھا۔

''ہاں میں مارکیٹ تک جا رہی تھی۔'' ردا نے بتایا۔

''تو چلیں۔'' نیلم نے کہا۔ ''ہم کو ذرا جلدی ہے۔''

ردا نے اپنی گھڑی پر وقت دیکھا اور بولی۔ ''جلدی تو مجھے بھی ہے۔''

نیلم نے ایک ڈریس اٹھایا اور اسے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''کیا میں اسے پہن کر دیکھوں۔ اور یہ ڈریس اگر یہ پہن لیں تو......''

ردا نے نیلم کی بات سن کر حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ اور بولی۔ ''یہ میرے نئے ڈریس ہیں۔''

''پہن لینے میں کیا حرج ہے۔'' نیلم کہہ کر ڈریسنگ روم کی طرف چلی گئی۔ جو اس کمرے کے ساتھ ہی ملحق تھا۔ اس نے اندر جا کر دروازہ بند کر لیا۔ ردا دم بخود کھڑی بند دروازے کو دیکھتی رہی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ نیلم ایسا کیوں کر رہی ہے۔ جب نیلم باہر نکلی تو وہ بالکل بدل چکی تھی۔ اس نے گہرا شوخ میک اپ کیا تھا۔ سر کے بال کھلے چھوڑے تھے اور آنکھوں میں ردا کے نیلے لینز بھی لگا لیے تھے۔ وہ ڈریس اس پر بہت جچ رہا تھا۔ ردا ابھی اس کا جائزہ لے رہی تھی کہ اس دوران خیام بھی لباس بدل کر آ گیا تھا۔ خیام کے بدن پر اب شلوار قمیص تھی۔

''چلیں......'' نیلم نے کہا۔

''لیکن......''

''میں نے ایسا اس لیے کیا ہے کیونکہ ہم جس جگہ جا رہے ہیں وہ بہت بڑا بوتیک ہے۔ یہ سب دیکھیں گے تو تمہیں اچھا خاصا بزنس مل جائے گا۔'' نیلم بولی۔

''واقعی......'' ردا مسکرائی۔

''بس اب نکلو......'' نیلم نے کہہ کر خیام کو اشارہ کیا۔ اور خیام نے باہر نکل کر دیکھا راہداری میں کوئی نہیں تھا۔ خیام تیزی سے سیڑھیوں کی طرف چلا گیا۔ اس کے پیچھے ردا اور نیلم بھی نکل آئیں۔ وہ لفٹ کی طرف چلی گئی تھیں۔

خیام سیڑھیوں سے اتر کر نیچے پہنچا تو لابی میں ہوٹل کا عملہ اور مظہر کھڑے تھے۔ مظہر کسی کے ساتھ فون پر بات کر رہا تھا۔ خیام بڑی ہوشیاری سے ان سے بے نیاز چلتا ہوا دروازے کی طرف چلا گیا۔ اس نے کیونکہ اپنا لباس بدل لیا تھا اس لیے مظہر نے اسے پشت کی طرف سے دیکھا تھا لیکن خاص توجہ نہیں دی تھی۔ اس دوران لفٹ سے ردا اور نیلم بھی باہر نکل کر دروازے کی طرف بڑھنے لگیں۔

مین دروازے پر سیکیورٹی کھڑی تھی۔ خیام ان دونوں کے برابر میں آ گیا تھا۔ ردا کئی بار اوپر نیچے جاتی تھی۔ اس لیے استقبالیہ پر اس کی پہچان تھی، ویسے بھی ردا جب بھی اس شہر میں آتی تھی، وہ اسی ہوٹل میں قیام کرتی تھی اور ہوٹل کا عملہ جانتا تھا کہ وہ فیشن ڈیزائنر ہے۔ اس لیے اس کے ساتھ نیلم اور خیام کو بھی انہوں نے نہیں روکا اور وہ آسانی سے ہوٹل سے باہر نکل گئے۔

☆☆☆

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

چنگیزی اس تنگ گلی سے کچھ دور تھا جبکہ کاشف پہلے ہی اپنی جگہ موجود تھا۔ اسے چنگیزی کا انتظار تھا۔ چنگیزی کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ ایک ریٹائر پولیس آفیسر اس کے تعاقب میں ہے۔۔ چنگیزی بھاگتا ہوا اس تنگ سی گلی کے پاس پہنچا اور اس نے بھاگتے بھاگتے بیگ اس گلی میں پھینک دیا۔ کاشف نے وہ بیگ اُٹھایا اور دوسری گلی میں نکل گیا جبکہ پولیس والے نے چنگیزی کا پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔ جس طرف اس نے بیگ پھینکا تھا اس طرف بھاگتے ہوئے پولیس نے ایک نظر دیکھا تھا اور اس نے یہ بھی دیکھا تھا کہ کوئی تھا جس نے بیگ پکڑا تھا اور گلی کی طرف گیا تھا۔

بیگ پھینک کر چنگیزی کے بھاگنے کی رفتار آہستہ ہوگئی تھی لیکن اچانک اس پر ایک آفت ٹوٹ پڑی کیونکہ ریٹائر پولیس آفیسر نے اس پر جست لگائی اور اسے لیتا ہوا نیچے جا پڑا۔ چنگیزی کے لیے وہ سب غیر متوقع تھا۔ وہ سمجھ ہی نہیں سکا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ جب اس ریٹائرڈ پولیس آفیسر نے چنگیزی کو پیٹ کے بل لٹا کر اس کے ہاتھ اس کی پشت کی طرف کر کے اس کو بے بس کر دیا تو چنگیزی کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ اسے پولیس نے پکڑ لیا۔ وہ ریٹائر پولیس آفسر ساری زندگی فرض شناسی کی مثال رہا تھا۔ اب بھی اس سے برداشت نہیں ہوا تھا کہ اس کے ملک کا بینک ڈاکو لوٹ کر لے جائیں۔

☆☆☆

کاشف بھاگتا ہوا آگے تک گیا اور پھر نارمل چلنے لگا۔ اس کا انگ انگ خوف سے کانپ رہا تھا۔ وہ گھوم کر کار پارکنگ تک پہنچا اور اس نے اپنی کار میں بیٹھتے ہی کار وہاں سے نکالی اور آگے جا کر ایک جگہ کار کھڑی کی اور نیلم کو کال کی۔

''نیلم کہاں ہو؟'' کاشف نے پوچھا۔

''ہم پہنچ رہے ہیں۔'' دوسری طرف سے نیلم نے مختصر جواب دیا۔

''سب ٹھیک ہے ناں۔'' کاشف بولا۔

''قسمت اچھی تھی کہ سب ٹھیک ہوگیا ورنہ پھنستے پھنستے رہ گئے تھے۔'' نیلم نے جواب دیا۔

''تم جلدی پہنچو۔'' کاشف نے کہہ کر فون بند کر دیا۔

کاشف کار کو بھگاتا ہوا اپنے گھر تک پہنچا۔ اس نے کار اندر کھڑی کی اور بیگ نکال کر ٹی وی لاؤنج میں چلا گیا۔ اس نے بیگ ایک طرف رکھ کر پانی کی بوتل لی اور اسے غٹاغٹ

دھیان

ماں نے بیٹے سے پوچھا۔ ''بیٹا سلطان صلاح الدین ایوبی کون تھا؟''

''پتا نہیں!'' بیٹے نے عجب بے نیازی سے جواب دیا۔

''بیٹا! اپنی کتابوں پر دھیان دیا کرو...... تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ماضی میں ہمارے اسلاف کون اور کیسے تھے؟''

''ممی!'' لڑکے نے ترکی بہ ترکی سوال کیا۔ ''آپ کو معلوم ہے کہ پنکی آنٹی کون ہیں؟''

''نہیں...... اس سوال کی کیا تک ہے؟''

''ممی! ہمیں ماضی کے بجائے حال میں رہنا چاہیے...... پنکی آنٹی سامنے رہتی ہیں اور وہ بہت خوب صورت اور ہنس مکھ ہیں۔ آپ کو ڈیڈی پر دھیان دینا چاہیے ورنہ کسی دن وہ پنکی آنٹی کے ساتھ کہیں دور چلے جائیں گے، ڈیڈی اُن کے دوست ہیں۔''

کراچی سے محمد عفان کا جواب

پینے لگا۔ پھر وہ صوفے پر ڈھیر ہوگیا اور لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ وہ ہانپ رہا تھا اور خوف ابھی بھی اس کے جسم میں خون کے ساتھ دوڑ رہا تھا۔

☆☆☆

ٹھیک ایک گھنٹا کے بعد نیلم اور خیام بھی گھر پہنچ گئے۔ خیام نے اور کچھ نہیں دیکھا اور فوراً بیگ کی طرف بڑھا۔ اس سے پہلے کہ وہ بیگ اُٹھاتا، کاشف نے سرعت سے بیگ اپنی طرف کھینچ لیا۔

''یہ کیا بات ہے؟'' خیام نے اس کی طرف دیکھا۔

''بات بیس لاکھ کی ہوئی تھی۔ تم ساری رقم نہیں لے جاسکتے۔'' کاشف بولا۔

''اب یہ میرے ہیں۔ تمہیں ساری رقم دینی ہوگی۔ ورنہ وہ ثبوت چلا جائے گا۔'' خیام نے متانت سے دھمکی دی۔

خیام نے کاشف کے ہاتھ پاؤں اس طرح سے باندھے ہوئے تھے کہ وہ کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ اس نے ڈھیلا پڑتے ہوئے کہا۔

''پہلے مجھے میرا ثبوت دو۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

اس نے اپنا موبائل اس کی طرف بڑھا دیا۔ ''یہ موبائل تم رکھ لو۔ اس میں وہ ویڈیو ہے۔ میں نے اپنی سم نکال لی ہے۔''

''اور وہ میموری کارڈ؟'' کاشف نے کہا۔

''مجھے یہ بیگ لے جانے دو۔ ٹھیک دس منٹ کے بعد میموری کارڈ تمہارے پاس ہوگا۔'' خیام نے کہا۔

''نہیں ایسا نہیں ہوگا۔ ایک ہاتھ میموری کارڈ دو اور دوسرے ہاتھ یہ بیگ لے جاؤ۔'' کاشف نے بھی شرط رکھ دی۔

''مجھے جانے دو گے تو وہ میموری کارڈ ملے گا۔ ورنہ میں کوئی رسک لینا نہیں چاہتا۔ اور اگر میں یہاں بیٹھا رہا تو وقت گزر جائے گا اور وہ بندہ خود بخود پولیس اسٹیشن پہنچ جائے گا۔'' خیام نے اطمینان سے کہا۔

کاشف نے اس کی طرف کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔ اسے خیام پر بھروسا کرنا ہی تھا۔ کیونکہ خیام اس پر بھروسا کرنے کو تیار نہیں تھا۔

''دس منٹ کے بعد کہاں ملے گا میموری کارڈ؟'' کاشف نے پوچھا۔

''تمہارے دروازے پر پہنچ جائے گا۔ دیکھو مجھ پر اعتبار کرو۔ میں نے راستے میں ہی اسے میسج کر دیا تھا، وہ لے کر پہنچ رہا ہے۔'' خیام کے لہجے میں سنجیدگی تھی۔

کاشف نے بیگ چھوڑ دیا۔ خیام نے بیگ کی زپ کھولی اور ہنسا۔ پھر خوشی سے اس نے بیگ اپنے کندھے پر لٹکایا اور چلنے لگا تو اس نے نیلم کے پاس رک کر کہا۔

''میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں کوئی رقم نہیں دوں گا۔ یہ ساری رقم میں اپنے پاس رکھوں گا اور ابھی یہ شہر چھوڑ دوں گا۔ چند دن میں میرا ویزا آجائے گا اور میں ملک سے باہر چلا جاؤں گا۔ تم نے کیا فیصلہ کیا ہے۔ چلتی ہو میرے ساتھ؟''

''یہ کیا بکواس کر رہے ہو؟'' کاشف اُٹھ کر چیخا۔

''مجھے اس سے پوچھنے دو۔'' خیام پر کاشف کے غصے کا کوئی اثر نہیں ہوا اور وہ اطمینان سے بولا۔

''شٹ اَپ اور دفع ہو جاؤ یہاں سے۔'' نیلم چلائی اور خیام نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

''جیسی تمہاری مرضی۔ لیکن میں تم کو اچھی پیشکش کر رہا ہوں۔ ہم دونوں بہت اچھی زندگی گزاریں گے۔''

''تم جاؤ گے یا پھر میں تم کو دھکے دے کر نکالوں۔'' نیلم نے اس کی طرف قہر آلود نظروں سے دیکھا۔

''غصہ مت کرو، میں جا رہا ہوں۔'' خیام نے کہا۔

خیام چھوٹے دروازے کی طرف بڑھا اور دروازہ کھول کر اس نے ایک نظر کاشف کی طرف دیکھا اور اپنے چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ سجا کر بولا۔ ''کاشف میرے پاس اس موبائل فون میں موجود ویڈیو کے سوا اور کوئی ثبوت نہیں ہے۔ میں نے وہ چال چلی تھی۔ مجھے میرے باپ کی قسم کہ میرے پاس یہی ثبوت تھا۔ اب اسے ضائع کر دو۔''

''دھوکے باز۔'' کاشف نے غصے سے قریب پڑی پانی کی خالی بوتل اس کی طرف پھینکی۔ وہ جھک گیا اور بوتل اس کے سر کے اوپر سے گزر کر دروازے کو جا لگی۔

وہ ڈھٹائی سے بولا۔ ''اب میں ساری زندگی انجوائے کروں گا۔ ایک پائی واپس نہیں کروں گا۔''

''اب تم یہاں سے نہیں جا سکو گے؟'' کاشف اس کی طرف دوڑا۔

خیام نے جلدی سے دروازہ کھولا اور جیسے ہی وہ باہر جانے لگا عین اس وقت باہر پولیس کی گاڑیاں پہنچ گئیں اور پولیس تیزی سے گاڑیوں سے باہر نکلنے لگی۔ خیام نے گھبرا کر پولیس کی طرف دیکھا۔ وہ بھاگ نہیں سکتا تھا۔ وہ واپس گھر کے اندر کی طرف بھاگا۔

''پولیس آ گئی......'' وہ گھبرا کر بولا۔

یہ سنتے ہی کاشف اور نیلم بھی ڈر سے ایک دوسرے کی طرف بڑھے۔ پولیس گھر میں داخل ہو چکی تھی۔ انہوں نے اسلحہ اُن پر تان لیا تھا۔ اور وہ تینوں اپنی اپنی جگہ کھڑے رہ گئے۔

چنگیزی کو اس شخص نے پولیس کے حوالے کر دیا تھا اور وہ چنگیزی کو مارتے ہوئے یہی پوچھتے رہے کہ تمہارے ساتھی کہاں ہیں۔ تم نے بینک سے لوٹی ہوئی رقم کا بیگ کس کو گلی میں دیا تھا۔ چنگیزی کی بات سننے کو کوئی تیار نہیں تھا کہ اصل ماجرا کیا ہوا تھا۔ ویسے بھی پولیس والوں کے ہاتھ صرف چنگیزی لگا تھا۔ باقی ڈاکو فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے اور پولیس کے لیے چنگیزی ہی غنیمت تھا۔ چنگیزی کی سمجھ میں بھی نہیں آ رہا تھا کہ وہ اصل ماجرا بتائے تو کیسے بتائے۔ آخر کار مسلسل تھپڑوں کی بارش سے اس نے کاشف کے بارے میں بتا دیا اور پولیس نے ان تینوں کو دھر لیا۔ ان پر بینک ڈکیتی کا مقدمہ درج ہو گیا تھا اور اب ان سے باقی ساتھیوں کے بارے میں پوچھا جا رہا تھا کہ وہ بینک سے سوا کروڑ کی رقم لے کر کہاں غائب ہوئے ہیں۔ پولیس کے حصار سے کس طرح نکلا جا سکتا تھا۔ شاید اب ان تینوں کے لیے یہ سوالیہ نشان تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN

www.paksociety.com

DOWNLOADED FROM
PAKSOCIETY.COM

بے داغ منصوبہ

کبیر عباسی

نظامِ کائنات میں بکھرے ہر ذرّے کا کوئی نہ کوئی مصرف ضرور ہے... ہر ذرّہ قدرت کی صنّاعی کا شاہکار بھی ہے... جس کے بکھرنے اور ٹوٹنے میں ہی قدرت کی مہلت پوشیدہ ہوتی ہے۔ اس طرح کوئی ایک حادثہ انسان کو بکھیر دیتا ہے... اس کے ٹوٹے دل کو کسی طرح قرار میسر نہیں آتا... وہ ان دیکھے اور انجانے راستوں پر نکل پڑتا ہے جو منزل کی جانب نہیں بلکہ گمراہی... اندھیروں اور موت پر منتج ہوتے ہیں... حالات کی شوریدہ سری اور کشیدگی کا شکار ہونے والے مظلوم بے صبری کا شکار ہو کے غلط راہ کا انتخاب کر بیٹھتے ہیں... قدرت کا اپنا انصاف ہوتا ہے مگر انتظار کی صعوبتیں اٹھانا ہر شخص کے بس میں نہیں ہوتا... وہ خود ہی منصف بن جاتا ہے... اور اپنی دانست میں ہر سُقم سے پاک منصوبے کا خالق ہوتا ہے۔

انتقام کی سلگتی چنگاریوں کی نذر ہو جانے والوں کا تماشائے اہلِ ستم

موسم نے بہت تیزی سے رنگ بدلا تھا۔ کچھ ہی دیر میں چمکیلی دھوپ غائب ہو چکی تھی اور آسمان کالے بادلوں سے بھر گیا۔ بادل زور زور سے گرجنے لگے اور آسمانی بجلی رہ رہ کے چمکنے لگی۔ گو کہ مغرب ہونے میں ابھی کچھ وقت باقی تھا مگر اندھیرا اتنی تیزی سے پھیلا تھا کہ رات کا گمان ہونے لگا۔

نور کی کوشش تھی کہ وہ مغرب تک اپنی منزل پر پہنچ جائے۔ شروع میں اس نے خاصی تیزی سے سفر کیا تھا مگر

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

پہاڑی سلسلہ شروع ہوتے ہی اس کی رفتار کم ہوگئی۔ پیچ در پیچ موڑ اور قدرے تنگ سڑک کی وجہ سے اسے ڈرائیونگ میں مشکل پیش ہورہی تھی۔ اس کی رفتار خاصی سست تھی۔ اوپر سے موسم کے بدلے تیور نے اس کی مشکلات میں مزید اضافہ کردیا تھا۔ بادل گرجتے تو اس کے ہاتھ اسٹیئرنگ پر بہکنے لگتے۔ اس نے رفتار بڑھانے کی کوشش کی مگر ہیڈلائٹس کی روشنی میں یہ مزید مشکل تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے بارش شروع ہوگئی۔ بارش کی بوچھاڑ اتنی تیز تھی کہ ونڈ اسکرین کے آگے گویا پانی کی چادر سی تن گئی تھی۔ اس نے وائپر چلائے مگر بے سود......

بارش اتنی تیز تھی کہ وائپرز سے خاص فرق نہیں پڑا۔ چند فٹ سے آگے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اچانک گاڑی کو ایک زوردار جھٹکا لگا اور گاڑی اچھل پڑی۔ یہ ایک اسپیڈ بریکر تھا جس پر نور کی نظر بروقت نہیں پڑ سکی تھی۔ اس کا سر چھت سے جا ٹکرایا۔ پل بھر کے لیے اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ اس نے سر جھٹک کے اپنے حواس پر قابو پانے کی کوشش کی مگر اگلے ہی لمحے گاڑی سڑک کے ساتھ بنے بلاک سے ٹکرا کے رک گئی۔ اس بار رفتار کم ہونے کی وجہ سے جھٹکا زیادہ زوردار تو نہیں تھا مگر گاڑی کی نہ صرف ہیڈلائٹس بجھ گئیں بلکہ گاڑی کی اندرونی روشنیاں بھی گل ہوگئیں۔ گاڑی میں گھپ اندھیرا چھا گیا۔

نور کو اپنے دل کی دھڑکن کانوں میں سنائی دے رہی تھی۔ کچھ دیر بعد اس کے حواس کچھ بحال ہوئے تو اس نے سیل فون نکال کے اس کی ٹارچ روشن کرلی۔ اس سے گاڑی کے اندر تو روشنی پھیل گئی مگر تیز بارش کے باعث باہر دیکھنا ممکن نہیں تھا۔ اس نے گاڑی کو سلف مارا مگر گاڑی نے جھرجھری تک نہیں لی۔ لائٹس نے بھی آن ہونے سے انکار کردیا، شاید جھٹکا لگنے سے بیٹری کا پلگ اتر گیا تھا۔

وہ گاڑی کے متعلق تھوڑا بہت علم رکھتی تھی مگر اتنی تیز بارش اور اندھیرے کی وجہ سے گاڑی سے اترنا ممکن نہیں لگ رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں اسے سردی لگنے لگی۔ اس نے جینز کے اوپر ہلکا سا کرتہ پہنا ہوا تھا۔

یہ اوائل اکتوبر کے دن تھے اور عام طور پر موسم قدرے گرم ہی رہتا تھا۔ یہاں آتے ہوئے اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ موسم اس طرح اپنا رنگ بدلے گا۔ ورنہ وہ کوئی بندوبست کرکے نکلتی۔ بارش رکنے کے کوئی آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ اب تک سڑک سے کوئی گاڑی بھی نہیں گزری تھی۔ اسے پریشانی ہونے لگی، سردی بھی بڑھتی جارہی تھی اور اس کے پاس سردی سے بچنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ اگر بارش پوری رات نہ رکی تو......؟

یہ خیال ہی اس کے لیے ہولناک تھا۔ بجلی چمکی تو اس کی نظر سڑک سے کچھ ہی فاصلے پر بنی ایک عمارت کے ہیولے پر پڑی۔ یہ شاید دو یا تین منزلہ عمارت تھی جو مکمل اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس نے غور کیا تو اسے عمارت کی بیس مینٹ سے چھنتی ہلکی سی روشنی نظر آئی۔ اس طرف شاید کوئی موجود تھا۔

یہ روشنی اسے امید کی کرن لگی۔ اس نے اپنی پنڈلی پر ہاتھ پھیر کے چاقو کی موجودگی کا یقین کیا۔ پھر اس نے سیٹ اٹھائی تو اس کے نیچے سے پستول برآمد ہوا۔ یہ چھوٹا سا لیڈیز پستول تھا مگر اس کی گولی بھی کسی کی جان لینے کے لیے کافی تھی۔ پستول پر سائلنسر فٹ تھا جس کی وجہ سے اس کی نال کچھ لمبی لگ رہی تھی۔ وہ پستول اٹھا کے اسے پُرخیال نظروں سے دیکھنے لگی۔

اسی اثنا میں اس کے سیل فون نے بیٹری لو کا سگنل دیا۔ اس کی ٹارچ کافی دیر سے آن تھی۔ جس کی وجہ سے بیٹری تیزی سے خرچ ہورہی تھی۔ اگر سیل آف ہوجاتا تو اسے مکمل اندھیرے میں بیٹھنا پڑتا، یہ خیال ہی اس کے رونگٹے کھڑے کردینے کے لیے کافی تھا۔ اس نے عمارت تک جانے کا فیصلہ کرلیا۔ پستول اس نے پینٹ کے ساتھ لگے ہولسٹر میں اڑسا۔ کرتے کی وجہ سے بغور دیکھنے پر ہلکا سا ابھار ہی نظر آتا۔ اس نے ساتھ والی سیٹ سے ہیٹ اٹھا کے سر پر رکھا۔ گاڑی کی چابی نکالی، دوسرے ہاتھ میں سیل اٹھایا اور گاڑی سے باہر نکل آئی۔

باہر بارش کی تیز بوچھاڑ نے اس کا استقبال کیا۔ وہ تیزی سے عمارت کی طرف بڑھنے لگی کہ سیل آف ہوگیا۔ سیل آف ہوتے ہی گھپ اندھیرا چھا گیا اور عمارت تک جانے والا چند گز کا فاصلہ بھی پل صراط کے مانند لگنے لگا۔ وہ سنبھل سنبھل کے آگے بڑھ رہی تھی کہ اچانک اس کے پاؤں کے نیچے سے گویا زمین نکل گئی۔

☆☆☆

فاروق کی گارمنٹس کی شاپ تھی جہاں بچوں کے ریڈی میڈ لباس فروخت ہوتے تھے۔ اس کی دکان اسلام آباد کے نواح میں واقع تھی۔ پہاڑی علاقہ ہونے کے باعث یہاں سردی اسلام آباد سے کچھ زیادہ ہی پڑتی تھی۔ سردیوں کی آمد آمد تھی۔ اس نے سردیوں کے لیے نئے لباس کے آرڈرز کی لسٹ تیار کی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

اس کے پاس دو سیلز مین تھے۔ ایک صبح جلدی دکان کھولتا تھا اور تین بجے چھٹی کر جاتا تھا۔ جبکہ دوسرے کی ڈیوٹی دن کے بارہ بجے سے رات دکان بند کرنے تک ہوتی تھی۔

آج کل کام کم تھا اس لیے وہ دکان جلدی ہی بند کر دیتے تھے۔ آج دوسرا سیلز مین چھٹی پر تھا اس لیے اسے سارا کام اکیلے کرنا پڑ رہا تھا۔ بارش کی وجہ سے عمارت میں موجود تمام دکانیں وقت سے پہلے بند ہو چکی تھیں۔ بارش کے شروع ہوتے ہی بجلی بھی چلی گئی تھی مگر یو پی ایس کی وجہ سے اس کی دکان روشن تھی۔

اس نے کام ختم کرنے کے بعد وقت دیکھا۔ شام کے سات بجے تھے مگر تیز بارش کے باعث اس کا فی الحال گھر جانا ممکن نہیں تھا۔ اس کا گھر بیس منٹ کی ڈرائیو پر تھا وہ عموماً بائیک پر ہی آتا جاتا تھا۔ کام کے دوران تو اسے سردی کا احساس نہیں ہوا تھا مگر کام ختم کرنے کے بعد جب وہ بیٹھا تو اسے ہلکی ہلکی سردی محسوس ہونے لگی۔ اس نے ہیٹر آن کیا اور اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ یہ گیس پر چلنے والا ہیٹر تھا۔ گیس کا کنکشن نہ ہونے کی وجہ سے اس نے، اس کے ساتھ ایل پی جی سلنڈر لگایا ہوا تھا۔ موسم کی اچانک انگڑائی سے اس کے جذبات نے بھی انگڑائی لے لی تھی۔ آج کی رات گھر میں تنہا گزارنا مشکل ہے۔ اس نے سوچا۔

وہ دراز قد کے ساتھ کسرتی جسم کا مالک تھا۔ پینتیس سال عمر کے باوجود نوجوان نظر آتا تھا۔ اور انتہائی پُرکشش شخصیت کا مالک تھا۔ اس کے یار دوست اسے یوسف ثانی کہا کرتے تھے۔ سرخی مائل بھورے اور گھنگریالے بال اس کی وجاہت میں اضافہ کرتے تھے جو اکثر اس کی پیشانی پر پڑے رہتے جن کی وجہ سے اس کا چہرہ معصومیت کا تاثر دیتا تھا۔ مگر وہ اتنا معصوم تھا نہیں۔ اس کے بہت سی عورتوں سے تعلقات تھے۔

آج کی رات روزینہ کے ساتھ گزاری جائے۔ اس نے زیرِلب خود سے کہا۔ روزینہ کا شوہر دبئی میں ملازمت کرتا تھا۔ اس کے دو بچے بھی تھے۔ وہ بچوں کی شاپنگ کرنے اکثر اس کی دکان پر آتی تھی۔ سرو قد، گلابی مائل رنگت، اخروٹی بالوں اور متناسب جسامت کے ساتھ وہ پہلی ہی نظر میں اس کے دل میں گھر کر گئی تھی۔ جلد ہی اس نے اسے شیشے میں اتار لیا اور ان کی اکثر راتیں ایک ساتھ گزرنے لگیں۔

اس نے سیل فون نکالا اور اس کا نمبر ملانے لگا۔ بیل جا رہی تھی مگر اس نے کال ریسیو نہیں کی۔ اس نے ری ڈائل کیا مگر اس بار بھی کسی نے کال ریسیو نہیں کی۔ وہ فون رکھ کے سوچنے لگا کہ آج اور کس کے ساتھ رات گزارنے کا موقع مل سکتا ہے کہ اس کے سیل کی بیل بجی۔ اس کا دل یکبارگی زور سے دھڑکا۔ یقیناً روزینہ کی کال ہوگی۔ اس کے ذہن میں خیال آیا۔ مگر اسکرین دیکھ کے اس کے ارمانوں پر اوس پڑ گئی۔ سیل کی اسکرین پر ''علینا کالنگ'' کے الفاظ جگمگا رہے تھے۔ علینا اس کی بیوی تھی۔

☆☆☆

علینا سے شادی میں اس کی پسند شامل تھی۔ وہ اس کی دور پار کی رشتے دار تھی۔ وہ اس کی بہن کی شادی میں آئی تو فاروق اسے دیکھتا رہ گیا۔

چند برس پہلے کا استخوانی جسم اب بھر گیا تھا۔ جوڑے میں بندھے بالوں سے نکلی سیاہ بالوں کی شریر لٹیں اس کے چہرے کا احاطہ کیے ہوئے تھیں۔ گھنیری پلکوں کے ساتھ سیاہ آنکھیں سمندر کی سی گہرائی لیے ہوئے تھیں۔ گوری رنگت میں گلابوں کی سی سرخی نے اس کے حسن کو دو آتشہ کر دیا تھا۔ اوپر سے اس نے قد کاٹھ بھی خوب نکالا تھا۔ اونچی ہیل والی سینڈل کے ساتھ وہ اس کے برابر ہی لگ رہی تھی۔ وہ اسے دم بخود دیکھ رہا تھا۔ مگر اس کے چہرے پر اسے اس طرح دیکھتے ہوئے ناگواری کا تاثر ابھرا۔ اور وہ اسے نظر انداز کر کے اندر کی طرف بڑھ گئی۔

شادی کے دوران ہی فاروق نے اس سے بے تکلف ہونے کی بھرپور کوشش کی مگر اس نے اس کی ہر کوشش ناکام بنا دی۔ فاروق کو اس کی یہی ادا بھا گئی۔ اس نے تو ہمیشہ لڑکیوں کو اپنے آگے پیچھے پھرتے ہی دیکھا تھا۔

چند دن بعد ہی اس نے گھر والوں کو رشتے کے لیے بھیج دیا۔ وہ برسرِ روزگار تھا اور متاثر کن شخصیت کا مالک تھا بغیر کسی ردّ و قد کے رشتہ قبول کر لیا گیا۔ سو شادی کے پہلے سال اس نے علینا کو بھرپور محبت اور توجہ دی۔ علینا نے بھی اس کا اور اس کے گھر والوں کا خیال رکھا۔ وہ اس سے بے تحاشا محبت کرتی تھی مگر فاروق کو آخرکار زندگی کی یکسانیت تنگ کرنے لگی اور وہ پھر سے دوسری عورتوں کے چکر میں رہنے لگا۔ دو بچوں کی پیدائش بھی اس کی روش نہ بدل سکی۔

اب ان کی شادی کو نو سال گزر چکے تھے۔ اس کی بڑی بیٹی نور العین آٹھ سال کی اور بیٹا محب پانچ سال کا ہو چکا تھا۔ علینا کو کچھ عرصہ پہلے ہی اس کی دیگر سرگرمیوں کا پتا چلا تھا۔ اس نے ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا اور بچوں کو لے کے میکے چلی گئی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

اسے میکے گئے دو ماہ ہو چکے تھے مگر فاروق نے اسے وہاں سے لے جانے کی تو درکنار ایک فون کال تک کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ بچوں سے بھی اس کا کوئی رابطہ نہیں تھا۔ اس کے امی ابو اس کی شادی کے کچھ عرصے بعد دنیا کو الوداع کہہ چکے تھے۔ بھائی اس کا کوئی تھا نہیں، دو بہنیں شادی شدہ تھیں مگر وہ بھی اس سے دبتی تھیں اس لیے اسے کسی کی طرف سے کوئی فکر نہیں تھی۔ اسے تو گویا کھلی چھوٹ مل گئی۔ وہ دوسری عورتوں کو گھر بھی لانے لگا۔ آج دو ماہ بعد اس کی بیوی نے پہلی بار کال کی تھی۔ اس نے کال ریسیو کی اور سپاٹ لہجے میں ہیلو کہا۔

''السلام علیکم پاپا......'' دوسری طرف سے اس کی بیٹی نور کی آواز ابھری۔

''جی بیٹا کیسی ہو آپ......محب کیسا ہے؟'' اس نے رسمی انداز میں پوچھا۔

''پاپا آپ ہمیں لینے کب آئیں گے۔'' دوسری طرف سے اس کا سوال نظرانداز کر کے روہانسی آواز میں اس کی بیٹی بولی۔

''بیٹا اپنی ماما سے کہو آپ کو لے کے خود آجائے۔ میں نہیں آسکتا۔'' اس نے قدرے غصے سے کہا اور کال کاٹ دی۔

وہ جانتا تھا کہ آخر کار بچوں کے لیے علینا کو اس سے سمجھوتا کرنا ہی پڑے گا۔

'میں اس کی تمام ضروریات پوری کرتا ہوں' اسے میری کسی بیرونی سرگرمی پر اعتراض ہونا ہی نہیں چاہیے۔' اس نے سوچا۔

اچانک شیشے کا دروازہ کھلا اور ایک لڑکی سیڑھیاں اتر کے نیچے آنے لگی۔ فاروق آنکھیں پھاڑے اسے دیکھ رہا تھا۔ جینز اور کرتے میں ملبوس لڑکی نے سر پر ایک بڑا سا ہیٹ رکھا ہوا تھا۔ جس سے اس کی لمبی زلفیں جھانک رہی تھیں۔ ان پر بارش کے قطرے چمک رہے تھے۔ کرتہ بھیگ کے اس کے جسم سے چپک چکا تھا اور اس کے خدوخال نمایاں ہو رہے تھے۔ وہ لنگڑاتے ہوئے آہستہ آہستہ سیڑھیاں اتر رہی تھی۔ 'اس وقت میں کچھ اور مانگتا تو وہ بھی مل جاتا' فاروق نے دل میں سوچا۔

'مگر میں جو بھی مانگتا وہ اس سے بڑھ کے تو نہ ہوتا' یہ خیال آتے ہی اس کے لبوں پر مسکراہٹ رینگ گئی۔

لڑکی سیڑھیاں اتر کے کاؤنٹر کی طرف بڑھی جس کے پیچھے فاروق بیٹھا تھا۔

وہ سردی سے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اسے اس حالت میں دیکھ کے فاروق کے جذبات انگڑائی لے کے بیدار ہو چکے تھے۔ وہ کاؤنٹر کے پیچھے سے نکل آیا۔ اور لڑکی سے بولا۔

''اوہ آپ تو کافی بھیگ چکی ہیں، ادھر ہیٹر کے پاس آ کے بیٹھ جائیں۔'' یہ کہہ کے اس نے کاؤنٹر کے پیچھے کی طرف اشارہ کیا۔

لڑکی اسے نظرانداز کر کے دکان کا جائزہ لینے لگی۔ اس نے فاروق پر نگاہ ڈالی۔ اس کی نظروں میں کچھ ایسا تھا کہ فاروق کا دل ایک لمحے کے لیے لرز گیا۔

☆☆☆

شہر ایوان میں ایک ہی ہفتے میں قتل کی چار وارداتوں نے ملک بھر میں کھلبلی مچا دی تھی۔ میڈیا نے پولیس ڈیپارٹمنٹ کا جینا حرام کر دیا تھا۔ چاروں وارداتوں میں ایک بات مشترک تھی۔ قاتل نے ہر مقتول پر تین تین گولیاں خرچ کی تھیں۔ ایک ایک گولی سینے میں اور دو دو گولیاں دونوں آنکھوں میں......

چار مقتولین میں سے تین نوجوان تھے اور تینوں کا تعلق کھاتے پیتے گھرانوں سے تھا۔ ایک مقتول کا باپ وزارت داخلہ میں سیکریٹری تھا۔ اس وجہ سے پولیس پر سیاسی دباؤ بھی تھا۔ وہ تینوں دوست تھے اور ایک ہی یونیورسٹی کے طالب علم جبکہ چوتھا مقتول ایک پینتیس سالہ شخص تھا۔ وہ ایک گارمنٹ شاپ کا مالک تھا۔

ایک ہائی لیول کی میٹنگ میں یہ کیس اسپیشل پولیس کے ایس پی رینک کے ایک آفیسر حمید درانی کے حوالے کر دیا گیا۔

درانی کا ریکارڈ شاندار تھا۔ بہت مشکل مشکل کیس اس کے کریڈٹ پر تھے۔ وہ انتہائی ذہین اور ایماندار آفیسر تھا۔ ہر کیس کی پوری باریک بینی سے تفتیش کرتا۔ جدید ٹیکنالوجی سے بھی وہ بھرپور انداز میں استفادہ کرتا۔ وہ پینتالیس سال کی عمر میں بھی پوری طرح چاق چوبند تھا۔ اس کی آنکھوں سے ذہانت چھلکتی تھی۔

اس سے پہلے یہ کیس جن تھانوں کی حدود میں آتے تھے انہی کے تھانیداروں کے پاس تھے۔ تین نوجوانوں والے کیس تو ایک ہی تھانے میں درج تھے البتہ چوتھا کیس اسلام آباد کے ایک نواحی علاقے میں درج ہوا تھا۔ درانی نے تمام کیسز کی فائلز منگوا کے ان کا تفصیلی مطالعہ کیا۔

اسے لگ رہا تھا کہ تینوں نوجوان مقتولین کے قتل میں کوئی لنک تھا۔ پہلی لاش یونیورسٹی کے ایک ویران گوشے میں پڑی ملی تھی جبکہ دوسرے دو نوجوانوں کی لاشیں اگلے ہی دن ایک جنگل سے دریافت ہوئی تھیں۔ چوتھا قتل چار دن

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

بعد ہوا تھا۔

دُرانی کو یہ قتل باقی تینوں سے کچھ ہٹ کے لگ رہا تھا۔ فائل میں مقتولین کے مکمل ایڈریس کے علاوہ گواہوں کے بیانات بھی درج تھے۔ مگر یہ سب رسمی خانہ پُری لگ رہی تھی۔ اس نے خود یونیورسٹی جانے کا فیصلہ کیا۔

اس کے ساتھ اس کا ایک ماتحت تھا۔ وہ سادہ لباس میں جا رہے تھے۔ کافی لڑکوں سے پوچھ گچھ کرنے کے بعد انہیں ایک ہی نئی بات معلوم ہوسکی کہ تینوں مقتولین کے ساتھ ایک چوتھا لڑکا بھی اکثر دیکھا جاتا تھا۔ ان چاروں کا گروپ تھا مگر ان تینوں کے قتل ہونے کے بعد اسے کسی نے نہیں دیکھا تھا حتیٰ کے پہلے لڑکے کے علاوہ وہ کسی کے جنازے میں بھی شریک نہیں ہوا تھا۔

درانی لڑکوں سے پوچھ گچھ کر رہا تھا کہ اس کی نظر ایک ہونق سے لڑکے پر پڑی، وہ انتہائی دبلا پتلا اور لمبوترے چہرے کا مالک تھا۔ موٹے فریم کی عینک کی وجہ سے وہ کچھ زیادہ ہی احمق لگ رہا تھا۔

درانی نے محسوس کیا کہ وہ اس سے کچھ کہنا چاہتا ہے مگر دوسرے لڑکوں کی وجہ سے جھجک رہا ہے۔ اس نے بھی اسے مخاطب نہیں کیا۔ جاتے جاتے اس نے لڑکے کو آنکھوں ہی آنکھوں میں خفیف سا اشارہ کیا۔ لڑکے نے بھی غیر محسوس انداز میں گردن ہلا دی۔

ان کی گاڑی گیٹ سے باہر پارک تھی، وہ جا کے اس میں بیٹھ گئے۔ دس منٹ بعد ہی درانی کی توقع کے مطابق لڑکا گاڑی کی طرف بڑھتا نظر آیا۔ وہ محتاط انداز میں اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔

وہ گاڑی کے نزدیک پہنچا تو درانی نے ہاتھ بڑھا کے پسنجر سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔ اس کا ماتحت پہلے ہی پیچھے بیٹھا تھا۔ لڑکا ڈرتے ڈرتے گاڑی میں بیٹھ گیا تو درانی نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

''سر ہم کدھر جا رہے ہیں؟'' اس نے نروس زدہ انداز میں سوال کیا۔

''بس تھوڑا آگے چل کے کہیں بیٹھتے ہیں۔'' درانی کے لہجے میں نرمی تھی۔

تھوڑا آگے جا کے اس نے گاڑی ایک ریسٹورنٹ کی پارکنگ لاٹ میں کھڑی کی اور ایک کیبن میں جا کے بیٹھ گئے۔ کولڈ ڈرنکس منگوانے کے بعد اس نے لڑکے سے اس کا نام پوچھا۔

''سر میرا نام حاکم ہے۔'' اتنا کہہ کے ہی وہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگا۔ ''اسے برباد کرنے والوں کو علم نہیں تھا کہ کیسے ان پر خدا کا قہر نازل ہوگا۔'' حاکم روتے ہوئے زیرِلب بڑبڑا رہا تھا۔

کچھ دیر بعد اس نے عینک اتار کے اپنی آنکھیں صاف کیں۔ اب وہ کچھ ریلیکس لگ رہا تھا۔

''تم کس کے بارے میں بات کر رہے تھے ذرا شروع سے بتاؤ۔'' درانی نے پوچھا۔

لڑکا کچھ دیر خاموشی سے چھت کو گھورتا رہا جیسے اپنے خیالات کو مجتمع کر رہا ہو۔ کچھ دیر بعد وہ بولا تو اس کے لہجے میں اداسی تھی۔

''میرا تعلق میاں چنوں سے ہے۔ میں ایک لوئر مڈل کلاس فیملی سے تعلق رکھتا ہوں۔ گریجویشن میں میرے بہت اچھے مارکس تھے۔ میں نے مختلف یونیورسٹیوں میں اسکالر شپ کے لیے اپلائی کیا تو اسلام آباد کی ایک یونیورسٹی میں مجھے داخلہ مل گیا۔ میں کیمسٹری میں ماسٹرز کر رہا ہوں اور میرا چوتھا سمسٹر چل رہا تھا۔ نور میری کلاس فیلو تھی۔ وہ یونیورسٹی کی سب سے شوخ و چنچل لڑکی تھی۔ لباس سے تو وہ کافی ماڈرن لگتی تھی مگر یونیورسٹی میں اس نے کبھی کسی لڑکے کو ایک حد سے آگے نہیں بڑھنے دیا۔ مجھے وہ پسند تھی بلکہ مجھے اس سے محبت ہوگئی تھی۔'' یہ کہہ کے اس نے مجرمانہ انداز میں سر جھکا لیا۔

ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ پھر بولا تو اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔

''مجھے اپنے متعلق کوئی خوش فہمی نہیں۔ اس کے نصیب میں تو کوئی شہزادہ ہونا چاہیے تھا۔ میں تو اس کے قابل ہی نہیں تھا اس لیے میں نے اس سے محبت کا اظہار تو دور کی بات کبھی دعا سلام کی کوشش بھی نہیں کی۔ وہ ویسے بھی لڑکوں سے کم ہی بات کرتی تھی۔ ایک دفعہ حسام نے اس سے بے تکلف ہونے کی کوشش کی تو اس نے سب کے سامنے اس کی خوب بے عزتی کی۔ حسام نے بھی اسے برے نتائج کی دھمکیاں دیں۔ وہ اس وقت تو وہاں سے چلا گیا مگر وہ اپنی بے عزتی بھولا نہیں تھا۔

اس نے اپنے باقی تینوں دوستوں سے بھی اس کا ذکر کر دیا۔ میں اس وقت ان کے پاس ہی بیٹھا ان کی باتیں سن رہا تھا مگر انہیں میری طرف سے کوئی ڈر نہیں تھا۔ وہ اسے برباد کرنے کے منصوبے بنا رہے تھے مگر میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے پہلے سوچا کہ نور کو ان کے متعلق بتا دوں مگر مجھے اس سے بات کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ میں نے ان

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

کی باتوں کو بڑھکیں سمجھ کے دل کو تسلی دے ڈالی۔

اسی دن میں شام کو بائیک پر ایک ہوم ٹیوشن پڑھانے جا رہا تھا۔ ایک سگنل پر بائیک روکی تو میری نظر حسام کی گاڑی پر پڑی۔ پچھلی سیٹ پر حاشر اور حمزہ بیٹھے تھے اور ان دونوں کے درمیان نور بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور اس نے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا رکھی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ سو رہی ہو۔ خود سے ان کے ساتھ جانا قطعی ممکن ہی نہیں تھا۔ وہ یقیناً اسے اغوا کر کے کہیں لے جا رہے تھے۔

اشارہ کھلا تو میں نے بھی بائیک ان کی گاڑی کے پیچھے لگا دی۔ میں نے ہیلمٹ پہنا ہوا تھا اس لیے پہچانے جانے کا کوئی امکان نہیں تھا مگر ان کی رفتار بہت تیز تھی۔ میری سیونٹی سی سی ان کا مقابلہ نہیں کر سکی۔ میں نے جلد ہی انہیں کھو دیا۔ پھر میں نے پولیس سے مدد لینے کا سوچا مگر اس کی بھی ہمت نہیں کر سکا۔ وہ بااثر لوگ تھے۔ ان کے مقابلے میں میری کون سنتا۔ اس وقت کی میری حالت میں جانتا ہوں یا میرا خدا۔ میری محبت کی جان اور عزت خطرے میں تھی مگر میں بے بس......"

اتنا بتا کے اس نے ایک گہرا سانس لیا۔ اس کی آنکھوں میں ملال کی کیفیت تھی۔

درانی نے اپنے ماتحت کو اشارہ کیا۔ اس نے پانی کا ایک گلاس بھرا اور حاتم کی طرف بڑھایا۔

وہ ایک ہی سانس میں سارا پانی پی گیا۔ کچھ دیر کے توقف کے بعد وہ دوبارہ گویا ہوا

"میں ایسے ہی بائیک سڑکوں پر گھمانے لگا۔ کافی دیر بے مقصد ڈرائیونگ کے بعد میں نے بائیک روڈ سے نیچے اتاری اور ایک درخت کے ساتھ ٹیک لگا کے بیٹھ گیا۔ یہ ایک قدرے ویران روڈ تھا۔ کافی دیر بعد اِکا دُکا گاڑیاں گزرتیں۔ مجھے احساس ہی نہیں ہوا کہ کب شام ہوئی اور اندھیرا پھیلنا شروع ہو چکا تھا مگر میرا گھر جانے کا جی نہیں چاہ رہا تھا۔

"اچانک مجھ سے کچھ فاصلے پر ایک گاڑی آ کے رکی۔ گاڑی رکتے ہی اس کی ہیڈ لائٹس آف ہو گئیں۔ اس میں سے تین افراد اترے۔ اتنے فاصلے اور اندھیرے کے باعث ان کے ہیولے ہی نظر آ رہے تھے۔

"وہ تینوں گاڑی کی پچھلی سائڈ پر آئے۔ ان میں سے ایک نے ڈکی کھولی اور تینوں نے مل کے اس میں سے کچھ نکالا۔ وہ تینوں ڈنڈا ڈولی کرتے ہوئے اسے جنگل کی طرف لے گئے۔

"ان کی واپسی جلد ہی ہو گئی۔ وہ گاڑی میں بیٹھے ہی تھے کہ عقب سے ایک اور گاڑی نمودار ہوئی، اس کی ہیڈ لائٹس کی روشنی میں یہ گاڑی صاف نظر آنے لگی۔ یہ سفید رنگ کی ایکس ایل آئی تھی۔ میری نظر نمبر پلیٹ پر پڑی تو میں ہکا بکا رہ گیا۔ یہ حسام کی گاڑی تھی۔"

اتنا کہہ کے وہ ایک لمحے کے لیے رکا۔ درانی اور اس کا ماتحت پوری دلچسپی سے اس کی رُوداد سن رہے تھے۔ انہیں یہ لحاتی توقف بھی گراں گزرا۔

"سر مجھے سگریٹ کی طلب ہو رہی ہے۔ اگر آپ کی اجازت ہو تو میں سگریٹ سلگا لوں۔"

درانی نے اسے اجازت دے دی۔

اس نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر نکالا۔ سگریٹ منہ میں دبا کے اس نے اسے لائٹر کا شعلہ دکھایا۔

اس کے ہاتھوں میں لرزش تھی جو اس کے کشیدہ اعصاب کی طرف نشاندہی کر رہی تھی۔

وہ سگریٹ کے گہرے گہرے کش لینے لگا۔

درانی اور اس کا ماتحت بے چینی سے پہلو بدل کے رہ گئے۔

کچھ دیر بعد وہ دوبارہ گویا ہوا۔ گاڑی واپس جا چکی تھی مگر مجھ میں قدم اٹھانے کی بھی سکت نہیں تھی۔ حالات و واقعات اشارہ کر رہے تھے کہ انہوں نے ڈکی سے نکال کے جو کچھ جنگل میں جو پھینکا تھا، وہ نور کی لاش تھی مگر میرا دل یہ ماننے کو تیار نہیں تھا۔ بڑی مشکل سے میں نے اپنی ہمت مجتمع کی اور جنگل میں کی جانب قدم بڑھا دیے۔

میرے موبائل کی ٹارچ لائٹ بہت مدھم تھی۔ اب اندھیرا بھی کافی گہرا ہو چکا تھا۔ مجھے بمشکل راستہ نظر آ رہا تھا۔

اچانک مجھے ٹھوکر لگی تو میں گرتے گرتے بچا۔ سنبھلنے کے بعد میں نے ٹارچ کا رخ زمین کی طرف کیا تو میرا دل اچھل کے حلق میں آ گیا۔ وہ چادر میں لپٹا کوئی وجود تھا۔

"میں نے ڈرتے ڈرتے ٹارچ کا رخ اس کے چہرے کی طرف کیا۔ وہ نور ہی تھی۔"

یہ کہہ کے وہ خاموشی سے انہیں تکنے لگا۔

☆☆☆

فاروق نے ایسی وحشت اس سے پہلے کسی کی آنکھوں میں نہیں دیکھی تھی۔

"آپ بیٹھیں ناں۔" اس نے نروس زدہ انداز میں

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

کہا۔

لڑکی سکون سے ہیٹر کے پاس ایک بینچ پر بیٹھ گئی تھوڑی دیر میں اس کی کپکپاہٹ ختم ہو چکی تھی۔

لائٹ آگئی تھی۔ فاروق نے الیکٹرک کیٹل پر چائے تیار کی اور کپوں میں ڈالنے کے بعد ایک کپ لڑکی کی طرف بڑھا دیا۔

اس نے خاموشی سے کپ تھام لیا۔

وہ ابھی تک ایک لفظ بھی نہیں بولی تھی۔ فاروق کو اس کی خاموشی سے الجھن ہو رہی تھی۔

''آپ کی ٹانگ کو کیا ہوا؟'' فاروق بس چاہتا تھا کہ وہ کچھ تو بولے۔

''اندھیرے کے باعث میں سیڑھی کا سٹیپ نہیں دیکھ سکی تھی اس لیے گر گئی۔'' اس نے پُرسکون انداز میں جواب دیا۔

اس کی لوچ دار آواز سن کے فاروق کے دل کی دھڑکن بے ترتیب ہونے لگی۔ پل بھر میں ہی اس کا خوف دور ہو گیا۔

''آپ اس موسم میں اس وقت اِدھر کیسے؟'' اس نے اگلا سوال کیا۔

''یہاں سے کچھ دور میرے چچا کا گھر ہے، میں وہاں جا رہی تھی کہ راستے میں گاڑی خراب ہو گئی۔ گاڑی میں مجھے سردی لگ رہی تھی۔ آپ کی دکان کی روشنی جلتی دیکھی تو میں اِدھر آگئی۔''

اس نے ایک بار پھر پُرسکون انداز میں جواب دیا۔

اس کے انداز میں خوف کا شائبہ تک نہ تھا۔ وہ ایسے چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے بات کر رہی تھی جیسے اپنے گھر میں کسی ہمدمِ دیرینہ سے بات کر رہی ہو۔

'یہ تو بڑی بے تکلف سی لڑکی لگ رہی ہے، میں خواہ مخواہ ہی اس سے ڈر گیا تھا۔' فاروق نے دل میں سوچا۔

وہ چائے پی چکی تو فاروق نے کپ لینے کے لیے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ کپ لیتے ہوئے اس نے جان بوجھ کے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے مس کیا۔ اس کے جسم میں تو جیسے کرنٹ دوڑ گیا مگر لڑکی کے تاثرات نارمل تھے۔

لڑکی کُرتے کا دامن اٹھا کے ہیٹر پر خشک کرنے لگی۔

فاروق اسے دزدیدہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں ہوس ناچ رہی تھی مگر لڑکی کو جیسے اس کی نظروں کی کوئی پروا نہیں تھی۔

فاروق کی ہمت کچھ مزید بڑھی۔

''آپ کافی بھیگ چکی ہیں۔ آپ نے کپڑے تبدیل نہ کیے تو بیمار پڑ سکتی ہیں۔ میرا گھر قریب ہی ہے آپ میرے ساتھ میرے گھر چلیں۔''

اس کے آخری جملے سے ''دعوت'' جھلک رہی تھی۔

''آپ کے گھر اور کون رہتا ہے؟'' لڑکی نے نارمل انداز میں پوچھا۔

''جی میں تنہا ہی رہتا ہوں۔''

''ہمم...... پھر تو آپ کے گھر جانا ہی پڑے گا۔'' لڑکی نے عجیب سے انداز میں کہا۔

فاروق کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ اس نے لڑکی کے انداز پر غور ہی نہیں کیا۔ بارش رک چکی تھی۔ اس نے ایک چادر لڑکی کو دی جو اس نے لپیٹ لی۔ وہ باہر آئے تو تیز ہوا نے ان کا استقبال کیا۔ وہ جھرجھری لے کے رہ گئے۔

اس نے پہلے لڑکی کی کار کا جائزہ لیا۔ باہر سے اس کی ایک ہیڈ لائٹ ہی ٹوٹی تھی۔ البتہ اندرونی خرابی کوئی مکینک ہی دور کر سکتا تھا۔

''میں صبح اپنے ایک جاننے والے مکینک کو بلوا لوں گا۔ وہ آپ کی گاڑی ٹھیک کر دے گا۔ آپ اس کی طرف سے بالکل بے فکر ہو جائیں۔'' اس نے لڑکی کو تسلی دی۔

لڑکی نے کوئی جواب نہیں دیا۔

فاروق نے واپس آکے بائیک اسٹارٹ کی، لڑکی اس کے پیچھے سوار ہو گئی۔ مگر فاروق کی توقع کے خلاف وہ اس سے خاصے فاصلے پر بیٹھی تھی۔

''تھوڑا قریب ہو کے بیٹھیں بائیک بیلنس نہیں ہو رہی۔'' اس نے ہوشیار بننے کی کوشش کی۔

''آپ سنبھل کے چلائیں تو ہو جائے گا بیلنس۔'' لڑکی نے خشک لہجے میں جواب دیا۔

وہ کہاں باز رہنے والا تھا اچانک اس نے بریک پر پاؤں دباؤ بڑھایا تو بائیک کو جھٹکا لگا۔

اور وہ اس سے ٹکرا گئی۔ فاروق کو اپنی کمر میں گدگدی محسوس ہونے لگی۔

''سوری ایک گڑھا آگیا تھا۔'' اس نے اچانک بریک لگانے کا جواز گھڑا۔

مگر لڑکی خاموش رہی۔ وہ پھر سے تھوڑا پیچھے ہو کے بیٹھ گئی۔

تھوڑی ہی دیر میں وہ گھر پہنچ گئے۔

لڑکی بغور گھر کا معائنہ کر رہی تھی۔ اس نے گیٹ کھول کے بائیک اندر کھڑی کی۔ پورچ میں ایک سفید رنگ کی

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

مہران بھی کھڑی تھی۔ لڑکی اسے پُرسوچ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

وہ بائیک کو لاک کر رہا تھا کہ اس کا فون بجنے لگا۔

اس نے فون نکال کے اسکرین پر نگاہ ڈالی تو اس کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں۔

☆☆☆

کچھ لمحات کے توقف کے بعد وہ دوبارہ گویا ہوا۔

''ٹارچ کی مدھم روشنی میں اس کا چہرہ پُراسرار منظر پیش کر رہا تھا۔ وہ مردہ ہی لگ رہی تھی، میری اس کے قریب جانے کی ہمت نہیں ہو سکی۔ میں بوجھل قدموں کے ساتھ پلٹ آیا۔

''میں نے اس واقعے کے متعلق کسی سے بات نہیں کی۔ دو دن بعد جب حمزہ کی لاش یونیورسٹی سے ملی تو اس وقت میرا خیال تک نور والے واقعے کی طرف نہیں گیا۔ مگر باقی دونوں کی جب لاشیں ملیں اور وہ بھی اسی انداز میں تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ نور تو مر چکی تھی پھر یہ قتل کون کر رہا تھا؟

''میں خوفزدہ ہو گیا مگر میں یہ سب کسی سے شیئر بھی نہیں کر سکتا تھا کہ کل مجھے نور نظر آ گئی۔ وہ سفید رنگ کی مہران ڈرائیو کر رہی تھی۔ وہ یونیورسٹی بھی اسی میں آئی تھی۔ اس کا رخ شہر سے باہر کی جانب تھا۔ حسام کا گھر بھی اسی طرف ہے۔ وہ باقی تینوں دوستوں کے قتل ہونے کے بعد یونیورسٹی نہیں آیا۔ وہ شاید اسی کی تلاش میں ادھر جا رہی تھی۔ میں اسے روکنا چاہتا تھا مگر میں اس وقت پیدل تھا۔ اس کی گاڑی جلد ہی میری نظر سے اوجھل ہو گئی۔

''سر پلیز نور کو یہ سب کرنے سے روک لیں۔ وہ ایک اور شخص کو بھی قتل کر چکی ہے۔ اس کا یہ روپ میرے لیے بہت خوفناک ہے۔ میں اسے مزید قتل کرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔ آج میں نے آپ کو یونیورسٹی میں دیکھا تو اسی وقت آپ کو یہ سب بتانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ آپ کا مہذب ... اور روایتی پولیس والوں سے مختلف انداز دیکھ کے میری ہمت بڑھی اور میں آپ سے ملنے چلا آیا۔

وہ اب منتظر نظروں سے درانی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

اس نے سب اتنی تفصیل سے بتایا تھا کہ درانی کو کوئی سوال پوچھنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ درانی نے ہنکارا بھرا اور اس سے گویا ہوا۔

''تم نے قانون پسند شہری ہونے کا ثبوت دیا۔ میں تمہارے اس جذبے کی قدر کرتا ہوں۔ تم اپنا نمبر اور ایڈریس نوٹ کرا دو۔''

''جی سر میں حسام کا ایڈریس بھی آپ کو دے دیتا ہوں اور نور کی گاڑی کا نمبر بھی۔ وقت کم ہے۔ آپ کو جلدی کچھ کرنا ہوگا۔ وہ کل شام اس طرف گئی تھی، ہو سکتا ہے حسام کے ساتھ کچھ ہو بھی چکا ہو۔'' وہ دیکھنے میں تو احمق لگ رہا تھا۔ مگر درانی اب اسے احمق سمجھنے پر تیار نہیں تھا۔

اس نے اس سے نمبر اور ایڈریس لیا اور اسے رخصت کر دیا۔

اسے رخصت کرنے کے بعد اس نے وائرلیس پر گاڑی کے متعلق پیغام نشر کر دیا۔ اس کے بعد اس نے موبائل نکالا اور فون پر اپنے ایک ماتحت کو حسام اور نور کے متعلق بتانے لگا۔ آخر میں اس نے، اسے حسام کے گھر کا ایڈریس نوٹ کرایا اور چند ساتھیوں کے ساتھ جلد از جلد پہنچنے کی ہدایت جاری کی۔

اس کا ماتحت ارشد علی عام طور پر زبان بند مگر کان اور آنکھیں کھلی رکھتا تھا۔ حاکم سے بات چیت کے دوران وہ بالکل خاموش رہا تھا۔ اس دوران وہ اس کی حرکات و سکنات کا بغور مشاہدہ کر رہا تھا۔

''ہاں بھئی برخوردار اب بتاؤ اس لڑکے کی کہانی کے متعلق تم نے کیا رائے قائم کی؟''

ارشد اس سے چار پانچ سال ہی چھوٹا تھا مگر جب وہ موڈ میں ہوتا تو اسے ایسے ہی مخاطب کرتا تھا۔

''سر میرے خیال میں تو اس نے افسانہ طرازی کی ہے۔''

''وہ کیسے؟'' درانی نے بھویں اچکا کے اس سے پوچھا۔

سر اتنے اتفاقات تو کہانیوں میں بھی رونما نہیں ہوتے جتنے اس کے ساتھ ہوئے۔ نور اغوا ہوئی تو اس نے اسے دیکھ لیا۔ اس کی زندہ لاش پھینکی جا رہی تھی تو اس نے پھر اسے دیکھ لیا اور جب وہ شہر سے باہر جا رہی تھی تو پھر سے اس کی نظروں میں آ گئی۔ اب آپ ہی بتائیں اتنے اتفاقات حقیقی زندگی میں ممکن ہیں؟''

''ہم......'' اس نے ہنکارا بھرا۔ ''بات تو تمہاری ٹھیک ہے مگر اس نے یہ ساری کہانی ہمیں کیوں سنائی؟''

''میرے خیال میں تو یہ لڑکا خود بھی مشکوک ہے کیونکہ اگر اسے واقعی نور سے محبت ہوتی تو وہ یہ سب ہمیں بتاتا؟''

''تمہارا مطلب ہے یہ جو قتل ہو رہے ہیں، ان میں

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

وہ خود ملوث ہے؟"

"ایسا عین ممکن ہے۔ ہوسکتا ہے اس کی ان لڑکوں سے کوئی دشمنی ہو اسی نے سب کو قتل کیا ہو اور اب نور کو پکڑوا کے خود صاف بچ نکلنا چاہتا ہو۔ اس نے جس طرح یہ سارے واقعات سنائے مجھے تو ان پر بالکل یقین نہیں آیا۔"

"میرا اپنا یہی خیال ہے۔ اس کی نگرانی کروانا پڑے گی۔" یہ کہہ کے اس نے موبائل نکالا اور اپنے ایک ماتحت کو کال کی۔

دوسری طرف سے جب کال ریسیو کرلی گئی تو وہ بولا۔

"منان یہ ایک موبائل نمبر اور ایڈریس نوٹ کرو۔ اس پر حاکم نام کا ایک لڑکا ملے گا، اس کا پچھلے ایک ماہ کا کال ریکارڈ اور اس کے متعلق بنیادی معلومات جلد از جلد معلوم کر کے دو۔ ہوسکتا ہے پچھلے کچھ عرصے میں اس سے متعلقہ کسی لڑکی کا قتل یا ریپ ہوا ہو، اس کے متعلق بھی معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرنا۔ اور ہاں اسے معلوم نہیں ہونا چاہیے کے اس کی ریکی کی جارہی ہے۔"

"اوکے سر۔ آپ بے فکر رہیں۔ میں جلد ہی آپ کو رپورٹ دیتا ہوں۔" دوسری طرف سے آواز ابھری۔

"اس کی نگرانی پر بھی کسی کو مامور کردو۔ یہ ابھی ہمارے پاس سے نکلا ہے۔ زیادہ چانس ہیں کہ یہ گھر ہی جائے گا تم ادھر ہی کسی کو بھجوادو۔" اسے ہدایات دینے کے بعد اس نے کال کاٹی ہی تھی کہ اس کا موبائل بجنے لگا۔

اسکرین پر خاور کا نام چمک رہا تھا۔ خاور کو اس نے حسام کو پکڑنے بھیجا تھا۔

اس نے جلدی سے کال ریسیو کی۔ اس کا پہلا جملہ سنتے ہی اس کے چہرے پر سنسنی دوڑ گئی۔

☆☆☆

وہ علینا کی کال تھی۔ فاروق اس وقت کوئی کال سننے کے موڈ میں نہیں تھا اس نے کال کاٹی اور موبائل ہی بند کر دیا۔

لڑکی اسے بغور دیکھ رہی تھی مگر کچھ بولی نہیں۔ مردانہ چادر لپیٹے تھر تھر کانپتی وہ لڑکی فاروق کو بہت پیاری لگی۔ بائیک پر سفر کرنے کی وجہ سے اسے پھر سے ٹھنڈ لگ رہی تھی۔

فاروق کو بھی سردی لگ رہی تھی حالانکہ اس نے جیکٹ بھی پہن رکھی تھی۔ وہ اسے اپنے بیڈروم میں لے آیا۔ وارڈروب سے اس نے علینا کا ایک جوڑا نکالا اور اس کی طرف بڑھا دیا۔ لڑکی نے زنانہ کپڑے دیکھ کے بھی فاروق سے کوئی سوال نہیں کیا۔ وہ خاموشی سے واش روم کی طرف بڑھ گئی۔

فاروق نے جیکٹ اور جوتے اتارے۔ ہیٹر آن کیا اور اس کے پاس بیٹھ کے آنے والے سنسنی خیز لمحات کو تصور کی آنکھ سے دیکھنے لگا۔

☆☆☆

نور نے کپڑے چینج کیے۔ یہ قمیص شلوار تھی جو اس کے بدن پر کافی ڈھیلی ڈھالی تھی ۔ خیر اس کا بھی فائدہ تھا اسے پستول چھپانے میں آسانی رہتی۔ اس نے پستول نکال کے گولیاں چیک کیں۔ پوری چھ گولیاں تھیں اور اسے اتنی ہی درکار تھیں۔ اسے اپنے نشانے پر مکمل بھروسا تھا۔ وہ جس شوٹنگ کلب کی ممبر تھی وہاں سب سے اچھا نشانہ اسی کا تھا۔ اس وقت کبھی اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اسے کبھی زندگی میں کسی پر گولی بھی چلانا پڑے گی۔ مگر وقت نے ایسا کھیل کھیلا تھا کہ اسے انسانی زندگیوں سے کھیلنا پڑ گیا تھا۔

تقریباً ایسی ہی سچویشن سے...... وہ ایک بار پہلے بھی نمٹ چکی تھی۔ وہ ایک دوست سے ملنے اس کے اپارٹمنٹ گئی تھی لفٹ میں وہ اکیلی تھی کہ فرسٹ فلور پر لفٹ رکی تو ایک شخص اندر آگیا۔ اسے اکیلے دیکھ کے اس شخص کی باچھیں پھیل گئیں۔ وہ اندر آتے ہی اس سے لپٹ گیا اور اسے چومنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کے پاس پستول اس وقت بھی تھا۔

پستول اور چاقو اس نے ان چاروں سے اپنی عزت گنوانے کے بعد سے ہی پاس رکھنا شروع کر دیا تھا۔ وہ تو اسے مردہ سمجھ کے جنگل میں پھینک آئے تھے مگر اس کی زندگی باقی تھی کہ کافی دیر ڈکی میں بند رہنے کے بعد بھی وہ بچ گئی تھی۔ اسے ہوش آیا تو وہ برہنہ زمین پر پڑی تھی۔ اس کے تن پر صرف ایک چادر تھی۔ گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ جھینگروں کی آواز سے اسے اندازہ ہوا کہ وہ کوئی جنگل تھا۔ وہ مشکل سے اٹھ کے سوچ ہی رہی تھی ...کس سمت چلے کہ روڈ سے ایک گاڑی گزری۔ اس کی لائٹس دیکھ کے اس نے اپنی سمت کا تعین کیا۔ اندھیرے میں وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا کے آگے بڑھنے لگی۔ جھاڑیاں بار بار اس کی چادر پکڑ لیتیں۔ بڑی مشکل سے وہ روڈ پر پہنچی ہی تھی کہ اس کے پاس ایک گاڑی آ کے رکی۔ گاڑی ایک عمر رسیدہ شخص چلا رہا تھا۔ اس کی سفید داڑھی اور نورانی چہرہ دیکھ کے اسے اس پر کسی فرشتے کا سا گمان ہوا۔ یہ اس کے لیے گویا غیبی مدد تھی۔ ورنہ اس وقت کوئی بھی اسے اس حال میں دیکھ کے رکنے کی ہمت

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

نہیں کرسکتا تھا۔ نور نے اسے اپنی ساری آپ بیتی سنادی۔ وہ اسے اس کے گھر تک چھوڑنے آیا۔ اس کے گھر والے دوسرے شہر میں رہتے تھے۔ وہ پڑھائی کی وجہ سے یہاں مقیم تھی۔ ایک کمرے اور کچن لاؤنج پر مشتمل اپارٹمنٹ اس نے کرائے پر لیا ہوا تھا۔ وہ ادھر تنہا رہتی تھی۔ آج پہلی بار اسے اپنی تنہائی نعمت لگی۔ گھر میں کوئی اور ہوتا تو وہ اس کا سامنا کیسے کرتی؟

وہ فرشتہ سیرت شخص اسے دروازے پر ہی چھوڑ گیا تھا۔ گیٹ کھلا ہوا تھا اور اتفاق سے چوکیدار بھی گیٹ پر موجود نہیں تھا۔ اسے اس کے اپارٹمنٹ تک آتے کسی نے نہیں دیکھا۔

اس واقعے کے بعد ہی اس نے پستول اور چاقو اپنے پاس رکھنا شروع کر دیا تھا۔ جو آج کام آنے والا تھا۔ لفٹ میں وہ پستول استعمال نہیں کرنا چاہتی تھی اس لیے اس نے بڑی مشکل سے خود پر ضبط کر کے اسے پیچھے دھکیلا اور بولی۔ ''ادھر نہیں۔ آپ کے پاس جگہ نہیں ہے؟''

''کیوں نہیں بے بی! میں ادھر تنہا ہی رہتا ہوں۔'' اس نے باچھیں پھیلاتے ہوئے جواب دیا تھا۔

وہ اسے اپنے کمرے میں لے جانے کے بعد دروازہ لاک کر کے پلٹا تو اس کے ہاتھ میں پستول دیکھ کے ہکا بکا رہ گیا۔

نور نے ایک لمحے کا توقف کیے بغیر گولی چلادی تھی۔ سائلنسر کی وجہ سے ہلکی سی ٹرچ کی آواز ہی ابھری تھی۔ وہ سینے پر گولی کھا کے پٹ سے گرا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت کا تاثر نقش ہو کے رہ گیا تھا۔

اس کے سینے سے ابلتے خون کو دیکھ کے نور کو عجیب سی تسکین کا احساس ہوا تھا۔ وہ اس کی لاش پھلانگ کر جانے لگی تھی کہ اسے ایک خیال آیا۔ اس نے پستول اس کی مردہ آنکھ سے لگا کے گولی چلادی۔ دوسری آنکھ کے ساتھ یہی سلوک کرنے کے بعد اس نے چاقو نکال لیا۔ اس کی پینٹ اتارتے ہوئے اسے گھن آئی مگر کام پورا کرنا بھی ضروری تھا۔

چاقو کی دھار بہت تیز تھی ہلکی سی جنبش سے ہی چاقو نے وہ عضو ہی الگ کر دیا تھا جو اس شخص کی موت کا سبب بنا تھا۔ اگلے دن کے اخبارات سے اسے علم ہوا کہ وہ گارمنٹس اسٹور کا مالک تھا۔

آج پھر گارمنٹس اسٹور کا مالک ہی میری قسمت میں آیا ہے۔ وہ سوچ کے مسکرائی۔ اسے اپنی مسکراہٹ خود بھی عجیب سی لگی۔

اس کی ہوس زدہ نظروں نے اس کی نیت دکان میں ہی آشکار کر دی تھی۔ نور کو تو ایسے لوگوں سے پہلے بھی شدید نفرت تھی جن کی نظروں میں گند بھرا ہوتا تھا۔ مگر اب تو اس نے دھرتی کو ایسے لوگوں سے پاک..... کرنے کا عزم کر لیا تھا۔ اسی سے اس کی آتشِ انتقام بجھ سکتی تھی۔ اس نے دکان میں ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر اس نے گھر جا کے کوئی ایسی ویسی حرکت کی تو وہ اس کے ساتھ بھی وہی سلوک کرے گی جو باقی چار مقتولین کے ساتھ کیا گیا تھا۔

اس نے پستول ہولسٹر میں ڈالا اور اسے شلوار کے نیفے کے ساتھ اٹیچ کر دیا۔ یہاں سے اسے پستول نکالنے میں آسانی رہتی۔

وہ کمرے میں آئی تو پوری طرح چوکنا تھی۔ مگر کمرے میں آ کے وہ حیران رہ گئی۔

کمرا اس کے وجود سے خالی تھا۔ اچانک اسے ایک آواز سنائی دی۔ اس کا دل اچھل کے حلق میں آ گیا۔

☆☆☆

فاروق خوش کن خیالات میں کھویا ہوا تھا کہ اسے گردے میں تکلیف کا احساس ہوا۔ یہ درد اسے پچھلے ایک ماہ سے گاہے بگاہے پریشان کر رہا تھا۔ اس نے ڈاکٹر کو چیک کرایا تو ڈاکٹر نے اسے چند ٹیسٹ لکھ کے دیئے۔ ٹیسٹ کی رپورٹس دیکھ کے ڈاکٹر نے اسے بتایا کہ اس کے گردے میں پتھری ہے مگر پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ پتھری چھوٹی ہے۔ زیادہ پانی پینے سے ہی خارج ہو جائے گی۔ اس نے اسے ادویات کے ساتھ خوراک میں پرہیز کا مشورہ بھی دیا۔ مگر نہ وہ پانی زیادہ پی سکا اور نہ ہی پرہیز رکھ سکا۔ بس اگر کبھی درد ہوتا تو باسکوپان کی ایک گولی کھا لیتا۔ اس سے اسے وقتی افاقہ ہو جاتا۔

اس درد کو بھی ابھی ہی ہونا تھا۔ وہ جھنجلایا۔

اس نے دراز میں سے گولیاں تلاش کرنے کی کوشش کی مگر گولیاں اسے نہیں ملیں۔

اچانک اسے یاد آیا کہ گولیاں تو دوسرے کمرے میں ہیں۔ وہ ننگے پاؤں ہی کمرے کی طرف بڑھا۔

اس نے کچن سے پانی کا گلاس بھرا اور دوسرے کمرے میں آ گیا۔ دراز سے اسے گولیاں مل گئیں۔ درد کی شدت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ اس نے دانت بھینچ لیے۔

وہ بیڈ پر بیٹھ کے گولی کھانے لگا۔ پانی پی کے وہ گلاس سائیڈ ٹیبل پر رکھ رہا تھا کہ اچانک درد کی شدید ٹیس اٹھی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

گلاس زوردار آواز کے ساتھ جا کے فرش پر لگا اور ٹوٹ گیا۔ کمرے میں کانچ کے ٹکڑے پھیل گئے۔ وہ بیڈ پر دراز ہو گیا۔ اس کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں چمک رہی تھیں۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ درد کی شدت سے بے ہوش ہو چکا تھا۔

☆☆☆

آواز دوسرے کمرے سے آئی تھی۔ نور نے خود کو سنبھالا اور محتاط انداز میں دوسرے کمرے کی طرف بڑھی۔

دوسرے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور وہ بیڈ پر سویا ہوا تھا۔ اس کی نظر اس کی پیشانی پر چمکتی بوندوں پر نہیں پڑی تھی اس لیے وہ اسے سوتا ہوا ہی لگی۔

اس کا بازو سائڈ ٹیبل پر پھیلا ہوا تھا۔ نیچے گلاس کے ٹکڑے دیکھ کے وہ سمجھ گئی کہ آواز کس کی آئی تھی۔

شاید سوتے میں اس نے بازو پھیلایا تو سائڈ ٹیبل پر رکھا گلاس گر گیا۔ اس نے خود سے ہی توجیہہ پیش کی۔

وہ اسے سوتے دیکھ کے حیران تھی۔ کہاں تو یہ مجھے بیڈ پر لے جانے کے لیے مرا جا رہا تھا۔ اور ابھی ایسے سو رہا ہے جیسے کئی دن سے سویا ہی نہ ہو۔

خیر میری بلا سے۔ اس نے کندھے اچکائے اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

کمرے کی کنڈی لگا کے وہ خود کو محفوظ تصور کر رہی تھی۔ سائڈ ٹیبل پر رکھے چارجر کو دیکھ کے اسے خیال آیا کہ اس کے موبائل کی بیٹری ختم تھی۔ یہ ویسا ہی چارجر تھا جیسا اس کے موبائل کے ساتھ لگتا تھا۔ موبائل چارجنگ پر لگانے کے بعد اس نے درازیں کھنگالنا شروع کر دیں۔ اسے گاڑی کی چابی کی تلاش تھی۔ کافی تلاش بسیار کے بعد بھی چابی اسے نہیں ملی۔ اس نے دوسرے کمرے میں جا کے چابی تلاش کرنے کا سوچا مگر پھر کچھ سوچ کے ارادہ ملتوی کر دیا۔ اس نے موبائل پر صبح چھ بجے کا الارم لگایا اور لیٹ گئی۔

آج آخری نیند لے لو کل کا سورج دیکھنا تمہیں نصیب نہیں ہوگا۔ اس نے تصور میں ہی اسے مخاطب کیا۔

تھکن کی وجہ سے اجنبی ماحول کے باوجود اسے نیند آ گئی۔

صبح الارم کی آواز سے اس کی آنکھ کھلی۔ اس نے واش روم میں جا کے اپنے کپڑے چیک کیے۔ کرتہ تو خشک ہو چکا تھا، مگر پینٹ ابھی گیلی تھی۔ اس نے گیلی پینٹ ہی پہن لی۔ کمرے سے باہر آ کے اس نے دوسرے کمرے میں جھانکا۔ وہ کمبل لپیٹے بے خبری کی نیند سو رہا تھا۔

سائڈ ٹیبل پر ایک چابی پڑی تھی جو باہر کھڑی گاڑی کی ہی معلوم ہو رہی تھی۔ رات کو اسے یہ نظر نہیں آئی تھی۔ شاید یہ اس نے بعد میں رکھی ہو۔ اگر یہ مجھے رات کو ہی مل جاتی تو اب تک میرا کام ختم ہو چکا ہوتا۔ اس نے سوچا۔

وہ فرش پر پھیلے کانچ کے ٹکڑوں سے بچتے ہوئے ٹیبل تک پہنچی، چابی اٹھاتے ہوئے اس کی نظر فاروق پر تھی۔ مگر وہ بے خبر سوتا رہا۔ اس کے خراٹوں کی آواز کمرے میں گونج رہی تھی۔ چابی اٹھا کے وہ تیزی سے پلٹی۔ اس کی توقع کے مطابق چابی اسی گاڑی کی تھی۔ گاڑی گیٹ سے باہر نکالنے کے بعد اس نے اتر کے گیٹ بند کیا۔ اسے بھوک ستا رہی تھی کل دن کے بعد سے اب تک اس نے کچھ نہیں کھایا تھا۔

اب کھانا اگلے جہاں میں ہی ملے گا۔ اس نے اداسی سے سوچا۔

راستے میں اس نے دیکھا اس کی گاڑی ادھر ہی کھڑی تھی۔ وہ جلد از جلد اپنا کام مکمل کرنا چاہتی تھی اس لیے گاڑی کو الوداعی نظروں سے دیکھتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔ اس کے سینے میں جلتی انتقام کی آگ پر آخری چھینٹے پڑنے باقی تھے۔ اس کے بعد اسے گاڑی کیا کسی بھی چیز کی ضرورت باقی نہ رہتی۔

وہ ایک گھنٹے میں ہی اپنی منزل پر پہنچ گئی۔ یہ ایک چھوٹا اور الگ تھلگ سا دو منزلہ مکان تھا جو دور سے ہی نظر آتا تھا۔ گاڑی گیٹ کے قریب پارک کر کے وہ اتری۔

اسے پتا چلا تھا کہ حسام آج کل ادھر اکیلا ہی رہ رہا تھا۔ اس کے باقی گھر والے اسلام آباد میں رہائش پذیر تھے۔ وہ باقی تینوں دوستوں کے قتل کے بعد ادھر آ کے چھپ گیا تھا اور شاید قاتل کے پکڑے جانے کا انتظار کر رہا تھا۔ مگر موت یہاں تک بھی آ پہنچی تھی۔

گیٹ اندر سے بند تھا مگر یہ کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ گیٹ کے ساتھ بنی باؤنڈری وال صرف پانچ فٹ بلند تھی۔ حفاظت کی غرض سے اس کے اوپر بھی کچھ نہیں لگایا گیا تھا۔ نور نے وہ بہ آسانی پھلانگ لی۔ گیٹ کے آگے پختہ روش پر حسام کی گاڑی کھڑی تھی۔ روش کے دونوں اطراف لان بنا ہوا تھا۔ روش کے آگے تین سیڑھیاں تھیں جن کے آگے مکان کا داخلی دروازہ تھا۔

اسے بتایا گیا تھا کہ حسام کا بیڈ روم اوپر والی منزل پر سیڑھیوں کے ساتھ ہی ہے اور اس وقت اسے اپنے بیڈ روم میں ہونا چاہیے تھا۔ اس نے اوپر جھانکا بڑے شیشوں والی کھڑکی اس کے بیڈ روم کی ہی لگ رہی تھی۔ اس پر گرل نہیں لگی تھی۔ اس کے آگے ٹیرس بھی تھا جس کے آگے دو فٹ کا

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

جنگلا لگا تھا۔

نور نے پہلے داخلی دروازہ چیک کیا، اس کی توقع کے مطابق وہ پیچھے سے بند تھا۔

وہ کھڑکی کے پاس آئی اور گرل پر چڑھ کے چھت کا شیڈ پکڑ لیا۔ بازوؤں کے زور سے اس نے خود کو اٹھایا، ہلکے جسم کی وجہ سے اسے کوئی خاص مشکل پیش نہیں آئی۔ خود کو اوپر اٹھا کے اس نے ایک ہاتھ سے جنگلا پکڑ لیا۔ جنگلے کا ڈیزائن ایسا تھا کہ وہ اسے پکڑتے ہوئے آسانی سے اوپر آ گئی۔

ٹیرس پر آ کے اس نے پستول نکال لیا۔ کھڑکی کا شیشہ ٹنٹڈ تھا۔ اس نے ہاتھ سے آنکھوں پر سایہ کیا اور اندر جھانکنے لگی۔ کھڑکی کا پردہ سمٹا ہوا تھا اور اندر لائٹ روشن تھی جس کی وجہ سے اندر کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔

بیڈ پر پڑی شکنیں بتا رہی تھیں کہ اس پر رات کو کوئی سویا تھا۔ سائڈ ٹیبل پر ایک سیل فون بھی رکھا تھا مگر کمرے میں کوئی موجود نہیں تھا۔ کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔

نور اندر کا تفصیلی جائزہ لے کے پلٹی ہی تھی کہ اس کے کاندھے پر زوردار ضرب لگی۔ اس کے ساتھ ہی چھناک کی آواز سے کھڑکی کا شیشہ ٹوٹا۔ کانچ کے کچھ ٹکڑے باہر بھی گرے، وہ ان سے تو محفوظ رہی مگر کندھے پر لگنے والی ضرب نے اس کا بازو شل کر دیا تھا۔ حسام اس سے دو فٹ کے فاصلے پر ایک ہاکی اٹھائے کھڑا تھا۔ پہلا نشانہ خطا ہونے کے بعد وہ پھر سے ہاکی بلند کر رہا تھا۔

نور نے پستول دوسرے ہاتھ میں اٹھا رکھا تھا۔ اس نے پستول کا رخ اس کے سینے کی طرف کیا اور ٹریگر دبا دیا۔ مگر اتنی دیر میں وہ ہاکی سے وار کر چکا تھا۔ ہاکی نور کے سر پر لگی۔ اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ اور وہ جنگلے کے اوپر سے ہوتے ہوئے نیچے گرنے لگی۔ نیچے گرتے ہوئے بھی اسے اس بات کا اطمینان تھا کہ اسے برباد کرنے والا آخری شخص بھی جہنم واصل ہو چکا ہے۔

☆☆☆

ارشد بغور درانی کے تاثرات دیکھ رہا تھا۔ اس کا چہرہ سنسنی خیز نظر آ رہا تھا۔ وہ دوسری طرف سے آنے والی آواز سن رہا تھا۔ بیچ میں چھوٹے چھوٹے سوال بھی پوچھ رہا تھا۔

مگر ارشد کو کچھ خاص سمجھ نہیں آ سکا تھا کہ کس کے متعلق بات ہو رہی ہے۔ اس نے کال بند کی تو ارشد اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

خاور کی کال تھی۔ وہ تھکے تھکے لہجے میں بولا۔ ''حسام قتل ہو گیا ہے۔ اور وہ لڑکی نور بھی ماری گئی ہے۔''

''وہ کیسے؟'' ارشد حیرت سے بولا۔

''خاور کو میں نے حسام کو گرفتار کرنے بھیجا تھا۔ اسے میں نے نور کے متعلق بھی بتا دیا تھا۔ اسے نور کی گاڑی راستے میں ہی کھڑی مل گئی مگر وہ خالی تھی۔ اس کی ہیڈ لائٹ ٹوٹی ہوئی تھی۔ اس نے اپنا ایک آدمی اُدھر ہی چھوڑا اور دوسرے آدمی کے ساتھ حسام کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

وہ اُدھر پہنچا تو اس کے گھر کے گیٹ کے سامنے ہی اس نے ایک مہران کھڑی دیکھی۔ گیٹ لاک تھا، وہ دیوار پھلانگ کے اندر داخل ہوا تو سامنے ہی نور کی لاش پڑی تھی۔ اس کے سر کے گرد خون کا تالاب جمع تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کی موت چھت سے گرنے کے باعث واقع ہوئی ہو۔ اس کا پستول بھی اس کے پاس پڑا تھا۔ اوپر جنگلے سے ایک سر جھانک رہا تھا۔ اس نے اوپر جا کے دیکھا تو حسام کی لاش اوندھی پڑی ہوئی تھی۔ اس کے سینے میں گولی لگی تھی۔ اس کے پاس ہی ایک ہاکی بھی پڑی تھی۔ اس کی جیب میں موجود کاغذات سے اس کی شناخت ہوئی۔

''تمہاری تھیوری تو غلط ثابت ہو گئی۔'' ساری تفصیل بتانے کے بعد اس نے ارشد کو چھیڑا۔

یہ تو کیس کی تفتیش سے ہی پتا چلے گا۔ وہ مسکرا کے بولا۔

واپسی پر دونوں کے درمیان کیس کے مختلف پہلوؤں پر بات ہوتی رہی۔

درانی افسردہ تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ طاقت کے نشے میں چور لوگ دوسروں کی عزتوں سے کھیلتے ہوئے یہ کیوں نہیں سوچتے کہ ان کی اس حرکت سے کیسی قیامت برپا ہو سکتی ہے۔

''یہ کیس تو کسی خاص زحمت کے..... بغیر حل ہو گیا۔'' وہ ارشد سے مخاطب ہوا۔

ارشد جواب میں مسکرا کے رہ گیا۔

وہ دونوں بے خبر تھے کہ ابھی اس کیس نے کئی موڑ لینے تھے۔

☆☆☆

فاروق کو ہوش آیا تو اسے شدید سردی لگ رہی تھی۔ اس نے کمبل کھولا۔ اچانک اسے لڑکی کا خیال آیا۔ مگر اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ اٹھ سکے۔ درد نے اس کی ساری توانائی نچوڑ لی تھی۔ وہ بے دم سا ہو کے پڑا رہا۔ اس نے کروٹ بدلی تو اسے پسلیوں میں چبھن کا احساس ہوا۔ یہ

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

گاڑی کی چابی تھی جو اس کی جیب میں ہی رہ گئی تھی۔ اس نے چابی نکال کے سائڈ ٹیبل پر رکھ دی۔ تھوڑی دیر میں ہی اس کی آنکھ لگ گئی۔ اس کی آنکھ کھلی تو دیوار گیر گھڑی صبح کے نو بجا رہی تھی۔

اسے رات والی تکلیف کا خیال آیا۔

وہ اس بات سے بے خبر تھا کہ یہ درد ہی اس کی زندگی بچانے کا سبب بنا تھا۔

درد کا خیال آتے ہی اسے لڑکی کا خیال آیا۔ وہ ہڑ بڑا کے اٹھ بیٹھا۔ اس نے پاؤں نیچے رکھ کے اٹھنے کی کوشش ہی کی تھی کہ اسے پاؤں میں شدید چبھن محسوس ہوئی۔ اس نے پاؤں اٹھا کے دیکھا، کانچ کا کافی بڑا ٹکڑا اس کے پاؤں میں پیوست تھا۔ اس نے اسے کھینچ کے نکالا تو خون بھل بھل بہنے لگا۔ وہ اس کی پروا کیے بغیر بھاگ کے دوسرے کمرے میں پہنچا مگر کمرا خالی تھا۔ اس نے واش روم میں جھانکا۔ ادھر علینا کے وہ کپڑے ٹنگے تھے جو رات کو اس نے لڑکی کو پہننے کے لیے دیئے تھے مگر اس کے کپڑے غائب تھے۔ وہ شاید جا چکی ہے۔

اس نے حسرت سے سوچا۔

وہ پلٹا تو اس کی نظر فرش پر پڑے خون کے نشانات پر پڑی۔ جو اس کے ننگے پاؤں چلنے کی وجہ سے لگے تھے۔ اس نے پاؤں کا معائنہ کیا خون اب بھی کافی تیزی سے بہہ رہا تھا۔ اس نے دراز سے روئی نکال کے زخم صاف کیا اور اوپر ایک کپڑا باندھ دیا۔ تھوڑی دیر میں کپڑا بھی خون سے تر ہو گیا۔ اسے نقاہت کا احساس ہونے لگا۔ اس نے رات کا کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ وہ بیڈ کے پشتے سے ٹیک لگا کے بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے زخم پر نظر ڈالی۔ خون جم کے خشک ہو چکا تھا۔ وہ اسی طرح پورا دن پڑا رہا۔ اسے اٹھنے کی ہمت ہی نہیں ہوئی۔

وہ سویا ہوا تھا کہ گیٹ پر کھٹکے کی آواز سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر پاؤں زمین پر رکھتے ہی اسے شدید تکلیف کا احساس ہوا وہ پھر بیٹھ گیا۔ اچانک کمرے کے دروازے پر ایک شخص نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا اور اس کا رخ فاروق کی طرف تھا۔ وہ فرش پر پھیلے خون کو عجیب سی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

نور اور حسام کی ڈیڈ باڈیز پہنچ چکی تھیں۔ درانی اسپتال کے مردہ خانے میں انہیں دیکھ آیا تھا۔ یہ ابھی تک میڈیا بھی حالیہ واقعات سے لاعلم تھا۔ وہ مکمل تفتیش تک میڈیا کو بے خبر رکھنا چاہتا تھا۔

کیس بظاہر حل ہو چکا تھا مگر درانی مطمئن نہیں تھا۔

آفس پہنچ کے اسے ان دونوں کے پاس سے جو چیزیں ملی تھیں وہ منگوائیں۔ ان میں نور کا سیل فون بھی تھا۔ درانی نے اسے الٹ پلٹ کے دیکھا۔ یہ ایک مشہور برانڈ کا اسمارٹ فون تھا جو نیا ہی لگ رہا تھا۔

اس نے سائڈ پر لگا آن کا بٹن پریس کیا، سیل کی اسکرین آن ہو گئی۔ مگر اس پر پیٹرن لاک لگا تھا۔ اس نے سیل کی اسکرین آنکھوں کے سامنے سیدھی کر کے رکھی۔ عموماً سیل کی اسکرین پر گرد کی وجہ سے جب کوئی پیٹرن لاک کھولتا ہے تو نشان پڑ جاتا ہے۔ اس پر بھی نشان پڑا تھا۔ نشان سے یہ انگریزی کا الفابیٹ ''این'' لگ رہا تھا۔ اس نے ''این'' کا پیٹرن بنایا۔ مگر یہ غلط نکلا پھر اس نے الٹا این بنایا تو لاک کھل گیا۔

وہ کال ریکارڈ چیک کرنا چاہتا تھا۔ مگر ہوم اسکرین پر ہی کال ریکارڈر کی ایپ دیکھ کے اس نے اس پر ٹچ کیا۔ اس میں تین ریکارڈڈ کالز سیو تھیں۔ یہ تینوں ایک ہی نمبر سے کی جانے والی اِن کمنگ کالز تھیں۔ ان پر لکھے ہوئے نمبر سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ نمبر سیل میں سیو نہیں ورنہ نمبر کے بجائے نام لکھا آتا۔ اس ... نے سب سے پرانی ریکارڈنگ جس پر پانچ دن پہلے کی تاریخ درج تھی، اوپن کر کے سیل کان سے لگا لیا۔

سیل سے نور کی ہیلو کی آواز ابھری۔

''کیسی ہو بے بی؟''

یہ آواز درانی کو مصنوعی سی لگی۔ شاید بولنے والا وائس چینجر استعمال کر رہا تھا۔

''آپ کون؟'' نور کے لہجے میں الجھن تھی۔

وہ ہنسا۔ ''تم مجھے اپنا خیر خواہ ہی سمجھو۔ میں نے تمہیں داد دینے کے لیے فون کیا ہے۔''

''کس بات کی داد؟'' نور پھر الجھن زدہ انداز میں بولی۔

''بھئی، تم نے تو کمال کر دیا۔ اپنی عزت کے لٹیروں سے اتنا بھیانک انتقام۔ آج کل تو ہر طرف تمہارے کارنامے کے چرچے گونج رہے ہیں۔''

''دیکھو مسٹر خیر خواہ! تم جو کوئی بھی ہو کھل کے بات کرو۔ میرے پاس پہیلیاں بوجھنے کا وقت نہیں۔'' وہ غصے سے بولی مگر اس کی آواز میں خوف کی آمیزش بھی تھی۔

''غصہ نہیں میری جان۔ تم جانتی ہو میں کس بارے

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

میں بات کر رہا ہوں۔ تمہارے ساتھ ان لوگوں نے جو کیا تھا، میں وہ سب جانتا ہوں۔ سوانجان مت بنو۔''

''تم اگر اتنا سب جانتے ہو تو یہ بھی جانتے ہو گے کہ یہ قتل میں نے نہیں کیے۔'' وہ برہمی سے بولی۔

''اچھا! اگر تم نے یہ قتل نہیں کیے تو پھر کس نے کیے ہیں؟'' اس کے لہجے میں مصنوعی حیرت تھی۔

''میری ان کو قتل کرنے کی خواہش ضرور تھی مگر مجھ سے پہلے ہی کوئی یہ کام کر گزرا۔'' اس بار وہ آرام سے بولی۔

''خیر جس نے بھی یہ کام کیا ہے، نیک کام ہی کیا ہے مگر تمہاری بربادی کا اصل مجرم تو ابھی باقی ہے۔ تم اسے مار کے اپنی باقی ماندہ خواہش پوری کر سکتی ہو۔''

''وہ کیسے؟ وہ تو غائب ہے۔''

دُرانی کو وہ خاصی احمق لگی جو کسی اجنبی سے اس طرح کی باتیں کر رہی تھی۔

''تم جاننا چاہتی ہو وہ کدھر ہے؟''

''تم جانتے ہو کہ وہ کدھر ہے؟'' اس نے جواب دینے کے بجائے الٹا سوال کیا۔

''ہاں میں جانتا ہوں، وہ اپنے آبائی گھر میں چھپا ہوا ہے۔''

''اس کا ایڈریس بتاؤ۔''

''تم اس کے ساتھ بھی وہی سلوک کرنا چاہتی ہو جو باقیوں کے ساتھ کیا ہے؟'' اس کا انداز چھیڑنے والا تھا۔

''تم اس کو چھوڑو کہ میں اس کے ساتھ کیا کرتی ہوں تم بس ایڈریس بتاؤ۔'' اس نے اصرار کیا۔

''اچھا نہیں بتانا چاہتی تو نہ بتاؤ مجھے اخبارات سے پتا چل جائے گا۔'' اس کے انداز میں شرارت تھی۔

ایڈریس نوٹ کرا کے وہ بولا۔ ''شکریہ۔'' اس نے اتنا ہی کہا اور کال کاٹ دی۔

درانی نے پورے انہماک سے وہ گفتگو سنی تھی مگر الجھن سلجھنے کے بجائے بڑھ گئی تھی۔

اس نئے کردار نے کہانی کو نیا رخ دے دیا تھا۔ اس کا شک حاکم کی طرف گیا۔ آواز تو وائس چینجر کے استعمال سے تبدیل ہو سکتی تھی مگر اس کا لہجہ بھی حاکم سے کافی مختلف تھا۔

دُرانی نے اپنے سیل سے اس نمبر پر کال کی مگر نمبر بند جا رہا تھا۔ اس کے نمبر پر سروس ایکٹیویٹ تھی۔ نمبر جوں ہی آن ہوتا اسے اطلاع مل جاتی مگر نمبر آن ہونے کی امید کم ہی تھی۔

اس نے جس کمپنی کا وہ نمبر تھا، اس میں اپنے ایک جاننے والے کو کال کر کے نمبر کی ملکیت جاننا چاہی۔

''آپ چند سیکنڈ ہولڈ کیجیے گا میں ابھی چیک کر کے بتاتا ہوں۔''

اسے کسی بھی نمبر کا سارا ریکارڈ حاصل کرنے کا اختیار بھی حاصل تھا مگر اس کا طریقہ کار ذرا لمبا تھا۔ اس لیے وہ اکثر اس طرح کی معلومات اپنے واقف کاروں سے ہی لے لیتا تھا۔

چند لمحات کے توقف کے بعد اس کا واقف کار بولا۔

''سر یہ نمبر چوہدری حاکم کے نام پر ہے۔''

درانی کو گو کہ اس کی توقع تھی مگر اسے پھر بھی حاکم کا نام سن کے اپنی سماعت پر شبہ ہوا۔

☆☆☆

تمام نیوز چینلز پر بریکنگ نیوز نشر ہو رہی تھی۔

آج کا دن اسلام آباد کے شہریوں پر پھر بھاری۔

ایک ہی دن میں تین لاشیں برآمد۔

اسلام آباد کے نواح میں ایک ہی گھر سے ایک لڑکی اور لڑکے کی لاش برآمد۔ لڑکے کو سینے میں گولی مار کر ہلاک کیا گیا جبکہ لڑکی کو سر میں کوئی چیز مار کر قتل کیا گیا ہے۔

تیسری لاش جی سکس کے ایک گھر سے برآمد۔ ایک لڑکے نے اپنے ہی سر میں گولی مار کے خودکشی کر لی حیرانی کی بات یہ ہے کہ تینوں اسی یونیورسٹی کے طالب علم تھے جس یونیورسٹی کے تین طالبعلموں کو اسی ہفتے بھیانک طریقے سے قتل کیا جا چکا ہے۔

کیا یہ اسی سلسلے کی کڑی ہے؟ آخر یہ سلسلہ کب رکے گا؟ پولیس کیا کر رہی ہے؟ آخر اس ملک میں عوام کی جان کیوں محفوظ نہیں؟ نیوز اینکر کی آواز جذبات سے لرز رہی تھی۔

ایک رپورٹر کو ابھی ابھی خبر ملی تھی اور بغیر تفصیل جانے ہی خبر چلا دی گئی۔ باقی چینلز نے بھی اسی کی پیروی میں اپنے اپنے طور پر سنسنی خیز انداز میں خبر نشر کر دی۔

وہ ٹی وی کے آگے بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر یہ سب سن کے زہریلی مسکراہٹ پھیل گئی۔

☆☆☆

دُرانی نے منان کو کال کی۔ ''ہاں بھئی تمہیں ایک کام سونپا تھا۔ کیا رپورٹ ہے اس کی؟''

''سر میں تگ و دو میں لگا ہوا ہوں۔ اس کے بارے میں تو کوئی جانتا ہی نہیں، بڑی مشکل سے کچھ معلومات ملی

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

ہیں۔‘‘

’’چلو پھر نان اسٹاپ شروع ہو جاؤ۔‘‘ وہ ہلکے پھلکے انداز میں بولا۔

’’وہ میاں چنوں سے تعلق رکھتا ہے۔ یہاں پڑھائی کی غرض سے آیا ہوا ہے۔ کیمسٹری میں ماسٹرز کر رہا ہے اور پڑھائی میں بہت تیز ہے۔ یونیورسٹی میں وہ اسکالرشپ پر آیا تھا۔ شروع میں اس کی رہائش ہاسٹل میں تھی۔ مگر نامعلوم وجہ سے اسے ہاسٹل سے نکال دیا گیا۔ اب وہ ایک بنگلے میں پے انگ گیسٹ کے طور پر رہتا ہے۔ پچھلے سیمسٹر میں وہ اسکالرشپ برقرار نہیں رکھ سکا۔ سو اس سیمسٹر کی اسے پوری فیس جمع کرانا پڑی۔ اس کے لیے وہ کچھ ہوم ٹیوشنز پڑھاتا ہے۔

’’باقی جو آپ نے اس سے متعلقہ کسی لڑکی کے ریپ یا قتل کے متعلق معلومات کا کہا تھا تو اس کے متعلق فی الحال کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ وہ بہت تنہائی پسند ہے۔ ہر وقت پڑھائی میں مگن رہتا ہے۔ اس کا کوئی دوست نہیں۔ سو اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنا بہت مشکل ہے۔‘‘ اس نے رٹے رٹائے انداز میں جیسے سبق سنا دیا۔

’’اس کی نگرانی پر کسے لگایا تھا تم نے؟‘‘

’’حسن اس کی نگرانی کر رہا ہے۔ وہ بتا رہا تھا کہ پانچ بجے وہ اپنے کمرے میں گیا اور اب تک اُدھر ہی ہے۔‘‘

’’گڈ تم بھی اس کے پاس چلے جاؤ۔ وہ نظروں سے اوجھل نہیں ہونا چاہیے۔‘‘ اس نے ہدایت جاری کی۔

ابھی چھ بجنے میں کچھ وقت باقی تھا۔ وہ ان کے پاس سے تقریباً ایک بجے رخصت ہوا تھا۔ گویا پانچ گھنٹے اس نے گھر سے باہر گزارے تھے۔ خیر اطمینان کی بات یہ تھی کہ وہ اب اپنے گھر تھا۔ یہاں سے اسے آرام سے گرفتار کیا جا سکتا تھا۔

وہ اگلی ریکارڈنگ چلانے ہی لگا تھا کہ خاور ایک شخص کو ساتھ لیے اندر داخل ہوا۔ وہ سادہ لباس میں تھا۔

اس شخص کے ہاتھ میں ہتھکڑی تھی۔ اس کا چہرہ ستا ہوا تھا۔ بڑھی ہوئی شیو اور شکن زدہ لباس کے باوجود وہ بہت ہینڈسم لگ رہا تھا۔ وہ فاروق تھا۔ اس کے گھر میں داخل ہونے والا شخص خاور ہی تھا۔ وہ اس وقت بھی سادہ لباس میں تھا۔ اس کے ساتھ دو پولیس والے اور بھی تھے، وہ وردی میں تھے۔

خاور بولا۔ ’’سر وہ لڑکی اس شخص کی گاڑی میں حسام کو قتل کرنے گئی تھی۔ گاڑی جائے وقوعہ پر موجود تھی۔ اس کے نمبر سے میں نے مالک کا پتا چلایا۔ جب ہم اس کے گھر پہنچے تو یہ زخمی حالت میں لیٹا ہوا تھا۔

’’یہ کہتا ہے کہ اس لڑکی کی گاڑی اس کی دکان کے پاس خراب ہو گئی تھی۔ اس نے دکان پر آ کے اس سے پناہ کی درخواست کی۔ یہ اسے اپنے گھر لے گیا۔ صبح جب یہ اٹھا تو لڑکی غائب تھی اسی دوران اس کا پاؤں زخمی ہو گیا۔ اس لیے یہ پورا دن گھر سے باہر ہی نہیں نکلا نہ اسے گاڑی کے غائب ہونے کا پتا چلا۔‘‘

’’تم نے اس کے بیان کی تصدیق کی۔‘‘ درانی نے پوچھا۔

’’جی سر، لڑکی کی گاڑی اس کی دکان کے پاس سے ہی خراب حالت میں ملی ہے۔ اس نے باقی جو باتیں بتائی ہیں وہ بھی ٹھیک لگ رہی ہیں مگر یہ اتنا نیک دل لگتا تو نہیں کہ کسی انجان لڑکی کو بلا کسی غرض کے اپنے گھر لے جائے۔ اس کی بیوی میکے گئی ہے اور یہ اپنے گھر میں تنہا تھا۔‘‘

’’پوسٹ مارٹم کی رپورٹ تک تو اسے حوالات میں رکھو۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے پتا چل جائے گا کہ اس نے تنہائی سے کوئی فائدہ تو نہیں اٹھایا۔‘‘

ان کے جانے کے بعد وہ پھر سے سیل کی طرف متوجہ ہوا ہی تھا کہ اس کا اپنا سیل بجنے لگا۔ دوسری طرف حسن تھا جو حاکم کی نگرانی پر مامور تھا۔

’’سر، حاکم نے خودکشی کر لی ہے۔‘‘ وہ اس کے ہیلو کہتے ہی بولا۔

دُرانی ششدر رہ گیا۔ آج کے دن واقعات بہت تیزی سے رونما ہو رہے تھے۔

☆☆☆

فاروق حوالات میں سر جھکائے بیٹھا تھا۔ جب پولیس نے اسے گرفتار کیا تو وہ حیران رہ گیا۔ اس نے بہت واویلا کیا۔ وہ اپنا جرم جاننا چاہ رہا تھا۔

پھر جب اسے بتایا گیا کہ اس کی گاڑی قتل کی واردات میں استعمال ہو چکی ہے تو اس کی حیرت دو چند ہو گئی۔

اس کی گاڑی صبح سے غائب تھی اور وہ لاعلم تھا۔

اس نے لڑکی کے متعلق سب بتا دیا مگر اس کے باوجود وہ اسے پکڑ کے لے آئے تھے۔

راستے میں ان کی باتوں سے اسے علم ہوا کہ وہ لڑکی ایک شخص کو قتل کرنے کے بعد خود بھی ماری جا چکی ہے۔ وہ چار قتل اس سے پہلے بھی کر چکی تھی۔ نہ صرف قتل بلکہ اس نے

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

http://paksociety.com

www.paksociety.com

لاشوں کے ساتھ جو سلوک کیا تھا، وہ سن کے فاروق کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ پولیس والے ہنس ہنس کے اس کے متعلق بات کررہے تھے۔ مگر فاروق کو ان کی باتیں سن کے چکر آرہے تھے۔

اب اسے اس کا پراسرار رویہ یاد آرہا تھا مگر اس وقت تو اس کے ذہن پر شیطان سوار تھا۔ اس نے اس کے رویّے پر غور ہی نہیں کیا تھا۔

اگر میرے گردے میں تکلیف نہ ہوتی تو......؟

یہ خیال ہی اس کے رونگٹے کھڑے کردینے کے لیے کافی تھا۔

☆☆☆

''کیسے ہوا یہ سب اور تم کدھر ہوا؟'' درانی، حسن سے پوچھ رہا تھا۔

''میں اس کے گھر کے پاس ہی کھڑا تھا کہ گولی چلنے کی آواز آئی، میں بھاگ کے اس کے کمرے کے دروازے پر پہنچا جو گلی میں ہی کھلتا ہے۔ مگر وہ اندر سے بند تھا۔ میں نے گیٹ پر جاکے بیل بجائی کافی دیر بعد جب میں گیٹ پھلانگنے کی سوچ رہا تھا کہ اندر سے ایک نوجوان نکلا۔ میں نے اسے اپنا پولیس کارڈ دکھایا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت ابھری مگر وہ کچھ نہیں بولا۔ وہ بھی گولی چلنے سے پریشان لگ رہا تھا۔ وہ مجھے ساتھ لیے اس کے کمرے میں گیا..... اس کمرے کا ایک دروازہ اندر بھی کھلتا ہے۔ وہ اس وقت لاک تھا۔ وہ لڑکا اندر سے جاکے چابی لے آیا۔ دروازہ کھول کے ہم اندر پہنچے تو حاکم بیڈ پر چت لیٹا تھا، اس کی پیشانی سے خون بہہ کے کمرے کے فرش پر ٹپک رہا تھا۔ پستول جس سے اس نے اپنی کنپٹی پر گولی ماری تھی پاس ہی پڑا تھا۔ میں ابھی اسی کمرے میں ہوں۔'' اس نے سب تفصیل سے بتادیا۔

''تم اُدھر ہی رکو اور ہاں کوئی کسی چیز کو نہ چھیڑے، میں ابھی آیا۔''

درانی پولیس کی گاڑی میں جائے وقوعہ پر پہنچا تو گلی میں کافی لوگ جمع تھے۔ پولیس کی گاڑی دیکھ کے بھیڑ تیزی سے چھٹنے لگی۔ حسن کمرے کے دروازے پر ہی کھڑا تھا۔ وہ اسے ساتھ لے کر اندر آیا۔ حاکم کی لاش بیڈ پر پڑی تھی، وہ بے نور آنکھوں سے چھت کو تک رہا تھا۔ وہ اسی لباس میں تھا جس میں درانی نے اسے دیکھا تھا۔

اس کی کنپٹی سے قطرہ قطرہ خون فرش پر ٹپک رہا تھا۔ اس کا ایک بازو بیڈ سے نیچے جھول رہا تھا۔ نیچے پستول پڑا

چٹکیاں

ایک لادین شخص سے سوال کیا گیا۔ ''اگر آپ کی شادی جڑواں بہنوں میں سے کسی ایک سے ہو اور وہ دونوں ہم شکل بھی ہوں تو آپ ان میں سے اپنی بیوی کو کیسے پہچانیں گے؟''

''میں پاگل ہوں جو پہچاننے کی کوشش کروں!''

☆☆☆

بعض لوگوں کی حرکتیں دیکھ کر یہ سوال کرنے کو دل چاہتا ہے کہ قبلہ! آپ پیدائشی ایسے ہی ہیں یا آپ نے کہیں سے ڈگری بھی لی ہوئی ہے۔

☆☆☆

بینک میں ڈکیتی کے دوران ایک ڈاکو نے ایک کسٹمر سے پوچھا کہ وہ واردات دیکھ رہا تھا۔ اس نے اثبات میں جواب دیا۔ ڈاکو نے اس کے پیشانی میں گولی اتار دی پھر وہ دوسرے کے پاس گیا تو اس نے جلدی سے کہا۔ ''میں نے کچھ نہیں دیکھا۔ باہر میری بیوی گاڑی میں بیٹھی ہوئی ہے۔ اس نے پوری ڈکیتی دیکھی ہوگی!''

☆☆☆

ایک شخص نے دو سو کا سامان خریدا۔ ہزار کا نوٹ دیا۔ دکاندار نے پڑوس سے نوٹ کھلا کرایا اور گاہک کو 800 دے دیے۔ تھوڑی دیر میں پڑوسی آیا اور کہا کہ ہزار کا نوٹ جعلی ہے۔ بتائیے اس لین دین میں دکاندار کو کتنا خسارہ ہوا۔

☆☆☆

''جس کے سر پر پیر ہوں اسے کیا کہا جائے گا؟''

''احمقانہ سوال ہے۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ ہو بھی جائے تو اسے چڑیل یا بھوت کہیں گے۔''

''ارے بھائی! پرندہ کہیں گے۔ ہر پرندے کا سر، پر اور پیر ہوتے ہیں۔''

امریکا سے جاوید کاظمی کی چٹکیاں

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

تھا۔ اس کے سینے پر ایک سفید کاغذ رکھا تھا۔

دُرّانی نے فوٹو گرافر کو اشارہ کیا۔ وہ لاش کی مختلف زاویوں سے تصویریں لینے لگا۔

وہ تصویریں لے چکا تو درانی نے کاغذ اٹھایا، اس نے باریک سے دستانے پہن رکھے تھے۔ اس لیے فنگر پرنٹس کے ضائع ہونے کا ڈر نہیں تھا۔

کاغذ پر پرنٹ کی ہوئی ایک تحریر تھی۔

وہ رقعہ درانی کے نام ہی تھا۔ اس پر لکھا تھا۔

دُرانی صاحب!

آج جو کچھ میں نے آپ کو بتایا، وہ سب سچ ہے سوائے اس کے کہ ان تینوں لڑکوں کی قاتل نور نہیں، میں تھا۔ میں بدنصیب اپنی محبوبہ کا انتقام لینے کے باوجود اس کی نظروں میں اپنا مقام نہ بنا سکا۔ میں نے ان تینوں کو قتل کرنے کے بعد نور کو فون کر کے سب بتا دیا۔ میرا خیال تھا کہ میرا یہ عمل اس کے دل میں میرے لیے کچھ تو گنجائش پیدا کر ہی دے گا۔ مگر اس نے مجھے خوب بے عزت کیا۔ وہ ان تینوں کو خود مارنا چاہتی تھی۔ اس نے مجھے آئندہ کال کرنے سے بھی منع کر دیا۔ اگلے دن ایک اور قتل ہو گیا۔ میں نے اسے کال کی تو اس نے مجھے بتایا کہ اسے اسی نے قتل کیا ہے۔ اس نے نور کی عزت لوٹنے کی کوشش کی تھی۔

”میں تو اس کو بہت معصوم سمجھتا تھا مگر وہ قاتلہ نکلی تھی۔ اس نے مجھے کہا کہ حسام کو وہ خود قتل کرے گی اور میں اسے آج کے بعد کال نہ کروں۔

”میں نے بھی دل میں پکا ارادہ کیا کہ اب اس سے بات نہیں کروں گا مگر میں پھر باز نہ رہ سکا۔ میں نے آج صبح اسے کال کی تو اس نے کال ریسیو کر لی مگر کچھ بولی نہیں۔ میں کافی دیر ہیلو ہیلو کرتا رہا مگر دوسری طرف مکمل خاموشی تھی۔

”مجھے بہت غصہ آیا اس لمحے مجھے اس سے شدید نفرت محسوس ہوئی۔ مجھے تین قتل کر کے بھی اپنی محبت نہیں ملی اس لیے میں نے آپ کو سب بتا دیا اور سارا الزام نور کے سر تھوپ دیا۔

مگر گھر آ کے مجھے پچھتاوا ہونے لگا۔ میرا ضمیر مجھے تنگ کرنے لگا۔ یہ تھی تمہاری محبت جب غرض پوری نہیں ہوئی تو تم نے اپنی محبوبہ کو ہی پھنسا دیا۔ مجھے اب جینے کا کوئی حق نہیں اس لیے میں خود کو مار رہا ہوں۔

فقط

ایک بدنصیب۔“

دُرّانی خط پڑھ کے سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے جو ریکارڈنگ سنی تھی، اس کی گفتگو اس خط کے مندرجات سے میچ نہیں کر رہی تھی۔

اس نے اپنے پورے کیریئر میں پرنٹ کیا ہوا خودکشی کا نوٹ پہلی دفعہ دیکھا تھا۔ یہ چیز بھی خط کی صحت کو مشکوک بنا رہی تھی۔

خیر دیکھا جائے گا۔ اس نے ذہن میں آنے والے خیال کو جھٹکا اور کمرے کی طرف متوجہ ہو گیا۔

یہ بارہ بائی چودہ کا کمرا تھا۔ جس کی ایک طرف کپڑوں کی الماری رکھی تھی۔ اس کے ساتھ والی دیوار میں ایک دروازہ نظر آ رہا تھا جو اندر کھل رہا تھا۔ دروازے کے ساتھ ہی ایک بڑا سا ٹیبل رکھا تھا۔ ٹیبل کے نیچے بنے ریکس میں کتابیں رکھی تھیں۔ ٹیبل پر ایک کمپیوٹر پرنٹر سمیت موجود تھا۔ اس میں کچھ صفحات لگے تھے۔ درانی نے ان میں سے ایک صفحہ اٹھا کے دیکھا۔ یہ اسی سائز اور وزن کا پیپر تھا جس پر خودکشی کا نوٹ درج کیا گیا تھا۔

کمپیوٹر کے ساتھ ہی ٹیبل پر پانی کا آدھا بھرا گلاس اور دوائی کی ایک شیشی رکھی تھی۔ اس نے اسے اٹھا کے دیکھا یہ خواب آور گولیاں تھیں۔ شیشی آدھی سے زیادہ خالی تھی۔ اس کی نظر کا چشمہ، سگریٹ کی ڈبیا اور لائٹر بھی ادھر ہی پڑا تھا۔

دُرانی نے حاکم کے موبائل کی تلاش میں اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی، وہ اسے بیڈ پر ہی لاش کے ساتھ پڑا نظر آیا۔

یہ ایک عام سا کی پیڈ والا موبائل تھا۔ موبائل آن تھا۔ اس میں دو سمیں پڑی تھی۔ حاکم نے اپنا ایک نمبر درانی کو دیا تھا۔ ایک سم اسی کمپنی کی تھی جبکہ دوسری سم اس کمپنی کی تھی جس سے نور کو کالز کی گئی تھیں۔

اس نے دوسرے نمبر سے اپنے نمبر پر کال کی۔ جب اس کے سیل کی بیل بجنے لگی تو اس نے اسے نکال کے دیکھا۔ یہ وہی نمبر تھا۔ وہ اپنا سیل جیب میں رکھنے ہی لگا تھا کہ اس کی نظر ایس ایم ایس نوٹی فکیشن پر پڑی۔

یہ کمپنی کی طرف سے نمبر آن ہونے کی اطلاع تھی۔ اس نے اس پر لکھا وقت دیکھا۔ میسج پانچ بج کر انسٹھ منٹ پر آیا تھا۔ اس نے کال ریکارڈ کھول کے حسن کی کال کا وقت چیک کیا۔ حاکم کے قتل کی اطلاع اسے چھ بج کر چار منٹ پر ملی تھی۔

اسے حیرت ہوئی۔

حسن کے بیان کے مطابق گولی چلنے کی آواز کے بعد لاش تک پہنچنے میں چار پانچ منٹ تو لگے ہی تھے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

گویا نمبر آن ہونے کا وقت لگ بھگ وہی تھا جب گولی چلنے کی آواز آئی تھی۔ اب یہ تو مشکل تھا کہ وہ خودکشی سے پہلے نمبر آن کرنے کی زحمت کرتا۔ نمبر کس نے آن کیا تھا؟

یہ بات غور طلب تھی۔

فرانسک والے اپنا کام مکمل کر چکے تو لاش کو ایمبولینس میں ڈال کر پوسٹ مارٹم کے لیے بھیج دیا گیا۔ درانی نے لاش کی جامہ تلاشی بھی لی تھی۔ اس کی جیب سے صرف ایک پرس نکلا تھا جس میں بارہ سو روپے کچھ ریزگاری اور کارڈز برآمد ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک تو اس کا شناختی کارڈ تھا۔ جبکہ دیگر دو میں سے ایک ڈیبٹ کارڈ اور ایک یونیورسٹی کا کارڈ تھا۔

لاش بھیجنے کے بعد وہ حسن کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ کمرے کو پیلی پٹی کی مدد سے سِیل کر رہا تھا۔

''ہاں بھئی کہاں ہے وہ نوجوان جس کے ساتھ مل کے تم نے لاش دریافت کی تھی؟''

''میں نے اسے اندر بھیج دیا تھا۔ یہ اِنہی کا گھر ہے حاکم اس کمرے میں کرائے پر رہتا تھا۔ میں اُسے اِدھر ہی بلواؤں یا اندر چلیں؟''

''اندر ہی چلتے ہیں اِدھر تو بیٹھنے کی جگہ ہی نہیں۔ ویسے بھی گھر کا معائنہ بھی کرنا ہے۔ اس کمرے کی تفصیلی تلاشی بھی ابھی نہیں کی گئی تھی۔'' درانی نے تلاشی لینے کا سوچا مگر پھر ارادہ ملتوی کر دیا۔

وہ دروازہ کھول کے اندر داخل ہو رہے تھے کہ ایک زوردار آواز آئی۔ وہ چونک گئے۔

☆☆☆

علینا اپنے گھر آ چکی تھی۔ گیٹ کھلا دیکھ کے اس کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ اندر آئی تو فاروق کی گاڑی غائب تھی۔ وہ شاید گاڑی لے کے کہیں باہر نکلے ہوئے ہیں۔ اس نے خود کو تسلی دی۔ اس نے لاؤنج کا دروازہ کھول کے پاؤں اندر رکھا ہی تھا کہ اس کی نظر خون کے دھبوں پر پڑی۔ اس کی چیخ نکل گئی۔

فاروق...... وہ زور سے چیخی۔ مگر گھر میں کوئی ذی نفس موجود نہیں تھا۔ پانچ سالہ محب اسے اس طرح چیختے دیکھ کر رونے لگا۔ اس کی بیٹی بھی خوفزدہ نظر آ رہی تھی۔

اس نے موبائل نکال کے فاروق کا نمبر ملایا مگر نمبر بند جا رہا تھا۔

اس کا دل کل شام سے ہی ہول رہا تھا۔ وہ عموماً دن کو نہیں سوتی تھی مگر کل اس کے سر میں درد تھا، وہ لیٹی تو اس کی آنکھ لگ گئی۔ اس نے بہت بھیانک خواب دیکھا۔ اس نے دیکھا کہ وہ اپنے گھر کی چھت پر کھڑی تھی بہت تیز ہوا چل رہی تھی۔ اس کے لمبے بال ہوا میں اُڑ رہے تھے۔ اچانک بارش شروع ہو گئی۔ وہ پلٹی تو اس کی نظر ایک لاش پر پڑی۔ وہ فاروق کی لاش تھی اس کی گردن کٹی ہوئی تھی اور اس سے خون بہہ رہا تھا۔

اچانک اس نے قہقہے لگانا شروع کر دیے۔ تم نے مجھ سے بے وفائی کی تھی؟ دیکھ لیا اپنا حشر؟

اس نے نفرت سے کٹے ہوئے سر کو نیچے پھینک دیا۔ اب وہ رو رہی تھی۔ وہ اونچی آواز میں بین کرنے لگی۔ آنسو اس کی آنکھوں سے دھاروں کی صورت میں بہہ رہے تھے۔ اچانک زور سے بادل گرجا تو اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس کا دل خشک پتے کے مانند لرز رہا تھا۔ آنسو اس کی آنکھوں سے حقیقت میں بھی بہہ رہے تھے۔ باہر گرج چمک کے ساتھ تیز بارش ہو رہی تھی۔ وہ کافی دیر اسی طرح بیڈ پر پڑی لرزتی رہی۔ ایسا خوفناک خواب اس نے زندگی میں اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ یا خدا میرے شوہر کو سلامت رکھنا۔ وہ جیسے بھی ہیں مجھے قبول ہیں۔ میں اب ان سے کوئی شکوہ نہیں کروں گی۔ اس کے دل سے بے اختیار دعا نکلی تھی۔

اس نے فاروق کو کال کرنے کا سوچا مگر اس سے بات کرنے کی اسے ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

اس نے اپنی بیٹی کو پاس بلا کے سیل اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

''بیٹا پاپا سے پوچھو وہ ہمیں لینے کب آئیں گے؟''

موبائل کا اسپیکر آن تھا۔ فاروق کی باتیں سن کر پھر سے اس کے آنسو بہنے لگے تھے۔

انہیں تو اپنے بچوں کی بھی پروا نہیں۔

اس نے آزردگی سے سوچا۔

وہ پھر رات کا کھانا بنانے میں مشغول ہو گئی۔ اس کی بھابی اپنے شوہر اور بچوں سمیت اپنے میکے گئی ہوئی تھی۔ اس نے کھانا تیار کر کے اپنے والدین اور بچوں کو دیا۔ اس کی ماں کو جوڑوں کا درد رہتا تھا۔ سردی کی وجہ سے ان کی تکلیف میں اضافہ ہو گیا تھا۔ اس کا باپ بھی فالج کے اٹیک کے بعد چلنے پھرنے سے معذور تھا۔ وہ کھانے کے بعد دوائی کھا کے سو گئے تو وہ اپنے کمرے میں آ گئی۔ اتنی دیر میں بچے بھی سو چکے تھے۔ وہ سونے کے لیے لیٹی تو اسے پھر سے

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

وہ خواب یاد آگیا۔ اس نے خوف سے جھرجھری لی۔

اس نے موبائل اٹھایا اور فاروق کو کال کرنے لگی۔

مگر اس نے کال ریسیو ہی نہیں کی۔ اس نے دوبارہ نمبر ملایا تو نمبر بند جا رہا تھا۔ اسے غصہ آیا۔

کافی دیر کروٹیں بدلنے کے بعد بھی نیند اس سے کوسوں دور تھی۔

اس نے اٹھ کر وضو کیا اور دو نفل پڑھ کے فاروق کی خیریت اور ہدایت کی دعا مانگنے لگی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ کل ہی واپس اپنے گھر چلی جائے گی۔

کچھ دیر میں اسے سکون محسوس ہونے لگا۔

صبح وہ اٹھی تو رات والی بے کلی کا نام نشان تک نہ تھا۔

وہ اپنے والدین کو تنہا چھوڑ کے نہیں جا سکتی تھی۔ شام کو اس کا بھائی اور بھابی واپس آئے تو وہ اسی ٹیکسی میں جس میں اس کا بھائی اور بھابی آئے تھے، اپنے گھر آگئی۔ وہ دونوں اس کی اس طرح اچانک روانگی پر حیران تھے مگر وہ اپنے والدین سے اجازت لے چکی تھی اس لیے انہوں نے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا۔

وہ بیڈ پر بیٹھی جانے کتنی دیر سے خیالوں میں گم تھی۔ اسے بچوں کا بھی کوئی ہوش نہیں تھا۔ جو کافی دیر سے سہمے ہوئے ایک طرف خاموش بیٹھے تھے۔

اچانک اسے خیال آیا تو اس نے اپنی پڑوسن کا نمبر ملایا۔

حال احوال کے بعد اس کی پڑوسن خود ہی بولی۔

”تم کدھر ہو؟ پتا ہے فاروق بھائی کو پولیس پکڑ کے لے گئی ہے۔“

اس نے تو مزے سے خبر سنا دی مگر علینا کو ایسا لگا جیسے اس کے نزدیک کسی نے بم پھوڑ دیا ہو۔

☆☆☆

دُرّانی باہر نکلا تو اس نے خود کو ایک کار پورچ میں پایا۔ جس میں سفید رنگ کی مارگلہ کھڑی تھی۔

آواز دروازہ بند ہونے کی آئی تھی۔

آگے ایک ڈبل ڈور تھا۔ جالی والا دروازہ باہر کی طرف کھلتا تھا جبکہ دوسرا دروازہ اندر کی جانب کھلتا تھا۔

دُرّانی نے جالی والا دروازہ کھول کے اندر والا دروازہ دھکیلا تو وہ کھل گیا۔ وہ دونوں اندر داخل ہوئے تو پیچھے جالی والا دروازہ خود زوردار آواز کے ساتھ بند ہو گیا۔

یہ بالکل ویسی ہی آواز تھی جیسی انہوں نے کچھ دیر پہلے سنی تھی۔ اس وقت بھی شاید کوئی اندر داخل ہوا تھا۔

وہ اندر داخل ہوئے تو انہوں نے خود کو لاؤنج میں پایا۔

وہ نوجوان امریکن اسٹائل کے کچن میں کھڑا پانی پی رہا تھا۔ کچن اور لاؤنج کے درمیان چار فٹ کی دیوار تھی جو کچن کو لاؤنج سے جدا کر رہی تھی۔

دُرّانی نے اسے پہچان لیا۔ آج یونیورسٹی میں حسام کے متعلق اسی نے سب کچھ بتایا تھا۔ دُرّانی اس وقت سادہ لباس میں تھا۔

وہ انہیں دیکھ کے باہر آگیا اور دُرّانی کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔

”نعمان!“ اس نے یک لفظی تعارف کرایا۔ اس کی نظریں درانی کی وردی پر بنے ستاروں سے ہوتی ہوئی اس کے نام کی پٹی پر جم گئی تھیں۔

دُرّانی نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اور اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ اس کی آنکھیں بہت گہری تھیں ایسا لگ رہا تھا جیسے ان میں ہزاروں راز دفن ہوں۔

درانی کو نامعلوم سی بے چینی کا احساس ہوا۔

لڑکا بھی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑا تھا۔

اس کا انداز چیلنج کرنے والا تھا۔

وہ باڈی بلڈر ٹائپ لڑکا تھا۔ کل رات کی بارش کی وجہ سے موسم قدرے خنک ہو گیا تھا مگر اس نے ہاف بازوؤں والی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ جس میں اس کے بازوؤں کی مچھلیاں نمایاں ہو رہی تھیں۔

دُرّانی نے اس کا ہاتھ چھوڑا تو وہ صوفے کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ ”بیٹھیں پلیز!“

وہ دونوں بیٹھ گئے۔

”آپ چائے پئیں گے ناں؟“ اس کا انداز رسمی تھا۔

”نہیں برخودار! ہمارے پاس وقت کم ہے۔ ہمیں تم سے بس چند معلومات درکار ہیں۔“

”جی پوچھیں۔ آپ کیا جاننا چاہتے ہیں؟“

درانی کو اس کے لہجے میں خفیف سے طنز کی جھلک محسوس ہوئی۔

حسن اس کا بیان لکھنے لگا۔ ساتھ ہی اس نے اپنے موبائل پر وائس ریکارڈر بھی آن کر لیا تھا۔

”اس گھر میں اور کوئی فرد نظر نہیں آرہا۔ تم اکیلے رہتے ہو؟“ درانی نے سوالات کا آغاز کیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

''اکیلا تو نہیں رہتا ہاں اس وقت اکیلا ضرور ہوں۔ میرے والدین ایک شادی میں شرکت کے لیے لاہور گئے ہوئے ہیں۔ ہم اِدھر تین افراد ہی رہتے ہیں۔ حاکم ہمارے گھر بطور گیسٹ رہ رہا تھا۔ وہ پہلے یونیورسٹی ہاسٹل میں رہتا تھا۔ دو تین ماہ پہلے اسے ایک متعدی مرض لاحق ہو گیا تھا۔ اس لیے اسے ہاسٹل سے نکال دیا گیا۔ اس نے مجھے کوئی کمرا کرائے پر ڈھونڈنے کا کہا۔

''ہمارا گھر افراد کی تعداد کے لحاظ سے کافی بڑا ہے۔ ایک کمرا الگ تھلگ سا بھی ہے۔ وہ ہمارے ساتھ رہتا تو مجھے اسٹڈی میں بھی اس کی ہیلپ مل جاتی اس لیے میں نے اسے مفت رہنے کی آفر کی مگر وہ نہ مانا۔ میرے اصرار پر وہ آ تو گیا مگر اس نے خود ہی ماہوار تین ہزار روپیہ کرائے کی مد میں دینا شروع کر دیا۔ اکثر اوقات کھانا بھی وہ ہمارے ساتھ ہی کھاتا تھا۔'' اس نے پہلے ہی سوال کا تفصیلی جواب دیا۔

''بائی نیچر وہ کیسا لڑکا تھا؟''

''وہ بہت کم گو اور اپنے کام سے کام رکھنے والا لڑکا تھا۔ اس کے اتنا عرصہ اِدھر رہنے سے ہمیں کبھی کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ الٹا وہ میری غیر موجودگی میں گھر کا سودا سلف بھی لے آتا۔ میرے گھر والے بھی اس سے خوش تھے۔'' اس کے لہجے میں افسردگی کی تھی۔

''ان دنوں تمہیں وہ کسی وجہ سے پریشان تو نہیں لگا؟''

''پچھلے کچھ دنوں سے وہ کافی کھویا سا رہنے لگا تھا۔ وہ نیند کی گولیاں بھی استعمال کرنے لگ گیا تھا۔ وہ کافی ریزرو رہتا تھا۔ اتنے عرصے کے ساتھ کے باوجود بھی وہ مجھ سے بے تکلف نہیں ہوا تھا۔ اس لیے میں نے باوجود خواہش کے اس سے کچھ پوچھا نہیں۔''

درانی کو گو کہ اگر اس نے واقعی خودکشی کی تھی تو اس کی وجہ معلوم ہو چکی تھی مگر بعض حقائق ایسے تھے جن سے پتا چل رہا تھا کہ اسے قتل کر کے خودکشی کا رنگ دینے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس حوالے سے یہ لڑکا بھی مشکوک لگ رہا تھا۔ کیونکہ کمرے کا گلی میں کھلنے والا دروازہ اندر سے بند تھا۔ گیٹ والی سائڈ سے بھی کوئی شخص باہر جاتا تو حسن کو نظر آ جاتا۔

وہ اس کی باتوں سے کوئی سراغ حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر فی الحال لڑکے نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی جو اسے مشکوک ثابت کرتی۔

''جب گولی چلنے کی آواز آئی تو تم کہاں تھے؟''

''میں واش روم میں تھا جب گولی چلنے کی آواز آئی۔ میرا خیال فوراً حاکم کی طرف گیا۔ وہ آج باہر سے آیا تو بہت پریشان لگ رہا تھا۔ وہ آتے ہی لیٹ گیا تھا۔ میں کچھ دیر بعد اس کے لیے چائے لے کر گیا۔ اس نے چائے پی کے میرے سامنے ہی نیند کی گولیاں لیں۔ پھر اس نے مجھ سے کہا کہ پلیز اب مجھے ڈسٹرب مت کرنا میں سونا چاہتا ہوں۔ میں خاموشی سے باہر نکل آیا۔ میرے باہر نکلتے ہی اس نے دروازہ اندر سے لاک کر دیا۔ عام طور پر یہ دروازہ کھلا ہی ہوتا ہے۔''

لڑکا ہر سوال کا تفصیلی جواب دے رہا تھا۔ درانی کو محسوس ہوا جیسے یہ سب اس نے پہلے سے سوچ رکھا ہے۔

''گولی کی آواز سنتے ہی تمہیں حاکم کا خیال کیوں آیا؟''

''میں چند دن پہلے ہی اس کے پاس پستول کی جھلک دیکھ چکا تھا۔ اس نے مجھے دیکھ کے پستول تکیے کے نیچے چھپا دیا تھا۔ میں منتظر رہا کہ وہ اس کے بارے میں خود ہی کوئی وضاحت کرے گا مگر وہ کچھ نہیں بولا تو میں نے بھی پوچھنا مناسب نہیں سمجھا۔''

''وہ تمہارے گھر میں رہتا تھا، اس کی مشکوک حرکات دیکھ کر بھی تم نے اس سے اس بارے میں کیوں بات نہیں کی؟''

اس بار اس کے لہجے میں قدرے سختی تھی۔

''مجھے کسی کے ذاتی معاملات میں ٹانگ اڑانا پسند نہیں ویسے بھی ہمارے گھر میں رہنے سے ہم پر اس کی ساری حرکات کی ذمّے داری..... عائد نہیں ہوتی۔'' وہ ناگواری سے بولا۔

''بیٹا جی! یہ تمہاری خام خیالی ہے کہ اس کی کسی حرکت کی ذمّے داری تم پر عائد نہیں ہوتی۔ تمہیں اس کے پاس پستول دیکھ کے ہی پولیس کو اس بارے میں انفارم کر دینا چاہیے تھا۔'' وہ الفاظ کو چبا چبا کے بولا۔

''سوری جی مجھ سے غلطی ہو گئی۔ مجھے کیا پتا تھا وہ اس پستول سے اپنی ہی جان لے لے گا۔ میں تو یہی سمجھا تھا کہ اس نے بس شوق میں پستول پاس رکھا ہوا ہے۔'' اس نے ایک دم اپنا لہجہ بدلا۔

''اچھا تم بتا رہے تھے کہ جب گولی کی آواز آئی تو تم واش روم میں تھے۔ تم نے پھر کیا کیا؟''

میں جلدی سے فارغ ہو کے باہر نکلا۔ اس دوران

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

مجھے کال بیل بھی سنائی دی تھی۔ میرا خیال تھا کہ باہر کوئی پڑوسی ہوگا جو گولی کی آواز سن کے آیا ہوگا۔ مگر جب میں باہر پہنچا تو یہ کھڑے تھے۔'' اس نے حسن کی طرف اشارہ کیا۔

دُرانی نے اس کے بعد کوئی سوال نہیں کیا۔ اس کے چہرے پر تفکر کی لہریں تھیں۔

اسے خاموش دیکھ کے لڑکا بولا۔ ''آپ اتنی جلدی کیسے پہنچ گئے تھے؟'' اس نے اپنی الجھن سلجھانے کی کوشش کی۔

''اس بات کو چھوڑو اور اِدھر دستخط کردو۔'' حسن نے اس کی طرف نوٹ بک بڑھائی جس پر وہ بیان لکھ رہا تھا۔

یہ نوٹ بک اکثر وہ ساتھ ہی رکھتا تھا۔ دستخط کرا کے اس نے نعمان سے اس کے شناختی کارڈ کی کاپی بھی لے لی۔

''تم ہمیں اطلاع دیے بغیر شہر سے باہر نہیں جاسکتے۔ تمہیں اس دوران کوئی بھی ایسی بات معلوم ہو جس سے اس کیس پر روشنی پڑسکتی ہو تو مجھے انفارم کردینا۔'' درانی نے اپنا کارڈ اس کی طرف بڑھایا۔

''کیا یہ سیدھا سادہ خودکشی کا کیس نہیں؟'' کارڈ لیتے ہوئے اس کی آنکھوں میں الجھن تیر رہی تھی۔

''فی الحال ہم اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔'' درانی نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

ایک بار پھر اسے نامعلوم سی بے چینی کا احساس ہوا۔

''میں حاکم کے گھر والوں کو اس کی موت کی اطلاع کر دوں؟'' وہ پوچھنے لگا۔ اس نے کچھ سوچ کر اسے اجازت دے دی۔

اس نے دروازے کی طرف قدم بڑھائے ہی تھے کہ اس کی نظر کارنس پر رکھی ایک تصویر پر پڑی۔

یہ سولہ سترہ سال کی انتہائی خوبصورت لڑکی کی تصویر تھی۔ جس کے بالوں کی پونیاں اس کے سر کے دونوں اطراف جھول رہی تھیں۔ اس کے چہرے پر بچوں کے سے تاثرات تھے۔ اس نے سوالیہ نظروں سے نعمان کی طرف دیکھا۔

نعمان کی نظریں بھی اس کی نظروں کے تعاقب میں تصویر پر جا کے ٹک گئی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں کرب ہلکورے لے رہا تھا۔

اس نے جب درانی کو اپنی طرف دیکھتا پایا تو وہ بولا۔ ''یہ میری بہن تھی تقریباً کچھ عرصہ پہلے یہ چھت سے گر کے مرگئی تھی۔'' اس کے لہجے میں نمی گھلی ہوئی تھی۔

''اوہ افسوس ہوا۔'' درانی اتنا ہی کہہ سکا۔

رات کے دس بج چکے تھے درانی اعصابی طور پر تھک چکا تھا۔ اسے شدت سے آرام کی طلب ہو رہی تھی۔

وہ گھر پہنچا تو اس کی بیوی ٹی وی کے آگے بیٹھی تھی۔ سدرہ خوبصورت نقوش اور چھریرے جسم کی مالک تھی۔ چالیس سال کی عمر اور تین بچوں کی پیدائش نے بھی اس کے فگرز پر کوئی خاص اثر نہیں ڈالا تھا۔

دُرانی اس کے پاس ہی صوفے پر بیٹھ گیا۔ ''بچے سو گئے؟'' اس نے دریافت کیا۔

''جیا اور ہشام تو سو گئے ہیں مگر ساحر حسب معمول لیپ ٹاپ کھول کے بیٹھا ہے۔'' اس نے اپنے پندرہ سالہ بیٹے کی شکایت کی۔

وہ تھکا ہوا تھا اس لیے کچھ نہیں بولا۔

''کھانا کھائیں گے ناں؟'' اس کی بیوی نے اس سے پوچھا۔

''ہاں لے آؤ۔'' اس نے تھکے تھکے انداز میں جواب دیا۔

وہ کھانا لینے چلی گئی تو وہ ٹی وی کی طرف متوجہ ہوا۔ ٹی وی پر ڈراما لگا ہوا تھا۔ اس نے ریموٹ اٹھا کے ایک نیوز چینل لگایا۔ ان تینوں کی موت کے متعلق خبریں چلتی دیکھ کے وہ حیران رہ گیا۔

اس کا خیال تھا کہ میڈیا والوں کو حاکم کی خودکشی کی خبر ہی ہوگی۔ اور وہ بظاہر ایسی خبر نہیں لگتی تھی کہ... نیوز چینلز والے اس کی طرف متوجہ ہوتے۔ نور اور حسام کی موت کی تو کسی کو خبر ہی نہیں تھی۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو بھی منع کردیا تھا۔ مگر میڈیا والے خبر ڈھونڈنے اور رائی کا پہاڑ بنانے میں مہارت رکھتے ہیں۔

ابھی بھی نئی نئی تھیوریز قائم کی جارہی تھیں لیکن سب اندازے تھے کوئی مصدقہ خبر نہیں تھی۔

اچانک اسے یاد آیا کہ اس نے اپنا عام نمبر آف کیا ہوا تھا۔ اسی لیے اتنی دیر میں اسے کوئی کال نہیں آئی تھی۔ اس نے نمبر آن کیا ہی تھا کہ اسے مسڈ کالز کے نوٹیفکیشنز ملنے لگے۔ اس نے سب نظرانداز کرکے آئی جی صاحب کا نمبر ملایا۔

وہ اس کی آواز سنتے ہی بولے۔ ''ہاں بھئی کیا رپورٹ ہے؟ میڈیا والوں نے ناک میں دم کر رکھا ہے۔ میں تو بس ایک ہی بات سب کو بتا رہا ہوں کہ تفتیش جاری ہے۔ مزید قتل نہیں ہوں گے وغیرہ۔'' ان کے لہجے میں بیزاری تھی۔

دُرانی ساری تفصیل بتا چکا تو وہ بولے۔ ''کیوں لبے

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

چکروں میں پڑ رہے ہو۔ سب نور اور حاکم کے کھاتے میں ڈالو اور جان چھڑاؤ۔ وزیر داخلہ صاحب کو رپورٹ چاہیے۔''

''سر کیا میں مزید تفتیش نہ کروں؟'' اس نے حیرت سے سوال کیا۔

''اب کیا تفتیش کرنی ہے سارا چکر سمجھ تو آگیا ہے۔ کل ہی فائنل رپورٹ تیار کر کے ایک پریس ریلیز جاری کر دو۔''

''او کے سر۔'' اس نے تھکے تھکے انداز میں کہا اور کال بند کر دی۔ سدرہ نے کھانا لگا دیا تھا اور منتظر نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ کھانا کھا کر ٹی وی بند کرنے ہی لگا تھا کہ نیوز اینکر کی آواز سن کے چونک گیا۔

☆☆☆

علینا پریشان تھی کہ فاروق کو پولیس کیوں پکڑ کے لے گئی مگر اس کی پڑوسن نہیں جانتی تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ میں چھت پر کھڑی تھی جب پولیس کی گاڑی آپ کے گیٹ پر رکی۔ میں چونک گئی۔ میں ادھر ہی گیٹ پر نظریں جما کے کھڑی ہو گئی۔ کافی دیر بعد پولیس والے باہر نکلے تو ان کے ساتھ فاروق بھائی بھی تھے ان کے ہاتھوں میں ہتھکڑی تھی۔ وہ لنگڑا کے چل رہے تھے شاید پولیس والوں نے ان کے ساتھ مار پیٹ کی تھی۔

''تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا۔'' اس نے روہانسی آواز میں شکوہ کیا۔

''آپ تو دو ماہ سے اپنے میکے گئی ہوئی تھیں۔ ادھر محلے میں سب لوگوں کا خیال تھا کہ فاروق بھائی نے آپ کو طلاق دے دی ہے۔ آپ نے بھی اتنے عرصے میں مجھ سے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا۔ اس لیے مجھے بھی آپ کو بتانے کا خیال ہی نہیں آیا۔'' اس نے تفصیلی جواب دیا۔

علینا نے اپنے بھائی کو کال کی تو وہ اسے آ کے لے گیا۔

''تم سو جاؤ ابھی کچھ نہیں ہو سکتا صبح ہی پتا کراؤں گا کہ اس بار اس نے کیا گل کھلایا ہے کہ پولیس اسے پکڑ کے لے گئی ہے۔'' اس کے بھائی نے گھر پہنچ کے بیزاری سے کہا تھا۔

علینا کی یہ رات بھی جائے نماز پر دعائیں مانگتے گزری تھی۔

☆☆☆

وہ کہہ رہی تھی۔ ''ناظرین ہمارا آئی جی صاحب سے رابطہ ہو گیا ہے، دیکھتے ہیں وہ اس کیس کے بارے میں کیا بتاتے ہیں۔''

''تفتیش آخری مراحل میں داخل ہو چکی ہے۔ اس کیس کے حوالے سے بہت ہی حیران کن انکشافات سامنے آئے ہیں۔ تفتیش کے دوران معلوم ہوا ہے کہ اس ہفتے جو یونیورسٹی کے چار لڑکے قتل ہوئے ہیں، انہوں نے اپنی ایک کلاس فیلو کو اغوا کر کے اس کا ریپ کیا تھا۔ اس لڑکی نے اپنے ایک دوست کے ساتھ مل کے انتقامی کارروائی کر کے انہیں قتل کیا مگر آج صبح جب اس نے حسام نامی لڑکے کو گولی ماری تو اس دوران وہ خود بھی چھت سے گر کے ہلاک ہو گئی۔ اس کے ساتھی کو جب لڑکی کی موت کی خبر ملی تو اس نے خودکشی کر لی۔ اس نے ایک خط بھی چھوڑا جس میں اس نے تین لڑکوں کے قتل کا اعتراف کیا ہے۔ اس کے مطابق چوتھا آدمی جو قتل ہوا، اسے لڑکی نے مارا تھا کیوں کہ اس نے بھی اس کی عزت لوٹنے کی کوشش کی تھی۔ اس طرح یہ کہانی اپنے اختتام تک پہنچ گئی ہے دونوں مجرم اپنے انجام کو پہنچ گئے ہیں۔ امید ہے کہ اس طرح کا کوئی مزید واقعہ اب سامنے نہیں آئے گا۔'' آئی جی صاحب ٹھہر ٹھہر کے بول رہے تھے۔

''یہ کہانی تو اپنے اختتام کو پہنچ گئی۔ مگر اس طرح کی کہانیاں جنم ہی کیوں لیتی ہیں؟ کیا اس طرح کے واقعات کی روک تھام پولیس کی ذمے داری نہیں؟'' اس نے چبھتا ہوا سوال کیا۔

''دیکھیں جی پولیس اپنا کام پوری جانفشانی کے ساتھ کر رہی ہے۔ اس طرح کے واقعات ترقی یافتہ ممالک میں بھی رونما ہوتے ہیں بلکہ دیکھا جائے تو اُدھر ریشو یہاں سے کہیں زیادہ ہے حالانکہ وہاں کی پولیس کے پاس یہاں سے کہیں زیادہ وسائل بھی ہیں۔ پولیس کا کام مجرموں کو پکڑنا ہے۔ اس طرح کے واقعات کی روک تھام اکیلی پولیس کا کام نہیں اس کے لیے پورے سسٹم میں بہتری کی ضرورت ہے۔''

جواب دیتے ہوئے ان کے لہجے میں ہلکی سی ناگواری تھی۔ جو انہوں نے چھپانے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔

''بہت شکریہ جونیجو صاحب۔'' اینکر کے پاس شاید اور کوئی سوال نہیں تھا۔

☆☆☆

پوری رات کیس کے بارے میں ہی سوچتے گزر گئی تھی۔ اس کے ذہن میں کوئی چیز کھٹک رہی تھی مگر زور دینے کے باوجود اسے یاد نہیں آرہی تھی۔ وہ اٹھا اور ٹیبل لیمپ آن

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

کر کے رائٹنگ ٹیبل پہ بیٹھ کے سارے واقعات ایک ترتیب سے لکھنے لگا۔

اس کی بیوی کی آنکھ کھلی تو وہ غنودگی میں بولی۔

''آپ ابھی تک سوئے نہیں۔'' اس کی آواز غنودگی کی وجہ سے کافی مختلف لگ رہی تھی۔

دُرّانی چونکا۔ یکا یک ہی اس کے ذہن میں گویا روشنی کا جھماکا ہوا۔ اسے وہ بات یاد آگئی تھی جس نے اسے پریشان کیا ہوا تھا۔ وہ ایک فیصلے پر پہنچ کے سوگیا۔ رات کو دیر سے سونے کی وجہ سے صبح اس کی آنکھ دیر سے کھلی اور وہ لیٹ ہوگیا۔

دُرّانی آفس پہنچا تو گیارہ بج رہے تھے۔

پوسٹ مارٹم، فنگر پرنٹس اور فرانسک لیب کی دیگر رپورٹس آچکی تھیں۔ اس نے سب سے پہلے نور کی رپورٹ نکال کے چیک کی۔

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق اس کی موت سر سے خون زیادہ بہنے کی وجہ سے واقع ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ کسی اور چھیڑ خانی کے کوئی شواہد نہیں ملے تھے۔

دُرّانی کو اس شخص کا خیال آیا جس کے گھر اس نے رات گزاری تھی۔ گویا وہ بے گناہ تھا۔

اس نے اسے بلوایا۔ وہ صدیوں کا بیمار لگ رہا تھا۔

اس نے اسے تنبیہ کر کے چھوڑ دیا۔

باقی دونوں کی رپورٹس میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ حاکم کے معدے سے خواب آور گولیوں کی موجودگی ظاہر ہوئی تھی مگر اس کی وضاحت نعمان نے اپنے بیان میں کر دی تھی۔ اس کی موت... سر میں گولی لگنے کی وجہ سے ہی واقع ہوئی تھی۔

اس نے فارنسک رپورٹس دیکھیں۔ اس کے ہاتھوں پر بارود کے ذرات سے پتا چل رہا تھا کہ گولی اسی کے ہاتھ سے چلائی گئی تھی۔ باقی پانچ افراد جو قتل ہوئے تھے ان میں سے جن کے قتل کا اعتراف خودکشی کے نوٹ میں کیا گیا تھا، وہ سب اسی پستول سے قتل ہوئے تھے جبکہ باقی دو افراد کے جسموں سے جو گولیاں نکلی تھیں، وہ اس پستول سے چلائی گئی تھیں جو نور کے پاس پڑا ہوا ملا تھا۔

فنگر پرنٹس کی رپورٹس سے بھی کوئی خاص بات معلوم نہیں ہوسکی تھی۔ پستول، خودکشی، خواب آور دوائی کی شیشی اور خودکشی کے نوٹ سب پر حاکم کی انگلیوں کے ہی نشانات تھے۔

فارنسک ڈیپارٹمنٹ والوں نے اس کی ہدایات کے مطابق اپنا کام پوری جانفشانی سے مکمل کیا تھا۔

ان رپورٹس کے مطابق جو کہانی خودکشی کے نوٹ میں لکھی تھی صحیح ثابت ہو رہی تھی مگر درانی مطمئن نہیں تھا۔

اس نے لیب میں ایک شخص کو کال کی۔ ''میں تمہیں دو ریکارڈنگز وائس ایپ کر رہا ہوں ان کا ٹیسٹ کر کے بتاؤ کے یہ دونوں میچ کر رہی ہیں یا نہیں۔''

اس نے نور کے سیل فون کی ریکارڈنگز اپنے سیل میں کل ہی بلیوٹوتھ کر دی تھیں۔ حسن نے نعمان کا جو بیان اپنے سیل میں ریکارڈ کیا تھا وہ بھی رات کو ہی اس کے موبائل میں سینڈ کر دیا تھا۔ اس نے وہ دونوں ریکارڈنگز لیب میں موجود شخص کو وائس ایپ کر دیں۔

کل رات جب اس کی بیوی اس سے غنودہ آواز میں بولی تھی۔ اس وقت اس کے ذہن میں آیا تھا کہ اس نے نعمان کی آواز اس شخص کی آواز کے ساتھ میچ کرانی ہے جو نور کو کال کرتا رہا تھا۔

اسے نور کے سیل میں ریکارڈ کی گئیں باقی دو ریکارڈنگز کا خیال آیا، وہ کل انہیں نہیں سن سکا تھا۔

اس نے اپنے موبائل سے دوسری ریکارڈنگ چلائی۔

اس ریکارڈنگ میں نور نے ایک شخص کے قتل کا اعتراف کیا تھا۔ اس نے ساری تفصیل بتائی تھی کہ کیسے وہ اسے لفٹ میں ملا تھا اور اسے اپنے کمرے میں لے گیا تھا۔ اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ اسے قتل کرنے کے بعد اس کے ذہن میں خیال آیا تھا کہ کیوں ناں اس قتل کو بھی وہی رنگ دیا جائے اس لیے اس نے اس کی بھی آنکھوں میں گولیاں ماریں کے اس کا مردانہ عضو کاٹ دیا تھا۔ ویسے بھی وہ اسی سلوک کا مستحق تھا۔

اس شخص نے بڑی ہوشیاری سے اس سے یہ ساری باتیں اگلوائی تھیں۔

اگلی ریکارڈنگ میں نور بتا رہی تھی کہ وہ حسام کو قتل کرنے جا رہی ہے۔ اس شخص نے حسام اور اس کے گھر کے متعلق ساری تفصیلات نور کو دی تھیں، وہ جو کوئی بھی تھا حسام کے گھر کا بھیدی لگ رہا تھا۔ حاکم کی تو حسام سے دوستی نہیں تھی سوا سے تو اتنی تفصیل پتا نہیں ہوسکتی تھی۔ درانی کے ذہن میں خیال آیا تھا۔

وہ اسی سوچ میں گم تھا کہ لیب سے کال آگئی۔

''سر وہ دونوں آوازیں ایک ہی شخص کی ہیں۔''

دُرّانی کی آنکھوں میں یہ سنتے ہی فتح مندانہ چمک

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

ابھری تھی۔

☆☆☆

فاروق گھر پہنچا تو چونک گیا۔ اسے یہاں سے علینا کے وجود کی خوشبو آرہی تھی۔ اس نے سارا گھر گھوم کے دیکھ لیا۔ علینا نہیں تھی، نہیں ملی۔ اس نے اسے اپنا وہم سمجھا۔

یکا یک ہی اسے شدت سے علینا کی یاد ستانے لگی۔ اس نے اس کے ساتھ بہت زیادتی کی تھی۔ وہ اسی وقت بائیک پر اپنے سسرال روانہ ہوگیا۔ گاڑی پولیس کی تحویل میں تھی۔ اسے بتایا گیا تھا کہ چند دن بعد ہی اسے گاڑی مل سکتی ہے۔ مگر اس نے گاڑی پر فاتحہ پڑھ لی تھی۔ اس کی اپنی جان بچ گئی تھی یہی کافی تھا۔ وہ اپنے سسرال پہنچا تو..... علینا اپنے بھائی کے ساتھ کہیں جارہی تھی۔ وہ اسے دیکھ کے حیران رہ گئی۔

فاروق بے اختیار اپنے بچوں کو اٹھا کے چومنے لگ گیا۔ اس کی آنکھوں سے بہتے آنسو دیکھ کے سبھی حیران تھے۔ علینا اسے زندگی میں پہلی بار روتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ وہ تو اپنے والدین کی موت پر بھی نہیں رویا تھا۔

شام کو وہ اپنے گھر میں تھے۔ اس نے علینا کو سب سچ بتا دیا تھا۔ اس نے علینا سے معافی مانگی کہ آئندہ وہ کسی غیر عورت کی طرف دیکھے گا بھی نہیں۔

علینا نے اسے بتایا کہ اس نے کتنا بھیانک خواب دیکھا تھا۔ خواب دیکھ کے اسے ہول اٹھنے لگے۔ وہ پوری رات اس نے جائے نماز پر فاروق کی خیریت کی دعا مانگتے گزار دی تھی۔

فاروق یہ سب سن کے حیران رہ گیا تھا شاید یہ علینا کی اس سے بے پناہ محبت ہی تھی کہ اس کی جان کو خطرہ لاحق ہوا تو اس کے دل کو خبر ہوگئی۔ علینا کی دعا نے ہی اس کی تقدیر بدلی تھی ورنہ اس نے تو اپنی موت کا سامان کرلیا تھا۔

نیک اور پرہیزگار بیوی خدا کی کتنی بڑی نعمت ہوتی ہے آج اسے احساس ہوا تھا۔

اس نے بے اختیار اپنے رب کا شکر ادا کیا اور دل ہی دل میں اپنے گناہوں کی معافی مانگنے لگا۔

☆☆☆

ایک ماہ بعد۔

نعمان کو سزائے موت ہوگئی تھی۔ اس کیس کو الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا نے بھرپور توجہ دی تھی۔ درانی کی کارکردگی کو محکمے کی طرف سے بہت سراہا گیا تھا۔ جلد ہی اس کی پروموشن بھی ہونے والی تھی۔

نعمان نے بہت ہوشیاری سے منصوبہ بنایا تھا۔ اس نے چھوٹی چھوٹی جزئیات کا خیال رکھا تھا مگر اس کی قسمت اچھی نہیں تھی کہ یہ کیس درانی کو مل گیا تھا۔ نور اگر اس کی کالز ریکارڈ نہ کرلیتی تو اس کا پکڑا جانا ناممکن تھا۔ مگر ہوشیار سے ہوشیار مجرم سے کوئی نہ کوئی غلطی سرزد ہو ہی جاتی ہے جس کی وجہ سے وہ پکڑا جاتا ہے۔ مگر وہ غلطی پکڑنے کے لیے بھی درانی جیسے ذہین اور باضمیر پولیس آفیسر کا ہونا ضروری ہے۔ اور کوئی پولیس آفیسر ہوتا تو سارا الزام نور اور حاکم پر لگا کے کیس داخلِ دفتر کردیتا۔ درانی کو بھی آئی جی صاحب نے یہی مشورہ دیا تھا مگر اس نے اپنے آفیسر کے بجائے اپنے ضمیر کی آواز سنی تھی۔ نعمان کا بیان پڑھ کے وہ رو پڑا تھا۔ اس نے اپنے بیان میں ساری تفصیل پوری جزئیات کے ساتھ بیان کی تھیں۔ درانی اس کا منصوبہ پڑھ کے اش اش کراٹھا تھا۔ اس نے منصوبہ بلاشبہ انتہائی ذہانت اور باریک بینی سے تیار کیا تھا مگر اس کی قسمت ہی خراب نکلی تھی۔

درانی افسردہ تھا۔ اتنے ذہین نوجوان کے ساتھ وقت نے ایسا کھیل کھیلا کہ وہ جرم کی راہ پر چل نکلا۔

اس نے لکھا تھا۔

''ہم دو بھائی بہن تھے صبا مجھ سے پانچ سال چھوٹی تھی۔ خدا نے اسے خوبصورتی تو بہت دی تھی مگر اس سے بہت سی نعمتیں چھین لی تھیں۔ وہ پیدائشی گونگی بہری تھی اور ذہنی معذور بھی۔ میں اس پر اپنی جان چھڑکتا تھا۔ میں اپنے والدین سے بھی زیادہ اس کا خیال رکھتا۔

میری حمزہ، حاشر اور عماد سے بچپن سے دوستی تھی۔ ہم ایک ہی سیکٹر میں رہتے تھے اور ہمارا ایک دوسرے کے گھروں میں بھی آنا جانا تھا۔ ہم نے اسکول کالج کے بعد یونیورسٹی بھی ایک ہی منتخب کی۔ یہاں ہمارے گروپ میں حسام کا بھی اضافہ ہوگیا۔

ان دنوں میرے والدین ہمارے آبائی شہر لاہور ایک شادی میں گئے ہوئے تھے۔ وہ صبا کو معذوری کی وجہ سے رشتے داروں کے سامنے لے جانے میں شرمندگی محسوس... کرتے تھے اس لیے اسے کہیں نہیں لے کے جاتے تھے۔ میں بھی اس کی وجہ سے نہیں گیا تھا۔ ان دنوں یونیورسٹی سے بھی چھٹیاں تھیں۔ میری گاڑی خراب تھی۔ میں وہ ٹھیک کرانے گیا۔ دو تین گھنٹوں کا کام تھا۔ مگر مجھے اطمینان تھا کہ وہ وقت صبا کے سونے کا تھا۔ میں اسے سوتا چھوڑ کے چلا گیا۔ تین گھنٹوں بعد واپس آیا تو وہ بیڈ پر برہنہ پڑی تھی۔ اس کا خون آلود جسم اور پھٹے ہوئے کپڑے اس کے ساتھ بیتی کہانی

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

بیان کر رہے تھے۔ اس کی حالت دیکھ کے میرا غم و غصے سے برا حال ہو گیا۔ کس نے کیا، یہ سب تمہارے ساتھ، میں چیخ چیخ کے اس سے پوچھ رہا تھا مگر وہ کچھ بھی بتانے سے قاصر تھی۔ وہ بس خالی خالی نظروں سے چھت کی طرف تکے جا رہی تھی۔

مجھ سے اس کی حالت دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ میں باہر نکل آیا۔ آخر یہ سب کس نے کیا تھا؟

میرا خیال حمزہ کی طرف گیا۔ جب میں گاڑی ٹھیک کرانے جا رہا تھا تو وہ مجھے راستے میں ملا تھا۔ اس کے پوچھنے پر میں نے اسے بتا دیا تھا کہ میری واپسی دو تین گھنٹوں بعد ہوگی۔ اسے پتا تھا کہ صبا گھر میں اکیلی ہے۔ مگر میرا دل ماننے کو تیار نہیں تھا کہ یہ سب اس نے کیا ہوگا۔ وہ تو میرا بچپن کا دوست تھا۔

میرے والدین دو دن بعد آ گئے۔ میں نے انہیں بھی کچھ نہیں بتایا۔ صبا اس دن کے بعد بالکل بجھ کے رہ گئی تھی۔ وہ پورا دن کمرے میں پڑی رہتی۔ اس نے کھانا پینا بھی کم کر دیا تھا۔ حمزہ، حاشر اور عماد اس دن کے بعد ہمارے گھر نہیں آئے تھے۔ یہ چیز میرا شک ان پر بڑھا رہی تھی مگر میرے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا۔ اسی طرح تین چار ماہ گزر گئے۔

صبا روز بروز گھلتی جا رہی تھی۔ وہ بالکل ہڈیوں کا ڈھانچا بن گئی تھی۔ میں اسے ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ ڈاکٹر زہرہ ہماری فیملی ڈاکٹر ہے۔ اس نے کچھ ٹیسٹ کرانے کا کہا۔

ٹیسٹ کی رپورٹس مجھ پر بم بن کر گریں۔ وہ پریگننٹ تھی۔

میں نے ڈاکٹر زہرہ کو کسی کو بھی یہ بات بتانے سے منع کر دیا۔

میں بہت پریشان تھا۔ جلد ہی یہ بات کھل جاتی تو ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتے۔ ڈاکٹر زہرہ نے بتایا تھا کہ اب ابارشن ممکن نہیں۔ اس مسئلے کا اب ایک ہی حل تھا کہ وہ زندہ ہی نہ رہتی۔ اس کی زندگی ویسے بھی مُردوں سے بدتر تھی۔ میں نے دل پر پتھر رکھا۔ اور اپنی جان سے عزیز بہن کو خود اس کے منہ پر تکیہ رکھ کے مار دیا۔ اس کی لاش میں نے چھت سے جا کے نیچے پھینک دی اور یہ ظاہر کیا کہ اس کی موت چھت سے گرنے سے واقع ہوئی ہے۔

لوگ تعزیت کے لیے آتے رہے مگر کچھ پتا نہیں تھا کہ میں کہاں ہوں؟ میرے آنسو اندر ہی اندر گر رہے تھے۔ میرے اندر آتش فشاں پک رہا تھا۔ میں نے اس کے قاتل کو تلاش کر کے بھیانک انجام سے دوچار کرنے کا تہیہ کر لیا۔ اس فیصلے سے مجھے کچھ سکون کا احساس ہوا۔

اس کے تین چار دن بعد میں عماد کے گھر گیا تو اس کی امی نے بتایا کہ وہ حمزہ اور حاشر کے ساتھ چھت پر ہے۔

میں سیڑھیوں کی جانب چلا گیا۔ چار پانچ سیڑھیاں باقی تھیں کہ مجھے ان کی آوازیں سنائی دیں۔

”مجھے لگتا ہے کہ نعمان کو ہم پر شک ہے۔“ یہ آواز حمزہ کی تھی۔

”ہوا کرے...... وہ ہمارا کیا بگاڑ سکتا ہے؟“ حاشر

قارئین متوجہ ہوں

پرچا نہیں ملتا

کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچا نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ بک اسٹال کا نام جہاں پر چا دستیاب نہ ہو۔
☆ شہر اور علاقے کا نام۔
☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL یا موبائل نمبر۔

رابطے اور مزید معلومات کے لیے

ثمر عباس 0301-2454188

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
سسپنس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگزشت
63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ کراچی

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں
35802552-35386783-35804200
ای میل: jdpgroup@hotmail.com

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

بے پروائی سے بولا۔

میرے ذہن میں بگولے اٹھ رہے تھے مگر میں خاموشی سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔

”تمہیں پتا ہے صبا پریگننٹ تھی۔ میرے خیال میں تو نعمان نے اسے خود چھت سے نیچے پھینکا ہے۔“ اس بار عماد بولا تھا۔

”اوہ اس کا تو مطلب ہے اس نے تمہارے بچے کو پیدائش سے پہلے ہی قتل کر دیا۔“ یہ کہہ کے حاشر.... نے قہقہہ لگایا۔

”میرے بچے کو نہیں بلکہ ہمارے بچے کو......“ عماد نے کہا تو باقی تینوں نے زور سے قہقہہ لگایا۔

مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ میرے بچپن کے دوست ہیں۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ ابھی جاکے ان سے بھڑ جاؤں۔ بڑی مشکل سے میں نے خود کو کنٹرول کیا اور خاموشی سے گھر آ گیا۔ اس رات میں ایک لمحے کے لیے بھی سو نہیں سکا۔ میرے اندر آتشِ انتقام بھڑک رہی تھی جو اُن کے خون سے ہی ٹھنڈی ہوسکتی تھی۔

اگلے دن میں نے ایک افغانی سے سائلنسر سمیت ایک پستول خرید لیا۔ میں شوٹنگ کلب کا باقاعدہ ممبر تھا۔ پستول کیا بھاری ہتھیار چلانے کی بھی میری پریکٹس تھی مگر ان کے لیے پستول بھی کافی تھا۔

میں نے حمزہ کو یونیورسٹی میں ہی شکار کر لیا۔ میں اسے ساتھ لے کے یونیورسٹی کیمپس کے ویران علاقے میں نکل گیا۔ جب میں نے اس کی طرف پستول سیدھا کیا تو اس کی آنکھوں میں حیرت اور خوف دیکھ کے مجھے دلی سکون ملا۔ میں نے بلا جھجک اس کے سینے پر گولی چلا دی۔ اس کے سینے سے ابلتا خون دیکھ کے مجھے ناقابلِ بیان راحت حاصل ہوئی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں بھی دو سوراخ کر دیے۔ انہیں آنکھوں سے میری معصوم بہن کو دیکھ کے اس کی ہوس جاگی تھی۔ میں نے اس کی پینٹ بھی اتار دی اور اس کی لاش کے ساتھ وہ کام کیا کہ وہ اگر زندہ رہتا تو اس کا شمار تیسری جنس میں ہی ہوتا۔

شام کو اس کے جنازے میں مجھے حسام ملا۔ وہ بہت خوفزدہ تھا۔ اس نے مجھے وہ سب بتا دیا جو انہوں نے نور کے ساتھ کیا تھا۔ اس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ وہ نور کو مردہ سمجھ کے جنگل میں پھینک آئے تھے مگر وہ بچ گئی تھی۔

یہ سب سن کے میرے ذہن میں ایک منصوبہ ترتیب پانے لگا۔ اگلے دن ہی میں نے حاشر اور عماد کا بھی خاتمہ کر دیا۔ وہ دونوں جہاں انہوں نے نور کی اپنی دانست میں لاش پھینکی تھی اس جگہ کو دیکھنے آئے تھے۔ میں ان کے گھر سے ہی ان کے پیچھے لگا تھا۔ انہیں مارنے میں مجھے کوئی مشکل نہیں ہوئی تھی۔ میرا انتقام پورا ہو چکا تھا۔ اس رات میں چار ماہ بعد پہلی بار سکون سے سویا تھا۔ میں نے خواب میں صبا کو دیکھا۔ وہ بہت خوش لگ رہی تھی۔

یہ تین قتل ایسے نہیں تھے کہ پولیس خاموشی سے بیٹھی رہتی۔ مجھے ڈر تھا کہ اگر پولیس نے پوری تندہی سے قاتل کو تلاش کرنے کی کوشش کی تو کہیں میں پکڑا ہی نہ جاؤں۔ میں اپنے والدین کا واحد سہارا تھا۔ میں اگر پکڑا جاتا تو وہ بھی زندہ درگور ہو جاتے۔ میں نے نور کو کال کر کے اسے حسام کو قتل کرنے پر رضامند کیا۔ میں نے اس سے اجنبی بن کر بات کی۔ میں اسے اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ تو اگر کوئی لڑکا اس سے فری ہونے کی کوشش کرتا تو اسے نہیں بخشتی تھی۔ ان لوگوں نے تو اس کی عزت پر ہاتھ ڈالا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ میری طرح وہ بھی آتشِ انتقام میں جل رہی ہوگی۔ میں وائس چینجر استعمال کر رہا تھا اس لیے مجھے پہچانے جانے کا کوئی ڈر نہیں تھا۔ اس نے مجھ سے حسام کا ایڈریس لے لیا۔ میرا حسام سے بھی فون پر رابطہ تھا۔ وہ باقی تینوں کے قتل کے بعد اپنے آبائی گھر جا کے چھپ گیا تھا۔ ہم ایک بار اس طرف گھومنے گئے تھے تو اس کے گھر ہی رکے تھے۔

دو دن بعد اسی انداز میں ایک شخص کو قتل کیا گیا جس انداز میں، میں نے ان تینوں کو مارا تھا۔ میں نے نور کو کال کی اور اندھیرے میں تیر چلایا جو نشانے پر لگا۔ اس نے اعتراف کر لیا کہ یہ قتل اسی نے کیا ہے۔ اس کے بقول اس شخص نے اس کی عزت لوٹنے کی کوشش کی تھی۔ اس نے اسے مار دیا اور اس کی لاش کے ساتھ وہی سلوک کیا جو میں نے ان تینوں کی لاشوں کے ساتھ کیا تھا۔ بقول اس کے وہ اسی سلوک کا مستحق تھا۔

اگلے دن وہ حسام کو قتل کرنے روانہ ہو گئی۔ میں نے اسے کال کی تو اس نے مجھے بتایا کہ وہ راستے میں ہے۔ میں نے اسے حسام کے گھر کے بارے میں ساری تفصیلات بتا دیں۔ اس کے بعد میرے منصوبے کا اگلا حصہ شروع ہو گیا۔ میں حاکم کے پاس گیا اور اسے ساری بات بتا دی۔ بس یہ نہیں بتایا کہ اپنی بہن کو میں نے خود مارا تھا۔ وہ مجھے پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ میرے اس پر بہت سے احسانات تھے۔ وہ اسکالرشپ سے

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

www.paksociety.com

محروم ہوا تو اس کے سیمسٹر کی فیس بھی میں نے جمع کرائی تھی۔ مجھے پتا تھا کہ وہ احسان فراموش نہیں۔ میں نے اسے ایک کہانی سنائی اور کہا کہ یہ جا کے پولیس کو سنا دو۔ وہ میرے مجبور کرنے پر میری بات مان گیا۔ میں نے اسے بتایا تھا کہ نور حسام کو قتل کر کے خودکشی کر لے گی اس لیے اس کے جھوٹے بیان سے کسی کو کوئی نقصان نہیں ہو گا۔ مگر اسی وقت تیز بارش شروع ہوگئی اور ہم نے پولیس کے پاس جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ پولیس کے پاس بعد میں بھی جایا جا سکتا تھا۔ نور کا نمبر بھی آف جا رہا تھا۔ صبح اس کا ایس ایم ایس آیا کہ وہ رات کو گاڑی خراب ہو جانے کی وجہ سے اپنا کام مکمل نہیں کر سکی۔ وہ ابھی حسام کے گھر پہنچ چکی تھی۔ میں حاکم کے کمرے کی طرف جا رہا تھا کہ میری نظر اس جگہ پر پڑی جہاں وہ اپنی بائیک کھڑی کرتا تھا۔ بائیک غائب تھی۔ گلی میں کھلنے والا دروازہ بھی باہر سے بند تھا مگر یہ فکر کی بات نہیں تھی۔ وہ اکثر صبح سویرے ہی یونیورسٹی کے لیے نکل جاتا تھا۔ میں نے اسی کے کمپیوٹر پر اس کی خودکشی کا نوٹ تیار کیا۔ پرنٹ نکال کے میں نے وہ صفحہ اپنے کمرے میں جا کے چھپا دیا۔

پھر میں نے نور کو کال کی۔ ”میں نے اسے مار دیا ہے مگر میں خود بھی شدید زخمی ہوں۔ میرے سر سے بہت سا خون بہہ گیا ہے۔ میرا پستول مجھ سے کچھ ہی فاصلے پر پڑا ہے۔ میں کوشش کر رہی ہوں کہ اس تک پہنچ کے اپنی زندگی کا خاتمہ کر لوں۔ مجھ سے یہ تکلیف برداشت نہیں ہو رہی۔“ وہ رک رک کے بول رہی تھی۔

اچانک اس کی ہچکی کی آواز ابھری۔ میں اسے ہیلو ہیلو کرتا رہ گیا مگر دوسری طرف مکمل خاموشی تھی۔ میں افسردہ ہو گیا مگر منصوبہ میری توقع کے مطابق آگے بڑھ رہا تھا۔

میں یونیورسٹی میں پہنچا تو وہ لائبریری میں بیٹھا مل گیا۔ میں اسے ساتھ لے کے باہر آ گیا۔ میں نے اسے بتایا کہ نور نے حسام کو مار کے خودکشی کر لی ہے۔ وہ مجھے خالی خالی نظروں سے دیکھنے لگا۔ اس نے مجھ سے میری معلومات کا ذریعہ تک نہیں پوچھا۔

میں نے اس سے پوچھا کہ وہ پولیس کے پاس جانے کے لیے تیار ہے۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

میں نے اس سے ساری کہانی جو میں نے اسے بتائی تھی دوبارہ سنی۔ وہ اسے لفظ بہ لفظ یاد تھی۔ اس نے وہ ایسے ہی سنائی تھی جیسے پولیس آفیسر کو سنائی تھی۔ اس کے الفاظ کا استعمال اور اداکاری شاندار تھی۔ میں مطمئن ہو گیا۔

فنڈز

ایک شخص نے اسٹیٹ بینک کو شکایت بھیجی کہ اس کے بینک نے اس کا ایک چیک اس نوٹ کے ساتھ واپس کر دیا ہے کہ ”فنڈز ناکافی ہیں“ مگر یہ وضاحت نہیں کی کہ ادائیگی کے لیے بینک کے اپنے فنڈز ناکافی ہیں یا میرے اکاؤنٹ میں کم رقم ہے۔ بینک کے خلاف سخت ایکشن لیا جائے۔

مانسہرہ سے احمد بٹ کی تنبیہ

میں نے اسے دلاسا دیا۔

”دیکھو یہ مت سمجھنا کہ میں تمہیں استعمال کر رہا ہوں۔ وہ لوگ اس سے کہیں بڑی سزا کے مستحق تھے۔ وہ اگر تمہاری بہن کے ساتھ ایسا کرتے تو کیا تم برداشت کر لیتے؟“

”تم فکر مت کرو، میں تمہاری ہدایات کے عین مطابق سب کر دوں گا۔ اور یہ سب میں صرف تمہارے لیے نہیں کر رہا۔ صبا اگر تمہاری بہن تھی تو سمجھو میری بھی بہن تھی۔“

اس کے جواب نے مجھے شرمندہ کر دیا مگر اس سٹیج پر منصوبہ تبدیل بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ جن دنوں صبا اس دنیا سے گئی تھی، وہ ہمارے گھر میں ہی رہ رہا تھا۔ وہ اسے ایک دو بار دیکھ بھی چکا تھا۔

ہم باہر جا رہے تھے کہ ایک جگہ تھوڑا جمگھٹا لگا دیکھا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ پولیس آئی ہے اور لڑکوں سے پوچھ گچھ کر رہی ہے۔ پولیس والے سادہ لباس میں تھے۔ انہوں نے مجھ سے بھی سوالات کیے۔ میں نے انہیں مقتولین سے حسام کی دوستی کے متعلق بتایا۔ اس پولیس والے کو دیکھ کے مجھے اس کی ذہانت اور باریک بینی کا اسی وقت اندازہ ہو گیا تھا مگر مجھے اپنے منصوبے پر بھی مکمل اعتماد تھا۔ میرا منصوبہ بالکل بے داغ تھا۔

میں نے حاکم کو اشارہ کیا مگر وہ جھجک رہا تھا۔ پولیس والے کی نظر اس پر پڑ گئی۔ وہ باہر جاتے جاتے اسے اشارہ کر گیا۔ میں نے حاکم کی کمر تھپکی اور اسے باہر بھیج دیا۔

میں گھر آ گیا اور بے چینی سے اس کا انتظار کرنے لگا۔ تقریباً دو گھنٹے بعد اس کی کال آئی تو وہ بہت خوش لگ رہا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ کام ہو گیا۔ شام کو گھر پر تفصیل سے بات ہو گی۔

شام کو وہ گھر آیا تو اس کے چہرے پر فتح مندانہ چمک تھی۔ اس نے مجھے ساری تفصیل بتائی۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اس

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

نے اتنی شاندار اداکاری کی ہے کہ اسے آسکر ایوارڈ ملنا چاہیے۔

میں نے اُسے مبارکباد دی۔

اب میرے منصوبے کے سب سے مشکل مرحلے کا آغاز ہو رہا تھا۔ مشکل اس لیے کہ میرا حاکم کو مارنے کا دل نہیں کر رہا تھا۔ میں نے اسے پہلی بار اتنا خوش دیکھا تھا جبکہ موت اس سے کچھ ہی دیر کے فاصلے پر تھی۔ میں افسردہ تھا مگر میں جانتا تھا کہ پولیس والوں کو اس کی کہانی پر یقین نہیں آیا ہوگا وہ لازمی اس کے بارے میں تفتیش کرتے۔ وہ پکڑا جاتا تو میری گرفتاری بھی یقینی تھی۔

میں اس کے لیے چائے بنا کے لے آیا۔ اس میں میں نے خواب آور دوا ملا دی تھی۔ اس نے چائے پی لی۔ میں چائے کے کپ اندر رکھ کے واپس آیا تو وہ میری توقع کے مطابق گہری نیند سو رہا تھا۔ میں نے اس کا موبائل اٹھایا اور اس میں سے ایک سم نکال کے وہ سم ڈال دی جس سے میں نور اور حسام کو کالز کرتا رہا تھا۔ یہ سم حاکم کے نام پر ہی تھی۔ وہ اسے استعمال نہیں کرتا تھا کچھ دن پہلے ہی میں نے اس سے مانگی تو اس نے وہ مجھے دے دی تھی۔ خواب آور دوا کی شیشی میں نے کمپیوٹر کے ساتھ رکھ دی۔ ادھر پانی کا آدھ بھرا گلاس پہلے سے رکھا تھا۔ میں نے چاقو پر اس کے فنگر پرنٹس ڈالے اور بیڈ کے میٹرس کے نیچے رکھ دیا۔ یہ وہی چاقو تھا جو میں نے ان تینوں کے جسموں پر استعمال کیا تھا۔ پھر میں نے پستول اس کے ہاتھ میں پکڑا کے اس کی کنپٹی پر رکھ کے اپنی انگلی سے ٹریگر دبا دیا۔ اس کے جسم نے جھٹکا کھایا۔ میں نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اس کے ہاتھ سے پستول نیچے گر گیا اور اس کا بازو بیڈ کی پٹی سے نیچے جھولنے لگا۔ خودکشی کا نوٹ میں نے اس کے سینے پر رکھ دیا۔ میرے ہاتھوں میں باریک دستانے تھے۔ اگرچہ خودکشی کے نوٹ کے بعد توقع کم ہی تھی کہ پولیس زیادہ باریک بینی سے تفتیش کرتی۔ لیکن اگر وہ تفتیش کرتی بھی تو سارے شواہد خودکشی کے نوٹ کی تصدیق کرتے۔ میں پیچھے ہٹ کر غور سے کمرے کا منظر نامہ دیکھنے لگا۔ سب کچھ میری توقع کے مطابق ہوا تھا۔ اچانک کال بیل بجی تو میں چونک گیا۔ میں جلدی سے باہر نکلا۔ دروازہ لاک کیا اور اندر جا کے دستانے ڈسٹ بن میں ڈال کے ان پر کوڑا ڈال دیا۔ میں گیٹ پر آیا تو ایک اجنبی شخص کھڑا تھا اس نے مجھے اپنا پولیس کارڈ دکھایا تو میں حیران رہ گیا۔ اس کا مطلب تھا وہ حاکم کی نگرانی کر رہا تھا۔ پولیس نے مجھ سے بیان لیا۔ میں نے سب اپنے منصوبے کے مطابق بتا دیا۔ میں مطمئن تھا مگر جب پولیس مجھے گرفتار کرنے آئی تو میں حیران رہ گیا۔ میرا منصوبہ تو بے داغ تھا۔ آخر ایسی کون سی غلطی مجھ سے سرزد ہوئی تھی جس نے پولیس کو میری راہ پر ڈالا تھا۔ مجھے بعد میں پتا چلا کہ نور نے میری کالز ریکارڈ کر لی تھیں اور ساؤنڈ میچنگ کے ذریعے وہ میری آواز ثابت ہوگئی۔ یوں میں اپنی تمام تر ہوشیاری کے باوجود بدقسمتی سے پکڑا گیا۔''

☆☆☆

صرف آواز کے میچ کرنے سے وہ قاتل ثابت نہیں ہوسکتا تھا۔ درانی نے اس کے ہاتھوں کا ٹیسٹ کرایا تھا اس کی توقع کے مطابق وہاں بارود کے تازہ ذرات تھے۔ درانی نے اس پر تھوڑی سختی کرائی تو اس نے اعترافِ جرم کر لیا۔

درانی نے اتنا پیچیدہ کیس حل کر لیا تھا مگر وہ اس کی کہانی جان کے افسردہ ہوگیا تھا۔ اس نے بے گناہ حاکم کی جان لی تھی شاید اسی وجہ سے وہ پکڑا بھی گیا۔

☆☆☆

فاروق پارک میں ایک بینچ پر بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے ہی تین نوجوان لڑکیاں ایک دوسرے سے اٹکھیلیاں کر رہی تھیں۔ وہ بار بار کن انکھیوں سے اسے دیکھتیں اور ہنسنے لگتیں۔ شاید وہ اسی کے حوالے سے ایک دوسرے کو چھیڑ رہی تھیں۔ فاروق دلچسپی سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ اچانک ایک لڑکی اٹھی اور اس کی طرف بڑھی۔ اس نے پاس آکے پوچھا۔

''میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں؟''

اس کی باچھیں پھیل گئیں۔ ''جی جی کیوں نہیں۔''

وہ اس کے ساتھ ہی بینچ پر بیٹھ گئی تو فاروق اٹھ کھڑا ہوا۔

''آپ تو یہاں بیٹھ سکتی ہیں مگر اب میں یہاں نہیں بیٹھ سکتا۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور علینا کی طرف بڑھ گیا۔

دونوں لڑکیاں اسے اس طرح جاتے دیکھ کے کھلکھلا کے ہنسیں جبکہ وہ لڑکی ہکا بکا اسے دیکھتی رہ گئی۔

دور بچوں کو جھولے دیتی علینا یہ سارا منظر دیکھ رہی تھی۔ فاروق کو اپنی طرف بڑھتا دیکھ کے اس کے چہرے پر آسودہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY